

روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق فتاویٰ

احکام و مسائل

کتاب و سنت کی روشنی میں

تالیف

فضیلہ شیخ مولانا ابو الحسن مثنیٰ احمد ربانی رحمۃ اللہ علیہ

نظر ثانی

فضیلہ شیخ حافظ عبدالکلام بن محمد حفظہ اللہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

*** توجہ فرمائیں! ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب.....

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ

لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔

متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی

نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

*** تنبیہ ***

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق فتاویٰ

احکام و مسائل

کتاب و سنت کی روشنی میں

تالیف

فضیلہ شیخ مولانا ابو الحسن مہتمم احمد ربانی

نظر ثانی

فضیلہ شیخ حافظ عبدالسلام بن محمد



Dar ul Andulus

دارالاندلس
اسلام کی نشرو اشاعت کا عالمی مرکز
ملیک راجہ چوک لاہور 4711-49-7230549-042

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

احکام و مسائل

کتاب وسینت کی روشنی میں

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا ابوالحسن منیر احمد ربانی

نظر ثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ عبدالسلام بن محمد

جمع و ترتیب

حافظ عمران ایوب ||| ایضاً اشتیاق احمد

ناشر..... دارالاندلس



Dar ul Andlus

اسلام کی نشرو اشاعت کا عالمی مرکز
دارالاندلس
ہدلیک روڈ، چورچوٹ لاہور

Ph: 7230549 Fax: 7242639 www.dar-ul-andlus.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

احکام و مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

- 45 جمعرات کو مردوں کی روحوں کا گھر آنا عقائد کا بیان
- 45 قبر میں میت کو نبی ﷺ کی صورت کا دکھایا جانا 13 کیا انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟
- 47 درود کی آواز 16 ایک من گھڑت روایت کی تحقیق
- 49 لفظ وہابی سے نفرت کیوں؟ 17 اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنے کے متعلق حدیث کی توثیق ..
- 49 نبی اکرم ﷺ کا بڑے بھائی جتنا ادب 19 عبد اللہ النبی اور عبد الرسول نام رکھنا
- 49 قرآن سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز 22 کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟
- 52 شہین کی شرعی حیثیت 22 غیر اللہ کی قسم کھانا
- 55 نبی ﷺ پر اعمال کا پیش کیا جانا 23 غیر اللہ سے مدد مانگنا
- 59 روایت ”لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ“ 25 میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں
- 60 ”نُورٌ مِنْ نُورِ اللّٰهِ“ والی ایک روایت کی تحقیق 26 زمانے کو برا کہنا
- 61 نوری ستارے والی روایت کی تحقیق 27 ایک ضمیر میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو جمع کرنا
- 62 نبی کریم ﷺ کا مسلک 29 مسئلہ تقدیر
- 63 نعت رسول مقبول ﷺ کی شرعی حیثیت 31 اللہ تعالیٰ کی مشیت رسول اللہ ﷺ کی مشیت سے مقدم ہے
- 64 سید کے کہتے ہیں؟ 35 قبروں پر جانور ذبح کرنا
- 65 ماہ صفر منحوس ہے؟ 35 قبروں پر اعمال پیش ہونا
- 66 ترانے کے لیے قیام 36 مسلمانوں کی میلوں ٹھیلوں میں شرکت
- 68 ”یا محمد“ کا نعرہ 36 کلمہ طیبہ
- 69 نبی ﷺ کی مخالفت پر سزا 37 استطاعت سے بڑھ کر نذر پوری کرنا
- 69 نجد کا صحیح مفہوم 38 رسول اللہ ﷺ کا سایہ
- 75 کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کا ٹھکانا پہلے بتلا دیا تھا؟ 40 خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت
- 77 تحریف شدہ آسمانی کتابوں سے انکار 42 نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا
- 77 ماہ رجب کے کوٹھڑوں کی شرعی حیثیت

116 بغیر وضو تلاوت قرآن مجید کا حکم

غسل اور جنابت کا بیان

118 صرف پانی سے طہارت

118 نچے ہو کر غسل کرنے کا حکم

119 عورت کا غسل جنابت میں بالوں کو تر کرنا

122 غسل خانے میں گنگو کرنا

122 حالت مباشرت میں پہنے گئے کپڑوں کا حکم

حیض و نفاس کا بیان

123 حائضہ عورت کا مسجد میں جانا

123 حیض و نفاس کی حالت میں عبادات کا حکم

126 حائضہ عورت کا قرآن کو ہاتھ لگانا

128 حائضہ عورت کا قرآن پاک کی تلاوت کرنا

129 دورانِ حج و عمرہ حائضہ کا حکم

طہارت کے متفرق مسائل

131 سلسل البول کا حکم

131 اہل کتاب اور دیگر کفار کے برتنوں اور ڈبیچے کا حکم

نماز کے احکام

133 اذان کا بیان

133 اذانِ فجر میں ”الْصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا

اذان میں ”أَشْهَدُ أَنْ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيٌّ وَ لِيُ

135 اللّٰهُ“ کا اضافہ

139 ترجیح والی اذان ثابت ہے؟

77 تعویذ کے متعلق شرعی موقف

78 اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ ”عشق“ کا استعمال

80 دم کر کے پانی پر پھونک مارنا

80 عاتلوں سے علاج کروانا اور انھیں ہاتھ دکھانا

81 کرامت اور صاحب کرامت

82 کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟

83 کیا علی علیہ السلام خلیفہ بلا فصل اور مشکل کشا ہیں؟

85 شیعہ اثنا عشریہ اور قرآن

95 ماہِ محرم کی بدعات اور ناجائز امور

99 جادو اور جنات نکلانے کی شرعی حیثیت

103 جنات میں شادی بیاہ اور تولد و تاسل

جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی

104 چیز رکھنا

104 شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم

105 شرک ناقابل معافی جرم

106 ہجرت کی حیثیت

وضو کا بیان

108 وضو میں پاؤں کا دھونا

108 وضو کی دعا کے متعلق حدیث کی وضاحت

109 دورانِ وضو دعائیں پڑھنا

109 وضو کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینے مارنا

110 کیا اخرون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

113 شلو اور ٹخنوں سے نیچے لگانے سے وضو ٹوٹا

114 نیل پالش کے ساتھ وضو

115 اگر دورانِ نماز وضو ٹوٹ جائے

116 غسل جمعہ کے بعد وضو

- 171 مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی قراءت
- 172 نماز ظہر میں کبھی کبھار جہراً کوئی آیت پڑھنا
- 173 سورۃ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ
- 173 دوران قراءت ہر آیت پر وقف
- 174 قصد ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا
- 175 قراءت میں سورتوں کی ترتیب
- 188 نماز میں قرآن سے دیکھ کر قراءت کرنا
- 180 نماز میں آیات کا جواب دینا
- 181 اونچی آواز سے آمین کہنے کا حکم
- فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی
- 181 سورت پڑھنا
- 182 کیا رفع الیدین کا حکم منسوخ ہو چکا
- 185 سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے؟
- 186 دوران سجدہ پاؤں کی کیفیت
- 187 دوران سجدہ دعا مانگنا
- 189 سجدہ سہو کا حکم
- 190 اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے
- 191 تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا
- 193 تشہد میں شہادت کی انگلی کا قبلہ رخ ہونا
- 193 پہلے تشہد میں درود پڑھنا
- 195 آخری تشہد میں دعا
- 195 مرد اور عورت کی نماز میں فرق
- 200 فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت
- 203 کیا رفع الیدین بتوں کی وجہ سے کیا جاتا تھا؟
- امامت کا بیان
- 204 صفوں کی درستی
- 140 نماز کے لیے اذان دینا
- 141 اذان سے پہلے صلوٰۃ کا حکم
- 141 بدعتوں کی اذان کا جواب
- 142 اقامت کون کہے؟
- 142 اقامت کے جواب میں ”أَقَامَهَا اللَّهُ وَ أَدَامَهَا“ کہنا
- 143 نو مولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا
- 145 اکیلا آدمی نماز کے لیے اپنی اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟
- اوقات نماز کا بیان
- 146 اوقات نماز اور ان کے معلوم کرنے کا طریقہ
- مساجد کا بیان
- 151 کیا مسجد کو گرایا جاسکتا ہے؟
- 153 مزین مساجد اور منقش جائے نماز پر نماز کا حکم
- 155 جنبی کا مسجد میں داخل ہونا
- 156 چھوٹے بچوں کا مسجد میں آنا
- 157 مسجد میں گردنیں پھلانگ کر آگے آنا
- 157 ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا
- 161 مساجد میں عورتوں کے اجتماعات کا کیا حکم ہے؟
- 162 مسجد میں اطلاعات
- 163 مسجد میں سترے کی ضرورت
- طریقہ نماز کا بیان
- 168 نماز کے لیے زبان سے نیت کرنا
- 169 نماز میں پاؤں سے پاؤں ملانا
- 170 نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟
- 171 سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ

- 243 خطبہ جمعہ کا اہتمام 207 صف میں اکیلے کھڑے ہونا
- 244 علاقائی زبانوں میں خطبہ جمعہ 208 امامت کا مستحق کون ہے؟
- 245 نماز جمعہ کی کل رکعتیں 209 نیکے سرجماعت کرانے کا حکم
- 245 نماز جمعہ کا صحیح وقت 209 واڑھی کنوانے والے کو مستقل امام بنانا
- 246 جمعہ کے روز سورۃ الکہف پڑھنے کی فضیلت 210 کیا غیر ذمہ دار شخص امامت کے لائق ہے؟
- 247 جمعہ کے روز عید آنے پر جمعہ کی رخصت 211 امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ
- 247 منبر کی تیسری سیڑھی پر خطبہ دینا 213 امام سے پہلے کرنا
- 248 خطبہ جمعہ کے دوران سنتوں کا حکم 214 ایک مسجد میں دو جماعتیں
- 249 جمعہ کے بعد سنتیں دو ہیں یا چار؟ 220 میاں بیوی کا باجماعت نماز ادا کرنا
- 250 خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ کے لیے الگ الگ امام 220 مرد کی عورتوں کے لیے امامت
- 250 خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی والی حدیث کا مفہوم 221 عورت کا جماعت کروانا
- 251 تین رکعات وتر تقسیم کر کے پڑھنا 222 مسافر کی مقیم کے پیچھے نماز
- 253 وتروں میں قنوت سے پہلے تکبیر 224 مسافر کی مقیم کے لیے امامت
- 254 وتر کی آخری رکعت 226 مشرک امام کے پیچھے نماز
- 255 وتروں کے بعد نماز 228 منفرد کے ساتھ نماز میں شریک ہونا
- 258 نماز عشاء کے بعد وتروں کی تعداد 229 نماز میں مقتدی کا امام کو لقمہ دینا
- 258 قنوت وتر رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟ 230 دوران قنوت مقتدی کیا کہے؟
- 259 قنوت نازلہ کا حکم 230 مقتدی بھی ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہیں
- 262 قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے 231 امام اور مقتدی کی تکبیر اور سمع اللہ من حمہ میں فرق کیوں؟
- 263 نماز تہجد میں سورۃ اخلاص کی مخصوص تعداد میں قراءت 263 نفل نماز کا بیان
- 263 نماز عید کے لیے عورتوں کا عید گاہ جانا 236 نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہئیں یا کھڑے ہو کر؟
- 264 نماز عید کہاں ادا کی جائے؟ 236 فرض نماز کی جگہ سنتوں کی ادائیگی
- 265 عید کے دن روزہ رکھنا 237 اقامت کے بعد سنتیں پڑھنے کا حکم
- 265 ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن نہ اتروانا 239 فجر کی سنتوں کی قضا کا طریقہ
- 266 نماز اشراق کا بیان 241 فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا
- 268 نماز استجارہ کا طریقہ 242 ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھنا
- 268 رکعات نماز تراویح کی تعداد

- 270 تراویح کے امام کے علاوہ دوسرے امام کا وتر پڑھانا 270
 270 صدقہ فطر ادا کرنے کا صحیح وقت 270

زکوٰۃ کے مسائل

- 300 زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی سزا کیا ہے؟ 300
 301 سونے چاندی کے نصاب پر زکوٰۃ 301
 301 رجب میں زکوٰۃ دینا اور روزے رکھنا 301
 302 زیورات پر زکوٰۃ 302
 303 مصارف زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟ 303
 304 مجاہدین کو زکوٰۃ دینا 304
 305 صدقہ فطر کا حکم 305
 306 مسجد کے قاری کو صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے؟ 306
 306 مقروض آدمی کا عشر دینا 306
 307 زمین ٹھیکہ پر دینا اور ٹھیکہ والی زمین کے عشر کا حکم 307
 308 آل رسول ﷺ کو زکوٰۃ دینا 308
 308 کن فقراء کو زکوٰۃ دینی چاہیے 308

روزے کے احکام

- 315 چاند دیکھ کر روزہ رکھنا 315
 316 رمضان کے چاند کے لیے ایک فرد کی گواہی 316
 317 سحری کھانا لازمی ہے؟ 317
 318 سحری کے لیے بہترین چیز 318
 318 تاخیر سے سحری کھانا 318
 318 اذان سحری کی حیثیت 318
 320 اذان کے دوران کھانا پینا 320
 321 سحری کھانے کا آخری وقت 321
 322 روزے کے لیے نیت کرنا 322
 322 روزے کے لیے زبان سے نیت کی حیثیت 322

نماز کے متفرق مسائل کا بیان

- 272 نماز میں قضائے حاجت کا مسئلہ 272
 272 جوتے پہن کر نماز پڑھنا 272
 273 نماز میں آستینیں چڑھانا 273
 273 مباشرت کے دوران پہننے گئے کپڑوں میں نماز کا حکم 273
 274 مرد کی ننگے سر نماز 274
 275 قبروں والی مسجدوں میں نماز 275
 279 گھر میں فرض نماز ادا کرنا 279
 280 دوران نماز جیب میں روپے رکھنا 280
 282 ڈرائیور حضرات کی نماز 282
 282 دوران نماز خیالات و وساوس اور ان کا علاج 282
 284 نماز میں مصروف افراد کو سلام کرنا 284
 284 نماز میں بالوں اور کپڑوں کو سنوارنا 284
 285 نماز میں خشوع و خضوع کا طریقہ 285
 287 نماز میں اعوذ باللہ پڑھنا 287
 287 ایک رات میں قرآن ختم کرنا؟ 287
 289 نماز میں ایک آیت سے کم تلاوت کرنا 289
 290 اگر جمعہ فوت ہو جائے؟ 290
 291 قضا نمازوں کی ادا نیکی کا طریقہ 291
 292 نماز کے متعلق شک 292
 293 بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا 293
 294 عصر کے بعد نفل پڑھنا 294
 297 سجدہ تلاوت کا حکم 297
 298 رسولی اللہ ﷺ کا نماز میں عمامہ باندھنا 298

حج کے احکام

- 342 استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا حکم
- 342 حج کتنی مرتبہ فرض ہے؟
- 343 حج کی کون سی قسم افضل ہے
- 344 دوران طواف جو تاسا تھ اٹھانا
- 344 کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے؟
- 345 مقام ملتزم پر دعا کرنا
- 345 رمل کس طواف میں ضروری ہے؟
- 346 حج یا عمرے سے واپسی پر دعوت کرنا

حج سے متعلق چند متفرق مسائل

- 347 دوران حج حیض و نفاس والی عورت کیا کرے؟
- 347 ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنے کا حکم
- 348 میت کی طرف سے حج کرنا
- 348 حج بدل کا حکم
- 348 رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت
- 349 آب زمزم کے فوائد
- 351 حج کے موقع پر کی قربانی

جنائزے کے احکام

- 352 میت کو غسل دینے کا طریقہ
- 353 میت کو غسل دینے والے پر غسل
- 354 میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا

کفن دینے کا بیان

- 357 کفن کا کپڑا

- 324 روزے کا اجر ضائع کر دینے والے اعمال
- 325 روزہ توڑ دینے کا کفارہ
- 325 روزہ افطار کرنے کا وقت
- 327 کس چیز سے روزہ افطار کرنا چاہیے؟
- 328 روزہ افطار کرنے کی دعا
- 328 فرضی روزوں کی قضا اور نفلی روزے
- 328 روزہ میں بھول کر کھانا پینا
- 329 تارک نماز کے روزے کا حکم
- 329 روزے کی حالت میں تے آنا
- 330 جھوٹ بولنے والے کا روزہ
- 330 ہوائی سفر کرنے والے کا وقت افطار
- 332 آکسیجن اور روزہ

- 332 مریض کا روزہ
- 333 بحری، بری اور فضائی سفر میں روزہ کی رخصت
- 334 حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے روزوں کی قضا
- 334 دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال

اعتکاف کے مسائل

- 336 اعتکاف کی شرعی حیثیت
- 338 اعتکاف کے لیے نیت
- 338 جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے
- 339 دوران اعتکاف ممنوع افعال
- 340 خواتین کا اعتکاف
- 341 دوران اعتکاف چند جائز کام
- 340 لیلة القدر کی تلاش
- 341 لیلة القدر کی علامات

396	تبر پر قرآن پڑھنا	358	عورت کا کفن
396	میت کے لیے دعا کا حکم	359	کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا
397	میت کے سر ہانے سورہ بقرہ پڑھنا	361	نماز جنازہ کا بیان
400	قبر سے سورہ الملک پڑھنے کی آواز آنا	361	نماز جنازہ کے لیے طاق مصفیں بنانا
400	چکی قبریں بنانا	361	نماز جنازہ میں رفع الیدین
401	قبروں پر مسجدیں بنانا	363	نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا حکم
401	قبر کی اونچائی	365	نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا
401	عورتوں کا قبرستان جانا	368	سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانا
403	جنازہ کے متفرق مسائل کا بیان	369	نماز جنازہ میں قراءت
403	میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا	370	نماز جنازہ میں میت پر نام لے دعا مانگنا
404	سوگ کا مسنون طریقہ	370	نماز جنازہ میں دعائیں
407	جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے باواز بلند ذکر کرنا	373	نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا
407	میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنا	374	نماز جنازہ کے فوراً بعد دعا
408	اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دینا	375	مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا
410	تین دن کے بعد تعزیت کا حکم	377	نماز جنازہ میں خواتین کی شرکت
410	جمعہ کے روز فوت ہونا	377	مردہ بچے کی نماز جنازہ
411	قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرنا	379	خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم
412	تجارت کے احکام	380	شہید کی نماز جنازہ کا حکم
412	سودی مال کا کیا کیا جائے؟	384	غائبانہ نماز جنازہ
413	بینک میں رقم رکھنا	385	میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا
414	بینک میں ملازمت کرنا	387	نماز جنازہ میں تہتہ ناقص وضو نہیں؟
414	انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت	388	غروب کے وقت نماز جنازہ ادا کرنا
415	قتلوں پر اشیاء خریدنے کا حکم	391	تدفین کا بیان
416	بیمہ کی شرعی حیثیت	391	میت کو قبر میں اتارنا
417	حرام کھانے کا انجام	392	میت کو قبر میں اتارنے والا کیا کہے؟
418	اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنا	392	تدفین کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا
420	گردی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا	396	قبروں کے مسائل کا بیان

454	نا جائز امور پر مشتمل شادی میں شرکت	421	نا جائز کاروبار کے لیے دکان کرائے پر دینا
456	مکھلاوہ کی رسم بد	423	شیو کی کمائی
458	بارات کی شرعی حیثیت اور مسنون شادی کے لوازمات	424	فونوگرافی کا پیشہ
459	شادی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا	426	ذخیرہ اندوزی
459	دعوت ولیمہ پر سلامی	427	بیع سلم کا حکم
460	نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کرنا	427	زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کی سزا
462	لوٹریوں سے مباشرت	430	خورد و نوش کی اشیاء ادھار لینا
463	حاملہ عورت سے صحبت کرنا	430	قرآن کی تعلیم پر معاوضہ لینا
464	ولادت سے کتنی مدت بعد مرد عورت کے پاس جائے	431	جی پی فنڈ کی شرعی حیثیت
464	عورت کے حقوق	433	نکاح کے احکام
465	خاندانی منصوبہ بندی	433	نکاح کے لیے ذات برادری ایک ہونا
466	شادی کے دو ماہ بعد بچے کی پیدائش	434	اسلام میں جہیز کی حیثیت
470	طویل عرصہ بیرون ملک رہنے والے کے نکاح کا حکم	436	اگر شادی کے لیے خرچہ محدود ہو تو؟
471	ایک سے زیادہ بیویوں کے مابین عدل کا حکم	437	بے نماز شخص کو لڑکی کا رشتہ دینا
471	بیوی یا شوہر کا راز افشا کرنے کا شرعی حکم	438	ولی کی اجازت کے بغیر نکاح
472	حزمت رضاعت	442	کورٹ میرج کی شرعی حیثیت
474	رضاعت کا مسئلہ	443	والد کی موجودگی میں چچا کی ولایت
475	ایک دفعہ دودھ پینے سے رضاعت	443	بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح
476	بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی	444	نکاح سے پہلے مباشرت
476	بہن کا دودھ پینے والے کی اولاد	446	بالغ اولاد کا نکاح
477	وٹرسٹہ کا نکاح	447	بالغ لڑکی کا نکاح
481	شادی سے پہلے کوئی شرط عائد کرنا	448	کم سن بچی کا نکاح
481	زبردستی کا نکاح درست نہیں	448	شمیہ کی اہلیہ سے نکاح
482	حلالہ کی شرعی حیثیت	449	اولاد کی تمنا میں شادی کرنا
483	متحدہ کا شرعی حکم	450	عورت کسی کا نکاح کروا سکتی ہے
487	طلاق کے احکام	452	دہن کے لیے بیوی کس کا استعمال
487	طلاق کا مسنون طریقہ	453	شادی کی تقریب میں بینڈ باجے

518	سب اہل خانہ کی طرف سے ایک قربانی	488	طلاق رجسی کے بعد
518	میت کی طرف سے قربانی کرنا	489	ایک مجلس کی تین طلاقوں کا شرعی حکم
519	نحر کرنے کا طریقہ	491	حالت حیض میں دی گئی طلاق
520	کیا پاکستانی قوم کو قربانی معاف ہے؟	493	دوران حمل دی گئی طلاق
524	عقیقہ کے مسائل	494	زبردستی دلوائی جانے والی طلاق
524	عقیقہ کی شرعی حیثیت	496	بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا
527	عقیقہ کے لیے اونٹ اور گائے ذبح کرنا	497	غصہ میں طلاق
529	عقیقہ کے موقع پر رسم مہندی	498	غیر مدخولہ کی عدت
530	کھانے پینے کے احکام	498	بیوہ کی عدت اور احکام
530	مسلمان کا اہل کتاب کے ساتھ کھانا	500	کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوتا ہے؟
530	لہسن کھایا جاسکتا ہے	502	خلع طلاق یا فسق نکاح
532	برائے مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام	503	طلاق اور خلع میں فرق
536	کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟	504	شوہر کی خبر نہ ملنے پر عورت کے لیے حکم
539	کھانے میں مکھی کا گرنا	507	قربانی کے احکام
540	جہاد کے احکام	507	کیا رھویں کی نیت سنت یا بدعت؟
540	جہاد کے لیے والدین کی اجازت	507	جن جانوروں کی قربانی جائز نہیں
541	قرآن وحدیث میں فی سبیل اللہ سے مراد	508	حاملہ جانور کی قربانی
542	جہاد کشمیر کی شرعی حیثیت	508	رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے؟
545	ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت	509	بھینس کی قربانی
546	کیا طالبان کسی غیر مسلم ملک سے مدد لیتے ہیں؟	511	دودانے سے کتر کی قربانی
550	کافروں کی گردنیں کاٹنا	513	قربانی کا جانور کیسا ہو؟
551	مسلمانوں سے لڑائی نہ کرنے والے کافروں سے سلوک	514	اونٹ کی قربانی میں کتنے آدمی شریک ہوں؟
552	کیا ”فی سبیل اللہ“ سے مراد جہاد ہے؟	515	قربانی کا وقت
553	کفار و دست مسلمان حکمرانوں کے خلاف جہاد	515	قربانی کے گوشت اور کھالوں کا مصرف
	اسلامی آداب و احکام	517	عورت کا قربانی کا جانور ذبح کرنا
		517	جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ لگانا
558	”السلام علیکم“ کی بجائے دیگر فقرے	518	قربانی کا جانور خود ذبح کرنا

- 598 عمل قوم لوط کی سزا
- 599 غیر محر معورت کے ساتھ خلوت نشینی
- 603 مرد کے کہتے ہیں؟
- 605 مرد کی دنیوی سزا
- 606 کافر کے بدلے مسلمان کا قتل
- 607 بیٹے کے قصاص میں باپ کا قتل
- 559 ہاتھ کے اشارے سے سلام
- 561 جھک کر یا کھڑے ہو کر سلام کرنا
- 561 تعظیماً کھڑے ہونا
- 562 دونوں ہاتھوں سے سلام کرنا
- 566 یہود و نصاریٰ سے سلام
- 570 روز قیامت انسان کو کس نام سے پکارا جائے گا؟
- 571 والدین کی طرف دیکھنے کے متعلق حدیث کی وضاحت
- 571 غسل خانے میں گفتگو
- 572 برہنہ حالت میں کسی کو دیکھنا
- 572 روزانہ سنگھمی کرنا
- 573 پینٹ شرٹ پہننا
- 574 کس رنگ کی پگڑی پہننا مسنون ہے؟
- 575 ٹوپی پر پگڑی باندھنا
- 576 لوہے کی انگٹھی پہننا
- 578 کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کرنا
- 580 وگ یعنی مصنوعی بال لگانا
- 584 بہن بھائیوں کا ایک بستر میں سونا
- دعاؤں اور اذکار کے احکام
- 610 تسبیح گننے کا صحیح اور ثابت طریقہ
- 610 کیا تسبیح کا استعمال جائز ہے؟
- وظائف کی تعداد کا مسئلہ
- 614 مجلس برخواست کرنے سے قبل سو مرتبہ استغفار کرنا
- 615 چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرنا
- 615 کلمہ شہادت کا وظیفہ
- 616 ”لا الہ الا اللہ“ کی فضیلت
- حرام اور مباح امور کا بیان
- 618 محرم کے بغیر عورت کا سفر
- 623 عورت کے لیے محرم کے بغیر حج و عمرہ کا حکم
- 625 ہاتھ اور پاؤں کی تصویر اتروانا
- 626 گھر میں تصویر لگانے کا حکم
- 627 جاندار کی تصویر والے لباس
- 627 قوالی کی شرعی حیثیت اور عرسوں کے کھانے
- 631 دل بہلانے کے لیے پانسری بجانا
- 631 قبروں پر عرس اور میلے کا حکم
- 634 گانا اور میوزک سننا
- 587 جاندار کی تقسیم کا شرعی طریقہ
- 589 زندگی میں وراثت کی تقسیم
- 589 وراثت میں انصاف کا مسئلہ
- 592 چچا کی موجودگی میں پوتہ وارث
- 593 وارث کے لیے وصیت کرنا
- 594 اولاد کو عاق کرنا
- وراثت کے احکام
- حدود کے احکام
- 596 زنا کی حد

- 679 گھڑی باندھنا 634 محفلوں میں تالی بجانا
 679 عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا 635 موسیقی، اسلام کی نظر میں
 680 فیشن کے لیے ناخن بڑھانا 641 خودکشی
 680 راہ چلتے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ ... 642 عزت بچانے کی خاطر خودکشی کرنا
 681 شادی شدہ عورت کے لیے باپ کی اطاعت 643 رسومات میں شرکت کرنا
 682 خوش طبعی 644 ہوٹلوں میں منعقد تقریبات میں شرکت
 644 ویڈیو اور موسیقی والی شادیوں میں شرکت
 645 داماد سے پردہ
 646 خاوند کی وفات کے بعد ملازمت کرنا
 647 کسی کی وفات پر خاموشی اختیار کرنا
 647 کتا کھلوانا
 652 چوسر کھینا کیسا ہے؟
 652 عورت کے لیے چہرے کے بال اکھیڑنا
 653 بیوی کے ساتھ جھوٹ بولنا
 654 قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو زمین پر رکھنا
 655 سکول میں کھنٹی بجانا
 658 تقریبات میں طلبے بجانا اور ترانے پڑھنا
 658 اپریل فول
 662 ماتم کا شرعی حکم
 664 علمی کے موقع پر گریبان پھاڑنا یا سینہ پیٹنا
 665 ہدیہ و تحفہ واپس لینے کا حکم
 666 بسم اللہ یا قرآنی آیات کو اعداد کی صورت لکھنا
 668 داڑھی اور مونچھوں کے متعلق شرعی احکامات
 670 داڑھی رکھنا فرض ہے
 671 داڑھی کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث
 672 خضاب لگانا
 678 چاندنی کی انگوٹھی پہننا
 684 شادی کرنے میں بھی والدین کی اطاعت
 684 ولدیت تبدیل کرانے کا حکم
 688 اولاد کے نان و نفقہ کی ذمہ داری
 689 خیر چہ کا حکم
 691 اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی
 695 روایت فضیلتِ سورۃ واقعہ کی تحقیق
 698 توبہ کے بعد مسرور کہ مال نامعلوم مالگوں تک پہنچانا
 699 علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث
 699 وفات کے بعد میت کی طرف سے سود کے مال سے صدقہ کرنا
 700 ناراضی کے دوران شوہر نفرت ہو جائے تو؟
 702 مسلمان مریض کو خون کا عطیہ
 702 کالے بکرے کا صدقہ
 704 مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی
 704 کوئے کا شرعی حکم
 706 قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا
 708 احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا
 710 قرآن خوانی کرانا
 711 جھوٹی قسم کا کفارہ
 645 داماد سے پردہ
 646 خاوند کی وفات کے بعد ملازمت کرنا
 647 کسی کی وفات پر خاموشی اختیار کرنا
 647 کتا کھلوانا
 652 چوسر کھینا کیسا ہے؟
 652 عورت کے لیے چہرے کے بال اکھیڑنا
 653 بیوی کے ساتھ جھوٹ بولنا
 654 قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو زمین پر رکھنا
 655 سکول میں کھنٹی بجانا
 658 تقریبات میں طلبے بجانا اور ترانے پڑھنا
 658 اپریل فول
 662 ماتم کا شرعی حکم
 664 علمی کے موقع پر گریبان پھاڑنا یا سینہ پیٹنا
 665 ہدیہ و تحفہ واپس لینے کا حکم
 666 بسم اللہ یا قرآنی آیات کو اعداد کی صورت لکھنا
 668 داڑھی اور مونچھوں کے متعلق شرعی احکامات
 670 داڑھی رکھنا فرض ہے
 671 داڑھی کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث
 672 خضاب لگانا
 678 چاندنی کی انگوٹھی پہننا

- 712 قسم کا کفارہ اور مسکین کے کھانے کی مقدار
- 712 دو یا تین نابالغ بچوں کی وفات پر جہنم سے آزادی
- 713 چچا زاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ
- 714 آیت کریمہ پڑھنے کی فضیلت
- 716 تاج کھینی کی کتاب اعمال قرآنی
- 716 ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب
- 717 ترجمہ پڑھنے کا ثواب
- 718 سیاہ لباس پہننا
- 719 مرد و خواتین کا اختلاط
- 719 گھروں میں پردہ
- 720 نماز کی تارک بیوی کا حکم
- 721 عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے کی دلیل پکڑنے والوں کا رد
- 722 ہومیوپیتھی ادویات استعمال
- 722 لفظ کا حکم
- 727 اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تحقیق
- 728 بینک کی چوکیداری کی نوکری
- 728 سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا
- 729 لفظ "نصب" کا معنی
- 729 علماء کی سیکورٹی
- 731 غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا
- 731 آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا
- 732 ساگرہ منانا
- 732 صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن
- 734 بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا
- 735 شوہر سے پوچھے بغیر عورت کا صدقہ کرنا
- 736 افتتاح کے لیے فیتا کا ثنا
- 737 حرام جانور کے اعضاء کا حکم
- 738 کبوتر بازی اور مرغ لڑانا
- 740 زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں
- 741 پھولوں کا تحفہ پیش کرنا
- 742 بال زائل کرنے کا حکم
- 742 دین کے لیے وقف کی گئی اولاد سے کام لینا
- 743 رسول اللہ ﷺ کا ختنہ
- 744 خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا یا چارہ؟
- 747 کالے کپڑے پہننے کا حکم
- 748 ضعیف روایات کا حکم
- 749 گھر سے نکلنے کی دعا کی وضاحت
- 749 آل محمد رضی اللہ عنہم سے مراد
- 751 خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں
- 752 قرآن پاک کے شہید اور اراق کو محفوظ کرنا
- 752 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ
- 755 صحیح بخاری کو ناقابل صحت سمجھنے والوں کا حکم
- 757 کیا امام بخاری اور دیگر محدثین بھی مقلد تھے؟
- 759 کیا اختلاف امت رحمت ہے؟
- 760 ہر امت کے لیے فتنہ والی حدیث کی تحقیق
- 762 ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے
- 731 عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے صحیح بخاری کی ایک روایت پر نظر
- 769 عورت کی آواز سننا
- 770 حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی تک زندہ ہیں؟
- 771 یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا حدیث رکھنے کے متعلق حدیث
- 771 خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے
- 775 نفاق سے براءت
- 776 شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت
- 777 شعبان کی نصف رات کے اعمال کی حیثیت
- 778 پندرہ شعبان کا قیام اور روزہ

عرض ناشر

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ أَمَّا بَعْدُ !

شریعت کے احکام پر عمل کرنا اور نواہی سے بچنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اگر شرعی احکام میں کہیں اختلاف واقع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے، نیز یہ ادب بھی سکھایا گیا ہے کہ بے فائدہ سوال پوچھنے سے اجتناب کیا جائے، پہلی قوموں کی ہلاکت کا ایک بڑا سبب اسی کو گردانا گیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”مسلمانوں میں سب بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔“ [مسند احمد (۱/۱۷۹)]

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے بھی نظر چرائی جائے اور جاہلانہ زندگی پر قناعت کر لی جائے۔ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار مسلمان ایسے ہیں کہ جن کو طہارت و پاکیزگی کے اسلامی مسائل کا بھی پتا نہیں اور پوری زندگی یونہی گزر جاتی ہے، مردوں کی نسبت یہ کیفیت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو پاکیزہ زندگی گزارنے کے متعلق بھرپور راہنمائی کی ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے علم و فضل سے بہرہ ور علماء و محدثین کی جماعت پیدا کی، جنہوں نے ہر دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل کتاب و سنت سے پیش کیا ہے۔

”احکام و مسائل کتاب و سنت کی روشنی میں“ روزمرہ کے مسائل سے متعلق فتاویٰ کا شاندار مجموعہ ہے جو محقق عالم، فضیلۃ الشیخ ابوالحسن مبشر احمد ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مجلہ الدعوتہ اور ہفت روزہ غزوة میں ساہا سال سے شائع ہوتے رہے، جماعت الدعوتہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ دعوت و جہاد کے عظیم منہج کے ساتھ ساتھ روزمرہ فقہی مسائل میں بھی کتاب و سنت کی بھرپور رہنمائی احباب کے لیے پیش کی۔ مجلہ الدعوتہ اور غزوة میں احکام و مسائل کے کالم اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جنہیں پڑھ کے ہزاروں لوگوں کے عقیدہ و عمل میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور بے شمار لوگ ان سے اب بھی دینی رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ واللہ الحمد!

دارالاندلس کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد میری خواہش تھی کہ مجلہ الدعوتہ اور غزوة میں بکھرے ہوئے ان انمول موتیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ تو اس خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے حافظ عمران ایوب اور ابو عمر اشتیاق بھائی کی ذمہ داری لگائی جنہوں نے کئی ماہ کی محنت کے نتیجے میں ایک جامع مجموعہ ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ مولانا مبشر احمد ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہزارہا فتاویٰ جات سے

انتخاب ہے، مگر اسے بچنے کے لیے کئی ایک سوالات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ روزمرہ زندگی سے متعلق زیادہ سے زیادہ مسائل کا احاطہ بھی ہو اور کتاب زیادہ ضخیم بھی نہ ہو۔ مجلۃ الدعوة کے سوالوں کی تخریج تو پہلے سے موجود تھی لیکن غزوہ میں اختصار کے پیش نظر ایسا نہیں، اس لیے غزوہ کے سوالات کی تخریج کا کام بھی رفقائے ادارہ نے سرانجام دیا۔ نظر ثانی کے لیے اس کتاب کو محترم حافظ عبدالسلام بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انھوں نے اول تا آخر اس کا مطالعہ کیا اور اسے بہتر سے بہترین بنانے کے لیے مختلف مفید تجاویز دیں، جن کی روشنی میں اس پر مزید کام کیا گیا۔

روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق یہ فتاویٰ ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت ہے، سینکڑوں پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں دیا گیا ہے اسے خود بھی پڑھیے اور احباب کو تحفہ بھی دیجیے۔

اللہ تعالیٰ اسے مؤلف محترم اور رفقائے دارالاندلس کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور اہل اسلام کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

محمد سیف اللہ خالد

مدیر دارالاندلس

۱۳ صفر المظفر ۱۴۲۶ھ



WWW. KITABOSUNNAT.COM

مقدمہ

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ أَمَّا بَعْدُ !

اسلامی احکامات میں انہماق و تفہیم اور سوجھ بوجھ پیدا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جس شخص کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

« سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ »

[صحیح بخاری، کتاب العلم: باب من یرد اللہ بہ خیرًا یفقهہ فی الدین (۷۱)]

”میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے: ”جس آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر و بھلائی کا ارادہ فرما لیتا ہے اسے دین کا فہم عطا کرتا ہے۔“

دین اسلام میں تمام اعتقادات و معاملات داخل ہیں، جس شخص کو عقائد اسلامیہ اور معاملات دینیہ کی تفہیم حاصل ہو جائے تو اسے خیر و برکت کی بلندیاں مل گئیں۔

اہل حدیث خوش نصیب افراد ہیں جن کے تمام مسائل کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ ان کے اصول و فروع اور قواعد و ضوابط کی اساس و بنیاد محض قرآن و حدیث پر استوار ہے۔

قرآن و حدیث اہل حدیث کے ضمیر کی آواز، دل کی دھڑکن اور روح کی غذا ہے۔ ہر صبح شام اور لیل و نہار نے بے شمار انقلابات اور تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹا لیکن کتاب و سنت کی ضیاءوں اور تابانیوں میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اس کے دلائل و براہین آج بھی اسی طرح چمک دمک رہے ہیں جیسا کہ چودہ سو سال پہلے تھے۔ لیکن بعض افراد ایسے بھی اس کربا رض پر موجود ہیں جنہوں نے کتاب و سنت کے آفتاب و ماہتاب کے مقابل اقوال الرجال کو پسند کیا اور امام الانبیاء، امام اعظم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت پر اپنے امام کے قول کو مقدم کیا اور اسلام کی حقیقی تصویر کو نمایاں کرنے کی بجائے مسخ کیا اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات کو تاویلات فاسدہ اور تاویل کاسدہ کے ذریعے رد کیا۔ انہی مقلدین پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف حنفی عالم اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

”اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے تو ان کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا بلکہ اول قلب میں استسکار پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے، خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری قوی دلیل اس کے محارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بجز قیاس کے کچھ بھی

نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر صحیح و صریح حدیث پر عمل کر لیں۔“ [تذکرۃ الرشید (۱۳۱/۱)]

تھانوی صاحب کے اس قول کی صداقت پر کئی ایک دلائل موجود ہیں کہ مقلدین اپنے امام کے قول کے خلاف صحیح حدیث پا کر خوش نہیں ہوتے بلکہ اس صحیح حدیث کا یا تو انکار کر دیتے ہیں یا پھر اس کی بعید از عقل تاویلیں کرتے ہیں۔ بعض تاویلات اس قدر فاسدہ ہوتی ہیں کہ عامۃ الناس بھی اسے سن کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُحْلِلَ وَ الْمُحْلَلَّ لَهُ» [سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح: باب المحلل والمحلل له (۱۹۳۴)، جامع ترمذی کتاب النکاح: باب ماجاء فی المحلل والمحلل له (۱۱۱۹)، ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی التحلیل (۲۰۷۶)، سنن النسائی (۳۴۴۵) مسند احمد (۳۲۳/۲)، بیہقی (۲۰۸/۱۸) مستدرک حاکم (۱۹۸/۲)]

”اللہ کے رسول ﷺ نے حلال کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے اس پر لعنت کی ہے۔“

یہ حدیث کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اس صحیح اور صریح حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حلالہ کرنے والے پر بھی اللہ کی پھنکار اور جس بے غیرت کے لیے حلالہ کیا جاتا ہے اس پر بھی اللہ کی پھنکار پڑتی ہے۔ حلالہ کسے کہتے ہیں، لغات حدیث کی معروف و مشہور کتاب ”النهاية“ میں مرقوم ہے:

”هُوَ أَنْ يُطَلِّقَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فَيَنْزَ وَجْهًا رَجُلًا آخَرَ عَلَى شَرِيْطَةٍ إِنْ يُطَلِّقَهَا بَعْدَ وَطْئِهَا لِنَحْلٍ لِرِزْوَجِهَا الْأَوَّلِ“ [النهاية في غريب الحديث والأثر (۱/۴۱۴)]

”حلالہ یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے پھر دوسرا آدمی اس عورت کے ساتھ اس شرط پر شادی کر لے کہ وہ اسے صحبت کے بعد طلاق دے گا تاکہ یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے۔“

حلالہ کی یہی تعریف احناف کی فقہی اصطلاحات پر مشتمل کتاب القاموس الفقهی (ص: ۱۰۰)، مطبوعہ ادارة القرآن کراچی، القاموس المحیط (۳/۳۷۱) المعجم الوسيط (ص: ۱۹۳) کتاب الآثار مترجم (ص: ۳۷۹)، مطبوعہ ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی کراچی، شرح النبی للبقوی (۱۰۱/۹)، الخیص الحیمیر (۱۷۱/۳)، تحفۃ الاحوذی (۱۸۵/۲) وغیرہا کتب لغات اور شروحات حدیث میں موجود ہے۔ لیکن مقلدین نے اس حلالہ جیسے مکروہ فعل کو جائز و روا رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی اس مبارک حدیث کی یوں تاویل فاسد کی:

”وَإِنْ كَانَ بِشَرِّطِ التَّحْلِيلِ فَيُحْمَلُ أَنَّهُ أَرَادَ بِاللَّعْنِ الرَّحْمَةَ“ [کنز الدقائق کی شرح مستخلص الحقائق (ص: ۱۲۶)]

”اگر یہ حدیث نکاح بشرط تحلیل کے متعلق ہے تو اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے لعنت سے مراد رحمت لی ہے۔“

مقلدین نے رسول اللہ ﷺ کی واضح حدیث کو اپنی مرضی و منشا کے خلاف پا کر لعنت کو رحمت سے بدل دیا، یعنی حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حلالہ کرنے والا اور کروانے والا لعنت کے بجائے رحمت کے مستحق ہیں، اور اس رحمت کے حصول کی خاطر آج مفتیان شرع متین نے اپنے اپنے دارالافتاء میں جہاں حلالہ کے جواز کا فتویٰ دینا شروع کیا ہوا ہے وہاں ساتھ ہی حلالہ کا بندوبست بھی کر رکھا ہے۔ اللہ شاہد ہے ہمارے پاس ان علمائے سو کے ستائے ہوئے کئی ایسے افراد آئے جنہیں باقاعدہ حلالہ کا مشورہ دیا گیا اور کہا گیا کہ تم اپنی بیوی کو لے آؤ ہمارے مدرسہ میں حلالہ کے لیے قاری صاحب موجود ہیں۔ بہر کیف مقلدین نے کتاب و سنت کی نصوص کو بالائے طاق رکھ کر اپنی آراء و اہواء کی پوجا کی اور رسول مکرم ﷺ کے واضح فرامین کو تاویلات رکیکہ اور آرائے فاسدہ کے ذریعے پس پشت ڈال دیا اور دشمنان اسلام کو اہل اسلام کی تضحیک و تمسخر کا موقع فراہم کیا

روؤں دل کو کہ پپوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

بہر کیف ہم نے اپنے فتاویٰ میں خالص کتاب و سنت کی تعلیمات کو فروغ دیا اور لوگوں کے ارسال کردہ سوالات کو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ و حسنہ کی روشنی میں حل کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جماعت الدعوتہ سے منسلک و غیر منسلک افراد نے ملک کے طول و عرض سے بے شمار خطوط اپنے مسائل کے حل کے لیے ارسال کیے اور ان خطوط کی اتنی کثرت ہے کہ راقم ان سب کا جواب دینا تو درکنار ان کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس وقت ہمارے دارالافتاء میں دو بورڈوں کے لگ بھگ خطوط موجود ہیں۔ جہاں یہ خطوط جماعت الدعوتہ کی ملک میں مقبولیت پر دلالت کرتے ہیں وہاں اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں کہ عوام میں صحیح اور خالص دین کے حصول کی تڑپ موجود ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بے دلائل فتاویٰ سے اکتا چکے ہیں اور اپنے مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم اور صحیح احادیث کے طالب ہیں۔

ہم اللہ کے فضل و کرم سے مسائل لکھتے ہوئے پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں اور روایات کی اچھے طریقے سے جانچ پڑتال کر کے پھر انہیں اپنے فتاویٰ میں جگہ دیتے ہیں اور جن روایات کا ضعف معلوم ہو جائے انہیں معرض استدلال میں پیش نہیں کرتے کیونکہ ہمارے نزدیک ضعیف روایات احکامات شرعیہ میں حجت اور دلیل نہیں بن سکتیں۔

بعض حضرات فتویٰ دیتے وقت دقیق عبارات اور مفتیانہ زبان استعمال کرتے ہیں جو اکثر قارئین کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ حالانکہ مقصود تو عوام الناس کو دین سمجھانا ہے۔ اس لیے جتنی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی جائے گی عوام الناس کو اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ بہر کیف یہ کتاب ”احکام و مسائل“ کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، اگر اس میں کوئی حسن اور خوبی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور انعام ہے اور اگر اس میں کوئی لغزش اور خطا ہے تو وہ راقم کا قصور فہم ہے، جس پر متنبہ کرنے والے اہل علم کا مشکور ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مؤلف، رفقاء دارالاندلس اور عوام الناس کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔ خصوصاً راقم کے دادا جان اور والد محترم رحمہما کے لیے اخروی کامیابی کا زینہ بنائے کیونکہ میرے ان بزرگوں نے مجھے دینی تعلیم کے

حصول کے لیے مواقع فراہم کیے، مگر میں بھی دینی ماحول دیا اور والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کی تو بہت زیادہ خواہش تھی کہ میں دین کا علم سیکھ کر اس کی اشاعت کا کام کروں اور اسی غرض سے انہوں نے مجھے محترم القام امیر جماعۃ الدعوة حافظ محمد سعید اور محترم پروفیسر ظفر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جماعۃ الدعوة کے قائدین میں اخلاص و استقامت عطا کیے رکھے اور ہمیں دن رات دین حنیف کے لیے مخلص ہو کر کام کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

ابوالحسن مبشر احمد ربانی عفا اللہ عنہ



عقائد کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کیا انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟

سوال کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے؟

جواب خلیفہ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ ”فعیلة“ کے وزن پر ہے، جب ایک کے بعد دوسرا اس کے قائم قام ہو تو عرب کہتے ہیں ”خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا“ فلاں شخص فلاں کا خلیفہ و نائب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آدم ﷺ کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ﴾ (البقرة: ۳۰)

”اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: ”میں بلاشبہ زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

اس سے مراد پوری ذریت آدم ہے یعنی ایسی قوم پیدا کرنے والا ہوں جو ایک دوسرے کے جانشین ہوں گے نہ کہ اللہ کے جانشین ہوں گے (معاذ اللہ) امام ابن کثیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”أَيُّ قَوْمًا يَخْلُفُ بَعْضُهُمْ بَعْضٌ قَرْنَا بَعْدَ قَرْنٍ وَجِيلًا بَعْدَ جَيْلٍ“

”خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ ان کے یکے بعد دیگرے بعض کے بعض جانشین ہوں گے اور ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں یونہی صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔“

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴾ [الانعام: ۱۶۵]

”اللہ کی ہستی تو وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا اور بعض کے بعض پر درجات بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں تمہیں آزمائش کرے۔ یقیناً آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا

مہربان بھی ہے۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يُكَشِفُ السُّوءَ وَ يُجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ءِ إِلَهَ مَعَ اللَّهِ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴾ [النمل: ۲۶]

”کون ہے وہ جو بے قرار شخص کی دعا کو قبول کرے جب وہ بے قرار اس سے فریاد کرے اور اس کی مصیبت کو نائل

دے اور کون ہے جو زمین میں تمہیں خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ تم لوگ غور و فکر بہت کم کرتے ہو۔“

ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ﴾ [زخرف: ۶۰]

”قرب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین میں جانشین بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔“

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الدُّنْيَا حُلُوءَةٌ حَضِرَةٌ وَإِنَّ اللَّهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ» [صحیح مسلم، کتاب الرقاق: باب اکثر أهل الجنة انفقوا (۲۷۴۲)، مسند احمد (۲۲/۳)]

”بے شک دنیا بیٹھا سبزہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنانے والا ہے تاکہ وہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔“

اس حدیث کی شرح میں شیخ مسلم بن محمود السلفی فرماتے ہیں:

”أَيُّ جَاعِلِكُمْ خُلَفَاءَ مِنَ الْقُرُونِ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ فَيَنْظُرُ هَلْ تَعْلَمُونَ بِطَاعَةِ أَمِّ بِمَعْصِيَةِ وَشَهَوَاتِكُمْ“ [تعلیق علی صحیح مسلم (۵۰۱/۴)]

”یعنی وہ تمہیں پہلے لوگوں کے خلیفے بنانے والا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ تم اس کی اطاعت کرتے ہو یا اس کی نافرمانی اور اپنی خواہشات پر عمل کرتے ہو۔“

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ میں خاص آدم عليه السلام مراد نہیں ہیں بلکہ ان کی تمام اولاد مراد ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ یکے بعد دیگرے اس زمین پر حکومت و خلافت عطا کرتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَالظَّاهِرُ لَمْ يَرِدْ آدَمَ عَيْنًا إِذْ لَوْ كَذَلِكَ لِمَا حَسَنَ قَوْلَ الْمَلَائِكَةِ ﴿آتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ فَإِنَّهُمْ أَرَادُوا أَنَّ مِنْ هَذَا الْجِنْسِ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ“ (المصباح المنير فی تہذیب تفسیر ابن کثیر (ص ۴۹/۴۹))

”ظاہر بات ہے کہ صرف آدم عليه السلام کی ذات یہاں مراد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو فرشتوں کا یہ قول بہتر نہیں تھا۔“ تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے گا۔“ فرشتوں نے اس بات کا ارادہ کیا تھا کہ جنس آدم میں سے ایسے لوگ ہیں جو فساد اور خون ریزی کریں گے۔“

علامہ ابو حفص عمر بن علی المعروف ابن عادل دمشقی فرماتے ہیں:

”مفسرین نے اس بات میں دو وجہوں پر اختلاف کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو خلیفہ کیوں کہا گیا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ نے زمین سے جنوں کو نکالا اور آدم علیہ السلام کو آباد کیا تو آدم علیہ السلام ان جنوں کے خلیفہ ہو گئے جو پہلے ہو گزرے، اس لیے کہ آدم علیہ السلام ان کے بعد میں آئے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیفہ اس لیے قرار دیا:

”لَا اِنَّهُ يُخَلِّفُ اللّٰهَ فِى الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِهِ وَيُرْوٰى عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَاَبْنِ عَبَّاسٍ وَالسُّدِّىِّ وَهَذَا الرَّاىُّ مُتَاَكَّدٌ بِقَوْلِهِ تَعَالٰى : ﴿ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِى الْاَرْضِ فَاَحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ (ص ۲۶۱)

”وہ اللہ کی مخلوق کے درمیان اللہ کا حکم نافذ کرے گا اور یہ بات عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مفسر سدی سے روایت کی گئی ہے اور یہ رائے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مؤکد ہوتی ہے:

”بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے آپ لوگوں کے درمیان حق سے فیصلہ کریں گے۔“ [اللباب فی علوم الکتاب ۱/۱۰۰۰۵۰]

مفسرین کی ان توجیہات سے معلوم ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب نہیں ہے۔ اسے خلیفہ یا تو اس لیے کہا گیا کہ یکے بعد دیگرے بعض افراد بعض کے جانشین ہیں اور ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں یہ سلسلہ جاری و ساری ہے یا پھر اس لیے کہ انسان اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون لوگوں کے درمیان نافذ کرتا ہے اور اسے عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف علیہ السلام (إِنِّى جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيفَةً) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”خلیفہ سے مراد ایسی قوم ہے جو ایک دوسرے کے بعد آئے گی اور یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور نائب ہے، غلط ہے۔“ [تفسیر احسن الکلام (ص ۱۷۷)]

بعض علماء نے جو انسان کو اللہ کا نائب و خلیفہ قرار دیا ہے تو اس سے مراد اللہ کے احکامات کا نفاذ کرنے والا ہے۔ مولانا عبدالرحمان کیلانی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

”یہاں علی الاطلاق خلیفہ (نائب، قائم مقام) کا لفظ استعمال ہوا ہے، صراحتاً یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ آدم اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے یا کسی دوسری مخلوق کا۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خلیفہ چونکہ وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کے مرنے یا عدم موجودگی کی صورت میں اس کے اختیارات سنبھالتا ہے اور اللہ تو ”حی لایموت“ اور ہمہ وقت حاضر ہے، لہذا آدم اللہ کے خلیفہ نہیں تھے بلکہ جنوں کے خلیفہ تھے۔ پھر ایک ایسی روایت بھی ملتی ہے کہ انسان کی پیدائش سے پیشتر اس زمین پر جن آباد تھے جو فتنہ و فساد اور قتل و غارت کرتے رہتے تھے تو اللہ نے فرشتوں کا لشکر بھیج کر ان جنوں کو سمندروں کی طرف دھکیل دیا اور آدم علیہ السلام ان کے خلیفہ ہوئے اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خلافت یا نیابت کے لیے موت یا عدم موجودگی ضروری نہیں، بلکہ کوئی با اختیار ہستی اپنی موجودگی میں بھی کسی کو کچھ اختیارات تفویض کر کے اسے

اپنا خلیفہ یا نائب بنا سکتی ہے کہ وہ اس کی منشا کے مطابق ان اختیارات کو استعمال کرے۔ ہمارے خیال میں دوسری رائے راجح ہے کیونکہ اس کی تائید ایک آیت سے بھی ہو جاتی ہے اور دنیا میں موجود سفارتی نظام سے بھی محولہ آیت کا ترجمہ یوں ہے: ”ہم نے امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی اور انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بار عظیم کے اٹھانے سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا کیونکہ انسان تو انہی جیسا ظالم اور نادان واقع ہوا ہے۔“ (الاحزاب: ۷۲) اور تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں امانت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے فرائض و احکام کی تعمیل اور ان کے نفاذ کا بار ہے اور اس کا دوسرا نظام نظام خلافت ہے۔“ [تیسیر القرآن (۱/۳۸۹)]

مفسرین کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ انسان کے خلیفہ ہونے کا یا تو یہ مفہوم ہے کہ یہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل، اطاعت و فرماں برداری اور شرعی قواعد و ضوابط کا نفاذ کرتا ہے یا پھر یہ ایک دوسرے کے بعد اس زمین پر وارد ہوتے ہیں اور صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے اور ناتیام قیامت جاری رہے گا۔ جیسا کہ امام ابن کثیر کے حوالے سے اور کئی ایک آیات قرآنیہ کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص انسان کو اللہ کا نائب یا خلیفہ اس معنوں میں لے لے کہ اللہ تعالیٰ کے کام انسان کرتا ہے اور اس کے افعال میں نائب ہے تو یہ معنی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح فہم نصیب فرمائے اور سلف صالحین کے منج پر قائم و دائم رکھے۔ (آمین!)

ایک من گھڑت روایت کی تحقیق

سوال بعض صوفیاء یہ حدیث ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا لَا أَعْرِفُ فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَعْرِفَ فَخَلَقْتُ خَلْقًا فَعَرَفْتَهُمْ بِي فَعَرَفُونِي“ ”میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پہچانا نہیں جاتا تھا۔ میں نے پسند کیا کہ پہچانا جاؤں، سو میں نے مخلوق پیدا کی، میں نے انھیں اپنا تعارف کروایا تو انھوں نے مجھے پہچان لیا۔“ کیا یہ روایت صحیح ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ يَقُولُ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَّبِعُوا مَعْقِدَهُ مِنَ النَّارِ » [بخاری، کتاب العلم: باب إثم من كذب على النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۱۰۷)]

”جس نے مجھ پر ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔“

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بعض لوگوں نے روایتیں گھڑ کر جرم عظیم کا ارتکاب کیا اور روایات وضع کرنے والے مختلف اقسام اور مختلف اغراض پر مبنی لوگ ہیں ان میں سے بعض نام نہاد صوفی منش لوگ بھی ہیں اور یہ روایت بھی انھیں متصوفین کا شاخسانہ ہے۔ اس کے بارے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

”كَيْسَ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُعْرِفُ لَهُ سَنَدٌ صَحِيحٌ وَلَا ضَعِيفٌ“

[مجموع الفتاوى (۱۸/۱۲۲، ۲۷۶)]

”یہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں سے نہیں ہے اور اس کی صحیح یا ضعیف کوئی سند معروف نہیں۔“

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی متابعت امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بدر الدین الزرکشی نے ”الذکرۃ فی الاحادیث المشتملہ (۱۳۶) الباب الثالث فی الزہد“ الحدیث العشرون میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ نے کی ہے دیکھیں! المقاصد الحسنیۃ للسخاوی (۸۳۸) (۳۲۷)، کشف الخفاء ومزیل الالباس از اسماعیل المحلونی (۲۰۱۶) (۱۳۲/۲)، الاسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ از ملا علی قاری (۳۵۳)، احادیث القصاص (۳)، اسنی المطالب (۱۱۱۰)، تمییز الطیب من الخبیث (۱۰۴۵)، الدرر المنتثرۃ (۳۳۰)، تذکرۃ الموضوعات [

معلوم ہوا کہ یہ روایت من گھڑت ہے اور متضوفین کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہے۔ ملا علی قاری نے اس کے مفہوم کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے اور سورۃ زاریات کی آیت (۵۶) ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ میں لِيَعْبُدُونِ کا معنی لِيَعْرِفُونِ کیا ہے کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ مجھے پہچان لیں اور اس تفسیر کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے (الاسرار المرفوعۃ (۲۶۹) تحت رقم (۳۵۳) ملا علی قاری کا قول درست نہیں ہے۔ اس قول کی نسبت جو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کی گئی ہے اس کی پختہ سند کی حاجت ہے۔ پھر قرآن و سنت میں جو صفات باری تعالیٰ ہم پڑھتے ہیں یہ روایت اس کے معارض ہے، اللہ عزوجل مجہول خزانہ کیسے ہو سکتے ہیں: وہ عزت و جلال والا کیسے نہ پہچانا جائے۔ ایسی روایات وضع کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے اجزائے خاملہ اور اقوال خفیہ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرنے کے متعلق حدیث کی توثیق

سوال اللہ ہی سے مانگنے کے متعلق حدیث کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس کی استنادی حیثیت معتبر نہیں۔ مہربانی فرما کر درست موقف کی رہنمائی فرمادیں۔

جواب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« يَسْأَلُ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى يَسْأَلَهُ شَيْءٌ نَعْلِيهِ إِذَا انْقَطَعَ » [شعب الإيمان للبيهقي (۴۱/۲) (۱۱۱۶) مجمع الزوائد (۲۲۸/۱۰)، صحيح ابن حبان (۲۴۰۲)، عمل اليوم والليلة لابن السني (۳۵۴)، الكامل لابن عدي (۲۰۷/۶)، مسند بزار (۳۱۳۵)، مسند ابی يعلى (۱۳۰/۶)]

”تم میں سے ہر کوئی اپنی حاجات اپنے رب سے مانگے حتیٰ کہ جب جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔“

اس حدیث کے موصول ومرسل ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے، اس کو جعفر بن سلیمان از ثابت البنانی از نبی ﷺ بہت سے راویوں نے روایت کیا ہے، انھوں نے ثابت البنانی اور نبی ﷺ کے درمیان

اُس ﷺ کا ذکر نہیں کیا۔ یعنی امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک تو جعفر بن سلیمان کے تفرد کی وجہ سے اسے غریب کہا ہے اور دوسرے جعفر بن سلیمان کے اکثر شاگردوں نے اسے مرسل بیان کیا ہے، موصول بیان نہیں کیا۔ اس کے جوابات درج ذیل ہیں:

- ① جعفر بن سلیمان کا تفرد مضر نہیں اس لیے کہ یہ مسلم کے راویوں سے ہے۔ اسے امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام ابن حبان، امام ابو احمد اور ابن سعد وغیرہم نے ثقہ قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۳۸۰/۱)، تقریب التہذیب (ص ۵۶۱)، الکاشف (۲۹۴/۱)، تہذیب سیر أعلام النبلاء (۴۸۵/۱)، الحرح والتعديل (۴۸۱/۲)]
- ② جعفر بن سلیمان سے قطن بن نسیر ہی نے اسے موصول بیان نہیں کیا بلکہ مسند بزار میں سیار بن حاتم نے اسے موصول بیان کرنے میں قطن کی متابعت کی ہے۔ سیار بن حاتم کو علامہ بیہقی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ صالح ہے اور صالح الحدیث ہے، اس میں کچھ کمی ہے۔ کسی نے اسے ضعیف قرار نہیں دیا۔“ لیکن ازدی نے کہا: ”اس کے پاس منکر روایات ہیں۔“ [المغنی فی الضعفاء (۴۵۹/۱)]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ”یہ صدوق ہے۔“ [الکاشف (۴۷۵/۱)]

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے اپنی کتاب ”الثقات“ میں ذکر کیا ہے۔ [كتاب الثقات (۲۹۸/۸)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صدوق ہے اور خطا کر جاتا ہے۔“ [تقریب التہذیب (ص ۲۸۲/۱)]

لہذا قطن بن نسیر حسن الحدیث ہے اور سیار بن حاتم ثقہ راوی نے اسے موصول بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ حدیث صحیح ہے۔ محدثین کا قاعدہ ہے کہ جب موصول و مرسل میں جھگڑا ہو جائے تو حکم موصول ہی کا ہوتا ہے خواہ موصول بیان کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہی ہوں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یقیناً صحیح بلکہ درست بات وہی ہے کہ جس پر فقہائے اصولیین اور محققین محدثین ہیں کہ جب ایک حدیث مرفوع اور موقوف یا موصول اور مرسل روایت کی گئی ہو تو حکم مرفوع اور موصول کا لگایا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ ثقہ راوی کی زیادتی ہے۔“ [شرح مسلم للنووی (۲۵۶/۱)]

امام نووی رحمہ اللہ کے اس اصولی قاعدے سے معلوم ہوا کہ جعفر بن سلیمان کے تلامذہ میں سے قطن بن نسیر اور سیار بن حاتم نے اس حدیث کو موصول بیان کیا ہے۔ باقی تلامذہ اسے مرسل بیان کرتے ہیں تو اس حدیث پر مرسل کا نہیں بلکہ موصول کا حکم لگے گا۔ لہذا یہ حدیث صحیح ہے، اس پر کوئی غبار نہیں جب کہ اس کی تائید میں ایک اثر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

«عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَتْ سَلُوا اللَّهَ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الشُّسْعَ فَإِنَّ اللَّهَ إِنْ كَمْ يُسِّرَهُ كَمْ يَتَيْسَّرُ» [مسند ابی یعلیٰ (۴۵۶۰)، المطالب العالیة (۲۳۲/۳)، عمل اليوم والليلة لابن السنن (ص ۱۲۸/۱)،

شعب الإيمان للبيهقي (۴۲/۲)، (۱۱۱۹)، مجمع الزوائد (۲۲۹/۱۰)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو حتیٰ کہ جوئی کا تسمہ بھی، بیشک اللہ تعالیٰ اگر اس کو آسان نہ کرے تو وہ آسان نہیں ہوتا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی تمام تر ضروریات میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے دست بدعا ہو اور صرف اسی سے سوال کرے۔

عبدالنبی اور عبدالرسول نام رکھنا

سوال سورۃ نور (۳۲) میں ہے: ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾ اور سورۃ زمر (۵۳) میں ہے: ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ ان دونوں آیات میں عباد کا لفظ غلام اور خادم کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ عبادت گزار کے معنوں میں، لہذا ان آیات کی روشنی میں عبدالمصطفیٰ، عبدالرسول یا عبدالنبی وغیرہ نام رکھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے جس کے معنی عابد یعنی عبادت گزار کے بھی آتے ہیں اور خادم و غلام کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ جب عبد کی اضافت و نسبت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مطلب خادم اور غلام ہی ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ نور میں عباد کی نسبت ”کم“ ضمیر کی طرف ہے۔ لیکن نام اور تسمیہ کے محل پر عموماً یہ لفظ عبادت کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس لیے ایسے مواقع پر اس کا استعمال درست نہیں کیونکہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ کئی ایک ایسی احادیث صحیحہ ہیں جن میں اسماء کے تعیین کے وقت عبد کی اضافت اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ عَبْدُ اللَّهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ » [ابن ماجہ، کتاب الادب، باب ما

يستحب من الاسماء (۳۷۲۸)، مسلم (۲۱۳۲)]

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔“

ان دونوں ناموں میں لفظ عبد کی اضافت بالترتیب لفظ اللہ اور الرحمن کی طرف ہے اور یہ دونوں باری تعالیٰ کے نام ہیں۔ وہ اسماء جن میں عبد کی اضافت غیر اللہ کی جانب تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بدل ڈالا تھا جیسا کہ امام ابن عبد البر الاستیعاب میں لکھتے ہیں:

”عَبْدُ اللَّهِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كَانَ اسْمُهُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ عَبْدَ

الْكَعْبَةِ فَاسْمَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدُ اللَّهِ“ [الاستیعاب برہامش الاصابة

[(۲۳۴۱۲)]

”سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام دور جاہلیت میں عبد الکعبہ تھا پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام عبد اللہ رکھا۔“

اسی طرح سیدنا عبد الرحمن بن عوف کا نام زمانہ جاہلیت میں عبد عمرو تھا۔ بعض نے کہا عبد الکعبہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان

کا نام عبد الرحمن رکھ دیا۔ [الاستیعاب (۳۸۷/۲)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کا نام دور جاہلیت میں عبد شمس تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے بدل کر عبد الرحمن رکھ دیا۔ [الاصابہ (۴/۲۰۰)، الاستیعاب (۴/۲۰۷-۲۰۸)]

ابن ابی شیبہ میں حدیث ہے شرح بن ہانی بیان کرتے ہیں:

« وَفَدَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْمِهِ فَسَمِعَهُمْ يُسْمِعُونَ رَجُلًا عَبْدَ الْحَجَرِ فَقَالَ لَهُ مَا اسْمُكَ فَقَالَ عَبْدُ الْحَجَرِ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَنْتَ عَبْدُ اللَّهِ » [ابن ابی شیبہ، کتاب الادب، بابتفسیر الاسماء (۲۵۸۹۲)]

”ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے سنا کہ یہ لوگ ایک شخص کو عبد الحجر کے نام سے پکار رہے تھے تو آپ ﷺ نے اس شخص سے پوچھا: ”تیرا کیا نام ہے؟“ اس نے کہا: ”عبد الحجر۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”(آج سے) تیرا نام عبد اللہ ہے۔“

ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« تَعَسَّ عَبْدُ الدِّينَارِ وَ عَبْدِ الدِّرْهَمِ وَ عَبْدُ الْقَطِيفَةِ » [ابن ماجہ، کتاب الزهد، باب فی المکثرین (۴۱۳۵)، بخاری، کتاب الجہاد والسير، باب الحراسة فی الغزو فی سبیل اللہ (۲۸۸۶)]

”درہم و دینار اور چادر کا بندہ تباہ ہو گیا۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عبد کی اضافت اسماء میں جب غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو یہ لفظ عبادت کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے ناموں کو بدل دیا تھا کیونکہ یہ شریک نام ہیں۔ اگر انھیں شریک نہ سمجھا جائے تو پھر ان میں شرک کی بوضرور موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

” وَ مِنْهَا أَنَّهُمْ كَانُوا يُسَمُّونَ أَبْنَاءَهُمْ عَبْدَ الْعُزْزِيِّ وَ عَبْدَ شَمْسٍ وَ نَحْوَ ذَلِكَ وَ قَدْ بَيَّنْتُ فِي أَحَادِيثٍ لَا تُحْضِي أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيَّرَ أَسْمَاءَ الصَّحَابَةِ عَبْدَ الْعُزْزِيِّ وَ عَبْدَ شَمْسٍ وَ نَحْوَهُمَا إِلَى عَبْدِ اللَّهِ وَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ وَ مَا أَشْبَهَهُمَا فَهَذِهِ أَتْبَاحٌ وَ قَوْلِبٌ لِلشِّرْكِ نَهَى الشَّارِعُ عَنْهَا لِكَوْنِهَا قَوْلِبٌ لَهُ وَ اللَّهُ أَعْلَمُ “ [حجة اللہ البالغة، باب اقسام شرك (۶۳۱)]

”شُرک کی شرک کی اقسام میں سے ایک یہ تھی کہ لوگ اپنی اولاد کے نام عبد العززی اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کے ناموں کو عبد العززی اور عبد شمس سے بدل کر عبد اللہ اور عبد الرحمن وغیرہ رکھا۔ یہ شرک کے دروازے اور سانچے ہیں۔ شرع میں ان ناموں سے اسی لیے منع کیا گیا ہے کہ یہ شرک کے سانچے ہیں۔ واللہ اعلم۔“

اسی طرح حنفی علمائے کرام میں سے ملا علی قاری مکتوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں رقمطراز ہیں:

” وَ لَا يَحُوزُ عَبْدُ الْحَارِثِ وَ لَا عَبْدُ النَّبِيِّ وَ لَا عِبْرَةَ بِمَا شَاعَ فِيمَا بَيْنَ النَّاسِ “ [مرقاۃ شرح

مشکوٰۃ (۵۱۳/۱۸)، تحت جدید رقم (۴۷۵۲)]

”عبدالجارث اور عبدالنبی وغیرہ نام رکھنا جائز نہیں اور لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔“
ملا علی قاری کی اس تصریح میں یہ بات عیاں ہوگئی کہ عبدالجارث اور عبدالنبی وغیرہ نام رکھنے جائز نہیں۔ بعض حضرات کا اس آیت ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرَفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ﴾ سے یہ استدلال کرنا کہ نبی ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کہیں کہ ”اے میرے بندو!“ یہ استدلال سراسر باطل ہے اور قرآن حکیم کے خلاف ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَ وَ النّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنّٰسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۷۹]

”کسی انسان کے یہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔“

اس آیت کریمہ میں صاف فرمایا ہے کہ نبی ﷺ کے لائق نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے عبد بن جاؤ۔ اس بات کی مزید تائید رسول اللہ ﷺ کی اس بات سے ہوتی ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ عَبْدِيْ وَ اَمْتِيْ كُلُّكُمْ عَبِيْدُ اللّٰهِ وَ كُلُّ نِسَائِكُمْ اِمَاءُ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ لِيَقُوْلُ غُلَامِيْ وَ حَارَتِيْ وَ فَتَاىِ وَ فَتَاتِيْ وَ لَا يَقُوْلُ الْعَبْدُ رَبِّيْ وَ لٰكِنْ لِيَقُوْلُ سَيِّدِيْ » [مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرہا، باب حکم اطلاق لفظ العبد والامة والمولى والسيد (۲۲۴۹)]

”ہرگز تم میں کوئی شخص نہ کہے میرا بندہ اور میری لونڈی۔ سب مرد تمہارے اللہ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں بلکہ یوں کہے کہ میرا غلام اور میری لڑکی، میرا خادم اور میری خادمہ اور غلام مالک کو ”ربی“ (میرا رب) نہ کہے بلکہ مالک کو ”سیدی“ کہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو ”عبدی“ (میرا بندہ) کہے اور جس کام سے خود رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہو، کیا اس کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عبد کا لفظ غلام و خادم کے معنوں میں مستعمل ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے: « لَا يَقُوْلُ الْعَبْدُ رَبِّيْ » لیکن پھر بھی کسی کو اجازت نہیں دی کہ وہ عبدی کہے کہ کسی فرد کی نسبت عبودیت میں اپنی طرف کرے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت درست ہے۔ غیر اللہ کی طرف اس کی اضافت کر کے اسماء رکھنا جائز نہیں، یہ کم از کم شرک کی بو سے خالی نہیں۔

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ ﴾ میں لفظ ﴿ قُلْ ﴾ یعنی ”آپ ﷺ کہیں“ کا مطلب یہ ہے کہ آگے جو ﴿ يَا عِبَادِيَ ﴾ ہے اس کی نسبت فرمان خداوندی کی طرف ہے نہ کہ یہ مطلب کہ آپ ﷺ بندوں کی اضافت اپنی طرف کر رہے ہیں۔ اس کی ممانعت سورۃ آل عمران کی آیت (۷۹) جو اوپر مذکور ہوئی ہے اس میں بھی ہے اور آپ ﷺ کی مذکورہ حدیث میں بھی اور

مزاج قرآن کے بھی خلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ جو ساری زندگی غیر اللہ کی عبودیت سے منع کرتے رہے اور عبد العزیز و عبد الشمس جیسے اسماء کو بدلتے رہے تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ عباد کی اضافت اپنی طرف کر کے عبد النبی یا عبد المصطفیٰ کہتے۔ اور سورہ نور کی آیت (۳۲) میں عِبَادِ كُمْ سے مراد خادم ہی ہے جیسا کہ لفظ ”اماء“ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور اس کی توضیح مذکورہ حدیث ہی میں ہو جاتی ہے جس میں خادم کو عبد کہا گیا ہے لیکن اس کی اضافت اپنی طرف کر کے بلانے کی کسی کو اجازت نہیں دی گئی بلکہ « لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ عَبْدِي » کہہ کر ممانعت کر دی ہے۔ لہذا عبد المصطفیٰ، عبد النبی، عبد الرسول وغیرہ نام رکھنا ناروا اور ناجائز ہیں، کسی طرح بھی درست نہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟

(سوال) ہم نے سن رکھا تھا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے مگر پھر کسی نے بتایا کہ یہ عقیدہ ٹھیک نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح عقیدہ بتادیں کہ اللہ کہاں ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ کے متعلق محدثین و سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ﴾ [طہ: ۵۰]
”رحمن عرش پر مستوی ہوا۔“

مستوی ہونے کا مفہوم بلند ہونا اور مرتفع ہونا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِنَّ اللّٰهَ سَمَّ بِكِتَابًا..... فَهُوَ مَكْتُوبٌ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ » [بخاری، کتاب التوحید: باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ﴾ (۷۰۰۴)]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب لکھی ہے..... جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے۔“

لیکن اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اسی طرح وہ عرش پر مستوی ہے، ہماری عقلیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے کیونکہ وہ مکان سے پاک اور مبرا ہے البتہ اس کا علم اور اس کی قدرت ہر چیز کو محیط ہے، اس کی معیت ہر کسی کو حاصل ہے جیسا کہ یہ بات عقائد کی کتب میں واضح طور پر موجود ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا

(سوال) بعض لوگ اپنی گفتگو میں اولاد، اولیاء اور نیک بندوں کی قسم کھاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(جواب) اسلامی تعلیمات میں غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکا گیا ہے، نبی کریم ﷺ نے غیر اللہ کی قسم کو کفر و شرک قرار دیا ہے۔ سعد بن عبد اللہ فرماتے ہیں: ”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو قسم کھاتے ہوئے سنا، اس نے کہا: ”کعبہ کی قسم! تو اسے ابن

عمرؓ نے کہا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ » [ابوداؤد، کتاب الايمان والنذور: باب كراهية الحلف بالآباء
(۳۲۵)، ترمذی (۱۵۳۵)]

”جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔“

عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک قافلے میں باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللَّهَ يَنْهَاهُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ فَمَنْ كَانَ حَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللَّهِ أَوْ يَسْكُتْ » [ابوداؤد،
کتاب الايمان والنذور: باب كراهية الحلف بالآباء (۳۲۴۹)، بخاری (۶۶۴۸)، مسلم (۱۶۴۶)]

”بیشک اللہ تمہیں تمہارے باپوں کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جو شخص قسم کھانا چاہے اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔“

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی قسم کھانا حرام و شرک ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے، جو لوگ اپنی گفتگو میں دودھ پتر کی قسم، پیر کی قسم، مرشد کی قسم، سید کی قسم، ماں باپ کی قسم، محبت کی قسم وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں انھیں اپنے محبوب رسول ﷺ کی مذکورہ بالا احادیث پر سنجیدگی و متانت سے غور و خوض کرنا چاہیے اور ناجائز و حرام قسموں سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔

غیر اللہ سے مدد مانگنا

(سوال) غیر اللہ سے مدد مانگنا کیسا ہے؟ شریعت کی نظر میں اس کی قباحت کی صراحت فرمادیں۔

(جواب) اللہ تعالیٰ کے سوانہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ ایسی اشیاء کے حصول کیلئے جو مخلوق کے اختیار میں نہیں ہیں، مخلوق میں سے کسی فرد کو پکارنا شرک ہے اور پھر مردہ کو جو نہ سن سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴾

[یونس: ۱۰۶]

”اور اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو جو نہ تجھے نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر تو نے یہ کام کیا تو ظالموں میں شمار ہوگا۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی غیر اللہ کو اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لیے پکارے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اللہ کے سوانہ کوئی کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ إِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

”اگر اللہ تعالیٰ تجھ کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو اس مصیبت کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔“

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا:

« وَاعْلَمَ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَىٰ أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَّمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ »

[ترمذی، کتاب صفة القيامة: باب منه (۲۰۱۶)]

”جان لو! اگر ساری امت تجھے نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو نفع نہیں پہنچا سکتی مگر وہ جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔“

قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ ﴾

[العنكبوت: ۱۷]

”بے شک جن لوگوں کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، وہ تمہارے لیے رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے ہاں سے رزق مانگو اور اس کی عبادت کرو۔“

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ﴾

[الأحقاف: ۶۰]

”اور ایسے لوگوں سے زیادہ کون گمراہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے لوگوں کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی دعا قبول نہ کر سکیں بلکہ ان کی آواز سے بھی بے خبر ہوں اور جب سب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت سے انکار کر دیں گے۔“

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ غیر اللہ کو حاجت روائی کے لیے پکارنا ان کی عبادت ہے حالانکہ انسان صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿ أَمِنْ يُحِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءَ ﴾ [النمل: ۶۲]

”مجبور و بے بس شخص کی دعا کو قبول کرنے والا اور مشکل کو حل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے؟“

یہ چند دلائل ہیں ورنہ اس کے بیان کے لیے قرآن و سنت میں کئی ایک نصوص موجود ہیں جن کو پڑھ کر کوئی بھی ذی شعور اور صاحب عقل اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تو ایسی کھلی حقیقت ہے کہ مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف کا ذکر کیا ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر پر جا کر حاجت روائی کے لیے پکارنا درست ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ سے بڑا بزرگ دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟ لیکن حالت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی امام الانبیاء ﷺ کی قبر پر جا کر انھیں کسی حاجت کے لیے کبھی نہیں پکارا۔ اگر یہ کام جائز ہوتا تو صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کو اپنے دور میں بڑی بڑی ضرورتوں اور مصائب کا سامنا تھا، وہ ضرور اللہ کے

رسول ﷺ کی قبر پر آتے۔ بالکل اسی طرح دعا کا مسئلہ ہے۔ ان جلیل القدر صحابہ میں سے کسی نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کی قبر پر آ کر یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے لیے دعا کر دیں۔ ہاں! زندگی میں جو واقعتاً بزرگ ہو اس سے دعا کروانا درست ہے اور اس میں بھی بزرگ سے نہیں مانگا جاتا بلکہ اس سے عرض کی جاتی ہے کہ وہ اللہ سے ہماری بہتری کے لیے دعا کرے۔

میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں، روایت کی وضاحت

(سوال) آج کل مختلف مقامات پر سنیکرز لگے نظر آ رہے ہیں جن پر لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میرے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں۔“ وضاحت کریں کہ یہ کون سی روایت ہے اور اگر ہے تو کس موقع پر کہا گیا؟

(جواب) قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات کئی جگہ سمجھائی کہ ہمیں اللہ ہی کافی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾

[توبہ: ۱۲۹]

”اگر یہ سب لوگ منہ موڑ جائیں تو آپ کہہ دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں نے اس پر توکل کیا اور وہ عرش عظیم کا رب ہے۔“

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ﴾ [الطلاق: ۳]

”جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے۔“

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ﴾ [الزمر: ۳۶]

”کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں۔“

الغرض اللہ تعالیٰ پر ایمان، توکل، اسے اپنے تمام امور میں کافی سمجھنا اسلامی عقیدہ ہے، بعض لوگ اس سے منحرف ہو جاتے ہیں اور قرآن وحدیث کے دلائل میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں، جس کی ایک مثال یہ ہے جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے۔ اصل روایت یہ ہے:

”عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا، اس دوران میرے پاس کچھ مال آ گیا، میں نے سوچا کہ آج کے دن میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اگر سبقت لے لی تو سبقت لے سکتا ہوں۔ کہتے ہیں میں اپنا آدھا مال لے کر آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے کہا ”تو نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا باقی رکھا؟“ میں نے کہا اسی کی مثل اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ تھا وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے کہا: ”اے ابوبکر! تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا باقی

رکھا؟“ تو انھوں نے کہا:

« أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ »

”میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول (کی رضامندی) کو باقی رکھا۔“

میں نے سوچا میں کسی چیز میں بھی ان سے آگے کبھی نہیں نکل سکتا۔“ (ترمذی، کتاب المناقب: باب رجاء ه ﷺ ان یكون ابو بکر ممن یدعی من جمیع ابواب الجنة: (۳۶۷۵)، حاکم (۴۱۴/۱))

شارحین حدیث نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس جملے ”أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ“ کی شرح ”رَضًا هُمَا“ سے کی ہے یعنی ”اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی۔“ جیسا کہ ملا علی قاری حنفی نے مشکوٰۃ کی شرح مرقاة (۳۷۹/۱۰) اور علامہ عبدالرحمن محدث مبارکپوری نے تحفۃ الاحوزی (۱۵۴/۱۰) میں ذکر کیا ہے۔ لہذا اسے غلط رنگ دے کر بیان کرنا درست نہیں ہے۔ ہر مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور وہی کام کرنا پسند کرتا ہے جسے اللہ نے پسند کیا یا اس کے رسول ﷺ نے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ جو مقام صدیقیت پر فائز تھے، انھوں نے بھی صدقہ کرتے وقت جو سب کچھ دے دیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہی میں دیا۔ اسی طرح کہا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی چھوڑی ہے۔ واللہ اعلم!

زمانے کو برا کہنا

(سوال) ہم عام طور پر زمانے کو برا کہتے ہیں کہ زمانہ ہی ایسا برا آ گیا ہے، کیا یہ کہنا درست ہے کہ زمانہ بہت برا آ گیا ہے؟
(جواب) زمانہ جاہلیت میں جب مشرکین عرب کو کوئی دکھ، غم، شدت و بلا پہنچتی تو وہ کہتے: ”يَا خَبِيئَةَ الدَّهْرِ!“ یعنی ہائے زمانے کی بربادی! وہ ان افعال کو زمانے کی طرف منسوب کرتے اور زمانے کو برا بھلا کہتے اور گالیاں دیتے حالانکہ ان افعال کا خالق اللہ جل جلالہ ہے تو گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی۔ امام ابن جریر طبری رضی اللہ عنہ نے سورہٴ جاثیہ کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« كَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُهْلِكُنَا اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَهُوَ الَّذِي يُهْلِكُنَا يُمَيِّتُنَا وَ يُحْيِينَا فَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى فِي كِتَابِهِ: ﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ﴾» [تفسیر ابن کثیر (۱۰۹/۴)]

”اہل جاہلیت کہتے تھے کہ ہمیں رات اور دن ہلاک کرتا ہے، وہی ہمیں مارتا اور زندہ کرتا ہے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: ”انھوں نے کہا ہماری زندگی صرف اور صرف دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے، دراصل انہیں اس کی خبر نہیں یہ تو صرف انکل بچو سے کام لیتے ہیں۔“
اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ زمانے کو برا بھلا کہنا اور اپنی مشکلات اور دکھوں کو زمانے کی طرف منسوب کر کے اسے برا بھلا کہنا مشرکین عرب اور دھریہ کا کام ہے۔ دراصل زمانے کو برا بھلا کہنا اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤَذِّنُنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَ أَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الْأَمْرُ أَقْلِبُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ »

[بخاری، کتاب التفسیر: باب تفسیر سورة جاثية (٤٨٢٦)، مسلم (٢٢٤٦)، حمیدی (٤٦٨/٢)، مسند

احمد (٢٣٨/٢)، ابو داؤد (٥٢٧٤)]

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ابن آدم مجھے اذیت دیتا ہے، وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے اور میں (صاحب) زمانہ ہوں۔

میرے ہاتھ میں معاملات ہیں، میں رات اور دن کو بدلتا ہوں۔“

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ » [مسند ابی یعلیٰ (٤٥٢/١٠)]

”زمانے کو برانہ کہو یقیناً اللہ ہی زمانہ ہے (یعنی زمانے والا ہے)۔“

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ يَا ضَيْعَةَ الدَّهْرِ! فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ » [حلیۃ الأولیاء (٢٥٨/٨)]

”ہرگز کوئی یہ نہ کہے: ”ہائے زمانے کی بربادی!“ بے شک اللہ ہی زمانے والا ہے۔“

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ ”أنا الدهر“ کا معنی بیان کرتے ہیں:

” أَنَا صَاحِبُ الدَّهْرِ وَ مُدَبِّرُ الْأُمُورِ الَّتِي يُنْسَبُونَهَا إِلَى الدَّهْرِ فَمَنْ سَبَّ الدَّهْرَ عَنْ أَجْلِ أَنَّهُ فَاعِلٌ

هَذِهِ الْأُمُورِ عَادَ سَبُّهُ إِلَى رَبِّهِ الَّذِي هُوَ فَاعِلُهَا » [فتح الباری (٥٧٥/١٦)]

”میں زمانے والا اور کاموں کی تدبیر کرنے والا ہوں، جن کاموں کو یہ زمانے کی طرف منسوب کرتے ہیں (یعنی دن

رات کا نظام وغیرہ ابدی ہے خود بخود چل رہا ہے۔ یہ زمانہ ہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے) جس نے زمانے کو اس بنا پر برا

بھلا کہا کہ وہ ان امور کا بنانے والا ہے تو اس کی گالی اس رب کی طرف لوٹنے والی ہے جو ان امور کا بنانے والا ہے۔“

لہذا زمانے کو برا بھلا کہنا جیسا کہ عوام الناس میں رائج ہے کہ زمانہ برا آ گیا ہے، گیا گزرا زمانہ ہے، وقت کا ستیا ناس

وغیرہ، دراصل اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنا ہے، کیونکہ سارا نظام عالم اللہ وحدہ لا شریک لہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہی پیدا

کرنے والا اور وہی مارتے والا ہے۔ وہی مدبر الامور ہے، منتظم اور سب کی بگڑی بنانے والا سچ بخش، غوث اعظم، داتا، فیض

بخش اور دست گیر ہے۔ اس لیے ان امور اور زمانے کو برا کہنا اللہ تعالیٰ کو برا کہنا ہے جو ان کا خالق ہے۔ لہذا ایسے کلمات سے

اجتناب کرنا چاہیے۔

ایک ضمیر میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو جمع کرنا

(سوال) کیا ترمذی میں ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کے سامنے خطبہ دیا اور کہا:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

« مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَقَدْ غَوَىٰ »

”جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ ہدایت پا گیا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا۔“
تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« بَسَّسَ الْخَطِيبُ أَنْتَ قُلٌّ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ »

”تو برا خطیب ہے تو کہہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔“

نیز اس ممانعت کی وجہ کیا ہے؟

(جواب) یہ حدیث کئی ایک کتب احادیث [صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة: ۸۷۰۔

نسائی، کتاب النکاح، باب ما يكره من الخطبة: ۳۲۸۱۔ ابوداؤد، کتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على

فوس: ۱۰۹۹۔ کتاب الأدب: ۴۹۸۱۔ مسند احمد: ۴/۲۵۶۔ بیہقی: ۲۱۶/۳، ۸۶/۱۔ مستدرک حاکم:

۲۸۹/۱] میں مطول و مختصر مروی ہے۔ ترمذی شریف میں مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ اس روایت میں جو ”مَنْ يَعْصِهِمَا فَقَدْ

غَوَىٰ“ (جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوا) کے الفاظ پر آپ ﷺ نے کہنے والے کو جو کہا کہ ”تو برا خطیب ہے

اس کی شارحین حدیث کئی وجوہات بیان کرتے ہیں بعض نے کہا کہ اس لیے آپ نے اس پر ناراضی کا اظہار کیا کہ اس نے اللہ

اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

نے ہمیں خطبہ سکھایا، اس میں مذکور ہے:

« مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَإِنَّهُ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ » [ابوداؤد، کتاب

النکاح: باب فی خطبة النکاح، (۲۱۱۹)]

اسی طرح قرآن کریم میں بھی ہے:

﴿ إِنْ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ [الأحزاب: ۵۶]

اس آیت میں ”يُصَلُّونَ“ کی ضمیر میں اللہ اور ملائکہ کو جمع کیا گیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”درست بات یہی ہے کہ منع اس لیے کیا گیا ہے کہ خطبوں کی شان یہ ہے کہ ان میں تفصیل

اور وضاحت ہو اور اشارات و رموز سے اجتناب ہو، اسی لیے صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بات کرتے تو

اسے تین بار دہراتے تاکہ اسے سمجھا جاسکے۔“ (شرح النووی (۱۳۹/۶)، طبع بیروت)

مزید تفصیل کے لیے حاشیہ سیوطی علی النسائی وغیرہ ملاحظہ کریں۔

خطیب کو چاہیے کہ وہ اشارات و رموز سے کام نہ لے تاکہ سامعین کو کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ ایک ضمیر میں اللہ اور اس کے

رسول بھی شریک ہیں۔ اس لیے بات کھول کر تفصیل سے عوام الناس کے سامنے بیان کر دینی چاہیے۔

مسئلہ تقدیر

(سوال) ہمارے کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر کسی کی تقدیر ہی میں برائی لکھی ہے تو پھر اس برائی کے کرنے پر عذاب اور گناہ کیوں ملے گا؟ حالانکہ وہ تو مجبور تھا۔ اس مسئلہ کی وضاحت سے ہماری تشفی فرمادیں۔

(جواب) تقدیر کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بحث و تحیص شرعاً منع ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بحث و تکرار سے اجر کی محرومی، بد عملی اور ضلالت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

« خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَصْحَابِهِ وَهُمْ يَخْتَصِمُونَ فِي الْقَدْرِ فَكَانَتْ يُمْقَأُ فِي وَجْهِهِ حَبُّ الرُّمَانِ مِنَ الْغَضَبِ فَقَالَ بِهِذَا أُمِرْتُمْ أَوْ لِهَذَا خُلِقْتُمْ؟ تَضْرِبُونَ الْقُرْآنَ بَعْضُهُ بِبَعْضٍ بِهِذَا هَلَكْتَ الْأُمَّةُ قَبْلَكُمْ » [ابن ماجہ، باب فی القدر (۸۵)، مصنف عبدالرزاق (۲۱۶/۱۱)، (۲۰۳۶۷)، مسند احمد (۱۷۸/۲)]

”آپ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس آئے اور دیکھا کہ وہ مسئلہ تقدیر پر بحث کر رہے ہیں تو آپ ﷺ یہ دیکھ کر اس قدر غصے میں آ گئے کہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ کے چہرے پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم اس کا حکم دیے گئے ہو یا تم اس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو؟ اللہ کے قرآن کی بعض آیات کو بعض کے ساتھ ٹکراتے ہو؟ (یاد رکھو!) اسی وجہ سے تم سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئیں۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اندر کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ ہم نے خیر و شر دونوں کا راستہ دکھا دیا ہے اور انسان کو اختیار دیا ہے کہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴾ [الدھر: ۳]

”ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکر۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد: ۱۰]

”ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیے۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں اور اسے عقل و شعور عطا کر دیا ہے کہ اپنے لیے دونوں راستوں میں سے جو صحیح ہے اسے اختیار کر لے۔ اگر انسان سیدھے یعنی خیر و برکت والے راستے کو اختیار کرے گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا اور جہنم کے دردناک عذاب سے اپنے آپ کو بچالے گا اور اگر راہ راست کو ترک کر کے ضلالت و گمراہی اور شیطانی راہ پر گامزن ہوگا تو جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جو تقدیر لکھی ہے اس نے اپنے علم کی بنیاد پر لکھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ ہر شخص کے متعلق تمام معلومات رکھتا

ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ انسان دنیا میں کیسے رہے گا؟ یا کیا کرے گا؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے اس نے اپنے علم کے ذریعے سب کچھ پہلے ہی لکھ دیا ہے، کیونکہ اس کا علم کبھی غلط نہیں ہو سکتا اور تقدیر میں لکھی ہوئی اس کی تمام باتیں ویسے ہی وقوع پذیر ہوں گی جس طرح اس نے قلمبند کی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ اللہ کے کمال علم و احاطہ کلی کا ذکر ہے۔ اس میں یہ بات نہیں کہ انسان کو اس نے ان لکھی ہوئی باتوں پر مجبور کیا ہے۔

اس لیے یہ بات کہنا درست نہیں کہ زانی و شرابی، چور و ڈاکو وغیرہ جہنم میں کیوں جائیں گے؟ کیونکہ ان کے مقدر ہی میں زنا کرنا، شراب پینا، چوری کرنا اور ڈاکے وغیرہ ڈالنا لکھا ہوا تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ایک استاد جو اپنے شاگردوں کی ذہنی و علمی صلاحیتوں اور ان کے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی و عدم دلچسپی سے اچھی طرح واقف ہے، وہ اپنے علم کی بنا پر کسی ذہین و معننی طالب علم کے بارے میں ڈائری میں لکھ دے کہ یہ طالب علم اپنی کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرے گا اور کسی شریر اور کند ذہن طالب علم کے بارے میں لکھ دے کہ وہ امتحان میں ناکام ہوگا اور پھر لائق اور کند ذہن کو کلاس میں برابر محنت کروائے اور انہیں اکٹھا سمجھائے لیکن جب امتحان ہو اور ذہین طالب علم اچھے نمبر حاصل کرے اور پوزیشن حاصل کرے اور کند ذہن طالب علم ناکام ہو جائے تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لائق طالب علم اس لیے کامیاب ہوا کہ استاد نے پہلے ہی اپنی ڈائری میں اس کے متعلق لکھ دیا تھا کہ وہ اول پوزیشن حاصل کرے گا اور کند ذہن اس لیے نفل ہوا کہ اس کے متعلق استاد نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ وہ نفل و ناکام ہوگا۔ لہذا اس بے چارے کا کیا قصور اور گناہ ہے؟ یقیناً سمجھدار انسان یہ نہیں کہے گا کہ اس میں استاد کا قصور ہے۔ اس لیے کہ اس میں استاد کی غلطی نہیں کیونکہ وہ دونوں کو برابر سمجھاتا رہا کہ امتحان قریب ہے، محنت کرو وگرنہ نفل ہو جاؤ گے۔ استاد کی ہدایت کے مطابق لائق طالب علم نے محنت کی اور نالائق طالب علم اپنی بری عادات میں مشغول رہا، یوں اس نے اپنا وقت کھیل کود اور شرارتوں میں صرف کر دیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کا علم بلاشبہ پوری کائنات سے زیادہ اکمل و اتم ہے، اس سے کوئی چیز مخفی و پوشیدہ نہیں، اس نے اپنے کامل علم کی بنا پر ہر انسان کے دنیا میں آنے سے قبل ہی لکھ دیا تھا کہ یہ بد بخت ہوگا یا نیک بخت؟ جنتی ہوگا یا جہنمی؟ مگر ان سے اختیارات اور عقل و شعور سلب نہیں کرتا بلکہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے اچھے اور برے راستوں میں فرق اپنے انبیاء و رسل بھیج کر کرتا رہا ہے اور سلسلہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد انبیاء کے ورثاء صالح علماء کے ذریعے کائنات میں انہیں ایمان و اعتقاد اور اعمال صالحہ کی دعوت دیتا ہے، کفر و شرک، معصیت اور گناہ سے منع کرتا ہے، جہنم کے عذاب اور حساب کتاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے ڈراتا ہے۔ ان تمام احکامات کے باوجود جب کافر اپنے کفر اور طغیان پر اڑا رہتا ہے، فاسق اپنے فسق و فجور سے توبہ نہیں کرتا تو اس کے ان برے اعمال پر اگر اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یہ تو عین عدل و انصاف ہے اور اس کے برعکس نیک و بد اور کافر و مومن سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا عین ظلم و نا انصافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت رسول اللہ ﷺ کی مشیت سے مقدم ہے

سوال میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اللہ کے پڑے کو حضرت محمد ﷺ چھڑالیں گے جبکہ حضرت محمد ﷺ کے پڑے کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تو پوچھنا میں یہ چاہتا ہوں کہ کیا حضرت محمد ﷺ کی مرضی اللہ کی مرضی پر حاوی ہے؟

جواب یہ عقیدہ درست نہیں ہے، حدیث میں آتا ہے:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا شَاءَ اللَّهُ وَ شِئْتُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجَعَلْتَنِي لِلَّهِ عَدْلًا؟ بَلْ مَا شَاءَ اللَّهُ وَحْدَهُ»

[مسند احمد (۲۱۴/۱)، بیہقی (۲۱۷/۳)، فتح الباری (۵۴۰/۱۱)، عمل اليوم والليلة للنسائي (۹۸۸)، الأدب المفرد (۸۰۴)، ابن السنن (۶۶۷)، تاریخ بغداد (۱۰۵/۸)]

”سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے کہا: جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔“

تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے؟ بلکہ جو اللہ اکیلا چاہے۔“

یہ روایت طح عبد اللہ کی جبر سے حسن ہے۔ یہ حدیث اس طرح بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا حَلَفَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ مَا شَاءَ اللَّهُ وَ شِئْتُ وَ لَكِنْ لِيَقُلْ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ شِئْتُ»

[سلسلة الأحاديث الصحيحة (۱۳۶، ۱۳۹)، صحيح ابن ماجه، كتاب الكفارات: باب النهي ان يقال ماشاء الله و شئت (۲۰۰/۲)، (۲۱۱۷)]

”جب تم میں سے کوئی حلف اٹھائے تو یہ نہ کہے جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں لیکن یوں کہے جو اللہ چاہے پھر آپ چاہیں۔“

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ وہ اہل کتاب کے ایک آدمی سے ملا ہے اس نے کہا: ”تم اچھی قوم ہو اگر تم شرک نہ کرو، تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور محمد (ﷺ) چاہیں۔“ اس نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا وَاللَّهِ إِنْ كُنْتُ لَا أَعْرِفُهَا لَكُمْ قَوْلُوا مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ شَاءَ مُحَمَّدٌ» [سلسلة الأحاديث الصحيحة (۱۳۷)، مسند احمد (۳۹۳/۵)، عمل اليوم والليلة للنسائي (۹۸۵)]

”اللہ کی قسم! میں اس بات کو جانتا ہوں۔ یوں کہا کرو جو اللہ چاہے پھر محمد (ﷺ) چاہیں۔“

یعنی اللہ کے ساتھ محمد (ﷺ) کو شریک نہ بناؤ بلکہ اللہ کے بعد محمد (ﷺ) کا ذکر کرو، اس لیے کہ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں، سب اس کے بندے ہیں۔

اسی مفہوم کی حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ [مسند احمد (۷۲/۵)، دارمی (۲۷۰۲)]

قبیلہ جہینہ کی ایک عورت قبیلہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اس نے کہا: ”تم شرک کرتے ہو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور حصہ دار بناتے ہو، تم کہتے ہو کہ جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں اور تم کہتے ہو کہ کعبہ کی قسم۔“ تو نبی کریم ﷺ نے انھیں حکم دیا: ”جب حلف کا ارادہ کریں تو کہیں:

« وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ وَ يَقُولُ أَحَدُهُمْ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ شِئْتَ » [نسائی، کتاب الایمان: باب الحلف بالکعبۃ (۳۸۰۴)، مسند احمد (۳۷۱/۶)، مستدرک حاکم (۲۹۷/۴)، اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما نے صحیح قرار دیا ہے۔]

”رب کعبہ کی قسم اور ان میں سے ہر کوئی کہے جو اللہ چاہے اور پھر آپ چاہیں۔“

قبروں پر جانور ذبح کرنا

سوال کیا قبروں پر جانور ذبح کرنا یا نذر و نیاز پڑھانا جائز ہے؟

جواب نذر و نیاز اور تقرب کی غرض سے جانور ذبح کرنا عبادت ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ إِنْ صَلَّيْتُ وَ نُسَكِيْتُ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ بِذَلِكَ أُمِرْتُ وَ أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴾ [الأنعام: ۱۶۲، ۱۶۳]

”کہہ دیجیے! بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے بات ماننے ہوں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ أَنْحَرْ ﴾ [الکوثر: ۲]

”اپنے رب کی خاطر نماز پڑھ اور قربانی کر۔“

ایک جگہ فرمایا:

﴿ لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَ لَا دِمَائُهَا وَ لَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ ﴾ [الحج: ۳۷]

”اللہ تعالیٰ کو ان جانوروں کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا لیکن اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

ان واضح آیات سے پتا چلا کہ ہر قسم کی عبادت، قربانی، جانوروں کے ذبیحہ اور تقویٰ اللہ کے لیے ہونا چاہیے، اس میں کسی کو شریک اور حصہ دار نہیں بنانا چاہیے۔ جو شخص کسی اور ہستی کے لیے جانور ذبح کرتا ہے اس پر نبی آخر الزمان صادق و مصدوق محمد ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے:

« لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ وَ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْأَرْضِ وَ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَيْهِ وَ

لَعَنَ اللَّهُ مَنْ أُوِيَ مُحَدِّثًا» [مسند احمد (۹۵۴)، نسائی، کتاب الضحایا: باب من ذبح لغير الله عزوجل (۴۴۲۷)]

”اللہ کی لعنت ہو اس آدمی پر جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا اور اس پر بھی لعنت ہو جس نے زمین کی حدود و علامات کو چرایا اور اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے اپنے والدین پر لعنت کی اور اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے کسی بدعتی کو جگہ دی۔“

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔ [مسند احمد (۲۹۱۳)]
سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا عَقْرَ فِي الْإِسْلَامِ » [مسند احمد (۱۹۷/۳)، بیہقی (۵۷/۳)، عبد الرزاق (۲۶۹)، شرح السنن (۴۶۱/۵)، جمع الجوامع (۲۷۲/۸)]

”اسلام میں قبروں کے نزدیک ذبیحہ نہیں ہے۔“

امام عبد الرزاق رضی اللہ عنہ نے ’عقر‘ کی تشریح میں فرمایا ہے:

”سَكَنُوا يَعْقِرُونَ عِنْدَ الْقَبْرِ بَقْرَةً أَوْ شَاةً“

”مشرکین قبروں کے پاس گائے یا بکری ذبح کیا کرتے تھے۔“

امام خطابی رضی اللہ عنہ نے ابوداؤد کی شرح میں فرمایا ہے:

”اہل جاہلیت نجی آدمی کی قبر پر اونٹ ذبح کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس کی سخاوت کا بدلہ دے رہے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنی زندگی میں اونٹ ذبح کر کے مہمانوں کو کھلاتا تھا، ہم اس کی قبر کے پاس ذبح کر رہے ہیں تاکہ درندے اور پرندے کھائیں اور جس طرح اس کی زندگی میں لنگر جاری رہتا تھا مرنے کے بعد بھی جاری ہے۔“

[معالم السنن (۷۳۴/۱)]

مذکورہ بالا حدیث اور اس کی شرح سے معلوم ہوا کہ قبروں کے پاس جانور ذبح کرنا زمانہ جاہلیت میں مشرکوں کا کام تھا جو قبروں پر لنگر جاری رکھتے تھے۔ اسلام نے آکر اس کو ختم کیا ہے اور یہ درس دیا ہے کہ قبروں کے پاس جانور ذبح کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ جو لوگ قبروں پر جا کر نذر و نیاز چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے ہیں وہ اہل قبور کو مشکل کشا اور حاجت روا جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں نذرانہ دیا گیا تو ہماری حاجت پوری ہوں گی اور صاحب قبر راضی ہوگا۔ حالانکہ اصحاب القبور نہ ہماری پکار سنتے ہیں اور نہ مشکلات حل کرنے پر قادر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ۚ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَكَلِمَاتُكُمْ تَرْجَعُ إِلَى اللَّهِ قَائِمَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ يُكَفِّرُونَ بَشَرِكُمْ وَلَا يُنْفِكُ مِنْكُمْ مِثْلَ خَبِيرٍ ﴾

[الفاطر: ۱۴، ۱۳]

”اور وہ ہستیاں جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں، اگر تم انہیں پکارو تو وہ

تمہاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور خبر دینے والے کی طرح تمہیں نہیں خبر دیں گے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ جن ہستیوں کو اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے وہ کسی بھی چیز کی مالک نہیں۔ مالک و مختار تو صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے اسے ہی پکارنا چاہیے اور نذریں اور نیازیں جو اکثر عوام قبروں اور آستانوں برمانتے ہیں، حرام قرار دی گئی ہیں۔ علامہ ابن کحیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اکثر لوگ جو نذر ماننے ہیں اور مشاہدے میں ہے کہ وہ کسی غائب انسان کے لیے ہوتی ہے یا مریض کے لیے یا کسی دوسری ضروری حاجت کے لیے۔ بعض لوگ نیک لوگوں کی قبروں پر آکر اس کا غلاف سر پر رکھ کر کہتے ہیں اے میرے فلاں آقا! اگر میرا غائب ہونے والا ساتھی واپس کر دیا گیا یا میرا مریض شفا یاب ہو گیا یا میری حاجت پوری کر دی گئی تو تیرے لیے اتنا سونا یا اتنی چاندی یا اتنا نلہ یا اس طرح کی پانی کی سبیل یا شمع جلاؤں گا یا اتنا تیل ڈالوں گا۔ یہ نذر بالا جماع باطل و حرام ہے، اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

- ① یہ نذر مخلوق کی ہے اور مخلوق کے لیے نذر ماننا جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہوتی۔
- ② جس کے لیے نذر مانی جا رہی ہے وہ مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔
- ③ اگر نذر ماننے والے نے یہ یقین کیا کہ میت اللہ کے سوا متصرف الامور ہے تو اس کا یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے۔“

[البحر الرائق (۲/۲۹۸)]

یہی بات فتاویٰ شامی (۱۲۸/۲) اور فتاویٰ عالمگیری (۲۱۶/۱) میں بھی موجود ہے۔
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً وَ قَصَدَ بِذَبْحِهَا التَّقَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَ ذَبِيحَتَهُ ذَبِيحَةً مُرْتَدًّا“ [فتاویٰ عزیزی اردو (ص ۵۳۷)]

”علمائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی ذبیحہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے کیا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہوگا۔“

فقہ حنفی کے حوالہ جات سے بھی معلوم ہوا کہ اہل قبور کے لیے نذر و نیاز ماننا بالا جماع حرام و باطل ہے اور ان کے متعلق تصرف کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ کئی لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو بزرگوں کے نام کی نذر دیتے ہیں۔ ان کے مزارات اور آستانوں پر حاضر ہو کر اللہ کے نام کا جانور ذبح کرتے ہیں تو یاد رہے کہ ایسے مقامات جہاں غیر اللہ کی عبادت ہوتی ہے جیسے قبروں پر سجدے کرنا، اہل قبور کو مشکلات میں نداء دینا اور پکارنا وغیرہ، وہاں اللہ کے نام کا ذبیحہ اور نذر و نیاز ماننا بھی جائز نہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے ثابت بن الضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے:

« نَذَرَ رَجُلٌ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بِبَوَانَةَ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هَلْ كَانَ فِيهَا وَتَنٌ »

مِنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ؟ قَالُوا لَا، قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيهَا عَيْدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ؟ قَالُوا لَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْفِ بِنَذْرِكَ فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ» [ابو داؤد، كتاب الأيمان والنذور: باب ما يؤمر به من وفاء النذر (۳۳۱۳)، بیہقی (۸۲۱۰)]

”ایک آدمی نے نذر مانی کہ وہ ہوانہ مقام پر اونٹ نحر کرے گا تو اس نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تو نہیں جس کی عبادت کی جاتی ہو؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس جگہ ان کے میلوں میں سے کوئی میلا تو نہیں لگتا؟“ صحابہ کرام نے عرض کیا: ”نہیں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اپنی نذر پوری کر لے اور یاد رکھو اللہ کی نافرمانی میں نذر کو پورا نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کو پورا کیا جائے گا جس کا ابن آدم مالک نہیں۔“

اس حدیث کی شرح میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس مقام پر مشرکین کا میلا لگتا ہو یا اس مقام پر ان کا کوئی بت وغیرہ نصب ہو اگرچہ اس مقام پر اب نہ میلے کا اہتمام ہوتا ہو اور نہ بت نصب ہو، ہمیں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے لیے کسی جانور کو ذبح کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ مشرکین کا کسی جگہ میلا لگانا یا کسی مقام پر ان کا غیر اللہ کی عبادت کرنا خالص اللہ کے لیے ذبح کرنا اور نذر پوری کرنے کے لیے مانع اور رکاوٹ ہے۔“ [ہدایۃ المستفید (۴۵۵۱)]

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایسے مقامات جہاں اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت ہوتی ہو، عرس میلے لگتے ہوں، وہاں اللہ کے نام کی نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھانا اور بکرے چھترے ذبح کرنا حرام ہیں، اس سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔

قبروں پر اعمال پیش ہونا

(سوال) مسند ابی داؤد طیالسی میں جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے اعمال تمہارے رشتہ داروں اور قرابت داروں پر ان کی قبروں میں پیش کیے جاتے ہیں، پس اگر نیکیاں ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر کچھ غیر صالح اعمال ہوں تو وہ کہتے ہیں: ”اے اللہ! تو انہیں توفیق دے کہ وہ تیری اطاعت والے کام کریں۔“ [مسند ابی داؤد الطیالسی (۱۹۰۳)، مسند احمد (۱۶۵۱۳)]

کیا یہ روایت صحیح ہے اور ہمارے اعمال واقعتاً ہمارے رشتہ داروں پر ان کی قبروں میں پیش کیے جاتے ہیں؟

(جواب) مذکورہ بالا روایت صحیح نہیں ہے، انتہائی کمزور ہے، اس کی سند میں صلت بن دینار راوی کو امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام عبدالرحمن بن مہدی، امام بخاری، امام جوزجانی، امام دارقطنی اور امام نسائی وغیرہم نے ضعیف و متروک قرار دیا ہے، کسی بھی محدث نے اس کی توثیق نہیں کی۔ (میزان الاعتدال: ۳۱۸) اسی طرح اس کی سند میں حسن راوی کی تدلیس بھی ہے لہذا یہ

روایت کسی طرح بھی درست نہیں کہ ہمارے تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی میلوں ٹھیلوں میں شرکت

(سوال) میلوں ٹھیلوں کی زینت بننا اسلام میں کیسا ہے؟ اور کیا ایسے مقامات پر تقسیم ہونے والی اشیاء کھانا جائز ہے؟
(جواب) اسلام میں میلوں ٹھیلوں کا کوئی تصور نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جو عرس اور میلے قائم کیے جاتے ہیں ان کی قباحتیں کسی بھی ذی شعور پر مخفی نہیں، ڈھول باجے، سرنگیاں، بھنگڑے، جوئے، شراب اور انہوں وغیرہ جیسی حرام چیزوں کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، ایسی محفلوں میں شرکت کرنا گناہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ میلوں کا بندوبست کیا کرتے تھے، جسے آج کے مسلمان کہلوانے والے افراد نے کثرت سے اپنا لیا ہے اور میلوں میں اللہ کے علاوہ صاحب قبر کو سجدہ کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صریح شرک ہے۔ سجدہ صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ ایسے مقامات پر اللہ کے نام پر بھی کوئی چیز نہیں دینی چاہیے۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایک آدمی نے ہوانہ جگہ اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ”کیا وہاں ان کے میلوں میں سے کوئی میلا تو نہیں؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”نہیں۔“ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی نذر پوری کر لے، اس لیے کہ اللہ کی نافرمانی میں نذر نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز میں نذر ہے جس کا ابن آدم مالک نہیں۔“

[سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور: باب ما یؤمر بہ من وفاء النذر (۳۳۱۳)، بیہقی: (۸۳/۱۰)]
اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ میلوں کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، جہاں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت ہو وہاں اللہ کے نام پر نذر چڑھانا بھی جائز نہیں۔ جب نذر چڑھانا جائز نہیں تو اس کا کھانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ سے دعا کی:

”اے اللہ! میری قبر کو وثن (بت) نہ بنا، اللہ کی لعنت ہو ایسی اقوام پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔“
[مسند حمیدی: (۱۰۲۵)، مسند احمد (۲/۲۶۶)]
اسی طرح آپ نے فرمایا:

”میری قبر کو عید میلا گاہ نہ بننے دینا۔“ [ابو داؤد، کتاب المناسک: باب زیارة القبور: (۲۰۴۲)]
لہذا ایسے میلوں میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی وہاں سے کوئی نذر و نیاز لے کر کھائیں۔

کلمہ طیبہ

(سوال) کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کسی ایک حدیث سے ثابت ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر ہم تک یہ کیسے پہنچا؟ نیز کسی غیر مسلم آدمی کو مسلمان ہونے کے لیے انہی الفاظ میں توحید و رسالت کا اقرار کرنا ہو گا یا اس کے لیے کوئی اور الفاظ بھی

قرآن و حدیث میں موجود ہیں؟

(جواب) اسلام میں داخل ہونے کے لیے جو کلمات پڑھائے جاتے ہیں وہ دو شہادتوں کا اقرار یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی ہے اور یہ بات کتب احادیث سے ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں ابو ذر الغفاری رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ مفصل مذکور ہے۔ انھوں نے بیت اللہ میں جا کر بلند آواز سے کہا:

« أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ »

”میں تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت و گواہی دیتا ہوں۔“

[صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: باب سلام ابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ (۳۸۶۱)]

اسی طرح عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ حدیث کتب احادیث میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ » [بخاری،

کتاب الایمان: باب ”فان تابوا و اقاموا الصلوة..... الخ (۲۵)، مسلم، کتاب الایمان: باب الأمر بقتال الناس..... الخ (۲۰)]

”مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔“

اسی طرح ملاحظہ ہو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے وفد عبدالقیس والی حدیث جس میں آپ ﷺ نے ایمان باللہ وحدہ کے بارے میں فرمایا:

« شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ » [بخاری، کتاب الایمان: باب إذا الخمس من

الایمان: (۵۳)، مسلم، کتاب الایمان: باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ..... الخ (۱۷)]

کتب احادیث کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے سب سے پہلے دو باتوں کی گواہی دینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور عرف عام میں اسے کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ میں دونوں چیزیں موجود ہیں، اسلام قبول کرتے وقت لوگ انہی دو باتوں کی گواہی دیتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں بھی اپنے مقام پر ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کا ذکر موجود ہے اور اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔

استطاعت سے بڑھ کر نذر پوری کرنا

(سوال) کیا استطاعت سے باہر نذر کو پورا کرنا ضروری ہے؟

(جواب) اگر کوئی آدمی ایسی نذر مان بیٹھے جس کی اسے استطاعت نہ ہو اور وہ اسے پورا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے ایسی نذر

پوری کرنا جائز نہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى شَيْخًا يُهَادِي بَيْنَ ابْنَيْهِ فَقَالَ مَا بَالُ هَذَا؟ قَالُوا نَذَرْنَا أَنْ يَمْسِيَ قَالَ إِنَّ اللَّهَ عَنْ تَعْذِيبِ هَذَا نَفْسَهُ لَعْنَى وَأَمْرَهُ أَنْ يَرْكَبَ » [بخاری، کتاب جزاء الصيد: باب من نذر المشى إلى الكعبة (۱۸۶۵)، (۶۷۰۱)، مسلم (۱۶۴۲)، مسند احمد (۱۱۴/۳)، ابو داؤد (۳۳۰۱)، ترمذی (۱۵۳۷)، نسائی (۳۸۸۳)، ابن الجارود (۹۳۹)، بیہقی (۷۸۱/۱۰)]

”بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو اپنے دو بیٹوں کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کیا ہے؟“ انھوں نے عرض کیا: ”اس نے نذر مانی ہے کہ وہ پیدل چل کر جائے گا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس کے اپنے نفس کو عذاب دینے سے بے پروا ہے۔“ تو آپ نے اسے سوار ہونے کا حکم دیا۔“ سنن نسائی میں ہے:

« نَذَرْنَا أَنْ يَمْسِيَ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ » [نسائی، کتاب الايمان والنذور: باب ما الواجب على من أوجب على نفسه نذراً ففجر عنه؟ (۳۸۸۳)]

”اس آدمی نے بیت اللہ کی طرف پیدل چل کر جانے کی نذر مانی تھی۔“

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُسْمِهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ وَمَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ يُطِيقَهُ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ » [ابو داؤد، کتاب الايمان والنذور: باب من نذر نذراً لا يطيقه (۳۳۲۲)]

”جس نے ایسی نذر مانی جس کا نام نہ لیا اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنے کی اسے طاقت نہ ہو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔“

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا جس نے پیدل چلنے کی نذر مانی اور وہ اس کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ [ابو داؤد، کتاب الايمان والنذور: باب من رأى عليه كفارة إذا كان في معصية (۳۲۹۶)، الفتح الرباني (۱۸۸/۱۴)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جو مرد یا عورت ایسی نذر مان لے جس کو پورا کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو تو وہ قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ ایسی نذر اس کے لیے پوری کرنا جائز نہیں اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ آدمی اپنے گھر والوں کو جو درمیانہ درجہ کا کھانا کھلاتا ہے اس طرح کا کھانا دس مساکین کو کھلا دے یا ان کو کپڑا دے یا ایک غلام آزاد کر دے اور جس کو اس کی طاقت نہ ہو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ [المائدة: ۸۹]

رسول اللہ ﷺ کا سایہ

(سوال) ہمارے ہاں یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ مبارک تھا اور کچھ اس کے برعکس بات کرتے ہیں۔ براہ مہربانی صحیح بات کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(جواب) رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلسلہ انسانیت ہی سے پیدا کیا تھا اور انسان ہونے کے اعتبار سے یہ بات عیاں ہے کہ انسان کا سایہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ ظَلَلْتُمْ بِالْغَدُوِّ وَ الْاَصَالِ ﴾

[الرعد: ۱۵]

”اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی اور ناخوشی سے اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ کرتی ہیں اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَوْ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَقَّهُوا ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَايِلِ سَجْدًا لِلّٰهِ وَ هُمْ دَاخِرُونَ ﴾ [النحل: ۴۸]

”کیا انھوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں اور بائیں سے لوٹتے ہیں۔ یعنی اللہ کے آگے عاجز ہو کر سربسجود ہوتے ہیں۔“

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان میں اللہ نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے ان کا سایہ بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں لہذا آپ ﷺ کا بھی سایہ تھا۔ آپ ﷺ کے سائے کے متعلق کئی احادیث موجود ہیں:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور نماز کی حالت میں اپنا ہاتھ اچانک آگے بڑھایا مگر پھر جلد ہی پیچھے ہٹا لیا۔ ہم نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! آج آپ (ﷺ) نے خلاف معمول نماز میں ایک نیا عمل کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ میرے سامنے ابھی ابھی جنت پیش کی گئی، میں نے اس میں بہترین پھل دیکھے تو جی میں آیا کہ اس میں سے کچھ اچک لوں مگر فوراً حکم ملا کہ پیچھے ہٹ جاؤ، میں پیچھے ہٹ گیا پھر مجھ پر جہنم پیش کی گئی « حَتَّى رَأَيْتُ ظِلِّي وَ ظِلُّكُمْ » ”اس کی روشنی میں میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا“ دیکھتے ہی میں نے تمہاری طرف اشارہ کیا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ [مسند ترك حاکم (۴۰۶/۴)]

ایک حدیث میں ہے:

”سیدہ زینب اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہما ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھیں، صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک اونٹ تھا اور وہ بیمار ہو گیا جب کہ زینب رضی اللہ عنہا کے پاس دو اونٹ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم ایک زائد اونٹ صفیہ رضی اللہ عنہا کو دے دو۔“ تو انھوں نے کہا: ”میں اس یہودیہ کو کیوں دوں؟“ اس پر رسول اللہ ﷺ ناراض ہو گئے۔ تقریباً تین ماہ تک زینب کے پاس نہ گئے حتیٰ کہ زینب نے مایوس ہو کر اپنا سامان باندھ لیا۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

﴿ فَبَيْنَمَا اَنَا يَوْمًا بِنَصْفِ النَّهَارِ اِذَا اَنَا لِظِلِّي رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مُقْبِلٍ ﴾ [مسند

احمد (۱۳۲/۶)، طبقات الكبرى (۱۲۷/۸)، مجمع الزوائد (۳۲۳/۴)]

”اچانک دیکھتی ہوں کہ دوپہر کے وقت نبی کریم ﷺ کا سایہ آ رہا ہے۔“

عقلی طور پر بھی معلوم ہوتا ہے کہ سایہ مرئیہ فقط اس جسم کا ہوتا ہے جو ٹھوس ہو اور سورج کی شعاعوں کو آگے گزرنے نہ دے۔ لیکن اگر وہ جسم اتنا صاف اور شفاف ہو کہ وہ سورج کی شعاعوں کو روک ہی نہیں سکتا تو اس کا سایہ بلاشبہ نظر نہیں آتا۔ مثلاً صاف اور شفاف شیشہ اگر دھوپ میں لایا جائے تو اس کا سایہ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس میں شعاعوں کو روکنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، بخلاف اس کے نبی کریم ﷺ کا جسد اطہر نہایت ٹھوس تھا، اس کی ساخت شیشے کی طرح نہیں تھی کہ جس سے سب کچھ گزر جائے۔

لا محالہ آپ ﷺ کا سایہ تھا۔ اگر جسم اطہر کا سایہ مبارک نہ تھا تو کیا جب آپ ﷺ لباس پہنتے تو آپ کے ملبوسات کا بھی سایہ نہ تھا۔ اگر وہ کپڑے اتنے لطیف تھے کہ ان کا سایہ نہ تھا تو پھر ان کے پہننے سے ستر وغیرہ کی حفاظت کیسے ممکن ہوگی؟ منکرین سایہ یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا سایہ اس لیے نہیں تھا کہ اگر کسی کا آپ ﷺ کے سایہ پر قدم آ جاتا تو آپ ﷺ کی توہین ہو جاتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ پیدا ہی نہیں کیا۔ جہاں تک پہلی بات ہے کہ آپ ﷺ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں، سراسر غلط ہے۔ نوریوں کا سایہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ جب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبد اللہ رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو ان کے اہل و عیال ان کے گرد جمع ہو گئے اور رونے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظَلُّهُ بِأَجْنِحَتَيْهَا حَتَّى رَفَعْتُمُوهُ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب الدخول علی

المیت بعد الموت (۱۲۴۴)]

”جب تک تم انھیں یہاں سے اٹھا نہیں لیتے اس وقت تک فرشتے اس پر اپنے پروں کا سایہ کیے رکھیں گے۔“ اور دوسری بات بھی خلاف واقعہ ہے کیونکہ سایہ پاؤں کے نیچے آ ہی نہیں سکتا، جب کبھی کوئی شخص سائے پر پاؤں رکھے گا تو سایہ اس کے پاؤں کے اوپر ہو جائے گا نہ کہ نیچے۔ لہذا ان عقلی اور نقلی دلائل کے خلاف یہ بے عقلی کی اور بے سند باتیں فی الحقیقت کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت

(سوال) کیا خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ممکن ہے؟

(جواب) خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ممکن ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے مجھے نیند میں دیکھا، اس نے یقیناً مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل نہیں بنا سکتا۔“ [بخاری، کتاب الجنائز: باب الدخول علی المیت بعد

الموت: (۱۲۴۴)]

اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے مجھے خواب میں دیکھا، وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔“ [بخاری، کتاب التبعیر: باب من رئی النبی فی المنام: (۲۹۹۳)]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ساتھ تعبیر کے مشہور تابعی امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت نقل فرمائی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب وہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی صورت میں دیکھے۔ فتح الباری میں ہے کہ جب کوئی شخص محمد بن سیرین سے بیان کرتا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے تو وہ فرماتے: ”تم نے جسے دیکھا ہے، اس کی شکل بیان کرو۔“ اگر وہ ایسی صورت بیان کرتا جسے وہ نہ پہچانتے تو فرماتے: ”تم نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا۔“

اس لیے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو ہو تو اس نے یقیناً رسول اللہ ﷺ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان آپ ﷺ کی صورت اختیار نہیں کر سکتا اور چونکہ صحابی آپ ﷺ کو پہچانتا بھی ہے، وہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ لیکن جس شخص نے آپ کو دیکھا ہی نہیں، وہ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ خود آپ ﷺ کی زندگی میں اجنبی لوگوں کو آپ ﷺ کی پہچان کے لیے بعض اوقات پوچھنا پڑتا تھا کہ آپ ہی رسول اللہ ﷺ ہیں؟

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ایک دفعہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اونٹ پر آیا، اسے مسجد میں بٹھایا، اس کا گھٹنا باندھا اور پھر کہنے لگا: ”تم میں محمد ﷺ (کون ہیں؟)“ نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، ہم نے کہا: ”یہ سفید تکیہ لگانے والے محمد ﷺ ہیں۔“ پھر اس نے آپ ﷺ سے مخاطب ہو کر کئی سوالات کیے۔“ [بخاری، کتاب العلم: باب القراءة والعرض علی المحدث (۶۳)]

سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ذر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے، فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے درمیان بیٹھے، کوئی اجنبی آتا تو پوچھنے کے بغیر معلوم نہ کر سکتا کہ آپ ﷺ ان میں سے کون ہیں؟ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ہم آپ ﷺ کے لیے بیٹھنے کی جگہ بنا دیتے ہیں تاکہ کوئی اجنبی آئے تو آپ کو پہچان لے۔ تو ہم نے آپ کے لیے مٹی کا ایک چپوڑہ بنا دیا تو آپ اس پر بیٹھے اور ہم آپ ﷺ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔“ [ابو داؤد، کتاب السنۃ: باب فی القدر (۶۹۸)]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ کیلئے ہجرت کر کے قبا پہنچے تو بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے۔ اس موقع پر انصار کے جن لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا تھا، وہ ان کو رسول اللہ ﷺ سمجھ کر سلام کرتے تھے۔ جب سایہ ہٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ پر دھوپ پڑنے لگی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کا آپ ﷺ پر سایہ کیا۔ اس وقت لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں جب آپ ﷺ کو نہ پہچاننے والے کسی دوسرے کے متعلق خیال کر سکتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو خواب میں بھی اس کا امکان ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کوئی شخص اگر آپ ﷺ کو

اس حلیہ میں دیکھے جو صحیح احادیث میں آیا ہے تو اس نے آپ ﷺ کو دیکھا ہے۔

لیکن اگر وہ کوئی اور صورت دیکھے یا کوئی ایسا شخص دیکھے جو اسے خلاف شریعت کسی کام کا حکم دے رہا ہو یا ایسا کام کر رہا ہو جو نبی کریم ﷺ کے شایان شان نہیں تو اسے رسول اللہ ﷺ کی زیارت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شیطان آپ ﷺ کی شکل نہیں بن سکتا مگر یہ بات نہیں کی کہ وہ کسی اور شکل میں آکر جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ اس دور کے شیطان مرزا دجال نے دعویٰ کیا تھا:

منم مسیح و محمد کہ مجتبیٰ باشد
میں مسیح ہوں اور محمد مجتبیٰ ہوں

خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے بہت سے وظائف اور طریقے گھڑے ہیں جن کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خلوص دل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ اگر قبولیت کے خاص اوقات میں دعا کی جائے تو امید اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے انبیاء کی زیارت بھی اللہ تعالیٰ جسے کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا

سوال کیا نبی ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنا جائز ہے؟

جواب جب اذان ہو رہی ہو تو مؤذن کے کلمات کا جواب دینا چاہیے اور مؤذن کے کلمات ”اَشْهَدُ اَنَّ.....“ کے بعد مندرجہ ذیل کلمات پڑھنے چاہیے:

« وَ اَنَا اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ حَدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا » [مسلم، کتاب الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤمن..... الخ (۳۸۶)، ابن حزيمة (۲۲۰/۱)]

اس کے علاوہ اذان ہوتے وقت کوئی اور عمل قرآن و حدیث، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔ اذان نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنتے تھے، انھیں جو تعلیم دی گئی تھی وہ احادیث میں مذکور ہے، عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا سَمِعْتُمْ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ ، [مسلم، کتاب الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤمن..... الخ (۳۸۴)، بخاری، کتاب الاذان (۶۱۱)]

”جب تم اذان سنو تو جو کلمات مؤذن کہتا ہے وہی تم بھی کہا کرو اور پھر مجھ پر درود پڑھو۔“

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ اَحَدُكُمْ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ ، ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ

مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى عَلَى الصَّلَاةِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ثُمَّ قَالَ حَتَّى عَلَى
الْفَلَاحِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ثُمَّ قَالَ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ
قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مِنْ قَلْبِهِ دَخَلَ الْجَنَّةَ [مسلم، كتاب الصلوة: باب استحباب
القول مثل قول المودن الخ (۳۸۵)]

”جب مؤذن اللہ اللہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر اللہ اکبر کہو، پھر جب وہ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو تم بھی اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو، پھر جب وہ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کہے تو تم بھی اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کہو، پھر جب وہ حَتَّى عَلٰی الصَّلٰوةِ کہے تو تم لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہو، پھر جب وہ حَتَّى عَلٰی الْفَلَاحِ کہے تو تم لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہو، پھر جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کہو اور جب وہ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو تم بھی لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو، جس نے جواب خلوص دل سے دیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔“

اس کے علاوہ کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے انھیں انگوٹھے چومنے اور آنکھیں ملنے کا حکم دیا ہو اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک صحابی سے صحیح سند سے ثابت ہے حتیٰ کہ ائمہ اربعہ سے کوئی اس کی سند پیش نہیں کر سکتا۔ اس صریح اور واضح حدیث کے ہوتے ہوئے (جس میں اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کے جواب میں صرف وہی کلمہ دہرانے کی تعلیم ہے اور اس سارے جواب پر جنت کی ضمانت ہے کہیں بھی انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملنے کا ذکر نہیں ہے) افسوس صد افسوس کہ لوگوں نے کہیں انگوٹھے چومنے، کہیں ”قرۃ عینی“ والے الفاظ کہنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ خود ساختہ حرکتیں اور خود ساختہ الفاظ ایسے ہیں جن کا دین اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اس بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اور دوسری جتنی روایات ہیں وہ سب کی سب موضوع یعنی بناوٹی اور خود ساختہ ہیں۔

چنانچہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب ”رد المحتار (۲۹۳/۱)“ میں ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”لَمْ يَصِحَّ فِي الْمَرْفُوعِ مِنْ كُلِّ هَذَا شَيْءٌ“

”اس بارے میں جتنی بھی مرفوع روایات ہیں ایک بھی صحیح سند سے ثابت نہیں۔“

علامہ شوکانی رضی اللہ عنہ نے ابن طاہر حنفی کی کتاب ”التذکرۃ“ کے حوالے سے لکھا ہے:

جس روایت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے انگوٹھا چوما، وہ روایت صحیح

نہیں ہے۔ [الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ: (۹)]

حسن بن علی ہندی تعلیقات مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

”كُلُّ مَا رُوِيَ فِي وَضْعِ الْإِبْهَامَيْنِ عَلَى الْعَيْنَيْنِ عِنْدَ سَمَاعِ الشَّهَادَةِ الْمُؤَدَّنَ لَمْ يَصِحَّ“
”مؤذن سے شہادتین کے گلے ستے وقت آنکھوں پر انگوٹھے رکھنے کے بارے میں جو کچھ روایت کیا گیا ہے اس میں سے کچھ بھی صحیح نہیں۔“

علامہ عینی حنفی نے اس سے منع فرمایا ہے، کہتے ہیں:

”يَجِبُ عَلَى السَّامِعِينَ تَرْكُ عَمَلِ غَيْرِ الْإِجَابَةِ“

”اذان سننے والے کو اذان کا جواب دینے کے علاوہ اور ہر عمل کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔“

حتیٰ کہ اہل علم نے تو ان روایات کو من گھڑت اور خود ساختہ قرار دیا ہے۔ امام ابو نعیم الاصبہانی نے کہا:

”مَا رُوِيَ فِي ذَلِكَ كُلُّهُ مَوْضُوعٌ“

”اس بارے میں جو بھی روایت کی گیا ہے وہ سب کا سب موضوع و من گھڑت ہے۔“

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے:

”كُلُّهَا مَوْضُوعَاتٌ“ [تیسیر المقال]

”یہ سب کا سب موضوع و من گھڑت ہے۔“

اور جس حدیث میں ”قرۃ عینی“ والی عبارت ہے، اس کے متعلق امام شیبانی ”تمییز الطیب من الخبیث“ میں فرماتے ہیں:

”قَالَ شَيْخُنَا وَلَا يَصِحُّ، فِي سَنَدِهِ مَجَاهِيلٌ مَعَ انْقِطَاعِهِ عَنِ الْخِضْرِ وَكُلُّ مَا رُوِيَ مِنْ هَذَا

فَلَا يَصِحُّ رَفْعُهُ الْبَتَّةَ“ [تمییز الطیب من الخبیث (۱۸۹)]

”شیخ سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ والی حدیث صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع بھی ہے اور اس کی سند میں راوی بھی

مجهول ہیں۔“

امام الانبیاء کا نام سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں کو لگانا یہ محبت نہیں ہے بلکہ محبت اس چیز کا نام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے کے لیے کائنات کی ہر چیز کو قربان کر دیا جائے۔ دیکھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی کو اپنے جسموں پر ملنا شروع کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا يَحْمِلُكُمْ عَلَى هَذَا ؟ قَالُوا حُبُّ اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ

سَرَّهُ أَنْ يُحِبَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أَوْ يُحِبَّهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَلْيَصِدُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ

إِذَا أُوتِمِنَ وَلْيُحْسِنُ جَوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ“ [شعب الایمان للبیہقی (۱۰۳۳)، ہدایۃ الرواۃ (۴۹۲۰)،

الصحیحۃ (۲۹۹۸)]

”تمہیں کسی چیز نے ایسا کرنے پر ابھارا ہے؟“ کہنے لگے: ”اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جسے یہ بات پسند ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کریں، تو وہ بات کرتے وقت سچ بولا کرے، امانت میں خیانت نہ کرے اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرے۔“ یعنی قول و فعل میں رسول اللہ ﷺ کا سچا تابع بن جائے۔

جمہرات کو مردوں کی روحوں کا گھر آنا

سوال کیا جمہرات کو مردوں کی روحوں گھروں میں آتی ہیں؟
جواب جمہرات کو فوت شدہ لوگوں کی روحوں اپنے ورثا کے گھروں میں واپس آنے کی کوئی بھی روایت ثابت نہیں۔ نہ روحوں شب براءت ہی کو واپس آتی ہیں۔ مردے قیامت کے دن ہی قبروں سے نکلیں گے۔

قبر میں میت کو نبی ﷺ کی صورت کا دکھایا جانا

سوال حدیث میں آتا ہے کہ میت سے رسول مکرم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو کیا رسول اللہ ﷺ خود بنفس نفیس قبر میں تشریف لاتے ہیں؟

جواب جب انسان اس دار فانی سے اپنا وقت مقررہ ختم کر کے قبر کی آغوش میں پہنچتا ہے تو اس سے منکر نکیر جو سوالات کرتے ہیں ان میں سے ایک سوال نبی کریم ﷺ کے متعلق بھی ہوتا ہے، کہا جاتا ہے: «مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ» ”تو اس مرد کے متعلق کیا کہتا ہے؟“ اگر آدمی ایماندار ہو تو اس کا صحیح جواب دیتا ہے اور اگر کافر ہو تو کہتا ہے: «لَا أَدْرِي» ”میں نہیں جانتا۔“ لیکن کسی صحیح حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ آپ ﷺ خود تشریف لاتے ہیں یا آپ ﷺ کی صورت وہاں پیش کی جاتی ہے جسے دیکھ کر اور اشارہ کر کے فرشتے کہتے ہوں: «مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ» ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مشکاة کی شرح مرقاۃ میں لکھا ہے:

”قِيلَ يُكْشَفُ لِمَيِّتٍ حَتَّى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ بُشْرَى عَظِيمَةٌ لِلْمُؤْمِنِ

إِنْ صَحَّ ذَلِكَ وَلَا نَعْلَمُ حَدِيثًا صَحِيحًا مَرُورًا فِي ذَلِكَ“ [مرقاۃ شرح مشکاة (۲۴۱)]

”کہا گیا ہے کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ کو دیکھتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو مؤمن کے لیے بڑی عظیم خوشخبری ہے (کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر لیتا ہے) لیکن ہم نہیں جانتے کہ کوئی صحیح حدیث اس بارے میں مروی ہے۔“

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”وَ سُئِلَ (الْحَافِظُ بْنُ حَجْرٍ) هَلْ يُكْشَفُ لَهُ (أَى لِّلْمِيتِ) حَتَّى يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجَابَ أَنَّهُ لَمْ يَرَوْ هَذَا فِي حَدِيثٍ وَ إِنَّمَا ادَّعَاهُ بَعْضُ مَنْ لَا يُحْتَجُّ بِهِ بِغَيْرِ مُسْتَنَدٍ سِوَى قَوْلِهِ هَذَا الرَّجُلِ وَ لَا حُجَّةَ فِيهِ لِأَنَّ الْإِشَارَةَ إِلَى الْحَاضِرِ فِي الدَّهْنِ“

[شرح صدور (۶۰)، مرقاة (۳۴۰/۱)]

”حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا: ”کیا میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا ہے؟“ تو انھوں نے جواب دیا: ”یہ بات کہ میت کے لیے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا ہے، کسی حدیث میں مروی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے غیر مستند باتوں سے استدلال کیا ہے جو قابل حجت نہیں سوائے اس قول ”ہذا الرجل“ کے اور اس میں اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ ہذا اسم اشارہ یہاں ذہن کے لیے ہے۔“

ہذا اسم اشارہ سے استدلال درست نہیں کیونکہ حضور دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حضور ذہنی (تصوراتی) اور دوسرا حضور شخصی، یہاں حضور ذہنی مراد ہے شخصی نہیں۔ [مرقاة المفاتیح (۳۴۰/۱)]

اس کے علاوہ قرآن مجید اور کتب احادیث میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ہذا اسم اشارہ کو بعید کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جس کی طرف ہذا کا اشارہ ہو وہ پاس ہی موجود ہو۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ فرشتے جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے کے لیے تشریف لائے تو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ انھوں نے آمد کا سبب دریافت کیا تو وہاں فرشتوں نے جواب دیا:

﴿ إِنَّا مُهْلِكُوا أَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴾ [العنکبوت: ۳۱]

”ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ یہ ظالم ہیں۔“

لوط علیہ السلام سدوم اور ابراہیم فلسطین میں تھے۔ بستی سدوم پاس موجود نہیں تھی لیکن فرشتے ”ہذہ“ کا اشارہ کر کے کہتے ہیں کیونکہ سدوم ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کے ذہن میں تھا۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ ہرقل نے بیت المقدس میں جب سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا تو کہا:

﴿ أَيُّكُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِهَذَا الرَّجُلِ ﴾ [بخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی (۷)]

”تم میں سے اس آدمی کے نسبی لحاظ سے کون زیادہ قریب ہے۔“

اسی طرح اس روایت میں یہ بھی موجود ہے: ﴿ إِنِّي سَأَلْتُ عَنْ هَذَا الرَّجُلِ ﴾ مراد یہ ہے کہ جب بیت المقدس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گفتگو ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ”ہذا“ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اور بیت المقدس مدینہ سے تقریباً (۸۱۰) میل کے سفر پر ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں ”ہذا“ اسم اشارہ حضور شخصی کے لیے نہیں بلکہ حضور ذہنی کے لیے بولا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو کے وقت وہاں موجود نہ تھے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ میں بدیل بن ورقاء مشرکین مکہ

کی طرف سے شرائط صلح نامہ طے کرنے کے لیے سفیر بن کر آیا اور گفتگو کر کے واپس مکہ پہنچا تو اس نے کہا:

« إِنَّا قَدْ جِئْنَاكَ مِنْ عِنْدِ هَذَا الرَّجُلِ » [مسند احمد (۱۸۱۶۶)]

”ہم تمہارے پاس اس آدمی سے ہو کر آئے ہیں۔“

سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سنا تو تحقیق حال کے لیے اپنے بھائی کو بھیجا اور کہا:

« اِرْكَبْ اِلَى هَذَا الْوَادِي فَاَعْلَمْ لِي عِلْمَ هَذَا الرَّجُلِ » [بخاری، کتاب المناقب: باب اسلام ابی

ذر الغفاری (۳۸۶۱)]

”تو اس کی طرف سوار ہو اور مجھے اس آدمی کے بارے میں معلومات فراہم کر۔“

اس قسم کی کئی مثالیں کتب احادیث میں موجود ہیں کہ لفظ اسم اشارہ کو بعید اور حضور ذہنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو قبر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کیا جاتا ہے اور اس میں لفظ لفظ مستعمل ہے وہ بھی حضور ذہنی

کے لیے ہے جیسا کہ اوپر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔

درود کی آواز

(سوال) دنیا میں جہاں کہیں بھی درود پڑھا جاتا ہے کیا اس کی آواز خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں جیسا کہ ایک روایت سے بھی ایسا ثابت ہوتا ہے؟

(جواب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

[الاحزاب: ۵۶]

”بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس نبی پر صلاۃ و سلام بھیجتے رہو۔“

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر صلاۃ و سلام پڑھنا چاہیے لیکن یہ بات کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ دنیا میں جہاں بھی درود پڑھا جاتا ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی آواز پہنچ جاتی ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سنتے ہیں۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے صلاۃ و سلام کے متعلق جو کتاب بنام ”جلاء الأفهام“ لکھی ہے اس میں ایک روایت حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے اس سند کے ساتھ درج کی ہے:

« قَالَ الطَّبْرَانِيُّ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ الْعَلَفِي حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرِيَمَ عَنْ خَالِدِ بْنِ يَزِيدَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي هَلَالٍ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : اَكْثَرُ مَا يَصَلُّوْنَ عَلَيَّ يَوْمَ الْحُمَةِ فَانَّهُ يَوْمَ مَشْهُودٍ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ

يُصَلِّي عَلَيَّ إِلَّا بَلَّغْنِي صَوْتُهُ حَيْثُ كَانَ قُلْنَا وَ بَعْدَ وَفَاتِكَ قَالَ وَ بَعْدَ وَفَاتِي إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيَّ
الْأَرْضَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ»

”حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جمعہ والے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو۔ یہ ایسا دن ہے کہ جس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر مجھ تک اس کی آواز پہنچ جاتی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہو۔“ ہم نے کہا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری وفات کے بعد بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔“

یہ روایت درست نہیں۔ امام عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”إِنَّ إِسْنَادَهُ لَا يَصِحُّ“ [القول البديع في الصلاة على الحبيب الشفيع (ص ۱۰۹/۱)]
”اس کی سند صحیح نہیں۔“

اس کی سند کے صحیح نہ ہونے کی دو وجوہات ہیں:

① سعید بن ابی مریم اور خالد بن یزید کے درمیان انقطاع ہے۔ یعنی سعید بن ابی مریم نے یہ حدیث خالد سے نہیں سنی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالد بن یزید ۱۳۹ھ میں فوت ہوئے۔ [تہذیب التہذیب (۱۷۸/۲)] جب کہ سعید بن ابی مریم کی ولادت ۱۳۳ھ میں ہوئی۔ [تہذیب التہذیب (۲۹۶/۲)] گویا کہ سعید خالد کی وفات کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے تو پھر یہ روایت صحیح کیسے ہو سکتی ہے؟

② دوسری علت یہ ہے کہ سعید بن ابی ہلال اور ابودرداء رضی اللہ عنہما کے درمیان بھی انقطاع ہے۔ سعید بن ابی ہلال مصر میں ۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ [تہذیب التہذیب (۳۴۲/۲)] جب کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخر میں فوت ہو چکے تھے۔ [تقريب التهذيب (ص ۵۲۱)] لہذا ۷۰ھ میں پیدا ہونے والے آدمی کی ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی اس دنیائے فانی سے جا چکے تھے۔

امام صلاح الدین الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ سعید بن ابی ہلال کی روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرسل ہے۔ [جامع التحصيل: (۲۲۲۴)] اور جابر رضی اللہ عنہ مدینہ میں ۷۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ [تقريب التهذيب (ص ۵۲۱)] تو جب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت مرسل ہے تو جابر رضی اللہ عنہ سے پہلے فوت ہو جانے والے صحابی ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ان کی روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ لہذا یہ روایت ضعیف ہے۔

علاوہ ازیں علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے القول البدیع میں طبرانی کبیر کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”أَخْرَجَهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ بِلَفْظِ أَكْثَرُوا الصَّلَاةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَإِنَّهُ يَوْمٌ مَشْهُودٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّي عَلَيَّ إِلَّا بَلَّغْتَنِي صَلَاتُهُ حَيْثُ كَانَ“

یعنی جلاء الافہام میں اس روایت کے اندر ”بَلَّغْتَنِي صَوْتُهُ“ اور القول البدیع میں ”بَلَّغْتَنِي صَلَاتُهُ“ کے الفاظ

ہیں۔ پہلی حدیث کا مطلب ہے مجھے اس کی آواز پہنچتی ہے اور دوسری کا مطلب ہے مجھے اس کا درود پہنچتا ہے۔ دوسری صورت میں مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کو درود پہنچا دیا جاتا ہے۔ بہر کیف جلاء الافہام والی روایت کہ جس میں نبی ﷺ کو درود کی آواز پہنچانے کا ذکر ہے اسنادی لحاظ سے قابل احتجاج نہیں۔

لفظ وہابی سے نفرت کیوں؟

سوال وہابی کے لفظ سے لوگوں کو متفر کیوں کیا جاتا ہے حالانکہ وہاب خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے؟

جواب سر زمین نجد و حجاز میں امام محمد بن عبدالوہاب رضی اللہ عنہ نے جب توحید خالص اور اتباع سنت کی دعوت دی اور اس کے لیے عملی جہاد کیا تو اس کی تکلیف سب سے زیادہ شرک و بدعت میں گرفتار لوگوں کو ہوئی۔ ہندوستان میں جب شاہ اسماعیل شہید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے دعوت و جہاد کا علم بلند کیا اور سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کی تو انگریز نے انہیں وہابی کے نام سے بدنام کیا تاکہ لوگ جہاد میں ان کا ساتھ نہ دیں، ورنہ فی الحقیقت وہابی نہ کوئی مذہب ہے اور نہ فرقہ۔ دراصل جہاد کو بدنام کرنے کے لیے غیر مسلموں نے ہر دور میں کوئی نہ کوئی ہتھکنڈا استعمال کیا۔ پہلے وہابی کہہ کر جہاد کو بدنام کیا جاتا تھا تو آج انہی مجاہدین کو بنیاد پرست اور دہشت گرد کہہ کر لوگوں کو جہاد سے متفر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا بڑے بھائی جتنا ادب

سوال میں نے سنا ہے اہل حدیث نبی اکرم ﷺ کو بڑے بھائی جتنا احترام دیتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

جواب یہ بات کہ وہابی لوگ حضور ﷺ کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی بڑے بھائی کی، سراسر غلط ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کو فرض سمجھتے ہیں۔ بھلا کوئی اپنے بڑے بھائی کو بھی اللہ کا رسول مانتا ہے۔ (سبحانک هذا بہتان عظیم)

قرآن سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز

سوال کچھ لوگ قرآن مجید کی بعض آیات سے عید میلاد کا جواز ثابت کرتے ہیں ان کی محنت کہاں تک درست ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

جواب نبی کریم ﷺ کی بعثت، ہجرت، تبلیغ، جہاد، امت پر شفقت اور آپ ﷺ کی زندگی کے دوسرے احوال پر مسلمان سے خوشی مطلوب ہے۔ یہ خوشی سال کے ۳۶۰ دنوں میں سے صرف ایک دن یا رات تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے میں ہر وقت اور ہر حالت میں ہونی چاہیے۔ یہ کس قدر زیادتی ہے کہ ہم مسلمان ہو کر سال میں صرف ایک دن تو خوشی اور جشن منائیں باقی

سارا سال نہ ہمیں آپ ﷺ کا قول و فعل یاد رہے، نہ زندگی میں آپ ﷺ کا اسوہ نظر آئے بلکہ ہماری زندگی کا ہر پہلو یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کی رسم و رواج کا مظہر ہو اور سال میں صرف ایک دن رسول اللہ ﷺ کے نام پر وہ بھی ان غیر مسلم قوموں کی مشابہت میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف گزرے۔ قرآن مجید کی آیت:

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ﴾ [یونس: ۵۸]

”کہہ دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوش ہو جاؤ۔“

اس میں ”فَلْيَفْرَحُوا“ سے نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی اور جشن منانے کا استدلال حقیقت میں تحریف قرآن ہے۔ کیونکہ ”فَلْيَفْرَحُوا“ کا معنی خوشی مناؤ کون سی لغت میں ہے؟ بتاؤ کس مفسر یا مترجم نے لکھا ہے کہ اس کا معنی جلوس نکالو، بھنگڑے ڈالو، موسیقی بجاؤ، بیل چھکڑے، بسیں، ٹرک، ٹرالیاں سجا کر میدان میں آؤ، گنبد خضراء کا ماحول بناؤ اور اونٹوں پر بیٹھ کر گلی گلی گھومو اور شکر کیہنتیں پڑھو۔

حضرت ابو سعید خدری، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ہلال بن سیاف، قتادہ، زید بن اسلم اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے اس فضل اور رحمت کی تفسیر اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ کی ہے جس کی تائید اس سے پہلی آیت بھی کرتی ہے۔ امام ابن جریر، امام ابن کثیر، امام بغوی، امام قرطبی، ابن عربی اور دوسرے بہت سے مفسرین نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ ائمہ کی تفاسیر میں سے کسی بھی تفسیر میں نہیں ہے کہ اس رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی ولادت ہے۔ یہ واضح ہو کہ لوگوں کیلئے اصل رحمت نبی کریم ﷺ کی بعثت اور رسالت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔“

یہ آیت نص ہے کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت جہانوں کے لیے رحمت ہے۔ اور صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو کہا گیا کہ آپ مشرکین کے لیے بددعا کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنِّي لَمْ أَبْعَثْ لِعَانًا وَ إِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً » [مسلم، کتاب البر والصلة: باب النهی عن لعن الدواب

وغیرها (۲۰۹۹)]

”میں لوگوں پر لعنت کرنے کے لیے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

یہ آیت اور حدیث دونوں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ جہانوں کے لیے رحمت نبی کریم ﷺ کی بعثت ہے۔ دوسرا صحیح بخاری کی روایت سے استدلال ہے وہ بھی باطل ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام وحی کے علاوہ کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا اور یہ بخاری کی حدیث میں جس بات کا تذکرہ ہے وہ خواب ہے اور خواب بھی نبی کریم ﷺ کا نہیں جو وحی ہوتا ہے بلکہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا خواب ہے اور ان کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے۔ ایک کافر آدمی کے خواب سے دین کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ جسے بیان بھی اس نے حالت کفر ہی میں کیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے

کہ کافر کومرنے کے بعد اس کے اچھے اعمال کی جزا نہیں ملتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا ﴾ [الفرقان: ۲۳]

”اور ہم ان کے عملوں کی طرف پہنچے جو انھوں نے کیے تھے تو ہم نے اسے اڑتی ہوئی خاک بنا دیا۔“

دوسری آیت میں ہے:

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَزَنًّا ﴾ [الكهف: ۱۰۵]

”یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اپنے رب کی آیتوں اور اس کی ملاقات کا، برباد ہو گئے ان کے اعمال۔ قیامت

کے دن ہم ان کے لیے ترازو قائم نہیں کریں گے۔“

اگر ابولہب نبی کریم ﷺ کی ولادت کا سن کر خوش بھی ہوا تھا تو وہ ایک طبعی خوشی تھی کیونکہ ہر انسان اپنے اعزا کے بچے کی پیدائش پر خوش ہوتا ہے اور جو خوشی اللہ کے لیے نہ ہو اس کا کوئی ثواب نہیں ملتا اور پھر کیا وہ خوشی ہر سال مناتا تھا یا اس نے ایک ہی مرتبہ منائی تھی۔ قرآن مجید کی نصوص سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا

كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَافِرٍ ۝ وَ هُمْ يَصْطَرِحُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي

كُنَّا نَعْمَلْ أَوْ لَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَاءَكُمُ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ

نَصِيرٍ ﴾ [الفاطر: ۳۶، ۳۷]

”اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان پر فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان

میں سے ان کے عذاب میں تخفیف ہی کی جائے گی۔ ہم ہر ناشکرے کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ وہ اس میں چلائیں

گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس سے نکال ہم اچھے کام کریں گے، ان کاموں کے علاوہ جو دنیا میں کرتے

تھے۔ (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے) کیا ہم نے تمہیں عمر نہیں دی تھی کہ اس میں سوچ لو جس نے سوچنا ہے اور تمہارے

پاس ڈرانے والے بھی آئے تھے۔ اب پکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔“

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝ لَا يُفْتَرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴾

[الزخرف: ۷۴، ۷۵]

”یقیناً مجرم جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور وہ اس میں ناامید ہو کر پڑے

رہیں گے۔“

اگر واقعی کسی کے خیال میں ان دلائل سے نبی کریم ﷺ پر خوشی اور جشن منانے کا شرعی حکم ثابت ہوتا ہے تو خود امام الانبیاء اور ان کے ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی؟ اگر انھیں یہ سمجھ تھی تو انھوں نے یہ جشن کیوں نہ منایا؟ پھر اس روایت میں ہے کہ ابو لہب نے کہا: ”میں اپنی انگلی سے پانی چوستا ہوں۔“ جب کہ انگلی اس کے ہاتھوں کا جز ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ ﴾ [لہب: ۱]

”ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہو گیا۔“

قرآن مجید کی یہ آیت بھی اس کی تردید کر رہی ہے۔ اب بات ابو لہب کی درست مانتی ہے یا قرآن کی؟ فیصلہ کریں اور یاد رکھیں! نبی کریم ﷺ پر خوشی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دین اسلام میں وہ چیزیں داخل کر دیں جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے دین پہنچانے میں خیانت کی ہے۔ (نعوذ باللہ) بلکہ خوشی کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لئے ہوئے دین کو مضبوطی سے تھام لیں اور اس میں کسی قسم کا اضافہ کرنے سے پرہیز کریں اور دل و جان سے اسلام کے احکامات تسلیم کریں۔ یہی آپ ﷺ کی محبت و اطاعت و اتباع ہے۔

شبیہ کی شرعی حیثیت

(سوال) شبیہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) مذکورہ صورت میں دو تین باتیں قابل غور ہیں، اولاً نفل نماز باجماعت ادا کرنا، ثانیاً نفل نماز کا اپنی طرف سے مقررہ اہتمام اور اس پر دوام و اصرار کرنا۔ یعنی خاص وقت یا معین مہینا میں اس کا خصوصی اہتمام کرنا۔ اول الذکر بات تو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ”میں ایک رات اپنی خالہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب رسول اکرم ﷺ نماز تہجد میں مشغول ہوئے تو میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا اور آپ کی اقتداء میں نماز تہجد پڑھنے لگا حالانکہ آپ ﷺ نے میری امامت کی نیت نہیں کی تھی تو آپ ﷺ نے مجھے سر سے پکڑ کر اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔“ [صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا لم ينو الامام ان يوم ثم جاء قوم فامهم (۶۹۹)] اور اسی طرح صحیح بخاری میں محمود بن ریح رضی اللہ عنہ سے سیدنا عثمان بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ سیدنا عثمان کی فرمائش پر ان کے گھر تشریف لائے اور دو رکعت نماز باجماعت ادا فرمائی۔ [صحیح بخاری، کتاب التہجد: باب صلوة النوافل جماعة (۱۸۶)]

ان ہر دو احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بلاشک و شبہ جائز ہے۔ لیکن اس کا اعلان کرنا، مردوں اور عورتوں کو بذریعہ اشتہارات جمع کرنا، نوافل باجماعت بال دوام ادا کرنا اور رات کو چراغ گل کر کے دعائیں مانگنا ناجائز اور بدعت ہے کیونکہ مطلقاً نفل نماز باجماعت ادا کرنا تو صحیح ہے لیکن یہ ترمودع اہتمام اس مطلق جواز کو بدعت میں بدل دیتے ہیں

جیسا کہ نماز چاشت صحیح احادیث سے ثابت ہے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام ہانی رضی اللہ عنہا سے یہ نماز مروی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اس کی پابندی کی وصیت بھی فرمائی۔ [صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب صلوة الضحیٰ فی الحضرة (۱۱۷۸)]

مگر اس وصیت کے باوصف سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کو بدعت کہتے ہیں (اس کی وجہ ذیل میں آرہی ہے) جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ مجاہد کہتے ہیں:

« دَخَلْتُ أَنَا وَعُرْوَةُ ابْنُ الزُّبَيْرِ الْمَسْجِدَ فَإِذَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ جَالِسٌ إِلَى حُجْرَةِ عَائِشَةَ وَإِذَا أَنَسٌ يُصَلُّونَ فِي الْمَسْجِدِ صَلَوَةَ الضُّحَى فَسَأَلْنَاهُ عَنْ صَلَاتِهِمْ؟ فَقَالَ بِدْعَةٌ » [صحیح بخاری، کتاب العمرة: باب کم اعتمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۷۷۵)، صحیح مسلم (۱۲۵۵)]

”میں اور عروہ ابن زبیر دونوں مسجد میں داخل ہوئے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پاس بیٹھے تھے اور اس وقت کچھ لوگ مسجد میں نماز چاشت پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان کی اس نماز کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: ”یہ بدعت ہے۔“

جب کہ یہ نماز متعدد اسانید صحیحہ سے مروی ہے جیسا کہ اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ مقام غور ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بدعت کیوں کہا؟ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود میں اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا دستور نہیں تھا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

”مُرَادُهُ إِنَّ أَظْهَارَهَا وَالْإِجْتِمَاعَ لَهَا بِدْعَةٌ لَا أَنَّ صَلَوَةَ الضُّحَى بِدْعَةٌ وَقَدْ سَبَقَتِ الْمَسْئَلَةُ فِي كِتَابِ الصَّلَاةِ“

”سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مراد یہ تھی کہ نماز چاشت کو مسجد میں ظاہر کر کے پڑھنا اور اس کے لیے اجتماع و اہتمام کرنا بدعت ہے نہ کہ نماز چاشت بدعت ہے۔“

امام ابوبکر محمد بن ولید الطرطوشی لکھتے ہیں:

”مَحَلُّهُ عِنْدِي عَلَى أَحَدٍ وَجْهَيْنِ أَنَّهُمْ كَانُوا يُصَلُّونَهَا جَمَاعَةً إِمَّا أَنَّهُمْ يُصَلُّونَهَا مَعًا أَوْ فَذَاذَا عَلَى هَيْئَةِ النَّوَافِلِ فِي أَعْقَابِ الْقَرَائِضِ“ [کتاب الحوادث والبدع (۴۰)]

”ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کی اس نماز کو تو اس لیے بدعت قرار دیا کہ وہ اسے باجماعت پڑھ رہے تھے یا اس لیے کہ اکیلے اکیلے اس طرح پڑھ رہے تھے جیسے فرائض کے بعد ایک ہی وقت میں تمام نمازی سنن رواتب پڑھا کرتے ہیں۔“

اس کی دوسری مثال یہ لے لیں کہ سبحان اللہ، اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کے وظائف اپنے اپنے مقام پر بڑے فضائل کے حامل ہیں اور مفسرین نے انھیں باقیات صالحات میں شمار کیا ہے، یہ بلندی درجات اور نجات اخروی کا بہترین ذریعہ ہیں مگر اس کے باوجود جب انھیں خاص قیود اور غیر ثابت تکلفات و التزامات کے ساتھ پڑھا جائے گا تو یہی وظائف ہلاکت اور

خسارے کا باعث بن جائیں گے۔ جیسا کہ سنن داری میں بسند صحیح سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آتا ہے کہ کچھ لوگ کوفہ شہر کی مسجد میں حلقہ باندھے کٹرکریوں پر سبحان اللہ، اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ سو دفعہ پڑھ رہے تھے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا:

«فَعُدُّوا سَبَائِكُمْ فَإِنَّا ضَامِنٌ أَنْ لَا يَضْبِعَ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ وَيُحْكَمَ يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! مَا أَسْرَعَ هَلَكَتِكُمْ هُوْلَاءِ صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَافِرُونَ وَ هَذِهِ نِيَابُهُ لَمْ تَبَلْ وَ آيَتُهُ لَمْ تُكْسَرْ..... أَوْ مُفْتَتِحُو بَابِ ضَلَالَةٍ؟» [سنن دارمی المقدمة: باب فی کراهیة أخذ الرأی (۲۰۸)]

”تم اپنے گناہوں کو شمار کرو میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری نیکیاں ضائع نہیں ہوں گی۔ اے امت محمد! تم پر افسوس ہے کہ تم کتنی جلدی ہلاکت میں مبتلا ہو گئے ہو، ابھی تو تم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بکثرت موجود ہیں، ابھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے بھی پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے استعمال میں آنے والے برتن بھی نہیں ٹوٹے..... تم ایسا کر کے گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو۔“

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ عبادت اور اطاعت جس طرح شریعت میں منقول ہو، اس کو اسی انداز میں ادا کرنا چاہیے یعنی جس ہیئت و صورت میں وہ عبادت ہوئی ہے، اس کو اسی طرز سے اپنانا چاہیے۔ اپنی طرف سے اس میں پابندیاں عائد کرنا، بغیر دلیل کے مطلق کو مقید کرنا، غیر موقت کو موقت کرنا یعنی کسی وقت کے ساتھ خاص کر لینا، غیر معین کو معین بنانا بدعت بن جائے گا، جس سے اجتناب ضروری ہے، وگرنہ ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیش نظر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے چاشت کو بدعت کہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حلقہ باندھ کر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ وغیرہ کا ذکر کرنے کو بدعت اور ہلاکت قرار دیا۔ امام ابواسحاق شاطبی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

” مِنْهَا التَّرَامُ الْكَيْفِيَّاتِ بِهَيْئَةٍ الْاجْتِمَاعِ عَلَى صَوْتٍ وَاحِدٍ وَ اتِّخَاذُ وِلَادَةِ النَّبِيِّ عِيْدًا وَ مَا اَشْبَهَ ذَلِكَ وَ مِنْهَا التَّرَامُ الْعِبَادَاتِ مُعَيَّنَةً فِي اَوْقَاتٍ مُعَيَّنَةٍ لَمْ يُوْجَدْ لَهَا ذَلِكَ التَّعْيِينُ فِي الشَّرِيْعَةِ كَالْتَّرَامِ يَوْمِ نَصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَ قِيَامِ لَيْلَتِهِ “

”یہ بھی بدعات سے ہے کہ کسی نیک عمل کی ادائیگی کے لیے اجتماع کی صورت میں ایک ہی آواز کے ساتھ ذکر کا التزام کرنا، عید میلاد النبی منانا اور اس کی مثل دیگر امور اور ان بدعات میں سے یہ بھی ہے کہ عبادت کو معین کرنا، معین اوقات کے ساتھ جن کی تعیین شریعت میں نہیں پائی جاتی۔ جیسا کہ ۱۵ شعبان اور اس کی رات کو پابندی کے ساتھ عبادت بجالانے کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں۔“

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام شاطبی اور دیگر محدثین کی تصریح سے یہ بات ثابت ہوئی کہ شریعت نے جن عبادات و اطاعات کو مطلق چھوڑا ہے، ان میں اپنی طرف سے پابندیاں عائد کرنا ان کی ہیئت و کیفیت کو بدلنا ہے، ان کو اوقات کے ساتھ معین کرنا گویا دین کو بدلنا ہے اور اس کا نام تحریف ہے اور یہ گمراہی ہے۔

لہذا لوگوں کا نوافل کے لیے اہتمام، خصوصی شیعہ کرنا، اس کے لیے لوگوں کو تیار کرنا، اس پر اصرار کرنا سراسر سنت اور سبیل المؤمنین کے خلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین، فقہاء اور محدثین رضی اللہ عنہم نے اس تکلف اور اہتمام کو پسند نہیں کیا۔ لہذا اس بدعت سے اجتناب کرنا چاہیے اور عبادت کا جو طریقہ اللہ کے رسول ﷺ سے منقول ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

نبی ﷺ پر اعمال کا پیش کیا جانا

(سوال) کیا نبی ﷺ اور رشتہ داروں پر ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں؟ وضاحت کر دیں۔

(جواب) روز نامہ جنگ ۷ مئی ۱۹۹۶ء میں جو مسئلہ لکھا گیا ہے، اس کا عنوان ”اعمال پیش ہونا“ ہے۔ اس کے تحت مفتی صاحب نے داڑھی منڈوانے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ”ڈاڑھی منڈوانے والو! تمہارے اعمال روزانہ فرشتے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو حضور ﷺ کو یہ حرکات دیکھ کر کتنا دکھ ہوتا ہوگا؟“ اس پر مفتی صاحب نے کنز العمال (۳۱۸/۵) اور حلیۃ الأولیاء (۱۷۹/۶) کا حوالہ دیا پھر مزید عزیز واقارب کے سامنے اعمال پیش کرنے کی دلیل کے طور پر مسند احمد (۱۶۵/۳) اور مجمع الزوائد (۲۲۸/۲) کا حوالہ ذکر کیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ داڑھی منڈوانا اسلام میں حرام ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت اور عذاب الیم کو دعوت ہے لیکن اس ضمن میں اعمال پیش ہونے کے متعلق جو روایات پیش کی جاتی ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ [الحج: ۷۶]

”اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور سارے معاملات اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔“

یعنی کائنات میں کسی چھوٹے یا بڑے معاملے کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ (۲۱۰)، آل عمران (۱۰۹)، حدید (۵) وغیرہ میں بیان کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تُعْرَضُ الْأَعْمَالُ فِي كُلِّ يَوْمٍ حَمِيسٍ وَائْتِنِينَ فَيَغْفِرُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ لِكُلِّ امْرِئٍ لَا يُشْرِكُ بِاللَّهِ شَيْئًا إِلَّا امْرَأًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ شَحْنَاءُ فَيَقَالُ أُرْكُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا أُرْكُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا» [مسلم، کتاب البر والصلة: باب النهي عن الشحناء (۲۵۶۵)]

”ہر جمعرات اور سوموار کو تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں تو اس دن اللہ تعالیٰ ہر اس آدمی کو بخش دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا سوائے اس آدمی کے کہ جس کے درمیان اور اس کے بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے ان دونوں کو چھوڑ دیجیے یہاں تک کہ صلح کر لیں۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! شعبان کے مہینے میں جس قدر آپ ﷺ روزے رکھتے ہیں، میں نے آپ کو اس قدر کسی دوسرے مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« ذَلِكْ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَ رَمَضَانَ وَ هُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ إِلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ فَأَحِبُّ أَنْ يُرْفَعَ عَمَلِي وَ أَنَا صَائِمٌ » [نسائی، کتاب الصیام: باب صوم النبی بآبی ہو و امی (۲۳۵۹)]

”یہ رجب اور رمضان کے درمیان ایسا مہینا ہے جس سے لوگ غافل ہیں اور یہ ایسا مہینا ہے جس میں رب العالمین کی طرف اعمال کو اٹھایا جاتا ہے۔ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اس حالت میں اٹھایا جائے کہ میں روزہ دار ہوں۔“

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس دن اللہ کے ہاں اعمال پیش کیے جاتے ہیں، میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل پیش ہو تو میں روزے کی حالت میں ہوں۔“ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ » [مسلم، کتاب الایمان: باب فی قوله تعالیٰ إن الله لا ینام (۱۷۹)]

”اس کی طرف رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اٹھایا جاتا ہے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے۔“ ان تمام احادیث میں تلبیخ دیتے ہوئے محدث شہیر عبد الرحمن مبارک پوری رقمطراز ہیں:

” هَذَا لَا يُنَافِي قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُرْفَعُ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَ عَمَلِ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ الْفَرْقُ بَيْنَ الرَّفْعِ وَ الْعَرْضِ لِأَنَّ الْأَعْمَالَ تُجْمَعُ فِي الْأُسْبُوعِ وَ تُعْرَضُ فِي هَذَيْنِ الْيَوْمَيْنِ فِي حَدِيثِ مُسْلِمٍ تُعْرَضُ أَعْمَالُ النَّاسِ فِي كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْإِنْتِنِ وَ يَوْمَ الْحَمِيسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ مُؤْمِنٍ إِلَّا عَبْدًا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ أَحِبِّهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ أَنْظَرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا قَالَ ابْنُ حَجَرٍ وَ لَا يُنَافِي هَذَا رَفْعَهَا فِي شَعْبَانَ فَقَالَ إِنَّهُ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ وَ أُحِبُّ أَنْ يُرْفَعَ عَمَلِي وَ أَنَا صَائِمٌ لِحَوَازِ رَفْعِ أَعْمَالِ الْأُسْبُوعِ مُفَصَّلَةً وَ أَعْمَالِ الْعَامِ مُجْمَلَةً “ [تحفة الأحوذی: (۵۵۱۲)]

” (سوموار اور جمعرات کو اعمال کا پیش کیا جانا) نبی ﷺ کے اس حکم کے منافی نہیں جس میں ہے کہ رات کا عمل دن سے قبل اور دن کا عمل رات سے قبل اٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رفع (یعنی اٹھانے) اور عرض (یعنی پیش کیے جانے) میں فرق ہے۔ اس لیے کہ پورے ہفتے میں اعمال جمع کیے جاتے ہیں اور ان دو دنوں (سوموار اور جمعرات) میں پیش

کیے جاتے ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ ہر جمعہ میں دو مرتبہ سوموار اور جمعرات کو اعمال اللہ کے ہاں پیش کیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر مومن کو بخش دیتا ہے سوائے ان دو آدمیوں کے جن کی آپس میں عداوت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مؤخر کر دو یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ احادیث اس حدیث کے بھی خلاف نہیں جس میں ہے کہ اعمال شعبان کے مہینے میں اٹھائے جاتے ہیں اور میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل روزے کی حالت میں اٹھایا جائے۔ اس لیے کہ جائز ہے ہفتے کے اعمال تفصیلاً اٹھائے جاتے ہوں اور سال کے اعمال اجمالی طور پر شعبان میں اٹھائے جاتے ہوں۔“

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے تمام اعمال اللہ کی طرف اٹھائے اور پیش کیے جاتے ہیں جو ان کی جزا و سزا کا مالک ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی متصرف الامور نہیں جس کے سامنے ہمارے اعمال پیش کیے جاتے ہوں۔ مسند احمد کے حوالے سے جو روایت پیش کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَعْمَالَكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ أَقَارِبِكُمْ وَعَشَائِرِكُمْ مِنَ الْأَمْوَاتِ فَإِنْ كَانَ خَيْرًا اسْتَبَشِرُوا بِهِ وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذَلِكَ قَالُوا اللَّهُمَّ لَا تُمَتِّهِمْ حَتَّى تَهْدِيَهُمْ كَمَا هَدَيْتَنَا» [مسند احمد (۱۶۵/۳)]

”تمہارے اعمال تمہارے عزیز و اقارب میں سے مرنے والوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر اعمال بہتر ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر بہتر نہ ہوں تو وہ کہتے ہیں: ”اے اللہ! تو ان کو اتنی دیر تک موت نہ دے جب تک انھیں ہماری طرح ہدایت نہ دے دے۔“

یہ روایت ضعیف ہے اس لیے کہ اس کی سند میں سفیان اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما کے درمیان مجہول راوی ہے۔ مفتی صاحب نے مسند احمد کے ساتھ مجمع الزوائد کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے مجمع الزوائد کا حوالہ تو ذکر کر دیا لیکن امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت پر جرح کو ہضم کر گئے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”رَوَاهُ أَحْمَدُ وَفِيهِ رَجُلٌ لَمْ يُسَمَّ“ [مجمع الزوائد (۳۳۱، ۳۳۲)]

”اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور اس سند میں ایک آدمی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا۔“

اس کے بعد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے مطابق ابویوب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ابویوب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس باب سے پہلے والے باب میں لائے ہیں اور اس کے بعد فرمایا: ”رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ (۱۹۴/۱) وَالْأَوْسَطِ (۷۲/۱) وَفِيهِ مَسْلَمَةُ بْنُ عَلِيٍّ وَهُوَ ضَعِيفٌ“ (اس روایت کو امام طبرانی ”المعجم الكبير“ اور ”المعجم الأوسط“ میں لائے ہیں۔ اس کی سند میں مسلمہ بن علی ضعیف راوی ہے۔ مسلمہ بن علی کے متعلق امام بخاری، امام ابن حبان اور امام ابوزرعہ رازی رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ”یہ منکر الحدیث ہے۔“ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”قَالَ الْبُخَارِيُّ كُلُّ مَنْ قُلْتُ فِيهِ مُنْكَرُ الْحَدِيثِ فَلَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ“

[میزان الاعتدال (۶/۱)]

”امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”ہر وہ شخص جس کے متعلق میں یہ کہوں کہ یہ منکر الحدیث ہے اس سے روایت بیان کرنا حلال نہیں۔“

امام یعقوب بن سفیان فسوی نے اسے ضعیف الحدیث، امام جوزجانی، امام ازدی، امام نسائی، امام دارقطنی، امام برقانی نے متروک الحدیث، امام آجری نے ابو داؤد سے غیر ثقہ و غیر مامون نقل کیا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

”يُرْوَى عَنِ الْأَوْزَاعِيِّ وَالزُّبَيْدِيِّ الْمَنَّاكِيْرَ وَالْمَوْضُوعَاتِ“ [تہذیب التہذیب (۴۳۹/۵-۴۴۰)]
[۷۷۵۸]

”مسلمہ بن علی امام اوزاعی اور زبیدی سے منکر و موضوع روایات بیان کرتا تھا۔“

لہذا ثابت ہوا کہ یہ روایت انتہائی کمزور ہے۔ حلیۃ الأولیاء اور کنز العمال کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« إِنَّ أَعْمَالَ أُمَّتِي تُعْرَضُ عَلَيَّ فِي كُلِّ يَوْمٍ جُمُعَةٍ وَ أَشَدَّ غَضَبُ اللَّهِ عَلَى الزُّنَاةِ »

[حلیۃ الأولیاء (۱۷۹/۶)، کنز العمال (۳۱۸/۵)]

”ہر جمعہ کو مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، زنا کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت سخت ہوتا ہے۔“

یہ روایت بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں دو راوی مجروح ہیں۔ احمد بن عیسیٰ بن ماہان الرازی، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں جھوٹی روایتیں بیان کرتا تھا اور عجیب و غریب روایات نقل کرتا تھا۔ محدثین نے اس پر کلام کیا ہے۔ [میزان الاعتدال (۱۲۸/۱)، لسان المیزان (۲۴۴/۱)]

اس روایت کا دوسرا راوی عباد بن کثیر بصری بھی متکلم فیہ ہے۔ لہذا یہ روایت بھی قابل حجت نہیں۔

اسی مضمون کی دو اور روایتیں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے منسوب ہیں۔ ایک روایت کو امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔

[الکامل (۱۲۴/۲)]

اس کی سند میں فراس بن عبد اللہ ساقط الاعتبار ہے اور دوسری روایت میں محمد بن عبد الملک بن زیاط ابوسلمہ انصاری ہے جو من گھڑت اور جھوٹی روایتیں بیان کرتا ہے۔ جسے امام ابن طاہر نے کذاب کہا ہے۔ [سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ (۹۷۵)، (۴۰۶-۴۰۷)]

لہذا روزنامہ جنگ کے مفتی صاحب کی بیان کردہ روایات ضعیف اور ناقابل حجت ہیں جن سے استدلال کرنا کسی طرح بھی اہل علم کے لیے جائز نہیں، جب کہ قرآن مجید اور صحیح احادیث سے یہ بات بالیقین ثابت ہے کہ تمام اعمال کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو متصرف الامور، جزا و سزا کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ہستی اسباب عالم سے بالاتر ہو کر متصرف الامور نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو متصرف الامور سمجھنا اور اعمال کو اس کی طرف لوٹانے کا عقیدہ رکھنا قطعاً غلط اور باطل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کئی ایسے واقعات ہوئے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوچھل رہے اور وہ اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش نہیں کیے گئے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کا ایک خادم (یا خادمہ) تھا جو وہاں صفائی کا کام سرانجام دیتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کیے اسے دفن دیا گیا۔ چند روز بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق

دریافت کیا تو آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَفَلَا كُنْتُمْ أَذُنْتُمْوُنِي بِهِ ؟ ذُلُونِي عَلَى قَبْرِهِ » [بخاری، کتاب الصلاة: باب كنس المسجد والتقاط الحرق (٤٥٨)]

”تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟ میری اس کی قبر پر رہنمائی کرو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سارا عمل رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر مخفی رہا۔ اگر آپ ﷺ پر امت کے اعمال پیش کرنے والی بات درست ہوتی تو یہ معاملہ آپ ﷺ پر کبھی مخفی نہ رہتا۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جب حدیبیہ کے موقع پر سفیر بنا کر بھیجا گیا تو ان کا معاملہ بھی آپ ﷺ سے اوجھل رہا۔ لہذا جب آپ ﷺ کی زندگی میں آپ پر اعمال پیش نہیں کیے گئے تو آپ ﷺ کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمارے اعمال آپ ﷺ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ دیکھ کر آپ ﷺ خوش ہوتے ہیں اور اعمال سیئہ دیکھ کر آپ ﷺ دعا کرتے ہیں اور اسی طرح اعزاء و اقارب کے بارے میں ایسا عقیدہ درست نہیں ہے۔

روایت ”لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ“

سوال کیا یہ روایت ”لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ“ صحیح ہے؟

جواب اس روایت کا مطلب ہے: ”اے محمد! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو جہانوں ہی کو پیدا نہ کرتا۔“

یہ روایت موضوع ہے جیسا کہ امام صنعانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الاحادیث الموضوعة (ص ۵۲۱)، (رقم ۷۸۱)“ میں اور علامہ عجلبونی نے ”كشف الخفاء (۱۶۴/۲)“ میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة (۳۲۶)“ میں ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کا یہ کہنا کہ حدیث کا معنی صحیح ہے اور اس کی تائید کے لیے دیلمی کی روایت ”يَا مُحَمَّدُ ! لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْحِنَّةَ وَ لَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ النَّارَ“ اور ابن عساکر کی روایت ”لَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا“ پیش کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ روایات تب تائید میں پیش کی جاسکتی تھیں جب یہ پایہ ثبوت کو پہنچتیں جب کہ بلاشک و شبہ یہ روایات بھی ثابت نہیں۔ ابن عساکر والی روایت کو سیوطی اور امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوع قرار دیا ہے، اسی طرح دیلمی والی روایت کو بھی علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں تو اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی پیدائش کی حکمت بیان کی ہے:

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْحِنَّةَ وَ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ [الذاریات: ۵۶]

”جن وانس کی پیدائش کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

گویا اس مقصد کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی پیدائش کا کوئی اور مقصد نہیں بتایا۔ کہیں یہ ثابت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

یہ سب کچھ اس لیے پیدا کیا یا اس کے لیے پیدا کیا۔

پھر لطف کی بات ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اس حدیث کو چرا کر اپنی کتاب *حقیقۃ الوحی* کے صفحہ (۹۹) پر لکھا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ان الفاظ کے ساتھ مخاطب ہوا ہے: ”لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْآفَلَآكَ“ سوچئے! رب کائنات کی تخلیق کی وہ حکمت تسلیم کی جائے گی جو قرآن میں ہے یا وہ جو اس موضوع، من گھڑت اور جھوٹی روایت میں ہے؟

”نُورٌ مِنْ نُورِ اللَّهِ“ والی ایک روایت کی تحقیق

(سوال) جابر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے اس بات کی خبر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا پھر یہ نور اللہ کی قدرت سے جہاں چاہا گھومتا رہا..... الخ۔“ فرمائیں کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

(جواب) محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے رسول اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کو اسناد کے ساتھ جمع کیا اور اس بات کی مکمل کوشش کی کہ کوئی ایسی بات رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو جو آپ نے نہیں کہی۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [صحیح بخاری، کتاب العلم: باب من كذب على النبي ﷺ (۱۰۷)]

”جس نے مجھ پر جان بوجھ کو جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

اور ایک روایت میں ہے:

« مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [مسند احمد: (۶۵/۱)]

”جس نے مجھ پر وہ بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنا لے۔“

اس لیے جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف بات منسوب کر کے بیان کرتا ہے اس کے لیے سند کی شرط لگانی گئی پھر سند کی صحت کے لیے بھی کڑی شرائط کو مد نظر رکھا گیا اور جس روایت کی کوئی سند نہیں ہوتی اسے کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”الْإِسْنَادُ عِنْدِي مِنَ الدِّينِ وَ لَوْ لَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ وَ لَكِنْ إِذَا قِيلَ لَهُ مَنْ حَدَّثَكَ بَقِيَ“ [تاریخ بغداد (۱۶۶/۶)، مقدمہ صحیح مسلم (۳۲)، معرفة علوم الحدیث للحاکم: (ص ۶۱)]

”اسناد میرے نزدیک دین میں سے ہیں اور اگر اسناد نہ ہوتیں تو ہر کوئی جو چاہتا کہہ دیتا لیکن جب اسے کہا جائے تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔“

ابن مبارک رضی اللہ عنہ کے شاگرد عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے یہ بات زنادقہ اور روایات گھڑنے والوں کے ذکر کے وقت کہی۔“ امام زہری رضی اللہ عنہ نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ ضعیف و متروک راوی سے کہا:

”قَاتَلَكَ اللَّهُ يَا بْنَ أَبِي فَرَوَةَ مَا جَرَأَكَ عَلَيَّ اللَّهُ؟ لَا تَسْنُدُ حَدِيثَكَ تُحَدِّثُنَا بِأَحَادِيثٍ لَيْسَ لَهَا حَظْمٌ وَلَا أَرْمَةٌ“ [معرفة علوم الحديث للحاكم (ص ۶۷)، طبع جدید (ص ۴۲)]

”اے ابن ابی فروہ! اللہ تجھے ہلاک کرے تو اللہ تعالیٰ پر کس قدر جرأت کرنے والا ہے، تو اپنی روایت کی سند بیان نہیں کرتا، تو ہمیں ایسی روایتیں بیان کرتا ہے جن کی کیلیں اور مہاریں نہیں ہیں۔“

الغرض محدثین کے نزدیک روایت کے درست ہونے کیلئے سند کا صحیح ہونا از حد ضروری ہے۔ مذکورہ بالا روایت جابر رضی اللہ عنہ کو کئی سیرت نگاروں نے بغیر سند کے درج کر دیا ہے اور بعض نے اسے امام عبدالرزاق کی طرف منسوب کیا ہے، ہمارے پاس امام عبدالرزاق کی ”المصنف“ گیارہ ضخیم جلدوں میں اور تفسیر عبدالرزاق تین جلدوں میں مطبوعہ موجود ہے لیکن یہ روایت ان میں ہمیں نہیں ملی۔ جو شخص اس روایت کی صحت کا داعی ہے وہ محدثین رضی اللہ عنہم کے قواعد کے مطابق اس کی ایک بھی صحیح سند پیش کرے۔ آج تک کوئی شخص اس کی ایک بھی صحیح سند پیش نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی غلط بیانی، جھوٹی روایات اور عقائد فاسدہ سے محفوظ فرمائے اور سلف صالحین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور ائمہ محدثین کے نقش قدم پر چلائے۔ (آمین!)

نوری ستارے والی روایت کی تحقیق

(سوال) تحفة الصلاة الی النبی الخمار (۱۸، ۱۹) میں بروایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ بے شک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ”تمہاری عمر کتنی ہے؟“ جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی: ”اے میرے آقا! میں نہیں جانتا کہ میری عمر کتنی ہے، ہاں! یا رسول اللہ! حجاب رابع عرش پر ایک نوری ستارہ ستر ہزار سال بعد طلوع ہوتا تھا جس کو میں نے ستر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے میرے رب کی عزت و عظمت کی قسم! اے جبرائیل! وہ نوری تارہ میں تھا۔“ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کے متعلق تاریخ بخاری کا حوالہ جو مذکورہ کتاب میں دیا گیا ہے کیا یہ درست ہے؟

(جواب) رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [مسند احمد: (۱/۶۵۰)]

”جس نے مجھ پر ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔“

اس لیے ایسے الفاظ جو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کہے ہوں ان کی نسبت آپ کی طرف کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے، ہمیں امام بخاری کی تاریخ کبیر اور تاریخ صغیر سے یہ روایت نہیں ملی بلکہ آج تک اس کی کوئی صحیح سند کسی حدیث کی کتاب سے نہیں ملی،

امام عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

”الْإِسْنَادُ عِنْدِي مِنَ الدِّينِ وَلَوْ لَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ“ [مقدمہ صحیح مسلم: باب بیان أن الإسناد من الدين: (۳۲)]

”سند دین میں سے ہے اور اگر سند نہ ہوتی تو جو شخص جو چاہتا کہہ دیتا۔“
امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منہاج السنۃ (۱۱/۴) میں فرماتے ہیں:

”سند اس امت کی خصوصیات میں سے ہے..... لہذا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی صحیح سند ہو، جب کسی روایت کی کوئی سند ہی نہ ہو تو وہ کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی۔“

نبی کریم ﷺ کا مسلک

(سوال) آج کل ہم بے شمار فرقے دیکھتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ﷺ کے طریقہ پر ہیں براہ کرم رہنمائی فرمائیں کہ نبی ﷺ کا مسلک کیا تھا؟

(جواب) رسول اکرم ﷺ دین اسلام کی دعوت پیش کرنے والے سچے نبی و رسول تھے۔ آپ ہر قسم کی فرقہ بندی سے منع کرتے تھے۔ قرآن حکیم میں کئی ایک آیات اور رسول اکرم ﷺ کی کئی ایک صحیح احادیث فرقہ بندی کی ممانعت پر نص قطعی ہیں۔ اسلام اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے، افتراق و تشتمت سے منع کرتا ہے۔ شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور وہابی جیسے تمام فرقے رسول اللہ ﷺ کے بعد کی پیداوار ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ایسا سوال کرنا نادانی و حماقت ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے یہود و نصاریٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کر دیا۔ یہود کہتے تھے ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: ”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل کی گئی ہے؟ کیا تم سمجھتے نہیں۔“ پھر آگے فرمایا:

”ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ موحد مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔“

[آل عمران: ۶۵-۶۷]

امام محمد بن اسحاق، امام ابن جریر اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نجران کے نصاریٰ اور علمائے یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس اکٹھے ہو گئے اور جھگڑنے لگے۔ علمائے یہود نے کہا: ”ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔“ اور نصاریٰ نے کہا: ”وہ تو نصرانی تھے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کی تکذیب کی کہ تورات ابراہیم علیہ السلام کے تقریباً ایک ہزار سال بعد نازل ہوئی اور انجیل تقریباً دو ہزار سال کے بعد تو ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی کیسے ہو گئے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم خلیل اللہ کی طرف نسبت کے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کے دین میں ان کی اتباع کی، محمد ﷺ اور ان کے مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمان۔ [تیسیر الرحمن لیبیان القرآن (ص ۱۸۵۱)]

اس توضیح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد وجود میں آئے تو ان کا یہ دعویٰ مردود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی تھے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ بالکل اسی طرح یہ بات بھی فضول اور باطل ہے کہ رسول اللہ ﷺ موجودہ فرقوں میں سے کسی ایک مذہب پر تھے کیونکہ یہ فرقے رسول اللہ ﷺ کے سینکڑوں سال بعد میں پیدا ہوئے۔ ان فرقوں میں سے اللہ کے رسول ﷺ کے زیادہ قریب وہ ہوگا جو اللہ کے نبی کے لئے ہوئے دین کی اتباع و اطاعت کرتا ہوگا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنی امت کے لیے کتاب و سنت دو چیزیں چھوڑی ہیں، جس نے ان دونوں پر عمل کر لیا وہ راہ راست پر ہے اور حق پر قائم ہے، جس نے قرآن و حدیث سے اعراض کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی نہ کی وہ گمراہ ہے اور صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم ہر طرح کی فرقہ بندی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے کتاب و سنت پر عمل پیرا ہو جائیں اور گمراہی سے بچ جائیں۔ (آمین!)

نعت رسول مقبول ﷺ کی شرعی حیثیت

(سوال) نعت رسول مقبول ﷺ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) نعت صفت بیان کرنے اور تعریف کرنے کو کہا جاتا ہے، ہمارے ہاں نعت کی اصطلاح نبی رحمت کی تعریف و توصیف کے لیے مخصوص ہے۔ آپ کی نعت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ عمل باعث اجر و ثواب ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں شرک کی آمیزش نہ ہو جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« لَا تُطَرُّوْنِي كَمَا أَطَرَّتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولِهِ »

[بخاری، کتاب أحادیث الانبیاء: باب قول الله تعالى: ﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ ﴾ (۳۴:۴۵)]

”مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ چڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھا چڑھا دیا ہے میں اس کا بندہ ہوں لہذا یہ کہو کہ (وہ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“

اس سے ثابت ہوا کہ غیر شرکیہ نعت یا دوسرے اشعار وغیرہ بھی جائز ہیں جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کا فروں کی ججو میں نبی ﷺ کے حکم سے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں فرمایا: ”ان (کافروں) کی ججو کرو، جبرئیل علیہ السلام تمہارے ساتھ ہیں۔“ [بخاری، کتاب بدء الخلق: باب ذکر الملائكة صلوات الله عليهم (۳۲۱۳)]

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے کئی لوگ غلط استدلال پیش کرتے ہیں کہ اشعار وغیرہ پڑھنا درست نہیں:

﴿ وَ الشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۚ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۚ وَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴾ [الشعراء: ۲۲۴-۲۲۶]

”شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو بیکے ہوئے ہوں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ہر وادی میں سرعکراتے

پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔“

اس آیت میں ان شعرا کی مذمت ہے جو اپنے اشعار میں اصول و ضوابط کی بجائے ذاتی پسند یا ناپسند کے مطابق اظہار رائے کرتے ہیں، غلو و مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور شاعرانہ خیالات میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے لیے حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُنْفِخُوا فِي جَوْفِ الرَّجُلِ فَيَحَايِرِيهِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَمْتَلِي شِعْرًا» [مسلم، کتاب الشعر: باب فی انشاد الأشعار و بیان أشعر الكلمة و ذم الشعر (۲۲۵۷)]

”پیٹ کا لہو پیپ سے بھر لینا جو اسے خراب کر دے، شعر کے ساتھ بھرنے سے بہتر ہے۔“

مذکورہ آیات کے متصل ہی آیت مبارکہ میں ان شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن کی شاعری صداقت اور حقائق پر مبنی ہے اور استثناء ایسے الفاظ سے فرمایا گیا ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایماندار، عمل صالح پر کاربند اور بکثرت ذکر الہی کرنے والا شاعر غلط، جھوٹی اور خیالی شاعری کر ہی نہیں سکتا۔ [دیکھئے: الشعراء: ۲۲۷]

اس لیے شرک و کذب سے پاک اشعار اور نعت وغیرہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سید کے کہتے ہیں؟

(سوال) کیا سید کوئی مخصوص ذات ہے یا ہر شخص کو سید کہا جاسکتا ہے؟

(جواب) موجودہ دور میں لفظ ”سید“ ایک مخصوص ذات کے لیے لوگ استعمال کرتے ہیں حالانکہ سید کوئی ذات نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کی رو سے شرافت و بزرگی اور سرداری کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کلمات استغفار پر ”اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِي“ کو فضیلت دیتے ہوئے اسے سید الاستغفار قرار دیا ہے۔ [بخاری، کتاب الدعوات: باب أفضل الاستغفار (۶۳۰۶)]

جمعة المبارک کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَ فِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَ فِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا وَ لَا تَقُومُ

السَّاعَةُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ» [مسندك حاكم (۲۷۷/۱)، صحيح ابن خزيمة (۱۱۵/۳)]

”تمام دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم عليه السلام پیدا ہوئے اور اسی دن جنت میں داخل کیے گئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے اور قیامت بھی اسی دن قائم ہوگی۔“

حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”سید الشهداء“ کہا۔ [مسندك حاكم (۱۲۰/۲)، (۱۹۵/۳)،

فتح الباری (۳۶۸/۷)، سلسلة الاحاديث الصحيحة (۳۷۴)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ لفظ سید سرداری، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے لیے فرمایا:

«إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ» ”میرا یہ بیٹا سردار ہے۔“ [بخاری، کتاب الصلح: باب قول النبی للمحسن بن علی..... (۲۷۰۴)]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری، کتاب الانبیاء: باب قول اللہ عزوجل..... الخ (۳۳۴۰)]

”قیامت کے دن میں سب انسانوں کا سردار ہوں گا۔“

الغرض بے شمار صحیح احادیث میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن کہیں بھی یہ کسی مخصوص ذات پر نہیں بولا گیا، ہر مومن موحّد اپنے اپنے مقام پر بزرگ و سید ہے۔

ماہ صفر منحوس ہے؟

سوال کچھ لوگ ماہ صفر کو منحوس سمجھتے ہیں کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ جب اس دنیائے فانی میں تشریف لائے تو دنیا جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی اور کئی طرح کے توہمات اور شیطانی وساوس میں مبتلا تھی۔ زمانہ جاہلیت کے باطل خیالات اور رسومات میں سے ”صفر“ بھی ہے۔ صفر کے متعلق ان کا گمان تھا کہ ہر انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے، جب پیٹ خالی ہو اور بھوک لگی ہو تو وہ کانٹا اور تکلیف پہنچاتا ہے۔ صفر کے متعلق یہ بھی خیال تھا کہ یہ ایک بیماری ہے جو پیٹ کو کاٹتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی لوگ صفر کے مہینے سے بدفال لیتے تھے کہ اس میں بکثرت مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے توہمات جاہلانہ کا رد فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَا عَدْوَى وَلَا صَفْرٌ وَلَا هَامَةٌ» [بخاری، کتاب الطب: باب لا صفر و هو داء یاخذ البطن (۵۷۱۷)]

”ایک مرض اڑ کر دوسرے کو نہیں لگتا اور نہ مرض صفر ہی اس طرح ہے اور نہ ہامہ کی کوئی حقیقت ہے۔“

صفر سے مراد پیٹ کا مرض بھی لیا گیا ہے جیسا کہ امام بخاری رضی اللہ عنہما کا یہ خیال ہے اور یہ بھی مراد لی گئی ہے کہ اس سے مراد صفر کا مہینا ہے یعنی ماہ صفر منحوس نہیں۔ بعض لوگ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مجھے ماہ صفر ختم ہونے کی بشارت دے گا میں اسے جنت کی بشارت دوں گا۔“ لیکن یہ روایت من گھڑت ہے۔ ملا علی قاری رضی اللہ عنہما نے الموضوعات الکبیر (ص ۱۱۶) میں لکھا ہے کہ اس روایت کی کوئی اصل نہیں۔ لہذا ماہ صفر کو منحوس خیال کرنا جاہلی توہمات سے ہے، اس کی کچھ حقیقت نہیں۔

ترانے کے لیے قیام

(سوال) ہمارے ملک پاکستان میں یہ طریقہ رائج ہے کہ قومی ترانہ کی تعظیم میں تمام لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں کیا یہ قیام نماز کے قیام کی طرح ہے اور کیا یہ درست ہے؟

(جواب) نماز والا قیام ایک شرعی عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے آدمی، عورت یا کسی ترانے و نغمے کی تعظیم کے لیے بھی اپنی جگہ کھڑا ہونا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾ [البقرة: ۲۳۸]

”نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے خاموش ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔“

معلوم ہوا کہ قیام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا چاہیے، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے قیام کرنا درست نہیں، جو اس چیز کو پسند کرتے ہیں کہ لوگ ان کے لیے کھڑے ہوں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دوزخ کی وعید سنائی ہے۔ خواہ وہ استاد ہو یا مرشد، چودھری ہو یا وڈیرا، صدر ہو یا وزیر اعظم یا کسی بھی شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والا افسر ہو، اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْتَلَّ لَهُ الرَّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » [ابوداؤد، کتاب الأدب: باب فی

قیام الرجل للرجل (۵۲۲۹)، ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جاء فی کراهیة قیام الرجل للرجل (۲۷۵۵)]

”جس آدمی کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔“

ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« أَنْ مُعَاوِيَةَ دَخَلَ بَيْتًا فِيهِ ابْنُ عَامِرٍ وَ ابْنُ الزَّبِيرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَقَامَ ابْنُ عَامِرٍ وَ جَلَسَ ابْنُ

الزَّبِيرِ فَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ اجْلِسْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ سَرَّهُ أَنْ

يَتَمَثَّلَ لَهُ الْعِبَادُ قِيَامًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ بَيْتًا فِي النَّارِ » [مسند احمد (۱۰۰، ۹۳/۴)، شرح السنة

(۲۹۵/۱۲)، (۳۳۳۰)، امام بغوی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

”حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک گھر میں داخل ہوئے، اس گھر میں ابن عامر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما تھے تو ابن عامر رضی اللہ عنہ

کھڑے ہو گئے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ بیٹھے رہے۔ ابن عامر رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بیٹھ جاؤ بلاشبہ میں نے

رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ بندے اس کے لیے مطیع ہو کر کھڑے کیے جائیں

وہ اپنا گھر آگ میں بنالے۔“

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے یوں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ بَنُو آدَمَ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ » [طبرانی کبیر (۳۶۲/۱۹)، مشکل الآثار

[(۳۹۰۳۸/۲)]

”جو آدمی اس بات کو پسند کرے کہ اولاد آدم اس کے لیے قیام کی صورت میں مطہ ہو جائے اس کے لیے آگ واجب ہے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت تھی لیکن اتنی شدید محبت کے باوجود وہ آپ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے:

«عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوا إِذَا رَأَوْهُ لَمْ يَقُومُوا لِمَا يَعْلَمُونَ مِنْ كَرَاهِيَّتِهِ لِذَلِكَ» [ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جاء في كراهية قيام الرجل للرجل (۲۷۵۴)، شرح السنة (۲۹۴/۱۲)]

”انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور جب وہ آپ کو دیکھ لیتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس قیام کو برا سمجھتے ہیں۔“

اس حدیث کو امام ترمذی اور امام بغوی رضی اللہ عنہما نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پاکباز، اعلیٰ و ارفع ہستی کے لیے قیام جائز نہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرا کون ایسا ہو سکتا ہے جس کے لیے قیام کیا جائے؟ لہذا کسی سکول ماسٹر، جج، وکیل، پروفیسر، ڈائریکٹر، صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، فوجی افسر، جنرل و کرنل، بریگیڈیئر، سیاستدان، دینی و سیاسی رہنما کے احترام میں یا کسی گلوکار وغیرہ کے ترانے و نغمے یا گانے پر کھڑے ہونا شرعاً درست نہیں بلکہ جو لوگ اس قیام کو پسند کرتے ہیں وہ اس دنیا ہی میں اپنے لیے جہنم خرید رہے ہیں۔ بعض لوگ قیام کے جواز کے لیے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے آنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا:

«قُومُوا إِلَيَّ سَيِّدِكُمْ» «اپنے سردار کی طرف اٹھو» [بخاری، کتاب المغازی: باب مرجع النبی من الأحزاب (۴۱۲۱)]

اس حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم کی خاطر کھڑا ہونا جائز ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ نہیں فرمایا تھا: «قُومُوا لِسَيِّدِكُمْ» «اپنے سردار کی خاطر اٹھو» بلکہ یوں فرمایا تھا: «قُومُوا إِلَيَّ سَيِّدِكُمْ» «اپنے سردار کی طرف اٹھ کر جاؤ»۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ خندق میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک قریشی حبان بن قیس نے ان کے بازو کی رگ میں تیر مارا تھا جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے مسجد میں خیمہ لگوا دیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے واپس آئے تو آ کر اسلحہ اتارا اور غسل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرائیل امین تشریف لائے۔ انھوں نے کہا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ اتار دیا ہے، اللہ کی قسم! میں نے تو ابھی اسلحہ نہیں اتارا، ان کی طرف نکلیں۔“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”کہاں؟“ تو جبرائیل علیہ السلام نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا کیونکہ انھوں نے معاہدہ توڑ کر کفار کی مدد کی تھی۔ جب وہ محاصرہ سے تنگ آ گئے تو انھوں نے قلعوں سے نکل کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے

سپرد کرنا اس شرط پر منظور کیا کہ سعد رضی اللہ عنہ جو حکم کریں گے، وہ ہمیں منظور ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سعد رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تو وہ گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ جب سعد رضی اللہ عنہ مسجد کے قریب آئے تو آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا: ”اپنے سردار (یا بہترین آدمی) کی طرف اٹھو۔“ [بخاری: کتاب المغازی: باب مرجع النبی من الأحزاب (۴۱۲۱، ۴۱۲۲)]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« قَوْمُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ فَأَنْزَلُوهُ » [مسند احمد (۱۴۲/۶)]

”اپنے سردار کی طرف اٹھو اور انھیں اتارو۔“

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے، جو ان کے نزدیک صحیح یا حسن ہے۔ [فتح الباری (۴۱۲/۷)]

یہی بات ظفر احمد تھانوی دیوبندی نے قواعد فی علوم الحدیث میں ذکر کی ہے۔ اس حدیث سے صراحتاً معلوم ہوا کہ سعد رضی اللہ عنہ مریض تھے اور گدھے پر سوار ہو کر آئے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں جب دیکھا کہ وہ مسجد کے قریب آچکے ہیں تو آپ ﷺ نے انصار کو انھیں گدھے سے اتارنے کے لیے حکم دیا تھا نہ کہ اپنی جگہ کھڑے ہونے کا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کی تعظیم کے لیے قیام کا حکم دے بھی کیسے سکتے تھے؟ جب کہ آپ ﷺ اپنے لیے تعظیمی قیام بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

”یا محمد“ کا نعرہ

(سوال) میں نے سنا ہے ایک روایت سے ”یا محمد“ کا نعرہ لگانا ثابت ہے۔ کیا ایسے ہی ہے اس روایت کی استنادی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) اس روایت کو امام بخاری رضی اللہ عنہ نے بطریق سفیان عن ابی اسحاق عن عبد الرحمن بن سعد بیان کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں سن ہو گیا تو انھیں ایک آدمی نے کہا: ”جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے، اسے یاد کریں۔“ تو انھوں نے کہا: ”یا محمد“ [الأدب المفرد (۹۶۴)]

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس میں مرکزی راوی ابو اسحاق السبعمی ہے جو مدلس ہے اور روایت معتن ہے۔ پھر ابو اسحاق السبعمی کو اختلاف بھی ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بیان کرنے میں اضطراب کا شکار ہے۔ کبھی اس روایت کو ابو ہشیم بن حش جیسے مجہول راوی سے (ابن السنی: ۱۷۰)، کبھی ابو شعبہ سے (ابن السنی: ۱۶۸) اور کبھی عبد الرحمن بن سعد سے (الأدب المفرد: ۹۶۳) بیان کرتا ہے لہذا یہ روایت ابو اسحاق کی تدلیس اور اضطراب کی وجہ سے ضعیف ہے۔

مجاہد کہتے ہیں: ”ایک آدمی کی ٹانگ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس سن ہو گئی تو اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اپنے سب سے محبوب شخص کو یاد کرو۔“ تو اس نے کہا: ”محمد“ تو اس کی ٹانگ کی بے حسی ختم ہو گئی۔“ [ابن السنی (۱۲۹)]

یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں غیاث بن ابراہیم کذاب و خبیث اور وضاع راوی ہے۔

[المغنی (۳۶/۲)، میزان الاعتدال (۳۳۷/۳)، الکامل (۲۰۳۶/۶)، احوال الرجال (۳۷۰)]

نبی ﷺ کی مخالفت پر سزا

سوال کیا یہ واقعہ کسی حدیث میں موجود ہے کہ ایک شخص نے دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے میں نبی ﷺ کی مخالفت کی تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا؟

جواب سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کے پاس اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا شروع کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔“ اس نے کہا: میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم طاقت نہیں رکھو گے اسے صرف تکبر نے اس بات سے روکا اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ اپنے منہ کی طرف نہیں اٹھا سکا۔“ [صحیح مسلم کتاب الاشریۃ: باب آداب الطعام والشراب احکامہا، (۲۰۲۱)]
یہ حدیث بالکل صحیح ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت کرنی چاہیے، کسی بھی مسئلہ میں نافرمانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مسلمان کامیاب تبھی ہوتا ہے جب وہ اپنے پیارے رسول ﷺ کی قولاً و عملاً مکمل پیروی کرے۔

نجد کا صحیح مفہوم

سوال نجد کا صحیح مفہوم کیا ہے اور حدیث نجد سے کون مراد ہے؟

جواب باطل پرست ہمیشہ اہل حق کے بارے میں مختلف قسم کے پروپیگنڈے سے کام لیتے آئے ہیں۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و احسان سے حق نمایاں اور آشکارا ہو کر رہا اور مخالفین ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ عرب کی سرزمین پر جب شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رضی اللہ عنہ نے توحید کا علم بلند کیا اور شرک و بدعات کی سرکوبی کی تو کلمہ گو مشرکوں نے نبی کریم ﷺ کی احادیث کا معنی و مفہوم بدل کر انھیں شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رضی اللہ عنہ پر چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ انہی احادیث میں سے ایک حدیث نجد ہے۔ جس کا صحیح مصداق عراق کی سرزمین ہے، جہاں بہت سے گمراہ فرقوں نے جنم لیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد عراق سے بہت سے فتنے رونما ہوئے۔ جنگ نہروان، واقعہ کربلا، بنو امیہ اور بنو عباس کی لڑائیاں، پھر تاتاریوں کے خوزین معرکے، اس طرح گمراہ فرقوں یعنی خوارج، شیعہ، معتزلہ، جمہیہ، مرجیہ وغیرہ کا ظہور بھی کوفہ بصرہ اور بغداد جو عراق کے مشہور شہر ہیں، سے ہوا۔ بارہ سو سال تک تمام مسلمانوں کا متفقہ طور پر یہی موقف رہا کہ نجد قرن شیطان سے مراد عراق ہی کا علاقہ ہے لیکن بارہویں صدی کے بعد اہل بدعت نے ان احادیث کا مفہوم بگاڑ کر انھیں شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رضی اللہ عنہ پر چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی احادیث ملاحظہ کریں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ نجد قرن شیطان سے مراد عراق ہی کا علاقہ ہے۔

① عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے کہا:

« ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ بَارِكْ فِي شَامِنَا اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي يَمِينِنَا قَالُوا يَا

رَسُولَ اللَّهِ! وَ فِي نَجْدِنَا قَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي يَمِينِنَا قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَ فِي نَجْدِنَا فَأَظْنُهُ قَالَ فِي الثَّلَاثَةِ : هُنَاكَ الزَّلَازِلُ وَ الْفِتْنُ وَ بِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ « [بخاری، کتاب الفتن: باب قول النبی: الفتنه من قبل المشرق (۷۰۹۴)، مسند احمد (۱۱۸/۲)، ترمذی، کتاب المناقب: باب فی فضل الشام واليمن (۳۹۵۳)، شرح السنة (۲۰۶/۱۴) صحیح ابن حبان (۷۲۵۷)]

”ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: ”اے اللہ! ہمارے لیے شام میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے یمن میں برکت نازل فرما۔“ لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے نجد (عراق) کے لیے بھی“ (دعا کریں)؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! ہمارے لیے شام میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے یمن میں برکت نازل فرما۔“ لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے نجد کے لیے بھی دعا کریں؟“ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا: ”وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔“

② عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَكْتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي يَمِينِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ مَدِينَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ فِي عِرَاقِنَا؟ فَأَعْرَضَ عَنْهُ فَقَالَ : فِيهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتْنُ وَ بِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ « [حلیۃ الأولیاء (۱۳۳/۶)، طبرانی کبیر (۱۳۴۲۲)]

”اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے مکہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے شام میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے یمن میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے صاع اور مد میں برکت نازل فرما۔“ ایک آدمی نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ آپ ﷺ نے اس سے اعراض کیا پھر فرمایا: ”اس میں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ رونما ہوگا۔“

③ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ فِي صَاعِنَا وَ فِي مَدِينَا وَ فِي يَمِينِنَا وَ فِي شَامِنَا فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ فِي عِرَاقِنَا؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : بِهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتْنُ وَ مِنْهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ « [کتاب المعرفة والتاریخ: باب ما جاء فی الکوفه (۷۴۶/۱)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، صاع، مد، یمن اور شام میں برکت نازل فرما۔“ تو ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔“

④ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ مَدِينَا وَ صَاعِنَا وَ يَمِينَنَا وَ شَامِنَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ فِي عِرَاقِنَا؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ مَدِينَا وَ صَاعِنَا وَ يَمِينَنَا وَ شَامِنَا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ فِي عِرَاقِنَا؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْهَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَ مِنْهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ» [كتاب المعرفة والتاريخ: باب ما جاء في الكوفة (٧٤٧/٢)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، مد، صاع، یمن اور شام میں برکت ڈال دے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ، مد، صاع، یمن اور شام میں برکت ڈال دے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور ہمارے عراق میں بھی؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہاں سے زلزلے اور فتنے اٹھیں گے اور شیطان کا سینگ طلوع ہوگا۔“ کتاب ”المعرفة والتاريخ“ کے اسی باب میں یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے جن میں نجد عراق کی تصریح ہے۔

⑤ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُشِيرُ بِيَدِهِ يَوْمَ الْعِرَاقِ : هَا إِنَّا الْفِتْنَةَ هَهُنَا ، هَا إِذَا الْفِتْنَةَ هَهُنَا..... ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ» [مسند احمد (١٤٣/٢)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو عراق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا (آپ ﷺ نے کہا): ”خبردار! بے شک فتنہ یہاں سے ہوگا، خبردار بے شک فتنہ یہاں سے ہوگا۔ یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی، (پھر کہا): ”یہاں سے شیطان کا سینگ نکلے گا۔“

⑥ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَا وَ صَاعِنَا اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَ يَمِينَنَا فَقَالَ رَجُلٌ وَ الْعِرَاقُ يَا رَسُولَ اللَّهِ!؟ فَسَكَتَ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَا وَ صَاعِنَا اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي حَرَمِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَ يَمِينَنَا فَقَالَ رَجُلٌ وَ الْعِرَاقُ يَا رَسُولَ اللَّهِ!؟ قَالَ مِنْ نَمَّ يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ وَ تَهِيحُ الْفِتْنُ» [المعجم الأوسط للطبرانی (٤١١٠)، مجمع الزوائد (٢٠٨/٣)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت نازل فرما، اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام اور یمن میں برکت نازل فرما۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور عراق کے بارے میں بھی دعا کریں؟“ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر فرمایا: ”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے مدینہ

میں برکت نازل فرما! اور ہمارے لیے ہمارے مد اور صاع میں برکت نازل کر، اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے حرم میں برکت نازل فرما اور ہمارے لیے ہمارے شام و یمن میں برکت نازل فرما۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اور عراق کے لیے بھی؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہاں سے شیطان کا سینگ نمودار ہوگا اور فتنے ابلیس گے۔“

② عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا نبی ﷺ نے دعا فرمائی:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَ يَمِينِنَا فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ يَا نَبِيَّ اللَّهِ! وَ عِرَاقِنَا فَقَالَ إِنَّ بِهَا قَرْنَ الشَّيْطَانِ وَ تَهِيحُ الْفُتْنُ وَ إِنَّ الْجَفَاءَ بِالْمَشْرِقِ» [مجمع الزوائد (۳۰۸/۳)]

”اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام اور یمن میں برکت پیدا فرما۔“ تو قوم میں سے ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے نبی! اور ہمارے عراق کے لیے بھی دعا کریں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک عراق میں شیطان کا سینگ ہے اور فتنے بھڑکیں گے اور بے شک جفا مشرق میں ہے۔“

امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: ”اس حدیث کو امام طبرانی نے ”المعجم الكبير“ میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔“

③ سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ! مَا أَسْأَلُكُمْ عَنِ الصَّغِيرَةِ وَ أَرْكَبُكُمْ لِلْكَبِيرَةِ! سَمِعْتُ أَبِي، عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ الْفِتْنَةَ تَحِيءُ مِن هُنَا وَ أَوْمًا بِيَدِهِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ مِنْ حَيْثُ يَطْلُعُ قَرْنَا الشَّيْطَانِ» [مسلم، كتاب الفتن: باب الفتنه من المشرق من حيث يطلع قرنا الشيطان (۲۹۰۵)]

”اے عراقیو! تم چھوٹے چھوٹے مسائل کس قدر دریافت کرتے ہو اور کبار کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں نے اپنے باپ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ کہتے تھے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”بلاشبہ فتنہ یہاں سے آئے گا۔“ اور اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں سے شیطان کے سینگ نکلیں گے۔“

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ» [بخاری، كتاب بدء الخلق: باب خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال (۳۳۰۱)، ابن حبان (۷۲۵۵)، مسند ابی یعلیٰ (۶۳۴۰)، مسلم، كتاب الايمان: باب تفاضل اهل الايمان فيه و رجحان اهل اليمن فيه (۵۲)، مسند ابی عوانة (۶۰۱۱)، مسند احمد (۵۰۶۱۲)، مسند حمیدی (۴۵۲۱۲)]

”کفر کا سرچشمہ مشرق کی طرف ہے۔“

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اسی روایت میں ابن حبان اور مسلم وغیرہ میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْإِيمَانُ يَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ وَرَأْسُ الْكُفْرِ قِبَلَ الْمَشْرِقِ»
 ”ایمان و حکمت کا محل تو یمن ہے اور کفر کا سرچشمہ (مدینہ منورہ سے) مشرق کی جانب ہے۔“

⑩ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«غَلِطَ الْقُلُوبِ وَالْحَفَاءُ فِي الْمَشْرِقِ وَالْإِيمَانُ فِي أَهْلِ الْحِجَازِ» [مسلم، کتاب الایمان:
 باب تفاضل اهل الایمان فیہ و رجحان اهل الیمن فیہ (۵۲)، صحیح ابن حبان (۷۲۵۲)، شرح السنة
 (۲۰۲/۱۴)]

”لوگوں کی سختی اور جفا مشرق میں ہے اور ایمان اہل حجاز میں ہے۔“

مذکورہ بالا دس صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ حجاز، شام اور یمن یہ تینوں ملک اسلام و ایمان کا مرکز ہیں اور یہاں سے اسلام و ایمان کا علم بلند ہوتا رہے گا اور مدینہ سے مشرق کی جانب واقع عراق کا علاقہ فتنوں کا سرچشمہ اور ضلالت و گمراہی کا مرکز ہے، یہاں سے بہت سے فتنوں نے جنم لیا ہے، یہاں خیر کم اور شر زیادہ ہے، آپ ﷺ نے یمن و شام کے لیے خصوصی برکت کی دعا فرمائی۔ اس لیے کہ مکہ مکرمہ جو آپ ﷺ کا پیدائشی اور آبائی علاقہ ہے، یہ یمن کا شہر تھا اور مدینہ منورہ جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی اور وہ آپ ﷺ کا مسکن و مدفن تھا، وہ شام کا شہر تھا۔ علامہ شرف الدین الطیبی رقمطراز ہیں:

”إِنَّمَا دَعَا لَهَا بِالْبَرَكَةِ لِأَنَّ مَوْلِدَهُ بِمَكَّةَ وَهِيَ مِنَ الْيَمَنِ وَمَسْكَنُهُ وَمَدْفَنُهُ بِالْمَدِينَةِ وَهِيَ

مِنَ الشَّامِ“ [شرح الطیبی علی مشکاة المصابیح (۳۹۵۸/۱۲)]

”آپ ﷺ نے شام و یمن کے لیے برکت کی دعا اس لیے کی کہ آپ ﷺ کی جائے پیدائش مکہ ہے اور وہ یمن کا علاقہ ہے اور آپ ﷺ کا مسکن و مدفن مدینہ میں تھا اور وہ شام کے علاقوں میں سے ہے۔“

شارح حدیث علامہ اشرف رضی اللہ عنہ نے بھی یہی بات ذکر کی ہے۔ [دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاة المصابیح

(۲۳۹/۱۰)]

معلوم ہوا کہ حجاز مقدس کی سرزمین کے لیے آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی اور وہ نجد جس کے لیے آپ ﷺ نے دعا نہیں کی وہ عراق کا علاقہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر کردہ صحیح احادیث میں تصریح ہے۔ عرب کے اندر نجد نام کے بہت سے علاقے ہیں اور ہر ایک نجد کے لیے آپ ﷺ نے خبر نہیں دی کہ وہاں سے زلزلے اور فتنے رونما ہوں گے۔ بلکہ خاص عراق کے بارے میں فرمایا کہ وہاں سے زلزلے اور فتنے جنم لیں گے۔ اس لیے حدیث نجد کا مصداق اصل عراق ہے نہ کہ اہل حجاز۔ آئیے پہلے نجد کا معنی و مفہوم سمجھ لیں کہ لغت عرب میں نجد کسے کہتے ہیں پھر دیکھیں کہ عرب میں نجد نام کے کتنے علاقے ہیں۔ نجد مصدر ہے جس کا معنی بلندی و رفعت ہے، گویا ہراوچی و بلند چیز کو نجد کہا جاتا ہے۔

علامہ محمد الدین فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”النَّجْدُ مَا أَشْرَفَ مِنَ الْأَرْضِ الطَّرِيقُ الْوَاضِعُ الْمُتَرَفِّعُ وَمَا خَالَفَ الْغُورَ أَي تَهَامَةً أَعْلَاهُ

يَهَامَةُ وَالْيَمْنُ وَاسْفَلَةُ الْعِرَاقِ وَالشَّامُ وَأَوْلُهُ مِنْ جِهَةِ الْحِجَازِ ذَاتُ عِرْقٍ“

[القاموس المحيط (۳۰۲/۱)]

”نجد بلند زمین کو کہتے ہیں یعنی بلند اور واضح راستہ جو غور و نشیب یعنی تہامہ کے بالمقابل ہے، وہ تمام اونچی زمین والا علاقہ جو تہامہ اور یمن سے شروع ہوتا ہے اور عراق و شام تک پھیلا ہوا ہے۔ حجاز کی جانب سے اس کی ابتدا ذات عرق مقام سے ہوتی ہے اور ذات عرق اہل عراق کا میقات ہے جہاں سے وہ احرام باندھتے ہیں۔“

علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

”الْأَجْدُ مِنَ الْأَرْضِ قِفَافُهَا وَصَلَابَتُهَا وَمَا غَلِظَ مِنْهَا وَاشْرَفَ وَارْتَفَعَ وَاسْتَوَى“

[لسان العرب (۴۰۱/۴)]

”نجد زمین کا وہ حصہ ہے جو بلند و بالا، مضبوط و گاڑھا اور اونچائی پر واقع ہو۔“

مزید فرماتے ہیں:

”وَمَا ارْتَفَعَ عَنْ يَهَامَةَ إِلَى أَرْضِ الْعِرَاقِ فَهُوَ نَجْدٌ“ [لسان العرب (۴۰۱/۴)]

”زمین کا وہ بلند حصہ جو تہامہ سے شروع ہو کر عراق کی زمین کی طرف جاتا ہے، وہ نجد ہے۔“

معلوم ہوا کہ سطح مرتفع اور بلند زمین کو نجد کہتے ہیں اور عرب میں بہت سارے نجد ہیں۔ شیخ ابو عبد اللہ یا قوت بن عبد اللہ الحموئی صاحب مجمع البلدان نے درج ذیل نجد شمار کیے ہیں:

① نجد ألوذ ② نجد أجا ③ نجد برق ④ نجد خال ⑤ نجد العری

⑥ نجد عفر ⑦ نجد العقاب ⑧ نجد کلب ⑨ نجد مرج ⑩ نجد الیمن

[معجم البلدان (۲۶۵/۵)، لسان العرب (۴۷۱/۴)]

معلوم ہوا کہ عرب کی سر زمین میں نجد نام کے بہت سے علاقے ہیں اور اصل میں ہر سطح مرتفع کو نجد کہا جاتا ہے اور مختلف بلند و بالا علاقوں کو نجد کہا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تمام نجد زلزلوں اور فتنوں کی آماجگاہ ہیں یا کوئی خاص نجد ہے جہاں سے فتنے اور شیطان کا سینگ رونما ہوا ہے یا مزید ہوگا؟ تو اوپر درج کردہ احادیث صحیحہ میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ فتنوں کی آماجگاہ اور فساد یوں کا مسکن نجد عراق ہے اور تاریخ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ جتنے فتنے، فرق اور مفسدہ پرداز بالخصوص کوفہ و بصرہ سے رونما ہوئے ہیں، اتنے کسی اور جگہ سے نہیں ہوئے اور شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق نجد عراق سے نہیں بلکہ نجد یمن سے ہے جس کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ لہذا معترضین کا حدیث نجد کو شیخ پر چسپاں کرنا علم حدیث و تاریخ و جغرافیہ عرب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ وہ اپنی بدعات اور رسم و رواج اور شرک جیسے گھناؤنے عمل پر پردہ ڈالنے کے لیے کرتے ہیں۔

کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کا ٹھکانا پہلے بتلا دیا تھا؟

(سوال) کیا یہ درست ہے کہ کیا نبی ﷺ نے بدر کے کافر مقتولوں کے قتل ہونے کی جگہ کی پہلے ہی سے نشاندہی فرمادی تھی؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا اس سے نبی ﷺ کا عالم غیب ہونا ثابت نہیں ہوتا؟

(جواب) نبی کریم ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر میں قتل ہونے والے کافروں کے نام لے کر یہ بات بتائی تھی کہ یہ فلاں کا مقتل ہے، یہ فلاں کے قتل کی جگہ ہے، یہاں فلاں آدی مارا جائے گا وغیرہ اور جس طرح آپ ﷺ نے بتایا تھا بالکل اسی طرح ہر ایک آپ ﷺ کی بتائی ہوئی جگہ قتل ہوا تھا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے مشورہ کیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بات کی اور آپ ﷺ نے اعراض کیا پھر عمر رضی اللہ عنہ نے بات کی تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اعراض کیا، پھر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: ”اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ ﷺ ہمیں حکم کریں کہ ہم گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم ضرور ڈال دیں گے اور اگر آپ ﷺ یہ حکم دیں کہ ہم انھیں برک الغماد تک دوڑا دیں تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔“ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور وہ چلے یہاں تک کہ بدر میں اترے۔ وہاں انھیں قریش کے پانی پلانے والے طے اور ان میں بنی حجاج کا ایک سیاہ غلام بھی تھا، انھوں نے اسے پکڑ لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا: ”مجھے ابوسفیان کا علم نہیں لیکن ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف تو لوگوں میں موجود ہیں۔“ جب اس نے یہ کہا تو صحابہ اس کو مارنے لگے: ”تو وہ کہنے لگا ”میں تمہیں ابوسفیان کے متعلق بتاتا ہوں۔“ جب انھوں نے اسے چھوڑا اور ابوسفیان کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: ”مجھے ابوسفیان کا علم نہیں لیکن ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف تو لوگوں میں موجود ہیں۔“ جب اس نے یہ بات کہی تو صحابہ نے پھر اس کو مارنا شروع کیا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھی، آپ ﷺ پھرے اور فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب وہ تم سے سچ بولتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو تم اسے چھوڑتے ہو۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

« هَذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ وَ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ هَهُنَا وَ هَهُنَا قَالَ فَمَا مَاطَ أَحَدُهُمْ عَنْ مَوْضِعٍ

يَدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ» [مسلم کتاب الجہاد والسير: باب غزوة بدر (۱۷۷۹)]

”یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے اور ہاتھ زمین پر رکھا، یہ فلاں کے گرنے کی جگہ، یہاں فلاں مرے گا۔ صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”جہاں آپ ﷺ نے ہاتھ رکھا تھا وہاں سے کوئی بھی نہ ہٹا (یعنی اس جگہ ہی وہ شخص مرا جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کے قتل ہونے کی جگہ ہے)۔“

یہی حدیث صحیح مسلم میں دوسری جگہ ان الفاظ سے مروی ہے۔

انس ﷺ فرماتے ہیں: ”ہم عمر ﷺ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے۔ ہم سب چاند دیکھ رہے تھے اور میں تیز نگاہ والا تھا، میں نے چاند دیکھ لیا اور میرے علاوہ کسی نے نہ دیکھا۔ میں نے عمر ﷺ سے کہا: ”کیا آپ نے نہیں دیکھا؟“ انھیں دکھائی نہ دیا۔ عمر ﷺ کہنے لگے: ”میں منقریب دیکھوں گا“ اور میں اپنے بچھونے پر چت لیٹا تھا پھر انھوں نے ہم سے بدر والوں کے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔ فرمایا:

«إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُرِينَا مَصَارِعَ أَهْلِ بَدْرٍ بِالْأَمْسِ يَقُولُ هَذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا إِنْ شَاءَ اللَّهُ قَالَ فَقَالَ عُمَرُ فَوَالَّذِي بَعَثَهُ بِالْحَقِّ مَا أَخْطَأُوا الْحُدُودَ الَّتِي حَدَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [مسلم، كتاب الحنة و صفة نعيمها : باب عرض مقعد الميت (۲۸۷۳)]

”بے شک نبی کریم ﷺ ہمیں کل کے دن (یعنی لڑائی سے ایک دن پہلے) بدر والوں کے گرنے کا مقام بتانے لگے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: ”اگر اللہ نے چاہا تو فلاں شخص کل یہاں مرے گا۔“ عمر ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا! جو حدیں آپ ﷺ نے ان کی متعین کی تھی وہ وہاں سے نہ ہٹے (یعنی ہر کافر اسی جگہ مارا گیا جہاں آپ ﷺ نے نشاندہی فرمائی تھی)۔“

علاوہ ازیں یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مسند احمد (۲۶۱/۱)، ابو داؤد، کتاب الجہاد، نسائی، کتاب الجنائز اور تفسیر ابن کثیر میں آیت ﴿وَ إِذْ يَعِدُّكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهُمَا لَكُمْ﴾ کے تحت ان الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے:

«وَاللَّهُ لَكَانِي الْآنَ أَنْظِرُ إِلَى مَصَارِعِ الْقَوْمِ» [عبیون الأثری فنون المغازی والشمال والسير لابن سید الناس (۳۲۸/۱)]

”اللہ کی قسم! گویا کہ میں اب قوم کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں۔“

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بعض اوقات غیب کی خبریں دیتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ علم غیب اور اخبار غیب میں بڑا فرق ہے۔ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اس کے سوا کوئی بھی عالم الغیب نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ [النمل: ۶۵]

”آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین والوں میں سے اللہ کے علاوہ کوئی غیب نہیں جانتا۔“

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ عِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ [الانعام: ۵۹]

”اور اسی (اللہ تعالیٰ) کے پاس غیب کی چابیاں ہیں جنہیں صرف وہی جانتا ہے۔“

پتا چلا کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

تحریف شدہ آسمانی کتابوں سے انکار

(سوال) جیسا کہ قرآن مجید نے بتلادیا ہے کہ پہلی آسمانی کتب بدل دی گئی ہیں تو اگر ان تحریف شدہ کتابوں سے انکار کر دیا جائے تو بندہ مسلمان نہیں رہتا؟

(جواب) تورات اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، اسی طرح انجیل بھی۔ ان پر ایمان رکھنا لازم ہے کہ اللہ نے تورات موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی۔ لیکن اب جو موجودہ بائبل ہے یہ تحریف شدہ ہے۔ یہ وہ آسمانی کتاب نہیں ہے جس پر ایمان لانے کا حکم ہے اس بائبل کی نفی کرنا بالکل درست ہے۔ اس کے محرف ہونے پر مفصل بحث دیکھنی ہو تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کی کتاب ”انظہار الحق“ ملاحظہ کریں۔ اسی طرح احمد دیدات کے عیسائی پادریوں کے ساتھ مناظروں کی کیشیں سنیں۔ (واللہ اعلم)

ماہ رجب کے کوٹھوں کی شرعی حیثیت

(سوال) کیا رجب کے کوٹھے اسلام سے ثابت ہیں اور کیا ان کی کوئی شرعی دلیل میسر ہے؟

(جواب) رجب کے مہینے میں جو ۲۲ تاریخ کو کوٹھے پکائے جاتے ہیں اس کا شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں، یہ رسوم و بدعات کی قبیل سے ہے اور ان کی ایجاد لکھنؤ میں ہوئی ہے۔ محمد حسین نجفی شیعہ مجتہد اپنی کتاب ”اصلاح الرسوم الظاہرة بکلام العترة الطاهرة (ص: ۲۸۳)“ پر آٹھویں باب میں (۲۲ رجب کے کوٹھے) کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

”مجملة ان غلط رسوم کے ایک ۲۲ رجب کے کوٹھے بھی ہیں۔ یہ رسم پہلے پہل ہندوستان سے نکلی اور پھر رفتہ رفتہ مختلف ممالک میں پھیل گئی اور روز بروز پھیل رہی ہے۔ مرزا صاحب (شیعہ مجتہد) نے اپنے انٹرویو میں تسلیم کیا ہے کہ وہ اس ایجاد کے معنی گواہ ہیں کہ ان کے سامنے لکھنؤ میں یہ رسم ایجاد ہوئی، اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔“

رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ محدثین سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا صحیح بخاری وغیرہ میں ارشاد ہے

« مَنْ أَحَدَثَ فِيهِ أَمْرًا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاری، کتاب الصلح: باب إذا اصطلحو على صلح جور (۲۶۹۷)]

”جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی جو اس دین میں سے نہیں ہے وہ مردود ہے۔“

لہذا ایسی رسومات و بدعات سے کھل اجتناب کیا جائے۔

تعویذ کے متعلق شرعی موقف

(سوال) کیا اسلام تعویذ پینے کی اجازت دیتا ہے اور اس کا کوئی ثبوت شریعت سے ملتا ہے؟

(جواب) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ عَلَّقَ شَيْئًا وَكَلَّ إِلَيْهِ» [مسند احمد (۳۱۱/۴)، حاکم (۲۱۶/۴)]
 ”جس نے کوئی بھی چیز لٹکائی اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔“

اس مفہوم کی اور بھی احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری سے بچنے کے لیے کچھ بھی نہیں لٹکانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے شفا کی درخواست کرتے رہنا چاہیے۔ شریکہ دم اور تعویذات لٹکانا تمام شرک ہے۔ فتح المجید شرح کتاب التوحید میں ہے کہ تمیمہ وہ منگے یا ہڈیاں ہیں جو نظر بد سے دور رکھنے کے لیے بچوں کے گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔ بیماری سے بچاؤ کے لیے ڈالے جانے والے کڑے، دھاگے، چھلے، درختوں کے پتے وغیرہ سب ناجائز ہیں، کیونکہ یہ اشیاء کسی کے نفع و نقصان کی مالک نہیں۔ قرآن حکیم یا دیگر آیات کو لکھ کر گلے میں ڈالنا یا بازو وغیرہ پر باندھ لینا درست نہیں، نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کا کوئی صحیح ثبوت نہیں ملتا لہذا ایسے امور سے کلی اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور دیگر مسلمان مریضوں کو شفاً کاملہ نصیب کرے۔ (آمین)

ذکر و اذکار اور شرعی دم سے کام لیں، اللہ پر توکل کر کے یقین کے ساتھ اگر دعا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ضرور شفا نصیب ہوگی۔

اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کے لیے لفظ ”عشق“ کا استعمال

(سوال) کیا لفظ ”عشق“ اللہ یا رسول اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز ہے؟

(جواب) قرآن حکیم اور حدیث رسول میں اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے جو لفظ کثرت سے آیا ہے وہ محبت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾

[المائدة: ۵۴]

”اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا (یاد رکھیے!) عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔“

ایک حدیث میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے ایک دن حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ”اے معاذ! یقیناً میں تیرے ساتھ محبت کرتا ہوں۔“ تو معاذ رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں بھی آپ کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔“ [مسند احمد (۲۴۵/۵)، (۲۲۱/۹)، صحیح ابن خزيمة (۷۵۱)، صحیح ابن حبان (۲۰۲۰)، ابوداؤد (۱۰۲۲)]

قرآن حکیم میں محبت والی کئی ایک آیات ہیں اور اسی طرح صحیح احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے لیے محبت کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ لہذا ہمیں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کے لیے یہی لفظ استعمال کرنا چاہیے اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی صحیح حدیث میں لفظ عشق استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک مصنوعی، بناوٹی اور جعلی روایت میں لفظ عشق استعمال ہوا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کر کے یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے عشق کیا اور چھپایا اور پاکباز رہا اور مر گیا وہ شہید ہے۔“

یہ روایت تاریخ بغداد (۱۶۶/۵-۲۶۲) (۵۰۱۲)، (۲۹۸/۱۱)، تاریخ دمشق اور اللعل المتناہیہ وغیرہ میں موجود ہے۔ علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ (۳۰۹)]

معلوم ہوتا ہے کہ جہاد سے باغی اور کسی عشق کے مریض نے یہ روایت بنائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے میدان کارزار میں قتل ہونے والوں کے علاوہ جل کر، غرق ہو کر، پیٹ کے مرض سے، ذات الجنب والے اور ایسی عورت کو شہید قرار دیا ہے جو نفاس میں بچے کی ولادت پر فوت ہو جائے۔ قتل عشق کو کہیں بھی شہید قرار نہیں دیا۔ یہ کسی قاتل لیلیٰ کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ امام ابن قیم رضی اللہ عنہ نے اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور فرمایا ہے:

”اس موضوع روایت سے دھوکا مت کھائیں یہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت نہیں ہے اور اس کا آپ کے کلام میں سے ہونا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں شہادت ایک بلند درجہ ہے جو صدیقیت کے رتبہ کے ساتھ ملایا گیا ہے، اس کے لیے اعمال اور احوال ہیں جو اس کے حصول کی شرط ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص اور خاص تو شہادت فی سبیل اللہ ہے اور عام شہادتیں پانچ ہیں جو صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور عشق ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ عشق ان میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو محبت میں اللہ کے ساتھ شریک ہے۔ یہ دل اور روح پر کنٹرول کرتا ہے اور غیر کے لیے محبت پیدا کرتا ہے اس کے ذریعے شہادت کیسے پائی جاسکتا ہے؟ یہ محال ہے۔ عشق کا فساد ہر فساد سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ روح کی خمر (شراب) ہے جو اس کو مست کر دیتی اور اللہ کے ذکر اور اس کی محبت اور اس کی مناجات سے لذت اور انس حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور دل کی عبودیت کو غیر اللہ کے لیے واجب کر دیتی ہے، عاشق کا دل معشوق کی عبادت کرتا ہے۔ بناؤ جو کسی دوسرے آدمی کی عورت کے ساتھ عشق کرتا ہے یا امر لڑکوں اور زانیہ و بدکار عورت سے عشق کرتا ہے کیا وہ اس عشق کی وجہ سے شہادت کا درجہ پالے گا؟ یہ تو صریح رسول اللہ کے دین کے خلاف ہے اور پھر عشق تو ان بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے شرعی اور قدرتی علاج مقرر کیا ہے جبکہ جو شہادت حدیث میں بیان کی گئی ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

[مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، زاد المعاد (۳۰۶/۳ - ۳۰۷)]

الغرض لفظ عشق قرآن وحدیث میں کہیں وارد نہیں ہوا اور عشق ایک بیماری ہے جس کا علاج کیا جانا چاہیے اور پھر یہ ہمارے عرف میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہے، اس لیے ایسے لفظ کا استعمال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے نہیں

کرنا چاہیے۔ کوئی شخص بھی یہ لفظ اپنی ماں، بہن اور بیٹی کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے کیسے پسند کرتا ہے؟

دم کر کے پانی پر پھونک مارنا

(سوال) کیا دم کر کے پانی پر پھونک ماری جاسکتی ہے؟ قرآن و سنت کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔

(جواب) نبی کریم ﷺ نے پینے والی اشیاء میں پھونک مارنے سے منع کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ رَجُلٌ الْقَدَاةَ أَرَاهَا فِي الْإِنَاءِ؟ فَقَالَ أَهْرِ قَهَا» [ترمذی، کتاب الاشربة، باب ماجاء فی کراهیة النفخ فی الشراب (۱۸۸۷)، مسند احمد (۲۶۱۳)]

”نبی کریم ﷺ نے پینے والی چیز میں پھونک مارنے سے منع کیا، ایک آدمی نے کہا: ”اگر برتن میں تنکا دیکھوں تو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر اس پانی کو بہادو۔“

عالموں سے علاج کروانا اور انھیں ہاتھ دکھانا

(سوال) کیا کسی عامل کو ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال جاننا یا اس سے اپنا علاج کروانا درست ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں واضح فرمادیں۔

(جواب) ایسے لوگ جو پر دفسروں کے بورڈ لگا کر ”جو چاہو سو پوچھو“ یا ”ہر قسم کی مراد پوری ہوگی“ کے دعوے کرتے ہیں، ان سے علاج کروانا اور انھیں قسمت کا حال دریافت کرنے کے لیے ہاتھ دکھانا بالکل ناجائز ہے۔ ایسے نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَتَى عَرَافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً» [مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الکھانة (۲۲۳۰) مسند احمد (۲۸۱۳) (۳۸۰۱۵)]

”جو شخص کسی خیریں بتانے والے (نجمی یا کاہن) کے پاس آیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوگی۔“

ایک دوسری حدیث میں ہے:

«مَنْ أَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أَنْزَلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ»

[ابوداؤد، کتاب الکھانة و التطير، باب فی الکھان (۳۹۰۴) ترمذی (۱۳۵) ابن ماجہ (۶۳۹)]

”جو شخص کسی کاہن کے پاس آیا اور اس کے اقوال کی تصدیق کی تو اس نے اس بات کا کفر کیا جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔“ ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کاہنوں، نجومیوں، نام نہاد جعلی پروفیسروں اور لوگوں کی قسمتوں کے دعوے کرنے والے عاملوں کے پاس جانا حرام ہے اور ان کے دعووں کی تصدیق کرنا شریعت محمدی سے کفر ہے لہذا ایسے کاموں سے کلی طور پر اجتناب کرنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کرامت اور صاحب کرامت

(سوال) کرامت کیا ہے؟ اور صاحب کرامت کیسے بنا جاسکتا ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری اور رسول مکرم ﷺ کی اطاعت و اتباع کرنے والے لوگ اللہ کے ولی اور دوست ہوتے ہیں، کبھی کبھار ان کے ہاتھ پر خلاف عادت کسی کام کا اظہار ہو جاتا ہے اور یہ اتفاقی عمل ہے۔ مستقل صاحب کرامت کا اختیار نہیں۔ انبیاء ﷺ سے خرق عادت کے طور پر جو ظاہر ہوا سے معجزہ کہتے ہیں اور اولیاء کے ہاتھ پر اگر ایسی چیز کا اظہار ہو تو وہ کرامت گردانی جاتی ہے۔ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

”معجزہ عجز سے مشتق ہے جو قدرت کی ضد ہے اور تحقیقی بات صرف یہ ہے کہ معجزہ وہ ہے وغیرہ کے اندر عجز کا فعل پیدا کرے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات بابرکات ہے۔“ [حاشیہ مشکاة (ص ۵۳۰)]

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ عجز کا فعل پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، بندہ نہیں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”جان لیجیے کہ جو خرق عادت امر انبیاء ﷺ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس کو معجزہ اس لیے کہتے ہیں کہ مخلوق اس کے ظاہر کرنے سے عاجز ہوتی ہے اور جب مخلوق اس سے عاجز ہوئی تو معلوم ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ جو اس کے نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔“

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

”جیسے مردوں کا زندہ کرنا اور لاشی کا سانپ بنا دینا اور پتھر سے اونٹنی نکالنا اور چاند کا پھٹ جانا وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اللہ کے بغیر کسی اور سے ان کا ہونا ممکن نہیں بلکہ یہ اللہ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے، نبی ﷺ نے جھٹلانے والوں کو چیلنج کر کے انھیں اس فعل کے صادر ہونے سے عاجز کر دیا۔“ [الشفاء (ص ۱۶۲) فتح الباری (۴/۶۱۶)]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کی ہے کہ انبیاء ﷺ سے کافر اور مشرک قوموں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں کوئی معجزہ، آیت یا نشانی دکھلاؤ تو انبیاء ﷺ نے یوں جواب دیا:

﴿وَمَا كَانُوا لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمُ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِأُذُنِ اللَّهِ﴾ [ابراہیم: ۱۱]

”اور ہمارے لائق یہ نہیں کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ لاسکیں مگر اللہ تعالیٰ کے اذن و حکم سے۔“

نبی کریم ﷺ سے مشرکین مکہ نے معجزے کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کو یوں جواب دیا:

﴿ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ﴾ [الانعام: ۱۰۹]

”آپ کہہ دیں کہ نشانیاں اور معجزے اللہ کے پاس ہیں۔“

معلوم ہوا کہ معجزات و نشانیاں لانا اللہ کے اختیار میں ہے کسی نبی و رسول ﷺ کا اختیار نہیں۔

کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟

(سوال) کیا ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے؟

(جواب) لفظ شیعہ کا معنی گروہ اور فرقہ ہے۔ قرآن مجید میں لفظ شیعہ کسی خاص مذہب کے لیے مستعمل نہیں ہوا۔ شیعہ حضرات کا اپنے مذہب کی حقانیت کے لیے الصافات کی آیت (۸۳) ﴿وَإِنَّ مِنْ شِبَعَتِهِ لِإِبْرَاهِيمَ﴾ پیش کرنا قطعاً درست نہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا معنی گروہ ہے نہ کہ موجودہ شیعہ۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا نوح علیہ السلام کے گروہ سے تھے۔ یعنی جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام بھی نبی تھے۔ قرآن مجید نے جہاں ابراہیم علیہ السلام کے دین کا ذکر کیا ہے، وہاں یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ﴾ [آل عمران: ۶۷]

”ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی لیکن وہ تو ایک سوسلم تھے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا دین بیان کرتے ہوئے ﴿حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ کہا ہے۔ اگر وہ مذہب شیعہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے: ”مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ شَيْعَةً“ لیکن قرآن میں اس طرح مذکور نہیں۔

قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مواقع پر لفظ شیعہ شریروں، فسادوں اور فتنہ بازوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ ۝ وَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴾

[الحجر: ۱۰، ۱۱]

”البتہ ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول اگلے شیعوں میں بھیجے اور ان کے پاس کوئی بھی رسول نہیں آیا مگر وہ ان سے مذاق کرتے تھے۔“

اگر لفظ شیعہ سے مراد شیعہ فرقہ ہے تو پھر اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ مذاق کرنے والے شیعہ تھے۔ اس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر عمار علی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

”یہاں شیعہ سے مراد وہ کافر ہیں جو رسولوں کے ساتھ ٹھٹھا و مذاق کرتے تھے۔“ [تفسیر عمدة البیان (۲/۱۷۴)]

﴿ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ﴾ [الانعام: ٦٥]

”کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو شیعہ بنا کر آپس میں لڑا دے۔“

اگر لفظ ﴿ شِيْعًا ﴾ سے شیعہ فرقہ مراد ہے تو ان کے عذاب الہی میں گرفتار ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اس آیت کے متعلق شیعہ مفسر عمار علی نے لکھا ہے:

”اس آیت میں لفظ ﴿ شِيْعًا ﴾ شریروں، فسادیوں اور فتنہ بازوں پر بولا گیا ہے۔“ [عمدة البيان (٣٥٣/١)]

﴿ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيْعًا ﴾ [القصص: ٤]

”بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور وہاں کے رہنے والوں کو شیعہ بنا دیا۔“
اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو شیعہ بنانے والا فرعون تھا۔

﴿ وَ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيْعًا ﴾ [الروم: ٣٢، ٣١]

”اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ شیعہ تھے۔“
اس آیت کی تفسیر میں شیعہ مفسر نے لکھا ہے:

”اس آیت میں شیعہ..... مشرکوں، بت پرستوں، دشمنان دین اور یہود و نصاریٰ کو کہا گیا ہے۔“

[عمدة البيان (١٣/٣)]

﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيْعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ﴾ [الانعام: ١٥٩]

”بے شک وہ لوگ جنہوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور شیعہ ہو گئے، ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔“

اس آیت نے صراحت کر دی کہ اللہ کے رسول ﷺ کا شیعوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جس فرقہ سے اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی تعلق نہ ہو، اس کے گمراہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں لفظ شیعہ گروہ بندی کے معنی میں ہے۔ اگر لفظ شیعہ سے خاص فرقہ مراد لیں تو خود سمجھ لیں کہ مذکورہ بالا پانچ آیات میں شیعہ کسے کہا گیا ہے۔

کیا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل اور مشکل کشا ہیں؟

(سوال) کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا ہیں اور خلیفہ بلا فصل ہیں، کیا ایسا عقیدہ کتاب و سنت کے خلاف نہیں؟

(جواب) اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ » [مسند احمد (۴۱۹/۵)]
 (۸۴/۱)، طبرانی کبیر (۴۰۵۲)، مجمع الزوائد (۱۲۸/۹)، (۱۴۶۱۰)، سند بزار (۲۵۱۹)، کتاب السنۃ
 لابن ابی عاصم (۵۹۰/۲)، ابن حبان (۲۲۰۵)، ترمذی (۳۷۱۲)، سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ (۱۷۵۰)]
 ”جس کا میں دوست ہوں علیؑ بھی اس کا دوست ہے، اے اللہ! جو علی سے دوستی لگائے تو بھی اسے دوست بنا
 اور نواس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔“

مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم اس کے الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ یہاں مولیٰ سے مراد دوست ہے یہاں مولیٰ سے مراد نہ خلیفہ
 بلافضل ہے اور نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ بلکہ خلیفہ بلافضل حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں اور مشکل کشا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے، جو
 ہر کسی کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ إِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ
 بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

”اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچا دے تو اسے دور کرنے والا کوئی نہیں مگر صرف وہی (یعنی اللہ تعالیٰ) اور اگر وہ آپ
 کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں، وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جسے
 چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مشکل اور مصیبت کو دور کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ ایک اور
 مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ءَ إِلَهَ مَعَ اللَّهِ
 قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴾ [النمل: ۶۲]

”بے کس و ناچار جب پکارے تو اس کی پکار کو قبول کر کے کون مصیبت کو دور کرتا ہے؟ اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا
 ہے کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (جو مشکل حل کر سکے) تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔“
 نبی کریم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے فرمایا:

﴿ وَ إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ وَ إِذَا اسْتَعْنَيْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ وَ اعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَيَّ أَنْ
 يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ وَ أَنْ اجْتَمَعُوا عَلَيَّ أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ
 لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ ﴾ [ترمذی، کتاب صفة القيامة: باب (۲۵۱۶)، مسند احمد
 (۲۹۳/۱-۳۰۳)]

”اور جب بھی تو سوال کرے اللہ سے سوال کر اور جب بھی تو مدد طلب کرے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر۔ یقین کر
 لے بلاشبہ اگر ساری امت اس بات پر جمع ہو جائے کہ وہ تجھے کسی چیز سے نفع پہنچائے تو وہ نفع نہیں پہنچا سکتی مگر وہی

جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور اگر ساری امت تجھے نقصان پہنچانے پر اکٹھی ہو جائے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر وہی جو اللہ نے تیرے خلاف لکھ دیا ہے۔“

مذکورہ بالا آیات اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک، مشکل کشا اور حاجت روا صرف اللہ کی ذات ہے، کائنات میں سے کوئی فرد بھی کسی کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو نصیحت کرتے ہوئے یہ بات سمجھا دی کہ آپ کی امت میں سے کوئی شخص بھی خواہ وہ نیک ہو یا بد، امیر ہو یا غریب، حکمران ہو یا رعایا، الغرض کوئی بھی کسی کی قسمت کا مالک نہیں۔ ہر قسم کا اختیار اللہ کے پاس ہے وہی مختار کل، مشکل کشا اور حاجت روا ہے۔

شیعہ اثنا عشریہ اور قرآن

(سوال) کیا شیعہ اثنا عشریہ ہمارے قرآن پر ایمان نہیں رکھتے؟

(جواب) اللہ وحدہ لا شریک لہ نے اپنے انبیاء و رسل پر کتب و صحائف نازل فرمائے اور اس سلسلے کی آخری کڑی امام اعظم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر بذریعہ جبریل امین قرآن نازل کیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَ بُشْرٰى لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ رُسُلِهِ وَ جِبْرِيلَ وَ مِيكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ۹۷-۹۸]

”آپ کہہ دیں جو شخص جبریل علیہ السلام کا دشمن ہے جس نے آپ کے دل پر اس قرآن کو اللہ کے حکم سے اتارا ہے جو اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس کے سامنے ہے اور یہ ہدایت و خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے (تو اللہ بھی اس کا دشمن ہے)۔ جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بھی کافروں کا دشمن ہے۔“

اس آیت کریمہ میں واضح کیا گیا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام یہ قرآن لے کر رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لِحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹]

”بے شک ہم نے اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَا يٰتِيْهِ الْبٰطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ

لَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿ [فصلت: ۴۱، ۴۲]

”بے شک وہ لوگ جنہوں نے قرآن حکیم کے ساتھ کفر کیا جب وہ ان کے پاس آیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ ہے۔“
معلوم ہوا کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جس میں باطل کو دخل نہیں اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری رب ذوالجلال والاکرام نے لے رکھی ہے۔ قرآن حکیم لاریب کتاب ہے، اس میں تبدیلی و تحریف ناممکن ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس جیسی کتاب نہ کوئی لاسکتا ہے اور نہ لاسکے گا۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ وحی الہی لوگوں کو سنانا شروع کی تو کفار نے کہا: ”اس میں کچھ ترمیم کرلو، تب ہم آپ ﷺ کی بات مان سکتے ہیں۔“ تو ارشاد الہی ہوا:

﴿ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلْنَاهُ فُلٌ مَّا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تَلَقَّائِيْ نَفْسِيْ إِنْ أَتَيْتُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴾ [يونس: ۱۵]

”اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ آپ ﷺ ان سے کہہ دیجیے کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں، میں تو بس اس وحی کا پیروکار ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔“
معلوم ہوا کہ وحی الہی قرآن پاک میں تغیر و تبدل کا حق کسی کو نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن حکیم ایک مکمل جامع کتاب ہے، اس میں کسی قسم کا شبہ، تغیر و تبدل اور تحریف ممکن نہیں۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرنے کے لیے کہا انہوں نے اسی طرح اس کو جمع کر دیا۔ قرآن پاک کی تحریف کا قائل مسلمان نہیں ہے۔ امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے نصاریٰ کا یہ الزام نقل کیا ہے:

”وَ أَيْضًا فَإِنَّ الرِّوَاغِضَ يَزْعُمُونَ أَنَّ أَصْحَابَ نَبِيِّكُمْ بَدَّلُوا الْقُرْآنَ وَ اسْقَطُوا مِنْهُ وَ

زَادُوا فِيهِ“ [الفصل في الملل والهواء والنحل (۷۵/۲)]

”نیز روافض دعویٰ کرتے ہیں کہ تمہارے نبی ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن پاک کو تبدیل کر دیا ہے اور اس میں سے کچھ آیات گرا دی ہیں اور کچھ زیادہ کر دی ہیں۔“

اس کا جواب دیتے ہوئے امام ابن حزم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ أَمَّا قَوْلُهُمْ فِي دَعْوَى الرِّوَاغِضِ تَبْدِيلُ الْقِرَاءَاتِ فَإِنَّ الرِّوَاغِضَ لَيْسُوا مِنَ الْمُسْلِمِينَ إِنَّمَا هِيَ فِرْقٌ حَدَثَتْ أَوْلَهَا بَعْدَ مَوْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخَمْسٍ وَ عِشْرِينَ سَنَةً وَ كَانَ مَبْدَأُهَا إِجَابَةٌ مِمَّنْ خَذَلَهُ اللَّهُ تَعَالَى لِذَعْوَةِ مَنْ كَادَ الْإِسْلَامَ وَ هِيَ طَائِفَةٌ تَحْرِي مَجْرَى

الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى فِي الْكُذْبِ وَالْكَفْرِ“ [الفصل في الملل والهواء والنحل (۷۰۱۲)]
 ”رہانصاری کا یہ کہنا کہ روافض کا دعویٰ ہے کہ صحابہ نے قرآن تبدیل کر دیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ روافض کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہے۔ یہ ایسے فرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ۲۵ سال بعد پیدا ہوئے اور ان فرقوں کی ابتدا اس شخص کی دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے ہوئی جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا داعی ہونے کی وجہ سے ذلیل و رسوا کر دیا تھا اور یہ روافض کا گروہ جھوٹا ہونے اور کفر میں یہود و نصاریٰ کے راستے پر گامزن ہے۔“

حافظ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث کے نزدیک تحریف قرآن کا قائل مسلمان نہیں ہے۔ روافض کو انھوں نے مسلمانوں میں شمار نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ تحریف قرآن کے قائل اور عقائد فاسدہ رکھتے تھے۔ شیعہ حضرات کا ایمان موجودہ قرآن کریم پر نہ ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

① شیعہ حضرات کے عقائد کا جزو لاینفک ہے کہ ناقلان قرآن اور راویان دین اسلام یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت جھوٹی تھی، ان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جس نے حق و صداقت کو دل و جان سے قبول کیا ہو اور ان کے نزدیک اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور دیگر ہزاروں صحابہ کی تعداد میں موجود تھا۔ دوسرا گروہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ پہلے گروہ کے جھوٹ کا نام انھوں نے نفاق رکھا ہے اور دوسرے گروہ کے جھوٹ کا نام تقیہ رکھا ہے۔ شیعہ حضرات کا مہذبہ الاسلام ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلبینی لکھتا ہے کہ امام باقر نے فرمایا:

”كَانَ النَّاسُ أَهْلَ رِدْيَةٍ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا ثَلَاثَةً فَقُلْتُ وَمَنِ الثَّلَاثَةُ؟ فَقَالَ الْمِقْدَادُ بْنُ الْأَسْوَدِ وَ أَبُو ذَرِّ الْعَفْغَارِيُّ وَ سَلْمَانُ الْفَارِسِيُّ“ [كتاب الروضة من الكافي (۲۴۰/۸)]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگ مرتد ہو گئے تھے، سوائے تین اشخاص کے۔“ راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا: ”وہ تین کون ہیں؟“ تو انھوں نے کہا: ”مقداد بن اسود، ابو ذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم۔“

قاضی نور اللہ شوشتری نے لکھا ہے کہ امام باقر سے روایت ہے:

”إِرْتَدَّ النَّاسُ إِلَّا ثَلَاثًا نَفَرِ سَلْمَانَ وَ أَبُو ذَرِّ وَ الْمِقْدَادُ“ [محالس المومنین (۲۰۳/۱)]

”تین کے سوا تمام لوگ مرتد ہو گئے تھے سلمان فارسی، ابو ذر غفاری اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم۔“

اس کے بعد لکھتا ہے:

”یعنی حضرت امام فرمود کہ جمیع مشاہیر صحابہ کہ استماع نص نبوی در باب خلافت امیر المومنین نمودہ بودند مرتد شدند الا سه نفر کہ سلمان و ابو ذر و مقداد است۔“ [محالس المومنین (۲۰۳/۱)]

”امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تمام مشہور صحابہ امیر المومنین کی خلافت کے بارے میں نص نبوی سننے کے باوجود پھر گئے

اور مرتد ہو گئے سوائے تین اشخاص کے یعنی سلمان، ابو ذر اور مقداد۔“
احمد بن علی الطبری نے لکھا ہے:

”وَمَا مِنَ الْأُمَّةِ أَحَدٌ بَاعَ مُكْرَهَا غَيْرَ عَلِيٍّ وَارْبَعَتِنَا“ [الاحتجاج (۸۴/۱)]

”امت میں سے کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس نے دلی رضا مندی کے بغیر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہو چار اشخاص کے سوا یعنی ابو ذر، سلمان، مقداد اور عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہم)۔“

طبری کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تمام امت مسلمہ نے دل و جان سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی، صرف مذکورہ چار اشخاص ایسے تھے جنہوں نے مجبوراً بیعت کی اور جو بات ان کے دل میں تھی وہ زبان پر نہ تھی۔ یعنی ان کا ظاہر و باطن ایک نہ تھا (العیاذ باللہ) زبان سے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور دل سے کسی اور کے ساتھ۔ شیخ الطائفہ الامامیہ ابو جعفر الطوسی رقمطراز ہیں:

”عَنْ حُمْرَانَ قَالَ قُلْتُ لِأَبِي جَعْفَرَ مَا أَقَلْنَا لَوْ اجْتَمَعْنَا عَلَى شَاةٍ مَا أَفْنَيْنَاهَا قَالَ فَقَالَ آلا أُخْبِرُكَ بِأَعَجَبٍ مِنْ ذَلِكَ؟ قَالَ فَقُلْتُ بَلَى قَالَ أَلَمْهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ ذَهَبُوا إِلَّا وَ أَسَارَ بِيَدِهِ ثَلَاثَةٌ“ [رجال کشی، (ص ۷۱)]

”حمران نے کہا میں نے امام باقر سے کہا: ”ہماری تعداد کس قدر کم ہے، اگر ہم ایک بکری پر جمع ہوں تو اسے بھی ختم نہ کر پائیں۔“ امام نے کہا: ”میں تجھے اس سے بھی عجیب بات نہ بتاؤں؟“ میں نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ فرمایا: ”مہاجرین و انصاریوں کے علاوہ سب چلے گئے یعنی مرتد ہو گئے تھے۔“

شیعہ حضرات کے مذکورہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تمام صحابہ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گئے تھے اور یہ عقیدہ انہوں نے اپنے مزعومہ ائمہ معصومین سے نقل کیا ہے۔ شیعہ حضرات کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں موقف مزید معلوم کرنا ہو تو اسد حیدر کی کتاب ”الصحابة في نظر الشيعة الامامية“ مطبوعہ قاہرہ اور باقر مجلسی کی ”بحار الأنوار“ سے مطالعن پر مشتمل جلدوں کا مطالعہ کریں۔ جس سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک دین اسلام کے راویان اور ناقلان قرآن جھوٹے تھے، جب تک عدالت و عظمت صحابہ کو شیعہ حضرات تسلیم نہیں کر لیتے اتنی دیر تک ان کا قرآن حکیم پر ایمان درست نہیں ہو سکتا اور صحابہ پر تمنا اور سب و شتم کرنا ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی موجودگی میں قرآن حکیم پر ایمان محال و ناممکن ہے۔ تقیہ اور کتمان کے بارے میں اصول کافی وغیرہ کتب کا مطالعہ کر لیں۔

② شیعہ علماء کے اقرار کے مطابق اس قرآن کو خلفائے ثلاثہ نے جمع کیا اور انہیں کے انتظام و انصرام سے یہ پوری دنیا میں پھیلا یا گیا اور اس موجودہ قرآن کی قابل و وثوق تصدیق ان کے ائمہ معصومین سے نہیں ملتی اور خلفائے ثلاثہ کے متعلق شیعہ کا عقیدہ ہے کہ وہ دین دشمن تھے اور اسلام کے لبادے میں حصول حکومت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پوچھے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیتے تھے اور ان کے رعب کی وجہ

سے آپ ﷺ خلافت بلا فصل کا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لیے کھلے عام واضح اور دو ٹوک اعلان نہ کر سکے۔ لہذا جو چیز دین دشمن لوگوں نے لکھ کر پھیلا دی ہو وہ معتبر اور قابل وثوق کیسے ہو سکتی ہے؟ شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو لوگ مرتد ہو گئے اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گئے اور اپنے لیے زمام حکومت پر قابض ہو گئے۔ علی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے غسل اور کفن دفن کے بعد اپنے گھر میں محصور ہو کر قرآن تالیف کرنے لگے۔ جب قرآن پاک جمع کر لیا تو اسے انصار و مہاجرین کے پاس لے کر آئے، اس لیے کہ اس بات کی انھیں رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی تھی۔ فصل الخطاب میں ہے:

”فَلَمَّا فَتَحَهُ أَبُو بَكْرٍ خَرَجَ فِي أَوَّلِ صَفْحَةٍ فَتَحَهَا فَضَاعِلُ الْقَوْمِ فَوَلَّبَ عُمَرُ وَقَالَ يَا عَلِيُّ! أَرُدُّهُ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِيهِ فَأَخَذَهُ عَلِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَانْصَرَفَ“ [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب (ص: ۷۰)]

”جب اسے ابو بکر نے کھولا تو پہلے صفحہ پر قوم کی فضیحتوں اور رسوائیوں کا ذکر تھا تو عمر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: ”اے علی! اس کو لے جاؤ، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔“ علی رضی اللہ عنہ نے اس قرآن کو لیا اور چلے گئے۔“

پھر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قاری قرآن کو بلا کر نیا قرآن لکھوایا گیا اور اس میں سے انصار و مہاجرین کی ذلت و رسوائی والی آیات کو نکال دیا گیا۔ [الاحتجاج للطبرسی (۱۰۶/۱)]

دوسری روایت میں ہے کہ جب صحابہ نے کہا: ”ہمیں تمہارے جمع کردہ قرآن کی حاجت نہیں۔“ تو علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”وَاللَّهِ مَا تَرَوْنَهُ بَعْدَ يَوْمِكُمْ هَذَا“ [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب (ص: ۷۰)]

”اللہ کی قسم! تم اس قرآن کو آج کے بعد کبھی نہیں دیکھو گے۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ شیعہ حضرات کے نزدیک موجودہ قرآن کے جامع ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے اور انھوں نے اسے حضرت زید بن ثابت سے لکھوا کر دنیا میں پھیلا دیا اور اصل قرآن جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا وہ تسلیم نہ کیا تو علی رضی اللہ عنہ نے اسے غائب کر دیا۔ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا پھیلا یا ہوا قرآن ہی آج دنیا میں پڑھا جا رہا ہے اور اس کے حافظین دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں شیعہ حضرات کا عقیدہ ملاحظہ ہو۔ ملا باقر مجلسی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

”ابو بکر و عمر ہر دو کافر بودند و ہر کہ ایشان را دوست دارد کافر است۔“

”ابو بکر و عمر دونوں کافر تھے اور ان سے دوستی رکھنے والا ہر فرد بھی کافر ہے۔“ (العیاض باللہ) [حق الیقین (ص: ۵۴۲)]

اس کے بعد لکھتا ہے:

”و دریں باب احادیث بسیار است و در کتب متفرق است و اکثر در بحار الانوار مذکور است“ [حق الیقین (ص: ۵۴۲)]

”اس بارے میں بہت سی روایات ہیں اور متفرق کتب میں موجود ہیں اور اکثر کا ذکر ”بجاء الانوار“ میں موجود ہے۔“
بجاء الانوار باقر مجلسی ہی کی کتاب ہے، جو ۱۱۰ جلدوں میں چھپی ہے اور راقم الحروف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مجلسی نے لکھا ہے:

”اعتقاد ما در براءت آنستکه بیزاری جو بند از بت هائے چهار گانه یعنی ابو بکر و عمر و عثمان و معاویہ و زنان چهار گانه یعنی عائشہ و حفصہ و ہند و ام الحکم و از جمیع اشیاع و اتباع ایشان و آنکہ ایشان بدترین خلق خدا بند و آنکہ تمام نمی شود اقرار بخدا و رسول و ائمہ مگر بہ بیزاری از دشمنان ایشان۔“ [حق الیقین (ص ۵۳۹)]
”تمرا کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ چار بتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی ابو بکر، عمر، عثمان اور معاویہ سے اور چار عورتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی عائشہ، حفصہ، ہند اور ام الحکم سے اور ان کے تمام پیروکاروں سے اور یہ اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ تھے اور یہ کہ اللہ پر، رسول پر اور ائمہ پر ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک ان دشمنوں سے بیزاری نہ کریں۔“

مشہور شیعہ مفسر علی بن ابراہیم قمی رقمطراز ہیں:

”آیت ﴿ وَكَرِهَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ میں کفر سے مراد ابو بکر، فسوق سے مراد عمر اور عصیان سے مراد عثمان ہیں۔“ (العیاذ باللہ) [تفسیر قمی (۳۱۹/۲)]، نیز دیکھیں تفسیر الصافی (۵۹۰/۲)،
تفسیر نور الثقلین (۸۳/۵)]

مولوی مقبول حسین دہلوی لکھتا ہے:

”کافی اور تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق سے روایت ہے کہ ﴿ حَبَبَ إِلَيْكُمْ الْإِيمَانَ ﴾ میں ایمان سے اور ﴿ زَيْنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ ﴾ میں ضمیر غائب سے مراد جناب امیر المؤمنین ہیں اور ﴿ كَرِهَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾ میں کفر سے مراد ہیں حضرت اول اور فسوق سے مراد ہیں حضرت ثانی اور العصیان سے

حضرت ثالث۔“ [ترجمہ و تفسیر مقبول دہلوی (ص: ۸۲۳)]

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے نزدیک قرآن کا انتظام و انصرام کرنے والے اور اسے نقل کروا کے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلانے والے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے چنانچہ ان کی سب سے زیادہ دشمنی ان کے ساتھ ہے اور ان سے بیزاری کا اظہار کرنا ان کا عقیدہ ہے، اس عقیدے کی موجودگی میں یہ موجودہ قرآن پر کیسے ایمان رکھ سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر وہ اس قرآن کو مان لیں تو ان کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

③ تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ تحریف قرآن کے بارے میں شیعہ حضرات کی امہات الکتاب میں دو ہزار سے زائد روایات موجود ہیں، جن میں پانچ قسم کی تحریف کا ذکر ہے: (۱) کمی (۲) زیادتی (۳) تبدیلی الفاظ (۴) تبدیلی حروف (۵) آیات و

سور اور کلمات کی خرابی ترتیب، پھر ان روایات میں شیعہ حضرات کے معتبر اور ثقہ علماء کے تین اقرار ہیں۔

① یہ روایات متواتر ہیں اور ان کی تعداد مسئلہ امامت کے متعلق مروی روایت سے کم نہیں۔

② یہ روایات تحریف قرآن پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔

③ ان روایات کے مطابق شیعہ کا تحریف قرآن کا عقیدہ بھی ہے۔

ایران سے مرزا حسین بن محمد تقی نوری طبری شیعہ کی ایک کتاب ۱۲۹۸ھ میں بنام ”فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب“ شائع ہوئی، جس میں مؤلف نے ہر عقلی و نقلی طریقے سے یہ بات اپنے مذہب کی اہمات الکتب سے ثابت کی ہے کہ قرآن محرف و مبدل ہے۔ موجودہ قرآن پر شیعہ کا ایمان نہیں ہے اور یہ شیعہ کے ثقہ علماء میں سے ہے اور شیعہ رجال کے تراجم پر ایران و ہندوستان سے جتنی کتب طبع ہوئیں ان میں سے اکثر کے اندر اس کا ذکر بڑے بھاری القابات سے کیا گیا ہے، مثلاً شیخ عباس قمی نے ”فوائد رضویہ (ص: ۱۵)“ میں لکھا ہے:

”سَحَابُ الْفَضْلِ بَحْرُ الْعِلْمِ الَّذِي لَيْسَ لَهُ سَاحِلٌ“

”مرزا حسین بن محمد نوری فضل کا بادل..... اور علم کا ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔“

نیز ایک اور کتاب میں لکھا ہے:

”إِمَامٌ أَيْمَةٌ الْحَدِيثِ كِبَارُ رِجَالِ الْإِسْلَامِ“ [مستدرک ابو سائل (۴۱۱)]

”حدیث کے اماموں کا امام ہے اور اسلام کے عظیم آدمیوں میں سے ہے۔“

معلوم ہوا کہ فصل الخطاب کا مؤلف شیعہ حضرات کے ہاں بڑا معتبر محدث اور بحر العلوم ہے اور یہ کتاب اس نے حضرت علیؑ کے روضہ میں بیٹھ کر مکمل کی ہے۔ اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتا ہے:

”وَ قَدْ فَرَعْتُ مِنْ تَنْمِيقِ هَذِهِ الْأُورَاقِ رَجَاءَ الْإِنْتِفَاعِ بِهَا فِي يَوْمٍ يُكْشَفُ عَنْ سَاقِ الْعَبْدِ

الْمُدْنِبِ الْمُسِيءِ الْمَسِيءِ حُسَيْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ تَقِيُّ النُّورِ الطَّبْرَسِيِّ فِي مَشْهَدِ مَوْلَانَا أَمِيرِ

الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِلْيَتِيمِينَ أَنْ بَقِيََا مِنْ شَهْرِ جُمَادَى الْأُخْرَى مِنْ سَنَةِ اثْنَتَيْنِ بَعْدَ الْأَلْفِ“

”امیر المؤمنین کے روضہ میں بیٹھ کر ان اوراق کے لکھنے سے بندہ گناہ گار حسین بن محمد تقی النوری الطبرسی ۲۸ جمادی

الآخری ۱۲۹۲ھ میں قیامت والے دن نفع کی امید کرتے ہوئے فارغ ہوا۔“

اور یہ مقام شیعہ کے ہاں بابرکت اور اقدس البقاع ہے اور جب یہ مؤلف فوت ہوا تو اسے نجف میں مشہد مرتضوی کے صحن میں دفن کیا گیا اور مشہد مرتضوی یعنی حضرت علیؑ کا روضہ شیعہ کے ہاں اقیاء کے دفن کا مقام ہے۔ لہذا اس کتاب کا مؤلف ان کے ہاں بڑا معتبر محدث ہے اور اس نے فصل الخطاب لکھ کر ثابت کر دیا کہ شیعہ اس قرآن کو تسلیم نہیں کرتے۔

اس کتاب میں لکھا ہے:

”أَنَّ الْأَخْبَارَ الدَّالَّةَ عَلَى ذَلِكَ تَزِيدُ عَلَى أَلْفَيْ حَدِيثٍ وَ أَدْعَى اسْتِفَافَتَهَا جَمَاعَةٌ كَالْمُفِيدِ وَ

المُحَقِّقِ الدَّامِدِ وَ الْعَلَامَةِ الْمَجْلِسِيِّ وَ غَيْرِهِمْ“ [فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب (ص ۲۰۱)]

”تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی احادیث دو ہزار سے زائد ہیں اور ان کے مشہور ہونے کا دعویٰ علماء کی ایک جماعت نے کیا ہے جیسے شیخ مفید، محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ ہیں۔“
اس مؤلف نے سید نعمت اللہ الجزائری الشیبی کے حوالے سے لکھا ہے:

”إِنَّ الْأَصْحَابَ قَدْ أَطْبَقُوا عَلَى صِحَّةِ الْأَخْبَارِ الْمُسْتَفِيضَةِ بِلِ الْمُتَوَاتِرَةِ الدَّالَّةِ بِصَرِيحِهَا عَلَى وَقُوعِ التَّحْرِيفِ فِي الْقُرْآنِ كَلَامًا وَ مَادَّةً وَ إِعْرَابًا وَ التَّصْدِيقِ بِهَا“ [فصل الخطاب (ص ۳۱۱)، الأنوار النعمانية (۲/۳۵۷)]

”اصحاب امامیہ نے ان مشہور روایات کی صحت بلکہ تواتر پر اتفاق کیا ہے، ایسا تواتر جو صراحتاً قرآن پاک میں تحریف پر دلالت کرتا ہے، یہ تحریف کلام و مادہ اور اعراب میں ہے اور ان روایات کی تصدیق پر بھی علمائے شیعہ نے اتفاق کیا ہے۔“

شیعہ کی معتبر کتاب اصول کافی میں روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”إِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِي جَاءَ بِهِ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَى مُحَمَّدٍ سَبْعَةَ عَشَرَ آيَةً“

”بلاشبہ جو قرآن جبرئیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے کر آئے اس کی سترہ ہزار آیات تھیں۔“

اس حدیث کی شرح میں ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے:

”فَالْخَبْرُ صَحِيحٌ وَ لَا يَخْفَى أَنَّ هَذَا الْخَبَرَ وَ كَثِيرًا مِنْ الْأَخْبَارِ الصَّحِيحَةِ صَرِيحَةٌ فِي نَقْصِ الْقُرْآنِ وَ تَغْيِيرِهِ وَ عِنْدِي أَنَّ الْأَخْبَارَ فِي هَذَا الْبَابِ مُتَوَاتِرَةٌ مَعْنَى وَ طَرَحُ جَمِيعِهَا يُوجِبُ رَفْعَ الْأَعْتِمَادِ عَنِ الْأَخْبَارِ رَأْسًا بَلْ ظَنِّي أَنَّ الْأَخْبَارَ فِي هَذَا الْبَابِ لَا يَقْصُرُ عَنْ أَخْبَارِ الْإِمَامَةِ فَكَيْفَ يُشْتَوْنَهَا بِالْخَبَرِ“ [مرآة العقول فی شرح اخبار آل الرسول (۲/۵۲۵)]

”یہ خبر صحیح ہے پس مخفی نہ رہے کہ یہ خبر اور دیگر بہت ساری صحیح روایات صراحتاً قرآن پاک میں کمی اور تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں اور میرے نزدیک تحریف قرآن کے مسئلہ میں روایات معناتواتر ہیں اور ان سب روایات کو ترک کرنا تمام ذخیرہ احادیث سے اعتماد کو اٹھانا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ تحریف قرآن کی روایات مسئلہ امامت کی روایات سے کم نہیں، اگر ان روایات کا اعتبار نہ ہو تو مسئلہ امامت روایات سے کیسے ثابت کریں گے؟“

مرزا حسین بن محمد بن تقی نوری طبرسی لکھتا ہے:

”الْأَخْبَارُ الْكَثِيرَةُ الْمُعْتَبَرَةُ الصَّرِيحَةُ فِي وَقُوعِ السَّقْطِ وَ دُخُولِ النُّقْصَانِ فِي الْمَوْجُودِ مِنَ الْقُرْآنِ“ [فصل الخطاب (ص ۲۳۵)]

”بہت ساری معتبر روایتیں موجودہ قرآن میں کمی پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں۔“
ملائف کا شافی لکھتا ہے:

”وَ أَمَّا اعْتِقَادُ مَشَائِحِنَا فِي ذَلِكَ فَالظَّاهِرُ مِنْ نِقَّةِ الْإِسْلَامِ مُحَمَّدٌ بْنُ يَعْقُوبَ الْكَلْبِيِّ إِنَّهُ كَانَ يَعْتَقِدُ التَّحْرِيفَ وَ النُّقْصَانَ فِي الْقُرْآنِ لِأَنَّهُ كَانَ رَوَى رِوَايَاتٍ فِي هَذَا الْمَعْنَى فِي كِتَابِهِ الْكَافِي وَ لَمْ يَتَعَرَّضْ لِقَدْحِ فِيهَا مَعَ أَنَّهُ ذَكَرَ فِي أَوَّلِ الْكِتَابِ أَنَّهُ كَانَ يَتَّقِي بِمَا رَوَاهُ فِيهِ وَ كَذَلِكَ أَسْتَاذُهُ عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْقُمِّيِّ فَإِنَّ تَفْسِيرَهُ مَمْلُوءٌ مِنْهُ وَ لَهُ غُلُوبٌ فِيهِ وَ كَانَ الشَّيْخُ أَحْمَدُ بْنُ أَبِي طَالِبٍ الطَّبْرَسِيُّ فَإِنَّهُ أَيْضًا نَسَجَ عَلَيَّ مِنْوَالِهِمَا فِي كِتَابِ الْإِحْتِجَاجِ“ [مقدمة تفسير صافی (۳۴۱)]

”بہر کیف تحریف قرآن کے بارے میں ہمارے مشائخ کا عقیدہ تو ظاہر بات ہے کہ ثقہ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی قرآن پاک میں تحریف اور کمی کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے اپنی کتاب اصول کافی میں اس معنی کی روایات بیان کی ہیں اور ان پر جرح نہیں کی باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا میں ذکر کیا ہے کہ جو روایات وہ اس میں لائیں گے اس پر انھیں اعتماد ہے۔ اسی طرح ان کے استاذ علی بن ابراہیم قمی کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ان کی تفسیر قمی اس بات سے بھری پڑی ہے اور انھوں نے اس میں غلو سے کام لیا ہے اور شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی بھی ان دونوں کے منہ پر اپنی کتاب الاحتجاج میں چلے ہیں۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ثقہ جعفریہ کی امہات الکتب میں دو ہزار سے زائد روایات تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں اور یہ ان کے ہاں متواتر روایات ہیں۔ ان کا مقام بھی وہی ہے جو مسئلہ امامت کی روایات کا ہے اور مسئلہ امامت ان کے ہاں اصول دین سے ہے۔ اگر ان روایات کا انکار کریں گے تو اپنے اصول دین کا انکار کرنا پڑے گا اور ان روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ قرآن محرف ہو چکا ہے، اس میں کمی بیشی، تبدیلی حروف و کلمات وغیرہ کی صورت میں ہوئی ہے اور تحریف قرآن پر ان کے ثقہ علماء کا اتفاق ہے۔ تفسیر قمی جو ان کی پہلی تفاسیر میں سے ہے اور بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے اور اس کا مؤلف علی بن ابراہیم قمی ان کے ہاں ثقہ محدث و مفسر ہونے کے ساتھ گیارہویں امام حسن عسکری کے دور کا ہے۔ اس میں تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی کثیر روایات موجود ہیں اور اس کا شاگرد محمد بن یعقوب کلینی جو اصول کافی وغیرہ کا مؤلف ہے اور یہ کتاب ان کے ہاں ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں بخاری شریف ہے۔ یہ بھی تحریف قرآن کا قائل ہے اور اس کے علاوہ ان کے علماء کی بہت بڑی تعداد صراحتاً تحریف قرآن پر عقیدہ رکھتی ہے۔ بعض شیعہ حضرات اپنے چار علماء کا نام لیتے ہیں کہ وہ تحریف کے قائل نہ تھے:

① سید شریف مرتضیٰ ② شیخ صدوق ③ ابو جعفر طوسی ④ ابو علی طبرسی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی تحریف کے قائل تھے۔ انھوں نے قرآن کے محرف نہ ہونے کا قول تقیہ کرتے ہوئے اور بعض

مصلحتوں کی بنیاد پر اختیار کیا کیونکہ سید شریف مرتضیٰ نے اپنے رسالہ ”المحکم والمتشابہ المعروف بتعبد النعمانی“ (ص: ۲۶) میں لکھا ہے:

”وَأَمَّا مَا حُرِّفَ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ فَقَوْلُهُ «كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ» فَحُرِّفَتْ إِلَى خَيْرِ أُمَّةٍ“

مقصود یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ”ائمہ“ کو ”امہ“ سے بدل دیا گیا ہے۔ اسی طرح کی کئی مثالیں شریف مرتضیٰ نے اس مقام پر ذکر کر کے واضح کر دیا کہ یہ اس بات کا قائل ہے کہ قرآن حکیم میں تحریف کی گئی ہے۔ مرزا حسین بن محمد نے فصل الخطاب میں ذکر کیا ہے کہ ان متقدمین میں کوئی موافق نہیں ہے۔ سید نعمت اللہ الجزائر شیعی نے لکھا ہے:

”وَ الظَّاهِرُ أَنَّ هَذَا الْقَوْلَ إِنَّمَا صَدَرَ مِنْهُمْ لِاجْتِزَاءِ مَصَالِحِ كَثِيرَةٍ مِنْهَا سَدُّ بَابِ الطَّعْنِ عَلَيْهَا بِأَنَّهُ إِذَا جَازَ هَذَا فِي الْقُرْآنِ فَكَيْفَ جَازَ الْعَمَلُ بِقَوَاعِدِهِ وَ أَحْكَامِهِ مَعَ جَوَازِ لُحُوقِ التَّحْرِيفِ لَهَا، كَيْفَ وَ هَوْلَاءِ الْأَعْلَامِ رَوَوْا فِي مُؤَلَّفَاتِهِمْ أَحْبَابًا كَثِيرَةً تَشْتَمِلُ عَلَى وَقُوعِ تِلْكَ الْأُمُورِ فِي الْقُرْآنِ وَإِنَّ الْآيَةَ هَكَذَا أُنزِلَتْ ثُمَّ غَيَّرَتْ إِلَى هَذَا“ [الأنوار النعمانية (۲/۳۵۸)]

”ظاہر ہے کہ ان حضرات کا یہ انکار چند مصلحتوں پر مبنی تھا جن میں سے ایک یہ ہے کہ طعن کا دروازہ بند کرنے کے لیے کہ جب قرآن میں تحریف جائز ہے تو اس کے قواعد اور احکام پر عمل کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ باوجود اس کے کہ ان میں تحریف کا واقع ہونا جائز ہے اور یہ قرآن کے غیر محرف ہونے کا عقیدہ کیسے رکھ سکتے تھے؟ جب کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں بہت ساری ایسی روایات درج کی ہیں جو تحریف قرآن پر مشتمل ہیں اور بتاتی ہیں کہ فلاں آیت اس طرح نازل ہوئی پھر اس طرح بدل دی گئی۔“

معلوم ہوا کہ ان چاروں نے بھی تقیہ کرتے ہوئے اور بعض مصلحتوں کی بنا پر کہہ دیا کہ قرآن محرف نہیں حالانکہ یہ تحریف کے قائل تھے۔ بعض شیعہ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ ہم تو اس قرآن کو مانتے ہیں اور اسے ہی پڑھتے پڑھاتے ہیں، لہذا ہم کیسے اس کی تحریف کے قائل ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی صرف مغالطہ ہے کیونکہ یہ تقیہ کی آڑ میں ایسا کہتے ہیں، ان کو یہ حکم ہے کہ جب تک بارہواں امام اصل قرآن لے کر نہیں آتا تم اسے ہی پڑھتے رہو، جب وہ اصل قرآن لے کر آئے گا تو پھر اس کی تلاوت ہو گی۔ مولوی مقبول دہلوی سورہ یوسف کی آیت (۳۹) میں ”يُعْصِرُونَ“ کے لفظ کے بارے میں لکھتا ہے:

”معلوم ہوتا کہ جب قرآن میں ظاہر اعراب لگا دیے گئے تو شراب خور خلفاء کی خاطر يُعْصِرُونَ کو يُعْصِرُونَ سے بدل کر معنی کو زیر و زبر کیا گیا ہے یا مجہول کو معروف سے بدل کر لوگوں کے لیے ان کے کتوت کی معرفت آسان کر دی۔ ہم اپنے امام کے حکم سے مجبور ہیں کہ جو تفسیر یہ لوگ کر دیں تم اس کو اس کے حال پر رہنے دو اور تغیر کرنے والے کا عذاب کم نہ کرو، ہاں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو اصل حال سے مطلع کر دو۔ قرآن کو اس کی اس حالت پر لانا جناب

صاحب العصر ؑ کا حق ہے اور انہی کے وقت میں وہ حسب تنزیل خدائے تعالیٰ پڑھا جائے گا۔ [ترجمہ و تفسیر مقبول دہلوی (ص/۳۸۴)]

نیز دیکھیں شیعہ حضرات کی معتبر کتب ”الأنوار النعمانية (۳۶۰/۲)، المقدمة السادسة من تفسیر الصافی (۲۵/۱)، بصائر الدرجات الجزء الرابع (ص/۱۹۳)“

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس قرآن کو پڑھنے پر مجبور ہیں اور ان کے نزدیک اصل قرآن ان کا بارہواں امام صاحب العصر والزمان لے کر آئے گا۔ اس کے ظہور تک یہ اسے ہی پڑھتے رہیں گے، حقیقت میں ان کا اس پر ایمان نہیں ہے۔ لہذا واضح ہو گیا کہ ان کا ایمان نہ قرآن پر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ قرآن پر صحیح ایمان لے آئیں تو فقہ جعفریہ کا خون ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حقائق کو سمجھ کر صحیح عمل کی توفیق نصیب کرے اور باطل مذاہب سے محفوظ رکھے۔ شیعہ حضرات کے اس موقف کی تفصیل کے لیے ان کی کتاب ”فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب“ اور علامہ احسان الہی ظہیر ؒ کی ”الشیعة والقرآن“ ملاحظہ ہو۔

ماہ محرم کی بدعات اور ناجائز امور

سوال ماہ محرم کی بدعات اور ان کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈال دیں تاکہ سمجھ دار لوگ اس برائی سے بچ سکیں؟

جواب ماہ محرم میں تعزیہ نکالنا، غازی عباس کے نام کا پنچر نکالنا، ڈولی بنانا، عورتوں کا بازاروں میں مردوں کے ساتھ مل کر سینہ کوئی کرنا جیسے تمام امور سراسر بدعت اور ناجائز ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

① سیدہ عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَحَدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاری، کتاب الصلح: باب إذا اصطلموا علی صلح جور فالصلح مردود (۲۶۹۷)، مسلم، کتاب الأفضیة: باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور (۱۷۱۸)]

”جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی وہ مردود ہے۔“

② یہی حدیث سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ سے ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

« مَنْ أَحَدَثَ فِي دِينِنَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [شرح السنة (۲۱۱/۱)]

”جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو پہلے اس میں نہیں تھی تو وہ مردود ہے۔“

③ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ » [مسلم، کتاب الأفضیة: باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور (۱۷۱۸)]

”جس نے ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں وہ مردود ہے۔“

③ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«إِنَّ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَإِنَّ مَا تُوَعَّدُونَ لَأَيُّ وَ مَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ» [بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة: باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ (۷۲۷۷)]

”بے شک سب سے بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے، سب سے اچھی سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے اور سب سے بدترین کام نئے ایجاد کردہ (یعنی بدعات) ہیں۔ بے شک جو تم وعدہ دیے گئے ہو وہ آنے والا ہے اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔“

⑤ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا خطبہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کہتے تھے:

«فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَ خَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ شَرَّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» [مسلم، کتاب الجمعة: باب تخفيف الصلاة والخطبة (۸۶۷)]

”یقیناً سب سے بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے، سب سے بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور سب سے بدترین کام نئے ایجاد کردہ (یعنی بدعات و خرافات) ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“
 مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ ہدایت و رہنمائی، طریقہ و راستہ صرف وہی برحق ہے جس پر محمد ﷺ تھے اور جو کام نبی کریم ﷺ کی سنت سے ثابت نہ ہو بلکہ خود تراشیدہ ہو وہ گمراہی و بدعت ہے۔

مذکورہ بالا امور نبی کریم ﷺ سے ہرگز ثابت نہیں بلکہ نبی ﷺ نے تو چہرہ پینے اور سینہ کوبی کرنے سے منع فرمایا ہے:
 سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَ شَقَّ الْجُيُوبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ» [بخاری، کتاب الحناظر: باب ليس منا من شق الجيوب (۱۲۹۴)، شرح السنة (۴۳۶/۵)]

”جس نے رخسار پینے اور گریبان چاک کیے اور جاہلیت کے واویلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔“
 اسی طرح نوحہ گری کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَرْبَعٌ فِي أُمَّتِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُونَهُنَّ الْفَخْرُ فِي الْأَحْسَابِ وَ الطَّعْنُ فِي الْأَنْسَابِ وَ الْإِسْتِسْقَاءُ بِالنَّجُومِ وَ النَّيَاحَةُ» [مسلم، کتاب الحناظر: باب التشديد في النياحة (۹۳۴)، شرح السنة (۴۳۷/۵)]

”میری امت میں چار کام جاہلیت کے امر سے ہیں جنہیں یہ ترک نہیں کریں گے: (۱) خاندانی وقار پر فخر کرنا۔ (۲) نسب ناموں میں طعن کرنا۔ (۳) ستاروں کے ذریعے پانی طلب کرنا۔ (۴) نوحہ گری کرنا۔“

اسی طرح اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« النَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتَّبِ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ عَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانَ وَ دِرْعٌ مِّنْ جَرَبٍ »

”جب نوحہ کرنے والی نے اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کی تو قیامت والے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ اس پر گندھک کا کرتہ اور خارش کی قمیص ہوگی۔“

ابو بردہ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو سخت تکلیف تھی کہ غشی طاری ہوگی اور ان کا سران کے گھر کی کسی عورت کی گود میں تھا تو ان کے گھر سے ایک عورت چلائی، انھیں طاقت نہ تھی کہ اس عورت کو کوئی جواب دیتے، جب افاتہ ہوا تو فرمایا:

« أَنَا بَرِيٌّ مِّمَّا بَرِيٌّ مِنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرِيٌّ مِنَ الصَّالِقَةِ وَ الْحَالِقَةِ وَ الشَّاقِقَةِ » [مسلم، کتاب الایمان: باب تحریم ضرب الحدود.....(۱۰۴)]

”جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیزار تھے میں بھی اس سے بیزار ہوں یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی، بال منڈانے والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے بری تھے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ تعزیت کے جلوس نکالنا، آہ و بکا کرنا، سینہ کوبی، ماتم کرنا، مرہیے کہنا اور نوحہ گری کرنا شریعت اسلامیہ میں ممنوع و حرام ہے۔ اب فقہ جعفری کے دو حوالے ذکر کرتا ہوں:

① فقہ جعفری کی معروف کتاب ”الأنوار النعمانية“ میں معراج کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ رَأَيْتُ الْمَرْأَةَ عَلَى صُورَةِ الْكَلْبِ وَ النَّارُ تَدْخُلُ فِي دُبُرِهَا وَ تَخْرُجُ مِنْ فِيهَا وَ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ رَأْسَهَا وَ يَدَهَا بِمَقَامِعَ مِنَ النَّارِ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ عَلَيْهَا السَّلَامُ حَبِيبِي وَ قُرَّةُ عَيْنِي! أَخْبِرْنِي مَا كَانَ عَمَلُهُنَّ حَتَّى وَضَعَ اللَّهُ عَلَيْهِنَّ الْعَذَابَ فَإِنَّهَا كَانَتْ قَيْنَةً نَوَاحَةَ حَاسِدَةً »

[الأنوار النعمانية (۲۱۶/۱)، نیز دیکھیں کتاب حیات القلوب (۵۴۲/۲)، عیون اخبار الرضا (۱۰۱/۲)]

”میں نے ایک عورت کتے کی شکل میں دیکھی، جس کے پیچھے سے آگ داخل ہوتی اور منہ سے نکلتی تھی۔ فرشتے آگ کے ہتھوڑوں سے اس کے سر اور ہاتھوں کو مارتے تھے۔“ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”میرے محبوب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک! مجھے بتائیں کہ ان عورتوں کا کیا عمل تھا کہ اللہ نے ان پر عذاب مسلط کر رکھا تھا؟“ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری بیٹی! وہ گانے والی، نوحہ گرا اور حسد کرنے والی عورت تھی۔“

② سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”مَنْ جَدَّدَ قَبْرًا أَوْ مَثَلًا مِثْلًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ“ [من لا يحضره الفقيه (۱۲۰/۱)]
 ”جس نے کسی قبر کی تجدید کی یا کوئی شئیہ بنائی تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔“
 نیز صاحب کتاب نے ”مَثَلٌ مِثْلًا“ کی یہ شرح کی ہے:

”مَنْ أَبْدَعَ بَدْعَةً وَ دَعَا إِلَيْهِ أَوْ وَضَعَ دِينًا فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ“ [من لا يحضره الفقيه (۱۲۱/۱)]
 ”جس نے کوئی بدعت ایجاد کی اور اس کی طرف دعوت دی یا دین بنایا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔“

مذکورہ بالا فقہ جعفریہ کے حوالہ جات سے واضح ہو گیا کہ نوحہ گری کرنا یا شئیہ بنانا مثلاً غازی عباس کا علم اور ہاتھ وغیرہ بنانا شرعاً حرام ہے اور ایسے امور ہیں جنہیں دین سمجھ کر اسلام میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ان رسمی جلوسوں، تعزیوں اور نوحہ گری کی پارٹیوں کا گلی بازار وغیرہ میں گھومنا اسلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ بدعات خیر القرون کے بعد کی ایجاد ہیں۔
 امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ۳۵۲ھ کے حالات میں رقمطراز ہیں:

”فِي عَاشِرِ الْمُحَرَّمِ مِنْ هَذِهِ السَّنَةِ أَمَرَ مَعِزُّ الدَّوْلَةِ مِنْ بُوَيْهِ قَبْحَهُ اللَّهُ أَنْ تُلْعَقَ الْأَسْوَاقُ
 وَأَنْ يَلْبَسَ النِّسَاءُ الْمَسْجُوجَ مِنَ الشَّعْرِ وَأَنْ يَخْرُجْنَ فِي الْأَسْوَاقِ حَاسِدَاتٍ عَنْ وُجُوهِنَّ
 نَاشِرَاتٍ شَعُورِهِنَّ يَلْطُمْنَ وَجُوهُنَّ يَنْعَنَ عَلَى الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ وَ
 لَمْ يُمْكِنُ أَهْلُ السَّنَةِ مَنَعَ ذَلِكَ لِكثَرَةِ الشَّبَعَةِ وَظُهُورِهِمْ وَكُونَ السُّلْطَانِ مَعَهُمْ“
 [البدایة والنہایة (۲۳۰/۱۱)]

”اس سال کے دس محرم کو معز الدولہ بن بویہ (اللہ اس کا برا کرے) نے حکم دیا کہ بازار بند کر دیے جائیں اور عورتیں بالوں کے بنے ہوئے کبیل پہن کر بازاروں میں اس طرح نکلیں کہ وہ چہرے ننگے کرنے والیاں اور بال بکھیرنے والیاں ہوں۔ اپنے چہروں کو تھپڑ ماریں، حسین بن علی رحمۃ اللہ علیہ پر نوحہ کریں۔ اس کام سے روکنا اہل سنت کے بس میں نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیعہ حضرات کی اکثریت تھی، انھیں غلبہ حاصل تھا اور بادشاہ وقت ان کے ساتھ تھا۔“
 امام ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تقریباً یہی بات تحریر کی ہے۔ [الکامل لابن الاثیر (۱۹۷/۲)]

اور یہ بات شیعہ حضرات کو بھی تسلیم ہے۔ [مجاہد اعظم (ص: ۳۳۳)، لشاكر حسين نقوی]
 مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ تعزیہ وغیرہ کی بدعات کا رواج چوتھی صدی ہجری میں ہوا ہے اور اس کا بانی معز الدولہ بن بویہ ہے۔ اس سے قبل اس بدعت کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ لہذا ایسی بدعات و خرافات سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے اور ان جلوسوں اور تعزیوں میں شامل ہو کر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ان میں حاضری دینے والا گناہ پر تعاون کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة: ۲]

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔“

جادو اور جنات نکالنے کی شرعی حیثیت

سوال کیا جنوں کی حقیقت ہے؟ نیز جادو کے علاج اور جنات نکالنے کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمادیں۔

جواب جنوں کا وجود انبیاء ﷺ کی متواتر خبروں سے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ زندہ، ذی عقل اور ارادے کے مطابق عمل کرنے والے، نیکی کا حکم دیے گئے اور برائی سے روکے گئے ہیں۔ ان کی کوئی خاص صفت یا لمبائی چوڑائی مقرر نہیں ہے جیسا کہ بعض ملحدوں کا دعویٰ ہے۔ چونکہ جنوں کا معاملہ انبیاء ﷺ سے متواتر ثابت ہے اس لیے ہر خاص و عام اسے متواتر جانتا ہے لہذا یہ ناممکن ہے کہ کوئی گروہ جو رسولوں کی طرف اپنی نسبت کرتا ہو اور وہ ان کے وجود کا انکار کرے۔

[مجموع الفتاویٰ (۱۰۹/۱۹)]

کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ بات بالکل عیاں اور ظاہر و باہر ہے کہ جنات کا وجود ہے اور یہ آگ کے شعلے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو جس طرح انسانوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا گیا، اسی طرح جنات کی طرف بھی آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے ہیں۔ جنات میں بھی نیک و بد ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، جو ان میں شیطنیت کی صفت کے حامل ہوتے ہیں، وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے وساوس و خطرات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس صورت میں انسانوں کو تعویذ پڑھنا چاہیے اور اللہ پاک کی پناہ پکڑنی چاہیے۔ معاشرے میں جو عمومی صورتحال ہے کہ جو ان لڑکیوں کو جنات کی شکایت ہوتی ہے، اکثر اوقات ہوتا ہے کہ لڑکی کی پسند کی شادی والدین نہیں کرتے تو وہ جنات کے سایہ کی شکایت کرنے لگ جاتی ہے اور والدین پریشان ہو کر جنات نکالنے والے عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ آ کر جو ان لڑکی کو چھوتے بھی ہیں اور رقم بھی بنورتے ہیں۔ یہ دھندہ عروج پر ہے۔ اکثر جنات نکالنے والے زر اور زن کے پیاسے ہوتے ہیں۔ پھر وہ طرح طرح کے ڈرامے رچا کر اپنا مقصود پورا کرتے ہیں۔ جب لڑکی کی مرضی سے اس کے آشنا سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو جنات کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بعض روایات میں صراحتاً جنات کے وجود انسانی میں داخلے کا تذکرہ ملتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”ایک سفر میں میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے نہیں جاتے تھے یہاں تک کہ غائب ہو جاتے، دکھائی نہ دیتے۔ ہم ایک چشیل میدان میں اترے، نہ اس میں درخت تھا اور نہ پہاڑ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے جابر! اپنے برتن میں پانی ڈال پھر ہمارے ساتھ چل۔“ جابر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم چل پڑے یہاں تک کہ ہم دکھائی نہ دیتے تھے۔ ہم ایک چشیل میدان میں پہنچے، نہ اس میں درخت تھے اور نہ پہاڑ۔ اچانک دو درخت نظر آئے، جن کے درمیان چار ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے جابر! اس درخت کی طرف جا اور کہہ کہ اللہ کے

رسول تمہیں کہتے ہیں تو اپنے ساتھی (یعنی دوسرے درخت) کے ساتھ مل جا یہاں تک کہ میں تمہارے پیچھے (قضائے حاجت کے لیے) بیٹھوں۔“

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”میں نے ایسے کہا وہ درخت اس کی طرف پلٹ آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ ان دونوں درختوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ پھر وہ دونوں اپنی جگہ کی طرف پلٹ آئے۔ ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ سوار ہو گئے اور اللہ کے رسول ﷺ ہمارے درمیان ایسے تھے گویا ہمارے اوپر پرندوں نے سایہ کیا ہوا ہے۔ آپ ﷺ کے سامنے ایک عورت آئی۔ اس کے پاس اس کا بچہ تھا، کہنے لگی: ”اے اللہ کے رسول! بلاشبہ میرے اس بیٹے کو ہر روز تین دفعہ شیطان پکڑ لیتا ہے۔“ آپ ﷺ نے اس بچے کو لے لیا۔ آپ نے اسے اپنے اور کجاوے کے اگلے حصے کے درمیان بٹھا دیا، پھر فرمایا: ”اللہ کے دشمن ذلیل ہو جا، میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کے دشمن ذلیل ہو جا، میں اللہ کا رسول ہوں۔“ تین مرتبہ آپ ﷺ نے ایسا کہا، پھر بچہ اس عورت کے حوالے کر دیا۔ جب ہم نے اپنا سفر تمام کر لیا اور ہم اس جگہ سے گزرے تو عورت اپنے بچے سمیت ہمارے سامنے آگئی۔ اس کے ساتھ دو مینڈھے تھے جنہیں وہ ہانک کر لارہی تھی۔ کہنے لگی: ”اے اللہ کے رسول! میری طرف سے ہدیہ قبول کر لیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا! اس کے بعد وہ شیطان واپس نہیں لوٹا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک مینڈھا اس سے لے لو اور دوسرا اسے واپس کر دو۔“ [دارمی (۱۶۷/۱، ۱۶۸)، ابن ابی شیبہ (۴۹۰/۱، ۴۹۲)، (۱۱۸۰۳)، التمشید (۲۲۳/۱، ۲۲۴) دلائل النبوة لأبی نعیم (۲۸۲)، عبد بن حمید (۱۰۵۲)]

اس روایت کی سند میں اسماعیل بن عبد الملک ہے۔ امام ابو حاتم رازی، امام نسائی، امام ابن حبان، امام ابوداؤد، امام محمد بن عمار، امام عقیلی، امام دولابی، امام ابو العرب القیر وانی، امام ابن شاہین (رضی اللہ عنہ) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [تہذیب الکمال (۱۴۲/۱، ۱۴۳)]

یعلیٰ بن مرہ ثقفی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں ہے:

”دوران سفر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت بچہ لے کر حاضر ہوئی۔ اس بچے کو جن کی شکایت تھی۔ نبی ﷺ نے اس کی ناک کو پکڑا اور فرمایا: ”نکل جا، بے شک میں محمد اللہ کا رسول ہوں۔“ کہتے ہیں پھر ہم سفر پر روانہ ہو گئے، جب ہم اپنے سفر سے واپس پلٹے، ہم اس پانی والی جگہ کے پاس سے گزرے تو وہ عورت اونٹ اور دودھ لے کر آئی۔ آپ نے اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دودھ پینے کا حکم دیا، انہوں نے دودھ پی لیا۔ آپ ﷺ نے اس عورت سے بچے کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگی: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! آپ کے بعد ہم نے اس میں کوئی بے قراری نہیں دیکھی۔“ [مسند احمد (۱۷۳/۴) (۱۷۷۰۸)، شرح السنة (۲۹۶/۱۳)]

اس کی سند میں عطا بن السائب ہیں جنہیں اختلاف ہو گیا تھا اور عمر کی روایت ان سے اختلاف کے بعد کی ہے اور عبد اللہ بن

حفص مجہول راوی ہے۔

عطا کے اختلاط کے متعلق ملاحظہ ہو: [تہذیب الکمال (۹۱/۲۰)]

اور عبد اللہ بن حنفص کی جہالت کے بارے میں دیکھیں: [تقریب، تاریخ الدارمی (۴۶۴)، الکامل لابن عدی،
نہایۃ السؤل، الکاشف وغیرہا]

یہ روایت مستدرک حاکم (۶۱۵/۲) میں بطریق احمد بن عبد الجبار از یونس بن بکیر از اعمش از المنہال بن عمرو از یعلیٰ بن مرہ مروی ہے۔ لیکن اس سند میں احمد بن عبد الجبار ہے۔ امام ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”یہ قوی نہیں ہے۔“
محمد بن عبد اللہ الحضرمی نے کہا: ”یہ جھوٹ بولتا تھا۔“ خود حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”یہ محدثین کے ہاں قوی نہیں ہے۔“ امام
ابو احمد بن عدی فرماتے ہیں: ”اہل عراق اس کے ضعف پر متفق ہیں۔“ الغرض یہ روایت ضعیف ہے۔ [تہذیب الکمال
(۱۶۶/۲۳-۱۶۷)]

پھر اس کی سند میں اعمش کی تدلیس بھی ہے اور روایت مععن ہے۔

یہ روایت مسند احمد (۱۷۶۹۰) میں عبد اللہ بن نمیر از عثمان بن حکیم از عبد اللہ بن عبد العزیز از یعلیٰ بن مرہ کے طریق سے
بھی مروی ہے اور یہ عبد الرحمن بن عبد العزیز غیر معروف ہے۔ [تعجیل المنفعۃ لابن حجر عسقلانی (ص/۲۵۳)]
اگر اس عبد الرحمن سے عبد اللہ بن عبد العزیز بن عبد اللہ بن عثمان بن حنیف الانصاری مراد ہوں تو یہ سند منقطع ہے کیونکہ اس
کی وفات ۱۲۲ھ کی ہے۔ اس کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی، تقریباً یہ ۹۵ھ کے قریب پیدا ہوا تھا اور یعلیٰ بن مرہ ثقفی سے
اس کی ملاقات کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنا بیٹا لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: ”اے اللہ
کے رسول! بلاشبہ میرے بیٹے کو جنون ہے اور وہ اسے صبح شام کے کھانے کے وقت پکڑ لیتا ہے اور ہمارے اوپر خباثت کرتا
ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینے کو نرم کیا اور دعا کی۔ اس نے ایک بار قے کی۔ اس کے پیٹ سے سیاہ پلے کی طرح
کی کوئی چیز نکلی تو اس نے دوڑ لگا دی۔“ [دارمی (۱۹)، (۱۷۰/۱) مسند احمد (۱/۲۳۹)، طبرانی کبیر (۱۲/۵۷) دلائل
النبوۃ اللبیقیہ (۱۸۲/۶)]

مسند احمد اور طبرانی کی روایت کے آخر میں ہے کہ اس بچے نے شفا پالی۔ لیکن اس کی سند میں فرقہ السنجی ہے۔ جمہور
محدثین کے ہاں فرقہ بن یعقوب السنجی ابو یعقوب راوی ضعیف ہے۔ [تہذیب الکمال (۱۶۶/۲۳-۱۶۷)]

اس طرح کی روایت مطر بن عبد الرحمن الاعنق عن ہند بن الوازع، عن الوازع کی سند سے بھی مروی ہے۔ [اتحاف
المہرۃ لابن حجر (۱۳/۶۵۶)، اطراف المسند (۵/۴۴۵)، جامع المسانید والسنن لابن الکثیر (۱۲/۳۴۶)]
لیکن اس کی سند میں ہند ام ابان بنت الوازع کی توثیق معلوم نہیں۔ ایک روایت عثمان بن ابی العاص سے بھی مروی ہے
جس کا ذکر علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ [مجمع الزوائد (۳/۹)]

انھوں نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عثمان بن بسر ہے جسے میں نہیں پہچانتا اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں۔
البتہ اس سلسلے کی ایک صحیح السنہ روایت امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہے کہ عثمان بن ابی العاص نے کہا: ”جب

رسول اللہ ﷺ نے مجھے طائف پر عامل بنایا، میری نماز میں کوئی چیز مجھے پیش آنے لگی، یہاں تک کہ میں نہیں جانتا تھا جو نماز میں نے پڑھی۔ جب میں نے یہ صورتحال دیکھی تو رسول اللہ ﷺ کی طرف کوچ کیا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابن ابی العاص!“ میں نے کہا: ”ہاں! اے اللہ کے رسول!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کون سی چیز تمہیں لائی ہے؟“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کوئی چیز میری نماز میں مجھے پیش آتی ہے یہاں تک کہ میں نہیں جانتا جو نماز میں نے پڑھی۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ شیطان ہے، قریب ہو۔“ میں آپ کے قریب ہوا اور اپنے قدموں کے سروں پر بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ مارا اور میرے منہ میں لعاب لگایا اور فرمایا: ((أُخْرِجْ عَدُوَّ اللَّهِ)) ”اے اللہ کے دشمن! نکل جا۔“ آپ ﷺ نے یہ کام تین مرتبہ کیا، پھر فرمایا: ”اپنے کام کے ساتھ الحاق کر لے۔“ عثمان رضی اللہ عنہم کھا کر کہتے ہیں: ”میں گمان نہیں کرتا کہ اس کے بعد کبھی اس نے میرے ساتھ اختلاط کیا ہو۔“

اس حدیث کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح کہا ہے۔ [ابن ماجہ، کتاب الطب: باب الفزع والأرق وما يتعود منه (۵۴۸)، مصباح الزجاجة المسند الجامع (۱۲/۴۱۱۸)]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسان میں داخل ہوتا ہے، اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: «أُخْرِجْ عَدُوَّ اللَّهِ» ”اللہ کے دشمن نکل جا۔“ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”انسان کے بدن میں جن کے داخل ہونے پر اہل سنت والجماعت کے ائمہ متفق ہیں۔“ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾

[البقرة: ۲۷۵]

”سو خورد نہ کھڑے ہوں گے مگر اس طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر جھپٹی بنا دے۔“ اور صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”شیطان انسان کے جسم میں اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح کہ خون دوران کرتا ہے۔“ [بخاری، کتاب بدء الخلق باب صفة إبليس و جنوده (۳۲۸۱)، مسلم (۲۱۷۵)، ملاحظہ ہو مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ (۲۴/۲۷۶)]

عبد اللہ بن احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”میں نے اپنے والد (احمد ابن حنبل) سے کہا: ”بہت سے لوگ ایسے کہتے ہیں کہ کوئی جن کسی المصروع (جس پر جن سوار ہو) کے بدن میں داخل نہیں ہوتا۔“ تو انھوں نے کہا: ”اے میرے بیٹے! وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصلاً یہ شیطان ہی ہے جو ان کی زبان سے (یہ جھوٹ) بولتا ہے۔“ [مجموع الفتاویٰ، (۲۴/۲۷۷)]

ایک مقام پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”بعض جاہلی اور گمراہ لوگوں نے جنہیں علم نہیں اس بات کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ معتزلہ میں سے ایک گروہ مثلاً الجبائی اور ابو بکر الرازی وغیرہ نے مصروع کے بدن میں جن کے داخل ہونے کا انکار کیا ہے مگر وہ بھی جن کے وجود کا انکار نہیں کرتے۔“ [مجموع الفتاویٰ (۱۹/۱۲)]

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ”جادو کی حقیقت“ (ص: ۱۸۹ تا ۱۹۱) از غازی عزیز مبارکپوری رحمہ اللہ مطبوعہ مکتبہ دارالسلام) اگر

کسی بھی شخص کو شیطانی وساوس لاحق ہوں تو وہ ان کا شرعی طریقہ کار سے علاج کرے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر پختہ اعتقاد رکھے، توکل و بھروسہ اسی کی ذات پر کرے اور نفع و نقصان کا مالک اسے سمجھتے ہوئے اس سے صدق دل سے دعا مانگے اور شیاطین سے بچنے کے لیے استعاذہ سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو پناہ پکڑنے کی ہدایت یوں فرمائی:

﴿ وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ ﴾

[المومنون: ۹۷، ۹۸]

”اور آپ کہہ دیں اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ پکڑتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے بھی تیری پناہ پکڑتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔“

اسی طرح فرض نمازوں کے بعد ذکر و اذکار، سونے اور بیدار ہونے کے اذکار اور صبح شام کے اذکار کے علاوہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت:

﴿ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبۡثِ وَالۡخَبَاۡثِٓتِ ﴾

غصہ اور گدھے کے ریگننے کے وقت ”اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ“ پڑھیں۔

الغرض اگر انسان مختلف مقامات پر تعوذ پڑھتا رہے تو اللہ تعالیٰ ضرور شفا عطا کرے گا۔ کتاب و سنت میں موجود ذکر و اذکار سے ہٹ کر شیطانی عمل کرنے والوں، غیر محرم عورتوں کے سر یا رگ کو پکڑ کر جن نکالنے والے عاملوں کے ہتھے نہ چڑھیں۔ وہ آپ کی عزت بھی برباد کریں گے اور دولت بھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر قسم کے شیطانی جھکنڈوں اور ابلیسی کارروائیوں سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

جنات میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل

سوال کیا جنات میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل کا سلسلہ ہے؟

جواب شیاطین و جنات میں انسانوں کی طرح شادی بیاہ اور مناکحت و توالد کا سلسلہ موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُنَّ وَلَا جَانٌّ ﴾ [الرحمن: ۵۶]

”ان نعمتوں کے درمیان نیچی نگاہوں والیاں (حوریں) ہوں گی، جنہیں جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا۔“

امام بغوی رحمہ اللہ ”لَمْ يَطْمِثْهُنَّ“ کا معنی بیان کرتے ہیں ”لَمْ يُجَامِعْهُنَّ“ یعنی ان سے جنوں اور انسانوں نے کبھی جماع نہیں کیا۔ [معالم التنزیل (۴/۲۷۵)]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْجِنَّ يَطْمِئِنُونَ“ [تفسیر انوار التنزیل و أسرار التاویل (۲/۴۵۶)]
 ”اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جن بھی جماع کرتے ہیں۔“

پس معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جنوں میں بھی نکاح و جماع کا سلسلہ موجود ہے اور شیطان کی اولاد و ذریت کا تذکرہ بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ
 أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِنِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا﴾ [الكهف: ۵۰]
 ”اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: ”آدم کے لیے سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے اور ظالموں کے لیے برا بدلا ہے۔“

اس آیت سے ثابت ہوا کہ شیطان کی اولاد بھی ہے۔ لہذا پتا چلا کہ جنات میں بھی مباشرت و مناکحت اور توالد و تناسل کا سلسلہ انسانوں کی طرح قائم ہے۔

جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی چیز رکھنا

(سوال) جنات سے بچاؤ کے لیے بچوں کے پاس چھری یا لوہے کی چیز رکھنا کیسا ہے؟

(جواب) یہ عملی طور پر درست نہیں اور شرعی طور پر اس کی کوئی صحیح بنیاد موجود نہیں۔ شرعی طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو شیطان کے شر سے بچانے کے لیے دم کیا جائے، جس طرح رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو دم کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دم کے لیے یہ کلمات کہتے:

«أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامِيَةٍ» [بخاری، کتاب
 أحاديث الانبياء: باب قول الله تعالى ﴿وَإِذَا حَضَرَ اللَّهَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ (۲۳۷۱)]

”میں ہر شیطان، ہرزہ ریلے کیڑے اور ہر نظر بد سے اللہ کے تمام کلمات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں۔“
 یا بچوں کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ بچوں کے پاس چھری، چاکو یا لوہے وغیرہ کی کوئی چیز اس اعتقاد سے رکھنا کہ یہ انھیں شیطانی چالوں سے محفوظ رکھے گی تو یہ ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشنے۔ (آمین!)

شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم

(سوال) شرعی احکامات میں ترمیم کی ضرورت سمجھنے والے کا حکم کیا ہے؟

(جواب) وہ تمام احکامات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے نازل فرمائے اور ان کی توضیح قرآن حکیم یا احادیث رسول

میں کر دی گئی ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وراثت، مایاء، طلاق، حدود وغیرہ، جن پر امت کا اجماع ہے ان پر کسی فرد کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان میں ترمیم یا نظر ثانی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔ یہ احکام محکم اور شرعی ہیں اور ہر دور میں اسی طرح لاگو ہوں گے جیسے رسول اکرم ﷺ کے مبارک زمانے میں اور خلفائے راشدین کے دور میں جاری و ساری تھے۔ جو شخص شرعی و محکم احکامات میں رد و بدل اور ترمیم کرنا چاہتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایسے احکامات کی مخالفت کر کے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اعتراض کر رہا ہے جو صریح کفر ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی رو سے واجب القتل ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ » [بخاری کتاب الجهاد: باب لا يعذب بعذاب الله (۳۰۱۷)]
 ”جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔“

لہذا تجد پسند نیکو چیزیں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کے دائرہ میں محدود رکھیں، مغرب زدہ ہو کر اپنے آپ کو جہنم میں نہ جھونکیں۔ مسلمان والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کی تربیت اسلامی اصولوں پر کریں تاکہ وہ اسلام پر اعتراض کرنے والے نہ ہوں بلکہ اسلام پر عمل کرنے والے سچے مسلمان بنیں۔

شُرک نا قابل معافی جرم

(سوال) کیا شرک نا قابل معافی جرم ہے؟

(جواب) شرک سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے“ اور شرک کو احادیث میں کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا کبیرہ گناہ کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ﴾ [المائدة: ۵۲]

”جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔“
 لہذا جو شخص توبہ کیے بغیر شرک ہی کی حالت میں مر گیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا، اس کے لیے نہ بخشش ہے اور نہ اسے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہی نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴾ [التوبة: ۱۱۳]

”کسی نبی اور اہل ایمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش کی دعا کریں اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں اس کے بعد کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جہنمی ہیں۔“

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ ﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”مِنْ بَعْدِ مَا مَاتُوْهَا عَلٰی“

شُرُكِهِمْ“ یعنی ان کے شرک پر مرجانے کے بعد۔ مراد یہ ہے کہ جو شرک کی حالت میں مرجائے اس کے لیے بخشش کی دعا مانگنے کی بھی اجازت نہیں۔ [تفسیر طبری (۴۸۵/۶)]

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ شرک اکبر الکبائر ہے اور اس پر مرنے والے جہنمی ہیں ان کی بخشش نہیں ہوگی، ان پر جنت حرام ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق دے دے اور موت سے پہلے وہ شرک چھوڑ کر توحید پر گامزن ہو جائے تو شرک کا گناہ معاف ہو جائے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ شرکیہ عقائد و اعمال سب کے لیے شرک ہوتے ہیں، کافروں کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی۔ مسلمان ہو کر بھی اگر شرکیہ عقائد و اعمال اختیار کر لے تو مشرک ہو جائے گا اور شرک یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ذات، صفات اور عبادت میں کسی بھی مخلوق کو حصہ دار بنالے۔ جیسے اللہ کی صفت عالم الغیب والشہادہ ہے۔ یہ صفت اس کی مخلوق میں سے کسی میں تسلیم کرے تو مشرک ہو جائے گا۔ [اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب التوحید، توحید خالص اور ہدایۃ المستفید]

سچی توبہ کی حیثیت

(سوال) اگر کوئی نوجوان کسی لڑکی کے بہکاوے میں آجائے اور وہ زنا کر بیٹھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کام اسلام میں جائز نہیں مگر پھر بھی شیطان کے بہکاوے میں آجائے اور غلطی کا احساس ہونے پر سچے دل سے توبہ کر لے اور آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کرے تو کیا اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا؟

(جواب) جب کوئی شخص شیطان کے بہکاوے میں آ کر کسی گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے پھر سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اے ایمان والو! اللہ کی طرف سے صاف دل سے توبہ کر لو۔“ [تحریم: ۸]

ایک اور مقام پر فرمایا:

”اے ایمان والو! سب اللہ کے آگے توبہ کر لو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ [نور: ۳۱]

بخاری و مسلم میں سو بندوں کے قاتل کا قصہ ہے مختصر یہ کہ جب اس قاتل نے سچے دل سے توبہ کا ارادہ کر لیا اور ایک عالم کے بتانے پر وہ ایک بہستی کی طرف روانہ ہوا جہاں لوگ اللہ کی بندگی کرنے والے تھے تو اسے راستے میں موت آگئی اور اسے رحمت کے فرشتے لے گئے۔

اسی طرح ایک عورت نے زنا کر لیا پھر نامد ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، حد لگانے کا مطالبہ کیا بالآخر اسے رحم کیا گیا اور آپ نے اس کا جنازہ پڑھا، عمر بن الخطاب نے کہا:

”یا رسول اللہ! آپ اس زانیہ کا جنازہ پڑھ رہے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ

یعنی کے ستر بندوں پر تقسیم کی جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔“ [مسلم، کتاب الحدود: باب من اعترف نفسه

[بالزنی (۱۶۹۶)]

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ جو شخص توبہ کرتا ہے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ خالص اور سچی توبہ کی تین شرائط ہیں:-

① گناہ کرنے والا گناہ سے باز آجائے۔

② گناہ پر نادم ہو۔

③ پختہ عزم کرے کہ پھر وہ اس گناہ میں مبتلا نہ ہوگا۔

جیسا کہ ریاض الصالحین باب التوبہ میں مذکور ہے۔ لہذا جو شخص اپنے گناہ پر شرمندہ ہو کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور آئندہ پختہ

ارادہ کر لیتا ہے کہ وہ گناہ نہیں کرے گا تو اللہ ایسے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔



WWW. KITABOSUNNAT.COM

KITABOSUNNAT @ GMAIL.COM

و

وضو کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

وضو میں پاؤں کا دھونا

(سوال) وضو میں پاؤں دھونے کا حکم ہے یا مسح؟ کیا سورہ مائدہ کی آیت (۶) سے پاؤں پر مسح کا حکم ثابت ہوتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

(جواب) قرآن حکیم میں بھی پاؤں دھونے کا حکم ہے اور سنت رسول ﷺ بھی یہی ہے۔ قرآن حکیم میں سورہ مائدہ کی آیت (۶) میں وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر مسح کر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔“

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ دو حکم ہیں: ایک دھونے کا اور دوسرا مسح کرنے کا۔ جن اعضاء کو دھونے کا حکم ہے ان پر زبر ہے جیسے ”وَجُوهَكُمْ“، ”أَيْدِيَكُمْ“ اور ”أَرْجُلَكُمْ“ اور جس پر مسح کا حکم ہے اس کے نیچے زبر ہے جیسے ”بُرُؤُسِكُمْ“۔ قرآن حکیم کی متواتر قراءت میں اور جتنے مطبوعہ نسخے ہیں ان سب میں ”أَرْجُلَكُمْ“ کی لام پر زبر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاؤں پر مسح نہیں بلکہ پاؤں کے دھونے کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی یہی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: ”رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ ان کی اڑیوں پر خشکی چمک رہی ہے تو آپ ﷺ نے بلند آواز سے دو یا تین مرتبہ فرمایا: ”ان اڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے، لہذا وضو اچھی طرح کرو (یعنی اڑیوں کو اچھی طرح سے دھولو، یہ کہیں سے خشک نہ رہ جائیں)۔“ [مسلم، کتاب الطہارۃ، باب وجوب الغسل بکمالها: ۲۴۱۔ بخاری، کتاب الوضو: باب غسل الرجلین: ۱۶۳۔]

لہذا صحیح بات جو قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہے وہ وضو میں پاؤں کا دھونا ہی ہے۔

وضو کی دعا کے متعلق حدیث کی وضاحت

(سوال) میں نے ایک مسجد میں وضو کی دعا ”بِسْمِ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ“ لکھی ہوئی دیکھی ہے اور اس پر مجمع الزوائد کا حوالہ تھا، کیا یہ روایت صحیح ہے؟

(جواب) مجمع الزوائد میں یہ روایت طبرانی کے حوالہ سے علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے درج کی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ طبرانی (۷۳۱) میں مروی اس روایت کی سند میں ابراہیم بن محمد البصری منکر الحدیث ہے۔ دیکھیں میران (۵۶۱) المغنی فی الضعفاء (۱۶۱) دیوان الضعفاء (۲۳۷) للذہبی [حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نتائج الافکار (۲۲۷/۱) میں اسے

ضعیف قرار دیا ہے اور لسان المیزان (۹۸/۱) میں اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اسی طرح علامہ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرۃ الموضوعات (ص ۳۱) میں اس روایت کو منکر ہی قرار دیا ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں کتاب الموضوعات لابن الجوزی (۱۶۸۰)، اور تنزیہ الشریعة المرفوعة عن الاحادیث الشنیعة الموضوعه (۳۴۰/۲)]

بعض ائمہ نے ابراہیم بن محمد کے استاد علی بن ثابت کو مجہول قرار دیا ہے۔ (تاریخ الافکار اور ترتیب الموضوعات) لیکن اسے امام احمد نے ثقہ اور ابوحاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ”لَا بَأْسَ بِهِ“ قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: ۱۷۷/۶) لہذا اس کی سند میں اصل علت ابراہیم بن محمد المہری ہے جس کی یہ منکر روایت ہے۔

دوران وضو دعائیں پڑھنا

سوال کیا دوران وضو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دعا ثابت ہے؟

جواب صحیح احادیث سے وضو کی ابتدا میں ”بسم اللہ“ اور آخر میں یہ دعا ثابت ہے:

«أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي

مِنَ التَّوَابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ» [ترمذی، کتاب الطہارۃ: باب ما یقال بعد الوضوء: ۵۵]

دوران وضو ایک ایک عضو کے دھونے پر جو لوگ مختلف کلمات پڑھتے ہیں ان کا ثبوت کسی معتبر اور صحیح حدیث میں موجود

نہیں ہے۔

وضو کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینے مارنا

سوال وضو کرنے کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینے مارنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب وضو کے بعد شرم گاہ کی طرف چھینے مارنا شرعی طور پر جائز اور درست ہے، اس کے ذریعے شیطانی وساوس دور ہوتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَالَ يَتَوَضَّأُ وَيَنْتَضِحُ» [ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب

فی الانتضاح: ۱۶۶۔ حاکم: ۱۷۱/۱۔ اس روایت کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ذہبی نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کرتے تو وضو کرتے اور شرم گاہ پر پانی کے چھینے مارتے۔“

سنن نسائی میں یہ الفاظ ہیں:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ وَنَضَحَ فَرَجَهُ» [نسائی، کتاب الطہارۃ: باب

النضح: ۱۳۵]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے وضو کیا اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا۔“
حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی نے شکایت کی کہ میں جب نماز میں ہوتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میرے
ذکر پر تری ہے تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« قَاتَلَ اللَّهُ الشَّيْطَانَ إِنَّهُ يَمَسُّ ذَكَرَ الْإِنْسَانِ فِي صَلَاتِهِ لِيُرِيكَ أَنَّهُ قَدْ أَحَدَتْ فَأِذَا تَوَضَّاتْ
فَانْضَحْ فَرَجَكَ بِالْمَاءِ فَإِنْ وَجَدْتِ قُلْتَ هُوَ مِنَ الْمَاءِ فَفَعَلَ الرَّجُلُ ذَلِكَ فَذَهَبَ » [عبد الرزاق
: ۱۵۱/۱ - ۵۸۳ - ابن ابی شیبہ : ۱۹۴/۱ - باب من كان اذا توضع فرجه]

”اللہ شیطان کو غارت کرے وہ نماز میں انسان کی شرمگاہ کو چھوتا ہے تاکہ اسے یہ خیال دلائے کہ وہ بے وضو ہو گیا
ہے، جب تم وضو کرو تو اپنی شرمگاہ پر پانی کے چھیننے مار لیا کرو۔ پس اگر تو ایسا خیال پائے تو یہ سمجھ لینا کہ یہ پانی
ہے۔“ تو اس آدمی نے ایسے ہی کیا تو یہ وسوسہ ختم ہو گیا۔“

حضرت نافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا تَوَضَّأَ نَضَحَ فَرَجَهُ » [ابن ابی شیبہ : ۱۹۴/۱]

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب وضو کرتے تو اپنی شرمگاہ پر چھیننے مارتے۔“

داؤد بن قیس فرماتے ہیں میں نے محمد بن کعب القرظی سے سوال کیا: ”(میں کیا کروں جب) میں جب وضو کرتا ہوں
تو تری کو پاتا ہوں؟“ انھوں نے کہا: ”جب تم وضو کر لو تو اپنی شرمگاہ پر پانی کے چھیننے مار لیا کرو، جب تمہیں ایسا
وسوسہ آئے تو سمجھنا کہ یہ وہی پانی ہے جس کے میں نے چھیننے مارے ہیں۔ شیطان تجھے نہیں چھوڑے گا حتیٰ کہ
تیرے پاس آئے گا اور تجھے تنگ کرے گا۔“ [عبد الرزاق : ۱۵۲/۱]

مذکورہ بالا حدیث اور آثار سے ثابت ہوا کہ وضو کے بعد اگر کوئی آدمی اپنے تہ بند اور شلوار وغیرہ کے اوپر وسوسہ شیطانی سے
ازالہ کے لیے پانی کے چھیننے مارے تو یہ شرعی طور پر درست ہے۔

کیا خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ خون نکل کر بہ جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ صحیح
موقف کیا ہے؟

جواب جسم سے خون کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس کے کئی ایک دلائل ہیں:

① امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ”کتاب الوضوء، باب من لم ير الوضوء الا من المخرجين“ کے تحت غزوہ ذات
الرقاع کے ایک واقعہ کا مختصر طور پر تذکرہ کیا ہے، جو دیگر کتب حدیث میں مفصل موجود ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے:
”حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع میں نکلے۔ ایک

آدی نے مشرکین کی ایک عورت کو پایا۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس پلٹے تو اس کا خاوند جو اس وقت موجود نہیں تھا، واپس آیا اور اسے اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے حلف اٹھایا کہ وہ اس وقت تک نہیں رکے گا جب تک محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کا خون نہ بہا دے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکلا۔ جب رسول اللہ ﷺ ایک مقام پر اترے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”آج رات کون چوکیداری کرے گا؟“ آپ کی اس بات پر ایک مہاجر اور ایک انصاری صحابی نے لبیک کہا۔ آپ نے فرمایا: ”اس گھاٹی کے دہانے پر تم دونوں پہرے کے لیے چلے جاؤ کیونکہ وہاں سے دشمن کے آنے کا راستہ ہو سکتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی گھاٹی کی نشیبی جانب چلے گئے۔

جب چوکیداری کرنے والے ساتھی گھاٹی کے دہانے کی طرف گئے تو انصاری ساتھی نے مہاجر سے کہا: ”آپ رات کے اوّل حصے میں پہرا دینا پسند کریں گے یا آخری حصہ میں؟“ انصاری کے لیے رات کا پہلا حصہ قرار پایا۔ مہاجر ساتھی سو گیا اور انصاری نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں وہ آدی بھی آ پہنچا۔ اس نے گھاٹی کے دہانے پر ایک شخص دیکھا تو وہ جان گیا کہ یہ پہرے دار ہے۔ اس نے ایک تیر مارا۔ انصاری نے وہ تیر نکال کر پھینک دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے۔ اس شخص نے دوسرا، پھر تیسرا تیر مارا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے وہ تیر اپنے جسم سے نکال پھینکے اور برابر نماز پڑھتے رہے، رکوع و سجود مکمل کیے اور پھر بعد میں اپنے ساتھی کو بیدار کیا، جب اس آدی نے ایک کے بجائے دو (پہرے دار) دیکھے تو بھاگ گیا۔ مہاجر نے جب اپنے انصاری ساتھی کو دیکھا کہ اس کے جسم سے خون ہی خون بہ رہا ہے تو فرمایا: ”سجان اللہ! تم نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا؟“ انصاری صحابی نے کہا: ”میں جو سورت پڑھ رہا تھا میرا دل نہ چاہا کہ میں اسے ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ جب مجھ پر یکے بعد دیگرے تیر برسائے گئے تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مجھے موت آنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے میرے ذمہ جو خدمت لگائی تھی وہ فوت نہ ہو جائے۔ اگر یہ ڈرنہ ہوتا تو میں مرجاتا مگر سورت ختم ہونے سے پہلے رکوع نہ کرتا۔“

[دارقطنی: ۸۵۸، ۲۳۱/۱۔ کتاب الحيض، باب جواز الصلاة مع خروج الدم السائل من البدن، ابو داؤد: ۱۹۸۔ کتاب الطهارة: باب الوضوء من الدم، حاکم: ۱۵۶/۱۔ موارد الظمان: ۲۵۰۔ ابن خزيمة: ۳۶۔ تلخیص الحبير: ۱۱۵/۱۔ اس روایت کو امام حاکم، امام ذہبی، امام ابن حبان اور امام ابن خزيمة ﷺ نے صحیح کہا ہے۔]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم سے خون کے بہ پڑنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر خون کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا تو یہ صحابی اپنی نماز توڑ دیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یقیناً اس واقعہ کی خبر رسول اللہ ﷺ کو ہوئی ہوگی کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ اتنا بڑا واقعہ رونما ہو اور آپ ﷺ اس سے بے خبر ہوں۔ اگر آپ کو خبر ہوئی تو اب خون کے ناقض وضو ہونے کی صورت میں ضروری تھا کہ آپ ﷺ اس کی وضاحت کرتے اور نماز کے فاسد ہونے کا ذکر کرتے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خون ناقض وضو نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ترجمہ الباب میں تعلقاً لاکر بھی یہی مسئلہ سمجھایا ہے۔

اس حدیث کے ذکر سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احناف کا رد کیا ہے، جو کہتے ہیں کہ خون ناقض وضو ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(وَ أَرَادَ الْمُصَنِّفُ بِهَذَا الْحَدِيثِ الرَّدَّ عَلَى الْحَنْفِيَّةِ فِي أَنَّ الدَّمَ السَّائِلَ يَنْقُضُ الْوُضُوءَ)
[فتح الباری: ۲۸۱/۱]

”امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث لا کر احناف کا رد کیا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ بہنے والا خون ناقض وضو ہے۔“
فائدہ: اس انصاری صحابی کا نام عباد بن بشر رحمۃ اللہ علیہ تھا اور مہاجر صحابی عمار بن یاسر رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انصاری صحابی سورہ کہف کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہ بات امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری سند سے اپنی کتاب ”دلائل النبوة“ میں ذکر کی ہے۔ [دار فطنی: ۲۳۱/۱، ۸۵۹]، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ [فتح الباری: ۲۸۱/۱]
② حضرت مسور بن مخرمہ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

”إِنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ صَلَّى وَ جَرُّحُهُ يَتَعَبُ دَمًا“ [فتح الباری: ۲۸۰/۱۔ سنن بیہقی اور ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً مروی ہے۔ تلخیص الحیبر: ۱۱۴/۱۔ المحلی: ۲۶۰/۱]
”حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ اس حالت میں نماز پڑھتے رہے کہ ان کے زخم سے خون بہ رہا تھا۔“

③ حضرت عبداللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہما کے بارے میں مروی ہے:

”عَصْرَ ابْنِ عُمَرَ بَشْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ“ [ابن ابی شیبہ: ۱۲۸/۱، ۱۴۷۹]
”حضرت ابن عمر رحمۃ اللہ علیہما نے پھنسی کو نچوڑا، اس میں سے خون نکلا مگر انھوں نے وضو نہیں کیا۔“

ایک روایت میں یہ لفظ ہیں:

”ثُمَّ صَلَّى وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ“ [فتح الباری: ۲۸۰/۱۔ ابن ابی شیبہ: ۱۲۸/۱، ۱۴۷۳]
”پھر حضرت ابن عمر رحمۃ اللہ علیہما نے نماز ادا کی لیکن وضو نہیں کیا۔“

④ امام طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے:

”إِنَّهُ كَانَ لَا يَرَى فِي الدَّمِ السَّائِلِ وَضُوءًا يَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ ثُمَّ حَسِبُهُ“ [فتح الباری: ۲۸۰/۱]
”وہ خون نکلنے سے وضو کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، خون کو اپنے آپ سے دھو دیتے اور بس۔“

⑤ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”مَا زَالَ الْمُسْلِمُونَ يُصَلُّونَ فِي جَرَاحَاتِهِمْ“ [فتح الباری: ۲۸۱/۱]
”مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں کی حالت میں نماز پڑھتے رہے۔“

⑥ ابو جعفر الباقر سے امام اعش رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ نکیر سے بہنے والے خون کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا:

”لَوْ سَأَلَ نَهْرٌ مِنْ دَمٍ مَا أَعَدْتُ مِنْهُ الْوُضُوءَ“ [فتح الباری: ۲۸۲/۱]

”اگر (اس) خون کی نہر بھی جاری ہو جائے تو میں اس کی وجہ سے دوبارہ وضو نہیں کروں گا۔“
 نیز خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، یہ موقف مدینہ کے فقہائے سبعہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ [فتح الباری:
 ۲۸۲/۱]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خون خواہ جسم کے کسی بھی حصہ سے خارج ہو۔ حلق سے خارج ہو یا مسوڑھوں سے، سینگلی اور پھپھنے لگوانے سے ہو یا چوٹ لگنے سے۔ زخم سے ہو یا کسی پھنسی پھوڑے کے پھٹ جانے سے۔ انجکشن لگا کر نکالا جائے یا فارغ لگنے سے نکلے۔ تھوڑا ہو یا زیادہ، کسی بھی صورت یہ ناقض وضو نہیں ہے۔ وضو کے ٹوٹنے کے متعلق جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں، وہ قابل حجت نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے [نصب الرایۃ (۱/۲۶) اور مجلۃ الدعوة ستمبر (۱۹۹۸ء)]

شلوار کٹنوں سے نیچے لٹکانے سے وضو ٹوٹنا

(سوال) وضو کرنے کے بعد اگر شلوار کٹنوں سے نیچے چلی جائے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

(جواب) چادر یا شلوار کٹنوں سے نیچے لٹکانا شدید گناہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

«مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكُعْبِيِّنَ مِنَ الْإِزَارِ فِي النَّارِ» [بخاری، کتاب اللباس: باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار: ۵۷۸۷]

”کپڑے کا وہ حصہ جو کٹنوں سے نیچے لٹک رہا ہے وہ آگ میں ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

«مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ مِنَ الْخِيَلَاءِ لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [مسلم، کتاب اللباس والزينة، باب تحريم جر الثوب خيلاء: ۲۰۸۵]

”جو شخص اپنا کپڑا غرور و تکبر سے لٹکائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں کرے گا۔“

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر کے ڈھلکنے کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّكَ لَسُتَ مِمَّنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ خِيَلَاءً» [نسائی، کتاب الزينة، باب إسهال الإزار: ۵۳۳۷]

”تو ان لوگوں میں سے نہیں جو اس فعل کو تکبر سے کرتے ہیں۔“

مذکورہ بالا روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مرد کے لیے کپڑا ٹخنے سے نیچے لٹکانا شدید ترین جرم ہے اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن کسی بھی فقیہ اور محدث نے کتب حدیث کے تراجم و ابواب میں اس کو ناقض وضو میں شمار نہیں کیا۔

نیز اس ضمن میں جو روایت سنن ابی داؤد میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے تھا تو آپ نے اسے حکم دیا: [إِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ] ”جا اور وضو کر۔“ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں ابو جعفر غیر معروف راوی ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابی داؤد (۳۲۳/۱) اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار (۱۱۸/۳) میں لکھا ہے: ”وَفِي إِسْنَادِهِ أَبُو جَعْفَرٍ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ لَا يُعْرَفُ اسْمُهُ“ ”اس حدیث کی سند میں اہل مدینہ میں سے ایک راوی ہے، جس کا نام معروف نہیں۔“ اور مشکوٰۃ المصابیح پر تعلق لکھتے ہوئے علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ فِيهِ أَبُو جَعْفَرٍ وَعَنْهُ يَحْيَى بْنُ أَبِي كَثِيرٍ وَهُوَ الْأَنْصَارِيُّ الْمَدَنِيُّ الْمُؤَدِّئُ وَهُوَ مَجْهُولٌ كَمَا قَالَ ابْنُ الْقَطَّانِ وَفِي التَّقْرِيبِ أَنَّهُ لَيْسَ الْحَدِيثُ فَقُلْتُ مَنْ صَحَّحَ إِسْنَادَ الْحَدِيثِ فَقَدْ وَهَمَ“ [المشکوٰۃ: ۱/۲۳۸]

”یعنی اس حدیث کی سند ضعیف ہے، اس میں ابو جعفر ہے۔ اس سے بیان کرنے والا یحییٰ بن ابی کثیر ہے اور وہ انصاری مدنی مؤذن ہے جو مجہول ہے۔ جس طرح ابن القطان نے کہا ہے اور تقریب میں ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ اس کی روایت کمزور ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔“

لہذا جب یہ روایت کمزور ہے اور کسی محدث نے اسے نواقض وضو میں شمار نہیں کیا تو جس آدمی کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو جائے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ البتہ وہ اس جرم کا مرتکب ضرور ہوگا جس پر احادیث میں وعید آئی ہے۔

نیل پالش کے ساتھ وضو

سوال کیا ناخنوں پر نیل پالش موجود ہونے کی صورت میں وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

جواب قرآن حکیم میں وضو کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ﴾ [المائدة: ۶]

”اے ایمان والو! جب تم اقامت صلوٰۃ کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو دھو لو۔“

اس آیت کریمہ میں چہرے اور ہاتھوں کو دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں ان کا دھونا فرض ہے۔ جب ناخنوں پر نیل پالش لگی ہو تو ناخن دھوئے نہیں جاسکتے جس سے وضو نہیں ہوتا۔ وضو میں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال اسی لیے ہے کہ پانی کی تری کا اثر ہر عضو پر اچھی طرح پہنچ جائے۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ ایک سفر میں ہم سے پیچھے تھے۔ آپ نے ہمیں اس حالت میں پایا کہ نماز کا وقت تھا اور ہم وضو کر رہے تھے، ہم اپنے پاؤں کو ہلکا سا دھو رہے تھے تو آپ نے بلند آواز سے کہا:

«وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» [بخاری، کتاب العلم، باب من رفع صوته بالعلم: ٦٠]

”ایڑیوں کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔“

اسی طرح صحیح بخاری ”کتاب الوضوء، باب غسل الأعقاب“ میں امام ابن سیرین تابعی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ وہ جب وضو کرتے تو انگوٹھی والی جگہ کو دھوتے تھے۔ یہ صرف اسی لیے تھا کہ انگلیاں خشک نہ رہ جائیں۔ کیونکہ وضو میں جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان کا خشک رہ جانا صحیح نہیں۔ نیل پالش لگنے سے ناخنوں پر تہ جم جاتی ہے اور ناخنوں تک پانی نہیں پہنچ پاتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ وضو کے وقت پالش اتار دی جائے تاکہ اعضاء وضو کو اچھی طرح دھویا جاسکے۔ بصورت دیگر اگر نیل پالش لگی رہی تو وضو نہیں ہوگا۔

اگر دوران نماز وضو ٹوٹ جائے

سوال دوران نماز اگر نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ وہ نماز مکمل کر لے یا وضو کر کے نئے سرے سے نماز پڑھے؟

جواب نماز کے لیے وضو کا ہونا شرط ہے۔ جب وضو ٹوٹ جائے تو نمازی کو نماز چھوڑ کر چلے جانا چاہیے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرنی چاہیے۔ بے وضو ہونے والا اگر امام ہے تو پیچھے سے کسی کو آگے کھڑا کر کے چلا جائے اور نئے سرے سے وضو کر کے نماز ادا کرے اور یہ بھی یاد رہے کہ نماز ابتدا سے شروع کرے نہ کہ جہاں سے چھوڑی تھی وہاں سے۔ سیدنا حضرت علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلْيَنْصِرْفْ وَ لْيَتَوَضَّأْ وَ

لْيُعِدِّ الصَّلَاةَ» [ابو داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فیمن یحدث فی الصلاۃ: ٢٠٥۔ ترمذی: ١١٦٤،

١١٦٦۔ عبد الرزاق ١٣٩١/١۔ ابن حبان: ٢٠٣۔ دارقطنی: ١٥٣١/١۔ یہ حدیث حسن ہے۔]

”جب تم میں سے کوئی نماز میں اپنی ہوا خارج کرے تو وہ واپس جا کر وضو کرے اور دوبارہ نماز پڑھے۔“

علمائے احناف کے ہاں مسئلہ یوں ہے کہ اگر نمازی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ چلا جائے اور وضو کر کے آئے اور اگر اس نے نماز کے منافی کوئی حرکت نہیں کی تو جہاں سے نماز چھوڑی تھی، وہیں سے ابتدا کرے، نئے سرے سے نماز ادا نہ کرے اور دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں:

«عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ أَصَابَهُ قِيءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ

مَذِيٌّ فَلْيَنْصِرْفْ ثُمَّ لْيَبْنِ عَلَى صَلَاتِهِ وَ هُوَ فِي ذَلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ» [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة

والسنة فيها: باب ما جاء في البناء على الصلاة: ١٢٢١]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جسے قے، نکسیر، پیٹ کا کھانا یا مذی آجائے تو وہ چلا

ہائے، وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے بشرطیکہ اس نے اس دوران کلام نہ کیا ہو۔“
یہ روایت ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”بلوغ المرام“ میں فرمایا ہے: ”صَعَفَةُ أَحْمَدُ وَغَيْرُهُ“ (اس حدیث کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے) لہذا اس روایت سے استدلال درست نہیں ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ نئے سرے سے وضو کرے اور ابتدا سے نماز پڑھے کیونکہ وضو نماز کے لیے شرط ہے۔

غسل جمعہ کے بعد وضو

(سوال) کیا غسل جمعہ کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟

(جواب) اگر وضو کر کے غسل کیا ہے تو پھر دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں بشرطیکہ شرمگاہ کو ہاتھ نہ لگے، کیونکہ شرمگاہ کو ہاتھ لگنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَتَوَضَّأَ » [بخاری، کتاب الوضوء: باب لا تقبل صلاة بغیر طہور: ۱۳۵]

”بغیر وضو کے نماز قبول نہیں ہوگی، یہاں تک کہ نمازی وضو کرے۔“

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

« مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ » [ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من المس الذکر: ۱۸۱]

”جس نے اپنی شرمگاہ کو چھوا وہ وضو کرے۔“

بغیر وضو تلاوت قرآن مجید کا حکم

(سوال) وضو کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ حدیث میں آتا ہے: [لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرًا]

”قرآن کو طاہر کے سوا کوئی نہ چھوئے۔“ صحیح راہ نمائی فرمائیں۔

(جواب) بے وضو انسان قرآن مجید کی تلاوت کر سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے جس میں بے وضو آدمی کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور قرآن مجید کی تلاوت کا حکم خود قرآن مجید میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاقْرَأْ وَآمَّا تَسْتَسْرَمِنَ الْقُرْآنِ ﴾ [المزمل: ۲۰]

”قرآن مجید سے جو میسر ہو، پڑھو۔“

اس میں یہ نہیں کہ وضو کے بغیر نہ پڑھو۔ جو حدیث آپ نے پیش کی ہے یہ حدیث مجموعی طرق کے لحاظ سے صحیح ہے کہ طاہر کے سوا قرآن مجید کو کوئی نہ چھوئے۔ اس کی تفسیر بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی جماعت میں

آئے، جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آگ سے نکل گئے۔ جب مجلس میں واپس آئے تو سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سُبْحَانَ اللَّهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ لَا يَنْجُسُونَ » [بخاری، کتاب الغسل، باب عرق الجنب و أن المسلم لا ينجس: ۲۸۳]

”سبحان اللہ! مومن نجس نہیں ہوتا۔“ (یعنی طاہر ہی رہتا ہے)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ”إِلَّا طَاهِرًا“ سے مراد ”إِلَّا مُؤْمِنًا“ ہے یعنی کافر قرآن مجید کو نہ چھوئے، مومن چھوسکتا ہے خواہ وہ با وضو ہو یا بے وضو۔ صحیح بخاری ہی میں ایک حدیث ہے، جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، جب اٹھے تو اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کیا اور پھر:

« قَرَأَ الْعَشْرَ الْآيَاتِ الْخَوَاتِمَ مِنْ سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ ثُمَّ قَامَ إِلَى شَنْ مَعْلَقَةٍ فَتَوَضَّأَ مِنْهَا فَأَحْسَنَ

الْوُضُوءَ ثُمَّ قَامَ يُصَلِّي » [بخاری، کتاب الوضوء، باب قراءة القرآن بعد الحدث وغيره: ۱۸۳]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کی، پھر نیکائے ہوئے مشکیزہ کی طرف بڑھے، وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔“

اس حدیث پر امام بخاری رضی اللہ عنہ نے یہ باب قائم کیا ہے: ”بَابُ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَ غَيْرِهِ“ (بے وضو ہونے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔) یہ بات تو مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے وضو بھی ہوتے تھے اور مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ » [مسلم، کتاب الحيض، باب ذكر الله في كل حال: ۳۷۳]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔“

اور اللہ کے ذکر میں قرآن مجید بھی داخل ہے۔ ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے لیے با وضو ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ آدمی اپنی عادت ہی بنا لے کہ تلاوت ہمیشہ ہی بے وضو ہونے کی حالت میں کرنی ہے، بہتر یہی ہے کہ با وضو ہو کر تلاوت کرے۔



غسل اور جنابت کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

صرف پانی سے طہارت

(سوال) اگر غسل جنابت کے وقت صابن وغیرہ نہ ہو تو کیا صرف پانی ہی سے پاک ہوا جاسکتا ہے یا صابن وغیرہ ضروری ہے؟
(جواب) پاک اور صاف پانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے کہ وہ خود پاک ہے اور پاک کرتا بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ﴾ (الأنفال: ۱۱)

”اس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا ہے تاکہ اس کے ساتھ تمہیں پاک کر دے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ پانی میں پاک کرنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔ لہذا جنابت کی پلیدی دور کرنے کے لیے پانی کافی ہے۔ صابن، شیمپو وغیرہ سٹھرائی اور طہارت کا باعث ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غسل جنابت کے لیے پانی کا تذکرہ ہی ملتا ہے اور اس پر کتاب و سنت اور اجماع امت دلالت کرتے ہیں کہ پانی بذات خود پاک ہے اور پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ننگے ہو کر غسل کرنے کا حکم

(سوال) کیا تنہائی میں ننگے ہو کر غسل کرنا جائز ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت فرمائیں۔

(جواب) تنہائی اور خلوت میں ننگے ہو کر غسل کرنا جائز ہے البتہ کپڑا باندھ لینا افضل ہے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے صحیح بخاری، ”کتاب الغسل“ میں یوں باب باندھا ہے: ”اس شخص کے متعلق بیان جس نے خلوت میں ننگے ہو کر غسل کیا اور جس نے کپڑا باندھ کر غسل کیا اور کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے۔“ حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ لوگوں کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔“ [بخاری، تعليقا (۲۷۸)]

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے خلوت و تنہائی میں ننگے نہانا جائز مگر ستر ڈھانپ کر نہانا افضل قرار دیا ہے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ننگے نہانے کے جواز پر اس باب میں دو احادیث بیان کی ہیں۔ ایک موسیٰ رضی اللہ عنہ کا خلوت و تنہائی میں غسل کرنا اور دوسرا ایوب رضی اللہ عنہ کا خلوت میں ننگے غسل کرنا اور یہ واقعات بیان کر کے نبی کریم ﷺ نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس لیے ہماری شریعت میں بھی اسی طرح خلوت میں نہانا جائز ٹھہرا لیکن کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے، اس کی دلیل یہ ہے: ”حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ“

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو گھر کے صحن میں غسل کرتے دیکھا تو فرمایا: ”بے شک اللہ شرم کرنے والا بردبار اور پردہ پوش ہے جب تم میں سے کوئی غسل کرے تو وہ ستر ڈھانپے اگرچہ دیوار کی اوٹ کے ساتھ ہو۔“ [تاریخ جرحان (۶۲۵/۳۳۲) بحوالہ إرواء الغلیل (۳۶۸/۷)]

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ و حسنہ سے معلوم ہوا کہ خلوت و تنہائی میں ننگے ہو کر غسل کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن کپڑا باندھ کر غسل کرنا بہتر اور افضل ہے۔

عورت کا غسل جنابت میں بالوں کو تر کرنا

(سوال) کیا عورت غسل جنابت میں اپنے سر کے بال تر کرے یا تر نہ بھی کرے تو غسل ہو جائے گا؟ اس مسئلے کو احادیث کی روشنی میں اس طرح واضح کریں کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور ساتھ غسل کا نبوی طریقہ بھی بیان کر دیں جس میں کی بیشی کی گنجائش نہ رہے۔

(جواب) ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہتی ہیں:

« قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ ضَمْرَ رَأْسِي أَفَأَنْقَضُهُ لِيُغْسَلَ الْجَنَابَةَ؟ قَالَ: لَا إِنَّمَا يَكْفِيكَ أَنْ تَحْنِي عَلَى رَأْسِكَ ثَلَاثَ حَثِيَّاتٍ مِنْ مَاءٍ ثُمَّ تُفِيضِي عَلَى سَائِرِ جَسَدِكَ الْمَاءَ فَتَطْهَرِينَ أَوْ قَالَ فَإِذَا أَنْتِ قَدْ تَطَهَّرْتِ » [ترمذی، کتاب الطہارۃ: باب هل تنقض المرأة شعرها عند الغسل (۱۰۵)، صحیح مسلم کتاب الحيض باب حكم صفائر المغتسلة (۳۳۰/۵۸)، ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب في المرأة تنقض شعرها عند الغسل (۲۵۱)]

”میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں جو مینڈھیاں مضبوطی سے باندھ لیتی ہوں کیا میں غسل جنابت کے لیے انھیں کھولوں؟“ آپ نے فرمایا: ”نہیں تجھے اتنا ہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو پانی بہائے پھر اپنے سارے بدن پر پانی ڈالے اور پاگیرگی حاصل کر لے۔“ یا فرمایا: ”تب تو نے اچھی طرح طہارت حاصل کر لی۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو اس بات کی رخصت ہے کہ وہ اپنی مینڈھیاں نہ کھولے، اصل مقصد پانی کو بالوں کی جڑوں تک پہنچانا ہے کیونکہ جنابت کے غسل میں فرض ہے کہ تمام بال بھیگ جائیں اگر کچھ بال خشک رہ جائیں تو غسل نہیں ہوگا۔ [ملاحظہ ہو حاشیہ مشکوٰۃ از مولانا اسماعیل سلفی (۴۳/۱)]

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: « أَفَأَنْقَضُهُ لِلْحَيْضَةِ وَالْجَنَابَةِ » کیا میں اپنی مینڈھیاں حیض اور جنابت کے لیے کھولوں؟ اس سے معلوم ہوا کہ حیض کا غسل ہو یا جنابت کا، مقصود پانی کا بالوں کی جڑوں تک پہنچانا ہے، عورت کو مینڈھیاں نہ کھولنے کی رخصت دی گئی ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث میں ہے:

« ثُمَّ تَصَّبُ عَلَى رَأْسِهَا فَتَدْلِكُهُ دَلِكًا شَدِيدًا حَتَّى تَبْلَغَ شُؤُونَ رَأْسِهَا » [مرعاة (۱۳۶/۲)، ابن

ماجہ، کتاب الطہارۃ و سننہا: باب فی الحائض کیف تغتسل (۶۴۲)، طیالسی (۶۰/۱)، حمیدی (۱۶۷) ابوداؤد (۳۱۴ تا ۳۱۶)، مسلم (۳۳۲/۶۱)، ابن خزیمہ (۲۴۸)، ابن حبان (۱۱۹۹)، المنتقی لابن الحارود (۱۱۷)

”پھر اپنے سر پر پانی بہائے اور اسے اچھی طرح ملے یہاں تک کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔“
ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ حیض یا جنابت کے غسل میں عورت کو شرعاً رخصت ہے کہ وہ اپنے سر کے بال نہ کھولے البتہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچائے بال ترک کرنے ضروری ہیں، اب رہا غسل کا نبوی طریقہ تو اس کیلئے احادیث درج ذیل ہیں:

«عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَعَسَلَ يَدَيْهِ ثُمَّ تَوَضَّأَ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ فَيَحْلِلُ بِهَا أُصُولَ الشَّعْرِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غُرْفٍ بِيَدَيْهِ ثُمَّ يُفِيضُ الْمَاءَ عَلَى جِلْدِهِ كُلِّهِ»

[بخاری، کتاب الغسل: باب الوضوء قبل الغسل (۲۴۸)، مسلم، کتاب الحيض (۳۲۱) ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب الغسل من الجنابة (۲۴۲)، ترمذی، ابواب الطہارۃ: باب ماجاء فی الغسل من الجنابة (۱۰۴)، ابوعوانہ (۲۹۸-۲۹۹) ابن خزیمہ (۲۴۲)، نسائی کتاب الطہارۃ: باب ذکر وضوء الحنب قبل الغسل (۲۴۷)]

”نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ جنابت کا غسل کرتے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوتے پھر نماز کی طرح وضو کرتے پھر اپنی انگلیاں پانی میں داخل کرتے اور ان سے بالوں کی جڑوں کا خلال کرتے پھر اپنے ہاتھوں سے تین چلو پانی اپنے سر پر ڈالتے، پھر اپنی ساری جلد پر پانی بہا دیتے۔“

سنن ابی داؤد وغیرہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں دونوں ہاتھ دھونے کے بعد «فَيَعْسِلُ فَرْجَهُ» یعنی اپنی شرمگاہ دھونے کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح بالوں کے خلال کے بعد «حَتَّى إِذَا رَأَى أَنَّهُ قَدْ أَصَابَ الْبَشْرَةَ وَأَنْقَى الْبَشْرَةَ» کا بھی ذکر ہے یعنی اپنے بالوں کا خلال کرتے یہاں تک کہ جب آپ سمجھتے کہ کھال کو پانی پہنچ گیا یا صاف کر لیا ہے تو اپنے سر پر تین بار پانی ڈالتے۔

«عَنْ مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ تَوَضَّأَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ غَيْرَ رِجْلَيْهِ وَغَسَلَ فَرْجَهُ وَمَا أَصَابَهُ مِنَ الْأَذَى ثُمَّ أَفَاضَ عَلَيْهِ الْمَاءَ ثُمَّ نَحَى رِجْلَيْهِ فَعَسَلَهُمَا هَذِهِ غُسْلُهُ مِنَ الْجَنَابَةِ» [صحیح بخاری، کتاب الغسل: باب الوضوء قبل الغسل (۲۴۹)]

نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ میمونہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے نماز کی طرح وضو کیا البتہ پاؤں نہیں دھوئے اور اپنی شرمگاہ کو دھویا اور جہاں کہیں نجاست لگی تھی پھر اپنے اوپر پانی بہایا پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے یہ آپ ﷺ کا غسل جنابت تھا۔ اس روایت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے شرمگاہ اور نجاست کے مقام کو وضو سے پہلے دھویا کرتے تھے اور اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی۔

میمونہ رضی اللہ عنہما کہتی ہیں:

« صَبَبْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا فَأَفْرَغَ بِيَمِينِهِ عَلَى يَسَارِهِ فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ غَسَلَ فَرْجَهُ ثُمَّ قَالَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَغَسَلَهُمْ بِالْتُرَابِ ثُمَّ غَسَلَهَا ثُمَّ تَمَضَّمُضٌ وَاسْتَنْشَقُ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ وَأَفَاضَ عَلَى رَأْسِهِ ثُمَّ تَنَحَّى فَغَسَلَ فَقَدَمَيْهِ ثُمَّ أَتَى بِمِنْدِيلٍ فَلَمْ يَنْفُضْ بِهَا »

[بخاری، کتاب الغسل: باب المضمضة والاستنشاق في الجنابة (۲۵۹)، ابن ماجه (۵۷۳)، مسند حمیدی (۳۱۶)، مسند احمد (۳۲۹/۶، ۳۳۰، ۳۳۵، ۳۳۶)، مسند عبد بن حمید (۱۵۵۰)، سنن الدارمی (۷۵۳/۷۱۸)، ابوداؤد (۲۴۵)، ترمذی (۱۰۳)، نسائی (۱۳۲/۱)، المسند الجامع (۵۱۸/۲۰)۔ (۵۲۰) (۱۷۴۴۱)]

”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غسل کا پانی رکھا تو پہلے آپ نے پانی کو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ بائیں پر ڈالا، اسی طرح دونوں ہاتھوں کو دھویا پھر اپنی شرمگاہ کو دھویا پھر اپنے ہاتھ کو زمین پر رگڑ کر مٹی سے صاف کیا پھر اسے دھویا پھر کھلی کی اور ناک میں پانی ڈالا پھر اپنے چہرے کو دھویا اور اپنے سر پر پانی بہایا پھر ایک طرف ہو کر دونوں پاؤں کو دھویا پھر آپ کے پاس رومال لایا گیا پس آپ نے اس کے ساتھ پانی خشک نہیں کیا۔“

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے غسل سے پہلے نماز کی طرح وضو کا ذکر ہے اور میمونہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں سر پر مسح کا ذکر نہیں ہوا جبکہ وضو کا مفصل ذکر ہے، اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث ہے، بیان کرتی ہیں:

« ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ ثَلَاثًا وَاسْتَنْشِقُ وَيَمَضَّمُضٌ وَيَغْسِلُ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ ثَلَاثًا ثَلَاثًا حَتَّى إِذَا بَلَغَ رَأْسَهُ لَمْ يَمَسَّحْ وَأَفْرَغَ عَلَيْهِ الْمَاءَ فَهَكَذَا كَانَ غُسْلُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »

[سنن النسائي، كتاب الطهارة: باب ترك مسح الرأس في الوضوء من الجنابة (۴۲۲)]

”شرمگاہ کو دھونے کے بعد پھر آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو تین بار دھوتے اور ناک میں پانی چڑھاتے اور کھلی کرتے اور اپنے چہرے اور بازوؤں کو تین تین بار دھوتے تھے، یہاں تک کہ جب سر تک پہنچے تو آپ نے مسح نہیں کیا اور اس پر پانی انڈیل دیا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل تھا۔“

علامہ سندھی ”لَمْ يَمَسَّحْ“ کے تحت لکھتے ہیں:

” قَدْ سَبَقَ أَنَّهُ كَانَ يَتَوَضَّأُ وَضُوءَ اللَّصْلَوَةِ فَمَا أُنْ يُقَالُ ذَلِكَ عُمُومٌ يُخَصُّ بِهَذَا أَوْ يُقَالُ لَهُ تَارَةٌ يَفْعَلُ هَذَا وَتَارَةٌ ذَلِكَ لِبَيَانِ الْجَوَازِ “

”یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ نماز کی طرح وضو کرتے یا تو کہا جائے گا اس حدیث میں عموم ہے جو اس حدیث کے ساتھ خاص ہو گیا ہے (یعنی وضو کے عموم میں مسح کرنا بھی آجاتا ہے) جبکہ اس حدیث سے تخصیص ہو گئی کہ مسح نہیں ہے کیونکہ یہ مسح کی نفی میں خاص ہے یا کہا جائے گا کبھی اس طرح کر لیتے اور کبھی اس طرح اور ایسا آپ نے بیان جواز کے لیے کیا ہے (یعنی دونوں طرح جائز ہے)۔“ [نیز دیکھیں تعلیقات سفلیہ (ص ۴۷)]

پس معلوم ہوا کہ غسل جنابت کرنے سے پہلے جسم پر لگی ہوئی منی وغیرہ کو صاف کیا جائے، شرمگاہ کو دھویا جائے پھر ہاتھوں کو اچھی طرح صاف کیا جائے اور نماز کی طرح وضو کیا جائے پھر پانی لے کر بالوں کی جڑوں تک پہنچایا جائے، پھر اپنے سارے جسم پر پانی بہا دیا جائے، اس طرح غسل جنابت ہو جائے گا۔

غسل خانے میں گفتگو کرنا

(سوال) کیا غسل خانے میں دوران غسل کوئی ضرورت کی بات کی جاسکتی ہے؟ بعض لوگ بات کرنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں، وضاحت کریں۔

(جواب) بوقت ضرورت بیت الخلاء میں اگر کوئی بات کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے :
 ”آپ ﷺ غسل فرما رہے تھے تو آپ کے ہاں ام ہانی رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو آپ نے پوچھا: ”کون؟“ تو انہوں نے جواب میں کہا: ”میں ام ہانی ہوں۔“ [بخاری، کتاب الغسل: باب التستر فی الغسل عند الناس: ۲۸۰]
 اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ضرورت کے تحت بات کرے تو کوئی حرج نہیں۔ بلاوجہ گفتگو سے بچنا چاہیے۔

حالت مباشرت میں پہنے گئے کپڑوں کا حکم

(سوال) کیا ان کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے جو حالت مباشرت میں پہنے ہوئے ہوں؟
(جواب) قرآن و سنت کی رو سے جس مرد نے جس کپڑے کے ساتھ اپنی بیوی سے صحبت کی اگر اس کپڑے میں پلیدی نہیں لگی تو اس کپڑے میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر کپڑے کو منی لگ جائے تو تری کی صورت میں دھو ڈالے، دھونے کے بعد اگر کپڑے میں نشان دکھائی دے تو کوئی حرج نہیں اور منی اگر خشک ہو جائے تو اس کو کھرچ دینا ہی کافی ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

”میں نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جو نبی ﷺ کی بیوی تھیں، سے دریافت کیا: ”نبی ﷺ جس کپڑے میں مباشرت کرتے تھے کیا اسی میں نماز پڑھ لیتے تھے؟“ تو انہوں نے کہا: ”ہاں! جب اس میں گندگی نہ دیکھتے۔“ [ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب الصلاة فی الثوب الذی یصیب أهلہ فیہ: ۳۶۶۔ نسائی ۱۰۵۰۱۔ ابن ماجہ: ۱۹۲/۱]



حیض و نفاس کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

حائضہ عورت کا مسجد میں جانا

سوال کیا حائضہ عورت مسجد میں جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب حائضہ عورت کے مسجد میں جانے کے بارے میں کافی اختلافات ہیں لیکن زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ حائضہ اور جنبی مسجد میں سے باہر مجبوری گزر سکتے ہیں۔ انھیں وہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے، قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكْرَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنْبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ ﴾

[النساء: ۴۳]

”نشے کی حالت میں نماز (اور نماز کی جگہ) کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ (تمہارا نشہ اتر جائے اور) تمہیں معلوم ہو جائے

جو تم کہہ رہے ہو، نیز جنبی بھی (مسجد کے قریب نہ جائے) مگر راہ عبور کرنے یا گزرنے کے لیے۔“

نوٹ: جس جگہ واقعتاً نماز ادا کی جا رہی ہے، وہ جگہ تو مسجد ہے لیکن اگر چھت پر نماز ادا نہیں کی جاتی تو وہ مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کون سی جگہ مسجد قرار دی گئی ہے؟ اگر چھت پر جماعت نہیں ہوتی تو کوئی حرج نہیں وہاں حائضہ اور جنبی جا سکتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمَسْجِدَ لَا يَحِلُّ لِجُنْبٍ وَلَا حَائِضٍ» [ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ و سننہا: باب فی ما جاء فی

اجتناب الحائض المسجد (۶۴۵)]

”مسجد میں حائضہ اور جنبی کا داخل ہونا حلال نہیں۔“

حیض و نفاس کی حالت میں عبادات کا حکم

سوال میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ عورت کا حیض و نفاس کی حالت میں نماز پڑھنا، اس سے جماع کرنا، مسجد میں داخل ہونا، روزہ رکھنا اور قرآن چھونا وغیرہ سب حرام ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں، خاص طور پر مسجد میں داخل ہونا اور قرآن کو چھونے کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب حیض و نفاس کی حالت میں نماز، روزہ، وطی اور مسجد میں داخل ہونا منع ہے، قرآن کو چھونا مختلف فیہ ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کو عید گاہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ عورتوں

کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کیا کرو تم مجھے اکثر جہنم میں دکھلائی گئی ہو۔“ انھوں نے کہا: ”کس وجہ سے اے اللہ کے رسول!؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم کثرت سے لعن طعن کرتی ہو اور شوہروں کے ساتھ کفر کرتی ہو، میں نے کوئی ایسا کم عقل اور کم دین نہیں دیکھا جو تم سے بڑھ کر عقل مند آدمی کی عقل کو زائل کرنے والا ہو۔“ عورتوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے دین اور عقل کا نقصان کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟ قُلْنَ بَلَىٰ »

”کیا عورت کی گواہی آدمی کی گواہی سے آدھی نہیں ہے؟“ انھوں نے کہا: ”کیوں نہیں۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ ان کی عقل کا نقصان ہے۔“ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَ لَمْ تَصُمْ؟ قُلْنَ بَلَىٰ ، قَالَ فَذَلِكَ مِنْ نَقْصَانِ دِينِهَا » [بخاری،

کتاب الحيض، باب ترك الحائض الصوم (۳۰۴)]

”کیا جب عورت ایام ماہواری میں ہوگی تو (کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ) نہ نماز پڑھے گی اور نہ روزہ رکھے گی؟“

(طہارت کی حالت میں روزہ قضا کرے گی، نماز کی قضا نہیں ہوگی) انھوں نے کہا: ”کیوں نہیں۔“ تو آپ ﷺ نے

فرمایا: ”یہ ان کے دین کا نقصان ہے۔“

حالت نفاس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَتِ النَّفْسَاءُ عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَقْعُدُ بَعْدَ نَفَاسِهَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا

أَوْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً » [ابو داؤد، کتاب الطہارۃ : باب ما جاء فی وقت النفساء (۳۱۱) ، ابن ماجہ، کتاب

الطہارۃ : باب النفساء کم تحلس (۶۴۸) ، ترمذی، کتاب الطہارۃ ، باب ما جاء فی کم تمکث النفساء

[۱۳۹)]

”نفاس والی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اپنے نفاس کے بعد چالیس دن یا چالیس راتیں بیٹھی رہتی تھیں۔“

ایک دوسری روایت میں ہے کہ متہ ازدیہ کہتی ہیں کہ میں نے حج کیا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، میں نے کہا:

”اے ام المومنین! بے شک سرہ بن جناب عورتوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ حیض والی نمازیں قضا کریں۔“ وہ کہنے لگیں: ”قضانہ

کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ایک عورت چالیس راتیں نفاس میں بیٹھتی لیکن نبی ﷺ اسے نفاس کی

حالت والی نماز قضا کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔“ [ابو داؤد = کتاب الطہارۃ ، باب ما جاء فی وقت النفساء (۳۱۲)،

حاکم (۱۷۵۱۱) بیہقی (۳۴۱۱) امام حاکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور امام ذہبی نے

ان کی موافقت کی ہے۔]

امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” وَ قَدْ أَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ وَ التَّابِعِينَ وَ مِنْ بَعْدِهِمْ عَلَىٰ أَنَّ النَّفْسَاءَ تَدْعُ

الصَّلَاةَ أَرْبَعِينَ يَوْمًا إِلَّا أَنْ تَرَى الطُّهْرَ قَبْلَ ذَلِكَ فَإِنَّهَا تَغْتَسِلُ وَ تُصَلِّيُ“ [ترمذی مع تحقیق

احمد شاکر (۲۵۸/۱) شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں کہ یہی مذهب صحیح ہے اور حدیث کے موافق ہے [”اہل علم اصحاب النبی، تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دن نماز چھوڑیں گی۔ ہاں اگر وہ چالیس دن سے پہلے طہر کی حالت دیکھ لیں تو غسل کریں اور نماز پڑھیں۔“]
حالت حیض میں جماع اور ہم بستری بھی ممنوع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ [البقرة: ۲۲۲]

”اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں وہ گندگی ہے۔ حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ جب وہ سترائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤں جہاں سے تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ تو بہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حیض والی ہو جاتی تو وہ اسے گھر سے نکال دیتے اور گھر میں نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور نہ جماع کرتے۔

رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی: ﴿ وَ يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ﴾ آخر آیت تک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ان کو گھروں میں رکھو اور جماع کے علاوہ باقی تمام کام کرو۔“ یہودیوں نے کہا کہ یہ شخص ہر معاملے میں ہماری مخالفت چاہتا ہے۔ اسید بن حمیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! بے شک یہودی اس طرح کہتے ہیں، کیا ہم حالت حیض میں عورتوں سے جماع نہ کریں؟“ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ آپ ان دونوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے، پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کو دودھ کا تحفہ بھیجا گیا تو ہم نے سمجھا کہ آپ ان سے ناراض نہیں ہیں۔“ [ابو داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی مؤاکلة الحائض و محامعتها (۲۵۸)، مسلم، کتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها (۳۰۲)، ترمذی = کتاب تفسیر القرآن، باب و من سورة البقرة (۲۹۷۷)، نسائی، کتاب الطہارۃ، باب تاویل قول الله عزوجل ﴿ وَ يَسْتَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ﴾ (۲۸۹)، ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ و سنتها: باب ما جاء فی مؤاکلة الحائض و سورہا (۶۴۴)]
اس آیت قرآنی اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت سے حالت حیض میں صحبت و جماع حرام ہے۔ البتہ اس کے ہاتھ کا کھانا پینا، کنگھی وغیرہ جیسے دیگر امور جائز و درست ہیں۔

اگر حالت حیض میں صحبت کر بیٹھے تو اسے ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دینا پڑے گا جیسا کہ صحیح حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔ [ابو داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی إتيان الحائض (۲۶۴)، ترمذی، ابواب الطہارۃ: باب ما جاء فی الكفارة فی ذلك (۱۳۶)، ابن ماجہ = کتاب الطہارۃ و سنتها، باب فی كفارة من أتى حائضًا (۶۳۰)]

حالت حیض میں عورت مسجد کے اندر عبادت کے لیے نہیں جاسکتی البتہ مسجد سے گزر سکتی ہے اور کوئی چیز مسجد سے اٹھانا ہو تو اٹھا سکتی ہے۔ اس کی رخصت ہے، جیسا کہ سورہ نساء آیت (۴۳) میں جنہی کو جنابت کی حالت میں مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی البتہ مسجد کے اندر سے گزرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ حیض و نفاس کی ناپاکی جنابت سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا حیض و نفاس کی صورت میں بھی مسجد کے اندر ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاولِيْنِي الْحُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ قُلْتُ إِنِّي حَائِضٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ حَيْضَتَكَ لَيْسَتْ فِي يَدِكَ » [ابو داؤد، كتاب الطهارة: باب في الحائض تناول من المسجد (۲۶۱)، مسلم، كتاب الحيض: باب جواز غسل الحائض رأس زوجها (۲۹۸)، ترمذی، ابواب الطهارة: باب ما جاء في الحائض تناول الشيء من المسجد (۱۳۴)، نسائی، كتاب الطهارة: باب استخدام الحائض (۳۸۳)]

”مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے مسجد سے چٹائی پکڑا دو۔“ میں نے کہا: ”میں حائضہ ہوں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے:

” وَهُوَ قَوْلُ عَامَّةِ أَهْلِ الْعِلْمِ لَا نَعْلَمُ بَيْنَهُمْ إِخْتِلَافًا فِي ذَلِكَ بِأَنَّ لَا بَأْسَ أَنْ تَتَنَاوَلَ الْحَائِضُ شَيْئًا مِنَ الْمَسْجِدِ “ [ترمذی بتحقیق احمد شاکر (۲۴۲/۱)]

”یہ عام اہل علم کا قول ہے۔ اس مسئلہ میں ہم ان کے درمیان اختلاف نہیں جانتے کہ حائضہ کا مسجد سے کسی چیز کے پکڑانے میں کوئی حرج نہیں۔“

رہا حائضہ عورت کا قرآن پاک کو چھونا تو اس کی ممانعت میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اہل علم اس کے بارے میں مختلف ہیں۔ البتہ افضل اور بہتر یہی ہے کہ مسلمان عورت طہارت کی حالت میں قرآن حکیم کو چھوئے یا کوئی صاف ستھرا کپڑا قرآن مجید کے اوراق کو پلٹنے کے لیے استعمال کرے، ہاتھ لگانے سے اجتناب کرے۔ امام نووی رضی اللہ عنہ اس صورت کے بارے میں لکھتے ہیں: ”یہ اختلاف کے بغیر جائز ہے۔“ [المجموع شرح المہذب (۳/۳۷۲)]

حائضہ عورت کا قرآن کو ہاتھ لگانا

(سوال) کیا حائضہ عورت قرآن مجید کو پکڑ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر پکڑ سکتی ہے تو پھر ﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب) اس مسئلے کے متعلق اہل علم کی مختلف آراء ہیں۔ عدل و انصاف کے ترازو سے جس بات کو ترجیح ملتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں بلا وجہ قرآن مجید نہیں چھونا چاہیے لیکن پڑھنے اور پڑھانے کے سلسلہ میں اگر چھو بھی لیتی ہے تو اس

میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے فرامین میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہو۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عورتیں حاضرہ ہوتی تھیں، وہ قرآن مجید پڑھتی اور پڑھاتی بھی تھیں لیکن کہیں بھی ان کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ وہ ایسی حالت میں قرآن مجید کو چھو نہیں سکتیں۔ اس وقت اس مسئلہ کے بیان کی ضرورت بھی تھی لیکن ضرورت کے باوجود شارع ﷺ کی اس پر خاموشی اس کے جواز کی دلیل ہے۔ قرآن مجید کی جس آیت سے ممانعت کا استدلال کرتے ہیں وہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیت قرآن مجید کو چھونے کے بارے میں نہیں ہے۔

اس آیت کے سیاق و سباق کا غور سے مطالعہ کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قرآن مجید کے متعلق بلکہ لوح محفوظ کے متعلق کہی گئی ہے ﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ کی ضمیر کا مرجع ﴿فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ﴾ ہے اور ﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ تو اس آیت کا معنی ہے کہ لوح محفوظ فرشتوں کے سوا کوئی نہیں چھوتا۔ ﴿الْمُطَهَّرُونَ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ اس بات پر حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین کی بہت بڑی جماعت متفق ہے۔ احناف کی تفسیر روح المعانی میں ہے:

”إِنَّ الْمُرَادَ بِالْمُطَهَّرِينَ الْمَلَائِكَةَ مَرُوءِي مِنْ عِدَّةِ طُرُقٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ كَذَا أَخْرَجَهُ جَمَاعَةٌ عَنْ أَنَسٍ وَقَتَادَةَ وَ ابْنِ جُبَيْرٍ وَ مُجَاهِدٍ وَ أَبِي الْعَالِيَةِ وَ غَيْرِهِمْ“

”مطہرین سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی اسناد کے ساتھ مروی ہے اور انس، قتادہ، ابن جبیر، مجاہد اور ابی العالیہ وغیرہم سے بھی ایک جماعت نے اس کو روایت کیا ہے۔“

تفسیر رازی میں ہے:

”الْضَّمِيرُ عَائِدٌ إِلَى الْكِتَابِ عَلَى الصَّحِيحِ“

”﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ کی ضمیر کتاب (لوح محفوظ) کی طرف لوٹی ہے۔“

اشرف الحواشی میں ہے کہ بعض نے اس ضمیر کو قرآن مجید کے لیے مانا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ بے وضو ہونے کی حالت میں اسے چھونا ناجائز ہے مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے اور قرآن مجید کو بے وضو چھونا جائز ہے گو بہتر یہ ہے کہ وضو کر لیا جائے۔ قرآن مجید کو چھونے کے متعلق جو صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

﴿لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ﴾

”طاہر کے سوا قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔“

اس طاہر کی تفسیر صحیح بخاری شریف کی حدیث میں موجود ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ جہنی تھے، نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر درد سے گزر گئے۔ غسل کے بعد واپس آ کر رسول اللہ ﷺ سے ملے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا: «الْمُؤْمِنُ لَا يَنْجَسُ» ”مومن نجس ہوتا ہی نہیں ہے۔“

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ «إِلَّا طَاهِرٌ» سے مراد «إِلَّا مُؤْمِنٌ» ہے یعنی قرآن مجید کو مومن کے سوا دوسرا نہ چھوئے

اور یہ بات مسلم ہے کہ حیض کی حالت میں عورت مومنہ ہی رہتی ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ”مجھے مسجد سے مصلیٰ پکڑاؤ۔ انھوں نے کہا: ”میں حائضہ ہوں۔“ تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:

« اِنَّ حَيْضَتَكَ لَيْسَتْ فِيْ يَدِكَ » [مسلم ، كتاب الحيض ، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها و
ترجیله (۲۹۸)]

”بے شک تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

نبی کریم ﷺ کے یہ الفاظ اس مسئلہ میں نص کی حیثیت رکھتے ہیں کہ حیض کی نجاست ہاتھ کے اندر نہیں ہے بلکہ حیض کی حالت میں ہاتھ پاک ہی رہتا ہے۔

اس ساری وضاحت کے باوجود اگر مسلمان عورت زیادہ تعظیم اور احترام کے پیش نظر قرآن مجید کو بغیر چھونے کے پڑھ سکتی ہے یا کوئی صاف ستھرا کپڑا قرآن مجید کو پکڑنے اور اوراق الٹانے کے لیے استعمال کر لے تو بہت بہتر اور اچھا ہے۔ اس سے وہ علماء کے اختلاف سے بھی نکل جائے گی۔ ایسی صورت میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”جَائِزٌ بَلَا خِلَافٍ“ (یہ بغیر کسی اختلاف کے جائز ہے۔) [المجموع شرح المہذب (۲/۳۷۲)]

حائضہ عورت کا قرآن پاک کی تلاوت کرنا

سوال بعض اہل علم حائضہ کو تلاوت قرآن کی اجازت دیتے ہیں اور بعض اس سے منع کرتے ہیں، آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں کہ کیا حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل علم کی اس مسئلے میں مختلف آراء ہیں۔ امام بخاری، امام ابن جریر طبری، امام ابن منذر، امام مالک، امام شافعی اور امام ابراہیم نخعی، ان سب کے نزدیک حائضہ عورت کے قرآن کی تلاوت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ راجح بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن و سنت میں کوئی صریح اور صحیح دلیل موجود نہیں جس میں حیض والی عورت کو قرآن مجید کی تلاوت سے روکا گیا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں بھی حائضہ ہوتی تھیں۔ اگر قرآن مجید کی تلاوت ان کے لیے حرام ہوتی تو اللہ کے رسول انھیں قرآن مجید کی تلاوت سے روک دیتے جس طرح کہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے روک دیا تھا اور جب حیض کی کثرت کے باوجود صحابی رسول نے یا امہات المومنین میں سے کسی نے امام الانبیاء سے اس کی ممانعت نقل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ جائز ہے۔ اب اس چیز کا علم ہونے کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی ممانعت بالکل منقول نہیں اس کو حرام کہنا درست نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے:

« لَا يَقْرَأُ الْحُجْبُ وَالْحَائِضُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ » [ابن ماجہ ، كتاب الطهارة و سننها: باب ما جاء في

قراءة القرآن على غير طهارة (۵۹۶)]

”حائضہ اور جنبی قرآن سے کچھ بھی نہ پڑھیں۔“

یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے جب یہ شخص حجازیوں سے کوئی روایت بیان کرے تو وہ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔ یہ روایت حجازیوں ہی سے ہے۔ دوسری حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يقرأُ الحائِضُ وَلَا النِّفَسَاءُ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْئًا » [دار قطنی، کتاب الجنائز: باب تخفیف القراءۃ
لحاجۃ (۱۸۵۴)]

”حائض اور نفاس والی عورتیں قرآن سے کچھ نہ پڑھیں۔“

یہ حدیث بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ اس کی سند میں محمد بن الفضل ہے، جسے محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ احادیث گھڑنے کا بھی اس پر الزام ہے۔

یہی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔ اس کی سند میں یحییٰ بن ابی ایسہ ہے اور یہ کذاب ہے۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

” لَا يَصْلُحَانِ لِلْإِحْتِجَاجِ بِهِمَا عَلَى ذَلِكَ فَلَا يُصَارُ إِلَى الْقَوْلِ بِالتَّحْرِيمِ إِلَّا بِدَلِيلٍ “
[نیل الأوطار (۴۶۱/۴)]

”ان دونوں حدیثوں کو حائضہ عورت کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کی ممانعت کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا اور بغیر دلیل کے اسے حرام نہیں کیا جاسکتا۔“

باقی مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ایسی عورت قرآن کو چھو نہیں سکتی، زبانی پڑھ سکتی ہے لیکن مجھے اس کی کوئی دلیل نہیں ملی۔

« لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ » [إرواء الغلیل (۱۲۲)]

”قرآن کو طاہر کے سوا کوئی نہ چھوئے“ اس سے اس پر استدلال درست نہیں ہے کیونکہ ”الطاهر“ کا معنی بخاری شریف کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث متعین کرتی ہے کہ اس کا معنی ہے مؤمن کے سوا قرآن کو کوئی نہ چھوئے۔ (واللہ اعلم)

دورانِ حج و عمرہ حائضہ کا حکم

(سوال) اگر کوئی دورانِ حج و عمرہ حائضہ ہو جائے تو طواف اور دیگر کام کر سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) حائضہ عورت حج اور عمرہ کا احرام باندھ لے اور حج کے سارے کام کرتی جائے، صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرے اور نہ نمازیں ہی ادا کرے پھر جب حیض سے پاک ہو جائے تو خانہ کعبہ کا طواف کرے کیونکہ طواف کے لیے طہارت شرط ہے۔

اگر طہارت نہ ہو تو طواف نہیں ہوتا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَذْكُرُ إِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا جِئْنَا سَرَفَ طَمَثَتْ فَدَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَآنَا أَبِي كُبَيْ قَالَ لَعَلَّكَ نَفْسَتْ؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَإِنَّ ذَلِكُ شَيْءٌ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ فَأَفْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهَرِي » [بخاری، کتاب الحيض: باب الأمر بالنفساء إذا نفسن (۲۹۴، ۳۰۵، ۳۱۶)، مسلم (۱۲۱۱)، ابوداؤد (۱۷۸۲)، ابن ماجہ (۲۹۶۳)، نسائی (۱۵۶/۵)]

”ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، ہمارا مقصد صرف حج تھا پھر جب ہم سرف مقام پر پہنچے تو میں حائضہ ہو گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو میں رو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شاید تجھے حیض آنا شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا: ”ہاں!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے مقرر کر دیا ہے، جو کچھ حاجی کرتے ہیں تو بھی کرتی جا سوائے اس کے کہ پاک ہونے تک بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گی۔“ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت حیض میں عورت بیت اللہ کے طواف کے علاوہ باقی حاجیوں والے تمام کام کر سکتی ہے اور جب حیض سے پاک ہو جائے تو بیت اللہ کا طواف کر لے۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM

طہارت کے متفرق مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

سلسلہ البول کا حکم

سوال اگر کسی شخص کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں تو نماز کس طرح ادا کرے؟ اور کیا ایسا شخص امامت کروا سکتا ہے؟

جواب اگر کسی شخص کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہوں تو وہ ہر نماز کے لیے وضو کر کے نماز پڑھ لے، ہر نماز کے لیے وضو کرنا اس کی طہارت ہے۔ لہذا وہ امامت بھی کروا سکتا ہے۔ اس کی نظیر شریعت اسلامیہ میں استحاضہ والی عورت کی ہے۔

جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش کے بارے میں ہے کہ ان کی استحاضہ کی حالت تھی تو نبی ﷺ نے انہیں فرمایا:

”جب حیض کا خون ہو جو سیاہ ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے تو نماز سے رک جا اور جب دوسرا خون ہو تو وضو کر اور نماز ادا

کر، وہ تو ایک رگ ہے۔“ [ابوداؤد کتاب الطہارۃ: باب إذا أقبلت الحيضة تدع الصلاة (۲۸۶)، نسائی،

کتاب الحيض والا استحاضة (۳۵۹)]

تو جس طرح مستحاضہ عورت کو خون آتا رہتا ہے تو اس حالت میں اسے حکم ہے کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھ لے کیونکہ وضو اس

کی طہارت ہے، اسی طرح سلسلہ البول کا مریض بھی جب نماز ادا کرنے لگے تو وضو کرے، یہ اس کی طہارت ہے اور نماز ادا

کرے، اسے ترک نہ کرے۔ (واللہ اعلم)

اہل کتاب اور دیگر کفار کے برتنوں اور ذبیحے کا حکم

سوال کیا اہل کتاب اور دیگر کفار کا ذبیحہ کھانا جائز ہے؟ اور کیا ان کے برتن استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علاوہ کفار کے ذبیحہ کھانا جائز نہیں ہے، چاہے مجوس ہوں یا بت پرست، کیونکہ

ہوں یا کافروں کی دوسری کوئی قسم، ان کے ذبیحوں سے ملے ہوئے شوربے بھی جائز نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب

کے کھانے کے علاوہ ہمارے لیے کسی بھی دوسرے کافر کا کھانا حلال نہیں کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”آج تمہارے لیے ساری چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان

کے لیے۔“ [المائدة: ۵]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما و دیگر مفسرین کے بقول ”طعام“ سے مراد ان کے ذبیحے ہیں، البتہ میوہ جات اور اس قسم کی

دوسری اشیاء کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ ”طعام محرم“ میں داخل نہیں ہیں۔ مسلمان کا کھانا مسلم وغیر مسلم سبھی کے

لیے حلال ہے اگر وہ سچا مسلمان ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کے ساتھ انبیاء، اولیاء، اصحاب قبور اور کفار کے معبودوں کو نہیں پکارتا ہے۔

رہا برتنوں کا مسئلہ تو اس سلسلے میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کافروں کے برتن سے جن پران کے کھانے اور شراب رکھی جاتی ہے اپنا الگ برتن رکھیں، اگر الگ برتن رکھنا مشکل ہو تو مسلمان کے لیے کھانا بنانے والوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کافروں کے استعمال میں آنے والے برتنوں کو اچھی طرح دھولیں پھر ان میں مسلمانوں کے لیے کھانا رکھیں۔

صحیحین میں حضرت ابو ثعلبہ حشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے برتنوں کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا:

”ان میں مت کھاؤ الا یہ کہ تمہیں دوسرا برتن نہ ملے، اگر ایسا ہو تو پہلے انھیں دھولو پھر ان میں کھانا کھاؤ۔“ [بخاری، کتاب الذبائح والصيد: باب آنية المحوس والميتة (۵۴۹۶)]

WWW. KITABOSUNNAT.COM



نماز کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اذان کا بیان

اذانِ فجر میں ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا

سوال کیا اذانِ فجر میں ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے یا یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا اضافہ ہے؟ تفصیل سے رہنمائی فرمائیں۔

جواب نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہما کو اذان کا جو طریقہ بذات خود سکھایا، اس میں صبح کی اذان کے لیے ”حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ“ کے بعد دو مرتبہ ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا ثابت ہے۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! عَلَّمَنِي سُنَّةَ الْأَذَانِ قَالَ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِي قَالَ تَقُولُ اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ فَإِنْ كَانَ صَلَاةُ الصُّبْحِ قُلْتَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ »
[ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب كيف الأذان (٥٠٠، ٥٠١)، موارد الظمان (٢٨٩)، طبرانی كبير (١٧٤/٧) حلية الأولياء (٣١٠/٨)، عبد الرزاق (٤٥٨/١)، شرح السنة (٢٦٣/٢)، ابن خزيمة (٢٠١/١)، دار قطنی (٢٣٣/١)]

”میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! مجھے اذان کا طریقہ سکھادیں۔“ آپ ﷺ نے میرے سر کے اگلے حصہ کو چھوا اور فرمایا: ”تو کہہ اللہ اکبر، اللہ اکبر..... اگر صبح کی نماز (کے لیے اذان) ہو تو تو کہہ ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ۔“

« عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ » [ابن خزيمة (٣٨٦)، دار قطنی (٢٤٢/١)، التحقيق لابن الجوزی (٣١١/١)، بیہقی (٤٢٣/١)، امام بیہقی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ نیز دار قطنی میں ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ مَرَّتَيْنِ“ کے الفاظ ہیں۔]

”حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”یہ سنت ہے کہ جب مؤذن فجر کی اذان میں ”حی علی الفلاح“ کہے تو دو مرتبہ ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہے۔“

اور یہ بات اصول حدیث میں واضح ہے کہ جب صحابی کسی امر کے بارے میں کہے کہ یہ سنت ہے تو اس سے مراد نبی کریم ﷺ

کی سنت ہی ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَاصْحَابُ النَّبِيِّ لَا يَقُولُونَ السُّنَّةَ إِلَّا لِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ [كتاب الأم (۱/۲۴۰)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لفظ ”سنت“ صرف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر بولتے تھے۔“

پس ثابت ہوا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کو فجر کی اذان میں ”حی علی

الفلاح“ کے بعد دوبار سنت کہنے کا مطلب یہی ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

» عَنْ بِلَالٍ أَنَّهُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤَدِّنُهُ بِصَلَاةِ الْفَجْرِ فَقِيلَ لَهُ وَنَائِمٌ فَقَالَ

الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ فَأَقْرَبَتْ فِي تَأْدِينِ الْفَجْرِ فَتَبَّتِ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِكَ»

[ابن ماجہ، کتاب الأذان: باب السنة في الأذان (۷۱۶)] اس کی سند میں انقطاع ہے لیکن چونکہ اوپر

صحیح سند سے ثابت ہے اس لیے بطور تائید اور شاهد کے ذکر کر دیا ہے۔ [-

”بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے تشریف لائے تو بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورہے ہیں تو

بلال رضی اللہ عنہ نے دو بار کہا: ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ (نماز نیند سے بہتر ہے) تو اسے فجر کی اذان میں مقرر کر دیا گیا پھر

معاملہ اس پر پختہ ہو گیا۔“

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ فجر کی اذان میں ”حی علی الفلاح“ کے بعد دو مرتبہ ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ

النَّوْمِ“ کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم فرمائی۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایجاد نہیں ہے،

جیسا کہ روافض کا کہنا ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات غلط منسوب ہے اور جس روایت کا حوالہ دے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے وہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ ملاحظہ ہو:

» عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ الْمُؤَدِّنَ جَاءَ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يُؤَدِّنُهُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ فَوَجَدَهُ

نَائِمًا فَقَالَ: الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ فَأَمَرَهُ عُمَرُ أَنْ يَجْعَلَهَا فِي نِدَاءِ الصُّبْحِ“ [موطاء، کتاب الصلاة

باب ما جاء في النداء للصلاة (۸) ۴۲ مع ضوء السالك]

”امام مالک رضی اللہ عنہ کو یہ بات پہنچی کہ مؤذن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس نماز صبح کی اطلاع دینے کے لیے آیا تو اس نے حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کو سوتا ہوا پایا۔ مؤذن نے کہا: ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ اسے صبح کی

اذان میں کہے۔“

موطاء کی یہ روایت معطل و مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہی روایت سنن دارقطنی (۱/۲۴۳) میں بھی موجود

ہے لیکن اس کی سند بھی صحیح نہیں۔ اس میں کئی علل ہیں: (۱) سفیان ثوری مدلس ہے اور اس روایت میں تصریح بالسماع موجود

نہیں۔ (۲) محمد بن عثمان بھی مدلس ہیں اور ان کی بھی تصریح بالسماع نہیں ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ کی تحقیق میں فرماتے ہیں:

”وَ هُوَ ضَعِيفٌ لِأَعْضَالِهِ أَوْ إِرْسَالِهِ“ [المشکوٰۃ (۱/۲۰۶)]

صبح میں نے نبی ﷺ کو اپنا خواب سنایا تو انھوں نے فرمایا:

« إِنَّ هَذَا رُؤْيَا حَقٍّ إِنْ شَاءَ اللَّهُ »

”یقیناً یہ خواب سچا ہے اگر اللہ نے چاہا۔“

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلال کو یہ کلمات سکھا دو تاکہ وہ اذان کہے کیونکہ اس کی آواز تجھ سے بہتر ہے۔“

[ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب كيف الأذان (۴۹۹)، ابن ماجہ (۷۰۶)، ترمذی (۱۸۹)، احمد (۴۳/۴)، دارمی (۲۱۴/۱)]

اسی طرح فجر کی اذان میں ”حَى عَلَى الْفَلَاحِ“ کے بعد دوبار ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا سنت سے ثابت

ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« مِنْ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ الْمُؤَدِّثُ فِي آذَانِ الْفَجْرِ حَى عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ »

[ابن خزيمة (۳۸۶)، دارقطنی (۲۴۳/۱)، بیہقی (۴۲۳/۱)، ابن منذر (۲۱/۳)]

”صبح کی اذان میں ”حی علی الفلاح“ کے بعد ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہنا سنت سے ہے۔“

اور اصول میں یہ بات ثابت ہے کہ صحابی رسول ﷺ کا یہ کہنا کہ ”مِنَ السُّنَّةِ كَذَا“ مسند اور مرفوع حدیث کے حکم

میں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ”المجموع (۲۳۲/۵)“ میں، امام ابن ہمام رحمہ اللہ نے ”التحریر“ میں اور اس کے شارح ابن

امیر الحاج نے (۲۲۳/۲) پر جمہور اصولیین اور محدثین سے یہی موقف نقل کیا ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اذان سکھائی اور فرمایا صبح کی اذان میں ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ

مِنَ النَّوْمِ“ کہا کرو۔ یہ حدیث سیدنا ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق کے ساتھ درج ذیل کتب میں مروی ہے۔ [احمد

(۴۰۸/۳)، ابو داؤد، (۵۰۱)، نسائی (۷/۲)، ابن خزيمة (۳۸۵)، دارقطنی (۲۲۴/۱)، بیہقی (۴۲۲/۱)، ابن

حبان (۲۸۹)، التاريخ الكبير (۱۲۳/۱)، عبد الرزاق (۴۷۲/۱)، حلیۃ الأولیاء (۳۱۰/۸)]

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ فجر کی پہلی اذان میں ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ کہا جاتا ہے۔

[طحاوی (۱۳۷/۱)، بیہقی (۴۲۳/۱)، تلخیص الحیبر (۲۰۱/۱)]

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے اذان میں ترجیح بھی ثابت ہے۔ یعنی شہادتین کے کلمات کو دوبارہ کہنا۔ پہلی بار آہستہ اور دوسری

بار اس سے اونچی آواز میں۔ مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اذان کے مذکورہ کلمات ہی سنت نبوی ﷺ سے

ثابت ہیں۔ ان میں نہ اضافہ جائز ہے اور نہ کمی ہی۔ اذان میں ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللَّهِ“ وغیرہ کے کلمات نہیں ہیں۔

جو لوگ ان کلمات کا اضافہ کرتے ہیں وہ احداث فی الدین کے مرتکب ہیں اور بدعتی ہیں۔ فقہ جعفریہ سے بھی ان کلمات کا

اذان میں کہنا ثابت نہیں ہے بلکہ فقہ جعفریہ کی رو سے یہ کلمات اذان میں کہنا گناہ ہے اور کہنے والا لعنت کا مستحق ہے۔

فقہ جعفریہ کی صحاح اربعہ وغیرہ میں مرقوم اذان اور اہل سنت کی اذان میں فرق صرف یہ ہے کہ ”حی علی الفلاح“

کے بعد فقہ جعفریہ میں ”حی علی خیر العمل“ دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ باقی اذان کے الفاظ وہی ہیں جو اہل سنت کی اذان

کے ہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب ”الفقہ من لا یحضرہ الفقیہ (۱/۱۸۸)“ پر ابن بابویہ قمی نے اذان کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

” هَذَا هُوَ الْاِذَانُ الصَّحِيحُ لَا يُزَادُ فِيهِ وَلَا يُنْقَضُ مِنْهُ وَالْمَفْوِضَةُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ قَدْ وَضَعُوا اٰخْبَارًا وَ زَادُوا فِي الْاِذَانِ مُحَمَّدًا وَ اَلْ مُحَمَّدِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ مَرَّتَيْنِ وَ فِي بَعْضِ رِوَايَاتِهِمْ بَعْدَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَّلِيُّ اللهِ مَرَّتَيْنِ وَ مِنْهُمْ مَنْ رَوَى بَدَلَ ذَلِكَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقَّ مَرَّتَيْنِ وَ لَا شَكَّ فِي اَنَّ عَلِيًّا وَّلِيُّ اللهِ وَ اَنَّهُ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا وَ اَنَّ مُحَمَّدًا وَ اَلَهُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَ لَكِنْ لَيْسَ ذَلِكَ فِي اَصْلِ الْاِذَانِ وَ اِنَّمَا ذَكَرْتُ ذَلِكَ لِيُعْرَفَ بِهَذِهِ الزِّيَادَةِ الْمُتَهَمُونَ الْمُدَلِّسُونَ اَنَّهُمْ فِي جُمْلَتِنَا“

”یہی اذان صحیح ہے، نہ اس میں زیادتی کی جائے گی اور نہ کمی اور مفوضہ فرقہ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انہوں نے بہت سی روایات گھڑیں اور اذان میں ”مُحَمَّدًا وَ اَلْ مُحَمَّدِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ“ (کے کلمات) دو مرتبہ کہنے کے لیے بڑھا دیے اور ان کی بعض روایات میں ”اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ“ کے بعد ”اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَّلِيُّ اللهِ“ دو دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ ان مفوضہ میں سے بعض نے ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: ”اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا“ یہ بات یقینی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ولی اور سچے امیر المؤمنین ہیں اور محمد و آل محمد خیر البریہ ہیں لیکن یہ الفاظ اصلی اذان میں نہیں ہیں۔ میں نے یہ الفاظ اس لیے ذکر کیے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے وہ لوگ پہچانے جائیں جو مفوضہ ہونے کی اپنے اوپر تہمت لیے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو اہل تشیع میں شمار کرتے ہیں۔“

ابن بابویہ قمی شیعہ محدث کی اس صراحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ”اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَّلِيُّ اللهِ“ وغیرہ کلمات اصل اذان کے کلمے نہیں بلکہ اس لعنتی فرقہ مفوضہ نے یہ گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیے ہیں۔ ائمہ محدثین کے ہاں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ الفقیہ من لا یحضرہ الفقیہ (۱/۱۸۸) کے حاشیہ میں مفوضہ فرقے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

” فِرْقَةٌ ضَالَّةٌ قَالَتْ يَاَ اللّٰهُ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَ فَوَّضَ اِلَيْهِ خَلْقَ الدُّنْيَا فَهُوَ الْحَلَّاقُ وَ قِيلَ بَلْ فَوَّضَ ذَلِكَ اِلَى عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“

”مفوضہ ایک گمراہ فرقہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا، اس کے بعد دنیا کی پیدائش کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ لہذا آپ ہی خلاق (بہت زیادہ پیدا کرنے والے) ہوئے اور ان کے عقائد میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کا معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔“

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ مفوضہ ایک لعنتی فرقہ ہے، جس نے یہ کلمات اذان میں بڑھائے ہیں، سنت کے ساتھ

ان کا کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب ”المبسوط (۱/۹۹)“ طبع تہران، لابی جعفر بن محمد حسین الطوسی میں لکھا ہے:

”فَأَمَّا قَوْلُ أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ وَ أَلِ مُحَمَّدٍ خَيْرَ الْبَرِيَّةِ عَلَى مَا وَرَدَ فِي شَوَازِ الْأَخْبَارِ فَلَيْسَ بِمَعْمُولٍ عَلَيْهِ فِي الْأَذَانِ وَ لَوْ فَعَلَهُ الْإِنْسَانُ يَأْتُمُّ بِهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَضِيلَةِ الْأَذَانِ وَ لَا كَمَالِ فُضُولِهِ“

”بہر حال اذان میں ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ وَ أَلِ مُحَمَّدٍ خَيْرَ الْبَرِيَّةِ“ کہنا جیسا کہ شاذ روایات میں آیا ہے، ان کے کہنے پر کوئی کاربند نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اذان میں یہ کلمات کہے تو وہ گناہ گار ہوگا، علاوہ ازیں یہ کلمات اذان کی فضیلت اور کمال میں سے نہیں ہیں۔“

اسی طرح شیعہ مذہب کی معتبر کتاب ”اللمعة دمشقية (۱/۲۴۰)“ میں لکھا ہے:

”مذکورہ اذان (جو اہل سنت کے مطابق ہے) یہی شرع میں منقول ہے۔ اس کے علاوہ زائد کلمات کا شرعی طور پر درست سمجھنا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اذان کے اندر ہوں یا اقامت میں۔ جیسا کہ سیدنا علیؑ کی ولایت کی گواہی کے الفاظ اور محمد و آل محمد کے خیر البریہ یا خیر البشر ہونے کے الفاظ ہیں۔ اگرچہ جو کچھ ان الفاظ میں کہا گیا ہے وہ واقعی درست ہے (یعنی سیدنا علیؑ کا ولی اللہ ہونا اور محمد و آل محمد کا بہترین مخلوق ہونا) لیکن ہر وہ بات جو واقعتاً درست اور حق ہے، اسے ایسی عبادات میں داخل کر لینا جو شرعی وظیفہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حد بندی کی گئی ہو، جائز نہیں ہو جاتا۔ لہذا ان کلمات کا اذان میں کہنا بدعت ہے اور ایک نئی شریعت بنانا ہے۔“

اسی طرح شیعہ حضرات کی کتاب ”فقہ امام جعفر صادق لمحمد جواد (۱/۱۶۶)“ طبع ایران میں لکھا ہے:

”وَ اتَّفَقُوا جَمِيعًا عَلَى أَنَّ قَوْلَ أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَ لِيَّ اللَّهُ لَيْسَ مِنْ فُضُولِ الْأَذَانِ وَ أَجْزَائِهِ وَ أَنَّ مَنْ أَتَى بِنِيَّةٍ أَنَّهُ مِنَ الْأَذَانِ فَقَدْ أَبْدَعَ فِي الدِّينِ وَ أَدْخَلَ فِيهِ مَا هُوَ خَارِجٌ عَنْهُ“

”سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَ لِيَّ اللَّهُ“ کلمات اذان اور اس کے اجزاء میں سے نہیں ہیں اور اس پر بھی کہ جو شخص ان الفاظ کو اس نیت سے کہتا ہے کہ یہ بھی اذان میں شامل ہیں تو اس نے دین میں بدعت نکالی اور وہ بات دین میں داخل کر دی جو اس سے خارج تھی۔“

اسی طرح شیعہ محدث و مفسر شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی نے اپنے فتاویٰ ”النهاية في مجرد الفقه والفتاوى“ (۶۹) طبع قم، ایران میں لکھا ہے:

”وَ أَمَّا مَا رُوِيَ فِي شَوَازِ الْأَخْبَارِ مِنْ قَوْلِ ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَ لِيَّ اللَّهُ وَ أَلِ مُحَمَّدٍ خَيْرَ الْبَرِيَّةِ“ فَمِمَّا لَا يُعْمَلُ عَلَيْهِ فِي الْأَذَانِ وَ الْإِقَامَةِ فَمَنْ عَمِلَ بِهَا كَانَ مُخْطِئًا“

”شاذ روایات میں جو یہ قول مروی ہے: ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَ لِيَّ اللَّهُ وَ أَلِ مُحَمَّدٍ خَيْرَ الْبَرِيَّةِ“ یہ ان

کلمات میں سے ہے جن پر اذان اور اقامت میں عمل نہیں کیا جاتا، جس شخص نے اس پر عمل کیا وہ غلطی پر ہے۔“ مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اذان کے کلمات شعائر اسلام میں سے ہیں اور یہ اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر کیے ہیں۔ کسی شخص کو ان میں نہ اضافہ کرنے کی اجازت ہے اور نہ کمی ہی۔ جو شخص اذان میں اضافہ یا کمی کرتا ہے، وہ بدعتی ہے اور موجب لعنت ہے۔ فقہ جعفریہ کی امہات الکتب میں بھی یہی اذان جو اہل سنت کے ہاں مشروع ہے، نقل کی گئی ہے سوائے ”حَسَّ عَلَيَّ خَيْرِ الْعَمَلِ“ کے اور فقہ جعفریہ کی رو سے ”أَشْهَدُ أَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللَّهِ“ کے کلمات کا اذان میں درج کرنا گناہ ہے اور بدعت ہے بلکہ یہ الفاظ لعنتی فرقہ مفوضہ نے گھڑے ہیں اور اذان میں داخل کر دیے ہیں۔ حالانکہ یہ کلمات اذان میں شامل نہیں ہیں۔

ہم دعویٰ کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ سیدنا علی، سیدنا حسن، سیدنا حسین، علی زین العابدین رضی اللہ عنہم وغیرہ جو شیعہ کے ہاں ائمہ اہل بیت، معصوم عن الخطاء شمار ہوتے ہیں، ان سے صحیح سند کے ساتھ تو کیا ضعیف سند کے ساتھ بھی ان کلمات کا اذان میں کہنا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی نماز کے لیے اذان دی جاتی تھی تو کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات اذان میں کہلوائے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ اذان میں یہ کلمات نہیں کہتے ان کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت سے محبت نہیں ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے، اگر محبت کی یہ علامت ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہو اس کا نام اذان میں لیا جائے تو ان حضرات کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی تمام اولاد، اسی طرح ان کے مزمومہ بارہ امام اور ان کی اولاد کے نام بھی اذان میں لینے چاہئیں تاکہ کھل کر محبت کا اظہار ہو اور اگر اس طرح اذان شروع کر دی جائے تو ہو سکتا ہے چوبیس (۲۴) گھنٹوں میں اذان بھی مکمل نہ ہو اور نماز کا وقت ہی نہ ملے۔ اوپر شیعہ مجتہدین سے صراحت کے ساتھ نقل کر دیا ہے کہ جو بات امر واقع میں درست ثابت ہو، اسے اذان میں اپنی طرف سے داخل کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اذان کے کلمات اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے منقول ہیں اور متعین ہیں، ان میں اضافہ کرنا اپنے آپ کو لعنت کا حق دار بنانے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو سنت نبوی پر عمل کی کما حقہ توفیق عنایت فرمائے۔

ترجیح والی اذان ثابت ہے؟

(سوال) کیا اذان میں ترجیح یعنی شہادتین کا دہرانا سنت رسول سے ثابت ہے؟ آگاہ فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(جواب) ترجیح والی اذان سے مراد دہری اذان ہے اور دہری اذان شریعت سے ثابت ہے، جس میں شہادتین پہلی بار دوسری بار کی نسبت پست آواز میں ہو اور دوسری بار پہلے کی نسبت بلند آواز میں کہے جائیں۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ، تاحیات مکہ کے مؤذن رہے ہیں جیسا کہ ”اسد الغابۃ (۶/۲۷۳)، رقم الترجمة (۶۲۲۹)“ میں موجود ہے اور وہ ایسی ہی اذان کہتے تھے۔ اس میں نمازوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ نماز کوئی بھی ہو اس کے لیے یہ اذان کہی جاسکتی ہے۔ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! مجھے اذان کے کلمات سکھائیں۔“ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے میرے سر کا اگلا حصہ پکڑا اور

فرمایا کہو:

«اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ، اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ»

ان کلمات کے ساتھ اپنی آواز بلند کرو، پھر کہو:

«أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، أَشْهَدُ أَنَّ

مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ الحديث» [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب كيف الأذان (۵۰۰)، ترمذی،

ابواب الصلاة: باب ما جاء في الترجيع في الأذان (۱۹۱)، بیہقی (۳۹۴/۱)، احمد (۴۰۹/۳)، ابن خزيمة

(۳۷۷)، مسلم (۳۷۹/۶)، ابن حبان (۱۶۸۰)، (۱۶۸۱)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ حُجَّةٌ بَيِّنَةٌ وَ دَلَالَةٌ وَاضِحَةٌ لِمَذْهَبِ مَالِكٍ وَ الشَّافِعِيِّ وَ أَحْمَدَ وَ

جَمْهُورِ الْعُلَمَاءِ أَنَّ التَّرْجِيْعَ فِي الْاَذَانِ ثَابِتٌ مَشْرُوعٌ وَ هُوَ الْعُودُ اِلَى الشَّهَادَتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

بِرَفْعِ الصَّوْتِ بَعْدَ قَوْلِهَا مَرَّتَيْنِ بِخَفْضِ الصَّوْتِ “ [شرح مسلم (۷۰/۴)]

” اس حدیث میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور علماء (رحمۃ اللہ علیہم) کے مذہب کے لیے کھلی دلیل اور واضح دلالت

ہے کہ اذان میں ترجیع ثابت اور مشروع ہے۔ ترجیع یہ ہے کہ دو مرتبہ شہادتین کے کلمات آواز پست کرنے کے بعد

بلند آواز سے دوبارہ کہے جائیں۔“

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اہل کوفہ کے نزدیک ترجیع مشروع نہیں، اس لیے کہ عبد اللہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ترجیع کا ذکر

نہیں۔ جمہور کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے اور اس میں ترجیع کا ذکر ہے اور یہ ذکر و زیادت مقدم ہے۔ اس لیے بھی کہ ابو

مخزومہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث عبد اللہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کے بعد کی ہے۔

ابو مخزومہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث ۸ھ میں حنین کے بعد کی ہے اور عبد اللہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ والی حدیث اس سے پہلے اذان کی ابتدا کے

وقت کی ہے۔ اہل مکہ و مدینہ اور تمام شہروں کا عمل اس میں ضم ہو گیا ہے۔ لہذا یہ کلمات اذان میں اضافہ نہیں بلکہ سنت سے ثابت

ہے اور ابو مخزومہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی ساری زندگی مکہ میں یہی اذان کہتے رہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس اذان کیساتھ اقامت بھی دہری کہی

جائے گی۔ بلال رحمۃ اللہ علیہ کی اذان کے ساتھ اقامت کے کلمات اکہرے ہیں۔ ہمارے خفی بھائیوں نے اذان بلال رحمۃ اللہ علیہ کی لے لی اور

اقامت ابو مخزومہ والی۔ کسی بھی حدیث پر پورا عمل نہیں کیا۔ اگر بلال والی اذان لینا ہے تو اقامت بھی انہی کی ہونی چاہیے اور اگر

اقامت ابو مخزومہ والی کہی جاتی ہے تو ان کی اذان ترجیع والی ہے، اس سے انکار کیوں؟ اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر چلائے۔ (آمین!)

نماز کے لیے اذان دینا

(سوال) ایک آدمی گھر میں نماز ادا کرتا ہے تو اس کے لیے اذان دینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں دے گا تو کیا اس کی نماز ہو

جائے گی؟

(جواب) نماز ادا کرنے کے لیے اذان دینا ضروری نہیں ہے، اگر بغیر اذان کے جماعت کروالی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی اور اگر اذان کہہ لیں تو اس کا جواز ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے:

”انس رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے تو جماعت ہو چکی تھی تو انھوں نے اذان و اقامت کہی اور جماعت سے نماز ادا کی۔“
[صحیح بخاری، کتاب الأذان: باب فی فضل صلاة الجماعة]

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے اذان و اقامت کے بغیر جماعت کرانا بھی ثابت ہے جیسا کہ طبرانی کبیر اور کتاب الآثار وغیرہما میں منقول ہے۔

کتاب و سنت میں کوئی ایسی دلیل ہمیں معلوم نہیں جس سے یہ لازم آتا ہو کہ جماعت کے لیے اذان کہنا فرض و واجب ہے، اس کے بغیر جماعت نہیں ہوتی۔ اذان تو صرف مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے اطلاع کا نام ہے۔

اذان سے پہلے صلوٰۃ کا حکم

(سوال) اذان سے قبل صلوٰۃ کے مروجہ کلمات کہنا کیسا ہے؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا کرتے تھے؟

(جواب) اذان کی ابتدا میں نبی ﷺ پر صلوٰۃ (مروجہ کلمات الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ وغیرہ) سنت سے ثابت نہیں۔ اذان کے بعد مسنون صلوٰۃ و اذکار پڑھنا باعث فضیلت ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اصحاب کا یہی معمول تھا اور یہی اہل سنت کا طریقہ ہے۔ اذان سے قبل درود و سلام پڑھنا اہل بدعت کا طریقہ ہے۔

بدعتیوں کی اذان کا جواب

(سوال) کیا ایک ہی وقت میں ہونے والی متعدد اذانوں کا جواب دینا ضروری ہے؟ نیز بدعتیوں کی اذان کا جواب دینا درست ہے؟

(جواب) اذان کا جواب دینے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا سَمِعْتُمُ النَّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب ما يقول اذا سمع المؤذن (۵۲۲)]

”جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جیسے مؤذن کہتا ہے۔“

اس روایت کی روشنی میں بعض کے نزدیک اذان کا جواب دینا واجب ہے اور بعض کے نزدیک مستحب۔ واجب بھی ہو تو صرف ایک اذان کا جواب دینا کافی ہے باقی سب کا آپ جواب نہ بھی دیں تو کوئی حرج نہیں، دے دیں تو بہر حال ثواب کا کام ہے۔ باقی رہا اہل بدعت کی اذان کا جواب دینے کا مسئلہ تو اذان بہر حال اذان ہے۔ آپ اس کا جواب دیں۔ ان کی

بدعت کلمہ حق پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ غلطی کا گناہ ان پر ہے۔ آپ ان کے ساتھ صرف حق میں ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب صحیح بخاری میں سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا اثر نقل کرتے ہیں، ان سے بدعتی امام کی اقتدا کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

”فَصَلِّ وَ عَلَيْهِ بِدْعَتُهُ“ [بخاری، کتاب الصلاة: باب إمامة المفتون المبتدأ]

”تم نماز پڑھو اور اس کی بدعت اس پر ہے۔“

اسی طرح عبید اللہ بن عدی بن خیار، جن دنوں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے، ان کے پاس تشریف لائے۔ سوال کیا کہ آپ کو تو امامت عامہ کا حق تھا لیکن اب جو کچھ آپ کے ساتھ گزر رہی ہے، ہمیں معلوم ہے۔ ہمیں باغیوں کا امام نماز پڑھائے تو ہم دل تنگ کرتے ہیں۔ تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

”لوگوں کے اعمال میں سے بہترین عمل نماز ہے، جب وہ نیکی کریں تو ان کے ساتھ نیکی کرو اور جب وہ برے کام

کریں تو تم ان کی برائیوں سے بچو۔“ [بخاری، کتاب الصلاة: باب إمامة المفتون المبتدأ]

اقامت کون کہے؟

سوال کیا ضروری ہے کہ مؤذن ہی اقامت کہے یا کوئی دوسرا بھی کہہ سکتا ہے؟

جواب افضل اور بہتر یہی ہے کہ اذان کہنے والا ہی اقامت کہے کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے (نماز کی اطلاع کے لیے) آگ اور ناقوس کا ذکر کیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ کا بھی ذکر کیا، پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان جفت اور اقامت اکہری کہیں سوائے ”قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ“ کے۔ [بخاری، کتاب الأذان: باب الأذان مثنیٰ مثنیٰ (۶۰۶)]

معلوم ہوا کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اذان بھی کہتے تھے اور اقامت بھی۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مؤذن سیدنا ابو محمد ورہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اذان بھی کہی اور اقامت بھی۔ [بیہقی (۳۹۹/۱)، ابن ابی شیبہ: (۲۱۶/۱)]

اقامت کے جواب میں ”أَقَامَهَا اللَّهُ وَ أَدَامَهَا“ کہنا

سوال بعض بھائی اقامت کے جواب میں ”أَقَامَهَا اللَّهُ وَ أَدَامَهَا“ کے الفاظ کہتے ہیں۔ ان الفاظ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اقامت کا جواب دینے کے لیے جو ”أَقَامَهَا اللَّهُ وَ أَدَامَهَا“ کہا جاتا ہے یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اس سلسلہ میں سنن ابی داؤد میں جو روایت مذکورہ ہے وہ انتہائی ضعیف ہے، اس کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں درج ذیل تین علتیں پائی جاتی ہیں۔

① محمد بن ثابت العبدي ضعيف راوي ہے۔ امام علی بن مدینی اور دیگر محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث میں قوی نہیں ہے۔ امام

ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”یہ کچھ نہیں ہے۔“ [میزان الاعتدال (۳/۴۹۵)]
 امام ابو حاتم نے کہا: ”یہ مضبوط نہیں ہے۔“ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”یہ اپنی بعض احادیث میں ثقات کی مخالفت کرتا ہے۔“ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”یہ قوی نہیں ہے۔“ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ”یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔“ [تہذیب التہذیب (۸۵/۹)]

⑤ ”رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الشَّامِ“ مجہول ہے یعنی یہ بات معلوم نہیں کہ اہل شام میں سے کون سا آدمی ہے جس سے یہ روایت مروی ہے۔

⑥ تیسری خرابی یہ ہے کہ شہر بن حوشب متکلم فیہ ہے جیسا کہ کتب رجال اس پر شاہد ہیں۔ [میزان الاعتدال (۲/۲۸۳)]، تہذیب التہذیب (۳۶۹/۴) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب میں اسے کثرة الأوهام یعنی کثرت سے وہم میں مبتلا ہونے والا قرار دیا ہے۔

لہذا جب یہ روایت صحیح نہیں تو اس سے استدلال کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ یاد رہے کہ بڑوں کی بات کوئی حجت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات ہی ہمارے لیے حجت ہیں۔ جو بات قرآن و سنت سے ملتی ہے وہ لے لو اور جس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں اس پر عمل کرنے کے ہم مکلف نہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا تو آپ کو بھی یہی جواب دیا گیا تھا کہ ہمارے بزرگ اور بڑے آج تک اسی طریقہ پر گامزن ہیں۔ کیا وہ غلط ہیں اور تم جو نیا دین لائے ہو وہ صحیح ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ سَكَانَ آبَاءُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴾ [البقرة: ۱۷۰]

”جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔“

معلوم ہوا منزل من اللہ دین کی بات کے مقابلے میں آباء و اجداد کے اقوال و افعال پیش کرنا پرانے مشرکین و کفار کا طرز عمل تھا۔ اہل اسلام کو یہ زیبا نہیں کہ وہ شرعی احکامات کے سامنے اپنے آباء و اجداد کو پیش کریں۔ لہذا جن مسائل کا ثبوت قرآن و سنت کی نصوص سے نصاً یا اشارۃً ملتا ہے انھیں لے لینا چاہیے اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا

(سوال) مسلمان اپنے نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر کہتے ہیں کیا یہ فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

(جواب) ہمارے علم کے مطابق اس کے متعلق کوئی صحیح و مرفوع حدیث موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں جو تین روایات پیش کی جاتی ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں۔ ایک روایت حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدَّنَ فِي أُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِينَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلَاةِ» [ترمذی، ابواب الاضاحی: باب الأذان فی أذن المولود (۱۵۱۴)، ابوداؤد، (۵۱۰۵)، احمد (۹/۶)، شعب الایمان (۸۶۱۷)، حاکم (۱۷۹/۳)، بیہقی (۳۰۵/۹)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے کان میں نماز والی اذان کہی جب اسے سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جنم دیا۔“

اس روایت کی سند میں عاصم بن عبید اللہ راوی ہے جس کے ضعف پر تقریباً تمام محدثین متفق ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

«وَمَدَارُهُ عَلَى عَاصِمِ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ وَهُوَ ضَعِيفٌ» [تلخیص الحیبر (۱۹۸۵)، (۳۶۷/۴)]

کتاب العقیقة، طبع جدید، اس راوی پر مزید کلام کے لیے دیکھے، تہذیب التہذیب (۳۶۰۳/۳)]

”اس روایت کا دار و مدار عاصم بن عبید اللہ پر ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔“

بعض حضرات نے اس روایت کی تقویت کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت پیش کی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدَّنَ فِي أُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ يَوْمَ وُلِدَ وَ أَقَامَ فِي أُذُنِهِ الْيُسْرَى» [السلسلة الضعيفة (۳۳۱/۱)، ارواء الغلیل (۴۰۱/۴)]

”بیشک نبی ﷺ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے کان میں اسکی ولادت کے دن اذان کہی اور بائیں کان میں اقامت کہی۔“

اور انھوں نے اس روایت کو ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت کے لیے شاہد ہونے کی امید ظاہر کی ہے۔ (نوٹ: ”السلسلة الضعيفة“ میں اس روایت کے یہ الفاظ طبع ہونے سے رہ گئے ہیں: ”فَأَدَّنَ فِي أُذُنِهِ الْيُمْنَى“ (آپ نے حسن کے دائیں کان میں اذان کہی۔) امام بیہقی نے اگرچہ اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن یہ ضعیف کی بجائے موضوع ہے کیونکہ اس میں محمد بن یونس الکدیمی راوی ہے، جس کے متعلق امام ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”قَدْ أَتَاهُمُ الْكُدَيْمِيُّ بِالْوَضْعِ“ (یہ روایت گھڑنے کے ساتھ متہم ہے)۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس راوی نے ہزار سے زیادہ روایات گھڑی ہیں۔“ اسی طرح موسیٰ بن ہارون اور قاسم المطرز نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔ [میزان الاعتدال (۷۴/۴)]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت گھڑنے کی تہمت دی ہے۔ لہذا یہ روایت موضوع ہونے کی وجہ سے شاہد بننے کے قابل نہیں ہے۔ اسی طرح اس میں کدیمی کا استاد اور استاد الاستاد بھی ضعیف ہیں۔ نیز حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں ہے:

«مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُودٌ فَأَدَّنَ فِي أُذُنِهِ الْيُمْنَى وَ أَقَامَ فِي أُذُنِهِ الْيُسْرَى لَمْ تَضُرَّهُ أُمُّ الصَّبِيَّانِ»

”جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہے تو اسے ام الصبیان

(بیماری) تکلیف نہیں دے گی۔“ [شعب الایمان (۸۶۱۹)]

اس کی سند میں یحییٰ بن العلاء الرازی کذاب راوی ہے۔ لہذا بچے کے کان میں اذان اور اقامت والی روایات نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

اکیلا آدمی نماز کے لیے اپنی اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟

(سوال) کیا تمہارا آدمی اپنی نماز کے لیے اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(جواب) اگر نمازی اکیلا نماز پڑھے تو اذان و اقامت کہہ سکتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَعَجِبُ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ مِنْ رَاعِي غَنَمٍ فِي رَأْسِ شَيْطِيَّةٍ بِحَبْلِ يُؤَدِّنُ لِلصَّلَاةِ وَيُصَلِّيُ فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ اُنظُرُوا إِلَى عَبْدِي هَذَا يُؤَدِّنُ وَيُقِيمُ الصَّلَاةَ يَخَافُ مِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي وَادْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ» [ابو داؤد، كتاب صلاة السفر: باب الأذان في السفر (۱۲۰۳)]

”تمہارا رب ایسے حروا ہے سے خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر اپنا ریوڑ چراتا ہے اور نماز کے لیے اذان کہتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ”میرے اس بندے کی طرف دیکھو جو مجھ سے ڈرتے ہوئے نماز کے لیے اذان اور اقامت کہتا ہے۔ میں نے اپنے اس بندے کو معاف کر دیا اور میں نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔“ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی اکیلا نماز پڑھے تو وہ اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے۔ یہ اس کیلئے بخشش کا ذریعہ بنتی

—

WWW.KITABOSUNNAT.COM



اوقات نماز کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اوقات نماز اور ان کے معلوم کرنے کا طریقہ

سوال اسلام میں اوقات نماز کے کیا احکام ہیں؟ ان کے معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور کیا اوقات معلوم کرنے کے لیے سایہ زوال منہا کیا جائے گا یا شامل؟ تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے ہر نماز اس کے اپنے وقت میں فرض کی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ﴾ [النساء: ۱۰۳]

”بلاشبہ نماز مومنوں پر وقت مقررہ میں فرض کی گئی ہے۔“

اس آیت کریمہ سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز اس کے مقررہ وقت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ اجمالی طور پر اوقات نماز کو اس آیت میں ذکر کر دیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں دیگر مقامات پر اول و آخر وقت کے تعیین کے بغیر اللہ تعالیٰ نے اوقات نماز کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلْفَا مِنَ اللَّيْلِ ﴾ [ہود: ۱۱۴]

”دن کے دونوں سروں میں نماز قائم کرو اور رات کی گھڑیوں میں بھی۔“

اس آیت کریمہ میں ”طَرَفِي النَّهَارِ“ سے مراد صبح اور ظہر و عصر کی نماز اور ”زُلْفَا مِنَ اللَّيْلِ“ سے مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے۔ [مرعاة المفاتیح (۲/۲۷۱)]

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْآنِ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴾

[بنی اسرائیل: ۷۸]

”نماز قائم کریں سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک اور فجر کا قرآن پڑھنا بھی۔ یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔“

اس آیت میں ”لِدُلُوكِ الشَّمْسِ“ کے معنی زوال آفتاب اور ”غَسَقِ اللَّيْلِ“ کے معنی تاریکی کے ہیں۔ زوال آفتاب کے بعد ظہر و عصر کی نماز اور رات کی تاریکی تک سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں اور ”قُرْآنِ الْفَجْرِ“ سے مراد نماز فجر ہے۔ یہاں قرآن نماز کے معنی میں ہے، اس کو قرآن سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ ایک

مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ

عَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ ﴾ [الرؤم: ۱۸، ۱۷]

”پس تم صبح و شام اللہ کی تسبیح کیا کرو، آسمانوں اور زمینوں میں تعریف اسی کی ہے۔ تیسرے پہر اور ظہر کے وقت بھی (اس کی پاکیزگی بیان کرو)۔“

اس آیت کریمہ میں بھی بعض مفسرین نے تسبیح سے نماز مراد لی ہے اور ”تُمْسُونَ“ میں مغرب و عشاء، ”تُصْبِحُونَ“ میں نماز فجر، ”عَشِيًّا“ میں سہ پہر یعنی عصر اور ”تُظْهِرُونَ“ میں نماز ظہر مراد ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ

النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى ﴾ [ظہ: ۱۳۰]

”سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرو اور رات کے مختلف وقتوں

میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتے رہیں، بہت ممکن ہے کہ آپ راضی ہو جائیں۔“

اس آیت میں بعض مفسرین نے تسبیح سے نماز مراد لی ہے۔ طلوع شمس سے قبل فجر، غروب سے قبل عصر، رات کی گھڑیوں سے مراد مغرب و عشاء اور ”اطراف النهار“ سے مراد نماز ظہر لی ہے کیونکہ ظہر کا وقت نہار اول کا آخری طرف اور نہار آخر

کا اول طرف ہے۔ مزید دیکھیں: [مرعاۃ المفاتیح (۲/۲۸۴)]

ان واضح آیات میں اجمالی طور پر اوقات نماز کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ رسول مکرم کی کئی ایک صحیح احادیث میں نمازوں کے اوقات کی ابتدا و انتہا کو متعین کرو یا گیا ہے۔

فجر کی نماز کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس

کے ایک مثل ہونے تک ہے اور عصر کا وقت مثل اول سے لے کر دو مثل تک اور مغرب غروب آفتاب سے لے کر شفق کے

غائب ہونے تک ہے اور عشاء شفق کے غائب ہونے سے لے کر نصف رات تک ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَ كَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطَوِيلِهِ مَا لَمْ تَحْضُرِ الْعَصْرُ، وَ وَقْتُ

الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفُرْ الشَّمْسُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ

إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الْاَوْسَطِ وَ وَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَإِذَا

طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَأَمْسِكَ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ الشَّيْطَانِ » [مسلم، کتاب الصلاة:

باب أوقات الصلوات الخمس (۶۱۲)]

”ظہر کا وقت جب سورج ڈھل جائے اور آدمی کا سایہ اس کی مثل ہو جائے اور عصر کی نماز کا وقت نہ ہو اور عصر کا

(آخری) وقت جب تک سورج زرد نہ ہو جائے اور مغرب کا جب تک سرفی غائب نہ ہو اور عشاء کا وقت رات کے نصف تک اور صبح کی نماز کا وقت طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ہے۔ جب آفتاب نکلنا شروع ہو جائے تو نماز سے رک جا کیونکہ وہ شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ لِلصَّلَاةِ أَوَّلًا وَآخِرًا وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ الظُّهْرِ حِينَ تَزُولُ الشَّمْسُ وَآخِرَ وَقْتِهَا حِينَ يَدْخُلُ وَقْتُ الْعَصْرِ وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ صَلَاةِ الْعَصْرِ حِينَ يَدْخُلُ وَقْتِهَا وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ تَصْفَرُّ الشَّمْسُ وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ الْمَغْرِبِ حِينَ تَغْرُبُ الشَّمْسُ وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ يَغِيبُ الشَّفَقُ وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ حِينَ يَغِيبُ الْأَفُقُ وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ يَنْتَصِفُ اللَّيْلُ وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ الْفَجْرِ حِينَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ وَإِنَّ آخِرَ وَقْتِهَا حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ » [ترمذی، ابواب الصلاة: باب مواقيت الصلاة (۱۵۱)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک ہر نماز کے لیے ایک ابتدائی وقت ہے اور ایک انتہائی وقت ہے۔ نماز ظہر کا ابتدائی وقت وہ ہے جب سورج ڈھل جائے اور آخری وقت (وہ ہے) جب نماز عصر کا وقت شروع ہو، نماز عصر کا ابتدائی وقت وہی ہے جب یہ (ظہر کے اختتام کے) وقت شروع ہوتا ہے اور آخری وقت جب سورج زرد ہو جائے۔ مغرب کا ابتدائی وقت جب سورج غروب ہو جائے اور آخری وقت جب شفق غائب ہو جائے۔ عشاء کا ابتدائی وقت جب شفق غائب ہو جائے اور آخری وقت جب آدھی رات گزر جائے۔ فجر کا پہلا وقت جب فجر طلوع ہو اور اس کا آخری وقت جب سورج طلوع ہو۔“

فجر کا ابتدائی وقت جب فجر طلوع ہو جائے اور آخری وقت جب سورج طلوع ہو جائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک صحیح احادیث موجود ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فجر کا اول وقت فجر صادق کے طلوع ہونے سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر کا اول وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جانے تک ہے اور عصر کا اول وقت ایک مثل سائے سے لے کر دو مثل تک ہے جب سورج زرد پڑ جائے۔ مغرب کا وقت سورج غروب ہونے سے لے کر شفق یعنی شام کی سرفی غائب ہونے تک ہے اور عشاء کا وقت سرفی کے غائب ہونے سے لے کر نصف رات تک ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ظہر کی نماز کے لیے مثل اول کی پہچان کا طریقہ کیا ہے اور زوال کا سایہ اس میں شامل ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”جب آفتاب ڈھلنا شروع ہو جائے تو نماز ظہر کا اول وقت شروع ہو جاتا ہے اس سے پہلے نماز ظہر کی ابتدا بالکل جائز نہیں اور نہ وہ نماز کفایت ہی کرتی ہے۔ پھر نماز ظہر کا وقت ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک باقی رہتا ہے۔ اس میں وہ اصلی سایہ شمار نہیں ہوگا جو زوال آفتاب کے وقت اس چیز کا تھا۔ البتہ اس سے جو زیادہ ہوگا وہ شمار ہوگا۔“

مولانا اسماعیل سلمیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”سورج بعض علاقوں میں سیدھا سر کے اوپر سے گزرتا ہے اور بعض علاقوں میں خم کھا کر گزرتا ہے اور موسم کے لحاظ سے بھی اس کی رفتار میں یہ فرق ظاہر ہوتا ہے۔ گرمی میں وہ سر کے قریب سے گزرتا ہے اور سردیوں میں ایک طرف زیادہ خم کھا کر گزرتا ہے۔ ان دونوں موسموں میں سایہ کا حساب الگ الگ ہوتا ہے۔ جن ممالک سے سورج خم کھائے بغیر گزرتا ہے وہاں دوپہر کے وقت جب سورج سر پر ہو تو ہر چیز کا سایہ اس کے قدموں میں ہوتا ہے ظاہر نہیں ہوتا۔ اس طرح گرمی کے موسم میں چونکہ سورج سر کے قریب ہوتا ہے اس لیے سایہ کم ہوتا ہے کیونکہ سورج کی رفتار میں خم اور انحراف کی وجہ سے کچھ نہ کچھ سایہ عین دوپہر کے وقت بھی ہوتا ہے۔ سردیوں میں جیسے خم بڑھتا ہے سایہ بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے سایہ اصلی کہا جاتا ہے، زوال کے بعد اس میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مثل کا حساب کرنے کے وقت یہ سایہ الگ کر دیا جائے گا، اسے علیحدہ کرنے کے بعد جو سایہ ہوگا مثل یا دو مثل اس سے شمار ہوگا۔“

[حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح: ۱/۴۱۴-۴۱۵]

زوال کا سایہ مثل میں شمار نہیں ہوگا، یہی بات امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتاویٰ“ (۷۴/۲۲) میں، فقہ حنفی کتاب ”الہدایۃ“ (۴/۱) میں، فقہ شافعی کی کتاب ”المجموع“ (۸۱/۳) میں فقہ حنبلی کی کتاب ”الروض المرعب“ (۴۲/۱) میں موجود ہے۔ الغرض یہ بات متفق علیہ ہے کہ زوال کا سایہ نکال کر مثل کی پیمائش ہوگی۔

مثل معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کھلی اور ہموار زمین میں زوال سے پہلے ایک لکڑی گاڑ دی جائے، اس لکڑی کا سایہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گا یہاں تک کہ زوال کے وقت کم سے کم رہ جائے گا۔ اس سائے کو ماپ لیا جائے جب یہ سایہ بڑھنا شروع ہو تو وہ اس بات کی علامت ہوگا کہ زوال ہو گیا ہے۔

پھر جب یہ سایہ اس قدر بڑھ جائے کہ لکڑی کے برابر ہو جائے (زوال کے وقت لکڑی کا ماپا ہوا سایہ الگ کرنے کے بعد) تو ایک مثل وقت ہو جائے گا اور جب دو گنا ہو جائے تو دو مثل ہو جائے گا۔ [فقہ السنۃ للشیخ عاصم الحداد (۱/۱۱۵)]

ایک طریقہ یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ دوپہر کے وقت سے پہلے ایک یا دو بالشت زمین کی سطح ہموار کر کے اس پر شمالاً جنوباً ایک سیدھا خط کھینچ دیا جائے۔ قطب نما سے اس خط کی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ پھر اس خط کے جنوبی نقطہ پر ایک سیدھی لکڑی گاڑ دیں۔ چونکہ دوپہر سے پہلے کا وقت ہوگا لہذا اس لکڑی کا سایہ عین اس خط پر نہیں ہوگا بلکہ اس سے قدرے مغرب کی جانب مائل ہوگا، پھر آہستہ آہستہ اس خط پر آنا شروع ہو جائے گا حتیٰ کہ بالکل اس خط پر آجائے گا۔ اس وقت اس سایہ کی انتہا پر نشان لگا دیں اور اس سایہ کو کسی اور لکڑی سے ماپ لیں اور یہ پیمانہ محفوظ کر لیں، یہ وقت عین دوپہر کا ہوگا۔ اس کے بعد وہ سایہ مشرق کی طرف بڑھنے لگے گا۔ یہ ظہر کا اوّل وقت ہوگا، پھر اس کے بعد جب سایہ بڑھتا جائے گا تو جس لکڑی کے ساتھ اصل سائے کی پیمائش کی تھی اس کے ساتھ اس کے اصل سائے کے نشان سے آگے ایک مثل جب سایہ ہو جائے گا تو وہ ظہر کا آخری وقت ہوگا اور عصر کا اوّل وقت۔

یہ طریقہ مثل معلوم کرنے کا ہے۔ اس کے لیے کچھ وقت نکال کر آپ تجربہ کریں اور شمسی مہینا کے حساب سے ہر ماہ اگر

آپ تجربہ کرتے رہیں گے تو آپ کے پاس ایک سالانہ جنتری مرتب ہو جائے گی۔ عصر حاضر میں محکمہ موسمیات کی جانب سے بھی کافی سہولت ہے اور مرتب شدہ جنتریاں بھی مل سکتی ہیں جن میں ٹائم کی صحیح نشاندہی ہوتی ہے۔ اگر اطمینان نہ ہو تو آدی خود تجربہ کر کے مشل اول و مشل ثانی معلوم کر سکتا ہے۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

مساجد کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

کیا مسجد کو گرایا جاسکتا ہے؟

سوال کیا مسجد کو کسی مصلحت اور شدید ضرورت کے باعث کسی دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے؟ قرآن و سنت کے دلائل سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔

جواب جو چیز وقف کر دی جائے اسے ہبہ کرنا، فروخت کرنا یا اپنی کسی شخص ضرورت کے لیے استعمال کرنا درست نہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

« فَتَصَدَّقُ عُمْرُ أَنَّهُ لَا يَبَاعُ أَصْلُهَا وَلَا يُورَثُ وَلَا يُوهَبُ » [بخاری، کتاب الوصایا: باب الوقف کیف یکتب (۲۷۷۲)]

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی زمین کو وقف کیا (اس شرط پر) کہ نہ اس کو بیچا جائے گا، نہ اس کا وارث بنا جائے گا اور نہ اسے تحفہ ہی دیا جائے گا۔“

اس حدیث میں یہ بات ہے کہ اس زمین کا اصل نہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کوئی اس کا وارث بن سکتا ہے اور نہ اسے ہبہ کیا جاسکتا ہے۔ مسجد بھی اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ أَلِّمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ﴾ [الحج: ۱۸]

”اور مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں (اس کی عبادت کے لیے) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔“
دوسری بات یہ ہے کہ مسجدیں بنانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّورِ وَأَنْ تُنْظَفَ وَ تُطَيَّبَ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب اتخاذ المساجد فی الدور (۴۵۵)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ان کو صاف ستھرا اور خوشبودار رکھا جائے۔“

مسجد کو گرایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے۔ اس لیے مسجد کو بلاوجہ گرایا یا کسی شخص کا صرف اپنے تصرف میں لے آنا اور اسے فروخت کرنا درست نہیں۔ ہاں اگر مسجد ایسی جگہ ہے جہاں لوگ اس سے مستفید نہیں ہو سکتے یا وہ کہیں راستے میں ہے، جس سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے یا کسی اور مصلحت کے لیے مسجد ایک جگہ سے ختم کر کے دوسری جگہ تعمیر کرنا درست ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ کوفہ میں کسی نے مسلمانوں کے بیت المال کو نقب لگا کر چوری کر لیا۔ نقب لگانے والا بھی پکڑا

گیا۔ اس وقت بیت المال کے نگران حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا تو انھوں نے جواب دیا:

« أَنْ انْقَلِبَ الْمَسْجِدَ وَ صَبَّرَ بَيْتَ الْمَالِ فِي قِبَلْتِهِ »

”مسجد کو یہاں سے اس طرح منتقل کر لو کہ بیت المال مسجد کے قبلہ میں آجائے۔“

کیونکہ مسجد میں کوئی نہ کوئی نمازی تو ضرور ہوتا ہے۔ اس سے بیت المال محفوظ ہو جائے گا، تو حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے مسجد وہاں سے ختم کر کے کعبوروں کی منڈی میں بنادی اور منڈی کو مسجد والی جگہ منتقل کر دیا اور یوں بیت المال بھی مسجد کے قبلہ میں بن گیا۔ [فتاویٰ ابن تیمیہ]

یہ سب کچھ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ہو رہا تھا، کسی نے بھی اس سے نہ روکا۔ اگر یہ کام درست نہ ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا ضرور انکار کرتے۔

ایک اور دوسری دلیل جس سے اہل علم استدلال کرتے ہیں وہ صحیحین کی حدیث ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

« لَوْ لَا أَنَّ قَوْمَكَ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهَدِمَ فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ وَ

الزُّقْتَهُ بِالْأَرْضِ وَ جَعَلْتُ لَهُ بَيِّنِينَ » [بخاری، کتاب الحج: باب فضل مکة و بنیانها (۱۰۸۶)،

مسلم، کتاب الحج: باب نقض الكعبة و بنائها (۱۳۳۳)]

”اگر تیری قوم میں نئے نئے مسلمان نہ ہوتے تو میں کعبہ کی عمارت کو گرانے کا حکم دے دیتا تاکہ (نئی تعمیر میں) اس

حصہ کو بھی داخل کر دوں جو اس سے باہر رہ گیا ہے اور اس کی کرسی زمین کے برابر کر دوں اور اس کے دو دروازے بنا

دیتا (ایک اندر جانے کے لیے اور دوسرا نکلنے کے لیے)۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف شدہ عمارت وغیرہ کو تبدیل کرنا جائز ہے۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اظہار نہ کرتے۔ مسجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی تبدیلی کی ایک قسم ہے لہذا جائز ہے۔ لیکن یہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہو اور کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے متعلق اپنی خواہش کے اظہار کے باوجود فتنے سے بچنے کے لیے ایسا نہ کیا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جس چیز کی نذر مانی گئی ہو وہ بھی وقف ہو جاتی ہے۔ اس کو تبدیل کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے ثابت ہے۔ مثلاً ایک شخص نذر مانتا ہے کہ میں اپنے گھر کو مسجد بناؤں گا، پھر وہ اس سے زیادہ اچھی جگہ مسجد بنا دیتا ہے تو یہ درست ہے۔ اس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص فتح مکہ کے موقع پر کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت المقدس جا کر نماز پڑھوں گا۔“ آپ نے اسے کہا: «صَلِّ هُنَا»

”یہیں مسجد نبوی میں نماز پڑھو۔“ اس نے پھر وہی بات کی۔ نبی کریم ﷺ نے اسے پھر یہی جواب دیا۔ اس نے تیسری مرتبہ یہی دہرایا تو آپ نے فرمایا: «فَشَأْنُكَ إِذَا» ”پھر جیسے چاہے کر۔“ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ لَوْ صَلَّيْتَ هَهُنَا لَأَجْزَأَ عَنْكَ صَلَاةٌ فِي بَيْتِ الْمَقْدَسِ»

[ابو داؤد، کتاب الایمان والنذور: باب من نذر أن یصلی فی بیت المقدس (۳۳۰۵، ۳۳۰۶)]

”اس ذات کی قسم جس نے محمد (ﷺ) کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اگر تو یہاں (مسجد نبوی) میں نماز پڑھتا تو یہ تجھے بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے کفایت کر جاتی۔“

مزین مساجد اور منقش جائے نماز پر نماز کا حکم

(سوال) مساجد کو مزین کرنا کیسا ہے؟ نیز ایسی مساجد میں اور منقش جائے نماز پر پڑھی جانے والی نماز کا کیا حکم ہے؟

(جواب) مساجد کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر، تلاوت قرآن اور نماز جیسی عبادات سرانجام دی جائیں اور یہی مساجد کی آبادی ہے۔ لیکن آج کل مساجد کی تعمیر میں نقش و نگار اور تیل بوٹوں پر زرخیر صرف کیا جا رہا ہے، لیکن عبادات کی طرف توجہ کم ہو گئی ہے۔ نمازیوں کی تعداد میں کم ہو رہی ہے اور مساجد و عبادت گاہوں کی گلکاری میں بہت زور دیا جا رہا ہے۔ یہ قیامت کی نشانی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ» [ابو داؤد، ابواب المساجد: باب فی بناء المساجد (۴۴۹)، نسائی (۶۹۰)، ابن ماجہ (۷۳۹)، شرح السنة (۳۵۰/۲)، ابن حبان (۳۰۸)، دارمی (۲۶۸/۱)، ابو یعلیٰ (۱۸۵/۵)، احمد (۱۰۲، ۱۳۴/۳)، طبرانی کبیر (۷۵۲)، طبرانی صغیر (۱۱۴/۲)]

”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں کے بارے میں فخر کرنے لگیں گے۔“

ابن خزیمہ، ابو یعلیٰ اور شرح السنہ میں یہ الفاظ ہیں:

«يَأْتِي عَلَى أُمَّتِي زَمَانٌ يَتَبَاهَوْنَ بِالْمَسَاجِدِ ثُمَّ لَا يَعْمُرُونَهَا إِلَّا قَلِيلًا»

”میری امت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ مسجدوں پر فخر کریں گے، انھیں بہت تھوڑا آباد کریں گے۔“

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَتُزَخَّرَ فَنَهَا كَمَا زَخَّرَفَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى» [سبل السلام (۳۴۷/۱)، فتح العلام (۲۱۴/۱)]

”تم مساجد کو ضرور بیہود و نصاریٰ کی طرح منقش کرو گے۔“

اور آج کل بالکل یہی کیفیت ہے کہ مساجد کو اس قدر منقش کر دیا گیا ہے کہ نمازی کا خشوع و خضوع متاثر ہوتا ہے اور اللہ کی طرف توجہ میں خلل اندازی ہوتی ہے۔ مناسب ہے کہ مساجد کی دیواریں، محراب اور جائے نماز سادہ ہوں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دیوار پر لکھے ہوئے پردے کو صرف اس لیے اتروا دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی نماز سے توجہ ہٹاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے:

« كَانَ قَرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 أَمِيطِي عَنَّا قَرَامَكَ هَذَا فَإِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيرُ تُعْرِضُ فِي صَلَاتِي » [بخاری، کتاب الصلاة: باب
 إن صلی فی ثوب مصلب أو تصاویر هل تفسد صلاته (۳۷۴) احمد (۱۰۱/۳، ۲۸۳)]
 ”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا جو انھوں نے اپنے گھر کی دیوار پر لٹکایا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ
 پردہ ہم سے دور کر دو (یعنی دیوار سے اتار دو) اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے پھرتی رہتی ہیں۔“
 علامہ محمد بن اسماعیل امیر بخاری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”فِي الْحَدِيثِ دَلَالَةٌ عَلَى إِزَالَةِ مَا يُشَوِّشُ عَلَى الْمُصَلِّي صَلَاتَهُ مِمَّا فِي مَنْزِلِهِ أَوْ فِي مَحَلِّ
 صَلَاتِهِ“ [سبل السلام (۱/۴۳۷)، فتح العلام (۱/۲۱۴)]
 ”اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو چیز نمازی کی نماز میں تشویش کا باعث ہو اسے زائل کر دینا چاہیے۔ وہ
 چیز اس کے گھر میں ہو یا نماز پڑھنے والی جگہ میں۔“
 نواب صدیق الحسن خاں رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی عبارت منقول ہے۔ [مسک الختام (۱/۳۳۹)]
 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى فِي خَمِيصَةٍ لَهَا أَعْلَامٌ فَنظَرَ إِلَى أَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا
 انصرفت قال: اذهبوا بخميصتي هذه إلى أبي جهنم واثنوني بأن جانيه أبي جهنم فإنها ألهمتني
 أنفا عن صلاتي » و فِي رِوَايَةٍ « كُنْتُ أَنْظُرُ إِلَى عِلْمِهَا وَ أَنَا فِي الصَّلَاةِ فَأَخَافُ أَنْ تَفْتِنَنِي »
 [بخاری، کتاب الصلاة: باب إذا صلی فی ثوب له أعلام و نظر الی علمها (۳۷۳)، مسلم (۵۵۶)]
 ”نبی کریم ﷺ نے اونی چادر میں نماز پڑھی جس میں دھاریاں تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک نظر ان دھاریوں کی طرف
 دیکھا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو فرمایا: ”میری یہ اونی چادر ابوجہم کو واپس کر دو اور کڑھائی کے بغیر لے کر آؤ۔ اس
 کڑھائی والی چادر نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔“ دوسری روایت میں ہے: ”میں نماز میں اس کی طرف
 دیکھنے لگا تو مجھے ڈر لاق ہوا کہ یہ مجھے فتنہ میں ڈال دے گی۔“
 اس حدیث کی شرح میں امام نووی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”فَفِيهِ الْحَثُّ عَلَى حُضُورِ الْقَلْبِ فِي الصَّلَاةِ وَ تَدْبِيرِ مَا ذَكَرْنَا هَا وَ مَنَعَ النَّظْرَ مِنَ الْإِمْتِدَادِ
 إِلَى مَا يُشْغِلُ وَ إِزَالَةَ مَا يُخَافُ اسْتِغَالَ الْقَلْبَ بِهِ وَ كَرَاهِيَةَ تَرْوِيقِ مِخْرَابِ الْمَسْجِدِ وَ
 حَائِطِهِ وَ نَقْشِهِ وَ غَيْرِ ذَلِكَ مِنَ الشَّاعِلَاتِ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ الْعِلَّةَ فِي
 إِزَالَةِ الْخَمِيصَةِ هَذَا الْمَعْنَى“ [شرح مسلم (۵/۳۸)]

”اس حدیث میں نماز کے اندر حضور قلب اور ذکر و تلاوت اور مقاصد نماز پر تہہ بر تہہ کرنے میں رغبت دلائی گئی ہے اور جو چیز نماز سے بے خبر کرتی ہے اس کی طرف نظر ڈالنے کی ممانعت، جو چیز نماز سے بے خبر کرتی ہے اس کا ازالہ، مسجد کے محراب اور اس کی دیواروں کو متشش کرنا اور اس جیسی دیگر بے خبر کرنے والی اشیاء کی کراہت ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے دھاری دار چادر کو ہٹا دینے کی یہی علت ذکر کی ہے۔“

ان صحیح احادیث اور شارحین حدیث کی تشریحات سے معلوم ہوا کہ مساجد کے در و دیوار اور محراب کو متشش کرنا، ششے وغیرہ سے مزین کرنا، تیل بوٹے والے جائے نماز اور ان جیسی دیگر اشیاء کا استعمال مکروہ ہے جو نماز سے نمازی کی توجہ ہٹاتی ہیں اور خشوع و خضوع اور تذلل و عاجزی میں کمی کرتی ہیں۔ تاہم اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی کیونکہ نبی ﷺ نے اپنی نماز دوبارہ ادا نہیں فرمائی اور نہ نماز کو توڑا ہی ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ نماز تو ہوگئی مگر توجہ بٹ گئی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ششے اور تیل بوٹے والی جائے نماز یا متشش محراب نہ بنایا جائے۔ کیونکہ یہ اشیاء نماز سے توجہ ہٹاتی ہیں۔

جنسی کا مسجد میں داخل ہونا

سوال (حالیہ جنابت میں کسی شخص کا مسجد میں داخل ہونا اور گزرنا کیسا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔)

جواب (حالیہ جنابت میں مسجد سے گزرنا پڑے تو اضطراری صورت میں گزر سکتے ہیں لیکن وہاں جنابت کی حالت میں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ﴾ [النساء: ۴۳]

”اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ جو بات منہ سے نکالتے ہو اس کو سمجھنے لگو، اسی طرح حالت جنابت میں بھی مگر راہ چلتے ہوئے حتیٰ کہ تم غسل کر لو۔“

اکثر سلف صالحین جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن مسیب، امام ضحاک، حسن بصری، عکرمہ، نخعی اور زہری رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نزدیک یہاں ”الصلاة“ سے مراد مواضع صلاة یعنی مساجد ہیں۔ امام ابن جریر نے اسے راجح قرار دیا ہے۔ [تفسیر ابن جریر، معالم التنزیل (۱/۴۳۱)]

اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے کہ جنسی کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے وہاں ٹھہرنا جائز نہیں۔ مستند روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کے گھر مسجد کی طرف اس طرح کھلتے تھے کہ بغیر مسجد سے گزرے وہ مسجد سے باہر نہیں جاسکتے تھے اور گھروں میں غسل کے لیے پانی نہیں ہوتا تھا۔ جنابت کی حالت میں مسجد سے گزرنا ان پر گراں گزرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جیسا کہ تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں موجود ہے۔

چھوٹے بچوں کا مسجد میں آنا

(سوال) کیا والدین اپنے ساتھ چھوٹے بچوں کو مساجد میں لاسکتے ہیں؟ قرآن و سنت سے جواب دیں۔

(جواب) مسجدوں میں چھوٹے بچوں اور بچیوں کا آنا شرعاً جائز و مستحب ہے بشرطیکہ وہ پاک صاف ہوں۔ ① حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہما

سے روایت ہے:

« أَنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبِ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لِأَبِي الْعَاصِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا » [بخاری، کتاب الصلوة، باب اذا حمل جارية صغيرة على عنقه في الصلاة (٥١٦)، موطا، کتاب قصر الصلاة: باب جامع الصلاة (٨١)، مسلم (٥٤٣)، شرح السنة (٢٦٣/٢)، ابوداؤد (٩١٧)]

”رسول اللہ ﷺ اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو اٹھائے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے جو ابوالعاص بن ربیع کی بیٹی تھیں۔ جب آپ ﷺ سجدے میں جاتے تو اسے نیچے بیٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے۔“

② حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ فَجَاءَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا وَعَلَيْهِمَا قَمِيصَانِ أَحْمَرَانِ يَعْثُرَانِ فِيهِمَا فَنَزَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَطَعَ كَلَامَهُ فَحَمَلَهُمَا ثُمَّ عَادَ إِلَى الْمَنْبَرِ ثُمَّ قَالَ صَدَقَ اللَّهُ: ﴿ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ رَأَيْتَ هَذَيْنِ يَعْثُرَانِ فِي قَمِيصَيْهِمَا فَلَمْ أَصْبِرْ حَتَّى قَطَعْتُ كَلَامِي فَحَمَلْتُهُمَا » [نسائی، کتاب الجمعة: باب نزول الامام عن المنبر قبل فراغه من الخطبة و قطعه كلامه (١٤١٤)، ابوداؤد (١١٠٩)، ترمذی (٣٧٧٤)، ابن ماجه (٣٦٠٠)، احمد (٣٥٤/٥)]

”رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ اس دوران حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما سرخ قمیصیں زیب تن کیے گرتے ہوئے آگے گئے تو رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے اترے، اپنا کلام منقطع کیا پھر ان دونوں کو اٹھا کر منبر پر تشریف لے آئے اور فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے: ”تمہارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔“ میں نے ان دونوں بچوں کو گرتے ہوئے قمیصوں میں دیکھا تو صبر نہ کر سکا، یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کو روک کر انہیں اٹھا لیا۔“

③ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أَطْوَلَ فِيهَا فَاسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَاتَّحَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةً أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ » [بخاری، کتاب الاذان، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي (٧٠٧)]

”میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارادہ کرتا ہوں کہ قراءت لمبی کروں، مگر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں، اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ اس کی ماں کو مشقت میں ڈال دوں۔“

⑤ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ مَعَ أُمِّهِ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ فَيَقْرَأُ بِالسُّورَةِ الْخَفِيفَةِ أَوْ بِالسُّورَةِ الْقَصِيرَةِ» [مسلم، كتاب الصلاة: باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام (٤٧٠)، ترمذی (٣٧٦)، احمد (١٠٩/٣)]

”نماز کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماں کے ساتھ (آئے ہوئے) بچے کی رونے کی آواز سنتے تو چھوٹی سورت تلاوت کرتے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ بچوں کو مسجد میں لانا جائز ہے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بچے صاف ستھرے ہوں اور مسجد میں گندگی و ناپاکی نہ پھیلے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

«وَفِيهِ حَوَازُ صَلَاةِ النِّسَاءِ مَعَ الرِّجَالِ فِي الْمَسْجِدِ وَأَنَّ الصَّبِيَّ يَحُورُ إِذْ خَالَهُ الْمَسْجِدُ وَإِنْ كَانَ الْأَوْلَى تَنْزِيهُهُ الْمَسْجِدَ عَمَّنْ لَا يُؤْمِنُ مِنْهُ حَدَّثَتْ» [شرح مسلم (١٥٦/٤)]

”اس حدیث میں مسجد میں مردوں کے ہمراہ عورتوں کے نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ اسی طرح بچوں کو مسجد میں لانا بھی جائز ہے، اگرچہ جس (بچہ) کی ناپاکی سے بچا نہیں جاسکتا اس سے مسجد کو بچانا ہی اولیٰ و بہتر ہے۔“

نیز وہ روایت صحیح نہیں جس میں یہ الفاظ ہیں:

«جَنِبُوا مَسَاجِدَكُمْ صَبِيَّانَكُمْ» [حاشیہ شرح السنہ (٢٦٥/٣)، كشف الخفاء و مزيل الالباس (٣٣٤/١)، المقاصد الحسنه (١٧٥)، الفوائد المجموعه في الأحاديث الموضوعه (٢٥)، تحقيق مختصر المقاصد (١٠٨)]

”اپنی مسجدوں کو بچوں سے بچاؤ۔“

حافظ عراقی، حافظ ابن حجر اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے اس روایت کو انتہائی ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بزار اور امام عبدالحق الاشعری نے کہا ہے: ”اس کی کوئی اصل نہیں۔“

یاد رہے کہ اگر بچے مسجد میں شور مچائیں یا نمازیوں کے لیے تشویش کا باعث بنیں تو ایسی صورت میں بچوں کو مسجد میں لانا جائز تو ہے لیکن واجب نہیں اور امر جواز پر اصرار کرنا درست نہیں، بالخصوص جب مسجد میں بچوں کی وجہ سے جھگڑا و فساد وغیرہ کھڑا ہو تو جواز پر اصرار کرنا مکروہ ہوگا۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ایک باب یوں قائم کیا ہے: ”بَابُ الْإِنْفِتَالِ وَالْإِنْصِرَافِ عَنِ الْيَمِينِ وَالشِّمَالِ“ (یعنی نماز مکمل کر کے دائیں اور بائیں جانب پلٹنے کا

(بیان) پھر اس کے تحت ذکر کرتے ہیں:

« وَ كَانَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ يَنْفَتِلُ عَنْ يَمِينِهِ وَ عَنْ يَسَارِهِ وَ يَعِيبُ عَلَى مَنْ يَتَوَقَّى أَوْ مَنْ يَعْمُدُ
الْإِنْفِتَالَ عَنْ يَمِينِهِ »

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ دائیں اور بائیں دونوں جانب پھر کر بیٹھے تھے اور جو آدمی جان بوجھ کر دائیں جانب سے پھر کر بیٹھتا اس پر اعتراض کرتے تھے۔“

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث درج کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلَاتِهِ يَرَى أَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ لَا يَنْصَرِفَ إِلَّا عَنْ
يَمِينِهِ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَثِيرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهِ » [بخاری، کتاب
الأذان: باب الانفتال والانصراف (۸۵۲)]

”تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے کہ خواہ مخواہ یہ سمجھے کہ دائیں طرف سے پھر کر بیٹھنا ہی لازم ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دفعہ دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بائیں جانب پھرتے تھے۔“

اس باب اور حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز سے سلام پھیر کر دائیں اور بائیں دونوں جانب پھرنا درست و جائز ہے لیکن اگر اس جائز کام کو کوئی شخص لازم جان لے اور صرف ایک طرف ہی پھرنے پر اصرار کرے تو یہ شیطان کی کارستانی ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے واضح ہے۔ شارح بخاری امام ابن میسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” فِيهِ أَنَّ الْمُنْدُوبَاتِ قَدْ تَقَلَّبَ مَكْرُوهَاتٍ إِذَا رُفِعَتْ عَنْ رُبَّتَيْهَا لِأَنَّ التَّيْمَانَ مُسْتَحَبٌّ فِي
كُلِّ شَيْءٍ أَيْ مِنْ أُمُورِ الْعِبَادَةِ لَكِنَّ لَمَّا خَشِيَ ابْنُ مَسْعُودٍ أَنْ يَعْتَقِدُوا وَجُوبَهُ أَشَارَ إِلَى
كَرَاهِيَتِهِ ” [فتح الباری (۳۳۸/۲)، إرشاد الساری (۱۴۵/۲)، مرعاة المفاتیح (۳۰۱/۳)]

”اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلاشبہ مباح امور اس وقت مکروہ ہو جاتے ہیں جب انہیں ان کے مقام سے بلند کر دیا جائے۔ اس لیے کہ عبادت کے تمام امور میں دائیں جانب کا لحاظ رکھنا مستحب ہے لیکن جب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں لوگ دائیں طرف پھرنے کو واجب نہ سمجھنے لگیں تو انھوں نے اس کے مکروہ ہونے کی طرف اشارہ کیا۔“

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” فِيهِ أَنَّ مَنْ أَصَرَ عَلَى أَمْرِ مَنْدُوبٍ وَ جَعَلَهُ عَزْمًا وَ لَمْ يَعْمَلْ بِالرُّخْصَةِ فَقَدْ أَصَابَ مِنْهُ الشَّيْطَانُ
مِنَ الْإِضْطِلَالِ فَكَيْفَ بِمَنْ أَصَرَ عَلَى بَدْعَةٍ أَوْ مُنْكَرٍ ” [شرح الطیبی علی مشکوٰۃ المصابیح
(۱۰۵۱/۳)، مرعاة المفاتیح (۳۰۱/۳)، مرقاة المفاتیح (۳۱/۳)]

”اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو آدمی کسی مندوب و مباح کام پر اصرار کرے اور اسے لازم قرار دے لے اور

رخصت پر عمل نہ کرے تو اسے شیطان نے گمراہ کر دیا ہے۔ جب مباح و جائز کام پر اصرار کا یہ حال ہے تو جو شخص کسی بدعت یا منکر پر اصرار کرے اس کا نتیجہ کیسا ہوگا۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ نابالغ چھوٹے بچوں اور بچیوں کا مسجد میں آنا جائز و درست ہے لیکن اگر یہ بچے نمازیوں کی نماز میں خلل اور مسجد میں فتنہ و فساد کا باعث بن جائیں تو انہیں مسجد میں لانے سے گریز کیا جاسکتا ہے۔

مسجد میں گردنیں پھلانگ کر آگے آنا

(سوال) جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آئے اس کے بارے میں کتاب سنت کا کیا حکم ہے؟

(جواب) جمعہ والے دن جب مسجد میں تشریف لائیں تو جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جائیں، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آگے جگہ حاصل کرنا مقصود ہو تو جلدی مسجد میں تشریف لائیں تاکہ اگلی صف میں جگہ مل جائے اور پہلے آنے کا ثواب بھی مل جائے۔ عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”جمعہ کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے آنے لگا تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم نے لوگوں کو ایذا پہنچائی ہے اور (آنے میں) دیر کی ہے۔“

[نسائی، کتاب الجمعة: باب النهی عن تخطی رقاب الناس: (۱۳۹۸)]

معلوم ہوا کہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا درست نہیں، جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا چاہیے۔

ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا

(سوال) کیا تحیۃ المسجد پڑھنا ضروری ہے اور کیا یہ رکعات ممنوعہ اوقات میں بھی ادا کی جاسکتی ہیں؟

(جواب) ہمارے نزدیک سب سے زیادہ صحیح موقف یہ ہے کہ تحیۃ المسجد کی رکعات کسی وقت بھی ادا کی جاسکتی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم عام ہے جیسا کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ

قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ » [بخاری، کتاب الصلاة، باب اذا دخل المسجد فليركع ركعتين (۴۴)، موطا

(۱۶۲/۱)، مسلم (۷۱۴)، ترمذی (۳۱۶)، شرح السنة (۳۶۵/۲)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں ادا کرے۔“

سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے:

« دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَانِي النَّاسِ قَالَ

فَجَلَسْتُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَرْكَعَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ تَجْلِسَ؟

قَالَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! رَأَيْتَكَ جَالِسًا وَ النَّاسُ جُلُوسٌ قَالَ فَإِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى يَرْكَعَ رَكَعَتَيْنِ» [مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب استحباب تحية المسجد برکعتين (۷۱۴)، احمد (۳۰۵۱۵)]

”میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تجھے بیٹھنے سے قبل دو رکعتیں پڑھنے میں کیا چیز مانع ہوئی؟“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو اور لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا (تو میں بیٹھ گیا)۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب بھی تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو دو رکعتیں ادا کرنے سے پہلے نہ بیٹھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ان دو رکعتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سیدنا ابوقادہ جب دو رکعتیں پڑھے بغیر بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے دو رکعتیں نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی، پھر عام حکم دیا کہ مسجد میں داخل ہونے والا شخص دو رکعت ادا کیے بغیر نہ بیٹھے۔ ان دو رکعتوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جمعہ والے دن دوران خطبہ کسی شخص کو بولنے کی اجازت نہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ أُسْكُتْ وَ الْإِمَامُ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَدْ لَعَنَتْهُ الْجَمْعَةُ : باب فى الإنصات يوم الجمعة فى الخطبة (۸۵۱)، مؤطا (۱۰۳/۱)، شرح السنة (۲۵۸/۴)]

”جب تم نے جمعہ والے دن امام کے خطبہ کے دوران اپنے ساتھی سے کہا ”چپ ہو جاؤ“ تو تم نے بیکار بات کی۔“ لیکن دوران خطبہ اگر کوئی شخص دو رکعت ادا کیے بغیر بیٹھے تو اسے بھی اس دوران دو رکعت ادا کرنے کا حکم ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَالَ: أَصَلَّيْتُ؟ قَالَ لَا، قَالَ: قُمْ فَصَلِّ الرَّكَعَتَيْنِ» [مسلم، کتاب الجمعة: باب التحية والامام يخطب (۸۷۵)، احمد (۲۹۷/۳)، ترمذی (۵۱۰)]

”ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے تو آپ ﷺ نے دریافت کیا: ”کیا تو نے نماز پڑھی ہے؟“ اس نے کہا: نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعتیں ادا کرو۔“ صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضرت سلیم غطفانی رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز اس وقت مسجد میں آئے جب آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو وہ بیٹھ گئے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب بھی تم میں سے کوئی شخص جمعہ والے دن مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو (قدرے) ہلکی رکعتیں ادا کرے، پھر بیٹھے۔“ [مسلم، کتاب الجمعة: باب التحية والامام يخطب (۸۷۵)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی آدمی مسجد میں داخل ہو تو اسے دو رکعتیں پڑھے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ یہ دو رکعت پڑھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ سب والی نمازوں میں سے ہے، جیسا کہ طواف کی نماز، سورج گرہن کی

نماز، ایسی تمام نمازیں ممنوعہ اوقات میں بھی ادا کی جاسکتی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے نماز کسوف کے متعلق فرمایا ہے:

« إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَاتٌ مِنَ آيَاتِ اللَّهِ » [بخاری، کتاب الکسوف: باب الدعاء فی الکسوف (۱۰۶۰)]

”بے شک سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔“

مساجد میں عورتوں کے اجتماعات کا کیا حکم ہے؟

(سوال) کیا خواتین مساجد میں تبلیغی اجتماعات منعقد کر سکتی ہیں؟ قرآن و سنت کی رو سے جواب دیں۔

(جواب) دعوت و تبلیغ ہر مسلمان کا حق ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اللہ وحدہ لا شریک لہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جس طرح مردوں کا وظیفہ ذکر کیا ہے اسی طرح عورتوں کے بارے میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبة: ۷۱]

”مومن مردوزن آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غلبے والا اور حکمت والا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ مومن مرد اور مومنہ عورت کی صفات و خوبیوں سے ایک خوبی اور صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، جس طرح مرد کو اچھی بات کہنے اور بری بات سے روکنے کا حکم ہے اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے منع کرے۔ یاد رہے صدر اول میں مردوں کے اجتماعات شکل و صورت کے اعتبار سے ہمارے آج کے جلسوں اور کانفرنسوں کی طرح نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا جواز دعوت و تبلیغ کی عمومی آیات و احادیث سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح عورتوں کا معاملہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی دعوت و تبلیغ کا ہر وہ طریقہ درست ہوگا جس میں وہ شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے اپنے گھر سے نکلیں مثلاً عورت ہا پردہ ہو، مہکنے والی خوشبو لگا کر نہ نکلے، فیشن ایبل ہو کر نہ نکلے اور مردوں سے اختلاط نہ ہو۔ اس طرح اجتماعات میں شریک نہ ہوں جیسے آج کل گلوکارائیں اور اداکارائیں فیشن ایبل ہو کر سٹیج پر نمودار ہوتی ہیں۔ یوں معلوم نہ ہو کہ وہ کسی فیشن شو یا حسن و آرائش کے مقابلہ کے لیے آئی ہیں بلکہ مکمل طور پر شرعی لباس میں ملبوس اور آرائش و نمائش سے مبرا ہو کر دعوت و تبلیغ کے اجتماعات میں آئیں اور اگر تبلیغی اجتماع گھر سے دور ہو تو ایسے سفر پر نکلنے کے لیے اپنے محرم کو ساتھ لے کر جائیں۔ محرم کے بغیر بالکل سفر نہ کریں۔ ان تمام شرعی حدود کو مد نظر رکھ کر عورتیں مساجد میں اپنا دعوت و تبلیغ کا پروگرام منعقد کر سکتی ہیں۔ مساجد دین اسلام کا شعار ہیں اور ان

کا مقصد انہیں آباد کرنا ہے اور مساجد کی آبادی نماز، روزہ، تلاوت، ذکر و اذکار، قرآن و سنت کی تعلیم و تبلیغ اور عبادات ہی سے ممکن ہے۔ جس طرح مسجد کو آباد کرنے کا مرد کو حق ہے، بالکل اسی طرح عورت کا بھی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُطُوطَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ» [مسلم، کتاب الصلاة: باب خروج النساء الی المساجد (۴۴۲)]

”جب عورتیں تم سے اجازت طلب کریں تو ان کو مساجد کے حصے سے منع نہ کرو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مساجد میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور اس عموم میں تبلیغی و اصلاحی اور اسلامی اجتماعات بھی شامل ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا مسجد میں اعکاف بیٹھنا اور مردوں کے پیچھے آ کر نماز پڑھنا اور عید گاہ جو مسجد کے حکم میں ہے وہاں عورتوں کو حاضر ہونے کی تاکید کرنا اور بعض بے سہارا خواتین کا مسجد نبوی میں قیام کرنا وغیرہ جیسے امور اس بات کے مؤید ہیں کہ عورت کو بھی مسجد میں قیام کی اجازت ہے اور مسجد میں قیام کا مقصد مسجد میں ذکر اللہ، عبادات اور وعظ و نصیحت ہے۔ لہذا عورتیں شرعی حدود میں رہتے ہوئے مردوں کے اختلاط سے اجتناب کرتے ہوئے مسجد میں تبلیغی اجتماع اور دعوت و اصلاح کے پروگرام منعقد کر سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شرعی مانع موجود نہیں۔

مسجد میں اعلانات

(سوال) مسجد میں جنازے کے اعلان کے علاوہ اعلان کرنا مثلاً کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی یا کسی بندے کو بلانا ہو وغیرہ، جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو معسکرات کی مساجد میں یہ اعلان کیوں کیے جاتے ہیں کہ فلاں کلاس فلاں گروپ اس بستی میں چلا جائے؟ اس کی شرعی دلیل دیں۔

(جواب) مساجد میں جن اعلانات سے روکا گیا ہے، ان میں گمشدہ چیز کا اعلان ہے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص کسی آدمی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو وہ اسے کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھ پر نہ لوٹائے کیونکہ مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئیں۔“ [صحیح مسلم، کتاب المساجد: باب النهی عن تشد الضالة (۵۶۸)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم کسی آدمی کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو اسے کہہ دو کہ اللہ تیری تجارت میں نفع نہ دے۔“ [ترمذی کتاب بالأحكام: باب النهی عن البیع فی المسجد (۱۳۲۱)]

جنازے کے اعلان کو مستثنیٰ کرنے کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ [اصلاح المساجد: (ص ۱۶۰)]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں گمشدہ چیز کا اعلان اور اشیاء کی خرید و فروخت منع ہے، ایسا کام کرنے والے کے لیے بد دعا کی گئی ہے۔ جبکہ مساجد میں مختلف دینی امور کی تقسیم کے لیے افراد کی ذمہ داریاں تقسیم کرنا منع نہیں ہے۔ معسکرات کی مساجد میں ذمہ داریاں تقسیم کی جاتی ہیں جیسے پہرے کے لیے بھیجنا، کھانا تقسیم کرنا، سونے کے لیے کہہ دینا تو ایسے امور کی ممانعت میں کوئی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے امور کے فیصلے مسجد ہی میں کیا کرتے تھے۔

مسجد میں سترے کی ضرورت

(سوال) کیا مسجد میں نماز کے لیے سترہ ضروری ہے؟ بعض لوگ اسے صحرا کے لیے خاص سمجھتے ہیں۔ صحیح بات کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) جب آدمی نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اسے مختلف وساوس میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ کبھی اس قدر حائل ہوتا ہے کہ اسے بھول جاتا ہے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اس شیطانی حملے سے بچنے کے لیے شریعت اسلامیہ نے جہاں کئی ایک اعمال صالحہ بتائے ہیں وہاں اس بات کی بھی تاکید فرمائی ہے کہ نمازی کو اپنے سامنے کوئی ایسی چیز رکھنی چاہیے جو اس کیلئے سترے کا کام دے۔ یا دیوار و ستون کے پیچھے ہو کر نماز ادا کرے۔ کیونکہ اگر سترہ نہ رکھا جائے تو شیطان نماز خراب کرتا ہے اور نمازی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ اگر سترہ سامنے ہو تو شیطان اس کی نماز کو نہیں توڑ سکتا۔ علاوہ ازیں اگر کوئی آدمی اس کے آگے سے گزرنا چاہے تو وہ سترے کے پیچھے سے گزر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص نمازی اور سترے کے درمیان سے گزرتا ہے یا سترے کی شرعی حد کے اندر سے گزرتا ہے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيِّ مَا ذَا عَلَيْهِ لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْرًا لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ

يَدَيْهِ» [بخاری، کتاب الصلاة: باب إثم المار بين يدي المصلي (۵۱۰)]

”نمازی کے آگے سے گزرنے والا آدمی اگر جان لے کہ اس پر کس قدر گناہ ہے تو وہ چالیس (سال) تک ٹھہر جائے تو یہ اس کے لیے اس کے آگے سے گزرنے سے بہتر ہے۔“

سترے کی شرعی حد تین ہاتھ ہے۔ یعنی نمازی اور سترے کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے یا اس کے سجدے والی جگہ اور سترہ کے درمیان بکری کے گزرنے کی مقدار کا فاصلہ ہو۔ اس سے زیادہ سترے سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ سترے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی کئی ایک احادیث ہیں جن میں اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَصَلِّ إِلَّا إِلَى سُتْرَةٍ وَلَا تَدْعُ أَحَدًا يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْكَ فَإِنَّ أَبِي فَلْتَقَاتِلُهُ فَإِنَّ مَعَهُ الْقَرِينُ»

[ابن خزيمة (۱۰/۲)، (۸۰۰)، کتاب الصلاة: باب النهي عن الصلاة الي غير سترة]

”سترے کے بغیر نماز نہ پڑھو اور کسی کو اپنے آگے سے نہ گزرنے دو۔ اگر وہ (گزرنے والا) انکار کر دے تو اس سے لڑائی کرو یقیناً اس کے ساتھ شیطان ہے۔“

② ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَصِلْ إِلَى سِتْرَةٍ وَلْيَذَنْ مِنْهَا لَا يَقْطَعُ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ صَلَاتَهُ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الدنو من السترة (۶۹۵)، ابن خزيمة (۸۰۳)، احمد (۲/۴)، الأوسط لابن المنذر (۸۶/۵)، ابن حبان (۴۰۹)، حاکم (۲۵۱/۱)، امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔]

”جب بھی تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو وہ سترے کی طرف نماز ادا کرے اور اس کے قریب ہو، شیطان اس پر اس کی نماز کو منقطع نہیں کرے گا۔“

③ حضرت سہل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَبِرْ وَ لِيَقْتَرِبْ مِنَ السُّتْرَةِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ » [شرح السنة (۴۴۷/۲)، (۵۳۷)]

”جب بھی تم میں سے کوئی آدمی نماز ادا کرے تو وہ سترہ رکھے اور سترہ کے قریب کھڑا ہو اس لیے کہ شیطان اس کے سامنے سے گزرتا ہے۔“

④ حضرت طلحہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا وَضَعَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ مُوْخَرَةِ الرَّحْلِ فَلْيَصِلْ وَ لَا يُبَالِ مِنْ مَرِّ وَرَاءَ ذَلِكَ »

[مسلم، کتاب الصلاة: باب سترة المصلي والندب الى الصلاة الى سترة (۴۹۹)، ترمذی (۳۳۵)، شرح السنة (۵۳۹)، ابن خزيمة (۸۰۵)، الأوسط لابن المنذر (۲۴۳۱)]

”جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے سامنے پالان کی کچھلی لکڑی کی مانند کوئی چیز رکھ لے تو نماز پڑھے، اس کے پیچھے سے جو گزرے اس کی پروا نہ کرے۔“

مندرجہ بالا احادیث سے یہ واضح طور پر معلوم ہوا کہ نمازی کو سترے کے بغیر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ احادیث عام ہیں، مسجد وغیر مسجد ہر دو صورتوں کو شامل ہیں بلکہ صحیح ابن خزيمة کی صحیح حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ کو فرمایا: «لَا تَصَلِّ إِلَّا إِلَى سِتْرَةٍ» ”سترے کے بغیر نماز نہ پڑھو۔“ جس سے واضح ہو گیا کہ سترہ کے بغیر نماز پڑھنا درست نہیں۔ صحابہ کرام رحمہ اللہ تو مساجد میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ حضرت عمر رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« وَ رَأَى عُمَرَ رَجُلًا يُصَلِّي بَيْنَ أُسْطُوَانَتَيْنِ فَأَذْنَاهُ إِلَى سَارِيَةٍ فَقَالَ صَلَّى إِلَيْهَا » [بخاری، ابواب

سترة المصلي: باب الصلاة الى الأستوانة (قبل الحديث/ ۵۰۲)]

”حضرت عمر رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے اسے ایک ستون کے

قریب کر دیا اور فرمایا: ”اس کی طرف نماز ادا کرو۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس اثر کو ابن ابی شیبہ اور حمیدی نے موصولاً بیان کیا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

«وَأَرَادَ عُمَرُ بِذَلِكَ أَنْ تَكُونَ صَلَاتُهُ إِلَى سِتْرَةٍ» [فتح الباری (۱/۵۷۷)]

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کا ارادہ اس لیے کیا کہ اس کی نماز سترہ کی طرف ہو۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتُ كِبَارَ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَدِرُونَ السَّوَارِيَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ»

[بخاری، ابواب سترۃ المصلی: باب الصلاة الى الأسطوانة (۵۰۳)]

”میں نے کبار صحابہ کو دیکھا کہ وہ مغرب (کی اذان) کے وقت ستونوں کی طرف جلدی کرتے۔“

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

«فَالأَوْجُهَ عِنْدِي أَنَّ الْإِمَامَ الْبُخَارِيَّ أَشَارَ بِالترَّجُمَةِ الْأُولَى عَدَمَ تَخْصِيصِ السِتْرَةِ

بِالصَّحْرَاءِ» [لامع الداری (۲/۵۰۲)]

”میرے نزدیک صحیح ترین توجیہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمہ باب سے یہ اشارہ فرماتے ہیں کہ سترہ صحراء کے

لیے مخصوص نہیں۔“

یہی بات مولانا محمد زکریا نے بھی کی ہے۔ [شرح ابواب و تراجم صحیح بخاری (ص/۷۹)]

اسی طرح صحیح بخاری میں ابوصالح السمان سے روایت ہے:

«رَأَيْتُ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي يَوْمٍ جُمُعَةٍ يُصَلِّي إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ

فَارَادَ شَابٌّ مِنْ بَنِي أَبِي مُعَيْطٍ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَدَفَعَ أَبُو سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي

صَدْرِهِ فَظَنَرَ الشَّابُّ فَلَمْ يَجِدْ مَسَاعًا إِلَّا بَيْنَ يَدَيْهِ فَعَادَ لِيَجْتَازَ فَدَفَعَهُ أَبُو سَعِيدٍ أَشَدَّ مِنْ

الأُولَى فَنَالَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ ثُمَّ دَخَلَ عَلَى مَرْوَانَ فَشَكَا إِلَيْهِ مَا لَفِيَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ وَدَخَلَ

أَبُو سَعِيدٍ خَلْفَهُ عَلَى مَرْوَانَ فَقَالَ مَا لَكَ وَ لَابْنِ أَخِيكَ يَا أَبَا سَعِيدٍ! فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا صَلَّي أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَارَادَ أَحَدٌ أَنْ

يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ فَإِنَّ أَبِي فَلْيَقَاتِلْهُ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ» [بخاری، كتاب الصلاة: باب يرد

المصلی من مر بین یدیہ (۵۰۹)]

”میں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو جمعہ والے دن سترہ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ بنو ابی معیط سے ایک

نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے اس کے سینے میں ایک گھونسا مارا۔ نوجوان نے جب

ان کے آگے سے گزرنے کے علاوہ کوئی جگہ نہ پائی تو وہ دوبارہ وہاں سے گزرنے لگا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے اسے

پہلے سے زیادہ سخت گھونسا مارا تو ابوسعید سے اس نوجوان کو رنج پہنچا۔ وہ نوجوان مروان کے پاس پہنچا اور ابوسعید نے جو کیا تھا اس کی شکایت کی۔ ابوسعید اس کے پیچھے ہی مروان کے پاس جا پہنچے تو مروان نے کہا: ”ابوسعید! تیرے اور تیرے بھتیجے کے درمیان کیا جھگڑا ہے؟“ ابوسعید رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی لوگوں سے آڑ کر کے نماز پڑھے، پھر کوئی اس کے سامنے (یعنی آڑ کے اندر) سے گزرتا چاہے تو اس کو روکے، اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے لڑے، وہ شیطان ہے۔“

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جمعہ کے روز ابوسعید سترہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور اس کا وہ اہتمام کیا کرتے تھے۔ یحییٰ بن ابی کثیر سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَقَدْ نَصَبَ عَصَا يُصَلِّي إِلَيْهَا»

[ابن ابی شیبہ (۳۱۰/۱)، الأوسط لابن المنذر (۸۹/۵)، طبقات ابن سعد (۱۱/۷)]

”میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں دیکھا، وہ لٹھی گاڑ کر اس کی طرف نماز ادا کر رہے تھے۔“
نافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا لَمْ يَجِدْ سَبِيلًا إِلَى سَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ قَالَ لِي وَلَيْتِي ظَهَرَكَ»

[ابن ابی شیبہ (۳۱۳/۱)]

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کی جانب کوئی جگہ نہ پاتے تو مجھے کہتے کہ میری طرف اپنی پشت کر کے بیٹھ جاؤ۔“

نافع رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُقْعِدُ رَجُلًا فَيُصَلِّيُ خَلْفَهُ وَالنَّاسُ يَمُرُّونَ بَيْنَ يَدَيْ ذَلِكَ الرَّجُلِ»

[ابن ابی شیبہ (۳۱۳/۱)]

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک آدمی کو بٹھاتے پھر اس کے پیچھے نماز پڑھتے اور لوگ اس آدمی کے آگے سے گزرتے۔“

ان صحیح احادیث اور آثار صحابہ سے معلوم ہوا کہ وہ مسجد وغیر مسجد جہاں بھی نماز پڑھتے تو سترے کا خیال رکھتے تاکہ نماز صحیح ادا ہو سکے۔ لہذا ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جب بھی نماز ادا کریں خواہ مسجد ہو یا کوئی دوسری جگہ، سترے کا ضرور خیال رکھیں تاکہ اگر کوئی آدمی اس کے سامنے سے گزرتا چاہے تو وہ سترے کے پیچھے سے گزر سکے۔ امام ابن ہانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ يَوْمًا وَ أَنَا أُصَلِّيُ وَ لَيْسَ بَيْنَ يَدَيَّ سُتْرَةٌ وَ كُنْتُ مَعَهُ فِي الْمَسْجِدِ

الْحَامِعِ فَقَالَ لِي اسْتَبْرُ بِشَيْءٍ فَاسْتَبْرْتُ رَجُلًا» [مسائل احمد لإسحاق بن إبراهيم المعروف بابن

ہانی (۶۶۱)]

”مجھے امام احمد رضی اللہ عنہ نے ایک دن نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، میرے سامنے سترہ نہیں تھا اور میں ان کے ساتھ جامع

مسجد میں تھا تو انھوں نے مجھے کہا: ”کسی چیز کو سترہ بنا لے۔“ تو میں نے ایک آدمی کو سترہ بنا لیا۔“
 مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ نمازی خواہ مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو یا صحراء میں اسے سترے کا اہتمام ضرور کرنا
 چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بات ذکر کر دی گئی ہے کہ وہ جب بھی نماز ادا کرتے، اس کا ضرور اہتمام
 فرماتے۔

ہم مساجد میں نماز کے لیے آئیں تو اس کا آسانی سے اہتمام کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے آنے والے اگر اگلی صف پوری
 کریں اور مسجد کی دیوار کے قریب ہوں اور بعد میں آنے والے ان کے پیچھے نماز ادا کریں تو اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جاتا
 ہے۔ ایک تو صفوں میں پہلے پہنچنے کا اجر ملے گا اور ساتھ ہی سترے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور اگر علیحدہ علیحدہ بھی نماز ادا
 کریں تو مسجد کی دیوار، ستون یا کسی اور لکڑی وغیرہ کو سترہ بنا کر نماز ادا کریں۔

WWW. KITABOSUNNAT.COM



طریقہ نماز کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

نماز کے لیے زبان سے نیت کرنا

سوال کیا نماز کے لیے زبان سے نیت کی جاسکتی ہے اور کیا کسی صحابی کے عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟
جواب نیت کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ قصد و ارادہ دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”الْبَيْتَةُ هِيَ الْقَصْدُ وَالْعَزْمُ عَلَى فِعْلِ الشَّيْءِ وَمَحَلُّهَا الْقَلْبُ لَا تَعْلُقُ لَهَا بِاللِّسَانِ أَصْلًا“
 [اغناء اللہغان (۱۵۶)]

”نیت کسی کام کے قصد اور پختہ ارادے کا نام ہے اور اس کا محل دل ہے اور زبان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔“
 مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فَالْبَيْتَةُ أَمْرٌ قَلْبِيٌّ“ (نیت دل کا معاملہ ہے۔) [فیض الباری (۸۱۱)]

لہذا اگر نمازی نے دل سے نیت کر لی تو تمام ائمہ کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہوگی۔ زبان سے نیت کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے اور نہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم سے ثابت ہی ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ قَالَ: اللَّهُ أَكْبَرُ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا قَبْلَهَا وَلَا تَلْفَظَ بِالْبَيْتَةِ وَلَا قَالَ أَصَلِّيَ لِلَّهِ صَلَاةً كَذَا مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ إِمَامًا أَوْ مَأْمُومًا وَلَا قَالَ آدَاءً وَلَا قَضَاءً وَلَا فَرَضَ الْوَقْتِ وَ هَذِهِ عَشْرُ بَدَعٍ لَمْ يَنْقُلْ عَنْهُ أَحَدٌ قَطُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ وَلَا ضَعِيفٍ وَلَا مُسْنَدٍ وَلَا مُرْسَلٍ لَفْظَةً وَاحِدَةً مِنْهَا الْبَيْتَةُ بَلْ وَ لَا عَنْ أَحَدٍ مِنْ أَصْحَابِهِ وَ لَا اسْتَحْسَنَهُ أَحَدٌ مِنَ التَّابِعِينَ وَ لَا الْإِمَامَةَ الْأَرْبَعَةَ“ [زاد المعاد (۲۰۱/۱)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اس سے پہلے کچھ نہ کہتے اور نہ زبان سے نیت کرتے اور نہ یوں کہتے کہ میں چار رکعت فلاں نماز، منہ طرف قبلہ کے، امام یا مقتدی ہو کر پڑھتا ہوں اور نہ ادا، قضا یا فرض وقت کا نام لیتے۔ یہ دس بدعات ہیں۔ اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح یا سند ضعیف یا مرسل سے قطعاً نقل نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی ایک سے بھی ایسا منقول نہیں اور نہ کسی تابعی نے اسے پسند کیا اور نہ ائمہ اربعہ نے۔“

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی حنفی لکھتے ہیں:

”و حال آنکہ از آن سرور علیہ و علی آلہ الصلاة و السلام ثابت است نہ بروایت صحیح و نہ بروایت ضعیف و نہ از اصحاب کرام و تابعین عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند بلکہ چون اقامت می گفتند تکبیر تحریمہ میفرمودند پس نیت بزبان بدعت

باشد“ [مکتوبات دفتر اول، حصہ سوم، مکتوب: ۱۸۶، صفحہ: ۷۳]

”زبان سے نیت کرنا رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند بلکہ ضعیف سند سے بھی ثابت نہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم زبان سے نیت نہیں کرتے تھے بلکہ جب اقامت کہتے تو صرف اللہ اکبر کہتے تھے۔ زبان سے نیت کرنا بدعت ہے۔“

امام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَلَوْ مَكَّتْ أَحَدُهُمْ عُمَرَ نُوْحَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُفْتَشُ هَلْ فَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ أَحَدٌ مِّنْ أَصْحَابِهِ شَيْئًا مِّنْ ذَلِكَ لَمَا ظَفَرَ بِهِ إِلَّا أَنْ يُجَاهِرَ بِالْكَذِبِ الْبُحْتِ وَ ط فِي هَذَا خَيْرٌ لِّسَبْقُونَا إِلَيْهِ وَ لَدَلُّونَا عَلَيْهِ“ [كما في إغاثة اللهفان (۱/۱۵۸)]

”اگر کوئی انسان سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر کے برابر تلاش کرتا رہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے زبان سے نیت کی ہو تو وہ ہرگز کامیاب نہیں ہوگا سوائے سفید جھوٹ بولنے کے اگر اس میں بھلائی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے پہلے کرتے اور ہمیں بتا کر جاتے۔“

نماز میں پاؤں سے پاؤں ملانا

(سوال) نماز کے دوران میرے ایک دوست جو پاؤں کی چھوٹی انگلی سے انگلی ملاتے ہیں اس پر کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے، براہ کرم قرآن و حدیث سے صحیح جواب دیں؟

(جواب) نماز کے دوران صف درست کرنا اقامت صلوٰۃ میں سے ہے جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”اپنی صفوں کو درست کرو بلاشبہ صفوں کی درستی اقامت صلوٰۃ میں سے ہے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الاذان: باب اقامة الصف من تمام الصلاة: (۷۲۳)]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”صفوں کو قائم کرو اور کندھوں کو برابر کرو اور خالی جگہ پر کرو اور اپنے بھائیوں کے آگے نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے کوئی خالی جگہ نہ چھوڑو اور جو صف کو ملائے اللہ اسے ملائے اور جو صف کو توڑے اللہ اسے

توڑے۔“ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف: (۶۶۶)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نمازیوں کو صحیح صف بندی کا حکم دیا گیا اور دو نمازیوں کے درمیان جو خالی جگہ ہوتی ہے اسے پر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ایک نمازی دوسرے نمازی کے ساتھ کندھا اور پاؤں ملا کر نہیں کھڑا ہوتا، درمیان میں فاصلہ رکھتا ہے تو وہ شیطان کے لیے جگہ چھوڑتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب صفیں باندھتے تھے تو اپنے ساتھی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملاتے تھے۔ لہذا دوسرے نمازی کے ساتھ پورا قدم اور کندھا ملانا چاہیے۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟

(سوال) نماز میں ہاتھ باندھنے کی دلیل کیا ہے؟ اور کیا ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف کے نیچے؟ مہربانی فرما کر آگاہ فرمائیں۔

(جواب) نماز میں ہاتھ سینے کے اوپر باندھنے چاہئیں جو صحیح حدیث سے ثابت ہے:

« عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى

الْيُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ » [ابن خزيمة (٤٧٩)، بیہقی (٣٠/٢)]

”حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر ہاتھ باندھے۔“

ایک روایت میں ہے:

« عَنْ هُلْبٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ يَسَارِهِ وَرَأَيْتُهُ

قَالَ يَضَعُ هَذَا عَلَى صَدْرِهِ » [احمد (٢٢٦/٥)]

”حضرت ہلب صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھا ہوا تھا۔“ شیخ شعیب ارنؤوط نے اس روایت کو ”يَضَعُ هَذَا عَلَى صَدْرِي“ کے علاوہ صحیح لغیرہ قرار دیا ہے اور ان الفاظ کو ضعیف

کہا ہے۔ [مسند احمد محقق (٢١٩٦٧)]

اس کی تائید اس مرسل روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے:

« عَنْ طَاوُسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى يَدِهِ الْيُسْرَى ثُمَّ يَشُدُّ

بَيْنَهُمَا عَلَى صَدْرِهِ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ » [ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب وضع اليمين على اليسرى في

الصلاة (٧٥٩)]

”سیدنا طاؤس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر اپنے سینے پر باندھتے تھے۔“

ان احادیث کی رو سے نمازی کو اپنے ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں اور زیر ناف ہاتھ باندھنے والی روایت انتہائی ضعیف

ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں لکھا ہے: ”مُتَّفَقٌ عَلٰی ضَعْفِهِ“ (اس روایت کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے) اور جو روایت «تَحَتَّ السُّرَّةُ» ”ناف کے نیچے“ ہاتھ باندھنے کے متعلق ابوداؤد میں مروی ہے اس میں عبدالرحمن بن اسحاق الواسطی راوی ضعیف ہے۔

سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ

سوال کیا سورۃ فاتحہ سے پہلے پوری ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پڑھنا جائز ہے؟ نیز کیا کسی صحیح حدیث میں مذکورہ عمل موجود ہے؟

جواب نعیم الجبر فرماتے ہیں: ”میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پڑھی پھر سورۃ فاتحہ پڑھی، جب غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ پر پہنچے تو ”آمین“ کہی اور لوگوں نے بھی ”آمین“ کہی۔ جب رکوع کیا تو اللہ اکبر کہا اور جب رکوع سے سر اٹھایا تو اللہ اکبر کہا پھر جب سجدہ کیا تو اللہ اکبر کہا اور جب سلام پھیرا تو کہا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ ہوں۔“ [صحیح ابن حبان، کتاب الصلاة: باب ذکر ما يستحب للإمام أن يحجر بسم الله..... (۱۷۹۷)، سنن النسائی، کتاب الافتتاح: باب قراءة بسم الله..... الخ (۹۰۴)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورۃ فاتحہ سے پہلے پوری ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھا کر بتایا۔

مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کی قراءت

سوال کیا مقتدی امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے گا یا صرف اپنی تنہا نماز میں؟ قرآن و سنت سے رہنمائی فرمائیں۔

جواب صحیح احادیث کی رو سے امام، مقتدی اور منفرد سب کے لیے ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا لازمی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

«عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» [بخاری، کتاب الأذان: باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها (۷۵۶)، ابو داؤد (۸۲۲)، نسائی (۱۳۷/۲)، ترمذی (۲۴۷)، ابن ماجہ (۸۳۷)]

”سیدنا عبادة بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو بھی نمازی امام ہو یا مقتدی، منفرد ہو یا باجماعت پڑھنے والا اگر سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس

کی نماز نہیں ہوتی۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”أَيُّ فِي رُكْعَةٍ مُنْفَرِدًا أَوْ إِمَامًا أَوْ مَأْمُومًا سِوَاءَ أَسْرَ الْإِمَامِ أَوْ جَهَرَ“ [قسطلانی شرح بخاری (۴۳۹/۲)]

”اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ہر رکعت میں ہر نمازی خواہ امام ہو، منفرد ہو یا مقتدی، امام آہستہ پڑھے یا بلند آواز سے، فاتحہ پڑھنا ہر صورت ضروری ہے۔“

اسی طرح علامہ کرمانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

”وَفِي الْحَدِيثِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ قِرَاءَةَ الْفَاتِحَةِ وَاجِبَةٌ عَلَى الْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا“
”اس حدیث میں دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ امام اور مقتدی پر ہر نماز میں واجب ہے۔“

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”صبح کے وقت ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ قراءت کر رہے تھے۔ آپ پر قراءت بھاری گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شاید تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟“ ہم نے عرض کیا: ”جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔“

[ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب (۸۲۳)، دار قطنی (۳۱۸/۱)، حاکم (۲۳۸/۱)، بیہقی (۱۶۴/۱)، احمد (۳۱۶/۵)، ابن خزیمہ (۳۰۴/۳)]
ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر نمازی پر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا لازم ہے۔

نماز ظہر میں کبھی کبھار جہراً کوئی آیت پڑھنا

(سوال) کیا یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں کبھی کبھار ایک یا دو آیات صحابہ رضی اللہ عنہم کو سناتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اب اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور کیا اسے مردہ سنت کہنا درست ہے؟ جب کہ سنت کبھی مردہ نہیں ہوتی، اس پر عمل چھوڑ دیا جاتا ہے، وضاحت فرمائیں۔

(جواب) ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ اور دوسریں پڑھتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت کرتے تھے اور کبھی کبھار ہمیں ایک آدھ آیت سنا دیا کرتے تھے اور پہلی رکعت میں قراءت دوسری رکعت سے زیادہ کرتے تھے۔ اسی طرح عصر اور صبح کی نماز میں بھی کرتے تھے۔“ [صحیح البخاری، کتاب الاذان: باب یقرا فی الاخرین بفاتحة الكتاب (۷۷۶)، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب القراءة فی الظهر والعصر (۴۰۱)]

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھار ظہر کی نماز جو سوری پڑھی جاتی ہے اس میں ایک آدھ آیت سنائی جاسکتی ہے۔ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی لازمی امر نہیں ہے وگرنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہمیشہ سناتے۔ کبھی کبھار کوئی آیت

سنادینا بالکل جائز ہے اور اس پر آج بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ سنت کے مردہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر لوگ عمل نہیں کر رہے۔ جس سنت پر لوگ عمل نہ کر رہے ہوں اس کو زندہ کرنا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا۔ البتہ جس کام پر شریعت نے شدت اختیار نہ کی ہو اس پر تشدد کر کے امت مسلمہ میں افتراق و انتشار کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

سورۃ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ

سوال نماز میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ صرف پہلی رکعت میں ثناء کے بعد پڑھی جائے یا ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ؟ اسی طرح ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ جہری پڑھنی چاہیے یا سری؟

جواب سورۃ فاتحہ کے شروع میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ بالاتفاق پڑھنا ثابت ہے، اختلاف اس کے جہری اور سری پڑھنے میں ہے۔ کثرت سے احادیث صحیحہ اس کے سری پڑھنے کی موجود ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

”انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابو بکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی وہ بلند آواز سے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ نہیں پڑھتے تھے۔“ [صحیح مسلم، کتاب الصلاة: باب حجة من قال لا يحجر بالبسملة، (۳۹۹)]

البتہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ جہراً پڑھنا بھی ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ”بسم اللہ“ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ [جزء للخطیب البغدادی: (۴۱)، (۱۸۰)] اس طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ”بسم اللہ“ بلند آواز سے پڑھنا صحیح سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ (۳۱۲/۱) میں موجود ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ عرب ممالک سے مطبوعہ قرآن حکیم کے نسخوں میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کو فاتحہ کی ایک آیت شمار کیا گیا ہے۔ بہر کیف ”بسم اللہ“ آہستہ پڑھنے کے دلائل زیادہ ہیں جبکہ بلند آواز سے پڑھنا بھی درست ہے۔ واللہ اعلم!

دورانِ قراءتِ ہر آیت پر وقف

سوال قراءتِ کامنوں طریقہ کیا ہے؟ کیا ہر آیت پر ٹھہرنا ضروری ہے؟

جواب قراءتِ قرآن کا مننون اور افضل طریقہ یہی ہے کہ آدی تلاوت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرے۔ نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ ہر آیت پر ٹھہرتے تھے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْطَعُ قِرَاءَةً تَقُولُ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُولُ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ثُمَّ يَقِفُ وَفِي رِوَايَةٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَرَأَ قَطَعَ آيَةً آيَةً يَقُولُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ثُمَّ يَقِفُ » [ترمذی، ابواب القراءت: باب فی فاتحة الكتاب (۲۹۲۷)، احمد (۳۰۲/۲)، حاکم (۲۲/۱)، ابن خزيمة (۲۴۷/۱)، بیہقی (۴۴/۲)، دار

قطنی (۳۱۳/۱)، طحاوی (۱۳۸/۱)، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیحین کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح الاسناد اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [المجموع (۳۳۳/۳)]

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھتے۔ آپ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے، پھر ﴿الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ پڑھتے پھر ٹھہر جاتے۔“ ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو الگ الگ کرتے مثلاً ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ کہتے پھر وقف کرتے۔“ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”قَالَ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعْبِ وَآخَرُونَ الْأَفْضَلُ الْوُقُوفُ عَلَى الْآيَاتِ إِتِّبَاعًا هَدَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسُنَّتُهُ“ [الاتقان (ص ۱۲۲/۱)]

”امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں اور دیگر اہل علم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہر آیت پر وقف افضل ہے۔“

امام ابو عمر الروافی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”وَ قَدْ كَانَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ السَّلَفِيِّينَ وَالْقُرَاءِ الْعَافِينَ يَسْتَجِبُونَ الْقَطْعَ عَلَيْهِنَّ“ [إرواء الغلیل (۶۲/۲)]

”ائمہ سلف اور قرآن کی ایک جماعت آیات پر وقف مستحب سمجھتی ہے۔“

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ امام ہو یا منفرد ہر ایک کو چاہیے کہ قراءت کرتے وقت ہر آیت پر وقف کرے۔ یہی طریقہ افضل ہے۔

قصداً ترک کی ہوئی نمازوں کی قضا

(سوال) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر نماز ترک کر دے پھر جب اللہ اسے توبہ کی توفیق دے تو کیا وہ اپنی ترک کی ہوئی نمازیں قضا کرے گا یا نہیں؟

(جواب) جب کوئی آدمی جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے تو اسے اللہ نماز پڑھنے کی توفیق عطا کرے تو اسے ان چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا لازم نہیں کیونکہ قصداً نماز ترک کرنے والا دائرۃ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کافر آدمی حالت کفر میں ترک کی ہوئی چیزوں کی قضا نہیں کرتا۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكَفْرِ وَتَرْكُ الصَّلَاةِ » [صحیح مسلم، کتاب الإیمان: باب بیان إطلاق..... (۸۲)]

”آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق نماز کا ترک کرنا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”وہ عہد جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے، وہ نماز ہے جس نے اسے ترک کیا وہ کافر ہو گیا۔“

[نسائی، کتاب الصلاة: باب الحكم في تارك الصلاة (۴۶۴)، ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلوات: باب ما جاء فيمن ترك الصلاة (۱۰۷۹)]

اور اسی طرح ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جَهَارًا» [مجمع البحرين کتاب الصلاة: باب في تارك الصلاة متعمدا (۵۳۴)]

”جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔“

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً نماز کا تارک دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے اور جب ایک آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے تو اسے کفر کی حالت میں ترک کی ہوئی چیزوں کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا۔ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے مرتدین کو جب وہ اسلام میں داخل ہوئے تو حالت ارتداد میں ترک کی ہوئی اشیاء کے اعادے کا حکم نہیں دیا اور جو علماء بے نماز کے کافر ہونے کے قائل نہیں ان کے نزدیک قصداً فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے گی لیکن اس کی کوئی پختہ دلیل موجود نہیں البتہ اگر کسی آدمی سے غفلت یا سستی کی بنا پر کوئی نماز چھوٹ جائے تو اسے یاد آجانے پر اس فوت شدہ نماز کی قضا کر لینی چاہیے۔

قراءت میں سورتوں کی ترتیب

سوال کیا نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد قراءت میں سورتوں کی ترتیب ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ ہمارے بعض بھائی اسے سنت کہتے ہیں؟ تفصیل سے جواب دیں۔

جواب نماز میں بہتر تو یہی ہے کہ قرآن پاک کی قراءت موجودہ ترتیب کے مطابق کی جائے لیکن اگر کسی وقت ترتیب آگے پیچھے ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایسا کرنا کئی ایک صحیح احادیث سے ثابت ہے، اس سے نماز میں خلل اور خرابی واقع نہیں ہوتی۔

① « عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَانْتَحَتِ الْبُقْرَةَ فَقُلْتُ يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَةِ ثُمَّ مَضَى [يَرْكَعُ عِنْدَ الْمِائَتَيْنِ فَمَضَى] فَقُلْتُ يُصَلِّي بِهَا فِي رَكْعَةٍ فَمَضَى فَقُلْتُ يَرْكَعُ بِهَا ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَ هَا ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَ هَا يَقْرَأُ مُتْرَسِلًا إِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيهَا تَسْبِيحٌ سَبَّحَ وَإِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَأَلَ وَإِذَا مَرَّ بِتَعْوِذٍ تَعَوَّذَ ثُمَّ رَكَعَ »

[مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب استحباب تطويل القراءة في الصلاة الليل (۷۷۲)، نسائی (۱۶۶۵)، احمد (۳۸۲/۵)، واضح رہے کہ بریکٹ والے الفاظ سنن نسائی کے ہیں]

”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی تو آپ نے سورہ بقرہ پڑھنی شروع کی، میں نے خیال کیا کہ آپ سو آیات پر رکوع کریں گے، آپ آگے گزر گئے پھر میں نے خیال کیا کہ

دو سو آیات پر رکوع کریں گے، آپ آگے نکل گئے، میں نے سوچا کہ آپ اسی پر سلام پھیریں گے (یعنی اسے دو رکعتوں میں تقسیم کریں گے) مگر آپ آگے نکل گئے۔ میں نے سوچا بقرہ کے آخر پر آپ رکوع کریں گے مگر آپ نے سورہ نساء شروع کر دی۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ نے سورہ آل عمران شروع کر دی۔ آپ نے اس کی قراءت کی۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر قراءت کرتے تھے، جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں تسبیح ہوتی تو آپ تسبیح پڑھتے اور جب سوال والی آیت پڑھتے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے اور جب عذاب والی آیت تلاوت کرتے تو اعوذ باللہ پڑھتے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے نماز کی پہلی رکعت میں سورہ بقرہ پڑھی پھر سورہ نساء پڑھی پھر سورہ آل عمران پڑھی حالانکہ سورہ آل عمران سورہ نساء سے پہلے ہے لہذا معلوم ہوا کہ سورتوں کی ترتیب قراءت میں لازم نہیں۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں:

”قَوْلُهُ ” ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ “ مُقْتَضَاهُ عَدَمُ كَزْمِ التَّرْتِيبِ بَيْنَ السُّورِ فِي الْقِرَاءَةِ “ [حاشیہ سندھی علی النسائی (۲۰۱/۲)]

”اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ قراءت کے دوران سورتوں کی ترتیب لازم نہیں۔“

② حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایک انصاری آدمی مسجد قباء میں ان کی امامت کروا رہا تھا، وہ جب بھی کوئی سورت پڑھتا تو اس سے پہلے ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ پڑھتا۔ جب اس سے فارغ ہوتا تو اس کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھتا اور ہر رکعت میں ایسے ہی کرتا۔ اس کے ساتھیوں نے گفتگو کی اور کہا: ”تم اس سورت کے ساتھ شروع کرتے ہو پھر اسے کافی نہیں سمجھتے حتیٰ کہ دوسری سورت پڑھتے ہو یا تو ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ پڑھا کر دیا اسے چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھ لیا کرو۔“

اس نے کہا: ”میں اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں، اگر تم پسند کرو تو تمہاری امامت کراؤں گا اور اگر ناپسند کرو تو تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ وہ اس شخص کو اپنے ساتھیوں میں سے افضل سمجھتے تھے۔ لہذا انھوں نے اس کے علاوہ کسی اور کی امامت کو ناپسند کیا۔ جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تجھے اپنے ساتھیوں کی بات ماننے سے کون سی چیز روکتی ہے؟ کس چیز نے تمہیں ابھارا ہے کہ تم ہر رکعت میں اس سورت کو لازم پڑھو؟“ اس نے کہا:

”إِنِّي أُحِبُّهَا فَقَالَ حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ“ [بخاری، کتاب الأذان : باب الجمع بين السورتين في ركعة والقراءة بالخواتيم وبسورة قبل سورة و بأول سورة (۷۷۴)، ترمذی (۲۹۰۱)]

”مجھے اس سورت سے محبت ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تیری اس سورت سے محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔“

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ترتیب لازمی نہیں ہے کیونکہ انصاری صحابی جب نماز پڑھتے تو سورہ فاتحہ کے بعد پہلے سورہ اخلاص پڑھتے پھر کوئی اور سورت پڑھتے اور ہر رکعت میں اسی طرح کرتے۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ بات بتائی گئی تو آپ نے منع نہیں فرمایا بلکہ اسے اس کے بدلے جنت کا وارث قرار دے دیا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس صحابی کا نام کلثوم بن الہمد تمہا۔“ [فتح الباری (۲/۲۵۸)]

③ حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے:

« صَلَّى بِنَا الْأَخْنَفُ بْنُ قَيْسٍ الْعَدَاةَ فَقَرَأَ فِي الرَّكْعَةِ الْأُولَى بِالْكَهْفِ وَ فِي الثَّانِيَةِ بِيُونُسَ وَ زَعَمَ أَنَّهُ صَلَّى خَلْفَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَرَأَ فِي الْأُولَى بِالْكَهْفِ وَ فِي الثَّانِيَةِ بِيُونُسَ »

[تغلیق التعلیق (۲/۳۱۳)، بخاری مع الفتح (۲/۲۵۷)]، یہ حدیث کتاب الصلاة لجعفر القرطابی اور مستخرج ابی نعیم میں بھی موجود ہے]

”ہمیں اخنف بن قیس نے صبح کی نماز پڑھائی، انھوں نے پہلی رکعت میں سورہ کہف اور دوسری میں سورہ یونس پڑھی اور کہا: ”انھوں نے سیدنا عمر رحمہ اللہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے بھی پہلی رکعت میں سورہ کہف اور دوسری میں سورہ یونس پڑھی۔“

قرآن پاک میں سورہ کہف کا نمبر اٹھارواں ہے جبکہ سورہ یونس کا نمبر دسواں ہے۔ خلیفہ راشد عمر بن خطاب رحمہ اللہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قراءت کرتے ہوئے سورتوں کی ترتیب لازمی نہیں مگر نہ وہ پندرھویں اور سولھویں پارے سے سورہ کہف پہلی رکعت میں اور گیارھویں پارے سے سورہ یونس دوسری رکعت میں نہ پڑھتے۔

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے قراءت کرنا لازمی نہیں، لہذا جن حضرات نے اسے بدعت کہا ہے وہ اپنی بات سے رجوع کریں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے جہالت و نادانی اور ضد و تعصب کی وجہ سے ایسے کہا ہے۔ ان حضرات کے پاس اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ ان کا استہزا و طعن اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت سے نوازے اور صراط مستقیم پر گامزن فرمائے۔ حنفی علماء میں سے کئی ایسے ہیں جو اس صورت کو جائز کہتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب ”الْجَمْعُ بَيْنَ السُّورَتَيْنِ فِي رَكْعَةٍ وَالْقِرَاءَةُ بِالْخَوَاتِيمِ وَبِسُورَةٍ قَبْلَ سُورَةٍ وَبِأُولَى سُورَةٍ“ میں قراءت کی چار صورتیں ذکر کی ہیں:

- ① ایک رکعت میں دو سورتوں کو جمع کرنا۔
- ② سورتوں کے آخری حصے کی قراءت کرنا۔
- ③ سورتوں کی تقدیم و تاخیر۔
- ④ سورتوں کو ابتدا سے پڑھنا۔

مشہور متعصب حنفی احمد رضا بجنوری اپنے استاد انور شاہ کاشمیری کے بارے میں لکھتا ہے کہ انھوں نے کہا:

”امام طحاوی نے ان چاروں صورتوں کو جائز لکھا ہے اور میرے نزدیک طحاوی کو ترجیح ہے۔“ [انوار الباری (۲/۳۵۰)]

مولوی غلام رسول سعیدی بریلوی نے لکھا ہے:

”ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ترتیب کے خلاف پڑھنا مطلقاً جائز ہے۔“ [شرح مسلم (۲/۵۳۰)]

بہر کیف صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ترتیب کے خلاف پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ جاہل و نادانوں کا خلاف سنت و حدیث کا فتویٰ لگانا سوائے گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے حضرات کو پیار

اور محبت سے سمجھائیں اور ان میں قرآن و حدیث کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

نماز میں قرآن سے دیکھ کر قراءت کرنا

(سوال) کیا نفل نماز (جیسے تراویح) میں قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کی جاسکتی ہے؟ احتاف اس کے قائل نہیں، قرآن و سنت کی رو سے مسئلہ واضح فرمادیں۔

(جواب) نماز میں قرآن مجید اٹھا کر قراءت کرنا جائز و درست ہے لیکن اسے معمول نہیں بنانا چاہیے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ہے:

« وَ كَانَتْ عَائِشَةُ يَوْمَهَا عَبْدُهَا ذَكْوَانَ مِنْ الْمُصْحَفِ » [بخاری (قبل الحدیث ۶۹۲) کتاب الأذان: باب [إمامة العبد والمولى]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی امامت ان کا غلام ذکوان قرآن دیکھ کر رواتا تھا۔“
حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اس کی شرح کرتے ہوئے فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

” وَصَلَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي كِتَابِ الْمَصَاحِفِ مِنْ طَرِيقِ أَيُّوبَ عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ“

”امام ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے کتاب المصاحف میں اس اثر کو بطریق ایوب عن ابن ابی ملیکہ اور اسی طرح ابن ابی شیبہ نے وکیع عن ہشام بن عروہ عن ابن ابی ملیکہ اور امام شافعی اور امام عبدالرزاق رضی اللہ عنہما نے بھی اس کو دوسرے واسطوں سے موصولاً بیان کیا ہے۔“
امام مروزی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

” سئِلَ ابْنُ شِهَابٍ عَنِ الرَّجُلِ يَوْمَ النَّاسِ فِي رَمَضَانَ فِي الْمُصْحَفِ قَالَ مَا زَالُوا يَفْعَلُونَ ذَا لِكَ مُنْذُ كَانَ الْإِسْلَامَ كَانَ خِيَارُنَا يَقْرَأُونَ فِي الْمَصَاحِفِ “ [قيام الليل (ص ۱۶۸)]

”امام ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا گیا جو رمضان میں لوگوں کی امامت قرآن سے دیکھ کر کرتا تھا تو امام زہری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جب سے اسلام آیا ہے اس وقت سے وہ لوگ جو ہم سے بہتر تھے قراءت قرآن مجید سے کرتے رہے ہیں۔“

اس کے علاوہ امام مروزی رضی اللہ عنہ نے امام ابراہیم بن سعد، قتادہ، سعید بن مسیب، ایوب، عطاء، یحییٰ بن سعید، عبد اللہ بن وہب اور امام احمد بن حنبل (رضی اللہ عنہم) سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔ نماز میں قرآن مجید سے قراءت کرنے سے امام ابو حنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن ان کے شاگردوں قاضی ابو یوسف اور امام محمد رضی اللہ عنہما نے اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کی ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

”وَ إِذَا قَرَأَ الْإِمَامُ مِنَ الْمُصْحَفِ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَقَالَ هِيَ تَامَةٌ“

[الهداية (۱/۱۳۷)]

”جب امام قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے جب کہ ان کے شاگردوں کے نزدیک نماز مکمل ہو جاتی ہے۔“

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب ہے کہ ان کے نزدیک اگر نمازی قرآن دیکھ کر قراءت کرے تو نماز فاسد لیکن اگر نماز میں کسی عورت کی طرف بنظر شہوت دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”وَلَوْ نَظَرَ الْمُصَلِّيَ إِلَى الْمُصْحَفِ وَقَرَأَ مِنْهُ فَسَدَتْ صَلَاتُهُ لَا إِلَى فَرْجِ امْرَأَةٍ بِشَهْوَةٍ“

[الأشباه والنظائر (ص: ۴۱۸)]

”اگر نمازی نے قرآن سے دیکھ کر قراءت کی تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی لیکن اگر کسی عورت کی طرف بنظر شہوت دیکھا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔“

علمائے احناف کا اسے عمل کثیر کہہ کر رد کرنا حکم اور سراسر باطل ہے، اگر اتنے عمل کو عمل کثیر کہہ کر نماز کو باطل قرار دے دیں تو اس قدر عمل کثیر نماز کے اندر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آتا ہے:

«عَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتُ زَيْنَبِ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لِأَبِي الْعَاصِ بْنِ رَيْبَعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا» [بخاری، کتاب الصلاة: باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه في الصلاة (۵۱۶)]

”حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ امامہ بنت زینب بنت رسول اللہ کو نماز پڑھتے ہوئے اٹھائے رہتے تھے۔ ابو العاص بن ریح بن عبد شمس کی حدیث میں ہے کہ جب سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ نِمْتُ عِنْدَ مَيْمُونَةَ وَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا تِلْكَ اللَّيْلَةَ فَتَوَضَّأْتُ ثُمَّ قَامَ يُصَلِّي فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَأَخَذَنِي فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ» [بخاری، کتاب الأذان: باب إذا قام الرجل عن يسار الامام فحول الامام إلى يمينه لم تفسد صلاتهما (۶۹۸)]

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ایک رات ام المومنین ميمونة کے گھر میں سویا ہوا تھا، اس رات نبی اکرم ﷺ کی بھی وہیں سونے کی باری تھی۔ آپ ﷺ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے، میں آپ ﷺ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا تو آپ ﷺ نے مجھے پکڑ کر دائیں طرف کر دیا۔“

ان ہر دو حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا امامہ بنت زینب کو اٹھا کر نماز پڑھنا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بائیں طرف سے دائیں طرف کرنا عمل کثیر نہیں اور اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی تو قرآن مجید دیکھ کر قراءت کرنا بھی عمل کثیر نہیں اور نہ اس سے نماز فاسد ہی ہوتی ہے۔ عمل کثیر احناف کا من گھڑت مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور تعجب اس بات پر ہے کہ حنفی اس قانون کی خود بھی کئی مقامات پر مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ درمختار میں لکھا ہے:

”کتے کے بچے کو اٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے۔“ [در مختار (ص ۲۰/)]

اور منیۃ المصلیٰ میں ہے: ”نماز میں ٹھہر ٹھہر کر جوئیں مارنا عمل کثیر نہیں۔“ [منیۃ المصلیٰ (ص ۱۰۰/)]

احناف کا دتیرہ ہے کہ جو حدیث امام کے قول کے خلاف ہو اسے حیلوں کے ذریعے رد کر دیتے ہیں اور جو امام کے قول کے مطابق ہو خواہ وہ کتنی ہی ضعیف کیوں نہ ہو وہ ان کے ہاں حجت ٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ اس کی مثالیں احناف کی معتبر کتب نور الانوار، اصول الشاشی اور اصول بزودی وغیرہ میں موجود ہیں۔

نماز میں آیات کا جواب دینا

(سوال) ہمارے ہاں نماز میں امام جب سورۃ الاعلیٰ پڑھتا ہے تو مقتدی اس کا جواب دیتے ہیں کیا ایسا کرنا سنت رسول سے ثابت ہے؟

(جواب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا قَرَأَ ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ قَالَ سُبْحَانَ رَبِّيَ

الْأَعْلَى » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الدعاء في الصلاة (۸۸۳)]

”نبی کریم ﷺ جب ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ پڑھتے تو کہتے ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى۔“

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ابواسحاق سمیعی ہے جو مدلس ہے اور صیغہ عن سے روایت کرتا ہے اور یہاں تصریح بالسماع نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ثقات رواۃ نے اسے موقوفاً بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ترمذی شریف میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سورۃ رحمن پڑھی اور صحابہ خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجَنِّ لَيْلَةَ الْجَنِّ فَكَانُوا أَحْسَنَ مَرْدُودًا مِنَّنَا »

”میں نے یہ سورت ایک رات جنوں پر پڑھی تو وہ تم سے اچھا جواب دیتے تھے۔“

جب ہر بار میں اس آیت پر پہنچتا تھا: ﴿فِيَايَ آلاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ تو وہ جواب میں کہتے: ﴿لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نَّعْمِكَ رَبَّنَا نَكْذِبُ فَلَكَ الْحَمْدُ﴾ ”اے ہمارے رب! تیری نعمتوں میں سے ہم کسی چیز کو نہیں جھٹلاتے، پس تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں۔“ [ترمذی، کتاب تفسیر القرآن: باب و من سورة الرحمن (۳۲۹۱)، تفسیر ابن

کثیر (۲۸۹/۱۴)، ابن عدی (۱۰۷۴/۳)، حاکم (۴۷۳/۲)]

یہ روایت اپنے شواہد کی بنا پر حسن درجہ کی ہے مگر اس میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ یہ عام حالات میں تلاوت کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حسن حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی بعض نماز میں ”اللَّهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَسِيرًا“ (اے اللہ! میرا حساب آسان فرما) کہتے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے تلخیص میں ان کی موافقت کی ہے۔ [حاکم (۵۰۱-۲۰۰)، احمد (۶/۴۸)، ابن خزیمہ (۸۴۹)]

ان احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو آدی قراءت کرے وہ جواب دے یا عام حالات میں جب تلاوت قرآن ہو تو سامع بھی جواب دے سکتا ہے لیکن مقتدی کا قرآن سن کر جواب دینا مجھے کسی حدیث سے نہیں ملا۔ (واللہ اعلم)

اونچی آواز سے آمین کہنے کا حکم

سوال سورة فاتحہ کے بعد بلند آواز سے آمین کہنے کی سنت رسول اور آثار صحابہ سے کیا دلیل ہے؟

جواب آمین بالجہر کئی ایک احادیث سے ثابت ہے جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

① سیدنا وائل بن حجر رحمہ اللہ سے مروی ہے:

« سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ وَقَالَ

أَمِينَ وَمَدَّ بِهَا صَوْتَهُ » [ترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء في التأمین (۲۴۸)، ابو داؤد، (۹۳۲)،

دارمی (۲۸۴/۱)، دارقطنی (۳۳۳/۱)، بیہقی (۵۷/۱)، ابن ابی شیبہ (۴۲۵/۲)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا آپ نے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ پڑھا اور آمین کے ساتھ اپنی آواز کو لمبا کیا۔“ بعض روایتوں میں ”مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ“ کی جگہ ”رَفَعَ بِهَا صَوْتَهُ“ آتا ہے یعنی اپنی آواز کو بلند کیا۔

② صحیح بخاری میں ہے:

« أَمَّنَ ابْنُ الزُّبَيْرِ وَمَنْ وَرَأَاهُ حَتَّىٰ أَلَّ لِلْمَسْجِدِ لَلْحَجَّةِ » [بخاری، کتاب الأذان: باب: جهر الإمام

بالتأمین (قبل الحدیث ۷۸۰/۱)، مسند شافعی (۲۱۲/۱۵)، بیہقی (۵۹/۲)]

”حضرت عبد اللہ بن زبیر رحمہ اللہ اور ان کے مقتدیوں نے اس قدر بلند آواز سے آمین کہی کہ مسجد لرز گئی۔“

③ « عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا حَسَدْتِكُمْ الْيَهُودُ عَلَى

شَيْءٍ مَا حَسَدْتِكُمْ عَلَى السَّلَامِ وَ التَّأْمِينِ » [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة: باب الجهر بآمین

(۸۵۶)، احمد (۱۳۴/۱۶-۱۳۵)، بیہقی (۵۶/۲)، ابن خزیمہ (۵۷۴)، امام بوصیری رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا

ہے۔ [مصباح الزجاجة (۲۹۷/۱)]

”سیدہ عائشہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہودی جس قدر آمین اور سلام پر حسد کرتے ہیں اس

قدر کسی چیز پر حسد نہیں کرتے۔“

③ حضرت عطاء تابعی رضی اللہ عنہ (جو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے استاد ہیں) سے مروی ہے:

”میں نے مسجد حرام میں دو سو (۲۰۰) صحابہ کرام کو پایا، جب امام ﴿وَلَا انْضَائِينَ﴾ کہتا تو سب صحابہ بلند آواز سے

آمین کہتے تھے۔“ [بیہقی (۲/۵۹)، ابن حبان (۱۹۹۶، ۱۹۹۷)]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ اونچی آواز سے آمین کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اس لیے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔

فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنا

④ سوال کیا فرائض کی آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کے علاوہ بھی کوئی سورت پڑھ سکتے ہیں؟

④ جواب فرائض کی آخری دو رکعات میں فاتحہ کے علاوہ کوئی سورت پڑھنا جائز ہے اور یہ جواز صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہر اور عصر کی قراءت کا اندازہ اور تخمینہ لگاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پہلی رکعت میں سورہ

”آلم تزیل السجدة“ جتنی قراءت کی اور دوسری روایت کے مطابق آپ نے ہر ایک رکعت میں تیس آیات کے برابر

قراءت کی اور آخری دو رکعتوں میں پہلی دو رکعتوں کی قراءت کی مقدار سے آدھی قراءت کی اور نماز عصر کی پہلی دو

رکعتوں میں نماز ظہر کی آخری دو رکعتوں کی قراءت کے برابر قراءت کی اور آخری دو رکعتوں میں پہلی دو رکعتوں کی

قراءت سے آدھی قراءت کی۔“ [مسلم، کتاب الصلوٰۃ: باب القراءۃ فی الظہر والعصر (۴۰۲)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کوئی اور سورت بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

پہلی دو رکعتوں میں اگر تیس آیات پڑھتے تو آخری رکعتوں میں اس سے آدھی قراءت پندرہ آیات بنتی ہیں جبکہ سورہ فاتحہ کی

سات آیات ہیں، معلوم ہوا کہ آخری رکعات میں فاتحہ کے علاوہ قراءت جائز و درست ہے۔

کیا رفع الیدین کا حکم منسوخ ہو چکا

⑤ سوال ہم الحمدیث نماز میں رفع الیدین کرتے ہیں احتاف کہتے ہیں یہ منسوخ ہو چکا کیا واقعی ایسا ہے؟

⑤ جواب رفع الیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کبھی رفع الیدین نہ کیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا كَبَّرَ

لِلرُّكُوعِ وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ رَفَعَهُمَا كَذَلِكَ أَيْضًا» [بخاری، کتاب الأذان: باب رفع

الیدین فی التکبیرۃ الأولى مع الافتتاح سواء (۷۳۵)، احمد (۸/۲)، موطا (۷۵۱)، عبد الرزاق (۲۰۱۷)،

ابن ماجہ (۸۵۸)، دارمی (۲۸۵۱)، دارقطنی (۲۸۷/۱)، بیہقی (۲/۶۹۲)، شرح السنۃ (۵۰۹)، ابو عوانہ

(۹۱۲)، ابو داؤد (۷۲۱)

”رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر اٹھاتے اور جب رکوع کے لیے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے تھے۔“

اسی طرح رفع الیدین کی روایت سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب رفع الیدین فی الصلاة (۷۲۶)]

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام صحابی ہیں۔ چنانچہ علامہ بدر الدین عینی رضی اللہ عنہ رقمطراز ہیں:

”وَإِبْلِ بْنِ حُجْرٍ أَسْلَمَ فِي الْمَدِينَةِ فِي سَنَةِ تَسْعٍ مِّنَ الْهَجْرَةِ“ [عمدة القاری شرح بخاری (۹/۳)]

”وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ۹ ہجری میں مدینہ میں مسلمان ہوئے۔“

یہ حضرموت کے علاقہ میں رہتے تھے اور حضرموت سے مدینہ تک اس وقت کی مسافت کے لحاظ سے چھ ماہ کا سفر تھا۔ پہلی دفعہ آپ کے پاس آئے اور آپ سے دین کے احکامات سیکھ کر دوبارہ اپنے وطن واپس چلے گئے پھر اس کے بعد ۱۰ھ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ بیان کرتے ہیں:

«لَمَّا جِئْتُ بَعْدَ ذَلِكَ فِي زَمَانٍ فِيهِ بَرْدٌ شَدِيدٌ فَرَأَيْتُ النَّاسَ عَلَيْهِمْ جُلُ الثِّيَابِ تَحَرَّكَ أَيْدِيَهُمْ تَحْتَ الثِّيَابِ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب رفع الیدین فی الصلاة (۷۲۷)]

”اس کے بعد ایک زمانے میں میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ ان دنوں سخت سردی تھی۔ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان کے اوپر موٹی چادریں تھیں، ان کے ہاتھ کپڑوں کے نیچے سے حرکت کرتے تھے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۰ھ تک آپ ﷺ سے رفع الیدین ثابت ہے، اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ جو حضرات رفع الیدین کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں وہ ۱۰ھ کے بعد کی عدم رفع الیدین کی کوئی صحیح روایت پیش کریں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا کہ کافر آپ کے پیچھے بت لے کر کھڑے ہو جاتے تھے تو یہ جاہلوں کا پھیلا ہوا بہت بڑا جھوٹ ہے، جسے بیان کرنے والا اگر کوئی عالم ہے تو اسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ ایسی بات کا وجود تو پورے ذخیرہ حدیث میں کہیں بھی نہیں، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ کسی ضعیف حدیث میں۔ محض لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کے شوق میں اور سیاسی اور جمہوری مصلحتوں میں آ کر نبی اکرم ﷺ سے جھوٹی بات منسوب کرنا اور اس پر اصرار کرنا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ ایسی مصلحتوں کا دنیا میں تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، لیکن آخرت میں لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر سنت رسول ﷺ کے خلاف ایسی مہم بازی کا جو نتیجہ نکلے گا، اس سے پھر وہاں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کفار کا آپ ﷺ کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہونا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر رفع الیدین اس لیے کیا کہ لوگ بغلوں میں جو بت رکھتے تھے ان کو گرانے کا یہ ایک طریقہ تھا تو کیا پہلی دفعہ تکبیر تحریر کے ساتھ جو رفع الیدین کی جاتی ہے اس وقت بت نہیں گرتے تھے؟ جو لوگ پہلی دفعہ رفع الیدین کے وقت بت نہیں گرنے دیتے وہ رکوع کی رفع الیدین

کے وقت کیسے کرنے دیں گے؟

نبی کریم ﷺ سے ترک رفع الیدین کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ امام جلال الدین سیوطی نے اپنی مایہ ناز کتاب ”الأزهار المتناثرة فی الأخبار المتواترة“ میں رفع الیدین کی حدیث کو متواتر کہا ہے۔ اسی طرح ”نظم المتناثر“ میں ”الحديث المتواتر“ اور تدریب الراوی وغیرہ ملاحظہ ہو۔

امام شافعی اور امام مالک رحمہما بھی صحیح روایت کے مطابق رفع الیدین کے قائل و فاعل تھے۔ ان سے اس مسئلہ پر کوئی اختلاف اور بحث مروی نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی رفع الیدین والی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« وَ بِهَذَا يَقُولُ أَهْلُ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ ابْنُ عَمَرَ وَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ وَ أَبُو هُرَيْرَةَ وَ أَنَسُ وَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الزُّبَيْرِ وَ غَيْرُهُمْ وَ مِنَ التَّابِعِينَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَ عَطَاءُ وَ طَاوُسُ وَ مُحَاهِدٌ وَ نَافِعٌ وَ سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ وَ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَ غَيْرُهُمْ وَ بِهِ يَقُولُ مَالِكٌ وَ مَعْمَرٌ وَ الْأَوْزَاعِيُّ وَ ابْنُ عُيَيْنَةَ وَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْمُبَارَكِ وَ الشَّافِعِيُّ وَ أَحْمَدُ وَ إِسْحَاقُ » [سنن ترمذی، کتاب الصلاة، باب رفع الیدین عند الركوع (۲۵۶)]

”یہی بات صحابہ کرام میں سے اہل علم کہتے ہیں۔ ان میں سے ابن عمر، جابر بن عبد اللہ، ابو ہریرہ، انس، ابن عباس، عبد اللہ بن زبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حسن بصری، عطاء، طاووس، مجاہد، نافع، سالم اور سعید بن جبیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اور یہی بات امام مالک، امام معمر، امام اوزاعی، امام ابن عیینہ، امام عبد اللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں۔“

امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس صراحت سے معلوم ہوا کہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم وغیرہ بھی رفع الیدین کے قائل تھے۔

لہذا یہ کہنا کہ امام شافعی اور امام مالک رحمہما کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف تھا جو ختم نہیں ہو سکا، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ بغرض مجال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شافعی و مالک میں یہ اختلاف تھا تو پھر بھی ان کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ رفع الیدین پر کوئی آئینہ نہیں آ سکتی، کیونکہ یہ آپ ﷺ کی متواتر سنت ہے جو آپ ﷺ نے کبھی ترک نہیں کی اور آپ ﷺ کی حدیث کے مد مقابل تو کسی امام کی بات قابل حجت نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ظاہر ہے اس نے حدیث رسول ﷺ کے مقابلے میں امام جو امتی ہے، کو نبی کریم ﷺ سے بھی بڑا درجہ دے دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

”يُظْهِرُونَ شِعَارَ أَهْلِ الْحَدِيثِ مِنْ أَفْرَادِ الْإِقَامَةِ وَ رَفَعَ الْأَيْدِي فِي الصَّلَوَاتِ وَ غَيْرِ ذَلِكَ“

[سير اعلام النبلاء (۱۲/۴۶۵)]

”امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھی اہل حدیث کے شعار (علامات) اکہری اقامت اور رفع الیدین کا علی الاعلان اظہار

کرتے تھے۔“

لہذا رفع الیدین سنت نبوی ہے اور شروع سے لے کر آج تک کتاب و سنت کے متوالوں کا عمل ہے۔ مسئلہ رفع الیدین کی تفصیل کے لیے محدث العصر امام محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”التحقیق الراسخ فی ان احادیث رفع الیدین لیس لها ناسخ“ اور استاذ الاساتذہ حافظ عبدالمنان نور پوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”مسئلہ رفع الیدین، تحریری مناظرہ“ وغیرہ ملاحظہ کریں۔

سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے؟

(سوال) سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں یا گھٹنے اگر دونوں کی احادیث صحیح ہیں تو ترجیح کسے دیں گے؟

(جواب) زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ سجدہ کے لیے تھکتے وقت پہلے زمین پر ہاتھ رکھنے چاہئیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَ لِيَضَعُ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ » [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه (۸۴۰)، نسائی (۲۰۷/۲)، دارمی (۳۰۳/۱)، احمد (۳۸۱/۲)، دارقطنی (۳۴۴/۱)، بیہقی (۹۹/۲-۱۰۰)]

”جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے بلکہ اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے رکھے۔“

اس حدیث کی سند جید ہے۔ امام نووی، امام زرقانی، امام عبدالحق، شہیبی اور علامہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ [ملاحظہ ہو: المجموع (۴۲۱/۳)، تحفة الأحوذی (۲۲۹/۱)، سبل السلام (۳۱۶/۱)]

اس حدیث کے لیے سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث بھی شاہد ہے۔ نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔“ [ابن خزیمہ (۶۲۷)، دارقطنی (۳۴۴/۱)، بیہقی (۱۰۰/۲)، حاکم (۲۲۶/۱)]

اس حدیث کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ جو لوگ سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

« عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ وَإِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب كيف يضع ركبتيه قبل يديه، (۸۳۸)، نسائی (۲۰۶/۲)، ترمذی (۲۶۸)، ابن ماجہ (۸۸۲)، دارمی (۳۰۳/۱)، ابن خزیمہ (۶۲۶)، طحاوی (۲۵۵/۱)، ابن حبان (۴۸۷)، دارقطنی (۳۴۵/۱)، بیہقی (۹۸/۲) شرح السنة (۶۴۲)]

”حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ سجدہ کرتے تو دونوں گھٹنے ہاتھوں

سے پہلے زمین پر رکھتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو دونوں ہاتھ گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔“
لیکن یہ روایت ضعیف ہے اس کی سند میں شریک بن عبد اللہ القاضی راوی ضعیف ہے۔ [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

السلسلة الأحادیث الضعیفة (۲/۳۲۹)]

درج بالا تفصیل سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ راجح اور قوی مذہب یہی ہے کہ سجدے میں جاتے وقت آدی گھٹنوں کے بجائے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔ امام اوزاعی، امام مالک، امام ابن حزم اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔

اگر حضرت وائل بن حجر رحمہم اللہ کی اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے پھر بھی ترجیح اسی موقف کو ہے۔ اس لیے کہ سیدنا ابو ہریرہ رحمہم اللہ کی حدیث قوی ہے اور وائل بن حجر رحمہم اللہ کی حدیث فعلی ہے اور تعارض کی صورت میں قوی حدیث کو فعلی حدیث پر ترجیح دی جاتی ہے اور سیدنا ابو ہریرہ رحمہم اللہ کی حدیث کی شاہد حضرت ابن عمر رحمہم اللہ والی صحیح حدیث بھی ہے۔ علاوہ ازیں سیدنا ابو ہریرہ رحمہم اللہ کی حدیث میں ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے کی ممانعت ہے اور تعارض کی صورت میں ممانعت والی روایت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

دورانِ سجدہ پاؤں کی کیفیت

سوال دورانِ سجدہ پاؤں رکھنے کا مسنون طریقہ بتلا کر منون فرمائیں؟

جواب دورانِ سجدہ دونوں پاؤں ملا کر کھڑے ہوں اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ کر کے دونوں ایڑیاں ملا کر رکھنی چاہئیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ سیدہ عائشہ رحمہا اللہ فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے بستر پر تھے اور رات کو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنا شروع کیا:

«فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوبَتَانِ» [مسلم، کتاب الصلاة: باب ما يقال في الركوع والسجود (۴۸۶)]

”میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے ٹوکوں پر لگا، آپ سجدہ کی حالت میں تھے اور آپ کے قدم مبارک کھڑے تھے۔“

اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے:

«فَوَجَدْتُهُ سَاجِدًا رَاصًا عَقَبِيَّهِ مُسْتَقْبِلًا بِأَطْرَافِ أَصَابِعِهِ الْقِبْلَةَ» [ابن خزيمة (۱۲۸/۱)، بیہقی فی السنن الکبری (۱۱۶/۱)، حاکم (۱۲۸/۱)]

”میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدے کی حالت میں اس طرح پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایڑیوں کو ملانے والے اور اپنی انگلیوں کے سروں کو قبلہ رخ کرنے والے تھے۔“

دوران سجدہ دعا مانگنا

(سوال) سجدے کے دوران دعا کرنا کیسا ہے؟ اور کیا صرف مسنون دعا ہی کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے بتادیں۔

(جواب) فرمان نبوی ﷺ ہے:

① « عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَقْرَبُ مَا يَكُونُ

الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ » [مسلم، كتاب الصلاة: باب ما يقال في الركوع والسجود (٤٨٢)، شرح السنة (١٥١/٣)]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا

ہے جب وہ سجدے کی حالت میں ہو، پس (تم سجدے کی حالت میں) کثرت سے دعا کرو۔“

② « عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ كَشَفَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السِّتَارَةَ وَ

النَّاسُ صُفُوفٌ خَلْفَ أَبِي بَكْرٍ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّهُ لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ إِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ أَوْ تَرَى لَهُ آلَا وَ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا أَوْ سَاجِدًا فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظَّمُوا فِيهِ الرَّبَّ عَزَّ وَجَلَّ وَ أَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ فَقَمِينٌ أَنْ يُسْتَحَابَ لَكُمْ »

[مسلم، كتاب الصلاة: باب النهي عن قراءة القرآن في الركوع والسجود (٤٧٩)، ابو داود، كتاب الصلاة: باب في الدعاء في الركوع والسجود (٨٧٦)، نسائي (١٠٤٤)، ابن ماجه (٣٨٩٩)، احمد (٢١٩/١)، دارمی (١٣٣١)، ابن خزيمة (٣٠٣/١)]

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پردہ ہٹایا، لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے صفیں

باندھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے لوگو! نبوت کی بشارتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی سوائے اچھے

خواب کے جسے مسلمان دیکھتا ہے یا اسے دکھایا جاتا ہے۔ خبردار! مجھے رکوع یا سجدے میں قرآن پڑھنے سے روکا گیا

ہے۔ رکوع میں تم اپنے رب کی تعظیم کرو اور سجدے میں دعا کرنے میں مبالغہ کرو، یہ تمہاری دعا کی قبولیت کے زیادہ

لاائق ہے۔“

③ « عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَفَعَهُ اللَّهُ عَنْهُ رَفَعَهُ اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى أَنْ يَقْرَأَ الْقُرْآنَ وَ

هُوَ رَاكِعٌ وَقَالَ إِذَا رَكَعْتُمْ فَعَظَّمُوا اللَّهَ وَإِذَا سَجَدْتُمْ فَأَدْعُوا فَقَمِينٌ أَنْ يُسْتَحَابَ لَكُمْ »

[احمد (٥٥/١)]

”سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حالت رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع کیا ہے اور فرمایا:

”جب تم رکوع کرو تو اللہ کی تعظیم کرو اور جب تم سجدہ کرو تو دعا کرو کیونکہ یہ تمہاری دعا کی قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ سجدے میں دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ احادیث عام ہیں لہذا فرض اور نفلی تمام سجدوں کو شامل ہیں اور ان میں دنیا و آخرت کی خیر طلب کرنا اور ان کے شر سے پناہ مانگنا جائز ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَالْحَدِيثُ دَلِيلٌ عَلَى مَشْرُوعِيَةِ الدُّعَاءِ حَالَ السُّجُودِ بِأَيِّ دُعَاءٍ كَانَ مِنْ طَلْبِ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْإِسْتِعَاذَةَ مِنْ شَرِّهِمَا“ [مرعاة المفاتيح (۱۹۷/۳)]

”یہ حدیث سجدوں کی حالت میں دعا کی مشروعیت پر دلیل ہے، دنیا و آخرت کی خیریت طلب کرنے اور ان کے شر سے پناہ مانگنے پر مشتمل کوئی بھی دعا ہو سکتی ہے۔“

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”الْأَمْرُ بِاِكْتِفَارِ الدُّعَاءِ فِي السُّجُودِ يَشْمَلُ الْحَتَّ عَلَى تَكْثِيرِ الطَّلَبِ لِكُلِّ حَاجَةٍ كَمَا جَاءَ فِي حَدِيثِ أَنَسٍ لِيَسْئَلَ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَةً كُلَّهَا حَتَّى شِئِعَ نَعْلُهُ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَ يَشْمَلُ التَّكْرَارَ لِلسَّوَالِ الْوَّاحِدِ“ [مرعاة المفاتيح (۱۸۸/۳)، فتح الباری (۳۰۰/۲)]

”سجدوں میں کثرت سے دعا مانگنے کا حکم ہر قسم کی حاجت کو کثرت سے طلب کرنے کی ترغیب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے: ”تم میں سے ہر ایک اپنی تمام حاجات اپنے رب سے مانگے یہاں تک کہ جوتے کا تمسہ بھی۔“ اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث ایک ہی سوال بار بار کرنے کو بھی شامل ہے۔“

سید سابق رحمۃ اللہ علیہ سجدے کی مقدار اور اذکار کے تحت رقمطراز ہیں:

”وَالْمُسْتَحَبُّ لَا يَقْتَصِرُ الْمُصَلِّي عَلَى التَّسْبِيحِ بَلْ يَزِيدُ عَلَيْهِ مَا شَاءَ مِنَ الدُّعَاءِ“

[فقہ السنۃ (۱/۱۴۸)]

”مستحب یہ ہے کہ نمازی صرف تسبیح پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس پر جو بھی دعا چاہے اضافی طور پر مانگے۔“

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”الْإِسْتِحْكَارُ مِنَ الدُّعَاءِ بِخَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ بِمَا وَرَدَ وَبِمَا لَمْ يَرِدْ“ [الدرر البہیہ (ص/۳۲)]

”نماز میں دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعا کثرت سے مانگنی چاہیے خواہ وہ دعا منقول ہو یا نہ ہو۔“

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: [الدراری المضیة (۱/۹۱)، السموط الذہبیہ (ص/۵۹)، الروضة الندیة (۱/۱۰۵)]

اگر آپ کہیں کہ کس دلیل سے قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے اندر ماثور وغیر ماثور دعاؤں کو جائز قرار دیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جس میں دو سجدوں میں دعا مانگنے کا کہا گیا ہے اور تشہد میں دعا کیلئے اس حدیث کو پیش کیا ہے:

«ثُمَّ لِيَتَخَيَّرَ أَحَدُكُمْ مِنَ الدُّعَاءِ مِمَّا أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة، باب التشہد (۹۶۸)،

بخاری (۸۳۱)]

”پھر تم میں سے ہر کسی کو جو دعا پسند ہو اختیار کرے۔“

آپ ﷺ نے نمازی کے لیے دعا میں اختیار دے دیا ہے کہ وہ جو چاہے دعا کرے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ عبادات چونکہ توقیفی ہوتی ہیں اس لیے دعا عربی زبان ہی میں مانگی جائے۔ قرآن و سنت میں کتنی ایسی دعائیں مذکور ہیں جو دنیا و آخرت کی بھلائوں کو شامل ہیں، ان میں سے کوئی اختیار کر لی جائے۔ اگر کوئی شخص واقعی ایسا ہے کہ وہ عربی میں دعائیں یاد نہیں کر سکتا تو اس کے لیے گنجائش ہو سکتی ہے کیونکہ معذروں کے لیے الگ شرعی قاعدہ موجود ہے۔

سجدہ سہو کا حکم

(سوال) اگر نمازی بھول کر رکعات میں کمی بیشی کر بیٹھے تو اس کا حل کیا ہے؟ نیز سجدہ سہو کا مسنون طریقہ بتادیں۔
(جواب) اگر کوئی آدمی بھول کر ایک رکعت کم پڑھ بیٹھے، پھر اسے یاد آ جائے کہ میں نے ایک رکعت کم پڑھی ہے تو اسے پوری نماز دہرانے کی بجائے ایک رکعت ہی ادا کر لینی چاہیے، جیسا کہ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی اور تین رکعت ادا کر کے سلام پھیر دیا پھر اپنے گھر چلے گئے پھر ایک شخص جسے خرباق کہا جاتا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ کو جا کر بتایا کہ نماز میں سہو واقع ہوا ہے، تب آپ ﷺ غصے کی حالت میں اپنی چادر کھینچتے ہوئے لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا:

«أَصَدَقَ هَذَا؟ قَالُوا نَعَمْ فَصَلَّى رُكْعَةً ثُمَّ سَلَّمَ ، ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ» [مسلم، کتاب المساجد، باب السهو فی الصلاة والسجود له (۵۷۴)]

”کیا اس نے سچ کہا ہے؟“ صحابہ نے عرض کیا: ”ہاں!“ پھر آپ ﷺ نے ایک رکعت نماز ادا کی، پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیرا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی نماز ایک رکعت کم ہو گئی اور اس نے تین رکعت ادا کر لی ہوں اگرچہ اس دوران کچھ باتیں بھی ہو چکی ہوں تو وہ باقی ایک رکعت ہی ادا کر کے سلام پھیرے اور سجدہ سہو کر لے۔ سجدہ سہو کے بارے میں دو قسم کی احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں سلام سے پہلے سجدہ سہو کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں سلام کے بعد سجدہ سہو کا ذکر ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے:

«ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ» [مسلم، کتاب المساجد: باب السهو فی الصلاة (۵۷۱)]
 ”پھر سلام سے قبل دو سہو کے سجدے کیے۔“

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدے میں تشهد، درود اور دعا کے بعد اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے، پھر اٹھ کر بیٹھ جائے، پھر سجدہ کر کے سلام پھیر دے۔ سلام سے پہلے سجدہ سہو کا جو طریقہ ہے وہ متفق علیہ ہے اور جو سجدہ سہو سلام کے بعد مذکور ہے وہ متفق علیہ تو نہیں لیکن صحیح حدیث سے ثابت ہے اور جائز عمل ہے۔

احناف کے ہاں جو سجدہ سہو کا طریقہ معروف ہے کہ التّحیات ”عبدہ و رسولہ“ تک پڑھ کر ایک طرف سلام پھیرا جائے پھر پورا تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، یہ طریقہ کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔

اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے

(سوال) اگر نمازی بھول کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے اور اسے حالت قیام میں ہی یاد آجائے کہ میں پانچویں رکعت میں کھڑا ہوں تو کیا اسی وقت بیٹھ جائے یا باقی رکعت ادا کر کے بیٹھے پھر سلام پھیرے؟ احناف کا موقف تو معلوم ہے کہ جیسے ہی یاد آجائے فوراً حالت تشہد میں واپس آجائے خواہ کسی حالت میں ہو، براہ کرم صحیح راہ نمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(جواب) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعات پڑھی تو آپ سے کہا گیا: ”کیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”وہ کیا؟“ صحابی نے کہا: ”آپ نے پانچ رکعات نماز پڑھی ہے۔“ تو آپ نے سلام کے بعد دوسو کے سجدے کیے۔“ [صحیح البخاری، کتاب السہو: باب اذا صلی خمساً (۱۲۲۶)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، مواضع الصلاۃ، باب السہوفی الصلاۃ: (۵۷۲)، ابوداؤد (۱۰۱۹)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ:

”اس حدیث میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور سلف و خلف رضی اللہ عنہم کے مذہب کی دلیل ہے کہ جس آدمی نے اپنی نماز میں بھول کر ایک رکعت زائد کر دی اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور اہل کوفہ نے کہا: ”جب بھول کر ایک رکعت زائد کر دے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، اس پر نماز کا اعادہ لازم ہے۔“ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے مزید کہا: ”اگر چوتھی رکعت میں تشہد بیٹھا پھر پانچویں زائد کر دی تو وہ ساتھ چوتھی رکعت ملا کر انہیں جفت کر دے اور یہ دو رکعت نفل ہو جائیں گی، اس پر بنا کرتے ہوئے، اس لیے کہ سلام واجب نہیں ہے اور ہر اس عمل کے ساتھ نماز سے نکل سکتا ہے جو نماز کے منافی ہو اور ایک رکعت اکیلی نماز نہیں ہوتی اور اگر چوتھی رکعت میں تشہد کے لیے نہیں بیٹھا تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے اس لیے کہ بقدر تشہد بیٹھنا واجب ہے جس کی ادائیگی اس نے نہیں کی یہاں تک کہ پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا۔“ لیکن مذکورہ بالا حدیث ان تمام باتوں کو رد کرتی ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچویں رکعت سے نہ واپس پلٹے ہیں اور نہ ساتھ ایک اور رکعت ملا کر اسے جفت کیا ہے۔“

[شرح صحیح مسلم: (۵۵/۵)۔ مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت]

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اہل علم نے اس باب میں اختلاف کیا ہے، اس حدیث کے ظاہری معنی کے مطابق محدثین کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں سے علقمہ، حسن بصری، عطاء نخعی، زہری، مالک، اوزاعی، شافعی، احمد ابن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم ہیں۔“ سفیان ثوری نے کہا ہے: ”اگر نمازی چوتھی رکعت میں نہیں بیٹھا تو مجھے زیادہ پسند ہے کہ وہ اعادہ کرے۔“ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اگر چوتھی رکعت میں بقدر تشہد نہیں بیٹھا اور پانچویں کا سجدہ کر لیا تو اس کی نماز فاسد ہے

اس پر لازم ہے کہ نماز نئے سرے سے ادا کرے اور اگر چوتھی رکعت میں بقدر تشہد بیٹھا ہے تو اس کی نماز ظہر مکمل ہوگئی اور پانچویں رکعت نفل ہے، وہ اس کے ساتھ ایک اور رکعت ملا لے پھر تشہد بیٹھے اور سلام پھیر دے اور سہو کے دو سجدے کر لے۔ تو اس کی نماز پوری ہوگئی۔“ امام خطابی فرماتے ہیں: ”سنت کی پیروی اولیٰ ہے۔“

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی سند اتنی عمدہ ہے کہ اہل کوفہ کے ہاں اس سے زیادہ عمدہ کوئی سند نہیں۔ جو شخص ظاہر حدیث کی طرف گیا ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت لازمی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی رکعت میں تشہد کیا یا نہیں کیا۔ اگر آپ نے چوتھی رکعت میں تشہد نہیں کیا تو آپ نے نماز نئے سرے سے ادا نہیں کی بلکہ اس نماز کو شمار کیا اور سہو کے دو سجدے کیے، ہر دو صورتوں میں اہل کوفہ کی بات میں فساد و خرابی داخل ہو جاتی ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں تحفة الاحوذی: (۴۲۵/۲)، (۴۲۶)، نیل الاوطار، ابواب سجود السہود: (ص/۵۶۹)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بھول کر چار رکعات والی نماز میں پانچویں کا اضافہ کر بیٹھے تو وہ سجدہ سہو کر لے تو اس کی نماز درست ہو جاتی ہے۔ اضافہ کا موقف بلا دلیل ہے۔

تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا

(سوال) کیا دوران تشہد انگشت شہادت کو حرکت دینا مسنون ہے؟

(جواب) دوران تشہد انگشت شہادت کو حرکت دینی چاہیے کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جب کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی

حدیث میں ہے:

« ثُمَّ رَفَعَ أُصْبَعَهُ فَرَأَيْتَهُ يُحَرِّكُهَا يَدْعُو بِهَا » [نسائی، کتاب الصلاة: باب قبض الثنتين من أصابع

اليد اليمنى و عقد الوسطى والإبهام منها (۱۲۶۹)]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی کو اٹھایا پھر اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے۔“

مولوی سلام اللہ حنفی شرح مؤطا میں لکھتے ہیں:

” وَ فِيهِ تَحْرِيكُهَا دَائِمًا إِذَا الدُّعَاءُ بَعْدَ التَّشَهُدِ “

” اس حدیث میں ہے کہ انگلی کو تشہد میں ہمیشہ حرکت دیتے رہنا ہے کیونکہ دعا تشہد کے بعد ہوتی ہے۔“

علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” فَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ السُّنَّةَ أَنْ يَسْتَمِرَّ فِي الْإِشَارَةِ وَ فِي تَحْرِيكِهَا إِلَى السَّلَامِ لِأَنَّ الدُّعَاءَ قَبْلَهُ “

[صفة صلاة النبي (ص/۱۵۸)]

” اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ انگلی کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے کیونکہ دعا سلام سے

متصل ہے۔“

اس کے علاوہ صرف ایک مرتبہ انگلی اٹھا کر رکھ دینا یا ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ پر اٹھانا، اس کے بارے میں صحیح

احادیث سے کوئی دلیل نہیں ملتی جب کہ یہ عمل مذکورہ حدیث کے منافی ہے۔ جس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ تشہد میں انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے وہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں محمد بن عجلان عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے بیان کرتا ہے اور محمد بن عجلان متکلم فیہ راوی ہے، اس کے علاوہ چار ثقہ راویوں نے عامر بن عبد اللہ سے اسی روایت کو بیان کیا ہے لیکن اس میں «لَا يُحَرِّكُهَا» کے الفاظ نہیں ہیں۔ معلوم ہوا یہ الفاظ شاذ ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی محمد بن عجلان کے طریق سے یہی روایت ذکر کی ہے، اس میں بھی «لَا يُحَرِّكُهَا» کے الفاظ نہیں ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں وائل بن حجر رحمہ اللہ والی روایت کو ابن ملتن، ابن قیم اور امام نووی کے علاوہ ناصر الدین البانی (رحمہم اللہ) نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ صرف «الهدایۃ فی تخریج أحادیث البدایۃ» کے مؤلف نے اس حدیث کو شاذ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ «يُحَرِّكُهَا» والے الفاظ صرف زائدہ بن قدامہ عاصم سے بیان کرتا ہے، زائدہ کے علاوہ عاصم کے دوسرے شاگرد «يُشِيرُ بِيَدِهِ» کے الفاظ ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات تحقیق اور انصاف سے عاری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سب محدثین نے اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشارہ والی حدیث کے ثبوت سے حرکت دینے کی نفی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور صحابہ پیچھے کھڑے تھے «فَأَشَارَ إِلَيْهِمْ أَنْ اجْلِسُوا» ”آپ نے ان کی طرف اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔“ [بخاری، کتاب الأذان: باب إنما جعل الإمام ليؤتم به (۶۸۸)]

اس حدیث سے ہر عقلمند آدمی یہ سمجھے گا کہ آپ ﷺ کا اشارہ صرف ہاتھ کو اٹھا دینا نہیں تھا جیسا کہ آپ سلام کے جواب میں کرتے تھے، بلکہ یہ اشارہ تھا جس سے سمجھ آتی تھی کہ آپ ﷺ بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ اشارہ حرکت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اشارہ والی احادیث کو تحریک والی احادیث کے مخالف قرار دینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت ہے:

«لَهِيَ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنَ الْحَدِيدِ» [صفة صلاة النبي للالباني (ص ۱۵۹)]

”یہ انگلی شیطان کے لیے لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے۔“

اس حدیث کو حرکت نہ دینے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ اس میں حرکت دینے یا نہ دینے کی صراحت موجود ہی نہیں ہے، جب کہ حرکت دینا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اس میں حرکت نہ دینے کی صراحت ہے تو پھر صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ دونوں امر جائز ہیں جیسا کہ علامہ صنعانی رحمہ اللہ نے سبل السلام میں اسے ترجیح دی ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ پختہ ہے کیونکہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ایک خاص اہتمام کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان کر رہے ہیں اور خاص کر تشہد کی حالت کا اور انہوں نے تشہد میں ایسی چیزیں بیان کی ہیں جو کسی نے بیان نہیں کیں۔ اس لیے ان کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

مزید تفصیل کے لیے علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتاب ”تمام المنۃ“ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

تشہد میں شہادت کی انگلی کا قبلہ رخ ہونا

سوال کیا حالت نماز میں شہادت کی انگلی قبلہ رخ ہونی چاہیے اور نظر کا اس پر مرکوز ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”نبی ﷺ جب نماز میں بیٹھ جاتے تو اپنی انگلی سے قبلہ رخ اشارہ کرتے اور اپنی نگاہ اسی پر رکھتے۔“ [ابوعوانہ، کتاب الصلاة: باب بیان الإشارة (۲۰۱۷)، ابن خزیمہ، کتاب الصلاة: باب الإشارة بالسبابة، (۷۱۹)]

دوسری حدیث میں ہے:

”یقیناً نبی ﷺ جب تشہد بیٹھ جاتے تو اپنا بائیں ہاتھ بائیں ران پر اور دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھتے اور شہادت والی انگلی سے اشارہ کرتے، آپ ﷺ کی نگاہ آپ کے اشارے سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔“ [ابوعوانہ کتاب الصلاة: باب الإشارة بالسبابة: (۲۰۱۸)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ تشہد کی صورت میں شہادت کی انگلی اٹھا کر قبلہ رخ اشارہ کرنا اور نظر اس پر رکھنا مسنون ہے۔

پہلے تشہد میں درود پڑھنا

سوال کیا دونوں تشہدوں میں درود پڑھنا ضروری ہے، پہلے تشہد میں پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

[الأحزاب: ۵۶]

”بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجو۔“

اس آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور یہ نماز کو بھی شامل ہے کیونکہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے آ کر سوال کیا کہ ہم نے سلام کہنا تو سیکھ لیا ہے، آپ ﷺ ہمیں بتائیں کہ ہم صلاۃ کیسے پڑھیں اور بعض روایات میں نماز کی صراحت بھی آتی ہے، جیسا کہ سنن دارقطنی میں حدیث ہے:

«عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ أَقْبَلَ رَجُلٌ حَتَّى جَلَسَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَمَا السَّلَامُ فَقَدْ عَرَفْنَاهُ فَكَيْفَ نُصَلِّيُ عَلَيْكَ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا فِي صَلَاتِنَا؟ فَقَالَ قُولُوا اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى..... الخ» [سنن دارقطنی (۳۵۵/۱)]

”حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، ہم بھی

آپ ﷺ کے پاس تھے، اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! سلام تو ہم نے جان لیا ہے مگر ہم آپ پر صلاۃ کیسے بھیجیں؟ جب ہم نماز پڑھ رہے ہوں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم ”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيَّ..... الخ“ کہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں رسول اللہ ﷺ پر سلام تو پہلے ہی پڑھتے تھے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد انہوں نے سلام کے ساتھ صلاۃ بھی آپ ﷺ سے سکھ لی۔

مذکورہ بالا آیت سورۃ اتراب کی ہے جو ۵۵ میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ و سلام پڑھنے کا حکم دیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو تشہد میں سلام پہلے ہی پڑھتے تھے، اب انہوں نے اس کے ساتھ صلاۃ کا بھی اضافہ کر لیا، یعنی جہاں سلام پڑھنا ہے، اس کے ساتھ ہی صلاۃ پڑھنی ہے، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ہم پہلے تشہد میں صرف سلام پڑھیں، صلاۃ نہ پڑھیں تو ﴿وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ پر تو عمل ہوگا لیکن ﴿صَلُّوا عَلَيْهِ﴾ پر عمل نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ سے آخری تشہد سے پہلے تشہد میں صلاۃ پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ سعد بن ہشام سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ ﷺ کے قیام اللیل کے متعلق روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

«فَقُلْتُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ! أَنْبِئِي عَنِ وِتْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ كُنَّا نَعْدُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِوَاكَهَ وَ طَهْوَرَهُ فَيَبْعُهُ اللَّهُ فِيمَا شَاءَ أَنْ يَبْعَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَيَتَسَوَّكُ وَ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يُصَلِّيُ تِسْعَ رَكَعَاتٍ لَا يَجْلِسُ فِيهِنَّ إِلَّا عِنْدَ الثَّامِنَةِ فَيَدْعُو رَبَّهُ وَ يُصَلِّيُ عَلَى نَبِيِّهِ ثُمَّ يَنْهَضُ وَ لَا يُسَلِّمُ ثُمَّ يُصَلِّيُ التَّاسِعَةَ فَيَقْعُدُ ثُمَّ يَحْمَدُ رَبَّهُ وَ يُصَلِّيُ عَلَى نَبِيِّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَدْعُو ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيمًا» [ابو عوانہ (۲/۳۲۴)، بیہقی (۲/۵۰۰)، نسائی (۱۷۲۱)]

”میں نے کہا: ”اے ام المؤمنین! آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے وتر کے متعلق بتائیں۔“ تو انہوں نے کہا: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے لیے سواک اور طہارت کے لیے پانی تیار کر دیتے۔ رات کے وقت جب اللہ تعالیٰ چاہتا، آپ ﷺ کو اٹھا دیتا۔ آپ ﷺ سواک کرتے اور وضو کرتے پھر نو رکعتیں ادا کرتے، آٹھویں کے سوا کسی رکعت میں نہیں بیٹھتے تھے۔ پھر آپ ﷺ اس میں اپنے رب سے دعا کرتے اور اس میں نبی ﷺ پر درود بھیجتے، پھر کھڑے ہو جاتے اور سلام نہیں پھیرتے تھے، پھر نویں رکعت ادا کر کے بیٹھتے اور اللہ کی حمد کر کے اس کے نبی ﷺ پر درود بھیجتے اور دعا کرتے، پھر سلام پھیر دیتے۔“

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی آخری قعدے سے پہلے والے قعدے میں درود پڑھا ہے۔ لہذا ہمیں آپ ﷺ کی سنت کے مطابق آخری قعدے سے پہلے والے قعدے میں بھی درود پڑھنا چاہیے۔

آخری تشہد میں دعا

سوال کیا حالت تشہد میں کوئی دعا ضروری بھی ہے یا سب اختیاری ہیں؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب نماز کے آخری تشہد میں چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو تو وہ چار چیزوں سے اللہ کی پناہ پکڑے ① جہنم کے عذاب سے ② قبر کے عذاب سے ③ زندگی اور موت کے فتنے سے ④ صبح و دجال کے شر سے۔“ [صحیح مسلم، کتاب المساجد: باب ما يستعاذ منه في الصلوة (۵۸۸)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نمازی کو آخری تشہد سے فارغ ہو کر یہ دعا کرنی چاہیے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَالِ » [مسلم، کتاب المساجد (۵۸۸)]

اس کے بعد جو جی چاہے دعا مانگ لے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں آپ کی حدیث ہے:

« وَ لِيَتَخَيَّرَ مِنَ الدُّعَاءِ اَعَجَبَهُ اِلَيْهِ فَيَدْعُوْهُ » [صحیح بخاری، کتاب الاذان: باب ما يتخير من الدعاء بعد تشهد: (۸۳۵)]

”جو دعا پسند ہو وہ مانگ لیں۔“

مرد اور عورت کی نماز میں فرق

سوال حنفی حضرات مرد اور عورت کے طریقہ نماز میں فرق روارکتے ہیں۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی جو کیفیت و ہیئت بیان فرمائی ہے اسے ادا کرنے میں مرد و زن برابر ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ » [بخاری، کتاب الأدب: باب رحمة الناس و البهائم (۶۰۰۸)،

احمد (۵۲۱۵)، إرواء الغلیل (۲۱۳)]

”تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔“

یاد رکھیں کہ تکبیر تحریمہ سے سلام تک مردوں اور عورتوں کی نماز کی ہیئت ایک جیسی ہے، سب کے لیے تکبیر تحریمہ، قیام، ہاتھوں کا باندھنا، دعائے استفتاح کا پڑھنا، سورہ فاتحہ، آمین، اس کے بعد کوئی اور سورت، پھر رفع الیدین، رکوع، قیام ثانی، رفع الیدین، سجدہ، جلسہ استراحت، قعدہ اولیٰ، تشہد، تحریک اصابع، قعدہ اخیرہ، تورک، درود اور اس کے بعد دعا، سلام اور ہر مقام پر پڑھی جانے والی مخصوص دعائیں سب ایک جیسی ہی ہیں۔ عام طور پر حنفی علماء کی کتابوں میں جو مردوں اور عورتوں کی

نماز کا فرق بیان کیا جاتا ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور عورتیں صرف کندھوں تک، مرد حالت قیام میں زیر ناف ہاتھ باندھیں اور عورتیں سینے پر، حالت سجدہ میں مرد اپنی رانیں پیٹ سے دور رکھیں اور عورتیں اپنی رانیں پیٹ سے چپکالیں، یہ فرق کسی بھی صحیح و صریح حدیث میں مذکور نہیں۔ چنانچہ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

① ”وَاعْلَمَ أَنَّ هَذِهِ السُّنَّةَ تَشْتَرِكُ فِيهَا الرَّجَالُ وَالنِّسَاءُ وَ لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَهُمَا فِيهَا وَ كَذَا لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ فِي مَقْدَارِ الرَّفْعِ رُوِيَ عَنِ الْحَنْفِيَّةِ أَنَّ الرَّجُلَ يَرْفَعُ إِلَى الْأُذُنَيْنِ وَالْمَرْأَةُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لِأَنَّهُ اسْتَرَّ لَهَا وَ لَا دَلِيلَ عَلَى ذَلِكَ كَمَا عَرَفْتُ “
[نیل الأوطار (۲/۱۹۸)]

” اور جان لیجیے کہ رفع الیدین ایسی سنت ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہیں اور ایسی کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی جو ان دونوں کے درمیان اس کے بارے میں فرق پر دلالت کرتی ہو اور نہ کوئی ایسی حدیث ہی وارد ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ہاتھ اٹھانے کی مقدار کے فرق پر دلالت کرتی ہو۔ احناف سے مروی ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور عورت کندھوں تک کیونکہ یہ اس کے لیے زیادہ سار ہے، لیکن اس کے لیے ان کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔“

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّفْرِقَةِ فِي الرَّفْعِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ “ [فتح الباری (۲/۲۲۲)، عون المعبود (۱/۲۶۳)]

” مرد اور عورت کے درمیان تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھانے کے فرق کے بارے میں کوئی حدیث وارد نہیں۔“

② مردوں اور عورتوں کو حالت قیام میں یکساں طور پر حکم ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سینے پر باندھیں۔ خاص طور پر عورتوں کے لیے علیحدہ حکم دینا کہ صرف وہی سینے پر ہاتھ باندھیں اور مردانہ کے نیچے باندھیں، اس کے متعلق حنفیوں کے پاس کوئی صریح اور صحیح حدیث موجود نہیں۔ علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ ترمذی کی شرح میں فرماتے ہیں:

” فَأَعْلَمَ أَنَّ مَذْهَبَ الْإِمَامِ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّ الرَّجُلَ يَضَعُ الْيَدَيْنِ فِي الصَّلَاةِ تَحْتَ السَّرَّةِ وَالْمَرْأَةُ تَضَعُهُمَا عَلَى الصَّدْرِ وَ لَمْ يَرَوْا عَنْهُ وَ لَا عَنْ أَصْحَابِهِ شَيْءٌ خِلَافَ ذَلِكَ “
[تحفة الأحوذی (۱/۲۱۳)]

” پس جان لو کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ مرد نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھے اور عورت سینے پر، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب سے اس کے خلاف کوئی اور قول مروی نہیں۔“

محدث العصر علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَضَعُهُمَا عَلَى الصَّدْرِ الَّذِي ثَبَتَ فِي السُّنَّةِ وَ خِلَافُهُ إِمَّا ضَعِيفٌ أَوْ لَا أَصْلَ لَهُ “

[صفة صلاة النبي (ص ۸۸)]

”اور سینے پر ہاتھ باندھنا سنت سے ثابت ہے اور اس کے خلاف جو عمل ہے وہ یا تو ضعیف ہے یا پھر بے اصل ہے۔“

③ حالت سجدہ میں مردوں کا اپنی رانوں کو پیٹ سے دور رکھنا اور عورتوں کا سمٹ کر سجدہ کرنا، یہ حنفی علماء کے نزدیک ایک مرسل حدیث کی بنیاد پر ہے، جس میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لیا کرو کیونکہ عورتوں کا حکم اس بارے میں مردوں جیسا نہیں۔“

علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”مُرْسَلٌ لَا حُجَّةَ فِيهِ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَّاسِيْلِ“ [صفة صلاة النبي (ص) ۸۹/۱]

”یہ روایت مرسل ہے جو قابل حجت نہیں۔ امام ابو داؤد نے اسے ”مراسیل“ میں یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے۔“

لیکن یہ روایت منقطع ہے اور اس کی سند میں موجود ایک راوی ”سالم“ محدثین کے نزدیک متروک ہے۔

علامہ ابن الترمذی حنفی نے اس روایت کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ [الجوہر النقی علی السنن الكبرى للبيهقي (۲/۲۲۳-۲۲۲)]

اس کے متعلق حنفی علماء ایک اور روایت پیش کرتے ہیں، سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”عورت جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو رانوں سے چپکا لے، اس طرح کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا موجب ہو۔“

[بیہقی فی السنن الكبرى (۲/۲۲۲-۲۲۳)]

اس روایت کے متعلق خود امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کر دی ہے کہ اس جیسی ضعیف روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اثر یہ بھی پیش کیا جاتا ہے:

«إِنَّهُ كَانَ يَأْمُرُ نِسَاءَهُ أَنْ يَتَرَبَّعْنَ فِي الصَّلَاةِ» [مسائل احمد لابن عبد الله (ص) ۷۱/۱]

”وہ اپنی عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ نماز میں چار زانوں بیٹھیں۔“

لیکن اس کی سند میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما راوی ضعیف ہے۔ [تقریب التہذیب (۱۸۲)]

پس معلوم ہوا کہ احناف کے ہاں عورتوں کے سجدہ کرنے کا مروج طریقہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر اس طریقے کے خلاف رسول اللہ ﷺ کے متعدد ارشاد مروی ہیں، چند ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

① «لَا يَنْبَسِطُ أَحَدُكُمْ ذِرَاعِيَهُ إِنْبَسَاطَ الْكَلْبِ» [بخاری، کتاب الأذان: باب لا يفترش ذراعيه في السجود (۸۲۲)]

”تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے دونوں بازو کتے کی طرح نہ بچھائے۔“

② «إِعْتَدِلُوا فِي السُّجُودِ وَ لَا يَفْتَرِشُ أَحَدُكُمْ ذِرَاعِيَهُ إِفْتِرَاشَ الْكَلْبِ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب صفة السجود (۸۹۷)]

”سجدہ اطمینان سے کرو اور تم میں سے کوئی بھی حالت سجدہ میں اپنے بازو کتے کی طرح نہ بچھائے۔“
 غرض نماز کے اندر ایسے کاموں سے روکا گیا ہے جو جانوروں کی طرح کے ہوں۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
 ”نبی کریم ﷺ نے نماز میں حیوانات سے مشابہت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اس طرح بیٹھنا جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے یا لومڑی کی طرح ادھر ادھر دیکھنا یا جنگلی جانوروں کی طرح افزائش یا کتے کی طرح اقباء یا کوئے کی طرح ٹھونکنے مارنا یا اسلام کے وقت شریر گھوڑوں کی دموں کی طرح ہاتھ اٹھانا یہ سب افعال منع ہیں۔“ [زاد المعاد (۱/۱۶۶)]
 پس ثابت ہوا کہ سجدہ کا اصل مسنون طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا اپنا تھا اور کتب احادیث میں یوں مروی ہے:
 « إِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا » [بخاری، کتاب الأذان : باب سنة الجلوس في التشهد (۸۲۸)]

”جب آپ سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر نہ بچھاتے اور نہ اپنے پہلوؤں ہی سے ملاتے تھے۔“
 قرآن مجید میں جس مقام پر نماز کا حکم وارد ہوا ہے اس میں سے کسی ایک مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے طریقہ نماز میں فرق بیان نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی کسی صحیح حدیث سے ہیئت نماز کا فرق مروی نہیں۔ تیسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ کے عہد رسالت سے جملہ اہمات المؤمنین، صحابیات اور احادیث نبویہ پر عمل کرنے والی خواتین کا طریقہ نماز وہی رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کا ہوتا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بسند صحیح ام درداء رضی اللہ عنہا کے متعلق نقل کیا ہے:

« إِنَّهَا كَانَتْ تَجْلِسُ فِي صَلَاتِهَا حَلْسَةَ الرَّجُلِ وَكَانَتْ فَقِيهَةً » [التاريخ الصغير للبخاری (۹۰)]
 ”وہ نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہ تھیں۔“

چوتھی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم عام ہے:

”اس طرح نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔“ [بخاری: (۶۰۰۸)]

اس حکم کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں یہ کہ سلف صالحین یعنی خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور صلحاء امت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دلیل کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے مردوں اور عورتوں کی نماز میں فرق کیا ہے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ کے استاد کے استاد امام ابراہیم نخعی سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

« تَفْعَلُ الْمَرْأَةُ فِي الصَّلَاةِ كَمَا يَفْعَلُ الرَّجُلُ » [ابن ابی شیبہ (۱/۲۷۵)]

”نماز میں عورت بھی بالکل ویسے ہی کرے جیسے مرد کرتا ہے۔“

جن علماء نے عورتوں کا نماز میں تکبیر کے لیے کندھوں تک ہاتھ اٹھانا، قیام میں سینے پر ہاتھ باندھنا اور سجدے میں زمین کے ساتھ چپک جانا موجب ستر بیان کیا ہے وہ دراصل قیاس فاسد کی بنا پر ہے، کیونکہ جب اس کے متعلق قرآن و سنت

خاموش ہیں تو کسی عالم کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ اپنی من مانی کر کے از خود دین میں اضافہ کرے؟ البتہ نماز کی کیفیت و ہیئت کے علاوہ چند چیزیں مرد و عورت کی نماز میں مختلف ہیں:

① عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سر پر اوڑھنی لیں اور اپنے پاؤں بھی ڈھانپیں۔ اس کے بغیر بالغہ عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ حدیث نبوی ہے:

« لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ الْحَائِضِ إِلَّا بِحِمَارٍ » [ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ: باب إذا حاضت الجارۃ لم تصل الا بحمار (۶۵۵)، ابو داؤد (۶۴۱)، احمد (۱۵۰/۶)]
 ”اللہ تعالیٰ کسی بھی بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کرتا۔“

لیکن مردوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھیں جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

« مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْأَزَارِ فِي النَّارِ » [بخاری، کتاب اللباس: باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار (۵۷۸۷)]

”تو بند کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ آگ میں ہے۔“

② عورت جب عورتوں کی امامت کرائے تو ان کے ساتھ پہلی صف کے وسط میں کھڑی ہو جائے، مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو۔ امام ابو بکر ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے مصنف میں اور امام حاکم رضی اللہ عنہ نے سیدنا عطاء رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا كَانَتْ تَوُجُّمُ النِّسَاءَ فَتَقُومُ مَعَهُنَّ فِي الصَّفِّ »

[دارقطنی (۴۰۴/۱)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کراتی تھیں اور ان کے ساتھ صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔“

اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آتا ہے:

« أَنَّهَا أَمَّتِ النِّسَاءَ فَقَامَتْ وَسَطَهُنَّ » [مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عون المعبود (۲/۲۱۲)]

”انہوں نے عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔“

③ امام جب نماز میں بھول جائے تو اسے متنبہ کرنے کے لیے مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں تالی بجا لیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

« أَلْتَسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَ التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ » [بخاری، کتاب العمل فی الصلاة: باب التصفيق للنساء (۱۲۰۳)]

”مردوں کے لیے سبحان اللہ اور عورتوں کے لیے تالی بجانا ہے۔“

④ مرد کو نماز کسی صورت میں بھی معاف نہیں لیکن عورت کو حالت حیض میں فوت شدہ نماز کی قضا نہیں ہوتی جیسا کہ یہ مسئلہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

⑤ اسی طرح عورتوں کی سب سے آخری صف ان کی پہلی صف سے بہتر ہوتی ہے اور مردوں کی پہلی صف ان کی آخری

صف سے بہتر ہوتی ہے۔ [مسلم، کتاب الصلاة : باب تسوية الصفوف وإقامتها وفضل الأول فالأول (۴۴۰)]
یہ تمام مسائل اپنی جگہ درست ہیں مگر قرآن و سنت سے ثابت شدہ فرق کو غیر ثابت شدہ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ تفریقات علمائے احناف کی خود ساختہ ہیں جن کا قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت

(سوال) نماز کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کے متعلق آگاہ فرمادیں؟

(جواب) دور حاضر میں فرض نمازوں کے بعد امام اور مقتدی مل کر جو اجتماعی دعا کا اہتمام کرتے ہیں اس کا نبی کریم ﷺ سے کوئی ثبوت صحیح سند کے ساتھ موجود نہیں، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسی کوئی بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ رسول کریم ﷺ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔ اگر اس دعا کا کہیں وجود ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور ذکر فرماتے۔ جس طرح صحابہ کرام نے باقی نماز کے مسائل بیان کیے ہیں اس طرح کہیں اس اجتماعی دعا کا ذکر بھی ضرور کیا جاتا۔ بعض لوگ تو اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ جو لوگ اس مسئلے پر عمل پیرا نہیں ہوتے انہیں بے عمل اور بہت بڑے گناہ کے مرتکب سمجھتے ہیں۔ بہر کیف نبی کریم ﷺ سے کسی صحیح تو کجا ضعیف حدیث میں بھی امام اور مقتدیوں کا مل کر اہتمام کے ساتھ دعا کرنا ثابت نہیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ سے فرض نمازوں کے بعد کچھ اذکار منقول ہیں جو ہم بھگت لند پڑھتے ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہے:

① ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا اور تین بار استغفار پڑھنا۔

② «اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ وَتَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ»

③ معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھنا۔

④ «رَبِّ أَعْنِي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»

⑤ آیت الکرسی پڑھنا۔

⑥ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنا۔

کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات نماز کے بعد سلام پھیر کر جلد اٹھ جاتے تھے۔ جیسا کہ

حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« قَالَ صَلَّى رِزَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِينَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ فَقَامَ مُسْرِعًا فَتَغَطَّى

رِقَابَ النَّاسِ إِلَى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهِ » [بخاری، کتاب الأذان : باب من صلى بالناس فذكر حاجة

فغطاهم (۸۵۱)]

” انھوں نے بیان کیا کہ میں نے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز عصر ادا کی، آپ ﷺ نے سلام پھیرا، پھر

جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے حجرے کی طرف لوگوں کی گردنیں پھلاکتے ہوئے چلے گئے۔“

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« صَلَّى بِنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِحْدَى صَلَاتِي الْعِشِيِّ فَصَلَّى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ إِلَى خَشْبَةِ مَعْرُوضَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَأَنَّهُ غَضْبَانٌ » [بخاری، کتاب الصلاة: باب تشبيك الأصابع في المسجد (٤٨٢)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر و عصر کی نمازوں میں سے کوئی ایک نماز پڑھائی، آپ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیرا۔ پس مسجد میں گاڑھی ہوئی ایک لکڑی کی جانب کھڑے ہو کر اس پر ٹیک لگائی گویا آپ غصے میں ہیں۔“

ان دونوں حدیثوں میں « فَسَلَّمَ فَقَامَ » ہے اور اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ ”ف“ عربی زبان میں تعقیب مع الوصل کے لیے ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ آپ سلام پھیرتے ہی اٹھ گئے۔ لہذا اذکار مسنونہ تو نمازوں کے بعد ثابت ہیں اور کبھی کسی کام کی بنا پر سلام پھیرتے ہی اٹھ جانا بھی درست ہے لیکن کسی صحیح حدیث میں امام اور مقتدیوں کا مل کر اہتمام کے ساتھ دعا کرنا وارد نہیں ہوا۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اذان اور اقامت کے درمیان تہویب کا بدعت ہونا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” وَ كَذَلِكَ الْجَهْرُ بِالِدُعَاءِ عَقِيبَ الصَّلَاةِ مِثْلَ دُعَاءِ الْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِينَ جَمِيعًا عَقِيبَ الصَّلَاةِ لَمْ يَكُنْ وَ لَكِنَّهُ نَبَتْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَجْهَرُونَ بِالذِّكْرِ فَالذِّكْرُ ثَابِتٌ وَ مَنْ اعْتَقَدَ مَا لَمْ يَدُلَّ عَلَيْهِ دَلِيلٌ شَرْعِيٌّ قُرْبَةً فَهُوَ مُخْطِئٌ ظَالِمٌ “ [مختصر الفتاوى المصرية (٤٠-٤١)]

”اسی طرح نمازوں کے بعد جہری طور پر دعا کرنا، جیسا کہ امام اور مقتدیوں کا مل کر نماز کے بعد دعا کرنا ہے، بدعت ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا۔ لیکن ان سے ثابت ہے کہ وہ جہری ذکر کرتے تھے۔ پس ذکر کرنا ثابت ہے (نہ کہ اجتماعی دعا) جس نے کسی ایسی چیز کے نیک ہونے کا اعتقاد کر لیا جس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، وہ خطا کار و ظالم ہے۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

” وَ أَمَّا دُعَاءُ الْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِينَ جَمِيعًا عَقِيبَ الصَّلَاةِ فَلَمْ يَنْقُلْ أَحَدٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلُنَا شَيْعَانِ :

أَحَدُهُمَا : دُعَاءُ الْمُصَلِّي الْمُنْفَرِدِ كَدُعَاءِ الْمُصَلِّي لِصَلَاةِ الْإِسْتِخَارَةِ وَحَدَهُ إِمَامًا كَانَ أَوْ مَأْمُومًا۔

وَالثَّانِي: دُعَاءُ الْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِينَ جَمِيعًا فَهَذَا الثَّانِي لَا رَيْبَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَفْعَلْهُ فِي أَعْقَابِ الْمَكْتُوبَاتِ كَمَا كَانَ يَفْعَلُ الْأَذْكَارَ الْمَأْتُورَةَ عَنْهُ إِذْ لَوْ فَعَلَ

ذَلِكَ لِنَقْلَ عَنْهُ أَصْحَابُهُ ثُمَّ التَّابِعُونَ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ كَمَا نَقَلُوا مَا هُوَ دُونَ ذَلِكَ“ [الفتاویٰ
الکبریٰ لابن تیمیہ (۱۰۸/۱)]

”بہر حال فرائض کے بعد امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا تو کسی ایک آدمی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے نقل نہیں
کیا۔ درحقیقت یہاں دو چیزیں ہیں:

① ایک نمازی کا دعا کرنا جیسا کہ نمازی دعائے استحارہ وغیرہ کرتا ہے خواہ نمازی امام ہو یا مقتدی۔

② امام اور مقتدیوں کا مل کر دعا کرنا، یہ دوسری چیز بلاشبہ نبی ﷺ نے فرض نمازوں کے بعد نہیں کی۔ جیسا کہ آپ ﷺ
اذا کر کیا کرتے تھے جو آپ سے (کتب احادیث میں) منقول ہیں۔ اگر اس موقع پر آپ اجتماعی دعا کرتے تو آپ ﷺ
کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے ضرور نقل کرتے پھر تابعین پھر دیگر علماء جیسا کہ انہوں نے اس سے کم درجہ کی اشیاء
آپ ﷺ سے نقل کی ہیں۔“

اسی طرح امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسے ایک اور مقام پر صراحت کے ساتھ بدعت قرار دیا ہے۔

[مجموع الفتاویٰ (۲۲/۵۱۹)]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا الدُّعَاءُ بَعْدَ السَّلَامِ مِنَ الصَّلَاةِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ أَوِ الْمَأْمُومِينَ فَلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ مِنْ هَدْيِهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَصْلًا وَلَا رُوي عَنْهُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ وَلَا حَسَنٍ“ [زاد المعاد (۱/۲۵۷)]
”باقی رہا نماز سے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رخ بیٹھ کر یا مقتدیوں کی طرف پھر کر اجتماعی دعا کرنا تو یہ آپ ﷺ کا
طریقہ قطعاً نہ تھا اور نہ آپ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ اور نہ حسن سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔“

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اس صراحت سے واضح ہوا کہ اجتماعی دعا جو ہمارے دور میں رائج ہے یہ بدعت
ہے، اس کا کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں۔ دیوبندی علماء میں سے مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”نَعَمْ الْأَدْعِيَةُ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ ثَابِتَةٌ كَثِيرًا بِلَا رَفْعِ الْيَدَيْنِ وَبِدُونِ الْإِجْتِمَاعِ“ [العرف الشذی
(ص: ۸۶)]

”ہاں فرض نمازوں کے بعد بہت سی دعائیں بغیر ہاتھ اٹھانے اور بغیر اجتماعی شکل اختیار کیے ثابت ہیں۔“

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

”وَلَمْ تَثْبُتْ شَاكِلَةُ الْجَمَاعَةِ فِيهَا كَمَا هُوَ مَعْرُوفُ الْأَنَ“ [العرف الشذی (ص: ۸۶)]

”اور دعا کی اجتماعی بیعت جس کا آج کل رواج ہے، ثابت نہیں۔“

مولوی فیض اللہ بگلہ دیشی لکھتے ہیں: ”شریعت میں ایسی دعا کا اصلاً و قطعاً کوئی ثبوت نہیں، نہ تعامل سلف سے اور نہ

احادیث سے، خواہ وہ صحیح ہوں یا ضعیف یا موضوع اور نہ کسی فقہ کی عبارت ہی سے۔ یہ دعائیں بدعت ہے۔“ [أحكام الدعوات

المروحة (ص: ۲۱)، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: دعابعد الفرائض کا مسنون طریقہ (ص: ۲۲)، از مفتی محمد

ابراہیم صادق [آبادی]

مولوی رفیق دلاوری جو مولوی محمود الحسن دیوبندی کا شاگرد ہے لکھتا ہے: ”الغرض فرض نماز کے سلام کے بعد امام اور مقتدیوں کا دل کر دعا مانگنا بدعت سیئہ ہے۔“ [عماد الدین (ص ۳۹۷)]

علاوہ ازیں اس مسئلے پر اب دیوبندی علماء اہل حدیث علماء جیسا موقف اختیار کر رہے ہیں۔ رشید احمد صاحب لدھیانوی نے اپنے احسن الفتاویٰ میں اسے بدعتِ شنیع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کے شاگرد مفتی محمد ابراہیم نے ”دعا بعد الفرائض کا مسنون طریقہ“ لکھ کر حنفیہ میں جو بالخصوص یہ رواج ہے، اس کی تردید کی ہے۔ باقی رہا فتاویٰ نذیریہ میں اس موضوع پر پیش کردہ روایات کا تجزیہ تو اس کی مفصل بحث کے لیے صلاۃ الرسول مخرج کا مطالعہ کریں۔ جس میں بالتفصیل ان روایات کا ضعف ذکر کیا گیا ہے اور ابن ابی شیبہ کی جو روایت فتاویٰ نذیریہ میں مرقوم ہے اس میں ”رفع یدیدہ و دعا“ کے الفاظ مطبوعہ ابن ابی شیبہ میں نہیں ملتے۔ باقی یہ مفصل روایت جامع ترمذی وغیرہ میں موجود ہے اور اس میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

بہر کیف اجتماعی دعا کا اہتمام کرنا اور اسے سنت سمجھنا غلط ہے۔ فرض نمازوں کے بعد جو مسنون اذکار ہیں انہیں پڑھیں اور یاد کریں۔ کئی لوگ بلا تحقیق یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ اہل حدیث نماز کے بعد دعا نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ہم نماز کے بعد کچھ وقت بیٹھ کر وہ مسنون اذکار و ادعیہ جو ثابت ہیں، پڑھتے ہیں۔

اصل میں جو لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ امام صاحب نے نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے تو وہ فوراً فتویٰ عائد کر دیتے ہیں کہ اس نے دعا نہیں مانگی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا لازم نہیں بلکہ بغیر ہاتھ اٹھائے بھی دعا مانگنا درست ہے۔ مثلاً مسجد میں آنے اور باہر جانے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل اور خارج ہونے کی دعائیں وغیرہ احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں کبھی کسی نے جھگڑا نہیں کیا کہ فلاں آدمی نے دعا نہیں مانگی اور نہ یہاں ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ حقیقت میں جب کسی چیز کا غلط رواج پڑ جاتا ہے تو پھر جب لوگ اس کے خلاف عمل دیکھتے ہیں تو وہ فوراً انکار کر دیتے ہیں۔ یہ طرز عمل اچھا نہیں ہے۔ اگر مسئلہ کا علم نہ ہو تو اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ اہل حدیث اسی بات کی دعوت دیتے ہیں کہ اندھا دھند پیروی نہ کی جائے بلکہ تحقیق والی لائن اختیار کی جائے۔ ہر آدمی اپنی ہمت و بساط کے مطابق مسئلے کی تحقیق کرے۔ اہل علم سے رابطہ کرے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

کیا رفع الیدین بتوں کی وجہ سے کیا جاتا تھا؟

سوال کیا یہ بات درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رفع الیدین اس لیے کروایا تھا کہ لوگ بغلوں میں بت رکھ کر آتے تھے؟

جواب کسی صحیح تو کجا ضعیف روایت میں بھی یہ بات موجود نہیں ہے، یہ لوگوں کی بنائی ہوئی بات ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ رفع الیدین نماز کے دوران کرنا رسول اللہ ﷺ کی مبارک سنت اور احادیث متواترہ اس پر دلالت کرتی ہیں، لوگوں نے اس عظیم سنت کو ترک کرنے کے جو حیلے تراش رکھے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

امامت کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

صفوں کی درستی

(سوال) ہمارے امام صاحب نماز سے پہلے صفوں کی درستی پر بڑا زور دیتے ہیں اس کی کیا اہمیت ہے؟
(جواب) نماز باجماعت میں صف بندی کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صف درست کرنا اقامتِ صلاۃ میں سے ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب الأذان، باب اقامة الصف من تمام الصلاة (۷۲۳)]
 ”صفیں درست کرو، بے شک صفوں کی درستی اقامتِ صلاۃ میں سے ہے۔“

اسی طرح ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ » [مسلم، کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف و اقامتها (۴۳۳)، ابو داؤد (۶۶۸)، ابن ماجہ (۹۹۳)، ابو عوانہ (۳۸/۲)، دارمی (۱۲۶۶)، احمد (۱۷۷/۳)]

”صفیں درست کرو بے شک صف کی درستی نماز کے پورا کرنے سے ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صفوں کی درستی اقامتِ صلاۃ اور تمام صلاۃ سے ہے اور ان کا ٹیڑھا ہونا نماز کے نقصان کا موجب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَقِيمُوا الصَّفِّ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّ إِقَامَةَ الصَّفِّ مِنْ حُسْنِ الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب الأذان: باب إقامة الصف من تمام الصلاة (۷۲۲)، عبد الرزاق (۲۴۲۴)]

”نماز میں صف قائم کرو، بے شک صف کا قائم کرنا نماز کے حسن میں سے ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَحْسِنُوا إِقَامَةَ الصُّفُوفِ فِي الصَّلَاةِ » [احمد (۴۸۵/۲)]

”نماز میں صفوں کی درستی اچھے طریقے سے کرو۔“

علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح الترغیب والترہیب (۴۹۶)]
 ان صحیح احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ صف کا صحیح و درست رکھنا نماز کے حسن و خوبصورتی میں سے ہے اور اس کا حکم

رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے، اگر صف کی درستی صحیح نہ ہوگی تو نماز کے اندر نقصان لازم آئے گا۔ صفوں کی درستی اور ان کا سیدھا ہونا رکوع ہی میں نہیں بلکہ قیام ہی سے ضروری و لازمی ہے۔ نبی کریم ﷺ پہلے صفیں درست کرتے تھے پھر نماز شروع کرتے تھے۔ اگر صف میں نقص ہوتا تو آپ ﷺ اصلاح فرماتے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صف درست کرتے تھے حتیٰ کہ اسے نیزے یا تیر کی مانند کر دیتے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی کا سینہ آگے بڑھا ہوا دیکھا تو فرمایا: ”اپنی صفوں کو درست کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔“ بعض روایات میں چہروں کی بجائے دلوں کا ذکر ہے۔ [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب إقامة الصفوف (۹۹۴)، ابو داؤد، کتاب الصلاة باب تسوية الصفوف (۶۶۳)، مسلم (۴۳۶)، بخاری (۷۱۷-مختصر)]

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک صفوں میں گھس جاتے۔ آپ ﷺ ہمارے سینوں اور کندھوں کو چھوتے اور کہتے: ”اختلاف نہ کرو، تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے۔“ اور کہا کرتے تھے: ”بے شک اللہ عزوجل اور اس کے فرشتے پہلی صفوں پر صلاۃ بھیجتے ہیں۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف (۶۶۴)، نسائی، کتاب الإمامة: باب كيف يقول الامام الصفوف (۸۱۲)]

زوائد ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ صف کی درستی نماز شروع کرنے سے پہلے ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کا کام صفیں درست کرنا بھی ہے۔ اگر کہیں صف میں خلل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صحیح کرائے پھر نماز شروع کرے۔ لیکن افسوس کہ ائمہ مساجد آج اس بات کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ اقامت کہنے کے ساتھ ہی نماز شروع کر دی جاتی ہے۔ صفوں کی درستی نہیں کرائی جاتی۔ نماز میں ہر شخص کو اس طرح کھڑا ہونا چاہیے کہ اپنے ساتھ والے کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں پورا ملا ہو، درمیان میں کوئی خلا نہ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خلا پر کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”یقیناً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”صفوں کو قائم کرو اور کندھوں اور بازوؤں کو برابر کرو اور شکاف بند کرو اور اپنے ہاتھوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جاؤ اور شیطان کے لیے خالی جگہ نہ چھوڑو اور جو شخص صف کو ملائے گا اللہ تعالیٰ اسے ملائے گا اور جو صف کو کاٹے گا اللہ تعالیٰ اسے (اپنی رحمت سے) کاٹ دے گا۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف (۶۶۶)، نسائی، کتاب الإمامة: باب من وصل صفاً (۸۱۸)، حاکم (۲۱۳/۱)، امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور علامہ البانی رحمہ نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [صحیح الترغیب والترہیب (۴۹۲)]

امام منذری رحمہ اللہ اس حدیث میں موجود لفظ ”فرجات“ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”الْفُرُجَاتُ جَمْعُ فُرْجَةٍ وَ هِيَ الْمَكَانُ الْحَالِي بَيْنَ الْإِثْنَيْنِ“

”لفظ فرجات ”فرجۃ“ کی جمع ہے اور اس کا مطلب دو آدمیوں کے درمیان خالی جگہ ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صف میں شگاف بند کرنے چاہئیں اور دو آدمیوں کے درمیان خالی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ لہذا جو لوگ دو نمازیوں کے درمیان چار انگلیوں یا اس سے زیادہ فاصلہ کرتے ہیں، ان کا عمل درست نہیں، انہیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«لَقَدْ رَأَيْتُ أَحَدَنَا يُلْزِقُ مَنَكِبَهُ بِمَنَكِبِ صَاحِبِهِ وَ قَدَمَهُ بِقَدَمِهِ وَ لَوْ ذَهَبَتْ تَفَعَّلُ ذَلِكَ لَتَرَى أَحَدَهُمْ كَأَنَّهُ بَغْلٌ شُمُوسٌ» [ابن ابی شیبہ (۳۵۲۴)، (۳۰۸/۱)، فتح الباری (۲/۲۱۱)، عمدۃ القاری (۲۶۰/۵)]

”میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر کوئی اپنا کندھا اپنے ساتھی کے کندھے سے اور اپنا پاؤں اپنے ساتھی کے پاؤں سے چپکا دیتا تھا اور اگر تو آج کس کے ساتھ ایسا کرے تو ان میں سے ہر کسی کو دیکھے گا کہ وہ (ایسے بدکتا ہے) گویا وہ شریہ ٹچر ہے۔“

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ”اپنی صفوں کو قائم کرو (یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کہی) اللہ کی قسم تم ضرور اپنی صفیں سیدھی کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے درمیان مخالفت ڈال دے گا۔“ صحابی فرماتے ہیں: ”پھر میں نے دیکھا کہ نمازی اپنا کندھا اور بازو اپنے ساتھی کے کندھے اور بازو سے، اپنا گھٹنا اس کے گھٹنے سے اور اپنا ٹخنہ اس کے ٹخنے سے ملا دیتا تھا۔“ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب تسوية الصفوف (۶۶۲)، بخاری، کتاب الأذان: باب إلزاق المنكب بالمنكب والقدم بالقدم تعليقا، احمد (۴/۲۷۶)، ابن حبان (۳۹۶)، دارقطنی (۱/۲۸۲)]

ابو عثمان النہدی فرماتے ہیں:

”كُنْتُ فِيمَنْ ضَرَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَدَمَهُ لِإِقَامَةِ الصَّفِّ فِي الصَّلَاةِ“

[المحلی لابن حزم (۴/۵۸)، موسوعة فقه عمر بن الخطاب رضي الله عنه (ص/۴۴۵)، ابن ابی شیبہ (۳۵۳۰)، (۳۰۹/۱)، فتح الباری (۲/۲۱۰)]

”میں ان لوگوں میں تھا جنہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نماز میں صف قائم کرنے کے لیے پاؤں پر مارا تھا۔“

صالح بن کیسان سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

«لَأَنْ يَحْرَثُنْتَايَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَرَى فِي الصَّفِّ خَلَاءً وَ لَا أَسُدُّهُ» [عبد الرزاق (۲۴۷۳)،

(۵۷/۲)، ابن ابی شیبہ (۱/۳۳۳)، المحلی (۴/۵۹)]

”مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میرے دو دانت ٹوٹ جائیں اس بات سے کہ اگر میں صف میں شگاف دیکھوں اور اسے

بند نہ کروں۔“

درج بالا صحیح اور حسن احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز شروع کرتے وقت پہلے صفیں سیدھی کرنی چاہئیں۔ اگر صف میں کوئی خلا ہو تو اس کو بند کیا جائے۔ امام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ صفیں درست کرائے۔ ہر نمازی اپنے بھائی کے کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملائے اور اپنے بھائی کے ہاتھ میں نرم ہو جائے۔ جب صف درست ہو جائے تو امام نماز شروع کرے اور یہ عمل قیام ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ قیام میں تو کندھوں میں اور پاؤں میں وقفہ ہو اور رکوع میں ملانا شروع کر دیں۔ اسی طرح پاؤں کی صرف ایک انگلی نہیں بلکہ پورا قدم ملایا جائے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملایا کرتے تھے اور قدم ملانے سے شریر فخر کی طرح بدکنا نہیں چاہیے۔ پاؤں ملانے اور شکاف بند کرنے سے نمازی اللہ تعالیٰ سے اجر کا مستحق قرار پاتا ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عمل کی توفیق بخشے اور ہمیں ہر قسم کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھے۔

صف میں اکیلے کھڑے ہونا

(سوال) اگر صف میں جگہ نہ ہونے کے باعث نمازی تھا صف بنا لے تو کیا نماز ہو جائے گی؟

(جواب) اگلی صف میں جگہ ہو تو پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کرنی چاہیے، اگر کوئی آدمی اس صورت میں نماز ادا کرے تو اسے نماز دہرائی چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يُصَلِّيُ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهُ فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ»

[ابو داؤد، کتاب الصلاة : باب الرجل يصلی وحده خلف الصف (۶۸۲)، ابن ماجہ (۱۰۰۴)، مسند شافعی (۱۷۶)، عبد الرزاق (۲۴۸۲)، ابن ابی شیبہ (۱۹۲/۲)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو صف سے پیچھے اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔“

اگلی صف میں سے کسی کو پیچھے کھینچ لانے کے متعلق صحیح حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی اوسط میں جو روایت پیچھے کھینچ کر لانے کے متعلق ہے اس کی سند میں بشر بن ابراہیم راوی نہایت ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [تلخیص الحبیبر (۳۷/۲)، مجمع الزوائد (۹۶/۲)]

ہمارے معاشرے میں عام طور پر جو یہ بات معروف ہو رہی ہے کہ جماعت ہو رہی ہو اور صف میں جگہ نہ ہو تو اگلی صف میں سے ایک آدمی نماز کے لیے پیچھے کھینچ کر ساتھ ملا لیں، اس کا ثبوت صحیح حدیث میں نہیں ہے بلکہ صف توڑنا درست ہی نہیں، کیونکہ حدیث ہے:

«مَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللَّهُ وَ مَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللَّهُ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة، باب تسوية

الصفوف (۶۶۶)]

”جس نے صف کو ملایا اللہ اس کو ملائے گا اور جس نے اسے کاٹا اللہ تعالیٰ اسے کاٹے گا۔“

گزشتہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ صف میں اکیلے نماز پڑھنے سے دوبارہ نماز ادا کرنی پڑے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اگلی صف میں جگہ موجود ہے پھر بھی پیچھے اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے دوبارہ نماز ادا کرنا ہوگی لیکن اگر اگلی صف میں جگہ ہی

نہیں پھر یہ پیچھے اکیلے نماز پڑھ لیتا ہے تو ان شاء اللہ اس کی نماز صحیح ہوگی۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ اور علامہ ناصر الدین البانی رحمہما اللہ نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف نقل کیا ہے۔ [دیکھیے: فتح الباری (۲/۲۱۳)، سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ (۳۲۲/۲)]

امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، امام اسحاق، امام ابو حنیفہ اور امام داؤد رحمہم اللہ ظاہری کا یہی مذہب ہے کہ صف سے آدمی نہ کھینچا جائے۔ [المجموع (۴/۲۹۹)]

امامت کا مستحق کون ہے؟

(سوال) امامت کا کیا معیار ہے اور امامت کا سب سے زیادہ کون حق دار ہے؟

(جواب) اس کے متعلق سیدنا ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَوْمَ الْقَوْمِ أَقْرَأَهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمَهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمَهُمْ هِجْرَةَ فَإِنْ كَانُوا فِي الْهَجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمَهُمْ سِلْمًا وَلَا يَوْمَنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ وَلَا يَقْعُدُ فِي بَيْتِهِ عَلَى تَكْرِمَتِهِ إِلَّا بِأَذْنِهِ» [مسلم، کتاب المساجد: باب من احق بالإمامة (۶۷۳)]

”لوگوں کا امام وہ ہونا چاہیے جو ان میں اچھی طرح قرآن کی قراءت جانتا ہو۔ اگر وہ قراءت میں برابر ہوں تو پھر وہ امامت کرائے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ان میں سے ہجرت میں مقدم ہو، اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو۔ کوئی آدمی دوسرے آدمی کی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کے اپنے بیٹھنے والی جگہ بیٹھے مگر اس کی اجازت لے کر۔“

حدیث کے بعض طرق میں اسلام کی جگہ عمر کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قاری قرآن پھر سنت کے عالم کا علی الترتیب امامت کے لیے انتخاب ہونا چاہیے اور جو امام منتخب ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے امامت کرائے کیونکہ اس کے پیچھے بچے، ضعیف، بیمار، مسافر اور مختلف قسم کے افراد ہوتے ہیں، لہذا نہ زیادہ لمبی نماز پڑھائے اور نہ اس قدر مختصر ہی ہو کہ قیام، رکوع و سجود وغیرہ کا بھی خیال نہ رکھے۔

نوٹ: یاد رہے کہ حنفی حضرات نے امامت کے متعلق کچھ لایعنی، فضول اور مضحکہ خیز شرائط ذکر کی ہیں جیسا کہ درمختار میں امامت کے بیان میں امام کی مختلف شرائط ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا گیا کہ امام کی بیوی سب سے حسین ہو، امام کا سر بڑا ہو، امام کا آلہ تناسل چھوٹا ہو وغیرہ۔ یہ شرائط انتہائی مضحکہ خیز اور باعث عار ہیں جن کا کتاب و سنت میں کہیں بھی وجود نہیں پایا جاتا، نہ کسی صحیح سند سے اور نہ کسی ضعیف سند ہی سے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب و سنت جیسی عظیم شاہراہ پر قائم رکھے۔ (آمین!)

ننگے سرجماعت کرانے کا حکم

سوال کیا کوئی آدمی ننگے سرجماعت کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو دلائل سے آگاہ کریں۔

جواب حافظ عبدالمنان نورپوری رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں: ”ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِحِمَارٍ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب المرأة تصلی بغیر حمار (۶۴۱)]
 ”اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی ننگے سر نماز کو قبول نہیں کرتا۔“

یہ حدیث صحیح ہے۔ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح ابن ماجہ اور صحیح ابوداؤد میں درج فرمایا ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بالغ عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ مرد اور نابالغ عورت کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے، لہذا اگر کوئی مرد ننگے سر نماز پڑھتا ہے تو اس سے الجھنا نہیں چاہیے۔ ننگے سر نماز پڑھنے والے کو بھی غور کرنا چاہیے کہ ننگے سر نماز پڑھنے میں سر ڈھک کر نماز پڑھنے سے کوئی زیادہ ثواب نہیں ملتا کہ اس عمل پر اصرار کرے، الغرض سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی پابندی بالغ عورت کے لیے ہے، مرد کے لیے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی فرضیت کتاب و سنت میں کہیں وارد نہیں ہوئی، ﴿لَا تَزِينُكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الاعراف: ۳۱] مرد کے لیے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کی فضیلت پر استدلال درست نہیں۔ (ہذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب) (احکام و مسائل: ۱۰۱)

حافظ عبدالمنان نورپوری رحمۃ اللہ علیہ کا جواب بالکل صحیح اور درست ہے، جب کتاب و سنت میں کہیں بھی مرد کے لیے سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کی پابندی وارد نہیں ہوئی تو نمازی خواہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد اس کی نماز ننگے سر درست ہوگی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ننگے سر نماز نہیں ہوتی وہ اپنے اس دعویٰ کی کوئی صحیح دلیل پیش کریں۔ انھوں نے مساجد میں ایسی فضول اور عبث ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں جنھیں پہن کر خود مسجد سے باہر جانا بھی پسند نہیں کرتے وہ پہن کر نماز ادا کرتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی مونڈ کر کبھی نماز نہیں پڑھی تو کیا یہ لوگ فتویٰ صادر کریں گے کہ ننگے منہ یعنی داڑھی منڈے کی نماز نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ دین کا صحیح فہم عطا کرے اور کتاب و سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

داڑھی کٹوانے والے کو مستقل امام بنانا

سوال ہماری مسجد کے امام صاحب اپنی داڑھی کو کٹواتے ہیں اور ان کی داڑھی ایک مٹھی سے بھی کم ہے، کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز ادا کرنا جائز ہے یا نہیں اور ایسے شخص کو امام بنانا کیسا ہے؟

جواب امام مسجد ایسا ہونا چاہیے جو شریعت کی صحیح طور پر پیروی کرنے والا ہو اور کتاب و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو اور سب سے زیادہ قرآن و سنت کا عالم ہو۔ داڑھی رکھنا مسلمان مرد پر واجب ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی بڑھانے

کا حکم دیا ہے جیسا کہ فرمایا:

« خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ وَفِرُّوا اللَّحَى وَأَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَفِي رِوَايَةٍ أَنَّهُمْ كَوُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللَّحَى » [بخاری، کتاب اللباس: باب تغلیم الأظفار و باب إعفاء اللحی

(۵۸۹۳)، (۵۸۹۳)]

”مشرکوں کی مخالفت کرو، داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔“ اور ایک روایت میں ہے۔ ”مونچھیں اچھی طرح کاٹو اور داڑھی بڑھاؤ۔“

اور خود رسول اللہ ﷺ کی داڑھی گھٹی تھی۔ نہ آپ نے داڑھی کاٹی اور نہ کانٹے کا حکم دیا، لہذا نبی ﷺ کا حکم ماننا واجب ہے۔ تو امام مسجد کو چاہیے کہ وہ اپنی داڑھی پوری رکھے۔ داڑھی منڈانے اور کٹانے والا فاسق و فاجر ہے، ایسے آدمی کو مستقل امام نہ بنائیں۔ البتہ ایسا شخص اگر کبھی نماز پڑھا دے تو اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی کیونکہ فاسق و فاجر کے پیچھے بالاتفاق نماز ہو جاتی ہے۔ امام مسجد کو اچھے طریقے سے سمجھائیں اگر وہ سمجھانے کے باوجود مکمل داڑھی نہیں رکھتا تو اس کا متبادل کوئی بہتر سوچ لیں اور اچھے طریقے سے اور حکمت کے ساتھ فیصلہ کریں، کسی فتنے کا پیش خیمہ نہ بنیں۔

کیا غیر ذمہ دار شخص امامت کے لائق ہے؟

(سوال) جو شخص کسی ہمسایہ کے گھر میں تاک جھانک کرے، کیا وہ امامت کرانے کا اہل ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) بشرط صحت سوال ایسا امام جو کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اسے امامت کا حق نہیں ہے۔ امام اعلیٰ صفات کا مالک ہونا چاہیے، جیسا کہ سنن الدارقطنی میں حدیث ہے کہ اپنے میں سے بہتر کو امام بناؤ اور ناجائز تاک جھانک شرعاً حرام ہے اور فعل حرام کا ارتکاب بالخصوص امام کے لیے تو قطعاً درست نہیں اور ایسا امام تو مقتدیوں کی نظر میں بھی مقام کھو دیتا ہے اور مقتدی اس سے کراہت کرنے لگ جاتے ہیں، اس کے متعلق یہ حدیث پیش نظر رہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تمین آدمیوں کی نماز ان کے سروں سے اوپر ایک بالشت بھی نہیں اٹھائی جاتی، ایک وہ شخص جو قوم کی امامت کروانا ہے اور وہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور وہ عورت جو رات اس حال میں گزارے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو، اور وہ دو بھائی جو آپس میں ناراض ہیں۔“ [ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلوات: باب من أم قرما وهم له كارهون (۹۷۱)]

اس حدیث کو امام نووی، امام عراقی اور علامہ بوصیری نے حسن اور صحیح قرار دیا ہے اور شیخ البانی رضی اللہ عنہ نے مشکوٰۃ کی تحقیق میں اسے شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے اور یہ یاد رہے کہ امام کے ساتھ تعصب مذہبی اور بلا وجہ کوئی عداوت نہ ہو۔ علامہ البانی رضی اللہ عنہ

اس حدیث پر لکھتے ہیں:

”امام کی نماز اوپر اس لیے نہیں اٹھائی جاتی کہ وہ امامت کے حق کو قائم نہیں کر رہا اور جب مقتدیوں کا اس کے ساتھ معاملہ مذہبی تعصب کی وجہ سے ہو تو یہ چیز اس میں داخل نہیں۔“ [تحقیق ثانی مشکوٰۃ، کتاب الصلاة: باب الإمامة: (۱۱۲۸)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام شرعی عذر کی بنا پر مقتدیوں کے ہاں ناپسندیدہ ہو جائے تو وہ امامت کے حق کو قائم نہیں کر رہا، اسے اس صورت میں امام رہنے کا حق نہیں۔ مسجد کی انتظامیہ کو چاہیے کہ ایسے امام کی کوتاہی پر اسے متنبہ کریں اور اخلاص کے ساتھ اس کی اصلاح کریں، اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو اسے امامت سے معزول کر دیں اور کسی مخلص، دیانتدار اور شریف شخص کا امامت کے لیے انتخاب کریں جو قرآن حکیم اور حدیث رسول اللہ ﷺ کا علم رکھنے کے ساتھ ساتھ باعمل بھی ہو۔

امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ

سوال مقتدی کے لیے امام کی اقتدا کا صحیح طریقہ سنت رسول کی روشنی میں بیان فرمادیں؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَبَادِرُوا الْإِمَامَ إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا وَإِذَا قَالَ وَ لَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا وَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُولُوا اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ » [مسلم، کتاب الصلاة: باب النهی عن مبادرة الامام بالتكبير وغيره (۴۱۵)]

”امام سے جلدی نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو، جب وہ ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو آمین کہو۔ جب رکوع کرے تو تم رکوع کرو، جب ﴿سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ﴾ کہے تو تم ﴿اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ﴾ کہو۔“ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا وَلَا تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا وَلَا تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ وَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُولُوا اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا وَلَا تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ » [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب الإمام يصلی من قعود (۶۰۳)]

”جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور تکبیر نہ کہو یہاں تک کہ وہ تکبیر کہے اور جب رکوع کرے تو رکوع کرو اور رکوع نہ کرو حتیٰ کہ وہ رکوع کرے اور جب وہ ﴿سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ﴾ کہے تو تم ﴿اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ﴾ کہو اور جب سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو اور جب وہ سجدہ نہ کرے تو تم سجدہ نہ کرو۔“

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے ”رسول اکرم ﷺ کی نماز“ میں لکھا ہے:

”حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب امام تکبیر کہے چکے تو مقتدی اس کے بعد تکبیر کہے، جب امام سجدے میں چلا

جائے تو تم سجدے میں جاؤ۔ جب امام سر اٹھا چکے تو تم سر اٹھاؤ۔ جب وہ ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہہ چکے تو تم ”رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ“ کہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مقتدی کو ہر فعل اس وقت کرنا چاہیے جب امام وہ کام کر چکے۔ نہ امام سے پہلے جانا چاہیے نہ اس کے ساتھ بلکہ امام کے بعد وہ رکن ادا کرے، متابعت کرے یعنی پیچھے پیچھے چلے۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ارکان ادا کرنے میں امام سے سبقت کر رہا تھا، فرمایا: ”تم نے نہ تنہا نماز پڑھی نہ امام کی اقتدا میں۔“ [بحوالہ رسالہ الصلاة لاحمد]

نیز عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

”انہوں نے ایک شخص کو امام سے سبقت کرتے دیکھا تو فرمایا: ”تم نے نہ اکیلے نماز ادا کی نہ امام کی اقتدا میں۔“

اسے مارا اور کہا: ”نماز لوٹاؤ۔“ [رسالہ الصلاة (ص ۳۵۲) مجموعة الحديث]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسی نماز کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: «إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا» کا مطلب یہ ہے کہ امام کی تکبیر ختم ہو جائے پھر مقتدی تکبیر کہے۔ لوگ جہالت کی وجہ سے غلطی کرتے ہیں اور نماز کے معاملے کو ہلکا سمجھتے ہیں، امام ہی کیساتھ تکبیر کہنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ غلطی ہے۔“ [رسالہ الصلاة لاحمد (ص ۲۵۲)]

امام احمد رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر بڑے بسط و تفصیل سے لکھا ہے کہ امام سے پہلے یا امام کے ساتھ تمام ارکان ادا کرنا غلط ہے۔ امام جب رکوع و سجدہ میں چلا جائے اور اس کی تکبیر کی آواز ختم ہو جائے تو مقتدی کو اس وقت رکوع و سجود وغیرہ امور شروع کرنے چاہئیں۔ ہمارے ملک میں یہ غلطی عام ہے، تمام طبقات یہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر سبقت نہ کریں تو امام کے ساتھ ضرور ادا کرتے ہیں، حالانکہ یہ صاف حدیث کے خلاف ہے، خطرہ ہے کہ نماز ضائع ہو جائے گی۔ امام کی اطاعت کا شرعاً یہی مطلب ہے کہ تمام ارکان وغیرہ امام پہلے ادا کرے۔ مقتدی اس وقت شروع کرے جب امام رکن میں مشغول ہو جائے۔ حدیث کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ امام سے سبقت درست ہے، نہ امام کی معیت بلکہ امام جب کسی رکن میں مشغول ہو جائے اس کے بعد مقتدی امام کے ساتھ شریک ہو۔

تعب ہے کہ تمام مکاتب فکر اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ بریلوی حضرات تو بدعات میں اس قدر محو ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو سنت کی محبت سے خالی کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت نئی سے نئی بدعتوں کی تلاش میں پریشان ہیں۔ اہل حدیث حضرات اور دوسرے موحد گروہ بھی اس غلطی میں از اول تا آخر مبتلا ہیں، الا کہ جس پر اللہ نے رحم کیا ہے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ کا ارشاد کس قدر درست ہے:

”لَوْ صَلَّيْتَ فِي مِائَةِ مَسْجِدٍ مَا رَأَيْتَ أَهْلَ مَسْجِدٍ وَاحِدٍ يُفِيمُونَ الصَّلَاةَ عَلَى مَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَنْ أَصْحَابِهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ“ [رسالہ الصلاة لاحمد (ص ۱۵۴)]

(یہاں مولانا اسماعیل سلفی کا کلام ختم ہوا)

”آپ اگر سو مسجدوں میں نماز ادا کریں تو کسی میں بھی آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریق پر نماز نہیں ملے گی۔“

امام احمد رضی اللہ عنہ اور مولانا اسماعیل سلفی رضی اللہ عنہ نے ان احادیث کا جو مطلب بیان کیا ہے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے فرامین کا یہی مطلب سمجھا ہے اور اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« كُنَّا نَصَلِّيْ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ لَمْ يَحْنُ أَحَدٌ مِّنَّا ظَهْرُهُ حَتَّى يَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبْهَتَهُ عَلَى الْأَرْضِ » [بخاری، کتاب الأذان باب السجود على سبعة اعظم (۸۱۱)]

”ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ”سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہتے تو ہم میں سے کوئی بھی اپنی پشت نہیں جھکاتا تھا حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیشانی زمین پر رکھ لیتے تھے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی بھی آپ کے زمین پر پیشانی رکھنے سے پہلے اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا تھا۔ کیا اب بھی کوئی ایسی مسجد ملتی ہے جس میں تمام لوگ اتنے حوصلے والے ہوں کہ ایک شخص بھی امام کے زمین پر پیشانی رکھنے تک اپنی پیٹھ کو نہ جھکائے۔ کم از کم مجھے تو نہیں ملی۔ ہاں اللہ کی رحمت سے امید ضرور ہے کہ اگر ہم پوری کوشش کریں اور اپنے بھائیوں کو بار بار سمجھائیں تو اس عمل پر پابندی شروع ہو جائے گی۔

جب حجاج بن یوسف کو مسلمانوں کی حکومت میں کوئی عہدہ حاصل نہیں ہوا تھا تو ایک دفعہ اس نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے پہلو میں نماز ادا کی اور امام سے پہلے سر اٹھانا اور اس سے پہلے سجدہ میں گرنا شروع کر دیا۔ جب اس نے سلام پھیرا تو سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے اس کی چادر کا کنارہ پکڑ لیا اور نماز کے بعد اذکار پڑھتے رہے۔ حجاج چھڑانے کی کوشش کرتا رہتا آتا نہ سعید رضی اللہ عنہ نے اپنے اذکار مکمل کر لیے پھر حجاج کی طرف متوجہ ہو کر اسے اس کی جلد بازی پر خوب تنبیہ کی اور ساتھ ہی نماز کے آداب سکھائے۔ حجاج نے ساری بات خاموشی سے سنی اور جواب میں کچھ نہ کہا۔ آخر ایک وقت آیا کہ وہ حجاج کا حاکم بن گیا۔ جب مدینہ میں آیا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا تو سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مجلس کا رخ کیا اور ان کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ”ایک دن وہ باتیں تم ہی نے کی تھیں؟“ سعید رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا: ”ہاں! میں ہی نے کی تھیں۔“ حجاج نے کہا: ”آپ جیسے معلم اور ادب سکھانے والے کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کے بعد میں نے جو نماز بھی پڑھی آپ کی بات مجھے ضرور یاد آتی رہی۔“ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ [البداية والنهاية (۱۹۹/۹)]

اسی تادیب کا اثر تھا کہ حجاج کے ہاتھ سے بھلے بھلے لوگ محفوظ نہیں رہے مگر اس نے سعید رضی اللہ عنہ کے ادب سکھانے کا ہمیشہ خیال رکھا اور انھیں کبھی نہ پریشان کیا اور نہ کوئی تکلیف ہی پہنچائی۔ ہمیں بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے ساتھ نماز پڑھنے والا اگر اس قسم کی جلد بازی کرے تو اسے سمجھائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرمادے اور اس کی درست نمازوں اور نیک دعاؤں میں ہمارا حصہ بھی شامل ہو جائے، اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو ہم ادائے فرض سے تو سبکدوش ہو جائیں گے۔

امام سے پہلے کرنا

(سوال) نماز میں امام سے پہلے کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) امیر کی اطاعت تو مدت ہوئی مسلمانوں سے چھن چکی۔ نہ ان کا کوئی امیر المؤمنین ہے جس کی اطاعت کو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سمجھیں، نہ انھیں اسے حاصل کرنے کی کوئی فکر ہے (الامام شاء اللہ)، لے دے کر نماز کے امام کی صورت میں انھیں پانچ وقت اطاعت کا سبق یاد کرایا جاتا ہے اور ان سے دنیا کے تمام کام چھڑوا کر اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر امام کی اقتدا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ اب تمہاری ہر حرکت امام کی حرکت کے بعد ہونی چاہیے، اس سے پہلے کوئی حرکت تمہارے لیے جائز نہیں مگر اکثر مسلمان نافرمانی کے ایسے خوگر ہو چکے ہیں کہ نہ انھیں اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر کوئی فکر ہے نہ عقل کے تقاضوں کی خلاف ورزی پر، وہ ہر رکن امام سے پہلے کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر سخت سزا سے ڈرایا ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَمَا يَخْشَى الَّذِي يَرْفَعُ رَأْسَهُ قَبْلَ الْإِمَامِ أَنْ يُحَوَّلَ اللَّهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ؟» [بخاری، کتاب الأذان: باب إثم من رفع رأسه قبل الامام (۶۹۱)، مسلم (۴۲۷)]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر میں نہ بدل دے؟“

نماز کی حالت میں امام سے پہلے کرنا عقل کے تقاضوں کے بھی سراسر خلاف ہے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے فتح الباری میں ایک نکتہ نقل فرمایا ہے کہ اگر غور کریں تو امام سے آگے بڑھنے کی کوئی بھی وجہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ نماز سے جلدی فراغت حاصل ہو جائے۔ اس جلد بازی کا علاج یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ وہ امام کے فارغ ہونے سے پہلے تو نماز سے نکل ہی نہیں سکتا پھر یہ جلد بازی کیوں؟ امام کی پیروی اور اس سے پہلے نہ کرنے کی ایک اور حدیث درج ذیل ہے:

«عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّا فَضِي صَلَاتُهُ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ! إِنِّي إِمَامُكُمْ وَلَا تَسْبِقُونِي بِالرُّكُوعِ وَلَا بِالسُّجُودِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا بِالْإِنْصِرَافِ فَإِنِّي أَرَاكُمْ أَمَامِي وَمِنْ خَلْفِي» [مسلم، کتاب الصلاة باب تحريم سبق الإمام بر كوع أو سجود و نحوهما (۴۲۶)]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ہمیں نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر اپنا چہرہ ہماری طرف پھیر کر فرمایا: ”لوگو! میں تمہارا امام ہوں، تم مجھ سے نہ رکوع میں پہل کرو، نہ سجدے میں، نہ قیام میں اور نہ منہ پھیرنے میں کیونکہ میں تمہیں اپنے سامنے سے اور پیچھے سے دیکھتا ہوں۔“

ایک مسجد میں دو جماعتیں

(سوال) کیا جماعت ہو جانے کے بعد رہ جانے والے افراد دوسری جماعت کروا سکتے ہیں؟ کچھ لوگ اسے مکروہ خیال کرتے ہیں۔

(جواب) ایک ہی مسجد میں دو بار جماعت کرانے کا جواز صحیح احادیث میں موجود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور فقہاء و محدثین رضی اللہ عنہم کا اس پر عمل رہا ہے۔

① سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبْصَرَ رَجُلًا يُصَلِّي وَحْدَهُ فَقَالَ أَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلَيَّ

هَذَا فَيُصَلِّي مَعَهُ» [ابو داؤد، كتاب الصلاة: باب في الجمع في المسجد مرتين (٥٧٤)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا ایسا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«أَيُّكُمْ يَتَجَرَّ عَلَيَّ هَذَا؟ فَقَامَ رَجُلٌ فَصَلَّى مَعَهُ» [ترمذی، كتاب الصلاة: باب ما جاء في الجماعة

في مسجد قد صلى فيه (٢٢٠)، احمد (٨٥٠٦٤/٣)، ابو يعلى (٣٢١/٢)، نصب الراية (٥٧/٢)، حاكم (٢٣٨/٤)، طبرانی صغیر (٢١٨/١)]

”تم میں سے کون شخص ہے جو اس کے ساتھ اجرت میں شریک ہو؟“ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔“

علامہ زیلعی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نصب الراية“ میں اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”قوت المغتذی“ میں لکھا ہے: ”جس آدمی نے اس آدمی کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز ادا کی تھی وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوسری جماعت ایک ہی مسجد میں جائز ہے اور اگر کوئی شخص اس وقت مسجد میں آئے جب جماعت ہو چکی ہو تو وہ دوبارہ کسی کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کرے تو یہ صحیح، مشروع اور جائز ہے اور آپ کا گزشتہ فرمان اس پر شاہد ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم سمجھا اور وہ اس کے قائل و فاعل تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں لکھا ہے:

«جَاءَ أَنَسٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إِلَى الْمَسْجِدِ قَدْ صَلَّى فِيهِ فَأَذَّنَ وَأَقَامَ وَصَلَّى جَمَاعَةً» [بخاری

تعلیقاً، كتاب الأذان: باب فضل صلاة الجماعة- ابن ابی شیبہ (١٤٨/١)]

”سیدنا انس رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے، جماعت ہو چکی تھی تو انھوں نے اذان و اقامت کہی اور جماعت سے نماز پڑھی۔“

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی گزشتہ حدیث کے متعلق رقمطراز ہیں:

”وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّهُ يَجُوزُ لِمَنْ صَلَّى فِي جَمَاعَةٍ أَنْ يُصَلِّيَهَا تَأْنِيًا مَعَ جَمَاعَةٍ آخَرِينَ وَأَنَّهُ

يَجُوزُ إِقَامَةُ الْجَمَاعَةِ فِي مَسْجِدٍ مَرَّتَيْنِ وَهُوَ قَوْلٌ غَيْرٌ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ“

[شرح السنة (٤٣٦/٣)]

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لی ہو، اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری مرتبہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اسی طرح مسجد میں دوبارہ جماعت قائم کرنا بھی جائز ہے۔ یہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔“

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَلَا يُكْرَهُ إِعَادَةُ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسْجِدِ وَمَعْنَاهُ أَنَّهُ صَلَّى إِمَامُ الْحَيِّ وَحَضَرَهَا جَمَاعَةٌ أُخْرَى اسْتَحَبَّ لَهُمْ أَنْ يُصَلُّوا جَمَاعَةً وَهَذَا قَوْلُ ابْنِ مَسْعُودٍ وَعَطَاءٍ وَالْحَسَنِ وَالنَّحْيِيِّ وَقَتَادَةَ وَإِسْحَاقَ“ [المغنی (۱۰/۳)]

”ایک مسجد میں دوبارہ جماعت کروانا مکروہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب محلے کے امام نے نماز پڑھ لی اور دوسری جماعت حاضر ہو گئی تو ان کے لیے مستحب ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عطاء رضی اللہ عنہ، نخعی، قتادہ اور اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔“

پھر امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ذکر کی ہے۔

② « عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَضَّلُ صَلَاةَ الْجَمِيعِ

عَلَى صَلَاةِ الْوَاحِدِ خَمْسٌ وَعِشْرُونَ دَرَجَةً » [بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: ان قرآن الفجر كان مشهودا (۴۷۱۷)، مؤطا (۲۹/۱)، نسائی (۲۴۱/۱)، ترمذی (۲۱۶)، ابن ماجہ (۷۸۷)، دارمی (۲۳۵/۱)، ابو عوانہ (۲/۲)، ابن خزیمہ (۳۶۴/۲)]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جماعت کی نماز کی فضیلت اکیلے آدمی کی نماز پر ۲۵ درجے زیادہ ہے۔“

یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے پہلی اور دوسری دونوں جماعتوں کو شامل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی پہلی جماعت فوت ہو جائے تو وہ دوسری جماعت کے ساتھ نماز ادا کر لے تو مذکورہ فضیلت پالے گا۔

③ « عَنْ الْجَعْدِ أَبِي عَثْمَانَ قَالَ مَرَّ بِنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي مَسْجِدِ بَنِي نَعْلَبَةَ

فَقَالَ أَصَلَيْتُمْ؟ قَالَ: قُلْنَا نَعَمْ وَذَلِكَ صَلَاةُ الصُّبْحِ فَأَمَرَ رَجُلًا فَادَّانَ وَاقَامَ ثُمَّ صَلَّى بِأَصْحَابِهِ » [ابو یعلیٰ (۴۳۵۵)، ابن ابی شیبہ (۳۲۱/۲)، بیہقی (۷۰/۳)، مجمع الزوائد (۴/۲)، عبدالرزاق (۲۹۱/۲)]

”حضرت ابو عثمان الجعد سے مروی ہے کہ بنو نعلبہ کی مسجد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزرے تو انھوں نے کہا: ”کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟“ تو کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ”ہاں!“ اور وہ صبح کی نماز تھی۔ آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا، اس نے اذان اور اقامت کہی پھر اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی۔“

﴿ اِنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَ قَدْ صَلَّوْا فَجَمَعَ بِعَلْقَمَةَ وَ مَسْرُوْقٍ وَ

الْاَسْوَدَ ﴾ [أبكار المنن (ص ۲۵۳) اس کی سند صحیح ہے۔ مرعاة شرح مشکوٰۃ (۴/۱۰۴)]

”سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں نے نماز پڑھ لی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے علقمہ، مسروق اور اسود کو جماعت کرائی۔“

مذکورہ بالا صریح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ مسجد میں دوسری جماعت کرو لینا بلا کراہت جائز و درست ہے اور یہ موقف اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

مسجد میں دوسری جماعت کو مکروہ سمجھنے والوں کے دلائل:

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

﴿ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَقْبَلَ مِنْ بَعْضِ نَوَاحِي الْمَدِيْنَةِ يُرِيْدُ الصَّلَاةَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا فَاَنْصَرَفَ اِلَى مَنْزِلِهِ فَجَمَعَ اَهْلَهُ ثُمَّ صَلَّى بِهِمْ ﴾ [مجمع الزوائد (۲/۴۸)، طبرانی اوسط (۴۷۳۹)، الكامل لابن عدی (۶/۲۳۹۸)، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔] تمام المنة (ص ۱۵۵)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اطراف سے تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کرنا چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر چلے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر والوں کو جمع کیا پھر ان کے ساتھ نماز پڑھی۔“

اور علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کو طبرانی نے معجم کبیر و اوسط میں بیان کیا ہے۔ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اس سے یہ دلیل لی جاتی ہے کہ اگر دوسری جماعت بلا کراہت جائز ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی فضیلت کو ترک نہ کرتے یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت عام مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہت زیادہ ہے۔ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے:

اَدْلًا: مولانا عبید اللہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

”اس حدیث سے دوسری جماعت کی مکروہیت پر دلیل پکڑنا محل نظر ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث اس بارے میں نص نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گھر میں نماز پڑھائی ہو بلکہ اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز مسجد میں پڑھائی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر کی طرف جانا گھر والوں کو جمع کرنے کے لیے تھا نہ کہ گھر میں جماعت کروانے کے لیے۔ تو اس صورت میں یہ حدیث اس مسجد میں جس کا مؤذن و امام متعین ہو، دوسری جماعت کے استحباب کی دلیل ہوگی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کو گھر ہی میں جماعت کرائی تو اس سے مسجد میں دوبارہ جماعت کی کراہت ثابت نہیں ہوتی بلکہ انتہائی آخری بات جو ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک آدمی ایسی مسجد میں آئے جس میں جماعت ہو چکی ہو تو اس کو چاہیے کہ اس مسجد میں نماز نہ پڑھے بلکہ اس سے نکل کر گھر چلا جائے اور گھر میں اپنے اہل کے ساتھ نماز پڑھے۔“

بہر حال اس کے لیے مسجد میں دوسری جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو مکروہ کہنا اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ یہ حدیث بعد میں آنے والے اکیلے آدمی کی اس مسجد میں نماز کی کراہت پر دلالت نہیں کرتی۔ اگر اس حدیث سے مسجد میں دوبارہ جماعت کے مکروہ ہونے پر دلیل لی جائے تو پھر اس سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ اکیلے بھی اس مسجد میں نماز نہ پڑھے۔“ [مرعاۃ المفاتیح (۱۰۵/۴)]

ثانیاً: اگرچہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے مگر یہ محل نظر ہے، کیونکہ اس کی سند میں بقیہ بن الولید مدلس راوی ہے اور یہ تدلیس التوسیہ کرتا ہے جو انتہائی بڑی تدلیس ہے اور اس کی تصریح بالسماع مسلسل نہیں ہے۔ دوسری جماعت کو مکروہ خیال کرنے والوں کی دوسری دلیل:

«عَنِ اِبْرَاهِيْمَ اَنَّ عَلْقَمَةَ وَ الْاَسْوَدَ اَقْبَلَا مَعَ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اِلَى مَسْجِدٍ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّاسُ قَدْ صَلَّوْا فَرَجَعَ بِهِمْ اِلَى الْبَيْتِ فَجَعَلَ اَحَدُهُمَا عَنْ يَمِيْنِهِ وَ الْاٰخَرَ عَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ صَلَّى بِهِمَا» [عبد الرزاق (۳۸۸۳)، (۴۰۹/۲)، طبرانی کبیر (۹۳۸۰)]

”ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ علقمہ اور اسود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف آئے تو لوگ انھیں اس حالت میں ملے کہ انھوں نے نماز پڑھ لی تھی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلے گئے۔ انھوں نے ایک کو دائیں جانب اور دوسرے کو بائیں جانب کیا پھر ان کو نماز پڑھائی۔“

اس روایت کی سند میں حماد بن ابی سلیمان ہیں جو مختلط اور مدلس تھے۔ [طبقات المدلس (۳۰)]

اور یہ روایت معتن ہے اور مدلس راوی کی عن عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ نیز حماد کے اختلاط سے قبل تین راویوں کی روایت حجت ہوتی ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ لَا يَقْبَلُ مِنْ حَدِيثِ حَمَادٍ اِلَّا مَا رَوَاهُ عَنْهُ الْقَدَمَاءُ شُعْبَةَ وَ سُفْيَانَ الثَّوْرِيَّ وَ الدَّسْتَوَائِيَّ وَ مَنْ عَدَا هَؤُلَاءِ رَوَوْا عَنْهُ بَعْدَ الْاِخْتِلَاطِ“ [مجمع الزوائد (۱۲۵/۱)]

”حماد بن ابی سلیمان کی وہ روایت قبول کی جائے گی جو اس سے قدام یعنی اختلاط سے پہلے والے راویوں کی روایت ہوگی جیسے شعبہ، سفیان ثوری اور ہشام دستوائی اور جو ان کے علاوہ اس سے روایت کریں وہ بعد از اختلاط ہے۔“

تقریباً یہی بات امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔ [شرح علل ترمذی لابن رجب (ص ۳۲۶)]

اور یہ روایت حماد سے معمر نے بیان کی ہے لہذا یہ بھی قابل حجت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دونوں شاگردوں کو دائیں بائیں کھڑا کر کے جماعت کرائی اور یہ بات احناف کو مسلم نہیں جیسا کہ محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ شاگرد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ [کتاب الآثار لمحمد بن حسن (ص ۶۹/ مترجم)]

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مسجد میں دوبارہ جماعت کروانا صحیح سند کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ لہذا مذکورہ بالا توضیحات سے معلوم ہوا کہ دوسری جماعت کی کراہت کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں بلکہ صحیح روایات سے دوسری

جماعت کا جواز نکلتا ہے اور یہی جواز والا مذہب زیادہ درست ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فَارْجَحُ الْأَقْوَالَ عِنْدَنَا هُوَ أَنَّهُ يَجُوزُ وَيَبَاحُ مَنْ أَتَى مَسْجِدًا قَدْ صَلَّى فِيهِ بِإِمَامٍ رَاتِبٍ وَهُوَ لَمْ يَكُنْ صَلَّاهَا وَقَدْ فَاتَتْهُ الْجَمَاعَةُ لِعُذْرٍ أَنْ يُصَلِّيَ بِالْجَمَاعَةِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ“ [مرعاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح (۱۰۷/۴)]

”ہمارے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ جو آدمی مسجد میں اس حال میں پہنچا کہ امام معین کے ساتھ نماز ادا ہو چکی ہو اور اس نے وہ نماز نہیں پڑھی اور عذر کی بنا پر اس کی جماعت فوت ہو گئی تو اس کے لیے جائز و مباح ہے کہ وہ دوسری جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔“

بہر صورت یہ یاد رہے کہ بغیر عذر کے جماعت سے پیچھے رہنا اور خواہ مخواہ سستی و کاہلی کا شکار ہو کر دوسری جماعت کا رواج ڈالنا درست نہیں کیونکہ دوسری جانب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی بہت تاکید وارد ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے تھے کہ مومنوں کی نماز اکٹھی ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لَقَدْ أَعْجَبْنِي أَنْ تَكُونَ صَلَاةُ الْمُؤْمِنِينَ وَاحِدَةً حَتَّى لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَبْتَ رِجَالًا فِي الدُّورِ يُنَادُونَ النَّاسَ بِحِجِينِ الصَّلَاةِ“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة، باب كيف الأذان (۵۰۶)، ابن خزيمة (۱۹۹/۱)]

”مجھے یہ بات پسند ہے کہ مومنوں کی نماز ایک ہو یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ کچھ آدمیوں کو مخلوں میں پھیلا دوں اور وہ لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دیں۔“

اس کے علاوہ بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تاکید میں کئی ایک صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمیں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، سوائے شرعی عذر کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے، کیونکہ اگر ہم گھر سے نماز باجماعت کے ارادے سے نکلتے ہیں اور ہمارے آتے آتے نماز فوت ہو جاتی ہے تو مسجد میں آ کر ادا کرنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے:

”مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ وَضُوءَهُ ثُمَّ رَاحَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا أَعْطَاهُ اللَّهُ مِثْلَ أَجْرٍ مَنْ صَلَّاهَا وَحَضَرَهَا لَا يَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ أَجْرِهِمْ شَيْئًا“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب في من خرج يريد الصلاة فسبق بها (۵۶۴)، نسائی (۱۱۱/۲)، شرح السنة (۳۴۲/۳)، حاکم (۲۰۸/۱)، تاریخ کبیر للبخاری (۴۶/۸)، احمد (۳۸۰/۳)، امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ یہ روایت حسن ہے۔ [نیل المقصود (۵۶۴)] اور اس کا ابو داؤد میں ایک شاہد بھی ہے۔ ملاحظہ ہو (۵۶۳)، نیز شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابو داؤد (۵۲۸)]

”جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا پھر چل پڑا (مسجد کی طرف) اس نے لوگوں کو پایا کہ انہوں نے نماز پڑھ لی ہے تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو نماز باجماعت ادا کرنے اور اس میں حاضر ہونے والے کی طرح اجر دے گا اور ان کا اجر کم

نہیں ہوگا۔“

لہذا بغیر شرعی عذر کے جماعت سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور اگر کسی عذر کی وجہ سے جماعت سے رہ گیا تو اور افراد کے ساتھ مل کر دوسری جماعت کروالی تو بلا کراہت جائز ہے۔

میاں بیوی کا باجماعت نماز ادا کرنا

(سوال) کیا میاں بیوی جماعت کروا سکتے ہیں اور اس کی کیفیت کیا ہوگی؟

(جواب) میاں بیوی باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں اور جماعت کی صورت میں مرد اپنی بیوی کو اپنے ساتھ برابر کھڑا نہ کرے بلکہ اسے پیچھے کھڑا کرے کیونکہ عورت اکیلی صف کے حکم میں شمار ہوتی ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں یہ عنوان قائم کیا ہے کہ ”بَابُ الْمَرْأَةِ وَحْدَهَا تَكُونُ صَفًّا“ (اکیلی عورت صف کے حکم میں ہوتی ہے) اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے:

«عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ

أُمِّيُّ أُمَّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا» [بخاری، کتاب الأذان، باب المرأة وحدها تكون صفا (۷۲۷)]

”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”ہمارے گھر میں ایک یتیم لڑکے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ماں ام سلیم ہمارے پیچھے تھی۔“

اس حدیث سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ استدلال کرتے ہیں کہ عورت اکیلی ایک صف کے حکم میں ہوتی ہے جیسا کہ ام سلیم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اکیلے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ لہذا جب عورت اکیلی ایک صف کا حکم رکھتی ہے تو مرد اپنی بیوی کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ سلف صالحین سے ازواج کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھانے کے واقعات، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، طبرانی، اخبار اصغیان اور ابن عساکر وغیرہ میں مذکور ہیں۔

مرد کی عورتوں کے لیے امامت

(سوال) کیا مرد عورتوں کو جماعت کروا سکتا ہے، اگر کروا سکتا ہے تو کس صورت میں یعنی امام کے پیچھے عورتوں کی صف ہوگی یا

امام کے پیچھے مردوں کی صف ہونا ضروری ہے، پھر اس کے بعد عورتوں کی صف ہوگی؟

(جواب) مرد عورتوں کی امامت کروا سکتا ہے۔ عورتیں مرد کے پیچھے صف باندھیں گی، ساتھ شریک نہیں ہوں گی۔ عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نماز پڑھی اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے پیچھے نماز ادا کی۔“

[نسائی، کتاب الإمامة: باب موقف الامام إذا كان معه صبی وامرأة (۸۰۵)]

اُس ﷺ سے روایت ہے:

”نبی کریم ﷺ نے انھیں اور ان کی ماں یا خالہ کو نماز پڑھائی تو آپ نے مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کیا اور عورت کو ہمارے پیچھے کھڑا کر دیا۔“ [مسلم، کتاب المساجد: باب جواز الجماعة فی النافلة: (۶۶۰)، ابوداؤد، کتاب الصلوة: باب الرجلین یوم أحدهما صاحب کیف یقرمان (۶۰۹)]

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب امام کے ساتھ ایک آدمی اور ایک عورت ہو تو آدمی دائیں جانب اور عورت ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہوگی۔ وہ مردوں کے ساتھ صف میں شامل نہیں ہوگی اور اس کا سبب فتنے سے ڈرنا ہے۔“ [نیل الاوطار: (۲۰۴/۳)]

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ امام کے ساتھ کوئی مرد ہو تو عورتیں پیچھے کھڑی ہو کر نماز پڑھ سکتی ہیں۔ اب رہا صرف مرد امام ہو اور خواتین مقتدی تو کیا اس طرح نماز جائز و درست ہے۔ نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”عورتوں کا مرد کے پیچھے دیگر مردوں کی موجودگی میں نماز پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس بات میں ہے کہ صرف مرد عورتوں کو نماز پڑھائے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح صحیح نہیں تو دلیل پیش کرنا اس کے ذمہ ہے۔“

[الروضۃ الندیہ (۱/۱۱۹)]

جابر رضی اللہ عنہ کا اپنے گھر میں عورتوں کی امامت کروانا پھر اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت اختیار کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مرد کی اقتداء میں عورتوں کی نماز درست ہے جیسا کہ (مسند ابی یعلیٰ: (۱۹۸، ۱۹۷، ۲، ۱۷۹۵) تحقیق مصطفیٰ عبدالقادر عطاء میں یہ حدیث ہے: علامہ بیہقی نے اس کی سند کو حسن ہے۔ اسی طرح صحیح البخاری وغیرہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکان کا انھیں جماعت کروانا بھی اس کا مؤید ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں [بداية المجتهد: (۱۰۷/۱)]

عورت کا جماعت کروانا

(سوال) کیا عورت دیگر خواتین کی امامت کروا سکتی ہے؟

(جواب) ایک عورت دوسری عورتوں کی جماعت کروا سکتی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ باقی عورتوں کے وسط میں کھڑی ہو، مردوں کی طرح آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو۔

حدیث نبوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام ورقہ بن عبد اللہ بن حارث کے گھر تشریف لاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر کیا جو اذان دیتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا:

« وَ أَمَرَهَا أَنْ تَوُمَّ أَهْلَ دَارِهَا » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب إمامة النساء. (۵۹۲)]

”تو اپنے گھروالوں کی امامت کروایا کر۔“

اس کی شرح میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”ثَبَّتَ مِنْ هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ إِمَامَةَ النِّسَاءِ وَ جَمَاعَتَهُنَّ صَحِيحَةٌ ثَابِتَةٌ مِنْ أَمْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ قَدْ آمَتِ النِّسَاءُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا وَ أُمُّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا فِي الْفَرُضِ وَ التَّرَاوُحِ“ [عون المعبود (۲/۲۱۱)]

”اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کا امامت اور جماعت کروانا صحیح ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ثابت ہے۔ سیدہ عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما عورتوں کی فرض اور تراویح میں امامت کرواتی تھیں۔“
ایک اور روایت میں مذکور ہے:

«عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا كَانَتْ أَمَّتِ النِّسَاءَ فَتَقُومُ مِنْهُنَّ فِي الصَّفِّ» [ابن ابی شیبہ (۲/۸۹)، حاکم (۱/۲۰۳)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کرواتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔“
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِنَّهَا أَمَّتِ النِّسَاءَ فَقَامَتْ وَسَطُهُنَّ» [ابن ابی شیبہ (۲/۸۸)]
”انہوں نے عورتوں کی امامت کروائی اور ان کے وسط میں کھڑی ہوئیں۔“

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت عورتوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر امامت کروا سکتی ہے۔
نیز میرے ناقص علم کے مطابق سلف سے کہیں بھی اس بات کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی عورت نے جمعہ یا عیدین کی نماز پڑھائی ہو۔ لہذا ان کے بارے میں سوچنا یا گنجائش نکالنا درست نہیں۔

مسافر کی مقیم کے پیچھے نماز

(سوال) کیا مسافر شخص مقیم امام کے پیچھے نماز قصر کر سکتا ہے یا وہ پوری ادا کرے؟

(جواب) مسافر پر واجب ہے کہ مقیم امام کے پیچھے پوری نماز پڑھے خواہ وہ مقیم امام کے ساتھ ابتدا میں داخل ہو یا درمیان میں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ» [بخاری، كتاب الصلاة: باب الصلاة في السطوح والمنبر والخشب (۳۷۸)]

”امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔“
دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأْتِمُوا» [بخاری، كتاب الأذان: باب قول الرجل فاتتنا الصلوة (۶۳۵)]

”جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھو اور جو تم سے رہ گئی تھی اس کو پورا کر لو۔“

یہ دونوں احادیث مسافر اور مقیم دونوں کے لیے عام ہیں۔ جس طرح مقیم امام کی اقتدا کرتا ہے اسی طرح مسافر بھی امام کی اقتدا کرے گا۔ اسی طرح جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے جو رکعات فوت ہو گئی تھیں ان کو پورا کیا جائے گا۔ مقتدی مسافر ہو یا مقیم کیونکہ یہ حکم عام ہے اور سب کے لیے ہے۔ موسیٰ بن سلمہ کہتے ہیں:

«كُنَّا مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا بِمَكَّةَ فَقُلْتُ إِنَّا إِذَا كُنَّا مَعَكُمْ صَلَّيْنَا أَرْبَعًا وَإِذَا رَجَعْنَا إِلَى رِحَالِنَا صَلَّيْنَا رَكْعَتَيْنِ؟ قَالَ تِلْكَ سُنَّةُ أَبِي الْقَاسِمِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [مسند احمد (۲۱۶/۱)، (برقم ۱۸۶۵)]

”ہم مکہ میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھے، میں نے پوچھا: ”جب ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں تو چار رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور جب اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹتے ہیں تو دو رکعت ادا کرتے ہیں (ایسا کیوں ہے؟)“

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”یہ ابوالقاسم محمد رضی اللہ عنہ کی سنت ہے۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ مسافر جب اکیلا ہو تو دو رکعت پڑھتا ہے اور جب مقیم کے پیچھے نماز ادا کرے تو پوری پڑھتا ہے، یہ کیوں ہے؟“ انھوں نے کہا: «تِلْكَ السُّنَّةُ» ”یہی سنت ہے۔“ [إرواہ الغلیل (۵۷۱)]

یہ حدیث اس مسئلے میں صریح نص ہے کہ مسافر کے لیے مقیم امام کے پیچھے پوری نماز پڑھنا ہی واجب ہے کیونکہ ایک صحابی رسول کا «مِنَ السُّنَّةِ» یا «تِلْكَ السُّنَّةُ» کہنا مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں دو رکعت نماز ادا کی، آپ کے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما اس پر عمل کرتے رہے۔“ اس حدیث کے آخر میں ہے:

«فَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا إِذَا صَلَّى مَعَ الْإِمَامِ صَلَّى أَرْبَعًا وَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ» [مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب قصر الصلاة بمنى (۶۹۴)]

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب امام کے ساتھ نماز پڑھتے تو چار رکعت پڑھتے تھے اور جب اکیلے ہوتے تو دو رکعت پڑھتے۔“

یہ تھا ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سنت پر عمل اور یہی عمل کرنے کا وہ دوسروں کو حکم دیتے تھے۔ ابو بکر کہتے ہیں:

”قُلْتُ لِابْنِ عُمَرَ: الْمُسَافِرُ يُدْرِكُ رَكْعَتَيْنِ مِنْ صَلَاةِ الْقَوْمِ يَعْنِي الْمُقِيمِينَ أَتُحْزِرُ بِهِ الرَّكْعَتَانِ أَوْ يُصَلِّي بِصَلَاتِهِمْ؟ قَالَ فَضَحِكَ وَقَالَ يُصَلِّي بِصَلَاتِهِمْ“ [بیہقی (۱۵۷/۳)]

”میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ”مسافر مقیم امام کے ساتھ دو رکعت پالیتا ہے، کیا اسے دو رکعت کفایت کر جائیں گی یا جتنی مقیم لوگوں نے نماز ادا کی ہے اتنی وہ بھی ادا کرے؟“ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ بات سن کر ہنس پڑے اور

کہا: ”جتنی نماز مقیم لوگوں نے پڑھی ہے اتنی ہی مسافر بھی پڑھے گا۔“

اس روایت کو شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۲۲/۳)]

یہ ایک صحابی رسول کا عمل اور فتویٰ بھی ہے کہ مسافر مقیم امام کے پیچھے پوری نماز ادا کرے گا، خواہ وہ شروع میں امام کے ساتھ ملا ہو یا آخری دو رکعتوں میں۔ اس کے برعکس اگر مقیم آدمی مسافر امام کے پیچھے نماز ادا کرتا ہے تو اسے پوری نماز پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال نماز پڑھائی اور مقیم لوگوں سے کہا: ”تم اپنی نماز پوری کر لو، ہم مسافر ہیں۔“

مسافر کی مقیم کے لیے امامت

سوال کیا مسافر آدمی مقیم افراد کی جماعت کروا سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اگر کوئی شخص کسی قوم کے ہاں مہمان بنے تو وہ ان کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو انہیں نماز پڑھا سکتا ہے اور جب مسافر مقیم کی امامت کرائے اور دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مقیم اٹھ کر اپنی بقیہ دو رکعتیں پوری کرے۔ اس سے مقیم کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

ابو عطیہ سے روایت ہے کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہمارے پاس نماز کی جگہ آئے، ایک دن نماز کا وقت آ گیا ہم نے انہیں کہا کہ تم آگے بڑھو تو انہوں نے کہا تم میں سے کوئی شخص آگے بڑھے حتیٰ کہ میں تمہیں بیان کروں کہ میں آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا يَوْمَهُمْ وَ لِيَوْمَهُمْ رَجُلٌ مِنْهُمْ » [ترمذی، ابواب الصلاة: باب ما جاء فيمن زار قوم لا يصلی بهم (۳۵۶)، ابن خزيمة (۱۵۲۰)، بیہقی (۱۲۶/۳)، نسائی (۷۸۶)، ابو داؤد (۵۹۶)، احمد (۴۳۶/۳)]

”جو آدمی کسی قوم کی زیارت کیلئے جائے تو وہ ان کی امامت نہ کروائے بلکہ ان میں سے کوئی آدمی ان کی امامت کرائے۔“

اس کی سند میں ابو عطیہ ہے جس کے بارے میں امام ابو حاتم، امام علی بن مدینی اور یحییٰ القطان نے کہا ہے کہ یہ مجہول ہے لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حدیث کی تحسین اور امام ابن خزيمة نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز اس حدیث کے بعض شواہد بھی ہیں۔

نافع سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کی ایک جانب مسجد میں نماز کے لیے اقامت کہی گئی اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس مسجد کے قریب زمین تھی جس میں وہ کام کر رہے تھے اور اس مسجد کا امام ان کا غلام تھا۔ اس غلام اور اس کے ساتھیوں کا مسکن بھی وہیں ہی تھا۔ جب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں سنا تو ان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تو مسجد کے امام نے انہیں کہا کہ آگے بڑھیں اور نماز پڑھائیں تو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« أَنْتَ أَحَقُّ أَنْ تُصَلِّيَ فِي مَسْجِدِكَ مِنِّي فَصَلَّى الْمَوْلَى » [كتاب الأم (۱۵۸/۱)، بیہقی (۱۲۶/۳)، كتاب الصلاة باب الامام الراتب أولى من الزائر]

”تم اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے مجھ سے زیادہ حق دار ہو۔“ پس پھر غلام نے نماز پڑھا دی۔“
ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مقرر امام امت کا زیادہ حق رکھتا ہے اور دوسرے شخص کو اس کے ہوتے ہوئے نماز نہیں پڑھانی چاہیے، ہاں اگر مقرر امام کسی دوسرے شخص کو اجازت دے دے تو وہ نماز پڑھا سکتا ہے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَلَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُؤَمِّرَ قَوْمًا إِلَّا بِإِذْنِهِمْ» [ابو داؤد، کتاب الطہارۃ: باب

یصلی الرجل و هو حاقن (۹۱)، بیہقی (۱۲۹/۳)]

”کسی شخص کے لیے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ وہ کسی قوم کی امامت کروائے مگر ان کی اجازت کے ساتھ۔“

ایک حدیث میں ہے:

«وَلَا يُؤَمِّرُ الرَّجُلُ فِي سُلْطَانِهِ وَلَا يَجْلِسُ عَلَيَّ تَكْرِمَتِي فِي بَيْتِي إِلَّا بِإِذْنِي» [ترمذی، ابواب

الصلاة: باب ما جاء من أحق بالإمامة (۲۳۵)، احمد (۲۷۲/۵)، نسائی (۷۷۹)، ابو داؤد (۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴)، ابن ماجہ (۹۸۰)، ابو عوانہ (۳۶/۲)، حمیدی (۴۵۷)، عبد الرزاق (۳۸۰۹)

حاکم (۲۴۳/۱)، شرح السنۃ (۳۹۴/۳)]

”کوئی آدمی دوسرے آدمی کی حکومت میں امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کی عزت کی جگہ (مسند وغیرہ پر) بیٹھے مگر صرف اس کی اجازت کے ساتھ۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر مقرر امام کسی آنے والے شخص کو امامت کی اجازت دے دے تو وہ شخص نماز پڑھا سکتا ہے۔
امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ مزید لکھتے ہیں: ”امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کہ کوئی آدمی کسی آدمی کی حکومت و سلطہ والی جگہ امامت نہ کرائے اور نہ اس کی عزت والی جگہ بیٹھے مگر اس کی اجازت سے، یہ اجازت امامت اور عزت والی جگہ دونوں کے متعلق ہے اور جب اسے نماز پڑھانے کی اجازت دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔“ [ترمذی، ابواب الصلاة (۶۱۱/۱)، بتحقیق احمد شاکر] علامہ احمد شاکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ نے جو بات استنباط کی ہے یہ اس حدیث کی بعض روایات میں بطور نص واقع ہوئی ہے جیسا کہ نیل الاوطار میں ہے:

«وَلَا يُؤَمِّرُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ وَلَا يَقْعُدُ عَلَيَّ تَكْرِمَتِي فِي بَيْتِي إِلَّا بِإِذْنِي» [نیل الاوطار

(۱۹۲/۳)]

”کوئی شخص دوسرے شخص کی سلطنت میں اس کی امامت نہ کرائے مگر اس کی اجازت کے ساتھ اور نہ اس کے گھر میں اس کی مسند پر بیٹھے مگر اس کی اجازت کے ساتھ۔“

پس اجازت ان دونوں صورت میں ہے یعنی صاحب بیت کی اجازت سے اس کی مسند پر بھی بیٹھا سکتا ہے اور آدمی کی

حکومت والی جگہ اس کی اجازت سے امامت بھی کرا سکتا ہے۔

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ مسافر اور زائر آدمی مقیم کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے، اس میں شرعی طور پر رخصت ہے، اگرچہ زیادہ حق مقرر امام کا ہے اور جب مسافر مقیم امام کی اجازت سے نماز پڑھائے اور وہ قصر کرنا چاہتا ہو تو مقیم کھڑے ہو کر اپنی نماز پڑھ لیں۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ إِذَا قَدِمَ مَكَّةَ صَلَّى بِهِمْ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَقُولُ يَا أَهْلَ مَكَّةَ! اتِمُّوا صَلَاتَكُمْ فَإِنَّا قَوْمٌ سَفَرٌ» [موطا، کتاب قصر الصلاة في السفر: باب صلاة المسافر إذا كان امام أو كان وراء الامام (۱۹)، بیہقی (۱۲۶/۳)، نصب الرایة (۱۸۷/۲)]

”بے شک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما جب مکہ تشریف لاتے تو انھیں دو رکعت پڑھاتے پھر کہتے: ”اے مکہ والو! اپنی نماز پوری کر لو، بلاشبہ ہم مسافر قوم ہیں۔“

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر غزوہ کیا اور فتح مکہ کے موقع پر میں آپ کے ساتھ حاضر تھا، آپ مکہ میں ۱۸ راتیں مقیم رہے۔ آپ صرف دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے:

”اے شہر والو! تم چار رکعات پڑھو، بے شک ہم مسافر قوم ہیں۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب متى يتم المسافر (۱۲۲۹)، بیہقی (۱۵۷/۳)، دلائل النبوة (۱۰۵/۵)، اس کی سند میں علی بن زید بن جعدان راوی کمزور ہے۔]

صفوان سے روایت ہے: ”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عبد اللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے آئے تو انھوں نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی پھر سلام پھیر دیا۔ ہم کھڑے ہو گئے اور ہم نے اپنی نماز مکمل کی۔“ [موطا، کتاب قصر الصلاة في السفر (۲۱)]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مسافر نماز پڑھائے تو اگر وہ دو رکعت پر سلام پھیر دے تو مقیم آدمی کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز پوری کر لیں۔

اس میں شرعی طور پر رخصت ہے، اس سے مقیم لوگوں کی نماز میں کوئی غلط واقع نہیں ہوتا۔ اگر کسی قسم کا غلط واقع ہوتا تو خلیفہ المسلمین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا نہ کرتے، جو لوگ اس بات پر لڑتے بھگڑتے ہیں ان کا یہ رویہ نامناسب ہے۔ جب شریعت میں رخصت موجود ہے تو اسے شرح صدر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور مسافر کی اقتدا میں مقیم کی نماز بالاتفاق صحیح ہے اور میرے علم میں کسی اہل علم نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔

مزید تفصیل کے لیے فقہ حنفی کی کتاب قدوری، باب صلاة المسافر (ص ۵۳۱)، فقہ حنبلی کی کتاب المغنی (۱۴۶/۳)، فقہ شافعی کی کتاب الام اور فقہ مالکی کے لیے مؤطا ملاحظہ ہو۔

مشرک امام کے پیچھے نماز

(سوال) کیا مشرکانہ عقیدہ کے حامل امام کے پیچھے نماز ادا کرنا صحیح و جائز ہے؟

(جواب) قرآن مجید اور صحیح احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر، مشکل کشا اور نفع نقصان کا مالک سمجھنا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو غوث اعظم کہنا اور علی ہجویری کو داتا ماننا شرک ہے اور ان امور پر اعتقاد رکھنے والا بلاشبہ مشرک ہے۔ کیونکہ کسی کو نفع و نقصان سے دوچار کرنا یا کسی کی پریشانی دور کرنا، فریاد رسی کرنا اور اولاد دینا یہ تمام صفات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہیں، جو اس نے کسی اور کو عطا نہیں کیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب سید الانبیاء محمد ﷺ کو بھی فرمایا:

﴿ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸]

”اے نبی! آپ کہہ دیں کہ میں اپنی جان کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے۔“
اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴾

[الجن: ۲۱، ۲۰]

”کہہ دیجیے! میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ کہہ دیجیے! میں تمہارے لیے نقصان اور ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔“

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے غیر میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا اور وحدہ لا شریک لہ ہے اور جو لوگ اللہ خالق کی صفات اس کی مخلوق میں مانتے ہیں وہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور مشرک آدمی کے اعمال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، وہ اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ لَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [الانعام: ۸۸]

”اور اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو ان کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے۔“
اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَ إِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ تَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ [الزمر: ۶۵]

”اور تحقیق وحی کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے تھے، اگر تو نے شرک کیا تو تیرے عمل ضائع ہو جائیں گے اور البتہ تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔“

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ مشرک آدمی کے اعمال اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں۔ خواہ وہ نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا زکوٰۃ۔ غرض کسی قسم کا عمل بھی مشرک کا قبول نہیں بلکہ وہ سارے اعمال اکارت اور ضائع ہوں گے۔ تو جب امام مشرک ہوگا اور اس کا اپنا عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں تو اس کی اقتدا میں ادا کی جانے والی نماز کیسے قبول ہوگی؟ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح العقیدہ ہو۔ جس شخص کا عقیدہ صحیح نہیں وہ امامت کے لائق کیسے ہو سکتا ہے؟

منفرد کے ساتھ نماز میں شریک ہونا

(سوال) اگر کوئی اکیلا شخص نماز پڑھ رہا ہو دوسرا اسکے ساتھ شریک ہو سکتا ہے؟

(جواب) اگر کوئی شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو اور دوسرے شخص آ کر اس کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائیں تو جماعت کی صورت بن جاتی ہے، صحیح احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« بَتُّ عِنْدَ خَالَتِي مِمْوَنَةَ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ فَقُمْتُ أُصَلِّي مَعَهُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَأَخَذَ بِرَأْسِي فَأَقَامَنِي عَنْ يَمِينِهِ » [بخاری، کتاب الأذان: باب إذا لم ينو الإمام أن يؤم ثم جاء قوم فأهمهم (٦٩٩)، مسلم، کتاب صلاة المسافرين: (٧٦٣)، نسائی (٨٠٧)]

”میں نے اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رات بسر کی۔ رسول کریم ﷺ رات کو نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا، میں آپ ﷺ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا تو آپ نے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنے دائیں جانب کھڑا کر دیا۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو اور دوسرا شخص آ جائے تو نماز باجماعت ادا ہو سکتی ہے۔

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر جو باب منعقد کیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یعنی جب امام نے امامت کی نیت نہ کی ہو پھر کچھ لوگ آ جائیں تو وہ ان کی امامت کر دے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« فِيهِ مَشْرُوعِيَّةُ الْجَمَاعَةِ فِي النَّافِلَةِ وَالْإِيْتِمَامُ بِمَنْ لَمْ يَنْوِ الْإِمَامَةَ وَبَيَانُ مَوْقِفِ الْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ » [فتح الباری (٤٨٥/٢)]

”اس حدیث سے نفل نماز کی جماعت، جس آدمی نے امامت کی نیت نہ کی ہو اس کی اقتدا اور امام و مقتدی کے کھڑے ہونے کی جگہ کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔“

امام ابن منذر رضی اللہ عنہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ امام کے لیے امامت کی نیت کرنا اقتدا کی صحت کے لیے شرط نہیں ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے:

« أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى فِي شَهْرِ رَمَضَانَ قَالَ فَجِئْتُ فَقُمْتُ إِلَى جَنْبِهِ وَجَاءَ آخَرُ فَقَامَ إِلَى جَنْبِي حَتَّى كُنَّا رَهْطًا فَلَمَّا أَحَسَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَا تَجَوَزَ فِي صَلَاتِهِ. وَهُوَ ظَاهِرٌ فِي أَنَّهُ لَمْ يَنْوِ الْإِمَامَةَ ابْتِدَاءً وَاتَّمَمُوا هُمْ بِهِ وَاقْرَهُمْ وَهُوَ حَدِيثٌ صَحِيحٌ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ » [فتح الباری (١٩٢/٢)، مزید دیکھیں: الإقناع لابن المنذر (١١٦/١)، الأوسط له، کتاب الإمامة: باب ذكر الائتمام بالمصلي الذي لا ينوي الإمامة (٢١١٠/٤)]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے مہینے میں نماز ادا کی، میں آیا اور آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا اور دوسرا آدمی آیا وہ میرے پہلو میں کھڑا ہو گیا حتیٰ کہ ہم ایک گروہ ہو گئے، جب نبی ﷺ نے محسوس کیا تو آپ نے اپنی نماز میں اختصار کیا۔“ یہ حدیث اس مسئلے پر ظاہر ہے کہ آپ نے ابتدا میں امامت کی نیت نہیں کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی اقتدا کی اور آپ نے انھیں برقرار رکھا۔ یہ حدیث صحیح ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے معلق ذکر کیا ہے۔“

امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ نفل اور فرض نماز کے مابین فرق ہے، فرض نماز میں امامت کی نیت شرط ہے، نفل نماز میں نہیں۔ لیکن امام احمد رضی اللہ عنہ کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

”کون آدمی اس پر صدقہ کرے گا کہ وہ اس کے ہمراہ نماز ادا کرے۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة، باب فی

الجمع فی المسجد مرتین (۵۷۴)]

امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو حسن اور امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان اور امام حاکم رضی اللہ عنہم نے اسے صحیح کہا ہے۔ [فتح

الباری (۱۹۲/۲)]

یہ حدیث فرض نماز کے بارے میں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص فرض نماز اکیلا پڑھ رہا ہو تو دوسرا آدمی اس کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے تو ان کی جماعت بن جائے گی۔ اس لیے نماز خواہ فرض ہو یا نفل دونوں صورتوں کا جواز حدیث سے واضح ہے کہ اکیلے آدمی کی نماز میں دوسرا ساتھ مل جائے تو جماعت کی صورت بن سکتی ہے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ وغیرہ کا بھی رجحان ادھر ہی معلوم ہوتا ہے اور صحیح احادیث سے اس موقف کو تقویت ملتی ہے۔

نماز میں مقتدی کا امام کو لقمہ دینا

(سوال) اگر نماز میں امام بھول جائے تو کیا مقتدی لقمہ دے سکتا ہے؟

(جواب) مسور بن یزید مالکی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں موجود تھا، آپ نماز میں قراءت کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ آیات ترک کر دیں، ان کی قراءت نہ کی۔ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: ”اے اللہ کے رسول! آپ نے اس طرح آیت ترک کی ہے۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے مجھے یاد دہانی کیوں نہیں کرائی۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلاة:

باب الفتح علی الإمام فی الصلاة (۹۰۷)، ابن خزیمہ (۱۶۴۸)، ابن حبان (۳۷۹)]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز ادا کی۔ آپ ﷺ نے اس میں قراءت کی۔ آپ پر قراءت خلط ملط کر دی گئی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ”کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہیں کس چیز نے روکا تھا۔“ [بیہقی (۲۱۲/۳)، شرح السنہ (۱۶۶۵)]

یعنی جب نماز میں مجھ پر قراءت خلط ملط کر دی گئی تو تمہیں لقمہ دینے سے کس چیز نے روکا تھا؟ امام خطابی رضی اللہ عنہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں: ”وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ تَلْقِينِ الْإِمَامِ“ ”اس حدیث میں امام کو لقمہ دینے کے جواز پر

دلیل ہے۔“ اور علیؑ سے نماز میں امام کو لقمہ دینے سے ممانعت والی روایت جو ابو داؤد (۹۰۸) میں ہے، اس کے بارے میں امام ابو داؤدؒ نے فرمایا: ”اس کی سند میں ابواسحاق راوی ہے، جس نے حارث سے چار روایات کے علاوہ سماع نہیں کیا اور یہ روایت ان کی سنی ہوئی روایات میں سے نہیں ہے، یعنی منقطع ہے اور ابواسحاق مدلس بھی ہے اور یہ ان کی عن والی روایت ہے اور دوسری علت یہ ہے کہ حارث راوی انتہائی ضعیف ہے۔“

دورانِ قنوت مقتدی کیا کہے؟

سوال جب امام قنوت کر رہا ہو تو مقتدی کیا کہے؟

جواب جب امام رکوع کے بعد نماز میں قنوت نازلہ پڑھتا ہے تو مقتدی اس پر آمین کہیں گے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

« قَنَّتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَّابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْإِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ فِي ذُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ يَدْعُو عَلَى أَحْيَاءٍ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ عَلَى رَعْلٍ وَذُكْوَانَ وَعُصَيْبَةَ وَيَوْمٍ مِنْ مَنْ خَلَفَهُ »

[ابو داؤد، ابواب الوتر: باب القنوت في الصلاة (۱۴۴۳) علامہ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ مسلسل پانچوں نمازوں کی آخری رکعت میں ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہنے کے بعد بنی سلیم کے قبیلے رعل، ذکوان اور عصبیہ کے خلاف دعا کی تھی اور جو آپ ﷺ کے پیچھے تھے وہ آمین کہتے تھے۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی صرف آمین کہیں گے۔

مقتدی بھی ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہیں

سوال رکوع سے اٹھتے وقت امام اور مقتدی کیا پڑھیں؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب رکوع سے اٹھتے وقت مقتدی کو بھی ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہنا چاہیے، حدیث میں ہے: ”رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو جس وقت قیام کرتے تکبیر کہتے پھر جب رکوع کرتے تکبیر کہتے اور جب رکوع سے اپنی پشت اٹھاتے تو ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہتے۔“ [بخاری، کتاب الأذان، باب التكبیر اذا قام من السجود (۷۸۹)]

نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث عام ہے اور آپ کی حالت امامت کو بھی شامل ہے اور حالت اقتدا کو بھی۔ اگرچہ آپ امام ہوتے تھے لیکن عبد الرحمن بن عوفؓ کی اقتدا میں بھی آپ نے نماز ادا کی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔

[ابو داؤد، کتاب الطہارۃ: باب المسح علی الخفین (۱۴۹)]

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ امام اور مقتدی دونوں ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا قَالَ الْإِمَامُ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُولُوا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ »

”جب امام ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہے تو تم ” رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ “ کہو۔“

لہذا امام صرف ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہے اور مقتدی صرف ” رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ “ کہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَ لَا حُجَّةَ لَهُمْ فِيهِ لِأَنَّهُ أَمَرَ بِأَنْ يَقُولَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَ نَحْنُ نَقُولُهُ فَأَمَّا إِذَا قَالَ مَعَهُ

غَيْرُهُ فَلَيْسَ بِمَذْكُورٍ فِي هَذَا الْخَبَرِ “ [مختصر خلافيات للبيهقي (۱/۳۹۳)]

”ان لوگوں کے لیے اس حدیث میں دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ نے ” رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ “ کہنے کا حکم دیا ہے

اور ہم یہ کہتے ہیں لیکن جب امام کیساتھ ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کوئی اور کہے یہ اس حدیث میں ذکر نہیں ہوا۔“

مزید فرماتے ہیں: ”یہ بات اصول میں طے ہے کہ عدم ذکر نفی کی دلیل نہیں ہوتا اور دوسری حدیث کے عموم سے مقتدی کا

” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہنا ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس حدیث کو یوں ہی سمجھا جائے تو اس کا مطلب ہوا کہ امام صرف

” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہے ” رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ “ نہ کہے حالانکہ بہت ساری صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں

کہ امام کو جیسے ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہنا چاہیے ” رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ “ بھی اسی طرح کہنا چاہیے۔ [تفصیل کے لیے

دیکھیں: مختصر خلافيات للبيهقي (۱/۳۹۱-۳۹۳)]

احناف کے ہاں امام محمد، قاضی ابو یوسف اور امام طحاوی کا یہ موقف ہے کہ امام ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ اور ” رَبَّنَا

لَكَ الْحَمْدُ “ دونوں کہے۔ [عقود الجواهر المنيفه فى أدلة مذهب الإمام أبى حنيفة (ص ۶۳)]

جب ان کے ہاں امام تسمیح و تحمید دونوں کو جمع کرے تو اس حدیث کی مخالفت نہیں تو مقتدی بھی تسمیح و تحمید دونوں کو جمع

کرے تو حدیث کے بالکل مطابق اور صحیح ہے لہذا مقتدی کو بھی ” سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ “ کہنا چاہیے۔

امام اور مقتدی کی تکبیر اور سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ میں فرق کیوں؟

(سوال) امام اللہ اکبر بلند آواز سے کہتا ہے جبکہ مقتدی آہستہ، امام سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ بلند آواز سے کہتا ہے جبکہ مقتدی آہستہ کہتے

ہیں، آپ اگر قرآن و حدیث کے دعویدار ہیں تو قرآن یا صحیح حدیث سے یہ چیز ثابت کریں؟

(جواب) نماز ایک اہم ترین عبادت ہے اور اس کا طریقہ رسول مکرم ﷺ کے ذریعے ہمیں بتایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ جب

نماز پڑھتے تھے تو جبری تکبیر کہتے تھے جیسا کہ سعید بن الحارث بن المعلى بیان کرتے ہیں:

« صَلَّى لَنَا أَبُو سَعِيدٍ فَحَهَرَ بِالتَّكْبِيرِ حِينَ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ وَ حِينَ سَجَدَ وَ حِينَ رَفَعَ وَ

حِينَ قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ » (صحیح البخاری، کتاب الاذان: باب یكبر وهو ينهض من السجدةین (۸۲۵))

”ہمیں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی تو انھوں نے جس وقت سجدے سے سر اٹھایا اور جس وقت (دوسرا) سجدہ کیا اور جس وقت سر اٹھایا اور جس وقت دو رکعتوں سے اٹھے، اونچی تکبیر کہی اور فرمایا میں نے اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔“

سعید بن الحارث فرماتے ہیں:

«إِشْتَكَى أَبُو هُرَيْرَةَ أَوْ غَابَ فَصَلَّى لَنَا أَبُو سَعِيدٍ الْخُدْرِيُّ فَحَهَرَ بِالتَّكْبِيرِ حِينَ افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَحِينَ رَكَعَ وَحِينَ قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ وَحِينَ قَامَ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ حَتَّى قَضَى صَلَاتَهُ عَلَى ذَلِكَ فَلَمَّا صَلَّى قِيلَ لَهُ قَدْ اِخْتَلَفَ النَّاسُ عَلَى صَلَاتِكَ فَخَرَجَ فَقَامَ عِنْدَ الْمَنْبَرِ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ! وَاللَّهِ مَا أَبَالِي اِخْتَلَفَتْ صَلَاتُكُمْ أَوْ لَمْ تَخْتَلِفْ هَكَذَا رَأَيْتَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي» [المستدرک علی الصحیحین (۸۴۴) (۲۲۳/۱)، السنن الکبری للبیہقی، کتاب الصلوٰۃ، باب جہر الامام بالتکبیر (۱۸/۲)، ابویعلیٰ (۱۲۲۹)، صحیح ابن خزیمة (۵۸۰)، مسند احمد (۱۱۱۴۰) (۱۷/۲۲۴، ۲۲۵)]

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیمار یا موجود نہیں تھے تو ہمیں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی، انھوں نے جس وقت نماز شروع کی رکوع میں گئے اور رکوع سے سیدھے کھڑے ہوئے تو ”سمع اللہ لمن حمدہ“ کہا اور سجدے سے اپنا سر اٹھایا دوسرا سجدہ کیا اور سر اٹھایا اور دو رکعتوں سے اٹھے تو اونچی آواز سے تکبیر کہی یہاں تک کہ اپنی نماز مکمل کی، انھیں کہا گیا: ”یقیناً لوگوں نے آپ کی نماز کے بارے اختلاف کیا ہے۔“ ابوسعید رضی اللہ عنہ آئے، منبر پر چڑھے اور کہا: ”اے لوگو! بلاشبہ اللہ کی قسم! تمہاری نماز مختلف ہو یا نہ ہو مجھے کوئی پروا نہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔“

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں میں تکبیر جہری اور سری کہنے میں اختلاف رونما ہوا تھا اور مردان وغیرہ بنو امیہ کے لوگ تکبیر آہستہ کہتے تھے جس کی وجہ سے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی نماز پر اختلاف کیا گیا تو انھوں نے اونچی تکبیریں کہہ کر نماز پڑھائی اور لوگوں کی کوئی پروا نہ کی اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اسی طرح تھی۔ یہ حدیث اس مسئلہ پر بالکل واضح ہے کہ امام تکبیریں جہراً کہے گا اور امام بیہتی نے بھی اس حدیث پر باب امام کی جہری تکبیر ہی کا قائل کیا ہے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

”جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے جس بیماری میں آپ نے وفات پائی تو آپ کے پاس ایک آدمی نے آ کر نماز کی اطلاع دی، آپ نے فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔“ میں نے کہا: ”یقیناً ابوبکر کچے دل کے آدمی ہیں، اگر وہ آپ کی جگہ کھڑے ہو گئے تو رو پڑیں گے اور قراءت پر قدرت نہ رکھ سکیں گے۔“ آپ نے فرمایا: ”ابوبکر کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔“ میں نے پھر وہی بات کہی تو آپ نے تیسری یا چوتھی دفعہ فرمایا: ”تم تو صواحب یوسف ہو، ابوبکر کو حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔“ انھوں نے نماز پڑھائی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو آدمیوں کا سہارا لے کر نکلے گویا

کہ میں آپ کی طرف دیکھ رہی ہوں، آپ کے پاؤں زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے تو آپ ﷺ نے اشارہ کیا کہ نماز پڑھاؤ لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹے اور نبی ﷺ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

«وَأَبُو بَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ التَّكْبِيرَ»

”اور ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو تکبیر سنا رہے تھے۔“ (صحیح البخاری، کتاب الاذان: باب من أسمع الناس التكبير الامام (۷۱۲)، صحیح مسلم کتاب الصلوة (۴۱۸))

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«اِشْتَكَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّيْنَا وَرَأَاهُ وَهُوَ قَاعِدٌ وَأَبُو بَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ تَكْبِيرَهُ» (صحیح مسلم، کتاب الصلوة: باب اتمام المأموم بالأمام (۴۱۳/۸۴)، المسند المستخرج (۹۲۰)، ابوداؤد (۶۰۶)، نسائی کبری (۵۳۵)، ابن ماجہ (۱۲۴۰)، ابن حبان (۲۱۲۲)، مسند احمد (۳۳۴/۳)، الادب المفرد (۹۴۸)، ابن خزيمة (۴۸۶)، سنن النسائی (۱۱۹۹)، ابویعلیٰ (۱۸۹۶)، ابوعوانہ (۱۰۸/۲)، طحاوی (۲۳۴/۱)، المسند الجامع (۴۷۳/۳، ۴۷۴)

”رسول اللہ ﷺ بیمار تھے اور ہم نے آپ کے پیچھے (اس طرح) نماز ادا کی کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنا رہے تھے۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں:

«صَلَّى بِنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَأَبُو بَكْرٍ خَلْفَهُ فَإِذَا كَبَّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ أَبُو بَكْرٍ يُسْمِعُنَا» (نسائی، کتاب الامامة: باب الائتتام لمن يأتهم بالإمام مسلم (۷۹۹))

”ہمیں نبی ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے تھے، جب رسول اللہ ﷺ تکبیر کہتے ابو بکر ہمیں تکبیر سنا رہے تھے۔“

ان احادیث صحیحہ سے بھی معلوم ہوا کہ امام تکبیر جہراً کہے گا اور مقتدی آہستہ اگر مقتدی ہی تکبیر جہری کہتے ہوتے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو انھیں رسول اللہ ﷺ کی تکبیر سنانے کی ضرورت نہ تھی۔

معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

«وَبَيْنَا أَنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّلَاةِ إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَرْحَمُكَ اللَّهُ فَحَدَّقَنِي الْقَوْمُ بِأَبْصَارِهِمْ فَقُلْتُ وَأَنْكَلُ أَمِيَاهُ، مَا لَكُمْ تَنْظُرُونَ إِلَيَّ؟ قَالَ فَضْرَبَ الْقَوْمُ بِأَيْدِيهِمْ عَلَى أَنْفَادِهِمْ فَلَمَّا رَأَيْتَهُمْ يُسْكِنُونِي لِكِنِّي سَكْتُ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَانِي بِأَبِي وَأُمِّي هُوَ مَا ضَرَبَنِي وَلَا كَهْرَنِي وَلَا سَبَنِي مَا رَأَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ أَحْسَنَ تَعْلِيمًا مِنْهُ قَالَ إِنَّ صَلَاتَنَا هَذِهِ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ

كَلَامِ النَّاسِ إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَ التَّكْبِيرُ وَ تَلَاوَةُ الْقُرْآنِ» (سنن النسائي، كتاب الصلوة: باب الكلام فى الصلوة (۱۲۱۹)، صحيح مسلم، كتاب المساجد: باب تحريم الكلام فى الصلوة (۵۳۷)، ابوداود كتاب الصلوة باب تسميت العاطس فى الصلوة (۹۳۰)، مسند احمد (۲۳۷۶۲) (۱۷۵/۳۹)، دارمی (۱۵۰۳)، الاحاد والمثنانى (۱۳۹۹)، ابن الجارود (۲۱۲)، ابن خزيمة (۸۵۹)، ابوعوانة (۱۷۲۸)، ابن حبان (۲۲۴۷)، بيهقى (۲۴۹/۲) (۲۵۰)، الاسماء والصفات للبيهقى (۴۲۱)، التمهيد (۸۰-۷۹/۲۲)، خلق افعال العباد (۱۹۳)، نسائي كبرى (۵۵۶)، طبرانى كبير (۹۴۸، ۹۴۵/۱۹) [

”میں اللہ کے رسول ﷺ کے ہمراہ نماز میں تھا کہ قوم میں سے ایک آدمی نے چھینک ماری، میں نے کہا: ”اللہ تجھ پر رحم کرے۔“ تو قوم مجھے گھورنے لگی، میں نے کہا: ”مجھے میری ماں گم پائے، تمہیں کیا ہے کہ میری طرف دیکھتے ہو؟“ قوم نے اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارنا شروع کیا، جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کر رہے ہیں تو میں نے ان سے بھگڑنے کا ارادہ کیا لیکن خاموش ہو گیا، جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے مجھے بلایا، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ نے مجھے مارا، نہ ڈانٹا اور نہ برا بھلا کہا، میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد تعلیم دینے والا اتنا اچھا کوئی معلم نہیں دیکھا، آپ نے فرمایا: ”یقیناً ہماری اس نماز میں لوگوں کا آپس میں گفتگو کرنا درست نہیں، یہ توتنج و تکبیر اور تلاوت قرآن ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ نماز میں سکوت اختیار کرے، اپنی آواز بلند نہ کرے۔ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے پیچھے آواز بلند نہیں کرتے تھے، معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب غلطی سے چھینک مارنے والے کو اونچی آواز میں ”يَرْجُكُ اللَّهُ“ کہہ دیا تو صحابہ انھیں گھورنے لگے۔ اس حدیث میں ”يسكتونى“ ہے اور بعض طرق میں ”ييسمونى“ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ مقتدی خاموش رہے گا۔ ہاں جہر مقتدی کے لیے جائز ہوگا مگر اس جگہ جس کی دلیل مل جائے۔

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ میں امام کی اقتدا کے متعلق احادیث میں ہے: «فَإِذَا كَبَّرَ الْإِمَامُ فَكَبِّرُوا» «جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو» سے پتا چلتا ہے کہ امام تکبیر جہری کہے گا کیونکہ مقتدی کو امام کی تکبیر کا بھی علم ہوگا جب امام تکبیر اونچی کہے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ نماز اللہ کے ذکر کے لیے پڑھی جاتی ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ (ط: ۱۳) ”نماز میرے ذکر کے لیے قائم کرو۔“

اور ذکر کے متعلق اللہ کا حکم ہے

”اپنے رب کو اپنے نفس میں عاجزی، خوف سے اور پست آواز سے صبح شام یاد کرتے رہو۔“

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کا اصول تو یہی ہے کہ اسے آہستہ کیا جائے سوائے اس کے کہ جہر کی دلیل آجائے۔

[الاعراف: ۲۰۵]

امام کے جہر کی دلیلیں تو اوپر ذکر کردی گئی ہیں، جو مقتدی کی تکبیرات کے جہر کا مدعی ہو وہ اس کی دلیل پیش کرے، یہ بات علمائے احناف کو بھی مسلم ہے جیسا کہ ان کی کتاب مجموعہ رسائل جلد اول تحقیق مسئلہ آمین میں لکھا ہے: ”قرآن پاک کے انہی ارشادات اور روایات سے نماز کے باقی اذکار کا آہستہ پڑھنا ثابت ہو گیا“ پھر آگے فائدہ دوم کے تحت لکھا ہے: ”در اصل

قاعدہ یہی ہے کہ دعا اور ذکر آہستہ پڑھے جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے، ہاں بعض اذکار میں اللہ کی یاد کے ساتھ انسانوں کو اطلاع دینا بھی مقصود ہوتا ہے اور انسان دل کی آواز کو سن نہیں سکتا اس لیے انسانوں کو سنانے کے لیے وہاں آواز بلند کی جاتی ہے جیسے اذان میں انسانوں کو بلانا، اقامت میں مقتدیوں کو بتانا مقصود ہوتا ہے۔ امام تکبیرات انتقال اور سلام اونچی آواز سے کہتے ہیں کیونکہ مقتدیوں کو اطلاع دینا مقصود ہے لیکن مقتدی اور اکیلے نمازی کو یہ ضرورت نہیں، اس لیے وہ آہستہ کہتا ہے۔“

لہذا احناف کے اور ہمارے اس متفقہ اصول قرآنی کے مطابق مقتدی تو تکبیر آہستہ ہی کہے گا بہر کیف قرآن و سنت کے بے شمار دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ مقتدی آہستہ اور خاموشی سے ذکر و اذکار اور تلاوت کرے گا جبکہ امام تکبیرات و قراءت جبری کرے گا۔ یاد رہے ایسے حیلے بہانے اور چال بازیاں بعض افراد کی جانب سے کتاب و سنت سے لوگوں کو دور کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں تاکہ انھیں بتایا جائے کہ دین اسلام پورا قرآن و حدیث میں نہیں بلکہ سارے کا سارا دین ان کی مزعومہ فقہ میں ہے اور اس کے لیے آج کل کئی واعظ و خطیب اور کم علم متعصب لوگ بڑی محنت کر رہے ہیں اور دن رات یہ باور کرانے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں کہ قرآن و حدیث ہماری مکمل راہنمائی نہیں کرتے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ !

اور اللہ تعالیٰ راہ صواب پر استقامت نصیب فرمائے، کتاب و سنت کے دامن سے وابستہ رکھے اور زلیغ و ضلال سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)



WWW.KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

نفل نماز کا بیان

نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہئیں یا کھڑے ہو کر؟

(سوال) نوافل بیٹھ کر پڑھنے چاہئیں یا کھڑے ہو کر؟ بعض لوگ کہتے ہیں عشاء کے بعد بیٹھ کر پڑھنے چاہئیں، قرآن و حدیث کی رو سے وضاحت کریں۔

(جواب) نوافل کھڑے ہو کر ادا کرنے چاہئیں تاکہ پورا ثواب ملے، اگر کوئی آدمی بغیر عذر کے بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اسے نصف اجر ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں، انھیں بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی پورا اجر ملتا تھا۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”مجھے حدیث بیان کی گئی کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو میں آپ ﷺ کے پاس آیا، میں نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے پایا تو میں نے اپنا ہاتھ سر پر رکھا، تو آپ نے کہا: ”اے عبد اللہ بن عمرو! تجھے کیا ہوا؟“ میں نے کہا: ”مجھے حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے اور آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی ایک کی مانند نہیں ہوں۔“ [صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب جواز النافلة قائماً او قاعداً: (۷۳۵)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں کھڑے ہو کر ہی نوافل ادا کرنے چاہئیں، اگر بلا عذر بیٹھ کر پڑھیں گے تو آدھی نماز کا ثواب ملے گا۔ صرف رسول اللہ ﷺ ایسی ہستی تھیں جنہیں بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی پورا اجر ملتا تھا، لہذا ہمیں پورا ثواب لینے کے لیے کھڑے ہو کر نفل ادا کرنے چاہئیں، البتہ فرض نماز بلا عذر بیٹھ کر ادا کرنا صحیح نہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ [مرعاة شرح مشکاة: باب القصد فی العمل جلد چہارم]

فرض نماز کی جگہ سنتوں کی ادائیگی

(سوال) جہاں فرض نماز پڑھی ہو وہاں سنتیں پڑھنا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

(جواب) جس وقت فرض نماز ادا کر لی جائے تو نوافل ادا کرنے کے لیے جگہ بدل لینا چاہیے یا کچھ کلام کر لینا چاہیے تاکہ فرض اور نفل میں فصل ہو جائے، بغیر فصل کیے اسی جگہ سنن و نوافل ادا نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا:

« اَنْ لَا نُؤْصَلَ صَلَاةٌ بِصَلَاةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ اَوْ نَخْرُجَ » [صحیح مسلم، کتاب الجمعة: باب الصلوة بعد الجمعة (۸۸۳)]

”ہم نماز کے ساتھ نماز نہ ملائیں حتیٰ کہ ہم بات کر لیں یا وہ جگہ چھوڑ دیں۔“

معلوم ہوا کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد اس جگہ بھی سنتیں پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ فرض نماز کے بعد کچھ کلام کر لیا ہو، اس طرح جگہ بدل کر بھی سنتیں ادا کر سکتے ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جگہ بدلنے کو افضل قرار دیا تاکہ سجدہ کرنے کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

اقامت کے بعد سنتیں پڑھنے کا حکم

(سوال) ایک شخص فجر کی سنتیں پڑھ رہا ہے کہ اقامت کہہ دی جاتی ہے وہ سنتیں پوری کرے یا سلام پھیر کر جماعت میں شامل ہو جائے؟

(جواب) جب فرض نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اگر سنتیں پڑھ رہا ہے تو اسے توڑ ڈالے اور فرض جماعت میں شامل ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

« إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن (۷۱۰)، ترمذی (۴۲۱)، ابو داؤد (۱۲۶۶)، نسائی (۸۶۶، ۸۶۷)، ابن ماجہ (۱۱۵۱)، احمد (۲۳۱/۲)، بیہقی (۴۸۲/۲)، ابن خزیمہ (۱۱۲۳)]

”جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔“

عبداللہ بن مالک بن نجیحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا وَقَدْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَأَتْ بِهِ النَّاسُ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الصُّبْحُ أَرْبَعًا؟ الصُّبْحُ أَرْبَعًا؟ » [بخاری، کتاب الأذان: باب إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة (۶۶۳)، مسلم (۷۱۱)]

”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا، حالانکہ نماز کے لیے اقامت کہی جا چکی تھی کہ وہ دو رکعت پڑھ رہا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اسے لوگوں نے گھیر لیا۔ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ”کیا صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے؟ کیا صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے؟“

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنْ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْمَسْجِدَ لِصَلَاةِ الْعِدَاةِ وَإِذَا رَجُلٌ يُصَلِّي رُكْعَتَيْ الْفَجْرِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتُصَلِّي الصُّبْحَ أَرْبَعًا » [كشف الأستار (۵۱۸)، (۲۵۱/۱)، ابن حبان (۲۴۶۹)، احمد (۲۳۸/۱)، ابن خزیمہ (۱۱۲۴)، طبرانی کبیر (۱۱۲۲۷)، مستدرک حاکم (۳۰۷/۱)، بیہقی (۴۸۲/۲)، اس روایت کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہما نے صحیح کہا ہے۔]

”بے شک نبی ﷺ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوئے تو ایک آدمی فجر کی دو رکعت پڑھ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تو صبح کی چار رکعت پڑھتا ہے۔“

بعض لوگ صبح کی نماز کے وقت بالخصوص سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، یہ بات درست ہے کہ صبح کی سنتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن انہیں فرض سے پہلے ادا کرنے کا بتایا گیا ہے، لہذا نماز کے لیے وقت پر بیدار ہو کر فرض سے قبل پڑھ لینی چاہیے۔ اگر فرض جماعت کھڑی ہو تو پھر کوئی بھی نماز فرض کے علاوہ نہیں ہوتی۔ خواہ فجر کی سنتیں ہوں یا کسی اور نماز کی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسجد کے ایک کونے میں سنت پڑھ لے پھر فرض جماعت میں شریک ہو جائے، ایسے لوگ اس حدیث پر غور کریں۔ عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« دَخَلَ رَجُلٌ الْمَسْجِدَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ فِيْ جَانِبِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ يَا فُلَانُ ! بَايَ الصَّلَاتَيْنِ اعْتَدَدْتُ ؟ اِبْصَلَاتِكَ وَ حُدُوكَ اَمْ بِصَلَاتِكَ مَعَنَا ؟ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن في إقامة الصلاة (۷۱۲)، ابو داؤد (۱۲۶۵)، ابن ماجہ (۱۱۵۲)، احمد (۸۲/۵)، نسائی مع السنن الكبرى (۸۵۱)، ابن خزيمة (۱۱۲۵)، ابو عوانة (۳۰/۲)، ابن حبان (۲۱۹۱)، بیہقی (۴۸۲/۲)]

”ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں تھے، اس نے مسجد کے ایک کونے میں دو رکعت نماز پڑھی پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا، جب رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو فرمایا: ”اے فلاں! تم نے دو نمازوں میں سے کون سی شمار کی ہے؟ کیا وہ نماز جو تو نے اکیلے ادا کی یا وہ نماز جو ہمارے ساتھ ادا کی ہے؟“

اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے مسجد کے کونے میں بھی نفل نماز یعنی سنت وغیرہ نہیں پڑھ سکتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:

« اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَقُمْتُ اُصَلِّي الرَّكْعَتَيْنِ فَحَدَّبَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ اَتُصَلِّي الصُّبْحَ اَرْبَعًا؟ » [مستدرک حاکم (۱۱۹۵)، ابو داؤد طیالسی (۲۷۳۶)، ابن حبان (۲۲۱/۶)]

”نماز کے لیے اقامت کہی گئی، میں دو رکعتیں پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے کھینچ لیا اور کہا: ”کیا تم صبح کی چار رکعت پڑھتے ہو۔“

علامہ غلام رسول سعیدی صحیح مسلم کی شرح میں رقمطراز ہیں: ”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اقامت کے وقت مطلق سنتیں پڑھنے سے منع کرتے تھے۔ بظاہر اس حدیث سے امام شافعی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ فجر کی سنتوں کی تاکید بھی رسول اللہ ﷺ نے کی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ ہی نے اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھنے پر ناراضی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لیے اتباع حدیث کا تقاضا ہے کہ اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھنا شروع نہ کرے، کیونکہ جن کے حکم سے سنتیں پڑھی جاتی ہیں وہ خود منع فرما رہے ہیں۔“

علامہ وشقانی لکھتے ہیں: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کو مارتے تھے جو اقامت فجر کے وقت سنتیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ انتہائی غلط طریقہ مروج ہے کہ مسجد میں فجر کی جماعت کھڑی ہوتی ہے اور لوگ جماعت کی صفوں سے متصل کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ امام با آواز قرآن پڑھ رہا ہے جس کا سنا فرض ہے اور سنتوں میں مشغول شخص اس فرض کو ترک کر رہا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ سنتوں میں مشغول شخص بظاہر فرض اور جماعت سے اعراض کر رہا ہے اور تیسری خرابی یہ ہے کہ اس کا یہ عمل اس باب کی احادیث کی مخالفت کو مستلزم ہے۔“ [شرح صحیح مسلم (۲/۴۲۰-۴۲۱)، مطبوعہ فرید بک سنٹال، اردو بازار لاہور]

علامہ غلام رسول سعیدی بریلوی کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ فرض نماز کے ہوتے ہوئے جو لوگ سنتوں میں مشغول رہتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی مخالفت کرتے ہیں اور عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک پٹائی کے لائق ہیں اور سنت ادا کر کے فرض سے اعراض کر رہے ہیں۔ لہذا ہر نمازی کو چاہیے کہ نماز کے لیے بڑی مستعدی کے ساتھ حاضر ہو اور سنتیں اس کے وقت پر ادا کرے، جب فرض جماعت کے لیے اقامت ہو تو نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے جیسے رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نماز توڑ دی تھی اور انھیں کھینچ کر جماعت میں شامل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشنے۔ (آمین!)

فجر کی سنتوں کی قضا کا طریقہ

(سوال) اگر فجر کی سنتیں جماعت سے پہلے ادا نہ کی جائیں تو کیا بعد میں پڑھ لی جائیں؟ اگر ہاں تو جواب عنایت فرمادیں۔

(جواب) اگر کسی آدمی کی فجر کی سنتیں کسی سبب کے باعث فوت ہو جائیں یعنی وہ انہیں وقت پر ادا نہ کر سکے تو نماز فجر ادا کرنے کے بعد پڑھ سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تقریری سنت سے یہ بات واضح ہے۔ آپ ﷺ کی احادیث تین اقسام کی ہیں:

①..... قول ②..... فعل ③..... تقریر

تقریر کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے کوئی عمل سرانجام دیا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اس سے منع نہ کیا ہو۔ آپ ﷺ کا منع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے اسے برقرار رکھا ہے۔ وگرنہ غلط کام کو نبی ﷺ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ صحابی رسول قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصُّبْحَ وَ لَمْ يَكُنْ رَكَعَ الرَّكَعَتَيْنِ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَمَّا سَلَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فَرَكَعَ رَكَعَتِي الْفَجْرِ وَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ إِلَيْهِ فَلَمْ يُنْكِرْ ذَلِكَ عَلَيْهِ » [موارد الظمان (۶۲۴)،

ابن خزيمة (۱۱۱۶)، مستدرک حاکم (۱/۲۷۴)، دارقطنی (۱/۳۷۲)، بیہقی (۲/۴۸۳)، المحلی لابن حزم (۳/۱۱۲)، نبل المقصود (۱۲۶۸)]

”انھوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی اور نماز فجر سے پہلے دو رکعت سنتیں ادا نہیں کی تھیں۔ جب رسول

اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو انھوں نے کھڑے ہو کر فجر کی دو سنتیں ادا کیں۔ نبی ﷺ ان کی طرف دیکھ رہے تھے، آپ ﷺ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔“
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں فوت ہو جائیں تو وہ نماز فجر کے بعد انھیں ادا کر سکتا ہے۔ علامہ ابو الحسن سندھی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”يُدُلُّ عَلَى الْإِدْنِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ لِمَنْ فَاتَهُمَا ذَلِكَ“ [حاشیہ سندھی علی ابن ماجہ (۳۵۲/۱)]

”جس آدمی کی فجر سے پہلے دو رکعت فوت ہو جائیں یہ حدیث اسے فجر کی نماز کے بعد ادا کرنے کی اجازت پر دلالت کرتی ہے۔“

علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”وَ قَالَ ابْنُ الْمَلِكِ : سُكُوْتُهُ يَدُلُّ عَلَى قَضَاءِ سُنَّةِ الصُّبْحِ بَعْدَ فَرَضِهِ لِمَنْ لَمْ يُصَلِّهَا قَبْلَهُ وَ بِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ“ [مرعاة المفاتيح (۴۶۵/۳)]

”ابن الملک نے کہا: ”نبی ﷺ کا اس بات پر خاموش رہنا دلالت کرتا ہے کہ صبح کی سنتیں فرض ادا کر لینے کے بعد اس آدمی کے لیے بطور قضا ادا کرنا جائز ہے جس نے یہ سنتیں فرض سے پہلے ادا نہیں کیں اور یہی قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔“
شیخ حسین بن محمود الزیادانی نے مشکوٰۃ کے حاشیہ ”الفتاح“ میں، شیخ علی بن صلاح الدین نے ”منہل الینایع شرح المصایح“ میں

اور علامہ زینی نے ”شرح المصایح“ میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ [ملاحظہ ہو: مرعاة المفاتيح (۴۶۵/۳)]

ہمارے حنفی بھائیوں کا کہنا ہے کہ فرض ادا کرنے کے بعد طلوع شمس تک سنتیں ادا نہیں کر سکتا، وہ اس کی دلیل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ لَمْ يُصَلِّ رَكْعَتِي الْفَجْرِ فَلْيُصَلِّهَا بَعْدَ مَا تَطَلَّعَ الشَّمْسُ » [ترمذی، کتاب الصلاة: باب ماجاء فی إعادتهما بعد طلوع الشمس (۴۲۳)]

”جس نے فجر کی دو رکعت نہیں پڑھیں وہ انھیں طلوع شمس کے بعد پڑھے۔“

اولاً: یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں قتادہ بن دعامة السدوسی مدلس راوی ہے اور یہ روایت معصن ہے، چنانچہ ضعیف ہے۔
ثانیاً: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جن کے حنفی حضرات مقلد ہیں، کے نزدیک اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو نہ فرضوں کے بعد ادا کرے اور نہ طلوع شمس ہی کے بعد۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

”وَ إِذَا فَاتَتْهُ رَكْعَتَا الْفَجْرِ لَا يَقْضِيهَا قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ لِأَنَّهُ يَنْقُي نَفْلًا مُطْلَقًا وَ هُوَ مَكْرُوهٌ بَعْدَ الصُّبْحِ وَ لَا بَعْدَ ارْتِفَاعِهَا عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَ أَبِي يُوسُفَ“ [الهداية (۷۲/۱)، طبع بیروت، باب إدراك الفريضة]

” اور جب آدمی سے فجر کی دو رکعتیں فوت ہو جائیں تو انہیں سورج نکلنے سے پہلے قضا نہ کرے۔ اس لیے کہ اب وہ مطلق نفل ہیں اور صبح کی نماز کے بعد نفل ادا کرنا مطلق طور پر مکروہ ہیں اور نہ انہیں سورج نکلنے کے بعد ہی ادا کرے، یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے۔“

صاحب ہدایہ کی توضیح سے معلوم ہوا کہ فقہ حنفی میں شیخین کے نزدیک جس کی صبح کی سنتیں رہ جائیں نہ وہ صبح کی نماز کے بعد ادا کرے اور نہ طلوع شمس ہی کے بعد۔ یعنی ان کا موقف صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے اور ضعیف حدیث کے بھی۔ کیونکہ صحیح حدیث کی رو سے فجر کی فوت شدہ سنتیں نماز فجر ادا کرنے کے بعد قضا کی جاسکتی ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور جن احادیث میں مطلق طور پر نماز فجر کے بعد نماز کی ممانعت ہے ان میں سے یہ دو رکعت صحیح حدیث کی رو سے مقید ہیں۔ لہذا ان کے ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا

(سوال) فجر کی سنتوں کے بعد بعض بھائی لیٹ جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا سنت ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

(جواب) فجر کی سنتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے: ”بَابُ الضُّجْعَةِ عَلَى الشَّقِّ الْأَيْمَنِ بَعْدَ رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ“ (یعنی فجر کی دو رکعتوں کے بعد دائیں کروٹ لیٹنے کا بیان۔) اور اس کے تحت یہ حدیث درج کی ہے:

« عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ » [بخاری، کتاب التہجد، باب الضجعة على الشق الايمن بعد ركعتي الفجر (۱۱۶۰)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو رکعتیں پڑھتے تو دائیں کروٹ لیٹ جاتے۔“

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ فَلْيُضْطَجِعْ عَلَى يَمِينِهِ » [ترمذی، کتاب الصلوٰۃ: باب ما جاء في الاضطجاع بعد ركعتي الفجر (۴۲۰)]

”جب تم میں سے کوئی فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) پڑھ لے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جائے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان قولی اور فعلی احادیث سے معلوم ہوا کہ فجر کی دو رکعت پڑھ لینے کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ فعل بھی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم بھی دیا کرتے تھے۔

لہذا ہر نمازی کے لیے دو رکعت کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا سنت ہے، اس پر عمل کرنا چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متروکہ سنتوں

میں سے یہ سنت بھی ہے جس پر بہت کم عمل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھنا

سوال ہمارے ہاں بعض افراد ظہر سے پہلے چار کی بجائے دو سنتیں پڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ بھی جائز ہے کیا یہ درست ہے؟
جواب ظہر کی فرض نماز سے پہلے رسول اکرم ﷺ چار رکعات پڑھتے اور کبھی دو رکعت پڑھ لیتے۔ دونوں طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

«عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ رُكْعَاتٍ رُكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَ رُكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا» [بخاری، کتاب التہجد: باب الركعتين قبل الظهر (۱۱۸۰)]

”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے دس رکعتیں یاد کیں ہیں، دو رکعتیں ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں ظہر کے بعد اور دو رکعتیں مغرب کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے۔“
 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَدْعُ أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ وَ رُكْعَتَيْنِ قَبْلَ العُدَاةِ» [بخاری، کتاب التہجد: باب الركعتين قبل الظهر (۱۱۸۲)]

”نبی ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور فجر سے پہلے دو رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔“
 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
 ”وَالْأُولَى أَنْ يُحْمَلَ عَلَى حَالَيْنِ فَكَانَ تَارَةً يُصَلِّيُ اثْنَتَيْنِ وَ تَارَةً يُصَلِّيُ أَرْبَعًا وَقِيلَ هُوَ مَحْمُولٌ عَلَى أَنَّهُ كَانَ فِي الْمَسْجِدِ يَقْتَصِرُ عَلَى رُكْعَتَيْنِ وَ فِي بَيْتِهِ يُصَلِّيُ أَرْبَعًا“ [نیل الأوطار (۱۸/۳)، فقہ السنۃ (۱/۱۸۷)]

”بہتر یہ ہے کہ ان احادیث کو دونوں حالتوں پر محمول کیا جائے۔ آپ ظہر سے پہلے کبھی دو رکعتیں پڑھتے تھے اور کبھی چار رکعات۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی ﷺ گھر میں چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور مسجد میں دو رکعتیں۔“
 سیدنا ابن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما نے جیسے دیکھا ویسے ہی بیان کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے گھر میں چار رکعتیں پڑھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

«عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ يُصَلِّي فِي بَيْتِي قَبْلَ الظُّهْرِ أَرْبَعًا» [مسلم، کتاب صلاة المسافرين: باب جواز النافلة قائماً وقاعداً (۷۳۰)، ابو داؤد (۱۲۵۱)]

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعتیں ادا کرتے تھے۔“

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے اور اگر چار پڑھے تب بھی درست ہے۔

خطبہ جمعہ کا اہتمام

(سوال) کیا کسی مسجد میں خطبہ جمعہ شروع کرنے کی شرائط ہیں؟ کیا کسی حدیث میں تصریح ہے کہ کتنی بڑی بستی ہو اور کتنی تعداد میں لوگ موجود ہوں تو خطبہ جمعہ کا اہتمام کیا جائے؟

(جواب) جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر فرض عین ہے سوائے چار اشخاص کے یعنی غلام، عورت، بچہ اور مریض۔ [ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: باب الجمعة للملوك والمرأة (۱۰۶۷)]
اس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اے ایمان والو! جب جمعہ والے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ آؤ اور لین دین چھوڑ دو۔“ (الجمعة: ۹)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جہاں بھی اہل ایمان ہوں گے وہاں جمعہ پڑھا جائے گا، کیا دیہات والوں میں اہل ایمان نہیں ہوتے؟ تو کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے شہر یا بستی شرط نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی اہل ایمان ہوں گے وہ نماز جمعہ پڑھیں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ﴿وَذُرُوا النَّبِيعَ﴾ سے مراد کاروباری منڈیاں ہیں اور یہ صرف شہروں میں ہوتی ہیں دیہاتوں میں نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں خرید و فروخت اور کاروبار نہ ہوتا ہو، لوگ آپس میں لین دین نہ کرتے ہوں۔ یہاں بیع سے مراد دنیا کے مشاغل ہیں اور وہ جیسے بھی ہوں اور جس قسم کے بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں جمعہ کی اذان کے بعد انھیں ترک کرنے کا حکم ہے، کیا اہل دیہات کے لیے مشاغل دنیا نہیں ہوتے؟ کیا کھیتی باڑی، دکانداری اور کاروبار مشاغل دنیا سے کوئی مختلف چیزیں ہیں؟

مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان پر جمعہ ضروری ہے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ شہروں میں جمعہ ادا کرو اور دیہاتوں میں نہ کرو بلکہ آیت کریمہ اور حدیث میں مطلق طور پر جمعہ کی فرضیت کا ذکر ہے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ ہزم النبیۃ جو حرہ بنی بیاضہ میں ایک جگہ ہے، وہاں جمعہ ادا کیا گیا تھا اور وہاں چالیس آدمی تھے۔ یہ گاؤں مدینہ سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری اور ابوداؤد میں ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ والی مسجد کے علاوہ اسلام میں پہلا جمعہ ”جوائی“ میں ادا کیا گیا جو بحرین کے دیہاتوں میں سے ایک دیہات تھا۔

کتب احادیث میں جمعہ کے قیام کے لیے لوگوں کی تعداد یا بستی کا بڑا اور چھوٹا ہونا کوئی شرط نہیں لگائی گئی، یہ لوگوں کی اپنی وضع کردہ شرائط ہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اہل بحرین کی طرف لکھا تھا:

« جَمَعُوا حَيْثُ كُنْتُمْ » [ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات: باب من كان يرى الجمعة في القرى وغيرها (٥٠٦٨)]
 ”تم جہاں کہیں بھی ہو جمعہ ادا کرو۔“
 اہل دیہات کے جمعہ کے متعلق علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”التحقیقات العلیی“ ملاحظہ فرمائیں۔

علاقائی زبانوں میں خطبہ جمعہ

سوال کیا جمعہ کے دونوں خطبوں میں عربی کے علاوہ اور کوئی زبان استعمال کر کے مخاطبین کو مسائل سمجھائے جاسکتے ہیں؟
 صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، انھوں نے وہاں جا کر کون سی زبان استعمال کی تھی؟ اس مسئلہ کی وضاحت کریں۔
جواب خطبہ کا مقصد سامعین و حاضرین کو وعظ و نصیحت ہے، جس بیان میں افہام (سمجھانا) نہ ہو وہ تو وعظ ہی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو ان کی قوم کی زبان سمجھا کر بھیجا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
 ”اور ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قومی زبان کے ساتھ تا کہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔“ [ابراہیم: ٤]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خطاب کرنے والے حضرات کا خطبہ تب ہی مؤثر ہوگا جب وہ سامعین کی زبان میں ہوگا اور اگر سامعین کی زبان کوئی اور ہو اور خطیب کی کوئی اور تو سامعین کو اس وعظ کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور مقصود فوت ہو جائے گا۔ صحیح مسلم وغیرہ میں خطبہ جمعہ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَ يُذَكِّرُ النَّاسَ » [مسلم، کتاب الجمعة: باب ذكر الخطبتين قبل الصلوة (٨٦٢)]
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ کرتے۔“

اور ظاہر ہے کہ افہام (سمجھانا) نہ ہو تو وعظ ہی نہیں ہوتا اور لفظ خطبہ بھی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سامعین کی زبان کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ خطبہ خطاب سے ہے اور خطاب پر صرف عربی زبان کی پابندی اصل مقصود کو فوت کرتی ہے، جو خطاب سے مقصود ہوتا ہے۔ فتاویٰ شامی (٥٣٣/١) میں مذکورہ مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے:

”مصنف نے خطبہ کے عربی میں ہونے کی قید نہیں لگائی کیونکہ باب ”صفة الصلاة“ میں گزر چکا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ شرط نہیں خواہ سامعین عربی پر قادر ہی ہوں برخلاف صاحبین کے کیوں کہ ان کے نزدیک عربی میں ہونا شرط ہے مگر عربی سے عاجز ہو تو پھر نزدیک بھی غیر عربی میں جائز ہے۔“

معلوم ہوا کہ ائمہ احناف کے ہاں بھی خطبہ کے لیے عربی زبان شرط نہیں۔ صحابہ کرام میں عربی زبان کے علاوہ خطبہ دینے کی مثال اس لیے نہیں کہ ان کی اور ان کے سامعین کی زبان عربی تھی۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حافظ عبداللہ محدث رویزی رحمۃ اللہ علیہ کا فتاویٰ: (٣٧١/٢) تا (٣٨٧)

نماز جمعہ کی کل رکعتیں

سوال نماز جمعہ کی کل رکعتیں کتنی ہیں اور کس ترتیب سے پڑھی جاتی ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب نماز جمعہ کی صرف دو رکعتیں فرض ہیں اور ان سے پہلے جمعہ کے نام سے سنن ثابت نہیں البتہ نوافل جتنے قسمت میں ہوں پڑھ لے، کم از کم دو رکعت پڑھ کر مسجد میں بیٹھیں، اس کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص جمعہ والے دن غسل کرے اور حسب استطاعت پاکیزگی حاصل کرے، تیل یا خوشبو لگائے پھر گھر سے نکلے دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے پھر جتنی مقدر ہو نماز پڑھے اور امام کے کلام کے وقت خاموش ہو جائے تو اس کے گناہ جو اس جمعہ اور گزشتہ جمعہ کے درمیان ہوئے ہیں بخش دیے جاتے ہیں۔“ [صحیح بخاری، کتاب الجمعة: باب الدهن، الجمعة (۸۸۳)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے خطبہ سے پہلے مقدر بھر نوافل پڑھے جاسکتے ہیں، ان کی تعداد مقرر نہیں، اگر کوئی شخص حالت خطبہ میں آجائے تو دو رکعت پڑھ کر بیٹھ جائے جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی شخص اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت نماز ادا کرے۔“ [بخاری، کتاب التہجد: باب ما جاء في التطوع مشني مشني (۱۱۶۶)]

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہے وہ چار رکعت پڑھ لے۔“ [صحیح مسلم کتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة (۸۸۱)]

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة وقبلها: (۹۳۷)، صحیح مسلم کتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة: (۸۸۲)]

پہلی حدیث قوی ہے اور دوسری فعلی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھی جائیں، یہ افضل ہے اور اگر کوئی دو بھی پڑھ لے تو جائز ہے۔

نماز جمعہ کا صحیح وقت

سوال کیا جمعہ کے دن زوال ہے؟ اگر زوال کا وقت جمعہ کے دن 12:38 ہو اور مسجد میں خطبہ 12:30 پر شروع ہو تو کیا ایسی مسجد میں خطبہ سے پہلے سنتیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا امام صاحب کا اتنی جلدی خطبہ دینا درست ہے؟

جواب جمعہ کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے کیونکہ یہ ظہر کا قائم مقام ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام

بخاری اور جمہور صحابہ و تابعین ائمہ محدثین رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”بے شک نبی ﷺ جمعہ کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے جب سورج ڈھل جاتا۔“ [صحیح بخاری، کتاب الجمعة: باب الجمعة إذا زالت الشمس: (۹۰۴)]

امام بخاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”عمر فاروق، علی بن ابی طالب، نعمان بن بشیر اور عمرو بن حریر رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے۔“
علامہ عبید اللہ مبارکپوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اس حدیث میں جمہور کی دلیل ہے کہ جمعہ کا اول وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب سورج ڈھل جائے جیسے ظہر کا وقت ہے اور جمعہ زوال کے بعد ہی پڑھا جائے، اسی طرح اس بات پر سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ اس وقت ادا کرتے تھے جب سورج ڈھل جاتا پھر ہم لوٹتے اور سایہ تلاش کرتے۔“

[مرعاة المفاتیح: (۴/۴۸۷)، مسلم کتاب الجمعة: باب صلاة الجمعة، حين نزول الشمس (۸۶۰)]

اسی طرح جو بھائی جمعہ زوال سے قبل پڑھنے کے قائل ہیں ان کے دلائل کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”جو دلائل ہم نے ذکر کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زوال سے قبل جمعہ ادا کرنے کی کوئی صحیح صریح دلیل موجود نہیں۔“ [مرعاة المفاتیح (۴/۴۹۰)، نیز دیکھیں تحفة الاحوذی (۳/۳۷)، طبع بیروت]

امام ترمذی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وہ بات جس پر اکثر اہل علم کا اجماع ہے کہ جمعہ کا وقت سورج ڈھل جائے تو شروع ہوتا ہے جیسے ظہر کا وقت ہے اور یہی قول امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔“ [ترمذی، ابواب الجمعة: باب ما جاء في وقت الجمعة] لہذا راجح اور درست بات جو صحیح و صریح احادیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ نماز جمعہ زوال کے بعد ادا کی جائے۔ رہا مسجد میں آکر سنت ادا کرنا، تو یاد رہے کہ تحیۃ المسجد جب بھی آپ مسجد میں داخل ہوں گے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھ کر بیٹھیں، احادیث صحیحہ صریحہ سبھی بات ظاہر ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز سورۃ الکہف پڑھنے کی فضیلت

(سوال) جمعہ المبارک کے دن سورۃ الکہف پڑھنے کی کیا فضیلت ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

(جواب) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”جس آدمی نے جمعہ والے دن سورۃ الکہف کی قراءت کی اس کے لیے دو جمعوں کے درمیان نور روشن ہو جاتا ہے۔“

[المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الکہف (۲/۳۶۸)]

انہی سے دوسری حدیث میں ہے:

”جس نے جمعہ والے دن سورۃ الکہف کی تلاوت کی اس کے لیے اس کے اور بیت اللہ کے درمیان نور روشن ہو جاتا ہے۔“

[بیہقی: (۲۴۹/۳)]

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے جبکہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے نعیم بن حماد کو ”ذومن اکیر“ (منکر روایات بیان کرنے والا) قرار دیا ہے۔ امام ذہبی کی جرح درست نہیں ہے۔ کیونکہ نعیم اس روایت میں منفر نہیں ہے۔ یزید بن مخلد اور سعید بن منصور نے اس کی متابعت کی ہے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ارواء الغلیل (۶۲۶، ۳/۹۶، ۹۵) ملاحظہ ہو۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ والے دن سورۃ الکہف کی تلاوت کرنے سے دو جمعوں کے درمیان تک نور روشن کر دیا جاتا ہے یا اس آدمی سے لے کر بیت اللہ تک نور روشن کر دیا جاتا ہے۔ لہذا سے جمعہ المبارک والے دن پڑھنا بالکل صحیح ہے۔

جمعہ کے روز عید آنے پر جمعہ کی رخصت

سوال اگر کے جمعہ روز عید آجائے تو کیا جمعہ ادا نہ کرنے کی رخصت شرعی طور پر ہے؟

جواب اگر جمعہ کے روز عید آجائے تو عید کی نماز ادا کی جائے گی البتہ جمعہ کے بارے میں اختیار ہے جو پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔

ایاس بن ابی رملہ کہتے ہیں کہ میری موجودگی میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

”کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں دو عیدوں (یعنی جمعہ المبارک اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ) کو ایک دن جمع

ہوتے دیکھا؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں!“ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر کیا کیا؟“ انھوں نے

کہا: ”آپ نے عید پڑھائی اور جمعہ کے بارے رخصت دی اور فرمایا: ”جو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔“ [ابوداؤد،

کتاب الصلاة: باب اذا وافق يوم الجمعة: يوم عيد (۱۰۷۰)]

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دو عیدیں اکٹھی ہو گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عید کی نماز پڑھائی

پھر فرمایا: ”جو جمعہ ادا کرنا چاہے وہ آئے اور جو پیچھے رہنا چاہے وہ پیچھے رہ جائے۔“ (ابن ماجہ: کتاب إقامة

الصلوات: باب ما جاء فيما اجتمع العیدان: (۱۳۱۲)]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

”ایک دن میں دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں جو جمعہ پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے اور جو (اپنے گھر میں) بیٹھنا پسند کرے

بیٹھا رہے۔“ [عبدالرزاق، کتاب الصلاة: باب فی العیدین یجتمعان: (۵۸۳۸)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر عید اور جمعہ اکٹھے آجائیں تو عید کی نماز پڑھی جائے اور جمعہ کے لیے رخصت ہے۔

منبر کی تیسری سیڑھی پر خطبہ دینا

سوال کیا منبر کی تیسری سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا جائز ہے؟ اگر جائز ہے، تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے، یہ عمل سنت

نبوی ﷺ ہے یا خاصہ نبوی ﷺ؟

جواب بعض احادیث میں نبی کریم ﷺ کا منبر کی تیسری سیڑھی پر چڑھنے کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ ایک دن منبر کی طرف تشریف لائے، جب آپ پہلی سیڑھی پر چڑھے تو کہا ”آمین“ پھر دوسری پر چڑھے تو کہا ”آمین“ پھر تیسری پر چڑھے تو کہا ”آمین“ پھر جب آپ منبر سے نیچے (فارغ ہو کر) اترے تو ہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! آج آپ سے خلاف معمول ایک بات کو سنا ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”کیا تم نے میری بات کو سنا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ نے فرمایا: ”جب میں سیڑھی پر چڑھا تو جبریل (ﷺ) میرے سامنے آئے اور کہا: ”جس نے اپنے والدین یا ان دونوں میں سے ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا وہ (رحمت الہی سے) دور ہوا۔“ تو میں نے: ”آمین“ کہا۔ جبریل (ﷺ) نے پھر کہا: ”جس کے سامنے آپ کا ذکر کیا گیا اور اس نے آپ پر درود نہ پڑھا تو وہ بھی (رحمت الہی سے) دور ہوا“ اس پر بھی میں نے ”آمین“ کہا۔ پھر جبریل (ﷺ) نے کہا: ”جس نے رمضان کو پایا لیکن گناہوں سے مغفرت حاصل نہ کی وہ بھی (رحمت الہی سے) دور ہوا“ تو میں نے کہا ”آمین“۔ [المستدرک للحاکم، کتاب البر والصلۃ (۱۵۳/۴)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منبر کی تیسری سیڑھی پر چڑھنا بھی جائز و درست ہے۔ اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کی خصوصیت کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں۔

خطبہ جمعہ کے دوران سنتوں کا حکم

سوال خطبہ جمعہ کے دوران آنے والے افراد بیٹھ کر خطبہ سنیں یا پہلے دو رکعت ادا کریں؟ قرآن و حدیث سے مسئلہ بتادیں۔

جواب جب امام خطبہ جمعہ دے رہا ہو اور اس وقت کوئی آدمی آئے تو اسے دو رکعت پڑھے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سلیم غطفانی رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور دو رکعت پڑھے بغیر ہی بیٹھ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «أَصَلَّيْتَ؟» «کیا تو نے (دو رکعتیں) پڑھ لی ہیں؟» تو اس نے جواب دیا: ”نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ» «(کھڑے ہو جاؤ اور) دو رکعتیں ادا کرو۔» [بخاری، کتاب الجمعة: باب من جاء و الإمام يخطب صلى ركعتين خفيفتين (۹۳۱)، ابن ماجہ (۱۱۱۴)، ابن خزيمة (۱۸۳۵)]

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ حضرت سلیم غطفانی رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ خاص ہے، کسی دوسرے شخص کو دو رکعت ادا کرنے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے اور سراسر صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عام حکم بھی دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

« إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَلْيَتَحَوَّزْ فِيهِمَا » [مسلم،

کتاب الجمعة: باب التحية والإمام يخطب (۸۷۵)

”جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے روز اس وقت آئے جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اسے ہلکی سی رکعتیں پڑھ لینی چاہیں۔“ صحیحین کی ان دونوں روایات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا سنت ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ مَنْ دَخَلَ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ لَا يَجْلِسُ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكَعَتَيْنِ وَ هُوَ قَوْلُ

كَثِيرٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ “ [شرح السنة (۴/۲۶۶)]

”یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص خطبہ کے دوران آئے وہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے، یہی اکثر اہل علم کا مسلک ہے۔“

جمعہ کے بعد سنتیں دو ہیں یا چار؟

سوال نماز جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھی جائیں گی یا چار، مسئلہ کی رو سے صحیح کیا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب کتب احادیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں بھی ادا کی ہیں اور چار کی بھی اجازت ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعًا وَ فِي

رِوَايَةٍ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا » [نسائی، کتاب الجمعة، باب عدد

الصلوة بعد الجمعة في المسجد (۱۴۲۷) ابو داود، کتاب الصلاة: باب الصلاة بعد الجمعة (۱۱۳۱)،

ترمذی (۵۲۳)، ابن ماجہ (۱۱۳۲)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی آدمی نماز جمعہ ادا کرے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے بعد جو چار رکعتیں پڑھنا چاہے وہ چار رکعتیں پڑھ سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ چار

رکعت پڑھنا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي قَبْلَ الظُّهْرِ رَكَعَتَيْنِ وَ بَعْدَهَا رَكَعَتَيْنِ وَ

بَعْدَ الْمَغْرِبِ رَكَعَتَيْنِ فِي بَيْتِهِ وَ بَعْدَ الْعِشَاءِ رَكَعَتَيْنِ وَ كَانَ لَا يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتَّى

يُنْصَرِفَ فَيُصَلِّي رَكَعَتَيْنِ » [بخاری، کتاب الجمعة: باب الصلاة بعد الجمعة و قبلها (۹۳۷)،

ابوداؤد (۱۲۵۲)، ترمذی (۵۲۲)]

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد دو دو رکعتیں پڑھتے، مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر میں، دو رکعتیں

عشاء کے بعد اور جمعہ کے بعد آپ گھر میں دو رکعتیں پڑھتے۔“

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنا بھی درست ہے اور دو بھی۔ لیکن یاد رہے کہ چار پڑھنا افضل ہے کیونکہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قوی ہے اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث فعلی ہے اور قوی حدیث فعلی حدیث پر مقدم ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ سنت خواہ چار رکعتیں پڑھی جائیں یا دو ان کا مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

« فَإِنَّ أَفْضَلَ الصَّلَاةِ صَلَاةَ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ » [بخاری، کتاب الاذان: باب صلاة الليل (۷۳۱)، أبو عوانة (۲/۲۹۴)، ابو داؤد (۱۴۴۷)، ترمذی (۴۵۰)]
 ”آدمی کا فرض نماز کے علاوہ باقی نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے۔“

لہذا اس طرح کے معاملات کہ جن میں اختیار ہے، فضول بحث و تکرار درست نہیں۔ جو چار پڑھنا چاہے وہ چار پڑھ لے اور جو دو پڑھنا چاہے وہ دو پڑھ لے، دونوں طرح جائز اور درست ہوگا۔

خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ کے لیے الگ الگ امام

سوال اگر خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نماز جمعہ کی امامت کر دے تو کیا نماز ہو جائے گی؟
جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا معمول تو یہی تھا کہ وہ خطبہ بھی خود ہی دیتے تھے اور نماز بھی خود ہی پڑھاتے تھے لیکن اگر کسی وقت ایک آدمی نے خطبہ دیا اور دوسرے نے جماعت کرادی تو نماز ادا ہو جائے گی، نماز نہ ہونے کی کوئی دلیل معلوم نہیں۔

خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی والی حدیث کا مفہوم

سوال صحیح مسلم کی حدیث کا مفہوم ہے کہ چھوٹا خطبہ اور لمبی نماز امام کے عقل مند ہونے کی نشانی ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ اگر واقعی یہ مراد ہے کہ خطبہ چھوٹا اور نماز لمبی ہونی چاہیے تو اس صحیح حدیث پر عمل کب ہوگا؟
جواب صحیح مسلم میں عمار رضی اللہ عنہ سے حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

« إِنْ طَوَّلَ صَلَاةَ الرَّجُلِ وَقَصَّرَ خُطْبَتَهُ مِثْنَةً مِنْ فَهْمِهِ فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ وَإِنْ مَنِ الْبَيَانَ سِحْرًا » [مسلم، کتاب الجمعة: باب تخفيف الصلوة والخطبة (۸۶۹)]

”بلاشبہ آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور اس کے خطبے کا چھوٹا ہونا اس کی فقاہت کی علامت ہے، تم نماز لمبی کرو اور خطبہ چھوٹا کرو، بلاشبہ بیان (موثر ہونے کے لحاظ سے) جادو (اثر) ہوتے ہیں۔“

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ جمعہ کی نماز خطبہ جمعہ سے لمبی ہو بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ نماز جمعہ عام نمازوں سے لمبی ہو اور خطبہ جمعہ عام خطبات سے چھوٹا ہو۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل خطبہ بھی دیا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ

آپ نے فجر کے بعد ظہر تک پھر ظہر سے عصر تک پھر سورج غروب ہونے تک بھی خطبہ دیا جس میں آپ نے گزشتہ اور مستقبل کی باتوں کا ذکر فرمایا۔ جابر بن سرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو خطبے ارشاد فرماتے تھے، ان دونوں کے درمیان آپ بیٹھتے تھے۔ آپ (ان میں) قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے، آپ کی نماز درمیانی ہوتی اور خطبہ بھی درمیانہ ہوتا۔“ [صحیح مسلم، کتاب الجمعة: باب ذکر الخطين قبل الصلوة (۸۶۲)، (۸۶۶)]

اسی طرح ام ہشام کی روایت میں ہے کہ انھوں نے سورہ ق والقرآن المجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطبہ جمعہ میں سن کر یاد کی۔ [صحیح مسلم، کتاب الجمعة: باب تخفيف الصلوة والخطبة: (۸۷۳)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ درمیانہ ہونا چاہیے، عام خطبوں کی طرح لمبا نہ ہو اور نماز جمعہ عام نمازوں سے لمبی ہو کیونکہ عام طور پر امام کو نماز ہلکی پڑھانے کا حکم ہے جو نمازیوں پر مشقت کا باعث نہ ہو اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ خطبہ ایک نہیں بلکہ دو ہوتے ہیں، اس لیے جمعہ کے دو خطبوں کا وقت تو نماز سے زیادہ ہی ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب!

تین رکعات وتر تقسیم کر کے پڑھنا

سوال کیا ترووں کا یہ طریقہ درست ہے کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور پھر الگ سے ایک رکعت پڑھی جائے؟ اور کیا یہ سنت سے ثابت ہے؟

جواب نماز وتر کی تین رکعات اس طرح ادا کرنا کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیں پھر ایک رکعت الگ ادا کر لیں، بالکل صحیح اور سنت نبوی کے مطابق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی و فعلی احادیث اس کی مؤید ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی نماز کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمْ الصُّبْحَ صَلَّى رَكْعَةً وَاحِدَةً تُؤْتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلَّى»

[بخاری، ابواب الوتر: باب ماجاء فی الوتر (۹۹۰)]

”رات کی نماز دو دو رکعت ہے، جب تم میں سے کسی ایک کو صبح کا ڈر ہو تو وہ ایک رکعت ادا کرے، جو نماز اس نے ادا کی ہے وہ اسے وتر بنا دے گی۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُؤْتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ فَإِذَا فَرَغَ مِنْهَا اضْطَمَحَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ» [ابو داؤد، كتاب التطوع، باب صلاة الليل (۱۳۳۵)، مسلم

(۷۳۶)، ترمذی (۴۴۱، ۴۴۰)، نسائی (۱۶۹۷)]

”بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعات نماز ادا کرتے، ان میں سے ایک رکعت وتر ادا کرتے، جب اس سے فارغ ہو جاتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔“

انس بن سیرین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ”صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں مجھے بتاؤ، ہم ان میں لمبی قراءت کرتے ہیں؟“ تو انہوں نے کہا:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ مَثْنِي مَثْنِي وَ يُؤْتِرُ بِرُكْعَةٍ وَ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْعُدَاةِ» [بخاری، کتاب الوتر: باب ساعات الوتر (۹۹۵)]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت پڑھتے تھے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے۔“ اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طویل حدیث میں بھی ایک رکعت وتر کا ذکر ہے۔ [ابو داؤد (۱۳۵۳، ۱۳۵۵)، مسلم (۷۶۳)] ان قوی اور فعلی احادیث سے واضح ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ رات کو دو دو رکعت نماز پڑھتے پھر آخر میں ایک رکعت وتر ادا کر لیتے، لہذا یہی صورت افضل معلوم ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُؤْتِرُ بِرُكْعَةٍ وَ كَانَ يَتَكَلَّمُ بَيْنَ الرُّكْعَتَيْنِ وَ الرُّكْعَةَ» [مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۹۱)، علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ (ارواء الغلیل (۲/۱۵۰)]

”بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان کلام کیا کرتے تھے۔“ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ فِي كُلِّ ثُنْتَيْنِ وَ يُؤْتِرُ بِوَاحِدَةٍ» [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة: باب ما جاء في الوتر بركعة (۱۱۷۷، ۱۳۵۸)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیتے تھے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے تھے۔“

اس روایت کے متعلق علامہ بویری فرماتے ہیں: ”هَذَا إِسْنَادٌ صَحِيحَةٌ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ“ (یہ سند صحیح ہے اس کے رجال ثقہ ہیں) [زوائد ابن ماجہ (ص/۱۸۰)، (رقم/۳۸۶)]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْصِلُ بَيْنَ الْوُتْرِ وَ الشَّفْعِ بِتَسْلِيمَةٍ وَ يُسَمِعُهَا»

[احمد (۳۳۳/۹)، صحیح ابن حبان (۲/۲۴۳۳)، طبرانی اوسط (۷۵۷)، تاریخ بغداد (۱۲/۳۱۴)، شرح معانی الآثار (۱/۲۷۸)، حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کو قوی کہا ہے۔ [فتح الباری (۲/۴۸۲)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر اور شفع میں سلام کے ذریعے فصل کرتے تھے اور آپ سلام ہمیں سناتے تھے۔“

نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يُسَلِّمُ بَيْنَ الرُّكْعَةِ وَ الرُّكْعَتَيْنِ فِي الْوُتْرِ حَتَّى يَأْمُرَ بِبَعْضِ حَاجَتِهِ»

[بخاری، کتاب الوتر: باب ما جاء في الوتر (۹۹۱)، شرح معانی الآثار: (۱/۲۷۹)، مؤطا (ص/۱۲۱)،

مسند شافعی (۱/۱۰۹)]

”بلاشبہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی ایک اور دو رکعت کے درمیان سلام پھیر دیتے تھے حتیٰ کہ اپنی کسی حاجت کے لیے حکم کر دیتے۔“

بکر بن عبد اللہ المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ ابْنَ عُمَرَ صَلَّى رُكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ قَالَ ادْخُلُوا إِلَيَّ نَاقِيَةً فَلَانَةَ ثُمَّ قَامَ فَأَوْتَرَ بِرُكْعَةٍ»
[ابن ابی شیبہ (۲/۲۹۲)]

”بے شک ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دو رکعت نماز ادا کی پھر سلام پھیر دیا پھر کہا: ”میرے پاس میری فلاں اونٹنی لے آؤ۔“ پھر کھڑے ہو گئے اور ایک رکعت وتر ادا کیا۔“

علامہ البانی رضی اللہ عنہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں: ”هَذَا إِسْنَادٌ صَحِيحٌ“ (یہ صحیح ہے) [إرواء الغلیل (۲/۱۴۷)]
امام طحاوی رضی اللہ عنہ نے سعید بن منصور کے طریق سے بیان کیا ہے کہ بکر بن عبد اللہ المزنی نے کہا:

«صَلَّى ابْنُ عُمَرَ رُكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَالَ يَا غُلَامُ! أَرَجُلٌ لَنَا ثُمَّ قَامَ فَأَوْتَرَ بِرُكْعَةٍ» [شرح معانی الآثار (۱/۲۷۹)، حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”سعید بن منصور نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔“ [فتح الباری (۲/۴۸۲)]

”ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دو رکعت نماز ادا کی پھر کہا: ”اے لڑکے! ہماری سواری لاؤ۔“ پھر کھڑے ہو گئے اور ایک رکعت وتر ادا کیا۔“
مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ تین وتر اس طرح ادا کرنا کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دیں، پھر ایک رکعت ادا کر لیں بالکل صحیح اور درست ہے۔ امام حاکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَقَدْ صَحَّ وَتُرُّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِثَلَاثِ عَشْرَةَ وَاحِدَةٍ وَعَشْرَةَ وَتِسْعٍ وَتِسْعٍ وَخَمْسٍ وَثَلَاثٍ وَوَاحِدَةٍ وَأَصْحَبُهَا وَتُرُّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرُكْعَةٍ وَوَاحِدَةٍ“ [مستدرک حاکم (۱/۶۱۰)، (رقم/۱۱۹)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ، تین اور ایک رکعت وتر ثابت ہیں اور صحیح ترین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رکعت وتر ادا کرنا ہے۔“

بہر کیف صحیح احادیث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وتر کی ایک رکعت علیحدہ ادا کرنا بالکل صحیح اور درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی احادیث سے ثابت ہے اور اس پر طعن کرنا صحیح احادیث اور صحابہ کرام پر طعن کرنے کے مترادف ہے اور اس کا انکار کرنا بجز جہالت کے اور کچھ نہیں۔

وتروں میں قنوت سے پہلے تکبیر

(سوال) کیا قنوت سے قبل اللہ اکبر کہنے والی روایت صحیح ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں؟

(جواب) عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت میں قنوت کرنے سے پہلے اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے، جسے امام ابن

عبدالبر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے۔ [الاستیعاب لابن عبد البر (۴/۴۵۰-۴۵۱)]

لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ اس میں ابان بن ابی عیاش متروک راوی ہے۔ ابان سے اس کو روایت کرنے والا حفص بن سلیمان بھی متروک ہے۔ [ابان کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: المغنی فی الضعفاء، ۱۰/۱۳]، تہذیب الکمال (۱/۴۸)، تہذیب التہذیب (۲/۴۰۰)، میزان الاعتدال (۱/۵۵۸)، لسان المیزان (۷/۲۰۰)۔ لہذا یہ روایت باطل ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے کہ اس حدیث کو ابان بن ابی عیاش سے حفص بن سلیمان کے علاوہ یزید بن ہارون، سفیان ثوری اور ہشام جیسے ثقات نے بھی بیان کیا ہے مگر ان میں سے کسی نے اللہ اکبر کہنے والا یہ اضافہ ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف روایت میں بھی قنوت سے پہلے اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے۔ [ابن ابی شیبہ (۱۰۰/۲) (رقم ۲۷۲۹)]

مگر یہ لیث بن ابی سلیم کی وجہ سے ضعیف ہے، لیث کو امام احمد نے مضطرب الحدیث، امام ابن معین اور امام نسائی رضی اللہ عنہما نے ضعیف اور امام ابن حبان اور حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہما نے اختلاط کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ [المغنی فی الضعفاء، ۲/۲۵۳]، تہذیب التہذیب (۸/۴۶۵)، میزان الاعتدال (۳/۴۲۰)، لسان المیزان (۷/۳۴۷)۔ لہذا دعائے قنوت کے لیے اللہ اکبر کہہ کر کانون تک ہاتھ اٹھانے والی روایات باطل ہیں، اس کا کوئی صحیح ثبوت موجود نہیں۔

وتر کی آخری رکعت

سوال کیا وتر کی آخری رکعت میں شامل ہونے سے ایک وتر ادا ہو جاتا ہے؟

جواب نماز باجماعت کی صورت میں مقتدی کو اتنی رکعات ہی ادا کرنی چاہئیں جتنی امام پڑھتا ہے، یہ بات درست نہیں کہ امام تین رکعات نماز پڑھائے اور مقتدی آخری رکعت میں شریک ہونے سے سمجھ لے کہ مجھے ایک رکعت وتر مل گیا ہے۔ مقتدی کی تعداد رکعات اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی امام نے پڑھائی ہیں۔ اس کی دلیل ایک تو یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ» [بخاری، کتاب الأذان: باب إنما جعل الإمام ليؤتم به (۶۸۹)]

”امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔“

اور دوسری حدیث میں ہے:

«فَمَا أَدْرَسْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأْتُمُوا» [بخاری، کتاب الأذان: باب لا يسعی إلى الصلاة وليأتمها

بالسكينة والوقار (۶۳۶)]

”جو نماز تم امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو تم سے رہ جائے اسے پورا کر لو۔“

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اگر تین وتر پڑھائے اور مقتدی ایک رکعت پائے تو اسے اٹھ کر باقی دو رکعت پوری

کرنی چاہئیں۔

وتروں کے بعد نماز

(سوال) کیا وتروں کے بعد کوئی نفل نماز پڑھی جاسکتی ہے اور سنت رسول ﷺ سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟

(جواب) نماز وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا رسول کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اس کے متعلق کئی ایک صحیح احادیث موجود ہیں:

① ابو سلمہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

« سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا عَنْ صَلَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ كَانَ يُصَلِّي ثَلَاثَ عَشْرَةَ رُكْعَةً يُصَلِّي ثَمَانِ رُكْعَاتٍ ثُمَّ يُؤْتِرُ ثُمَّ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ ثُمَّ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ بَيْنَ النَّدَاءِ وَالْإِقَامَةِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب صلاة الليل و عدد ركعات النبي ﷺ في الليل (٧٣٨)، ابن ماجه (١١٩٦)]

”میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا: ”آپ ﷺ تیرہ (۱۳) رکعات پڑھتے تھے، آٹھ رکعتیں پڑھتے پھر وتر ادا کرتے پھر بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے لیکن جب رکوع کرتے تو کھڑے ہو کر رکوع کرتے، پھر صبح کی اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت پڑھتے۔“

② سعد بن ہشام کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وتر کے بارے میں جب انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تو انھوں نے بتایا: ”آپ نو رکعت وتر اس طرح ادا کرتے کہ آٹھویں میں تشهد بیٹھتے، اللہ کا ذکر، حمد اور دعا کرتے پھر سلام پھیر دیتے:

« ثُمَّ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ وَهُوَ قَاعِدٌ » [مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب جامع صلاة الليل و من نام عنه أو مرض (٧٤٦)]

”پھر بیٹھ کر سلام پھیرنے کے بعد دو رکعت پڑھتے۔“

امام نووی رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے: ”اس حدیث کے ظاہر سے امام اوزاعی اور امام احمد رضی اللہ عنہما نے وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کو مباح قرار دیا ہے اور امام مالک رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کیا ہے۔“ پھر فرماتے ہیں:

”قُلْتُ: الصَّوَابُ أَنَّ هَاتَيْنِ الرُّكْعَتَيْنِ فَعَلَهُمَا بَعْدَ الْوُتْرِ جَالِسًا لِبَيَانِ جَوَازِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْوُتْرِ وَبَيَانِ جَوَازِ النَّفْلِ جَالِسًا وَ لَمْ يُؤَظْبِ عَلَى ذَلِكَ بَلْ فَعَلَهُ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ أَوْ مَرَاتٍ قَلِيلَةً“

[شرح مسلم للنوی (١٩٦/٦)]

”میں کہتا ہوں کہ درست بات یہ ہے کہ ان دو رکعتوں کو رسول اللہ ﷺ نے وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھنے کا جواز بیان کرنے کے لیے ادا کیا ہے اور اس پر دوام نہیں کیا بلکہ اسے ایک یا دو مرتبہ یا بہت تھوڑی دفعہ کیا ہے۔“

مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فِيهِ مَشْرُوعِيَّةٌ رَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْوُتْرِ عَنْ جُلُوسٍ“ [مرعاة المفاتيح (۴/۲۲۵)]
 ”حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کی مشروعیت ہے۔“

مزید فرماتے ہیں:

”وَالرَّاجِحُ عِنْدِي مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ النَّوَوِيُّ أَنَّ الْأَمْرَ فِي قَوْلِهِ اجْعَلُوا..... لِلنَّدْبِ لَا لِلِاجْتِبَابِ“
 [مرعاة المفاتيح (۴/۲۶۵)]

”میرے نزدیک راجح بات وہی ہے جس کی طرف امام نووی رحمۃ اللہ علیہ گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: «اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وَتَرَا» میں حکم وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔“

③ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْوُتْرِ رَكَعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ»
 [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها: باب ما جاء في الركعتين بعد الوتر جالساً (۱۱۹۵)،
 ترمذی، ابواب الصلاة: باب ما جاء لا وتران في ليلة (۴۷۱)، احمد (۶/۲۹۸)، دار قطنی (۲/۲۶)،
 بیہقی (۳/۳۲)، الكامل لابن عدی (۶/۲۴۱۰)]
 ”بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد بیٹھ کر دو ہلکی سی رکعتیں ادا کرتے تھے۔“

④ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيهِمَا بَعْدَ الْوُتْرِ وَهُوَ جَالِسٌ يَقْرَأُ فِيهِمَا إِذَا زُلْزَلَتْ وَ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ» [مسند احمد (۵/۲۶۰-۲۶۹)، بیہقی (۳/۳۳)، کتاب الوتر۔
 طحاوی (۱/۲۳۶)]

”بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان دو رکعتوں میں سورہ زلزال اور سورہ کافرون کی قراءت کرتے۔“

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اس کے راوی ثقہ ہیں۔“ [مرعاة المفاتيح (۴/۲۹۹)]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [المشکوٰۃ محقق (۱/۴۰۱)]

⑤ اسی معنی کی روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ [بیہقی (۳/۳۳)]

⑥ «عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَقَالَ إِنَّ السَّفَرَ جُهْدٌ وَثِقَلٌ فَإِذَا أَوْتَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيَرْكَعْ رَكَعَتَيْنِ فَإِنْ اسْتَيْقَظَ وَإِلَّا كَانَتْ لَهُ» [دار قطنی، کتاب الوتر: باب فی الركعتين بعد الوتر (۱۶۶۵)،

دارمی (۱۶۰۲)، بیہقی (۳۳/۳)، مجمع الزوائد (۲/۲۴۹)، طحاوی (۱/۲۳۶) [

”ثوبان رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں، ان سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ سفر پر مشقت اور طبیعت پر گراں ہوتا ہے، جب تم میں سے کوئی وتر ادا کرے تو وہ دو رکعت بھی ادا کرے، اگر وہ بیدار ہو گیا (اور نماز پڑھ لی تو ٹھیک) اور اگر بیدار نہ ہوا تو یہ دو رکعتیں اس کے لیے (رات کے قیام سے کافی) ہوں گی۔“

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ وَالْأَوْسَطِ وَفِيهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ صَالِحٍ كَاتِبُ اللَّيْثِ وَفِيهِ كَلَامٌ“

[عبد اللہ بن صالح ابو صالح کاتب الیث بن سعد کے بارے میں ملاحظہ ہو: المغنی فی الضعفاء (۱/۵۴۴)، تہذیب التہذیب (۳/۱۶۷)، الکاشف (۱/۵۶۲)، الجرح والتعديل (۵/۳۹۸)، تقریب التہذیب (ص/۱۷۷۰)]

”اس حدیث کو امام طبرانی نے المعجم الکبیر اور المعجم الأوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عبد اللہ بن صالح کاتب الیث ہے اور اس میں کلام ہے۔“

اس کے متعلق راجح بات یہ ہے کہ یہ حسن درجے کا راوی ہے بشرطیکہ اس کی روایت ثقات کے خلاف نہ ہو۔ مذکورہ حدیث میں اس کی متابعت عبد اللہ بن وہب دارمی کے ہاں ہے۔ علامہ عبد اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دارمی کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”اہل علم کا اس بات پر اختلاف ہے کہ جو شخص پہلی رات وتر ادا کرے پھر آخری رات میں اٹھ کھڑا ہو، آپ کے صحابہ میں سے بعض اہل علم اور کچھ ان کے بعد والے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ وتر توڑ دے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایک رکعت ملا دے اور پھر جو ظاہر ہو نماز پڑھے پھر آخر میں وتر ادا کرے۔ اس لیے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں اور اسی بات کی طرف امام اسحاق بن راہویہ گئے ہیں اور بعض اہل علم صحابہ وغیرہ نے کہا ہے کہ جب اول رات وتر ادا کرے پھر سو جائے، پھر رات کے آخر میں قیام کرے تو جو حصہ اس کے لیے ظاہر ہو پڑھ لے اور اپنے وتر کو نہ توڑے اور وتر کو اسی حال میں چھوڑ دے۔“

یہ قول امام سفیان ثوری، امام مالک، امام عبد اللہ بن مبارکپوری، امام شافعی، اہل کوفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے کئی طرق سے مروی ہے کہ آپ نے وتر کے بعد نماز ادا کی ہے۔“

[جامع ترمذی (۲/۳۲۴)، بتحقیق احمد شاکر]

اس کے بعد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ذکر کی ہے۔

مذکورہ بالا تحقیق سے معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز کے ساتھ جس نے وتر ادا کر لیے تو وہ اس کے بعد دو رکعت پڑھے تو جائز و درست ہے اور جس روایت میں ہے: ”تم اپنی آخری نماز وتر بناؤ“ اس میں حکم و جوب کے لیے نہیں بلکہ ندب و استحباب کے لیے ہے اور جس شخص نے اول رات وتر ادا کر لیے ہوں اور اسے پچھلی رات بیداری نصیب ہو جائے تو وہ قیام کرے اور رات

میں ادا کیے ہوئے وتروں کو نہ توڑے۔ [والله اعلم بالصواب]

نماز عشاء کے بعد وتروں کی تعداد

سوال وتروں کی تعداد کے متعلق آگاہ فرمائیں کہ وہ کتنے پڑھے جائیں؟

جواب نماز عشاء کے بعد تین وتر بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور ایک بھی۔ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْوِتْرُ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ وَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ وَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ» [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب کم الوتر (۱۴۲۲)، نسائی (۱۷۱۰)، ابن ماجہ (۱۱۱۰)، بیہقی (۲۳/۳)، التمهید (۲۵۸/۱۳)، مستدرک حاکم (۳۰۲/۱)]

” وتر ہر مسلمان پر لازم ہے، جو پانچ وتر ادا کرنا پسند کرے وہ پانچ پڑھے لے اور جو تین وتر پڑھنا پسند کرے وہ تین پڑھے لے اور جو ایک رکعت پسند کرے وہ ایک پڑھے لے۔“

لہذا ان صورتوں میں سے کوئی بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔

قنوت وتر رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟

سوال وضاحت کر دیجیے کہ قنوت وتر پڑھنے کا صحیح محل کیا ہے رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ جزا کم اللہ خیراً

جواب رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے ثابت ہے اور اکثر روایات رکوع سے پہلے ہی قنوت وتر پر دلالت کرتی ہیں۔

① سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوتِرُ فَيَقْنُتُ قَبْلَ الرَّكْعَةِ» [ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة: باب ما جاء في القنوت قبل الركوع وبعده (۱۱۸۲)، نسائی (۲۳۵/۳)، دارقطنی (۳۱/۲)]

”رسول اللہ ﷺ وتر ادا کرتے تو دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے۔“

② سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أَقُولَ إِذَا فَرَعْتُ مِنْ قِرَاءَةِ تَبِي فِي الْوِتْرِ اَللَّهُمَّ اهْدِنِي.....» [کتاب التوحید لابن مندہ (۹۱/۲) إرواء الغلیل (۱۶۸/۲)]

”مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات وتر میں قراءت سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کے لیے سکھائے: «اَللَّهُمَّ اهْدِنِي.....»“

یہ روایت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ وتر میں دعائے قنوت قراءت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے کرنی چاہیے۔

③ علقمہ سے روایت ہے:

«أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَأَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوا يَقْتُونُونَ فِي الْوَتْرِ قَبْلَ الرَّكُوعِ» [ابن ابی شیبہ (۲/۳۰۶)، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ [إرواء الغلیل (۲/۱۶۶)]

”ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔“

④ عاصم احول کہتے ہیں:

”میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: ”رکوع سے پہلے ہے۔“ پھر میں نے کہا: ”فلاں شخص آپ کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ رکوع کے بعد ہے۔“ تو انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ”وہ غلط کہتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت کی۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر (۷۰) قراء صحابہ کو مشرکوں کی ایک قوم (بنی عامر) کی طرف تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا، ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وعدہ تھا (انھوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے ان ستر (۷۰) قراء کو شہید کر ڈالا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت کی اور ان پر بددعا فرمائی۔“ [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة الرجیع (۶/۴۰۹)، ابو عوانہ (۲/۲۸۵)، دارمی (۱/۳۷۴)، الطحاوی (۱/۱۴۳)، بیہقی (۲/۲۰۷)، احمد (۳/۱۶۷)]

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو دعا ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی خیر خواہی، کفار و مشرکین اور دشمنان اسلام کے لیے بددعا کے طور پر کی جاتی ہے وہ رکوع کے بعد ہے، جسے قنوت نازلہ کہا جاتا ہے اور جو دعا رکوع سے پہلے مانگی جاتی ہے وہ قنوت وتر ہے اور قنوت وتر میں ہاتھوں کا اٹھانا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ رکوع سے پہلے قراءت سے فارغ ہونے کے بعد اسی طرح بغیر ہاتھ اٹھائے دعا مانگنی چاہیے، جو لوگ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں وہ اسے قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہیں۔

قنوت نازلہ کا حکم

⑤ سوال) قنوت نازلہ کا کیا مطلب ہے، یہ کیوں اور کیسے کی جاتی ہے؟ مکمل وضاحت سے سمجھا دیں۔

⑥ جواب) قنوت دعا کو کہتے ہیں اور نازلہ کا معنی مصیبت میں گرفتار ہونا ہے۔ زمانے کے حوادث میں پھنس جانے کے وقت نماز میں اللہ تعالیٰ سے گریہ و زاری کر کے ان حوادث و واقعات سے نجات پانے کے لیے التجا و دعا کرنا قنوت نازلہ کہلاتا ہے۔ دنیا میں مصائب و آلام کئی طرح کے ہوتے ہیں، مثلاً دنیا کے کئی خطوں میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ

ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں، دن رات ان کو پریشانیوں میں مبتلا کر رہے ہیں، ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں اور کمزور و لاغر مسلمان ان کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں، تو ان تمام حالات میں قنوتِ نازلہ کی جاتی ہے اور یہ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، فقہاء و محدثین اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم کا طریقہ رہا ہے۔ اس دعا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان، اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے انتہائی تذلل اور معجز و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی چاہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! ہمیں ان مصائب و آلام سے محفوظ فرما، ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میں قنوت اس لیے کرتا ہوں تاکہ تم اپنے پروردگار کو پکارو اور اس سے اپنی ضروریات کے بارے میں سوال کرو۔“

[مجمع الزوائد (۱۳۸/۲)]

نبی کریم ﷺ نے مصیبت و پریشانی اور رنج و غم کے پیش نظر کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کی اور کبھی بعض نمازوں میں۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« وَاللَّهِ ! لَأَقْرَبَنَّ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ أَبُو هُرَيْرَةَ يَفْتَتُ فِي الظُّهْرِ وَالْعِشَاءِ الْأَخِيرَةِ وَ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَ يَدْعُو لِلْمُؤْمِنِينَ وَ يَلْعَنُ الْكُفَّارَ » [مسلم، کتاب المساجد: باب استحباب القنوت في جميع الصلوات (۶۷۶)]

”اللہ کی قسم! میں تمہارے قریب وہ نماز ادا کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کی نماز ہے۔“ پس سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ظہر، عشاء اور فجر کی نماز میں قنوت کرتے تھے اور مومنوں کے لیے دعا کرتے تھے اور کافروں پر لعنت کرتے تھے۔“

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ صبح اور مغرب کی نماز میں قنوت کرتے تھے۔“ [مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة: باب استحباب القنوت في جميع الصلوات إذا نزلت بالمسلمين نازلة (۶۷۸)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« قَنَتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْعَتَمَةِ شَهْرًا » [ابو داؤد، کتاب الوتر: باب القنوت في الصلاة (۱۴۴۲)]

”رسول اللہ ﷺ نے نماز عشاء میں ایک ماہ قنوت کی۔“

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« قَنَتَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ إِذَا قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ مِنَ الرَّكْعَةِ الْأَخِيرَةِ يَدْعُو عَلَى أَحْيَاءٍ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ عَلَى رِعْلٍ وَ ذُكُوَانَ وَ عُصَيَّةٍ وَ يَوْمٍ مِنْ مَنْ خَلْفَهُ » [ابو داؤد، کتاب الوتر: باب القنوت في الصلاة (۱۴۴۳)]

”رسول اللہ ﷺ متواتر ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز میں جب آخری رکعت میں ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہتے تو قنوت کرتے اور نبی کریم کے چند قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ پر بددعا کرتے اور مقتدی آمین کہتے۔“
 مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ مختلف حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کبھی ایک نماز میں، کبھی دو تین اور کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کرتے تھے۔ تو ہمیں بھی حالات و واقعات کے تقاضے کے مطابق ایسا کرنا چاہیے اور یہ معاملہ اس وقت تک جاری رہے جب تک دشمنوں کی مکمل سرکوبی نہیں ہو جاتی اور مسلمانوں کے مصائب و آلام میں کمی واقع نہیں ہوتی۔
 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ بَعْدَ الرَّكْعَةِ فِي صَلَاةِ شَهْرًا إِذَا قَالَ سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ يَقُولُ فِي قُنُوتِهِ اللَّهُمَّ نَجِّ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، اللَّهُمَّ نَجِّ سَلْمَةَ بِنَ هِشَامٍ، اللَّهُمَّ نَجِّ عِيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ، اللَّهُمَّ نَجِّ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، اللَّهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ. قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ ثُمَّ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَكَ الدُّعَاءَ بَعْدَ فَقُلْتُ أَرَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَرَكَ الدُّعَاءَ لَهُمْ قَالَ فَقِيلَ وَمَا تَرَاهُمْ قَدْ قَدِمُوا؟» [مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة : باب استحباب القنوت في جميع الصلوات (٦٧٥)]

”نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت کی۔ جب آپ ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہتے تو اپنی قنوت میں کہتے: ”اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات دے اے اللہ! سلمہ بن ہشام کو نجات دے اے اللہ! عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات دے۔ اے اللہ! ضعیف مومنوں کو نجات دے۔ اے اللہ! اپنا عذاب قبیلہ مضر پر سخت کر۔ اے اللہ! ان پر یوسف علیہ السلام کے زمانے جیسا قحط ڈال دے۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”پھر میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے دعا کرنا چھوڑ دی تو میں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کرنا چھوڑ دیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: ”تم دیکھتے نہیں کہ جن کے لیے رسول اللہ ﷺ دعا کرتے تھے وہ آگے ہیں (یعنی کفار کے غلبے سے انھیں نجات مل گئی ہے)۔“
 موجودہ حالات میں چونکہ مسلمان کئی ممالک (مثلاً فلسطین، کشمیر اور الجزائر وغیرہ) میں سفاک و خونخوار دشمن کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور کئی ممالک میں مسلمان سالہا سال سے جو رو جفا کی چکی میں پس رہے ہیں تو ان کی نصرت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جب ہم جہاد بالسیف وغیرہ جیسی تدابیر کے ساتھ صف آراء ہیں تو ہمیں قنوت نازلہ جیسے مجرب ہتھیار سے بھی کام لینا چاہیے۔ تمام مسلمان اپنی نمازوں میں رکوع کے بعد ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہہ کر سجدہ میں جانے سے پہلے مجاہدین اور مظلوم مسلمانوں کے لیے دعا کریں۔ دعا کرتے وقت امام مختلف دعائیں پڑھے جب کہ پیچھے مقتدی آمین کہیں۔ قنوت نازلہ سے مقصود مظلوم و مقہور مسلمانوں کی نصرت و کامیابی اور سفاک و جابر دشمن کی ہلاکت و بربادی ہے۔ اس

لیے اس مقصد کو جو دعا بھی پورا کرے وہ مانگی جاسکتی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَ الصَّحِيحُ أَنَّهُ لَا يَتَعَيَّنُ فِيهِ دُعَاءٌ مَخْصُوصٌ بَلْ يُحْصَلُ بِكُلِّ دُعَاءٍ وَ فِيهِ وَجْهٌ أَنَّهُ لَا يُحْصَلُ إِلَّا بِالْأَدْعَاءِ الْمَشْهُورِ اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ إِلَى آخِرِهِ وَالصَّحِيحُ أَنَّ هَذَا مُسْتَحَبٌّ لَا شَرْطُ“ [شرح مسلم (۱/۲۳۷)]

”صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی مخصوص دعا متعین نہیں بلکہ ہر اس دعا کو پڑھا جاسکتا جس سے یہ مقصود حاصل ہو اور «اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ..... الخ» پڑھنا مستحب ہے شرط نہیں۔“

یاد رہے کہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ یہ مذکورہ دعا بھی پڑھی جائے اور اس کے بعد وہ دعائیں بھی پڑھی جائیں جو اس معنی کی قرآن مجید اور حدیث نبوی میں موجود ہیں۔ مختلف دعائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں جیسا کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جب رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تو ہنگامی حالات کے پیش نظر مخالفین اسلام کے لیے بددعا کرتے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور مسلمانوں کے لیے استغفار کرتے تھے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« وَ كَانَ يَلْعَنُ الْكُفْرَةَ فِي النَّصْفِ اللَّهُمَّ قَاتِلِ الْكُفْرَةَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِكَ وَيَكْذِبُونَ رُسُلَكَ وَ لَا يُؤْمِنُونَ بِوَعْدِكَ وَ خَالَفَ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَ أَلْقَى فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ وَ أَلْقَى عَلَيْهِمُ رِجْزَكَ وَ عَذَابَكَ إِلَهَ الْحَقِّ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِينَ » [ابن خزيمة (۲/۱۵۵/۱۵۶)، قیام رمضان للألبانی (ص ۳۲۱)]

”نصف رمضان میں کافروں پر لعنت کرتے اور کہتے: ”اے اللہ! ان کافروں کو جو تیرے راستے سے روکتے ہیں اور تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے وعدوں پر ایمان نہیں لاتے، تباہ کر دے اور ان کے کلمات میں مخالفت ڈال دے اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دے اور ان پر عذاب و سزا نازل فرما۔“ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے اور مسلمانوں کے لیے اپنی استطاعت سے بھلائی کی دعا کرتے اور مومنوں کے لیے استغفار کرتے۔“

قوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے

سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوت نازلہ میں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے؟

جواب قوت نازلہ کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہی دعا مانگتے تھے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فِي صَلَاةِ الْعَدَاةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا عَلَيْهِمْ »

[مسند احمد (۳/۱۳۷)، اس روایت کو علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل]

”میں نے رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں دیکھا کہ آپ نے ہاتھ اٹھائے اور دشمنانِ اسلام پر بددعا کی۔“
یاد رہے کہ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اس کے متعلق جتنی روایات مروی ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں، جو قابلِ حجت نہیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ”السنن الصغریٰ“ میں لکھا ہے ”فَانْهَا مِنَ الْمُحَدَّثَاتِ“ کہ یہ عمل بدعات میں سے ایک بدعت ہے۔

نماز تہجد میں سورہٴ اخلاص کی مخصوص تعداد میں قراءت

(سوال) کیا تہجد کی بارہ رکعات اس طرح پڑھی جاسکتی ہیں کہ پہلی دو رکعات میں سے پہلی رکعت میں سورہٴ اخلاص بارہ مرتبہ اور دوسری رکعت میں گیارہ مرتبہ پڑھے پھر دو رکعات میں سے پہلی میں دس بار اور دوسری میں نو بار۔ اسی طرح جب رکعتیں کم ہوتی جائیں تو سورہٴ اخلاص پڑھنے کی تعداد بھی کم ہوتی جائے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کریں۔

(جواب) نماز کے اندر سورہٴ فاتحہ کے بعد انسان جتنی چاہے قراءت حسب استطاعت کر سکتا ہے جیسا کہ آپ نے ایک آدمی کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے کہا:

”جب تم قبلہ رو ہو جاؤ تو سورہٴ فاتحہ پڑھو اور اس کے بعد جو چاہو قراءت کرو۔“ [ابن حبان]

لیکن تہجد کی نماز میں مذکورہ سورت کی تخصیص میں کوئی صحیح حدیث ہمیں معلوم نہیں، یہ کسی انسان کی ذاتی اختراع معلوم ہوتی ہے۔

نماز عید کے لیے عورتوں کا عید گاہ جانا

(سوال) کیا نماز عیدین کے لیے عورتوں کا عید گاہ میں جانا ضروری ہے؟

(جواب) عیدین کی نماز میں عورتوں کی شرکت لازمی ہے، جو عورتیں ایامِ ماہواری میں بھی ہوں وہ بھی عید گاہ کی طرف جائیں، وہ اگرچہ نماز ادا نہیں کریں گی لیکن مسلمانوں کی دعاؤں میں شرکت کریں گی۔ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم عیدین کے دن حیض والی اور پرہہ دار دو شیزاؤں کو لے کر آئیں تاکہ وہ مسلمانوں کی

جماعت اور ان کی دعا میں شریک ہو جائیں اور حائضہ عورتیں نماز والی جگہ سے علیحدہ رہیں، ایک عورت نے کہا:

”اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کے پاس بڑی چادر نہ ہو تو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے اس کے ساتھ والی

چادر اوڑھا دے۔“ [بخاری، کتاب الصلوٰۃ: باب وجوب الصلوٰۃ فی الثیاب: (۳۵۱)، مسلم، کتاب صلوٰۃ

العیدین: باب ذکر اباحۃ النساء فی العیدین إلی المصلی: (۸۹۰)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو عیدین کی نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ کی طرف جانا چاہیے، اگر عورت کے ایام

ماہواری شروع ہو جائیں تب بھی وہ عید گاہ کی طرف جائے گی، مسلمانوں کی دعا میں شرکت کرے گی، امام ابن قدامہ

مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”المغنی“ میں یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد بعض ایسے حضرات کے اقوال نقل کیے ہیں جو عورتوں کے

لیے عید گاہ کی طرف جانا پسند نہیں کرتے، پھر اس کے متعلق انتہائی جامع اور مؤثر تبصرہ یوں کیا ہے:

”رسول اللہ ﷺ کی سنت سب سے زیادہ اتباع کی حق دار ہے۔“ (المغنی: ۴/۲۶۵)

اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خواتین عید گاہ میں حاضر ہوتی تھیں۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

”نبی ﷺ عید الفطر کے دن اٹھے، پہلے نماز ادا کی پھر خطبہ دیا، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو عورتوں کے پاس تشریف لے گئے آپ ﷺ نے انھیں نصیحت کی اور آپ ﷺ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ٹیک لگائے ہوتے تھے۔“

[صحیح بخاری، کتاب العیدین: باب المشی والركوب الى العيد (۹۶۱)]

الغرض اس معنی کی کئی ایک احادیث صحیحہ موجود ہیں کہ عورتوں کو نماز عید کی ادائیگی کے لیے عید گاہ کی طرف جانا چاہیے۔

نماز عید کہاں ادا کی جائے؟

(سوال) کیا نماز عید مسجد میں ادا کرنی چاہیے یا مسجد سے باہر کھلے میدان میں؟ کتاب وسنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) رسول اکرم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ نماز عید عید گاہ میں ادا کی جائے، آپ ﷺ عید والے دن مدینہ سے نکل کر باہر عید گاہ میں نماز ادا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف نکلتے تھے۔“ [صحیح بخاری، کتاب العیدین:

باب الخروج الى المصلی بغیر منبر (۹۵۶)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ”اخبار المدینہ“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”المصلیٰ (عید گاہ)“ مدینہ میں ایک معروف جگہ ہے، اس کے اور مسجد کے دروازے کے درمیان ایک ہزار ہاتھ کی مسافت ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ عید گاہ کی طرف نکلتے تھے تو آپ ﷺ کے ساتھ ایک نیزہ ہوتا جسے آپ کے آگے عید گاہ میں نصب

کیا جاتا، آپ اس کی طرف نماز ادا کرتے تھے۔“ [صحیح بخاری، کتاب العیدین: باب حمل العنزة أو الحرابة

بین یدی الامام يوم العيد: (۹۷۳)]

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ نماز مسجد کی بجائے عید گاہ میں پڑھی جائے، البتہ عذر کی صورت میں مسجد میں ادا کی جاسکتی ہے، اس کے بارے میں روایت تو ضعیف ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ بارش کی صورت میں مسجد میں نماز عید ادا کی لیکن امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے عید کے دن بارش کی بنا پر لوگوں کو مسجد میں نماز عید پڑھائی۔“

[المحلی (۱۲۸/۵)، (۱۲۹)]

لہذا عذر کی وجہ سے نماز عید مسجد میں ادا کی جاسکتی ہے۔

عید کے دن روزہ رکھنا

(سوال) عید والے دن روزہ رکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید والے دن قربانی کرنے تک روزہ ہوتا ہے۔

(جواب) عید والے دن روزہ رکھنے کی شریعت میں ممانعت ہے۔ ابو عبید مولیٰ ابن ازہر سے روایت ہے کہ میں عید کے دن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا:

”ان دو دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے یعنی تمہارے روزے چھوڑنے کا دن اور دوسرا دن جس میں تم اپنی قربانی (کے گوشت) سے کھاتے ہو۔“ [بخاری، کتاب الصوم: باب صوم یوم الفطر: (۱۹۹۰)]
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”یہ حدیث عیدین کے دونوں دنوں میں روزے رکھنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے، وہ روزے خواہ نذر کے ہوں یا کفارہ کے یا نفل یا حج تمتع کے اور اس بات پر اجماع ہے۔“ [فتح الباری: (۴/۲۳۹)]
عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو روزوں سے منع کیا ہے یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دنوں کے۔“ [صحیح مسلم، کتاب الصیام: باب تحریم صوم یومی العیدین: (۱۱۴۰)]
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ان دو دنوں میں کسی بھی قسم کے روزے رکھنے کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے، خواہ کوئی شخص نذر کا روزہ رکھے یا نفل روزہ رکھے یا بطور کفارہ روزہ رکھے یا کسی اور نیت سے رکھے۔“
علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

”ان دو دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے لیے تیار کردہ ضیافت سے اعراض ہے۔“ [نبیل الاوطار (۴/۳۵۱)، (۳۵۲)]

ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن نہ اتروانا

(سوال) کیا صاحب قربانی کے لیے ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن اتروانا جائز ہے؟ اور جس نے قربانی نہ کرنی ہو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

(جواب) جو آدمی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد بال یا ناخن کاٹنے سے باز رہنا چاہیے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جب تم ذی الحجہ کا چاند دیکھ لو اور تمہارا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو بالوں اور ناخنوں کو تراشنے سے رک جاؤ۔“
 [صحیح مسلم، کتاب الاضاحی: باب نہی من دخل علیہ عشر ذی الحجۃ..... الخ (۱۹۷۷)]
 اور جس شخص نے قربانی نہ کرنی ہو وہ عید والے دن اگر ناخن تراش لے، بال اتار لے، مونچھیں کاٹ لے، زیر ناف بال اتار لے تو اسے بھی قربانی کا ثواب مل جاتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
 ”مجھے یوم الاضحیٰ کو عید کا حکم دیا گیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے مقرر کیا ہے۔“ ایک آدمی نے کہا:
 ”آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر میں قربانی کے لیے دودھ دینے والی بکری کے سوا نہ پاؤں تو کیا اس کی قربانی کروں؟“
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں لیکن تم اپنے بال، ناخن تراش لینا اور اپنی مونچھیں کاٹنا اور شرمگاہ کے بال موٹہ دینا، اللہ کے ہاں یہ تیری پوری قربانی شمار ہوگی۔“ [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما جاء فی ایجاب الاضاحی: (۲۷۸۹)، نسائی، کتاب الضحایا: باب من لم یجد الاضحیۃ: (۴۳۷۰)]
 اسے امام ابن حبان (۲۰۳۳)۔ اور امام حاکم (۲۲۳/۳) اور امام ذہبی نے صحیح کہا ہے، اس کی سند میں عیسیٰ بن ہلال الصدنی صدوق ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حدیث حسن ہے۔ [تقریب مع تحریر: (۱۴۵/۳)]
 اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے قربانی نہ کرنی ہو وہ عید والے دن اپنے بال اور ناخن تراش لے تو اس کو بھی اللہ کے ہاں سے پوری قربانی کا ثواب مل جائے گا۔

نماز اشراق کا بیان

(سوال) نماز اشراق کسے کہتے ہیں اور اس کا صحیح وقت کونسا ہے؟
(جواب) اشراق کے معنی ”طلوع آفتاب“ یعنی جب آفتاب طلوع ہو کر ذرا بلند ہو تو اس وقت نوافل ادا کرنا نماز اشراق کہلاتا ہے۔ قاسم شیبانی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

« أَنْ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمٍ رَأَى قَوْمًا يُصَلُّونَ مِنَ الضُّحَى فَقَالَ أَمَا قَدْ عَلِمُوا أَنَّ الصَّلَاةَ فِي غَيْرِ هَذِهِ السَّاعَةِ أَفْضَلُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: صَلَاةُ الْأَوَائِينَ حِينَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب صلاة الأوائين حين ترمض الفصال (۷۴۸)، بیہقی (۴۹/۳)]

”سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو صلاۃ الضحیٰ پڑھتے دیکھا تو فرمایا: ”کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ نماز اس وقت کے علاوہ وقت میں افضل ہے؟ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صلاۃ الاوائین اس وقت ہے جب شدت گرمی کی وجہ سے اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلتے ہیں۔“
 ایک دوسری حدیث میں ہے:

« خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَهْلِ قُبَاءٍ وَهُمْ يُصَلُّونَ الضُّحَى فَقَالَ صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ إِذَا رَمَضَتِ الْفِصَالُ مِنَ الضُّحَى » [احمد (۴/۳۶۶)، بیہقی (۳/۴۹۰)، طبرانی کبیر (۵/۲۳۴)، صحیح ابن خزيمة (۱۲۲۷)، شرح السنة (۴/۱۱۴۵)، ابن ابی شیبہ (۲/۴۰۶)، إرواء الغلیل (۲/۲۲۰)]

”رسول اللہ ﷺ اہل قبا پر نکلے، وہ صلاۃ الضحیٰ پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: صلاۃ الاوابین اس وقت ہے جب دھوپ کی شدت کی وجہ سے اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلتے ہیں۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ”صلاۃ الضحیٰ“ یعنی نماز اشراق اول وقت کی بجائے اچھی طرح دھوپ میں پڑھنا افضل ہے۔ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری ﷺ فرماتے ہیں: ”یہ وقت نصف النہار سے کچھ پہلے ہے۔“ [منة المنعم (۱/۴۷۱)]

اور اسے ہی نبی ﷺ نے ”صلاۃ الاوابین“ قرار دیا ہے۔ اوابین ادواب کی جمع ہے اور ادواب وہ شخص ہے جو اخلاص اور عمل صالح کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔ نصف النہار سے کچھ دیر پہلے عام طور پر لوگوں کے لیے استراحت و آرام کا وقت ہوتا ہے اور ادواب شخص راحت و سکون کو پس پشت ڈال کر اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے، اس لیے یہ وقت صلاۃ الضحیٰ کا افضل وقت قرار دیا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يُحَافِظُ عَلَى الصَّلَاةِ الضُّحَى إِلَّا أَوَّابٌ قَالَ وَ هِيَ صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ » [صحیح ابن خزيمة (۱۲۲۴)، مستدرک حاکم (۱/۳۱۴)، سلسلۃ الأحادیث الصحیحہ (۱۹۹۴، ۷۰۳)، مجمع الزوائد (۲/۲۳۹)، طبرانی اوسط (۳۸۷۷)]

”صلاۃ الضحیٰ کی ادواب ہی حفاظت کرتا ہے“ اور فرمایا: ”یہی صلاۃ الاوابین ہے۔“

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ صلاۃ الضحیٰ کا دوسرا نام صلاۃ الاوابین ہے۔

عام اہل علم نے نماز اشراق کو صلاۃ الضحیٰ ہی قرار دیا ہے البتہ بعض نے فرق کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے: ”صلاۃ الاشراق ضوہ صغریٰ میں اور صلاۃ الضحیٰ ضوہ کبریٰ میں ادا کی جاتی ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے جن احادیث میں نماز اشراق کی ترغیب دی ہے ان میں ہے کہ فجر کی نماز کے بعد بیٹھ کر انسان انتظار کرتا رہے حتیٰ کہ سورج نکل آئے پھر دو رکعت پڑھے۔ ملا علی قاری نے کہا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ صلاۃ الضحیٰ کا اول وقت وہ ہے جب کراہت کا وقت چلا جائے اور اس کا آخری وقت زوال سے پہلے کا ہے، لہذا جو اول وقت میں نماز ادا ہوئی اسے صلاۃ الاشراق اور جو اس کے آخری وقت تک ادا ہوئی اسے صلاۃ الضحیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے:

”جب سورج اپنے مطلع سے نکل کر ایک دو نیزوں کی مقدار تک بلند ہو جاتا ہے جیسے سورج ڈوبنے سے پہلے نماز عصر کی مقدار تک ہوتا ہے تو نبی کریم ﷺ دو رکعت پڑھتے پھر مہلت رکھتے یہاں تک کہ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو آپ ﷺ چار رکعات نماز پڑھتے۔“ [نسائی فی السنن الکبریٰ (۱/۱۷۸)]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ الضحیٰ اور صلاۃ الاشراق میں فرق اس لحاظ سے ہے کہ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد نماز ادا کریں تو اسے صلاۃ الاشراق کہتے ہیں اور اگر سورج اچھی طرح بلند ہو، دھوپ کی شدت ہو جائے اور زوال سے قبل نماز پڑھیں تو یہ صلاۃ الضحیٰ ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز مغرب کے بعد چھ رکعات کی ادائیگی کو صلاۃ الاوابین قرار دینا ثابت نہیں۔ جیسا کہ بعض احناف کا یہ موقف ہے بلکہ یہ بات سابقہ صحیح احادیث کے خلاف ہے کیونکہ ان میں ”صلاۃ الضحیٰ“ ہی کو ”صلاۃ الاوابین“ کہا گیا ہے۔

نماز استخارہ کا طریقہ

(سوال) استخارہ کا صحیح طریقہ کیا ہے اور کیا کسی دوسرے شخص سے استخارہ کروایا جاسکتا ہے؟

(جواب) جب کسی جائز کام کے کرنے کا ارادہ ہو تو ایسے موقع پر استخارہ کرنا سنت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز ادا کرے، اس کے بعد یہ دعا مانگے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَسْتَحِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ اَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَ لَا اَقْدِرُ وَ تَعْلَمُ وَ لَا اَعْلَمُ وَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هَذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّىْ فِىْ دِيْنِىْ وَ مَعَاشِىْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِىْ فَاقْدُرْهُ لِىْ وَ يَسِّرْهُ لِىْ ثُمَّ بَارِكْ لِىْ فِيْهِ وَ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هَذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّىْ فِىْ دِيْنِىْ وَ مَعَاشِىْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِىْ فَاصْرِفْهُ عَنِّىْ وَ اصْرِفْنِىْ عَنْهُ وَ اَقْدِرْ لِىْ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ رَضِّنِىْ بِهٖ » [بخارى، كتاب التهجيد: باب ما جاء فى التطوع منى منى (۱۱۶۲)]

یہ استخارہ دن یا رات میں کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے۔ عصر حاضر میں بعض لوگوں نے استخارے کو ایک کاروبار بنا لیا ہے اور یہ طریقہ ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لوگوں نے جگہ جگہ استخارہ کے اڈے بنا لیے ہیں حالانکہ مسنون تو یہ ہے کہ آدمی خود استخارہ کرے، کسی دوسرے سے استخارہ کروانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔ استخارہ کروانے والوں نے پھر یہ اعتقاد بنا لیا ہے کہ فلاں بزرگ سے استخارہ کراؤں گا تو مجھے کوئی کچی بات مل جائے گی، جس پر میں عمل کر لوں گا اور وہ خواب دیکھ کر صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیں گے۔ حالانکہ استخارہ ضرورت مند آدمی اللہ وحدہ لا شریک لہ سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا سینہ کھول دے گا اور کسی جانب اس کی توجہ مبذول کر دے گا۔ اچھے کام کے لیے استخارہ کے علاوہ اصحاب الخیر سے مشورہ بھی جاری رکھنا چاہیے۔

رکعات نماز تراویح کی تعداد

(سوال) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے کتنی رکعات تراویح ثابت ہیں؟ وضاحت فرمادیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(جواب) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

« مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَ احْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ » [بخاری، کتاب الایمان: باب تطوع قیام رمضان فی الایمان (۳۷)، مسلم (۷۶۰)]

”جس نے رمضان المبارک کا قیام ایمان اور ثواب سمجھ کر کیا، اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔“
نماز تراویح کو قیام رمضان، صلاۃ فی رمضان، قیام اللیل اور صلاۃ اللیل وغیرہ کہا جاتا ہے اور اس کا وقت نماز عشاء سے لے کر نماز فجر تک ہے، رات کے کسی بھی حصے میں پڑھی جاسکتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي مَا بَيْنَ أَنْ يَقْرَعَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى الْفَجْرِ إِحْدَى عَشْرَةَ رُكْعَةً وَيُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رُكْعَتَيْنِ وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب صلاة الليل و عدد ركعات النبي في الليل (۷۳۶)]

”نبی کریم ﷺ نماز عشاء اور نماز فجر کے درمیان گیارہ رکعت ادا کرتے تھے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر ادا کرتے۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رُكْعَةً » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب صلاة الليل و عدد ركعات النبي في الليل (۷۳۸)]

”رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔“

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا۔ [موطا (۱/۱۴۱)، بیہقی (۲/۴۹۶)]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ گیارہ رکعت تراویح ادا کرتے تھے۔ [سنن سعید بن منصور بحوالہ التعلیق الحسن (۳۹۲/۱)، الحاوی للفتاوی (۱/۳۴۹)]

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”أَخَذُ لِنَفْسِي فِي قِيَامِ رَمَضَانَ هُوَ الَّذِي جَمَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَلَيْهِ النَّاسَ إِحْدَى عَشْرَةَ رُكْعَةً وَ هِيَ صَلَاةُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَا أَدْرِي مَنْ أَحَدَتْ هَذَا الرُّكُوعَ الْكَبِيرَ “ [الصلاة والتهدجد (ص ۲۸۷)، لعبد الحق الأشبيلي]

”تراویح کے متعلق جو بات میں اپنے لیے اختیار کرتا ہوں، وہ گیارہ رکعت ہے جس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا تھا اور یہی رسول اللہ ﷺ کی نماز تھی اور میں نہیں جانتا کہ کس نے یہ (گیارہ رکعات سے) زیادہ نماز ایجاد کی ہے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل مبارک گیارہ رکعت تراویح ہی کا ہے اور اسی کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔

تراویح کے امام کے علاوہ دوسرے امام کا وتر پڑھانا

سوال نماز تراویح میں یہ عمل دیکھنے میں آیا ہے کہ تراویح ایک امام پڑھاتا ہے جبکہ وتر کی جماعت دوسرا امام کراتا ہے، کیا یہ عمل قرآن و سنت کے مطابق ہے؟

جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے امام کے لیے جو شرائط ملتی ہیں ان میں یہ بات کہیں بھی موجود نہیں کہ تراویح اور وتر کے لیے ایک امام ہونا چاہیے، کوئی بھی صحیح العقیدہ امام ہو اس کی اقتداء میں نماز ادا کر لیں۔ تراویح اور وتر کی ایک امام بھی جماعت کروا سکتا ہے اور الگ الگ امام بھی، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

صدقہ فطر ادا کرنے کا صحیح وقت

سوال فطرانہ یعنی صدقہ عید الفطر نماز عید سے کتنے روز پہلے دیا جاسکتا ہے اور کیا پہلے ادا کرنا ضروری ہے؟

جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر نماز عید سے پہلے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ» [بخاری، کتاب الزکوٰۃ: باب فرض صدقة الفطر (۱۵۰۳)، مسلم (۹۸۴)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو مسلمانوں کے غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر فرض کیا ہے اور لوگوں کو نماز عید کی طرف نکلنے سے پہلے اس کے ادا کرنے کا حکم فرمایا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر نماز عید سے پہلے نکالنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عید سے ایک یا دو دن پہلے صدقہ فطر نکال دیتے تھے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے: «وَكَانُوا يُعْطَوْنَ قَبْلَ الْفِطْرِ بِيَوْمٍ أَوْ يَوْمَيْنِ» [صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عید الفطر سے ایک یا دو دن پہلے صدقہ فطر دے دیتے تھے۔] [بخاری، کتاب الزکوٰۃ: باب صدقة الفطر على الحر والمملوك (۱۵۱۱)]

نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ ابْنَ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَانَ يَبْعَثُ زَكَاةَ الْفِطْرِ إِلَى الذِّي يَجْمَعُ عِنْدَهُ قَبْلَ الْفِطْرِ

بِيَوْمَيْنِ أَوْ ثَلَاثَةٍ» [فتح الباری (۳/۳۷۶)]

”سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عید الفطر سے دو یا تین دن پہلے صدقہ فطر اس آدمی کی طرف بھیج دیتے تھے جو صدقہ جمع کرتا تھا۔“

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صدقہ فطر جمع کرنے کی ذمہ داری لگائی اور شیطان تین راتیں مسلسل ان کے جمع کردہ ڈھیر سے چوری کے لیے آتا رہا، بالآخر اس نے تیسری مرتبہ آیت الکرسی بتا کر جان چھڑائی۔ [بخاری، کتاب الوکالۃ: باب إذا وكل رجلاً فترك الوكيل شيئاً (۲۳۱۱)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَ يَدُلُّ عَلَى ذَلِكَ أَيْضًا مَا أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ فِي الْوِكَالَةِ وَ غَيْرِهَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ وَ كَلَّنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ الْحَدِيثُ وَ فِيهِ أَنَّهُ أَمْسَكَ الشَّيْطَانَ ثَلَاثَ لَيَالٍ وَ هُوَ يَأْخُذُ مِنَ التَّمْرِ فَدَلَّ عَلَى أَنَّهُمْ كَانُوا يُعْجَلُونَهَا“

[فتح الباری (۳/۳۷۶-۳۷۷)]

”نماز عید سے دو تین دن پہلے صدقہ فطر نکالنے پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب الوکالۃ“ وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کی حفاظت پر مامور فرمایا۔ اس حدیث میں ہے کہ انھوں نے تین راتیں مسلسل شیطان کو کھجوریں چوری کرتے ہوئے پکڑا۔ اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ صحابہ کرام صدقہ فطر نکالنے میں جلدی کرتے تھے۔“

لہذا نماز عید سے دو تین دن پہلے صدقہ فطر ادا کرنا زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

WWW. KITABOSUNNAT.COM



نماز کے متفرق مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

نماز میں قضائے حاجت کا مسئلہ

(سوال) اگر کسی آدمی کو حالت نماز میں پیشاب نکل کر رہا ہو تو کیا ایسی صورت میں نماز ادا کرنا درست ہے؟
(جواب) حالت نماز میں اگر پیشاب کی حاجت ہو جائے تو نماز ترک کر کے قضائے حاجت کی جائے پھر نماز ادا کر لی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا صَلَاةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ » [مسلم، کتاب المساجد: باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام (۵۶۰)]

”کھانے کی موجودگی میں اور جب دو غیبت ترین چیزیں نکل کر رہی ہوں تو نماز نہیں ہوتی۔“
 دو غیبت ترین چیزوں سے مراد پیشاب و پاخانہ ہیں۔ اسی طرح زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَرَادَ أَحَدُكُمْ الْغَائِطَ فَلْيَبْدَأْ بِهِ قَبْلَ الصَّلَاةِ » [موطا (۱۰۹/۱)، احمد (۴۸۳/۳)]
 ”جب تم میں سے کوئی ایک پاخانہ کرنا چاہتا ہو تو وہ اسے نماز سے پہلے کر لے۔“
 لہذا پہلے قضائے حاجت کر لی جائے پھر نماز پڑھی جائے تاکہ نماز اطمینان و سکون سے ادا کی جاسکے۔

جوتے پہن کر نماز پڑھنا

(سوال) جوتے پہن کر نماز ادا کرنا ٹھیک ہے اور کیا یہ واجب ہے؟
(جواب) جوتے اگر پاک اور صاف ستھرے ہوں، ان کے نیچے گندگی نہ لگی ہو تو پھر ان میں نماز پڑھنا درست ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ قَدْرًا أَوْ أَدَى فَلْيَمْسَحْهُ وَ لْيَصِلْ فِيهِمَا »
 [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة في النعل (۶۵۰)]
 ”جب بھی تم میں سے کوئی آدمی مسجد کی طرف آئے تو وہ دیکھے اگر اس کے جوتوں میں کوئی گندگی وغیرہ لگی ہو تو اسے صاف کرے اور ان میں نماز پڑھے۔“

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« خَالِفُوا الْيَهُودَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نِعَالِهِمْ وَلَا خِيفَافِهِمْ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة في النعل (٦٥٢)]

”یہودیوں کی مخالفت کرو، وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔“

یہ حکم وجوب کے لیے نہیں کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ننگے پاؤں بھی اور جوتوں میں بھی نماز پڑھتے تھے۔ [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة في النعل (٦٥٣)]

نماز میں آستینیں چڑھانا

سوال نماز میں قیص کی آستینوں کی کفوں کو اوپر چڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ صحیح حدیث کی رو سے واضح کریں۔

جواب قیص کی کفیں چڑھا کر نماز پڑھنا سخت منع ہے جیسا کہ امام الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں حدیث بیان کی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مجھے سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے) کہ نماز میں نہ بالوں کا جوڑا بناؤ اور نہ

کپڑوں کو اکٹھا کرو۔“ [صحیح بخاری، کتاب الأذان: باب السجود على السبعة، (٨١٠)]

نماز کے دوران اکثر و بیشتر افراد کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بالوں یا کپڑوں کو درست کرتے رہتے ہیں، یہ امور نماز کے منافی ہیں، جب نماز ادا کر رہے ہوں تو ساری توجہ اور دھیان عبادت میں ہونا چاہیے اور ان تمام حرکات سے اجتناب کرنا چاہیے جن کا نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مباشرت کے دوران پہنے گئے کپڑوں میں نماز کا حکم

سوال وہ کپڑے جنہیں پہن کر مباشرت کی گئی، کیا انہیں ہوئے نماز ادا کرنا صحیح ہوگا؟

جواب قرآن و سنت کی رو سے اپنی بیوی سے جن کپڑوں میں صحبت کی ہے اگر ان میں پلیدی نہیں لگی تو انہیں ~~پہن کر~~ نماز پڑھی جاسکتی ہے، اگر کپڑے پر منی لگ جائے تو تری کی صورت میں دھو ڈالے۔ دھونے کے بعد اگر کپڑے میں نشان دکھائی دے تو کوئی حرج نہیں اور اگر منی خشک ہو تو اس کا کھرچ دینا ہی کافی ہے۔

۱۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

« سَأَلْتُ أُمَّ حَبِيبَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي الثَّوْبِ الَّذِي يُجَامِعُهَا فِيهِ؟ فَقَالَتْ نَعَمْ إِذَا لَمْ يَرَفِ فِيهِ أَدَى » [ابو داؤد، کتاب

الطهارة: باب الصلاة في الثوب الذي يصيب أهله فيه (٣٦٦)، نسائی (١٥٥/١)، ابن ماجہ (١٩٢/١)،

دارمی (۲۶۰/۱)، احمد (۳۲۵/۶)، ابن خزیمہ (۳۸۰/۱)، ابن حبان (۲۳۷)، بیہقی (۴۱۰/۲) [میں نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جو نبی ﷺ کی بیوی تھیں، سے پوچھا: ”کیا رسول اللہ ﷺ جس کپڑے میں مجامعت کرتے تھے اس میں نماز پڑھ لیتے تھے؟“ تو انھوں نے کہا: ”ہاں! جب اس میں گندگی نہ دیکھتے۔“

۲۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كُنْتُ أَفْرُكُ الْمَنِيَّ مِنْ تَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَصَلِّي فِيهِ» [ابو داؤد، كتاب الطهارة: باب المنى يصيب الثوب (۳۷۲)، نسائی (۱۵۶/۱)، ابن ماجہ (۱۹۲/۱)، احمد (۳۵/۶)، ابن خزیمہ (۱۴۶/۱)، شرح السنة (۸۹/۲)]

”میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کھرچ دیتی تھی پھر آپ ﷺ اسی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔“

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كُنْتُ أَعْسِلُهُ مِنْ تَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ وَأَنْزِ الْأَعْسَلِ فِيهِ يُقَعُّ الْمَاءِ» [بخاری، كتاب الوضوء: باب إذا غسل الجنابة أو غيرها فلم يذهب أثره (۲۳۱)، ترمذی (۲۰۱/۱)، دارقطنی (۱۲۵/۱)، بیہقی (۴۱۸/۲)، شرح السنة (۱۸۸/۲)، ابن ماجہ (۵۳۶)، احمد (۱۴۲/۶)]

”میں اسے (منی کے اثرات کو) رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے دھوتی تھی پھر آپ نماز کے لیے نکلتے اور کپڑے میں دھونے کے نشانات دکھائی دیتے۔“

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ انسان جس کپڑے میں اپنی بیوی سے مباشرت کرے، وہی کپڑے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے، اگر اس میں منی وغیرہ لگی ہو تو اسے دھو ڈالے یا کھرچ ڈالے۔ حالت جنابت میں لباس پہننے سے کپڑے پلید نہیں ہوتے۔

مرد کی ننگے سر نماز

(سوال) کیا آدمی کی ننگے سر نماز ہو جاتی ہے؟ دلیل سے وضاحت فرمادیں۔

(جواب) نماز میں ستر ڈھانپنا واجب ہے اور کندھوں پر بھی کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کپڑے شریعت میں ضروری طور پر ثابت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک کپڑے میں بھی نماز پڑھی ہے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ محمد بن منکدر راوی کا بیان ہے کہ ایک دن میں جب جابر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو وہ ایک کپڑے کو جسم پر لپیٹے نماز پڑھ رہے تھے جب کہ دوسرا کپڑا قریب رکھا ہوا تھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کسی نے کہا: ”آپ ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کر رہے ہیں جب کہ دوسرا کپڑا بھی آپ کے پاس موجود ہے۔“ انھوں نے کہا: ”ہاں! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسے جاہل مجھے دیکھ لیں۔“ پھر فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي كَذَا» [بخاری، كتاب الصلاة: باب الصلاة بغير رداء (۳۷۰)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے:

«رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلًا بِهِ فِي بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ

وَاضِعًا طَرَفَيْهِ عَلَى عَاتِقَيْهِ» [بخاری، کتاب الصلاة: باب الصلاة في الثوب الواحد ملتحقاً به (۳۵۶)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں نماز پڑھتے دیکھا، اس کپڑے کے

دو کنارے آپ ﷺ کے کندھوں پر بندھے ہوئے تھے۔“

ہاں عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِحِمَارٍ» [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب المرأة تصلي بغير خمار

(۶۴۱)، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے]

”اللہ تعالیٰ بالغ عورت کی نماز دو پٹا (اوڑھنی) کے بغیر قبول نہیں کرتا۔“

یہ حدیث بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مرد کی نماز ننگے سر ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ایسا کپڑا ضروری نہیں ورنہ نبی

کریم ﷺ یہ کہہ دیتے کہ مرد اور عورت کی نماز ننگے سر نہیں ہوتی۔ حالانکہ کسی حدیث میں ایسے مذکور نہیں۔

اب دلائل سے کوئی یہ مت سمجھے کہ ایک کپڑے میں اس وقت نماز درست تھی جب مسلمانوں کے پاس کپڑے کم تھے اور

جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دے دی تو سر ڈھانپنا واجب ہو گیا۔ اس بات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہم امیر المؤمنین سیدنا

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں، کیونکہ وہ یقیناً ہم سے بڑھ کر شریعت کو سمجھنے والے تھے۔ ایسے ہی حالات میں کسی شخص نے

ان سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سے زیادہ کپڑوں کو شمار کر لیا مگر اس میں

سر ڈھانپنے والے کپڑوں کا نام ہی نہیں۔ [بخاری، کتاب الصلاة: باب الصلاة في القميص والسراويل (۳۶۵)]

امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو تو فراخی و وسعت کے وقت بھی یہی بات سمجھ میں آئی کہ سر ڈھانپنا واجب نہیں۔ اب ان صحیح و مرفوع

احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کو ترک کر کے اپنی عقل کو سامنے رکھنا ہرگز انصاف نہیں۔

قبروں والی مسجدوں میں نماز

سوال ایسی مساجد جہاں قبریں ہوں، نماز پڑھنا جائز ہے؟ کیا نماز ادا ہو جائے گی؟

جواب ایسی مسجدیں جہاں قبریں ہوں وہاں نماز ادا کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ قبروں والی جگہ یا قبروں کی طرف منہ

کر کے نماز ادا کرنے کے متعلق پہلے چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ کے ایک گرجے اور اس میں لگائی گئی تصویروں کا ذکر

نبی ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ أَوْلَئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَ فَأُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ » [بخاری، کتاب الصلاة: باب هل تنبش قبور مشرکی الجاهلیة (۴۲۷)، مسلم (۵۲۸)، نسائی (۷۰۵)]

”بے شک جب ان میں کوئی نیک آدمی مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں تصویریں بناتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن مخلوق میں سے اللہ کے ہاں بدترین ہوں گے۔“

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ و أبی بکر و عمر رضی اللہ عنہما (۱۳۹۰)، مسلم (۵۲۹)]

”اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔“

③ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ » [مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة: باب النهی عن بناء المساجد علی القبور (۵۳۰)]

”اللہ یہودیوں کو تباہ کرے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔“

④ سیدنا جناب رضی اللہ عنہ سے طویل روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل فرمایا:

« أَلَا وَ إِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَ صَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ إِنِّي أَنهَاكُمْ عَنْ ذَلِكَ » [مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة: باب النهی عن بناء المساجد علی القبور (۵۳۲)]

”خبردار! جو لوگ تم سے پہلے تھے (یہود و نصاریٰ) وہ اپنے نبیوں اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، میں تمہیں اس کام سے روکتا ہوں۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قبروں پر مسجدیں بنانا شرعاً حرام و ممنوع ہے تو ایسی مساجد میں نماز ادا کرنا بالاولیٰ منع ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھیں کہ شراب کی خرید و فروخت منع ہے۔ اسی منع کے اندر شراب پینے کی حرمت بھی موجود ہے کیونکہ شراب کی خرید و فروخت ذریعہ ہے اور اس کا مقصود شراب نوشی کرنا ہے اور شرعی اصول یہ ہے کہ ویلے کی حرمت اس ذریعے کے مقصود کو بھی شامل ہوتی ہے۔

اسی طرح مسجد بنانا ذریعہ ہے اور مقصود نماز ادا کرنا ہے۔ جب قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے تو ان مساجد کے اندر نماز ادا کرنا بھی حرام ٹھہرے گا۔ مسجدیں بنانے کا جب شریعت نے حکم دیا ہے تو اس ضمن میں نماز پڑھنے کا حکم بھی موجود ہے کیونکہ مسجد بنانے کا مقصد نماز ادا کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے امام احمد رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى فِي مَقْبَرَةٍ أَوْ إِلَى قَبْرِ أَعَاذَ أَبَدًا » [المحلی لابن حزم (۲۸۰، ۲۷/۴)]

”جس نے قبروں والی جگہ یا قبر کی طرف نماز ادا کی، وہ اپنی نماز کو ضرور لوٹائے۔“

سیدنا ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ وَلَا تَحْلِسُوا عَلَيْهَا » [مسلم، کتاب الجنائز: باب النهی عن الجلوس علی القبر و الصلاة علیہ (۹۷۲)، ابو یعلیٰ (۱۰۱۴)، احمد (۱۳۵/۴)، ترمذی (۱۰۵۰)، ابو داؤد (۳۲۲۹)، نسائی (۷۶۱)، ابن خزیمہ (۷۹۳)، ابن حبان (۲۳۱۱)]

”قبروں کی طرف نماز ادا نہ کرو اور نہ ان پر بیٹھو۔“

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبِرَةَ وَالْحَمَّامَ » [ترمذی، ابواب الصلاة: باب ما جاء أن الأرض كلها مسجد (۳۱۷)، ابو داؤد (۴۹۲)، ابن ماجہ (۷۴۵)، احمد (۸۳/۳)، دارمی (۱۳۹۷)، کتاب الأم (۴۹۲/۱)، ابن خزیمہ (۷۹۱)، ابن حبان (۳۳۸)، حاکم (۲۵۱/۱)]

”ساری زمین مسجد ہے سوائے قبروں والی جگہ اور حمام کے۔“

اس حدیث کو ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور ذہبی رضی اللہ عنہم نے صحیح کہا ہے۔ بعض ائمہ نے اسے معلل قرار دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مرسل اور موصول دونوں طرح سے مروی ہے اور موصول بیان کرنے والا راوی ثقہ ہے۔ جب مرسل و موصول کا جھگڑا ہو تو حکم موصول کا ہوتا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں خاص طور پر امام بخاری اور امام مسلم رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک جب مرسل و موصول میں جھگڑا ہو تو حکم موصول کا ہوگا۔ [شرح مسلم (۲۵۶/۱-۲۸۲)]

اسی طرح علامہ عراقی نے بھی یہی بات کی ہے۔ [شرح الفیہ (۸۳/۱)]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى أَنْ يُصَلَّى بَيْنَ الْقُبُورِ » [موارد الظمان (۳۴۵)، مسند بزار (۴۴۱)، مجمع الزوائد (۳۰/۲)، طبرانی اوسط (۵۶۲۷)، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسے امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اس کا ایک شاہد عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے صحیح ابن حبان میں موجود ہے۔ [موارد الظمان (۳۴۲)، تلخیص الحبیبر (۲۷۷/۱)، اور دوسرا شاہد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد (۴۹۰)، بیہقی (۱۴۵۱/۲) اور تلخیص الحبیبر (۲۷۷/۱) میں موجود ہے]

”نبی ﷺ نے قبروں کے درمیان نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔“

سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اجْعَلُوا فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا هَا قُبُورًا » [بخاری، کتاب الصلاة: باب كراهية الصلاة في المقابر (۴۳۲)، ترمذی (۴۵۱)، مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها (۲۰۸)، مسند احمد (۱۶/۲)، ابو داؤد (۱۴۴۸)، ابن ماجہ (۱۳۷۷)]

”اپنی نماز کا کچھ حصہ گھروں میں ادا کیا کرو، انہیں قبرستان مت بناؤ۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَجْعَلُوا مَبُوتَكُمْ مَقَابِرَ إِنْ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تَقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب صلاة النافلة في بيته و جوازها في المسجد و سواء في هذا الرتبة و غيرها (۷۸۰)]

”اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قبروں والی جگہ نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور حدیث ابن عمرو اور ابی ہریرہ رضی اللہ عنہما میں جو گھروں کو قبرستان بنانے سے منع کیا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قبروں والی جگہ نماز نہیں پڑھی جاتی اور نہ قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لیے تم گھروں کو قبرستان نہ بناؤ بلکہ نفل نمازیں گھروں میں پڑھ لیا کرو تا کہ یہ قبرستان نہ بنیں۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ نسائی میں فرماتے ہیں: ”وَلَا تَتَّخِذُوا هَا قُبُورًا“ کا مفہوم امام کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے: ”انہیں قبروں کی طرح نہ بناؤ کیونکہ قبروں میں نماز نہیں پڑھی جاتی۔“ [حاشیہ سندھی مع سیوطی علی النسائی (۲۱۹/۳)] اور اسی مقام پر علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”أَيُّ كَالْقُبُورِ فِي الْخُلُوعِ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ وَالصَّلَاةِ“

”گھروں کو قبروں کی طرح نہ بناؤ جہاں اللہ کا ذکر اور نماز نہیں ہوتی۔“

ان احادیث میں قبروں والی جگہ نماز پڑھنے کی ممانعت عام ہے خواہ قبر دائیں طرف ہو یا بائیں طرف، آگے ہو یا پیچھے اس لیے کہ منع کی حدیث عام ہے اور جب تک عموم کی تخصیص کتاب و سنت کی کسی دلیل سے نہ ہو عام کی دلالت باقی رہتی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”نہ تو قبر والی جگہ اور نہ قبر کی طرف نماز صحیح ہوتی ہے اور اس سے ممانعت کی وجہ شرک کا ذریعہ بند کرنا ہے۔ ہمارے

بعض اصحاب نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ایک یا دو قبریں نماز سے مانع نہیں، اس لیے کہ ان پر مقبرہ کا لفظ نہیں بولا

جاتا۔ مقبرہ تین یا تین سے زائد قبروں کو کہتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے عام اصحاب میں یہ فرق نہیں ہے، بلکہ

ان کا کلام علت اور استدلال کی عمومیت ایک قبر کے پاس بھی نماز پڑھنے کو مانع ہے اور یہی بات درست و برحق ہے

اور مقبرہ ہر وہ جگہ ہے جس میں قبر بنائی جائے نہ کہ قبروں کا مجموعہ۔“ [الاختیارات العلمية لابن تیمیہ (۲۵)]

ہمارے اصحاب نے کہا ہے قبروں کے ماحول میں ہر وہ جگہ جو مقبرہ کے نام کے تحت آتی ہے اس میں نماز نہ پڑھی جائے۔ یہ

بات اسے متعین کر دیتی ہے کہ نماز کی ممانعت ایک قبر کو بھی شامل ہے۔

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا دلائل اور ائمہ و محدثین کی توضیحات سے معلوم ہوا کہ قبر والی جگہ نماز نہیں ہوتی لہذا اس سے

اجتناب نہایت ضروری ہے۔

گھر میں فرض نماز ادا کرنا

سوال کیا بغیر کسی شرعی عذر کے گھر میں فرض نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب تندرست اور غیر معذور آدمی پر فرض نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾ [البقرة: ۴۳]

”رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

یہ امر ہے اور یہاں امر (حکم) ووجوب کے لیے ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ » [ابن ماجہ، کتاب المساجد: باب التغلیظ

فی التخلف عن الجماعة (۷۹۳)]

”جس شخص نے اذان سنی، پھر وہ بغیر کسی عذر کے مسجد میں نہ آیا تو اس کی نماز ہی نہیں۔“

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے:

”ایک نابینا شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: ”مجھے کوئی مسجد میں لانے والا نہیں، گھر میں نماز ادا

کرنے کی رخصت دے دیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس پلٹا تو رسول اللہ ﷺ نے

پوچھا: ”تو اذان سنتا ہے؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں!“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « فَأَجِبْ » ”تو پھر قبول کر (یعنی

تیرا مسجد میں آنا لازمی ہے)۔“ [مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة: باب يجب إتيان المسجد

علی من سمع النداء (۶۵۳)]

اندازہ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا شخص کو اذان سننے کے بعد اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی تو پینائی

والے شخص کو بغیر شرعی عذر کے بھلا گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت کس طرح ہو سکتی ہے؟ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا:

”میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں، پھر اذان کہلاؤں اور ایک شخص کو نماز پڑھانے کیلئے کھڑا کر کے

ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز باجماعت کے لیے حاضر نہیں ہوتے اور انہیں ان کے گھر سمیت جلا ڈالوں۔

یہ سخت وعید اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر باجماعت نماز ادا کرنا فرض ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے معاشرے میں

اس کی کوئی اہمیت نہیں، لوگ اذان سننے کے بعد اپنے کاموں ہی میں مشغول رہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنے

اپنے مقام ہی پر نماز پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ بغیر کسی شرعی عذر کے ایسے لوگوں کی نماز ہوتی ہی نہیں جیسا کہ گزشتہ

احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

دوران نماز جیب میں روپے رکھنا

(سوال) دوران نماز اکثر ہماری جیبوں میں تصویر والے نوٹ ہوتے ہیں، اس سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟
(جواب) اس بات میں قطعاً شبہ نہیں کہ جاندار کی تصویر شرعاً حرام ہے اور اس پر نصوص قطعیہ، صحیحہ اور حسن درجہ کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا:

« إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ » [بخاری، کتاب اللباس: باب عذاب المصورین يوم القيامة (۵۹۵۰)، مسلم، کتاب اللباس (۲۱۰۹)، مسند احمد (۳۷۵/۱)، مسند حمیدی (۱۱۷)، مسند ابی یعلیٰ (۵۱۰۷)، نسائی (۵۳۶۶)]

” بیشک اللہ کے ہاں انسانوں میں سے سخت ترین عذاب کے مستحق قیامت کے دن تصویر بنانے والے ہوں گے۔“

سعید بن ابی الحسن فرماتے ہیں: میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، ان کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: ”اے ابن عباس! میں ایسا انسان ہوں کہ میری معیشت میرے ہاتھ کی کاریگری ہے اور میں تصاویر بناتا ہوں۔“ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”میں تمہیں وہی حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَوَّرَ صُورَةً فَإِنَّ اللَّهَ مُعَذِّبُهُ حَتَّى يَنْفُخَ فِيهَا الرُّوحَ وَ لَيْسَ بِنَافِعٍ فِيهَا أَبَدًا »

”جس آدمی نے کوئی تصویر بنائی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دے گا، یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے اور وہ اس تصویر میں کبھی روح نہیں پھونک سکے گا۔“

یہ بات سن کر اس کا سانس چڑھ گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”کم بخت! اگر تو نے تصویر بنائی ہی ہے تو درخت وغیرہ کی بنا جن میں روح نہیں ہے۔“ [بخاری، کتاب البیوع: باب بیع التصاویر التي ليس فيها الروح و ما يكره من ذلك (۲۲۲۵)، مسلم، کتاب اللباس (۲۱۱۰)، نسائی (۵۳۶۲)، ابو داؤد (۵۰۲۴)، ترمذی (۱۷۵۱)، شرح السنة (۳۲۱۹)، صحیح ابن حبان (۵۶۸۶)، احمد (۳۵۹/۱)، مسند حمیدی (۵۳۱)، ابو یعلیٰ (۲۵۷۷)، بیہقی (۲۷۰/۷)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر بنانا شرعاً حرام ہے اور مصور کو قیامت کے دن شدید ترین عذاب دیا جائے گا اور ایسی جگہ جہاں تصاویر آویزاں ہوں، عبادت کرنا درست نہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ أَبِي أَنْ يَدْخُلَ الْبَيْتَ وَ فِيهِ الْآلِهَةُ فَأَمَرَ بِهَا فَأُخْرِجَتْ فَأُخْرِجَ صُورَةُ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ فِي أَيْدِيهِمَا مِنَ الْأَزْلَامِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ لَقَدْ عَلِمُوا مَا اسْتَقْسَمُوا بِهَا قَطُّ ثُمَّ دَخَلَ الْبَيْتَ فَكَبَّرَ فِي نَوَاحِي الْبَيْتِ وَ خَرَجَ وَ لَمْ يُصَلِّ فِيهِ » [بخاری، کتاب المغازی: باب أين رَكَرَ النَّبِيُّ الرَّايَةَ يَوْمَ الْفَتْحِ (۴۲۸۸)]

”بے شک رسول اللہ ﷺ جب مکہ تشریف لائے تو آپ نے بیت اللہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس میں (مشرکین کے) معبود تھے، آپ نے انہیں نکالنے کا حکم دیا تو انہیں نکال دیا گیا۔ اس میں سے ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کی تصاویر بھی نکالی گئیں، ان دونوں کے ہاتھوں میں تیر تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اللہ ان مشرکین کو تباہ کرے یقیناً انہیں علم ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام نے تیروں کے ذریعے کبھی فال نہیں نکالی۔“ پھر آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے اس کے مختلف کونوں میں ”اللہ اکبر“ کہا اور باہر نکل آئے اور آپ نے اس میں نماز نہیں پڑھی۔“ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَ فِي الْحَدِيثِ كَرَاهِيَةُ الصَّلَاةِ فِي الْمَكَانِ الَّذِي فِيهِ صُورٌ لِكُونِهَا مَطْنَةً الشِّرْكِ وَ كَانَ غَالِبٌ كُفْرُ الْأُمَمِ مِنْ جِهَةِ الصُّورِ “ [فتح الباری (۱۷/۸)]

”اس حدیث سے تصویروں والی جگہ نماز ادا کرنے کی کراہت معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اس جگہ شرک کا گمان ہے اور امتوں میں کفر اکثر تصویروں کی جانب سے داخل ہوا ہے۔“

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَ تَلَاعَبَ بِهِمْ فِي تَصْوِيرِ الصُّورِ فِي الْكِنَائِسِ وَ عِبَادَتِهَا فَلَا تَحْدُ كِنْسِيَّةٌ مِنْ كِنَائِسِهِمْ تَحْلُو عَنْ صُورَةِ مَرِيَمَ وَ الْمَسِيحِ وَ حَرَجِسَ وَ بَطْرَسَ وَ غَيْرِهِمْ مِنَ الْقَدَيْسِينَ عِنْدَهُمْ وَ الشُّهَدَاءِ وَ أَكْثَرُهُمْ يَسْجُدُونَ لِلصُّورِ وَ يَدْعُونَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ تَعَالَى “ [إغاثة اللهفان في مصائد الشيطان (۲/۳۸۸)]

”شیطان نے عیسائیوں کے ساتھ جو کھیل کھیلے ہیں ان میں سے ایک گرجا گھروں میں تصویریں رکھنا اور ان کی عبادت کرنا بھی ہے۔ آپ عیسائیوں کے گرجا گھروں میں سے کوئی گرجا گھر بھی مریم و عیسیٰ علیہ السلام، جرجس اور بطرس وغیرہ جو ان کے ہاں قدسی شمار ہوتے ہیں، ان کی تصاویر سے خالی نہیں پائیں گے اور ان کی اکثریت تصویروں کو سجدہ کرتی اور انہیں اللہ کے سوا پکارتی ہے۔“

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر بنانا حرام ہے اور انہیں عبادت گا ہوں میں آویزاں کرنا عیسائیت کی تلمیح ہے اور جہاں تصاویر آویزاں ہوں وہاں عبادت کرنا درست نہیں۔ البتہ رہی یہ بات کہ تصویر ہماری جیب میں بھی ہوتی ہے تو کیا اس سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں چند ایک باتیں قابل توجہ ہیں:

❊ نوٹوں اور سکوں پر تصاویر حکومت شائع کرتی ہے اور وہ اس کی ذمہ دار ہے اور اللہ کے ہاں جوابدہ ہوگی۔

❊ ان نوٹوں اور سکوں کو اس ملک میں رکھتے ہوئے استعمال کرنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ ہر قسم کی خرید و فروخت کا دار و مدار انہی نوٹوں اور سکوں پر ہے۔

❊ اگر عبادت کے وقت مساجد وغیرہ میں انہیں باہر نکال کر رکھیں تو دولت کے ضیاع کا قوی اندیشہ ہے۔

شریعت اسلامی میں اضطراری کیفیت میں شرعی حکم تبدیل ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة: ۱۷۳]

”جو شخص مجبور ہو، بغاوت کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو اس پر حرام کھانا گناہ نہیں۔“

لہذا جیب میں نوٹ اور سکے ایک تو پوشیدہ ہوتے ہیں، عبادت کے وقت سامنے نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے عبادت میں خلل نہیں آتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ہماری مجبوری ہے اور بامر مجبوری گناہ نہیں۔ لہذا اقرب الی الصواب بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جیب میں اگر روپے ہوں تو نماز ادا کرنے میں خلل نہیں ہوتا کیونکہ تصاویر اگر سامنے یا عبادت والے کمرے میں آویزاں ہوں تو وہاں نماز ادا نہیں کرنی چاہیے، تاوقتیکہ اس مکان اور کمرے کو تصاویر سے پاک کر دیا جائے۔ (واللہ اعلم)

ڈرائیور حضرات کی نماز

(سوال) ڈرائیور حضرات جو زندگی کے اکثر اوقات سفر میں ہوتے ہیں ان کی نماز قصر ہوگی یا مکمل پڑھی جائے گی؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(جواب) ڈرائیور شخص جب تک گاڑی چلاتا ہے اور سفر میں رہتا ہے تو وہ مسافر ہے اور وہ نماز قصر ادا کرے گا۔ جب وہ اپنے گھر میں آئے تو پوری نماز ادا کرے گا کیونکہ یہاں وہ مقیم ہے اور گاڑی چلانے کے وقت وہ سفر میں ہے اور سفر کی نماز قصر ہے۔

دوران نماز خیالات و وساوس اور ان کا علاج

(سوال) نماز میں ہمیں مختلف وسوسے آتے رہتے ہیں۔ ان سے نماز کی صحت پر اثر پڑتا ہے یا نماز باطل ہو جاتی ہے؟ قرآن و سنت سے رہنمائی فرمائیں۔

(جواب) نماز کے اندر وسوسے اور خیالات کے آنے سے نماز باطل نہیں ہوتی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

« صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِينَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطَى رِقَابَ النَّاسِ إِلَى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهِ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهِ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ فَرَأَى أَنَّهُمْ عَجِبُوا مِنْ سُرْعَتِهِ فَقَالَ ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تَبَرُّعِنَا فَكَّرْتُ أَنِ يَحْبِسَنِي فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِهِ »

[بخاری، کتاب الأذان: باب من صلى بالناس فذكر حاجة فتخطاهم (۸۵۱)]

”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینہ میں عصر کی نماز ادا کی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو جلدی سے اٹھ

کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی کسی بیوی کے حجرے کی طرف چلے گئے۔ لوگ آپ ﷺ کی اس جلدی سے گھبرا گئے۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ آپ کی جلدی پر تعجب کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہمارے گھر میں سونے کی ایک ڈلی ہے، میں نے ناپسند کیا کہ وہ مجھے روک رکھے، میں نے اس کی تقسیم کا حکم دیا ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں کسی چیز کی یاد آئے یا کوئی خیال آجائے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« قَالَ عُثْمَانُ بْنُ أَبِي الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلَاتِي وَ قِرَاءَتِي يُلْبِسُهَا عَلَيَّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهُ خِنْزَبٌ فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذُ بِاللَّهِ مِنْهُ وَ انْفُلْ عَلَى يَسَارِكَ ثَلَاثًا قَالَ فَفَعَلْتُ ذَلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللَّهُ عَنِّي » [مسلم، كتاب السلام: باب التعوذ من شيطان الوسوسة في الصلاة (٢٢٠٣)]

”سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! شیطان میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر قراءت خط ملط کر دیتا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس شیطان کا نام خنزب ہے۔ جب اس کا اسانا محسوس کرو تو (دوران نماز) ”عوذ باللہ“ پڑھو اور دائیں طرف تین مرتبہ تھوکو۔“ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما نے کہا: ”میں نے ایسا ہی کیا اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ”میں اپنا لشکر روانہ کرتا ہوں حالانکہ میں نماز میں ہوتا ہوں۔“ [نیل الأوطار (٢/٣٨٣)]

یعنی بعض اوقات نماز کے دوران میرا خیال لشکر کی تیاری کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں:

« قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى تَحَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا وَسَّوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ » [بخاری، كتاب العتق: باب الخطاء والنسيان في العتاقة (٢٥٢٨)]

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت سے وہ خیالات و وساوس جو ان کے سینوں میں پیدا ہوتے ہیں، معاف کر دیے ہیں، جب تک وہ انھیں عملی جامہ نہ پہنائیں یا ان خیالات کے ساتھ کلام نہ کر لیں۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ شیطان نماز کے اندر وسوسے ڈالتا ہے لہذا جب کسی شخص کو نماز میں کوئی خیال آئے یا وسوسہ پیدا ہو تو وہ ”عوذ باللہ“ پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھوکے، اللہ تعالیٰ اس سے یہ وسوسہ دور فرمادیں گے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وسوسہ اور خیال آجانے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ انسان کو حالت نماز میں ان خیالات کو دور کر کے اپنی پوری توجہ نماز کی طرف مبذول کر دینی چاہیے تاکہ پورے انہماک اور دھیان سے نماز ادا کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح طور پر مناجات ہو، البتہ جتنا دھیان نماز میں کم ہوتا ہے، اتنا ثواب کم ہو جاتا ہے جیسا کہ دیگر صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے۔

نماز میں مصروف افراد کو سلام کرنا

سوال ہم جب مسجد میں آتے ہیں تو کچھ لوگ نماز میں مصروف ہوتے ہیں کیا انھیں سلام کہا جا سکتا ہے؟

جواب نماز کی حالت میں سلام کرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب مسجد میں آتے تو سلام کہتے۔ رسول اللہ ﷺ اگر نماز میں ہوتے تو ہاتھ کے ساتھ اشارہ کر دیتے تھے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: ”نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ رہے ہوتے اور کوئی سلام کہہ دیتا تو کیسے جواب دیتے تھے؟“ بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: «كَانَ يُشِيرُ بِيَدِهِ» ”آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دیتے تھے۔“ [ترمذی، کتاب الصلاة: باب ما جاء في الإشارة في الصلاة (۳۶۸)]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ باہر سے مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہہ سکتا ہے، خواہ جماعت ہو رہی ہو۔ اگر یہ درست نہ ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ خود ہاتھ کے اشارے سے جواب نہ دیتے بلکہ اس سے روک دیتے، جیسا کہ آپ نے منہ سے جواب دینے سے روک دیا تھا۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”ہم جبشہ جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو سلام کہتے تھے تو نبی کریم ﷺ نماز ہی کے دوران ہمیں جواب دیتے تھے، جب ہم جبشہ سے واپس آئے تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ نماز میں مشغول ہیں، میں نے سلام کیا تو آپ نے جواب نہ دیا، نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يُحَدِّثُ مِنْ أَمْرِهِ مَا يَشَاءُ وَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَدْ أَحَدَّتْ مِنْ أَمْرِهِ أَنْ لَا تَكَلَّمُوا فِي الصَّلَاةِ» [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب رد السلام في الصلاة (۹۲۴)]

”اللہ تعالیٰ اپنا جو نیا حکم دینا چاہتا ہے، دے دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ایک نیا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں کلام نہ کرو۔“

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ مسجد میں داخل ہونے والا سلام کہے اور نماز میں مشغول آدمی ہاتھ کے اشارے سے جواب دے، منہ سے جواب دینا اس حالت میں درست نہیں۔

نماز میں بالوں اور کپڑوں کو سنوارنا

سوال کیا نماز میں کپڑے درست کرنے اور بال سنوارنے سے متعلق حدیث میں کوئی ممانعت آئی ہے؟ آگاہ فرمادیں۔

جواب نماز میں اطمینان و سکون کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیے اور نماز کے ارکان کی ادائیگی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ عام لوگوں کی جو عادت ہے کہ کبھی سر کے بالوں سے کھیلتے ہیں اور کبھی داڑھی کے بالوں سے۔ نماز میں ایسے افعال سے پرہیز کرنا

چاہیے جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«أَمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ وَلَا أَكْفُّ شَعْرًا وَلَا تَوْبًا» [بخاری، کتاب الأذان: باب لا یکف
توبہ فی الصلاة (۸۱۶)]

”مجھے سات اعضا پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں۔“
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں کپڑوں اور بالوں سے کھیلنا اور انھیں سمیٹنا درست نہیں ہے لہذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

نماز میں خشوع و خضوع کا طریقہ

(سوال) میری نماز میں خشوع و خضوع اور حضور قلبی نہیں ہوتا، مجھے نماز میں خشوع پیدا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟

(جواب) یہ بات ظاہر ہے کہ کامیاب مومن بننے کے لیے نماز میں عجز و انکسار اور خشوع و خضوع کی ضرورت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”يَقِينًا فَلَاحٍ وَكَامِيَانِ اِنْ اِيْمَانَ وَالْوَالِدِ نَظَائِي هِيَ جَوَائِي نَمَازِوِي مِيْنِ خَشُوْعٍ اِخْتِيَارِ كَرْتِي هِيْنِ“ [المؤمنون: ۲/۱]

نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، چند ایک درج ذیل ہیں:-

① انسان کو نماز کا معنی و مفہوم سیکھنا چاہیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور کر رہا ہے اس کو سمجھے، قراءت، دعا، ذکر و اذکار کے الفاظ و معانی پر غور کرے اور ذہن میں یہ بات ہو کہ میں عبادت کرتے ہوئے اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور اپنے رب سے محو گفتگو ہوں جیسا کہ حدیث جبریل رضی اللہ عنہ میں احسان کا معنی بتلایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو کم از کم یہ خیال ضرور

رہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ رہا ہے۔“ [بخاری، کتاب الايمان: باب سؤال جبريل النبي عن الايمان (۵۰)]

اس طریقے سے انسان نماز کی لذت کو محسوس کرے گا اور یوں نماز آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔“ [مسند احمد: (۱۲۸/۳)، (۱۹۹)، (۲۸۵)، حاکم: (۱۶۰/۲)]
لہذا نماز کے معنی و مفہوم سے آدمی کو باخبر رہنا چاہیے۔

② ایسی سوچ بچار کو دور کرنے کی کوشش کرے جو نماز میں آڑے آتی ہے، وساوس شیطانی کو دفع کرے تاکہ دل شہوات نفسانی سے نکل کر اللہ کی محبت میں اٹک جائے۔

③ نماز پر سکون طریقے سے ادا کرے، جلد بازی سے کام نہ لے، جب تک نماز میں سکون و اطمینان نہ ہو نماز ادا نہیں ہوتی جیسا کہ حدیث میں جو نماز میں رکوع و سجدہ صحیح ادا نہیں کرتا اسے نماز کا چور قرار دیا گیا ہے۔ [حاکم: (۲۲۹/۱)]
[مسند احمد: (۳۱۰/۵)]

ایک حدیث میں رکوع و سجدہ میں ٹھونگے مارنے والے کو اس بھوکے آدمی کی طرح قرار دیا گیا ہے جو ایک یا دو کھجوریں کھاتا ہے اور یہ اسے کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ [صحیح ابن خزيمة: (۳۳۲/۱)۔ طبرانی کبیر: (۱۱۵/۴)]

④ نماز کے اندر موت کو یاد کرے، جب موت یاد آئے گی تو نماز اچھے طریقے سے ادا کرے گا اور یہ یقین کر کے نماز پڑھے کہ اسے شاید اگلی نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے جیسا کہ مسند احمد، ابن ماجہ، المعجم لابن الاعرابی میں حدیث ہے اور شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

⑤ نماز کی دعائیں اور اذکار زیادہ سے زیادہ یاد کرے اور مختلف نمازوں میں مختلف دعائیں اور اذکار جو احادیث صحیحہ میں وارد ہیں، پڑھے۔ کیونکہ ایک مختصر سی دعا جو یاد کی ہوتی ہے وہ آدمی کی عادت در روٹین میں آجاتی ہے پھر اس کا زبان پر ورد تو جاری ہوتا ہے لیکن دل فکر سے خالی ہوتا ہے یعنی ہماری نماز بطور عادت ہوتی ہے عبادت نہیں، جب نماز کے اذکار مختلف یاد ہوں گے اور بدل بدل کر پڑھے گا تو نماز میں دھیان اور توجہ رہے گی اور خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ نماز کے اذکار کے لیے راقم کی کتاب ”صلاة المسلم“ یا ”حسن المسلم“ وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

⑥ اگر نماز میں وسوسہ آجائے تو اپنے بائیں جانب تھوک کر ”عوذ باللہ“ پڑھ لیں۔ [صحیح مسلم، کتاب الاسلام: باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة: (۲۲۰۳)، احمد: (۲۱۶/۴)]
اس طرح شیطان جو نماز کو بھلا دیتا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

⑦ جس جگہ نماز ادا کرے اس جگہ نقش و نگار اور تصاویر وغیرہ نہ ہوں۔ [صحیح مسلم، کتاب اللباس: باب تحریم تصویر صورة الحيوان (۲۱۰۷)]
کیونکہ یہ اشیاء نماز سے توجہ ہٹا دیتی ہیں۔

⑧ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں تاکہ نیکی کی رغبت ہو اور برے لوگوں کی صحبت سے اجتناب کریں۔
⑨ اگر حاجت تنگ کر رہی ہے تو پہلے حاجت کو جائے پھر نماز ادا کرے، کیوں کہ پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز ادا کرنا درست نہیں۔ [ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ و سننہا: باب ما جاء فی النهی للحاقن أن یصلی: (۶۱۷)]

⑩ نیند کا غلبہ ہو تو پہلے نیند پوری کر لے پھر نماز پڑھے۔ [صحیح مسلم، کتاب صلاة، المسافرین (۷۸۶)]

⑪ گفتگو کرنے والے آدمی کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھے۔ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب الصلاة الی المتحدثین و النیام: (۶۹۴)، حاکم (۲۷۰)]

⑫ دوران نماز نظر ادھر ادھر نہ گھمائے۔ [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب الالتفاق فی الصلاة (۹۰۹)]

⑬ اسی طرح کبھی رات کا قیام بھی کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو معمول بنالیں، اس سے بھی خشیت الہی نصیب ہوتی ہے۔

اگر مذکورہ بالا امور پر توجہ دی جائے تو اللہ کے فضل و کرم سے نماز میں خشوع نصیب ہو جاتا ہے، اللہ ہمیں ایسا نمازی بنائے کہ ہم اس کی بندگی صحیح نہج پر کر سکیں اور شیطانی وسوسوں اور عجز و انکسار سے دور کرنے والے ذرائع سے اللہ محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

نماز میں اعوذ باللہ پڑھنا

(سوال) امام کے پیچھے تراویح پڑھتے وقت نیند یا کوئی دوسرا خیال آئے تو ”اعوذ باللہ“ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے کہا:

”اے اللہ کے رسول! بلاشبہ شیطان میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اسے مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ شیطان ہے جسے ”خزب“ کہا جاتا ہے، جب تو اسے محسوس کرے تو اس سے اللہ کی پناہ مانگ یعنی ”اعوذ باللہ“ پڑھ اور اپنی بائیں جانب تین بار تھوک۔“ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے اسے مجھ سے دور کر دیا۔“ [مسلم، کتاب السلام: باب التعوذ من شیطان الوسوستہ: (۲۲۰۳)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں اگر شیطان دوسرے ڈالے تو ”اعوذ باللہ“ پڑھ سکتے ہیں، اگر نیند کا ایسا غلبہ ہو کہ الفاظ کی پہچان مشکل ہو رہی ہو تو پہلے نیند پوری کر لیں پھر نماز پڑھیں اور اگر ایسا غلبہ نہیں تو نماز پوری کر لیں اور سستی و کاہلی دور کریں۔

ایک رات میں قرآن ختم کرنا؟

(سوال) تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم کرنا کیسا ہے جبکہ بعض اسلاف ایسا کرتے رہے؟

(جواب) صحیح احادیث سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی ایک رات میں قرآن حکیم ختم نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کی قراءت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کبھی زیادہ قرآن پڑھتے اور کبھی کم۔ چند ایک احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ سیدنا حدیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبُقْرَةَ فَقُلْتُ يَرَكُّعٌ عِنْدَ الْمِائَةِ ثُمَّ مَضَى فَقُلْتُ يُصَلِّيُ بِهَا فِي رَكْعَةٍ فَمَضَى فَقُلْتُ يَرَكُّعٌ بِهَا ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَهَا يقرأ مترسلاً إِذَا مَرَّ بِآيَةٍ فِيهَا تَسْبِيحٌ سَبَّحَ إِذَا مَرَّ بِسُؤَالٍ سَأَلَ وَإِذَا مَرَّ بِتَعْوِذٍ تَعَوَّذَ ثُمَّ رَكَعَ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب تطويل القراءة

فی صلاة اللیل (۷۷۲)، نسائی (۲۲۶/۳)، احمد (۳۸۲/۵)، ابو داؤد (۸۷۳)، شرح السنة (۲۰/۴)]

”میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے سورہ بقرہ شروع کی۔ میں نے خیال کیا آپ ﷺ سو آیت پر رکوع کریں گے لیکن آپ ﷺ نے قراءت جاری رکھی، میں نے سوچا یہ سورت ایک رکعت میں پڑھیں گے مگر آپ جاری رہے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ پڑھ کر رکوع کریں گے مگر آپ ﷺ نے سورہ نساء شروع کر دی۔ اسے پڑھا پھر آل عمران شروع کر دی، آپ ﷺ نے اسے بھی پڑھا۔ آپ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت

کرتے۔ جب ایسی آیت کے پاس سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح کرتے اور جب سوال والی آیت کے پاس سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب پناہ والی آیت کے پاس سے گزرتے تو پناہ پکڑتے، پھر آپ ﷺ نے رکوع کیا۔“

۲۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَطَالَ حَتَّى هَدَّتُ بِأَمْرِ سُوءٍ قَالَ قِيلَ وَمَا هَمَمْتَ بِهِ؟ قَالَ هَمَمْتُ أَنْ أَجْلِسَ وَأَدْعَهُ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب تطويل القراءة في صلاة الليل (۷۷۳)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ نے قراءت لمبی کر دی حتیٰ کہ میں نے غلط معاملے کا ارادہ کر لیا۔“
آپ سے کہا گیا: ”آپ نے کیا ارادہ کیا؟“ کہنے لگے: ”میں نے ارادہ کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آپ ﷺ کو چھوڑ دوں۔“

۳۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« وَ لَا أَعْلَمُ نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ الْقُرْآنَ كُفْلَهُ فِي لَيْلَةٍ » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب جامع صلاة الليل و من نام عنه أو مرض (۷۴۶)]

”میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ نے (کبھی) ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو۔“

۴۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَقْرَأِ الْقُرْآنَ فِي شَهْرٍ قُلْتُ إِنِّي أَجِدُ قُوَّةَ حَتَّى قَالَ فَاقْرَأْهُ فِي سَبْعٍ وَ لَا تَزِدْهُ عَلَى ذَلِكَ » [بخاری، کتاب فضائل القرآن: باب فی کم یقرأ القرآن؟ (۵۰۵۴)، مسلم، کتاب الصیام: باب النهی عن صوم الدهر (۱۱۵۹)]

”ایک مہینے میں قرآن پڑھ۔“ میں نے کہا: ”میں (اس سے کم وقت میں پڑھنے کی) قوت رکھتا ہوں حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سات دنوں میں پڑھ اور اس سے زیادہ نہ کر۔“

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انھیں مزید رخصت دیتے ہوئے فرمایا:

« لَا يَفْقَهُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ » [ابو داؤد، کتاب الصلاة: باب تحزيب القرآن (۱۳۹۴)]

”جس نے تین دن سے کم میں قرآن پڑھا اس نے اسے نہیں سمجھا۔“

۵۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ خود بھی تین دنوں سے کم میں قرآن ختم نہیں کرتے تھے۔

« كَانَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ فِي أَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ » [صفة صلاة النبي للألبانی (ص/۱۲۰)]

”نبی کریم ﷺ تین دن سے کم میں قرآن نہیں پڑھتے تھے۔“

۶۔ سنن سعید بن منصور میں صحیح سند کے ساتھ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«إِقْرَأْ وَالْقُرْآنَ فِي سَبْعٍ وَلَا تَقْرَأْ وَأَفِيْ أَقْلٍ مِنْ ثَلَاثٍ» [فتح الباری (۹۷/۹)]

”قرآن مجید کو سات دنوں میں پڑھو اور تین دنوں میں نہ پڑھو۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایک رات میں قرآن مجید ختم نہیں کرتے تھے اور آپ ﷺ تین راتوں سے کم میں قرآن مکمل نہیں کرتے تھے اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو بھی فرمایا: ”جس نے تین دنوں سے کم میں قرآن پڑھا اس نے اسے سمجھا نہیں۔“ لہذا سب سے پسندیدہ اور بہترین بات یہی ہے کہ تین دنوں سے کم میں قرآن نہ پڑھا جائے۔

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَهَذَا اِخْتِيَارُ اَحْمَدَ وَ اَبِي عُبَيْدَةَ وَ اِسْحَاقَ بْنِ رَاهُوِيَةَ وَ غَيْرِهِمْ“ [فتح الباری (۹۷/۹)]

”یہی مذہب امام احمد، امام ابو عبیدہ اور امام اسحاق بن راہویہ (رضی اللہ عنہما) وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔“

مولانا عبد الرحمن مبارکپوری رضی اللہ عنہ رقمطراز ہیں:

”وَالْمُخْتَارُ عِنْدِي مَا ذَهَبَ اِلَيْهِ الْاِمَامُ اَحْمَدُ وَ اِسْحَاقُ بْنُ رَاهُوِيَةَ وَ غَيْرُهُمَا“

[تحفة الأحوذی (۶۳/۴)]

”میرے نزدیک مختار مذہب وہی ہے جسے امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ (رضی اللہ عنہما) وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔“

سلف صالحین میں سے کئی افراد سے تین دنوں سے کم میں قرآن پڑھنے کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا عمل اور حکم سب پر فائق ہے۔ ممکن ہے ان اسلاف تک یہ احادیث نہ پہنچی ہوں۔ اس لیے ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوہ کو سامنے رکھنا چاہیے۔ آپ ﷺ سے بہتر عمل کسی کا نہیں ہو سکتا، اس لیے ہمارے نزدیک راجح بات یہی ہے کہ قرآن مجید کو تین دنوں سے کم میں نہ ختم کیا جائے۔

نماز میں ایک آیت سے کم تلاوت کرنا

(سوال) کیا نماز میں ایک آیت سے کم (سورہ بقرہ کی آخری آیت) قراءت کرنے سے نماز ہو جائے گی؟

(جواب) نماز کے اندر ہر رکعت میں سورہ فاتحہ لازم ہے، اس سے زائد جتنی چاہے قراءت کر لیں، خواہ فاتحہ کے بعد ایک آیت پڑھیں یا زیادہ، نماز درست ہوگی۔

رفاعہ بن رافع الزرقی صحابی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”ایک شخص آیا اور رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، اس نے آپ کے قریب ہی نماز پڑھی پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ”دوبارہ نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی۔“ اس نے عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! مجھے بتائیے کہ میں کیسے نماز پڑھوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب قبلہ کی طرف منہ کرو تو تکبیر کہو پھر سورہ فاتحہ پڑھو پھر (قرآن میں سے) جو چاہو پڑھو۔ جب تم رکوع کرو تو اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھ دو اور

اپنی پشت پھیلا دو، اپنا رکوع اطمینان سے کرو، جب تم اپنا سر اٹھاؤ تو اپنی کمر سیدھی کرو، یہاں تک کہ ہڈیاں اپنے جوڑوں تک لوٹ جائیں، جب تم سجدہ کرو تو اپنا سجدہ اطمینان سے کرو پھر جب سر اٹھاؤ تو اپنی بائیں ران پر بیٹھ جاؤ، پھر اسی طرح ہر رکعت میں کرو۔“ [مسند احمد (۴/۳۴۰)، (۱۸۹۹۵)] علامہ نیموی حنفی لکھتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے، [آثار السنن: (ص/۲۱۴)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سورۃ فاتحہ ضروری ہے، اس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے اور فاتحہ سے زائد قراءت نمازی کی منشا پر چھوڑ دی جائے۔ لہذا آپ سورۃ فاتحہ ضرور پڑھیں اور اس سے زائد قراءت جتنی چاہے کریں آپ کی نماز درست ہوگی۔

اگر جمعہ فوت ہو جائے؟

(سوال) اگر کسی شخص کا جمعہ فوت ہو جائے تو کیا وہ بعد میں جمعہ کی دو رکعت پڑھے؟ قرآن و سنت سے وضاحت فرمائیں۔
(جواب) برحق بات یہ ہے کہ جس شخص کا جمعہ فوت ہو جائے وہ نماز ظہر ادا کرے۔ جمعہ فوت ہونے کی صورت میں نماز جمعہ ہی ادا کرنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں جیسا کہ ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ اس سلسلے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے:

« إِذَا أَدْرَكَ الرَّجُلُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ رُكْعَةً صَلَّى إِلَيْهَا رُكْعَةً أُخْرَى فَإِنَّ وَجَدَهُمْ جُلُوسًا صَلَّى أَرْبَعًا » [مصنف عبدالرزاق (۳/۲۳۴)، (۵۴۷۱)، المحلی لابن حزم (۵/۷۰)، بیہقی (۳/۲۰۴)، الأوسط لابن المنذر (۱۰۱/۴)، ابن ابی شیبہ (۵۳۳۴)]

”جب آدمی جمعہ والے دن ایک رکعت پالے تو وہ اس کے ساتھ پچھلی رکعت ادا کرے لیکن اگر لوگوں کو جلسہ کی حالت میں پائے تو چار رکعات ادا کرے۔“

امام بغوی رضی اللہ عنہ رقمطراز ہیں:

”جو شخص امام کو نماز جمعہ میں پائے اور اگر اس کے ساتھ ایک مکمل رکعت پالے تو اس نے جمعہ پالیا، پھر جب امام سلام پھیر دے تو اس کے ساتھ پچھلی رکعت ملا لے تو جمعہ مکمل ہو گیا۔ لیکن اگر امام کے ساتھ مکمل رکعت نہ پائے جیسا کہ دوسری رکعت میں امام کو رکوع کے بعد اٹھنے کی صورت میں پائے تو اس کا جمعہ فوت ہو گیا، اب اس پر واجب ہے کہ وہ چار رکعات نماز ادا کرے۔“ [شرح السنة (۴/۲۷۳)]

اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَدْرَكَ رُكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ » [مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاة: باب من ادرك ركعة من الصلاة فقد ادرك تلك الصلاة (۶۰۷)]

”جس شخص نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔“

ابونضرہ کہتے ہیں:

”جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ فَقَالَ رَجُلٌ قَدْ فَاتَتْهُ الْجُمُعَةُ كَمْ يُصَلِّي؟ قَالَ عِمْرَانٌ وَ لَمْ تَفُوتَهُ الْجُمُعَةُ؟ فَلَمَّا وَلى الرَّجُلُ قَالَ عِمْرَانٌ: أَمَا إِنَّهُ لَوْ فَاتَنِي الْجُمُعَةُ صَلَّيْتُ أَرْبَعًا“

[عبد الرزاق (۵۴۸۲)، (۲۳۶/۳)]

”ایک آدمی سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا: ”جس آدمی کا جمعہ فوت ہو جائے وہ کتنی نماز ادا کرے؟“ عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اس کا جمعہ کیوں فوت ہوتا ہے؟“ جب آدمی پیٹھ پھیر کر جانے لگا تو عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: ”بہر کیف اگر میرا جمعہ فوت ہو جاتا تو میں چار رکعات ادا کرتا۔“

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ جس کا جمعہ فوت ہو جائے اسے چار رکعات ادا کرنی چاہئیں۔ علاوہ ازیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے:

« مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً فَلْيُضِفْ إِلَيْهَا أُخْرَى وَ مَنْ فَاتَتْهُ الرَّكْعَتَانِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا »

[مجمع الزوائد، کتاب الصلاة: باب فيمن أدرك من الجمعة ركعة (۳۱۷۱)، (۴۲۰/۲)، امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے اسے حسن کہا ہے]

”جس آدمی نے جمعہ کی ایک رکعت پالی وہ اس کے ساتھ پچھلی رکعت ملا لے اور جس کی دو رکعت فوت ہو جائیں وہ چار رکعات ادا کرے۔“

مذکورہ بالا روایات سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ جس شخص کی نماز جمعہ فوت ہو جائے وہ چار رکعات ادا کرے۔ عبداللہ بن عمر، عمران بن حصین اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور کثیر ائمہ و محدثین رضی اللہ عنہم سے یہی بات منقول ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس بات کا کوئی بھی مخالف نہیں۔ نیز بعض ائمہ نے تو اس پر اجماع بھی نقل فرمایا ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: موسوعة الإجماع في الفقه الإسلامي (۷۰۱/۲)، (۲۴۶۳)]

قضا نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ

(سوال) قضا نماز کی ادائیگی کا کیا طریقہ کار ہے اور جس آدمی سے سفر میں نماز قضا ہو جاتی ہے، اس کا کیا طریقہ ہے، کیا وہ پوری نماز پڑھے یا قصر؟

(جواب) فوت شدہ نمازوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھنا چاہیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غزوہ احزاب میں بعض نمازیں فوت ہو گئیں تو انہوں نے ترتیب سے ادا کی تھیں۔ صحیحین میں ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خندق والے دن آئے تو کفار قریش کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور کہا:

”اے اللہ کے رسول آج میں بمشکل سورج ڈوبتے نماز پڑھ سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں نے تو ابھی بھی نماز نہیں پڑھی۔“ اس کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وادی بھمان اترے، آپ نے نماز کے لیے وضو کیا

اور ہم نے بھی وضو کیا پھر غروب شمس کے بعد عصر کی نماز پڑھی پھر مغرب کی نماز پڑھی۔“ [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة الخندق: (۴۱۱۲)]

نبی ﷺ کو اس نماز کے فوت ہو جانے کا اس قدر ملال تھا کہ آپ نے مشرکین پر بد دعا کی۔ چنانچہ صحیح بخاری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے خندق والے دن کہا:

”اللہ! ان مشرکین کے لیے ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جس طرح انھوں نے ہمیں نماز وسطیٰ سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔“ [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة الخندق: (۴۱۱۱)]

مسند احمد اور مسند شافعی میں ہے کہ کفار نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے روکے رکھا تو آپ ﷺ نے ساری نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ امام نووی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ان روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جنگ خندق کئی روز جاری رہی تو کسی دن دوسری صورت بن گئی ہوگی۔ [الرحیق المختوم (عربی)، (ص ۳۰۵)]

معلوم ہوا کہ فوت شدہ نمازیں ترتیب سے ادا کرنی چاہئیں۔ مسافر کو اللہ نے حالت سفر میں دو سہولتیں عطا کی ہیں:

① نماز قصر

② جمع کر کے پڑھنا یعنی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء اور جس نے حالت سفر میں اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھایا اور واپس گھر آ گیا تو یہاں حالت اقامت میں پوری نماز ادا کرے۔

نماز کے متعلق شک

سوال جب کسی شخص کو شک ہو کہ اس نے نماز پڑھی ہے یا نہیں تو وہ کیا کرے؟

جواب جب کسی مسلمان کو فرض نماز کے بارے میں شبہ ہو کہ اس نے نماز پڑھی ہے یا نہیں تو اس صورت میں اسے فوراً نماز ادا کر لینی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَ لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ » [بخاری کتاب مواقیب الصلاة: باب من نسي صلاة فليصل إذا ذكر (۵۹۷)]

”جو آدمی نماز پڑھنا بھول جائے تو جب اسے یاد آ جائے اسے پڑھ لے، بس اس کا یہی کفارہ ہے۔“

نمازوں کا اہتمام کرنا مسلمان پر لازم ہے اور باجماعت نماز ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَافِظُوا عَلَيَّ الصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَ قَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾ [البقرة: ۲۸]

”نمازوں کی حفاظت کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔“

اور فرمایا:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاٰكِعِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۳]

”نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

لہذا نماز کا اہتمام کرنا چاہیے اور جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، جو نماز کسی وجہ سے رہ جائے اسے یاد آنے پر جلدی ادا کرنا چاہیے، نماز کی ادائیگی ہی اس کا کفارہ ہے۔

بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کرنا

(سوال) کیا بارش کی وجہ سے نمازیں جمع کی جاسکتی ہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقررہ اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے لہذا ہمیں ہر نماز اس کے وقت میں ادا کرنی چاہیے۔ وقت کے علاوہ صرف وہی نماز ادا ہو سکتی ہے جس کی کوئی شرعی دلیل موجود ہو، بغیر دلیل کے کسی نماز کو اس کے وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح نمازوں کو جمع کرنے کے لیے بھی دلیل کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازوں کو جمع کیا ہے۔ اگر سفر زوال شمس کے بعد شروع کرتے تو ظہر کے وقت میں عصر بھی پڑھ لیتے تھے۔ اسی طرح مغرب کے وقت میں عشاء ادا کر لیتے تھے اور اگر سفر زوال سے پہلے شروع کرتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے اور عصر کو اول وقت میں ادا کر لیتے۔ اسی طرح مغرب کو تاخیر سے ادا کرتے اور عشاء کو اول وقت میں پڑھ لیتے۔ [ابوداؤد، کتاب صلاة السفر: باب الجمع بين الصلاتين (۱۲۲۰)، بیہقی (۱۶۲/۳)، دارقطنی (۳۹۳/۱)، ترمذی (۵۵۳)، المسند المستخرج لأبي نعیم (۲/۲۹۴)]

اب رہا مقیم آدمی کے لیے نماز جمع کرنا اور اس کا طریقہ کار تو بعض اوقات مقیم آدمی بھی نماز جمع کر سکتا ہے۔ [مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها: باب الجمع بين الصلاتين في الحضر (۷۰۵)]

یہاں محل نزاع یہ بات ہے کہ مقیم کی جمع کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیا مقیم ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء پڑھ سکتا ہے یا ظہر کو مؤخر کر کے عصر کو اول وقت میں ادا کرے۔ اسی طرح مغرب کو مؤخر کرے اور عشاء کو اول وقت میں پڑھے؟ تو ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ مقیم ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء جمع نہیں کر سکتا، اگر جمع کرنا چاہے تو ظہر کو مؤخر کرے اور عصر کو اول وقت میں پڑھے، اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کرے۔

جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ مقیم بھی مسافر کی طرح نمازیں جمع کر سکتا ہے انھیں حدیث سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ حالانکہ یہ مطلق جمع کا ذکر ہے، اس کا طریقہ کار بیان نہیں ہوا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو نقل کیا ہے:

« اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى بِالْمَدِينَةِ سَبْعًا وَ تَمَانِيَا الظُّهْرَ وَ الْعَصْرَ وَ الْمَغْرِبَ وَ الْعِشَاءَ » [بخاری، کتاب مواقيت الصلاة: باب تأخير الظهر الى العصر (۵۴۳)]

”بے شک نبی ﷺ نے مدینہ میں سات اور آٹھ رکعات جمع کر کے ادا کیں یعنی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء۔“

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے: ”بَابُ تَأْخِيرِ الظُّهْرِ إِلَى الْعَصْرِ“ (یعنی ظہر کو عصر تک مؤخر کرنے کا بیان)

سید الفقہاء، امام الحدیث، حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس حدیث میں ظہر کی نماز کو عصر تک مؤخر کرنے اور مغرب کو عشاء تک مؤخر کرنے کا بیان ہے تاکہ نمازیں جمع بھی ہوں اور اپنے اپنے وقت میں بھی ادا ہوں اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو مفصل بیان کر کے بات بالکل واضح کر دی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِينَةِ ثَمَانِيًا جَمِيعًا وَ سَبْعًا جَمِيعًا آخِرَ الظُّهْرِ وَ عَجَلَ العَصْرَ وَ آخِرَ المَغْرِبِ وَ عَجَلَ العِشَاءَ» [نسائی، کتاب المواقیب: باب الوقت الذي يجمع فيه المقيم (۵۹۰)]

”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ میں آٹھ اور سات رکعات اکٹھی ادا کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کو مؤخر کیا اور عصر کو جلدی کیا اور مغرب کو مؤخر کیا اور عشاء کو جلدی کیا۔“

اس روایت پر امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں باب قائم کیا ہے: ”الْوَقْتُ الَّذِي يَجْمَعُ فِيهِ الْمُقِيمُ“ (اس وقت کا بیان جس میں مقيم نماز جمع کرے۔)

ان صحیح احادیث اور محدثین کی فقہت سے واضح ہو گیا کہ مقيم آدمی نمازیں جمع کرنا چاہے تو اپنے اپنے اوقات میں پڑھے یعنی ظہر کو تاخیر سے اور عصر کو اول وقت میں، اسی طرح مغرب آخری وقت میں اور عشاء اول وقت میں۔ (واللہ اعلم)

عصر کے بعد نفل پڑھنا

سوال کیا عصر کے بعد نفل پڑھنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے کی ممانعت ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَشْرُقَ الشَّمْسُ وَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغْرُبَ» [بخاری، کتاب مواقیب الصلاة: باب الصلاة بعد الفجر حتى ترتفع الشمس (۵۸۱)، ابو داؤد (۱۲۷۶)، ابن خزيمة (۱۲۷۱)، ابن ماجه (۱۲۵۰)]

”بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کے بعد نماز ادا کرنے سے منع کیا ہے حتیٰ کہ سورج نکل آئے اور عصر کے بعد بھی حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعَتَيْنِ وَ عَنْ لَيْسَتَيْنِ وَ عَنْ صَلَاتَيْنِ نَهَى عَنْ

الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَجْرِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغْرُبَ الشَّمْسُ» [بخاری، کتاب مواقیب الصلاة: باب الصلاة بعد الفجر حتى ترتفع الشمس (۵۸۴)]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے دو سو دوں، دو لہاسوں اور دو نمازوں سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فجر کے بعد طلوع شمس تک اور عصر کے بعد غروب شمس تک نماز سے منع فرمایا ہے۔“

اسی طرح اور احادیث میں بھی ذکر ہے لیکن یہ احادیث اپنے عموم پر نہیں ہیں بلکہ ان میں تخصیص ہو چکی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَلُّوا بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا أَنْ تُصَلُّوا وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةً » [مسند طیبی (۱۷/۱)، مسند ابی یعلیٰ (۵۸۱، ۴۱۱)، ابو داؤد (۱۲۷۴)، ابن ابی شیبہ (۳۴۸/۲)، نسائی (۵۷۴)، مسند احمد (۱۰۷۶)، ابن خزيمة (۱۲۸۵)، صحیح ابن حبان (۶۲۱)، بیہقی (۴۵۹/۲)، سلسلۃ الأحادیث الصحیحة (۲۰۰)]

”عصر کے بعد نماز نہ پڑھو مگر سورج بلند ہو تو پھر پڑھ لو۔“

مندرجہ ذیل حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَلُّوا عِنْدَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَلَا عِنْدَ غُرُوبِهَا فَإِنَّهَا تَطْلُعُ وَ تَغْرُبُ عَلَى قَرْنِ شَيْطَانٍ وَ صَلُّوا بَيْنَ ذَلِكَ مَا شِئْتُمْ » [مسند ابی یعلیٰ (۴۲۱۶)، (۲۲۰/۷)]

”سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت نماز نہ پڑھو، اس لیے کہ یہ شیطان کے سینگ پر طلوع و غروب ہوتا ہے اور اس کے دوران جس قدر چاہوں نماز پڑھ لو۔“

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز کی ممانعت مطلق طور پر نہیں بلکہ جب تک سورج بلند ہو، زردی مائل نہ ہو تو نوافل وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے عصر کے بعد نماز پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« وَالَّذِي ذَهَبَ بِهِ مَا تَرَكَهُمَا حَتَّى لَقِيَ اللَّهَ تَعَالَى حَتَّى نُقِلَ عَنِ الصَّلَاةِ » [بخاری، کتاب مواقیب الصلاة: باب ما یصلی بعد العصر من الفوائت نحوها (۵۹۰)]

”اس کی قسم جو آپ ﷺ کو لے گیا آپ نے ان دو رکعتوں کو نہیں چھوڑا حتیٰ کہ اللہ سے جا ملے اور اللہ سے نہیں ملے حتیٰ کہ نماز سے بوجھل ہو گئے اور عصر کے بعد دو رکعتیں اکثر بیٹھ کر ادا کرتے تھے اور نبی ﷺ ان دو رکعتوں کو پڑھا کرتے تھے اور انھیں مسجد میں اپنی امت پر نقل ہونے کی وجہ سے ادا نہیں کرتے تھے، وہ امت کے لیے تخفیف پسند کرتے تھے۔“

دوسری روایت میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« رَكْعَتَانِ لَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُهُمَا سِرًّا وَلَا عَلَانِيَةً رَكْعَتَانِ قَبْلَ

الصُّبْحِ وَ رُكْعَتَانِ بَعْدَ الْعَصْرِ» [بخاری، کتاب مواقیب الصلاة: باب ما یصلی بعد العصر من الفوائت و نحوها (۵۹۲)]

”دو رکعتیں رسول اللہ ﷺ نہ خفیہ طور پر چھوڑتے تھے اور نہ علانیہ طور پر، دو رکعتیں صبح کی نماز سے پہلے اور دو رکعتیں عصر کی نماز کے بعد۔“

ایک روایت میں ہے کہ عبد العزیز بن رفیع رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

« وَ رَأَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ يُصَلِّي رُكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَ يُخْبِرُ أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَدَّثَتْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ لَمْ يَدْخُلْ بَيْتَهَا إِلَّا صَلَّاهُمَا» [فتح الباری (۲/۶۶)]

”میں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو عصر کے بعد دو رکعتیں ادا کرتے دیکھا، وہ بیان کرتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خبر دی: ”نبی ﷺ ان کے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر آپ یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔“

ام موسیٰ کہتی ہیں: ”میں نے علی رضی اللہ عنہما کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا۔“ [مسند ابی یعلیٰ (۴۷۲۴، ۴۷۲۵)، المقصد الأعلى فی تقریب أحادیث الحافظ أبی یعلیٰ (۵۴۰، ۵۴۱)، (۱/۱۶۵)]

اسی طرح بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم سے بھی عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا ثابت ہے جس کی تفصیل امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے ذکر کی ہے۔ [المحلی (۳/۶۰۵)]

انھوں نے تیس صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جن میں خلفائے راشدین اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ نبی ﷺ نے عصر کے بعد صرف فوت شدہ سنت کی قضا کی تھی اور ہمیں منع کر دیا ہے تو یہ بات درست نہیں۔ اولاً اس لیے کہ قضا تو صرف ایک دفعہ کرنی تھی نہ کہ ساری عمر، ثانیاً قضا کی ممانعت والی روایت درست نہیں اور وہ روایت مختلف کتب احادیث میں موجود ہے۔ [احمد (۲/۳۱۵)، (۱۳/۲۷۲)، موارد الظمان (۶۲۳)، مجمع الزوائد (۲/۲۲۳)، المقصد الأعلى (۵۳۸)]

ام سلمہ رضی اللہ عنہما کہتی ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کی پھر میرے گھر میں داخل ہوئے اور دو رکعتیں ادا کیں۔ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے وہ نماز ادا کی ہے جو (پہلے) آپ ادا نہیں کرتے تھے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس وفد آ گیا تو اس نے مجھے ان دو رکعتوں سے مشغول کر دیا جو میں ظہر کے بعد پڑھتا تھا، سو میں نے اب انہیں ادا کر لیا ہے۔“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! جب یہ دونوں فوت ہو جائیں تو ہم بھی انہیں قضا کر لیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔“ [احمد (۶/۳۱۵)]

امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے کیونکہ حماد بن سلمہ کی کتب میں یہ روایت نہیں اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے چونکہ اس کی سند میں ذکوان ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے بیان کر رہا ہے۔ ذکوان نے اس حدیث کو ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے نہیں

سنا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابو ولید طیاہی نے اس حدیث کو حماد بن سلمہ سے از ازق از ذکوان از عائشہ از ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے اور اس روایت میں قضا کی ممانعت کا ذکر نہیں، جس سے معلوم ہوا کہ ذکوان کی روایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے اور اس میں ممانعت کا ذکر بھی نہیں، لہذا یہ اضافہ ساقط ہے۔

اسی طرح حماد بن سلمہ سے اس کو حجاج بن مضال نے [طبرانی، (۲۴۸۱۲۳)] اور عبد المالك بن ابراهيم [بیہقی، (۴۵۷۱۲)] نے بھی روایت کیا ہے اور ان میں بھی ممانعت والا اضافہ موجود نہیں۔ نیز ام سلمہ والی حدیث صحیح بخاری (۱۲۳۳، ۴۳۷۱) اور صحیح مسلم (۸۳۳) وغیرہ میں بھی موجود ہے، اس میں بھی قضا کی ممانعت مذکور نہیں۔ لہذا ممانعت والی روایت منکر ہے اور اس میں بیان کردہ اضافہ ساقط ہے۔ بہر کیف مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ نماز عصر کے بعد مطلق طور پر نماز منع نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے وفات تک عصر کے بعد دو رکعت ادا کی ہیں اور آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اسی پر عمل پیرا رہی۔

سجدہ تلاوت کا حکم

(سوال) وہ کون سی آیت ہے جس پر سجدہ لازم ہے؟

(جواب) قرآن مجید میں پندرہ ایسے مقامات ہیں جہاں سجدہ کرنا مسنون ہے۔ بعض اہل علم نے سورۃ الحج کے دوسرے سجدے کو شمار نہیں کیا جبکہ کچھ لوگوں نے اس کی جگہ سورۃ ص کے سجدے کو شمار نہیں کیا اور تعداد چودہ ذکر کی ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ یہ دونوں سجدے بھی مسنون ہیں۔ سورۃ ص کا سجدہ صحیح بخاری (۱۰۲۹) میں مذکور ہے اور سورۃ الحج کے دونوں سجدے ابو داؤد (۱۴۰۲) کی حسن حدیث سے ثابت ہیں۔ ان مقامات پر سجدہ کرنا یا نہ کرنا دونوں امور جائز ہیں، البتہ نہ کرنے سے کر لینا افضل ہے، لیکن اسے لازم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سورۃ النجم کا سجدہ کیا (بخاری: ۱۰۸۱)، صحیح بخاری کی دوسری حدیث میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے نبی ﷺ کو سورۃ النجم سنائی اور آپ ﷺ نے سجدہ نہیں کیا۔“ [بخاری، کتاب القرآن: باب من قرأ السجدة ولم يسجد (۱۰۷۲)]

امام بخاری نے بھی سجدہ تلاوت کے مسنون ہونے کا باب ذکر فرمایا ہے:

﴿بَابَ مَا جَاءَ فِي سَجُودِ الْقُرْآنِ وَ سُنَّتِهَا﴾

سجدہ تلاوت کے ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپ نے جمعہ کے دن سورۃ نحل کی تلاوت فرمائی، جب سجدے کا مقام آیا تو منبر سے نیچے اتر کر سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ آئندہ جمعہ آپ نے دوبارہ سورۃ نحل تلاوت فرمائی، جب سجدہ کی آیات پر پہنچے تو فرمایا: ”لوگو! ہم آیات سجدہ سے گزرتے ہیں، جو سجدہ کر لے اس کا عمل صحیح ہے اور جو نہ کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔“ (یہ کہہ کر) آپ نے سجدہ نہ کیا۔ اس روایت میں نافع حضرت عبد اللہ بن عمر کا قول بیان فرماتے ہیں:

« إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَفْرَضْ عَلَيْنَا السُّجُودَ إِلَّا أَنْ نَشَاءَ » [صحيح بخارى، ابواب ال: باب من رأى أن الله عزوجل لم يوجب السجود (١٠٧٧)]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ فرض نہیں کیا مگر ہم میں سے جو سجدہ کرنا چاہے (اس پر بھی کوئی حرج نہیں)۔“

رسول اللہ ﷺ کا نماز میں عمامہ باندھنا

(سوال) کیا رسول اللہ ﷺ کو حالت نماز میں عمامہ یا ٹوپی کے ساتھ دیکھا گیا ہے؟

(جواب) نبی مکرم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ گڑی و عمامہ باندھتے لیکن یہ تصریح کہ حالت نماز میں آپ کو دیکھا گیا ہو اس کا علم نہیں، البتہ بعض احادیث ایسی موجود ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ نے گڑی باندھ کر ہی نماز پڑھائی ہوگی۔ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ”میں نے نبی ﷺ کو گڑی اور موزوں پر مسح کرتے دیکھا ہے۔“ [صحيح البخارى، كتاب الوضوء: باب المسح على الخفين (٢٠٤)]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”سفر میں رسول اللہ ﷺ پیچھے رہ گئے اور میں بھی آپ کے ساتھ پیچھے رہ گیا، جب آپ ﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ”کیا آپ کے پاس پانی ہے؟“ میں آپ ﷺ کے پاس پانی لے کر آیا، آپ ﷺ نے اپنی ہتھیلیاں اور چہرہ دھویا اور اپنے بازوؤں سے کپڑا ہٹانے لگے تو جبہ کی آستین تنگ تھی، آپ نے جبہ کے نیچے سے ہاتھ نکالا اور جبہ اپنے کندھوں پر ڈال دیا اور بازوؤں کو دھویا اور اپنی پیشانی اور گڑی اور اپنے موزوں پر مسح کیا پھر سوار ہو گئے اور میں بھی سوار ہو گیا، ہم جب قوم کے پاس پہنچے تو وہ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے، انھیں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ ایک رکعت پائی۔ جب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو محسوس کیا تو پیچھے ہٹنے لگے، آپ ﷺ نے ان کی طرف اشارہ کیا تو انھوں نے ان کو نماز پڑھائی۔“ [مسلم، كتاب الطهارة: باب المسح على الناصية والعمامة (٢٧٤)]

نبی ﷺ سے عمامہ اتارنا اس موقع پر ثابت نہیں جس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ آپ نے عمامہ باندھ کر ہی نماز پڑھی ہو گی۔ (واللہ اعلم!)

عورتوں کا نماز میں پاؤں ڈھانپنا

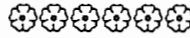
(سوال) کیا نماز میں عورتوں کا جرابیں پہننا ضروری ہے؟

(جواب) عورت کو نماز کی ادائیگی کے وقت اپنا سارا جسم چھپانا چاہیے، ایک قمیص اور بڑے دوپٹے کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ قمیص اتنی لمبی ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ”انہوں نے رسول

اللہ ﷻ سے سوال کیا: ”کیا عورت تہ بند کے بغیر قیص اور اوڑھنی (بڑی چادر) میں نماز پڑھ سکتی ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”اگر قیص اتنی لمبی ہو کہ قدموں کی پشت کو چھالے تو درست ہے۔“ [ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ : باب فی کم تصلی المرأة (۶۴۰)]

اس روایت کو کئی ایک ائمہ نے موقوف قرار دیا ہے اور امام حاکم و امام ذہبی نے اسے بخاری کی شرط پر مرفوع قرار دیا ہے۔ علامہ امیر ایمانی رحمۃ اللہ علیہ ”سبل السلام“ میں فرماتے ہیں: ”یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے اس لیے کہ اس میں اجتہاد کو دخل نہیں۔“ [سبل السلام: ۳۰۵/۱]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو نماز کی حالت میں اپنے پاؤں بھی چھپانے چاہئیں، خواہ پاؤں قیص کے اندر چھپ جائیں جب کہ قیص لمبا ہو یا جرائیں پہن لی جائیں۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

زکوٰۃ کے مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی سزا کیا ہے؟

(سوال) بہت سے مسلمان نماز تو پڑھتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں لیکن شریعت کے مطابق زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں کیا شرعی حکم ہے؟

(جواب) (۱) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ فَأُدْخِلُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴾ [التوبة: ۳۴، ۳۵]

”جو لوگ سونے اور چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجیے کہ جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے جسے تم نے اپنے لیے خزانہ بنا کر رکھا تھا، پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔“

۲۔ ایک اور آیت میں ہے:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ [آل عمران: ۱۸۰]

”جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں کجوسی کو اپنے لیے بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لیے نہایت بدتر ہے، عنقریب قیامت والے دن یہ اپنی کجوسی کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے۔“

۳۔ « عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مِثْلَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَحَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَيْبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَأْخُذُ بِلَهْزِمَتَيْهِ يَعْنِي بِشِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُولُ أَنَا مَالِكٌ أَنَا كَنْزُكَ » [بخاری، کتاب الزکوٰۃ: باب إنم

مانع الزكاة (۱۴۰۳)]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا لیکن اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کا مال گنجدے زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا، جس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں

گے اور وہ اس کے گلے کا ہار ہوگا، وہ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑے گا اور کہے گا: ”میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔“

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو روز قیامت سخت عذاب سے دوچار کیا جائے گا، اس لیے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

سونے چاندی کے نصاب پر زکوٰۃ

(سوال) اگر کسی کے پاس تین چار تولے سونا اور چھ سات سو روپے کی چاندی ہے تو کیا اس صورت میں اس مال پر زکوٰۃ عائد ہوگی؟
(جواب) نبی کریم ﷺ نے سونے اور چاندی کو الگ الگ نصاب مقرر کیا ہے، جس پر سال کا عرصہ گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، جو چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد ہوتی ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں صدقہ نہیں۔“ [بخاری، کتاب الزکاة: باب لیس فیما دون خمس: (۱۴۵۹)]
 حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تمہارے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں ۵ درہم ہیں، اس کے علاوہ اور تم پر کچھ لازم نہیں آتا جب تک تمہارے پاس بیس دینار نہ ہوں، جب تمہارے پاس بیس دینار ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو نصف دینار ہے پھر جو زیادہ ہو وہ اس کے حساب سے ہوگا۔“ [ابوداؤد، کتاب الزکاة: باب زکاة، فی السائمة: (۱۵۷۳)]
 معلوم ہوا کہ سونے کا نصاب ۲۰ دینار اور چاندی کا نصاب ۵ اوقیہ چاندی یعنی ۲۰۰ درہم ہے۔ ان کا وزن پاک و ہند کے عام علماء کے ہاں مشہور و معروف ہے کہ سونا ساڑھے سات تولے اور چاندی ساڑھے باون تولے پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے ہاں ۷۰ گرام سونا اور ۳۶۰ گرام چاندی ہو تو زکوٰۃ پڑتی ہے۔ [احکام زکوٰۃ و عشر (۲۱) از حافظ عبدالسلام بھٹوی]
 لہذا آپ کے پاس موجود مقدار پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، ہاں اگر خوشی سے نقلی صدقہ کریں تو وہ آپ کی مرضی ہے۔

رجب میں زکوٰۃ دینا اور روزے رکھنا

(سوال) کیا رجب کے مہینے میں خاص اہتمام سے روزے رکھنا اور زکوٰۃ نکالنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟ کیونکہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ رجب کا مہینا زکوٰۃ کا مہینا ہے۔

(جواب) رجب ایک ایسا مہینا ہے جسے عامۃ الناس نے عید و میلہ کا مہینا سمجھ رکھا ہے، خصوصاً ۲۷ رجب کی رات کو اور جتنا اس مہینا میں لوگ بعض علاقوں میں صدقات و خیرات کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ روزے رکھتے ہیں اور عمرے کا اہتمام کیا جاتا ہے شاید یہ اہتمام عام مہینوں میں نہیں کیا جاتا، جب کہ اس ماہ خصوصیت کے ساتھ روزے رکھنے اور زکوٰۃ نکالنے کے

متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں، سلف صالحین سے اس کی مخصوص فضیلت میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔ عام حالت میں جس طرح ہر ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھا جاتا ہے یا چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ کے روزے یا ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزے رکھے جاتے ہیں وہ اس ماہ میں بھی اسی طرح رکھے جاسکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ رجب کے مہینے کے کوئی خاص روزے ہیں تو اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اس ماہ کا احترام زمانہ جاہلیت میں لوگ خاص طور پر کرتے تھے۔ جیسا کہ المصنف لابن ابی شیبہ میں روایت ہے: ”اہل جاہلیت اس کی تعظیم کرتے تھے۔ [ابن ابی شیبہ (۹۷۵۸)]

اور عاصم بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں:

”ابن عمر رضی اللہ عنہما جب لوگوں کو اور ان کی رجب کے لیے تیار کردہ چیزوں کو دیکھتے تو ناپسند کرتے۔“ (ابن ابی شیبہ، کتاب

الصیام: باب فی صوم رجب ما جاء فیہ (۹۷۶۱)

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

ماہ رجب کی فضیلت، اس ماہ کے روزوں اور خصوصی طور پر اس کی راتوں کے قیام کے بارے کوئی صحیح حدیث جو قابل حجت ہو مروی نہیں اور مجھ سے پہلے اس پر امام ابو اسماعیل المروزی الحافظ نے جزم کیا ہے۔ ”تبيين العجب عما ورد فی فضل رجب: (ص ۲۱) اور حافظ ابن رجب اس ماہ میں خصوصاً زکوٰۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”اس شہر کے لوگوں نے رجب میں زکوٰۃ نکالنے کو عادت بنا لیا ہے، اس کی سنت میں کوئی اصل نہیں اور نہ ہی سلف میں سے کسی ایک نے یہ بات معروف ہے۔“ [لطائف المعارف (ص ۱۲۵)، بحوالہ السنن والمبتدعات لعمر و عبد سلیم]

زکوٰۃ کے لیے قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جس ماہ میں آدمی کے پاس اتنا مال آجائے جس پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے تو وہاں سے حساب کر کے ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ دی جائے تو سال کے بعد جو بھی مہینا آئے اس میں زکوٰۃ دی جائے۔ ہر شخص کے لیے رجب کا مہینا زکوٰۃ کے لیے مختص نہ کیا جائے۔ بہر کیف رجب کے مہینا میں مخصوص نماز، روزہ اور زکوٰۃ نکالنے کے متعلق کوئی صحیح بات موجود نہیں۔

زیورات پر زکوٰۃ

(سوال) زیر استعمال زیورات یا استعمال کے لیے عاریتاً دینے کے لیے تیار کرائے گئے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں علماء کا اختلاف معروف ہے، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور اگر ان زیورات میں زکوٰۃ واجب ہونے کی بات مان لیں تو کیا اس کا بھی نصاب ہے؟ اور اگر کہتے ہیں کہ ان کا بھی نصاب ہے تو ان احادیث کا کیا جواب ہے جو زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں اور جن کے اندر رسول اللہ ﷺ نے زیورات کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو جہنم کی آگ کی وعید سنائی ہے مگر ان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ کو نہیں پہنچتے ہیں؟

(جواب) سونے اور چاندی کے زیورات جو زیر استعمال ہیں یا استعمال کے لیے عاریتاً دینے کے لیے بنوائے گئے ہیں ان میں

زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف معروف و مشہور ہے لیکن راجح قول یہی ہے کہ ان زیورات میں بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ سونے اور چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے جو دلائل ہیں وہ عام ہیں۔ نیز عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”ایک خاتون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور ان کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو موٹے کنگن تھے۔ اسے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ اس نے جواب دیا: ”نہیں“ آپ نے فرمایا: ”کیا تم کو یہ اچھا لگے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تمہیں آگ کے دو کنگن پہنائے؟“ چنانچہ اس نے وہیں دونوں کنگن اتار دیے اور کہا: ”یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔“ [ابوداؤد، کتاب الزکاة: باب الكنز ماہو؟ (۱۰۶۳)]

اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ہے کہ وہ سونے کے زیورات پہنتی تھیں تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ”کیا یہ کنز ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو مال زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ جائے اور پھر اس کی زکوٰۃ دے دی جائے تو کنز نہیں۔“ [ابوداؤد، کتاب الزکاة: باب الكنز ماہو؟: (۱۰۶۴)]

آپ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

یہ ساری حدیثیں ان زیورات پر محمول کی جائیں گی جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچ گئے ہوں تاکہ ان احادیث کے درمیان اور زکوٰۃ کے تعلق سے وارد دیگر دلائل کے درمیان تطبیق ہو جائے کیونکہ جس طرح قرآنی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔ نیز آیات کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کرتی ہیں، اسی طرح احادیث بھی بعض بعض کی تصدیق و تفسیر کرتی ہیں۔ زیورات میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے جس طرح ان کا مقدار نصاب تک پہنچنا ضروری ہے اسی طرح دیگر امور زکوٰۃ مثلاً روپے، پیسے، سامان تجارت اور چوپایوں کی طرح زیورات پر ایک سال کی مدت کا گزرنا بھی ضروری ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

مصارف زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

سوال کتاب و سنت کی روشنی میں مصارف زکوٰۃ واضح فرمادیجئے؟

جواب مصارف زکوٰۃ کا مطلب ہے کہ وہ مدیں (جگہیں) جہاں پر زکوٰۃ صرف کی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَ

الْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبة: ۶۰]

”صدقات (زکوٰۃ کا مال) فقراء اور مساکین، زکوٰۃ وصول کرنے والے عاملین، نومسلموں کی تالیفِ قلب، غلاموں، قرضداروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ

علم و حکمت والا ہے۔“

یہ آٹھ مصارف زکوٰۃ ہیں، ان آٹھوں کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے۔

فقراء و مساکین:..... فقیر سے مراد وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس تھوڑا بہت خرچ موجود ہو یعنی اس کی آمدنی اس کی ضرورت سے بہت تھوڑی ہو۔

عالمین:..... وہ لوگ جو خلیفہ اسلام یا مسلمانوں کے امیر کی طرف سے زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور ہوں۔ ان کی تنخواہوں وغیرہ پر زکوٰۃ کا مال صرف ہو سکتا ہے۔

مؤلفۃ القلوب:..... اس سے مراد وہ ضعیف الایمان مسلمان ہیں جن کی اگر دلجوئی یا مالی اعانت نہ کی جائے تو ان کے اسلام سے منحرف ہونے کا خطرہ ہو۔

فی الرقاب:..... یعنی اگر کوئی مسلمان آدی غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو مال زکوٰۃ سے اسے غلامی سے آزادی دلا دی جائے تو درست ہے۔

غارمین:..... ان سے مراد وہ مقروض ہیں جن پر اتنا قرض چڑھ چکا ہو کہ جس کے اتارنے کی وہ سکت نہ رکھتے ہوں۔ مگر یاد رہے کہ اگر کوئی آدی خلاف شرع کاموں مثلاً شراب، جوا، وغیرہ میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے مقروض ہو گیا ہو تو اس پر زکوٰۃ کا مال صرف کرنے سے گریز کرنا چاہیے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

فی سبیل اللہ:..... اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو محاذ جنگ پر دشمنان اسلام کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ یہ لوگ غنی بھی ہوں جب بھی ان کی اعانت مال زکوٰۃ سے کرنا جائز ہے تاکہ وہ سامان حرب جیسا کہ دور حاضر میں کلاشنکوف، گرینوف، زیویک وغیرہ گتیں خرید کر دشمن اسلام کا مقابلہ کر سکیں۔

ابن السبیل:..... اس سے مراد وہ مسافر ہیں جو اپنے وطن سے دور ہیں اور ان کے پاس خرچ ختم ہو گیا ہے تو مال زکوٰۃ سے ان کی اعانت کرنا جائز ہے۔

مجاہدین کو زکوٰۃ دینا

(سوال) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجاہدین زکوٰۃ کے مستحق نہیں کیا کتاب و سنت کی رو سے مجاہدین کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

(جواب) اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والوں کو زکوٰۃ دینا شرعی طور پر درست اور جائز ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے ایک مد مجاہدین کے لیے رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَ

الْعَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبة: 60]

”صدقات صرف فقیروں کے لیے ہیں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے

جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں آٹھ مصارف زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک فی سبیل اللہ ہے۔ فی سبیل اللہ کا مصرف جو باقی سات کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے اس سے بالاتفاق جہاد مراد ہے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْهُمْ الْمُغْرَاةُ الَّذِينَ لَا حَقَّ لَهُمْ فِي الدِّيُونِ“ [تفسیر ابن کثیر (ص: ۶۱۶)، مطبوعہ دار السلام]

”فی سبیل اللہ میں وہ مجاہدین، غازی داخل ہیں جن کا (سرکاری) دفتر میں کوئی حق نہیں ہوتا۔“

ابن عبدالحکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَيُجْعَلُ مِنَ الصَّدَقَةِ فِي الْكُرَاعِ وَالسَّلَاحِ وَ مَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ مِنْ آلَاتِ الْحَرْبِ وَ كَفِّ الْعَدُوِّ عَنِ الْحَوَزَةِ لِأَنَّهُ كُلُّهُ مِنْ سَبِيلِ الْعَزْوِ وَ مَنْفَعَتِهِ“ [البحر المحیط (۶۰/۵)]

”صدقہ زکوٰۃ میں سے گھوڑے، فخر، گدھے، اسلحہ اور آلات حرب میں سے جس کی ضرورت ہو، حاصل کیے جائیں گے اور دشمن کو سرحدوں سے روکنے کے لیے یہ تمام اشیاء لڑائی کی راہ میں اور اس کی منفعت میں سے ہیں۔“

امام ابو بکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

”سُبُلُ اللَّهِ كَثِيرَةٌ وَ لِكِنِّي لَا أَعْلَمُ خِلَافًا فِي أَنَّ الْمُرَادَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ هَهُنَا الْعَزْوُ مِنْ جُمْلَةٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ [احکام القرآن (۲/۹۶۹)]

”اللہ کے راستے بہت زیادہ ہیں لیکن میں اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ کسی نے اس بات میں اختلاف کیا ہو کہ یہاں سبیل اللہ سے مراد لڑائی یا غزوہ ہے۔“

یعنی اس آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد بالاتفاق اللہ کے راستے میں لڑائی و غزوہ ہے اور ان پر زکوٰۃ صرف کرنا بالکل صحیح ہے۔ عصر حاضر میں کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر چکے ہیں اور اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے کفار سے برس پیکار ہیں۔ ان کی خدمت کرنا اور آلات حرب خرید کر دشمنان دین کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ اس لیے مجاہدین کی زکوٰۃ فنڈ سے امداد کرنا بالکل صحیح اور درست ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی ہے کیونکہ جتنا کفر مجاہدین سے خائف ہے اتنا دیگر مسلمانوں سے نہیں۔

صدقہ فطر کا حکم

(سوال) صدقہ فطر کا کیا حکم ہے اور کیا اس میں بھی نصاب ہے؟ اور کیا صدقہ فطر میں جو غلہ جات نکالے جاتے ہیں وہ متعین ہیں؟ اور اگر متعین ہیں تو کیا کیا ہیں؟ اور کیا مرد پر سارے گھر کی جانب سے، جن میں بیوی اور خادم بھی ہیں، صدقہ فطر نکالنا واجب ہے؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(جواب) صدقہ فطر ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح حدیث ہے وہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے ہر مسلمان مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع ”جو“ صدقہ فطر فرض قرار دیا ہے اور مسلمانوں کے نماز عید کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الزکاة: باب فرض صدقۃ الفطر (۱۵۰۳)]

صدقہ فطر کے لیے نصاب شرط نہیں بلکہ وہ مسلمان جس کے پاس اپنے لیے اور اپنے بال بچوں کے لیے ایک دن اور ایک رات کی خوراک سے زائد غلہ ہو اسے اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے جن میں اس کے بچے، بیویاں اور زر خرید غلام اور لونڈی شامل ہیں، صدقہ فطر نکالنا ہوگا۔

وہ غلام یعنی خادم جسے اجرت، تنخواہ پر رکھا گیا ہو وہ اپنے صدقہ فطر کا خود ذمہ دار ہے، الایہ کہ مالک بطور احسان اپنی طرف سے ادا کر دے یا خادم نے مالک پر صدقہ فطر کی شرط لگا رکھی ہو۔ لیکن زر خرید غلام کا صدقہ فطر تو جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے، مالک کے ذمہ ہے۔ صدقہ فطر کا علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق شہر کی خوراک کی جنس سے نکالنا ضروری ہے، خواہ کھجور ہو یا جو، گیہوں ہوں یا مکئی یا اس کے علاوہ کوئی اور غلہ ہو اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں کسی خاص قسم کے غلے کی شرط نہیں رکھی ہے اور اس لیے بھی کہ اس سے غرباء و مساکین کے ساتھ ہمدردی مقصود ہوتی ہے۔

مسجد کے قاری کو صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے؟

(سوال) کیا ہم اپنی مسجد میں قرآن پڑھانے والے قاری صاحب کی تنخواہ صدقہ فطر سے ادا کر سکتے ہیں؟

(جواب) صدقہ فطر فقراء و مساکین کا حق ہے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّقَثِ وَ طُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ » [ابن ماجہ، کتاب الزکاة: باب صدقۃ الفطر (۱۸۲۷)]

”نبی اکرم ﷺ نے صدقہ فطر فرض قرار دیا ہے جو روزہ دار کے لیے فضول و بے کار باتوں سے طہارت کا باعث ہے اور مساکین کے لیے کھانے کا باعث ہے۔“

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر مساکین کا حق ہے لہذا اس مال سے قاری صاحب کی تنخواہ ادا نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اگر وہ مساکین کے زمرے میں داخل ہیں تو انہیں صدقہ فطر دیا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مقروض آدمی کا عشر دینا

(سوال) ایک ایسا آدمی جس نے کسی دوسرے آدمی سے زمین ٹھیکا پر لے کر گندم کی فصل کاشت کی ہو اور اس پر قرض بھی ہو تو

کیا اس آدمی پر بھی پورا پورا عشر دینا فرض ہے یا کہ کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ براہ کرم قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔
(جواب) کوئی آدمی مقروض ہو اور اس کے پاس زمین کی آمدنی کے علاوہ دیگر ذرائع آمدنی ہوں جس میں سے وہ قرض ادا کر سکتا ہو تو اسے زمین سے حاصل ہونے والی ساری آمدنی سے عشر ادا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے:
 ”اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے۔“ [البقرة: ۲۶۷]

اس آیت میں اللہ نے زمین سے نکلنے والی ساری آمدنی میں سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر اس کے پاس زمینی آمدنی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے تو وہ زمین کی آمدنی سے اپنا قرض اتارے اور باقی سے عشر دے اور اگر قرض اتنا ہے کہ ادا کرنے کے بعد آمدنی سے کچھ نہیں بچتا ہے تو قرض ادا کر دے، اس پر عشر فرض نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے مسلمانوں پر جو صدقہ فرض کیا ہے وہ اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور فقراء پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری (۴۳۹۵) میں موجود ہے۔
 جس آدمی کا سارا مال ہی قرض میں جا رہا ہو تو وہ غنی نہیں بلکہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو اس کی وسعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

زمین ٹھیکا پر دینا اور ٹھیکا والی زمین کے عشر کا حکم

(سوال) زمین ٹھیکے پر دینا جائز ہے یا ناجائز؟ دلائل سے ثابت کریں۔ اگر جائز ہے تو عشر مالک دے گا یا مزارع؟
(جواب) زمین کو اگر کرائے پر دینا ہو تو روپے پیسے کے عوض یا کل پیداوار میں سے مقرر کردہ حصہ کے بدلے میں دے، شرعی طور پر اس کی رخصت موجود ہے۔ صحیح بخاری (۲۳۳۱) میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کاری کریں تو کل پیداوار میں سے نصف حصہ ان کا ہوگا اور نصف ہمارا۔ اسی طرح مسلم میں ہے کہ رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ہم زمین کو کرائے پر اس طرح دیتے تھے کہ طے کر لیتے کہ زمین کے اس حصے کی پیداوار ہماری اور اس حصے کی ان کے لیے، تو اس طرح کبھی ایک طرف پیداوار ہوتی اور دوسری طرف نہ ہوتی تو آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع کر دیا لیکن چاندی کے عوض دینے سے منع نہیں کیا۔“ [صحیح مسلم، کتاب البیوع: باب کراء الارض: (۱۵۴۷)]
 ان صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین اگر کرائے یا ٹھیکے پر دینا ہو تو اس کا کرایہ یا ٹھیکا رقم کی صورت میں بھی لیا جا سکتا ہے اور غلے کی صورت میں بھی۔ اس زمین سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کا عشر مزارع دے گا کیونکہ فصل کا مالک کاشتکار ہے مالک زمین نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے ایمان والو! پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور اس میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے

زمین سے نکالا ہے۔“ [البقرة: ۲۶۷]

اور جو زمین کا مالک ہے جس نے ٹھیکے یا کرائے پر زمین دی ہے اسے جو رقم ملے اگر اس کے پاس پہلے سے اتنی رقم ہے جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچتی ہے تو اس میں ملا کر زکوٰۃ کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا اور اگر اس سے پہلے وہ صاحب نصاب نہیں اور جو رقم اسے ٹھیکے میں ملی ہے وہ اتنی ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے تو سال کا عرصہ گزرنے پر اس میں سے زکوٰۃ دے گا۔

آل رسول ﷺ کو زکوٰۃ دینا

سوال کیا سید یعنی آل رسول کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ یعنی وہ زکوٰۃ کے مستحق ہیں یا نہیں؟

جواب زکوٰۃ اور صدقات کے اصل حق دار آٹھ ہیں جن کا ذکر سورہ توبہ کی آیت (۶۰) میں موجود ہے اور ان میں سید اور

آل رسول کا ذکر نہیں ہے، کیونکہ ان کے لیے زکاۃ کا مال حلال نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَ إِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) » [مسلم، کتاب الزکاۃ :

باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة (۱۰۷۲)]

”بلاشبہ صدقہ محمد اور آل محمد (ﷺ) کے لیے حلال نہیں۔“

لہذا جو بھی رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اس کے لیے صدقہ و زکوٰۃ حلال نہیں ہے۔

کن فقراء کو زکوٰۃ دینی چاہیے

سوال آج کل ماگنا ایک پیشہ بن چکا ہے مہربانی کر کے بتادیں کہ کس قسم کے فقیروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ

إِيَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ۝ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي

الْأَرْضِ يُحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَعْيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ الْحَافَا وَمَا

تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾ [البقرة: ۲۷۲، ۲۷۳]

”اور جو بھی تم بھلی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود پاؤ گے۔ تمہیں صرف اللہ کی رضامندی طلب کرنے کے

لیے خیرات کرنی چاہیے اور جو بھی تم بھلی چیز خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

صدقات کے مستحق صرف وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں روک دیے گئے ہیں، جو زمین میں (کاروبار وغیرہ) کے لیے

چل پھر نہیں سکتے۔ نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں۔ آپ ان کی علامت سے انہیں پہچان

لیں گے۔ وہ لوگوں سے چٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے بے شک اللہ تعالیٰ اسے جاننے والا ہے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے صدقات و خیرات اور اموال کے مستحق وہ لوگ ہیں جو ”جہاد فی سبیل اللہ“ میں روکے گئے ہیں اور وہ جو فقیر و محتاج ہیں مگر ضرورت ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر دست سوال دراز نہیں کرتے، کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا ان کی خودداری اور عزت نفس کے منافی ہے۔ اس آیت کریمہ میں فقیر و غریب کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں وہ انتہائی قابل توجہ ہیں مثلاً:

۱۔ التّعفف: اس کا مطلب سوال سے بچنا، یعنی فقر و غربت کے باوجود یہ لوگ لوگوں سے سوال کرنے سے گریز کریں گے۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ میں بھیک مانگنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ فَيَأْتِي الْحَبْلَ فَيَجِيءُ بِحِزْمَةٍ حَطَبٍ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيعُهَا فَيَسْتَسْقِي بِثَمْنِهَا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ» [ابن ماجہ، کتاب الزکاة: باب کراہیة

المسئلة (۱۸۳۶)، بخاری، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن المسئلة (۱۴۷۱)، مسند احمد (۱/۱۶۴)]

”تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی پکڑ کر پہاڑ پر جائے اور اپنی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا لاد کر لائے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت پر قناعت کرے تو اس کے حق میں لوگوں سے سوال کرنے سے بہتر ہے کہ لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔“

اسی معنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔ [بخاری، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن

المسئلة (۱۴۷۰)، نسائی، کتاب الزکاة: باب المسئلة (۲۵۸۵)، مسند احمد (۲/۲۵۷، ۳۰۰)]

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَمَنْ يَتَقَبَّلْ لِيْ بِوَاحِدَةٍ وَاتَّقَبَّلْ لَهُ بِالْحَنَةِ قُلْتُ أَنَا قَالَ لَا تَسْأَلِ النَّاسَ شَيْئًا قَالَ فَكَانَ

تُوبَانٌ يَقَعُ سَوَطُهُ وَهُوَ رَاكِبٌ فَلَا يَقُولُ لِأَحَدٍ نَاوِلْنِيْهِ حَتَّى يَنْزِلَ فَيَأْخُذَهُ» [ابن ماجہ، کتاب

الزکاة: باب کراہیة المسئلة (۱۸۳۷)، ابو داؤد، کتاب الزکاة: باب کراہیة المسئلة (۱۶۴۳)، نسائی،

کتاب الزکاة: باب فضل من لا يسأل الناس شيئاً (۲۵۹۱)، حاکم (۱/۴۱۲)، الترغیب والترہیب

[(۵۸۱/۱)]

”جو شخص میری ایک بات قبول کرے گا میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا: ”میں قبول کرتا

ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لوگوں سے کسی چیز کا بھی سوال نہ کر۔“ ثوبان رضی اللہ عنہ کی حالت یہ تھی کہ وہ سوار ہوتے

اور ان کا کوڑا گر جاتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ میرا کوڑا مجھے پکڑا دو بلکہ خود اتر کر اٹھاتے۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَأَلَ وَ لَهُ مَا يُغْنِيهِ جَاءَتْ مَسْئَلَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُدُوشًا أَوْ حُمُوشًا أَوْ كُدُوشًا فِي

وَجْهِهِ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ! وَ مَا يُغْنِيهِ ؟ قَالَ حَمْسُونَ دِرْهَمًا أَوْ قِيمَتُهُ مِنَ الذَّهَبِ »

[ابن ماجہ، کتاب الزکاة: باب من سأل عن ظهر غنى (۱۵۰۲)، نسائی، کتاب الزکاة: باب حد

الغنى (۲۵۹۳)، ابو داؤد، کتاب الزکاة، باب من يعطى من الصدقة و حد الغنى (۱۶۲۶)، ترمذی، کتاب

الزکاة: باب ما جاء من تحل له الزکاة (۶۵۰، ۶۵۱)، سلسلہ الأحادیث الصحیحة (۴۹۹)]

”جس شخص نے سوال کیا اور اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے کفایت کرتا ہے تو قیامت کے دن وہ سوال اس کے چہرے پر چھلا ہوا نشان بن کر آئے گا۔“ سوال کیا گیا: ”اے اللہ کے رسول! آدمی کو کتنا مال کفایت کرتا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پچاس درہم یا اتنی قیمت کا سونا۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا معیوب ہے، کوئی خود دار انسان اسے پسند نہیں کرتا۔ جس شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ وہ اسے کفایت کرتا ہو پھر بھی وہ بھیک مانگے تو اس کے بھیک مانگنے کے باعث قیامت کے دن اس کے منہ پر زخم کا نشان ہوگا اور جو آدمی مسلسل بھیک مانگتا رہتا ہے، قیامت والے دن اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا زَالَ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِي وَجْهِهِ مَزْعَةٌ لَحْمٍ » [بخاری، کتاب الزکاة: باب من سأل الناس تكثرًا (۱۴۷۴)، مسلم، کتاب الزکاة: باب كراهة المسئلة للناس (۱۰۴۰)، نسائی، کتاب الزکاة: باب المسئلة (۲۵۸۶)]

”آدمی لوگوں سے ہمیشہ سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت والے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔“

لہذا لوگوں سے بھیک مانگنے سے حتی الوسع بچنا چاہیے اور جو آدمی لوگوں سے بھیک مانگنے سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے توفیق عطا کر دیتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں دے دیا، انھوں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے انھیں پھر دے دیا۔ انھوں نے پھر سوال کیا آپ نے انھیں دے دیا، حتیٰ کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی تھا ختم ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَا يَكُونُ عِنْدِي مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ أَدَّخِرَهُ عَنْكُمْ وَ مَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ وَ مَنْ يَسْتَعْنِ يُعِنِّهِ اللَّهُ وَ مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللَّهُ وَ مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ » [بخاری، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن المسئلة (۱۴۶۹)، مسلم، کتاب الزکاة: باب فضل التعفف والصبر (۱۰۵۳)، ترمذی، کتاب البر والصلة: باب ما جاء في الصبر (۲۰۲۴)، نسائی، کتاب الزکاة: باب الاستعفاف عن المسئلة (۲۵۸۹)، ابو داؤد، کتاب الزکاة: باب في الاستعفاف (۱۶۴۴)]

”جو کچھ میرے پاس مال ہوتا ہے میں اسے تم سے روک کر نہیں رکھتا۔ جو شخص سوال سے بچاؤ طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بچا لیتا ہے اور جو غنا طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے غنا دے دیتا ہے اور جو صبر کرنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صبر کی توفیق دے دیتا ہے۔ کسی شخص کو صبر سے بڑھ کر وسیع اور خیر والی چیز نہیں دی گئی۔“

لہذا ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے اور بھیک مانگنے سے بچا کر رکھے۔ وہ مسلمان کامیاب ہے جو اپنے رزق پر قناعت کرے اور کسی سے سوال نہ کرے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن

عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرِزْقٌ كَفَافًا وَفَنَعَهُ اللَّهُ بِمَا آتَاهُ » [مسلم، کتاب الزکاة: باب فی الکفاف و الفناعة (۱۰۵۴)، ابن ماجہ، (۴۱۳۸)، ترمذی (۲۳۴۸)، شرح السنة (۲۴۰/۱۴)، مسند احمد (۱۶۸/۲)، بیہقی (۱۹۶/۴)، حلیۃ الأولیاء (۱۲۹/۶)]

”وہ شخص کامیاب ہو گیا جو اسلام لایا اور حسب ضرورت روزی دیا گیا اور جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا اس پر اسے قناعت کی توفیق بخشی۔“

لہذا بہترین مسلمان وہ بھی ہے جو حسب ضرورت روزی دیا گیا تو اس نے اسی پر قناعت کی اور لوگوں سے بھیک نہیں مانگی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھیک مانگنے سے محفوظ فرمائے اور جتنی روزی وہ عطا کرے اس پر قناعت کی توفیق بھی عطا کرے۔ (آمین!)

اگر سوال کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو نیک لوگوں سے سوال کر لینا چاہیے کیونکہ نیک لوگ جو بھی صدقات و خیرات کرتے ہیں وہ محض اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں اور مسائل کو محروم نہیں کرتے۔ عام دنیا دار لوگ اگر ایک آدھ بار تعاون کر بھی دیں تو وہ لوگ انسان کی عزت نفس اور خودداری کو مجروح بھی کر دیتے ہیں جب کہ اللہ کا خوف رکھنے والے لوگ انسان کی محتاجی اور فقر سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے اور کسی موقع پر کیے ہوئے اپنے تعاون کو جتلاتے تک نہیں۔ اس سے انسان کی حرمت و عزت بھی محفوظ رہتی ہے، جس طرح انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ (واللہ اعلم)

۲۔ الحاف: سورۃ بقرہ کی اس آیت کریمہ میں، جسے ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، مسکین کی دوسری صفت ”الحاف“ کی نفی بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بالکل سوال نہیں کرتے، کیونکہ ان کی پہلی صفت ”عفت“ بیان کی گئی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوال میں الحاح و زاری نہیں کرتے اور جس چیز کی انھیں ضرورت نہیں ہے اسے لوگوں سے طلب نہیں کرتے۔ اس لیے کہ الحاف یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود (بطور پیشہ) لوگوں سے مانگے۔ [تفسیر احسن البیان (ص ۱۵۴)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَيْسَ الْمَسْكِينُ بِهَذَا الطَّوْفِ الَّذِي يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللَّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَ التَّمْرَةُ وَ التَّمْرَتَانِ قَالُوا فَمَا الْمَسْكِينُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ! قَالَ الَّذِي لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ وَ لَا يَفْطِنُ لَهُ فَيَتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَ لَا يَسْأَلُ النَّاسَ شَيْئًا » [بخاری، کتاب الزکاة: باب قول الله عزوجل لا يسألون الناس الحافاً (۱۴۷۶)، مسلم، کتاب الزکاة: باب المسكين الذي لا يجد غنى ولا يفتن له فيصدق عليه (۱۰۳۹)]

”مسکین وہ نہیں ہے جو ایک ایک دو دو لقمے یا ایک ایک دو دو کھجور کے لیے لوگوں کے در پر جا کر سوال کرتا ہے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! پھر مسکین کون ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسکین وہ ہے جو حسب ضرورت مال نہیں پاتا، اس کا ادراک نہیں کیا جاتا کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال ہی کرتا ہے۔“

صحیح مسلم میں مذکورہ باب کے تحت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے اس طرح بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَيْسَ الْمُسْكِينُ بِالَّذِي تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ وَ التَّمْرَتَانِ وَ لَا اللَّقْمَةُ وَ اللَّقْمَتَانِ إِنَّ الْمُسْكِينَ الْمُتَعَفِّفُ اقْرَأْ وَ إِنْ شِئْتُمْ ﴿ لَا يُسَالُونَ النَّاسَ الْحَافَا ﴾ » [نیز دیکھیں، بخاری، کتاب التفسیر: باب لا يسألون الناس الحافا (۴۵۳۹)]

”مسکین وہ نہیں جو ایک ایک دو دو کھجور یا ایک دو لقمے کے لیے در در پھرتا ہے، مسکین تو وہ ہے جو سوال کرنے سے بچتا ہے، اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھ لو: ”وہ لوگوں سے چٹ کر سوال نہیں کرتے۔“ الحاف کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُلْجِفُوا فِي الْمَسْئَلَةِ فَوَاللَّهِ لَا يَسْأَلُنِي أَحَدٌ مِنْكُمْ شَيْئًا فَتُخْرِجُ لَهُ مَسْئَلَتَهُ مِنِّي شَيْئًا وَ أَنَا كَارِهٌ فَيُبَارِكُ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتُهُ » [مسلم، کتاب الزکاة: باب النهی عن المسئلة (۱۰۳۸)، نسائی، کتاب الزکاة: باب الإلحاف فی المسئلة (۲۵۹۴)، مسند احمد (۹۸/۴)، بیہقی (۱۹۶/۴)، مستدرک حاکم (۶۲/۲)، طبرانی کبیر (۳۴۸/۱۹)، حلیۃ الأولیاء (۸۱/۴)]

”گڑگڑا کر اور چٹ کر سوال نہ کرو، اللہ کی قسم! تم میں سے جو کوئی مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے اور اس کا سوال مجھ سے کوئی چیز نکلا لیتا ہے اور میں اسے ناپسند کر رہا ہوتا ہوں تو جو میں اس کو دیتا ہوں اللہ اس میں برکت نہ دے گا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ الحاف یعنی کسی کے سامنے الحاح و زاری کر کے اور چٹ کر سوال کرنا منع ہے۔ جس شخص کے پاس چالیس درہم ہوں پھر وہ لوگوں سے گریہ و زاری کر کے سوال کرے تو وہ الحاف کرنے والا ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« سَرَّحْتَنِي أُمِّي إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَيْتُهُ وَ قَعَدْتُ فَاسْتَقْبَلَنِي وَ قَالَ مَنِ اسْتَعْنَى أَعْنَاهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ مَنِ اسْتَعَفَّ أَعْفَاهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ مَنِ اسْتَكْفَى كَفَاهُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ مَنِ سَأَلَ وَ لَهُ قِيمَةٌ أَوْ قِيَةٌ فَقَدْ أَلْحَفَ فَقُلْتُ نَاقَتِي الْيَاقُوتَةُ خَيْرٌ مِّنْ أَوْقِيَةٍ فَرَجَعْتُ وَ كَمِ اسْأَلَهُ » [نسائی، کتاب الزکاة: باب من الملحف (۲۵۹۶)، ابو داؤد، کتاب الزکاة: باب من يعطى من الصدقة و حد الغنى (۱۶۲۸)، ابن خزيمة (۲۴۴۷)، ابن حبان (۸۴۶-موارد) مسند احمد (۷/۳)، بیہقی (۲۴/۷)]

”میری ماں نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف روانہ کیا۔ میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ میری طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور فرمایا: ”جو شخص لوگوں سے بے پروائی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بے پروا کر دے گا اور جو شخص سوال سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچالے گا اور جو تھوڑے پر کفایت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کفایت دے گا اور جو شخص سوال کرے گا اور اس کے پاس ایک اوقیہ (۳۰ درہم) کے برابر مال ہوگا تو اس نے الحاف کیا۔“ میں نے دل میں کہا: ”میری یا قوتہ اونٹنی ایک اوقیہ سے بہتر ہے، میں واپس پلٹ آیا اور آپ ﷺ سے سوال نہ کیا۔“

عبداللہ بن عمرو بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ سَأَلَ وَ لَهُ أَرْبَعُونَ دِرْهَمًا فَهُوَ الْمُلْحِفُ » [نسائی، کتاب الزکاة: باب من الملحف (۲۵۹۵)، بیہقی (۲۴/۷)]

”جس شخص نے سوال کیا اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو وہ ملحف ہے یعنی لوگوں سے چٹ کر سوال کرنے والا ہے۔“
بنو اسد میں سے ایک آدمی نے کہا:

”میں اور میرے گھر والے بقیع الغرقد (مدینہ کے قبرستان کا نام) میں اترے تو میری اہلیہ نے مجھے کہا: ”رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر کھانے کے لیے کسی چیز کا سوال کر۔“ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپ کے پاس میں نے ایک آدمی کو پایا جو آپ ﷺ سے سوال کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اسے کہہ رہے تھے: ”میرے پاس کچھ نہیں ہے جو میں تمہیں دوں۔“ وہ ناراض ہو کر پیٹھ پھیر کر چلا اور کہنے لگا: ”مجھے عمر دینے والے کی قسم ہے! تم اس کو دیتے ہو جسے چاہتے ہو۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ شخص مجھ پر غصے ہوتا ہے اس بات پر کہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ اور فرمایا:

« مَنْ سَأَلَ مِنْكُمْ وَ لَهُ أُوقِيَّةٌ أَوْ عِدْلُهَا فَقَدْ سَأَلَ إِحْسَافًا »

”تم میں سے جس آدمی نے سوال کیا اور اس کے پاس ایک اوقیہ (۴۰ درہم) یا اس کے برابر مال ہو تو اس نے چٹ کر سوال کیا۔“

اسدی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے دل میں کہا: ”میرے پاس تو ایک اونٹنی چالیس درہم سے بہتر ہے۔“ میں واپس پلٹ آیا اور رسول اللہ ﷺ سے سوال نہ کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس جو اور خشک انگور آئے تو آپ ﷺ نے ہمیں بھی اس میں سے ایک حصہ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی کر دیا۔“ [نسائی، کتاب الزکاة: باب اذا لم یکن عنده دراهم و کان له عدلہا (۲۵۹۷)، ابو داؤد، کتاب الزکاة: باب من یعطی الصدقة و حد الغنی (۱۶۲۷)، مسند احمد (۳۶/۴)، بیہقی (۲۴/۷)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ مسکین اور فقیر وہ ہے جس کے پاس حسب ضرورت اخراجات نہیں ہیں اور وہ لوگوں سے چٹ کر سوال بھی نہیں کرتا اور ناواقف و نادان اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر اسے مالدار تصور کر لیتا ہے اور عام طور پر معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ آدمی صدقات و خیرات کا مستحق ہے اور جس شخص کے پاس چالیس درہم یا اس کے برابر مالیت ہو تو وہ اس کی ضرورت کو کفایت کر جاتا ہے اور وہ ملحف (یعنی چٹ کر سوال کرنے والا) نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے دیے ہوئے مال پر قناعت کر لیتا ہے۔

موجودہ دور میں لاری اڈوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومنے والے بھکاری اور گداگر پیشہ ور لوگ ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو محنت مزدوری کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بدن میں اتنی سکت اور ہمت رکھی ہے کہ اگر وہ اسے کام میں لائیں تو سوال کرنے سے بچ سکتے ہیں لیکن یہ لوگ حصول مال کے لیے محنت و مزدوری سے جی چرا کے آسان راستہ اختیار کرتے ہیں اور حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر ہر طریقے سے مال اکٹھا کرنے میں مصروف ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ

بھی ہیں جن کا پورا کتبہ ہی در در کا بھکاری اور سوالی بنا ہوا ہے۔

نوجوان عورتیں اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے لاری اڈوں کی خاک چھان رہی ہیں۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ لوگ صدقات و عطیات کے مستحق معلوم نہیں ہوتے۔ مال و زر والے افراد اور احسان و نیکی کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ صاحب حاجات اور صدقات و خیرات کے مستحق افراد کو پہچان کر ان پر اپنے اموال صرف کریں اور یقیناً حاجت مند مسلمان اللہ کے دین کے حامل ہوں گے اور نماز روزہ جیسی عبادات سرانجام دیتے ہوں گے کیونکہ وہ تو ذلت و خواری سے بچنے کے لیے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے اور نہ ان کی خودداری اور عزت نفس ہی انہیں اس بات کی اجازت دیتی ہے، جب کہ پیشہ ور بھکاریوں میں تو بہت سارے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نشہ آور اشیاء خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے تعاون گناہ پر تعاون ہے جو شرعاً حرام ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”وَ اِخْتَلَفَ اَصْحَابُنَا فِيْ مُسْتَلَمَةِ الْقَادِرِ عَلٰى الْكَسْبِ عَلٰى وَجْهَيْنِ اَصْحَهُمَا : اِنَّهَا حَرَامٌ لِظَاهِرِ الْاِحَادِيْثِ وَ الثَّانِي حَلَالٌ مَعَ الْكِرَاهَةِ بِثَلَاثَةِ شُرُوْطٍ : لَا يُدْلُ نَفْسُهُ، وَ لَا يُلْحِ فِي السُّوَالِ وَ لَا يُوْذِي الْمَسْتُوْلَ فَاِنْ فَقَدَ اَحَدَ هَذِهِ الشُّرُوْطِ فَهِيَ حَرَامٌ بِالْاِتِّفَاقِ“ [شرح مسلم للنووی (۱۱۳/۷)]

”جو شخص کمائی پر قادر ہے اس کے سوال کرنے کے متعلق دو وجہوں سے ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے صحیح ترین بات یہ ہے کہ اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے، ظاہر احادیث کی وجہ سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کراہت کے ساتھ تین شرطوں کے ساتھ حلال ہے: ①..... وہ اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ ②..... اور نہ سوال کرنے میں گریہ و زاری سے کام لے۔ ③..... اور جس سے سوال کر رہا ہے اسے تنگ نہ کرے۔ اگر ان تین شرطوں میں سے ایک بھی مفقود ہوگئی تو سوال کرنا بالاتفاق حرام ہے۔“

دور حاضر کے بھکاری تو در در کی ذلت و رسوائی بھی اٹھاتے ہیں اور مانگتے وقت انتہائی درجے کی گریہ و زاری کرتے ہیں اور لوگوں کو تنگ بھی کرتے ہیں، انہیں اگر کہا جائے ”بھائی معاف کرو“ تو پھر بھی جان نہیں چھوڑتے لہذا ان کا سوال کرنا تو کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ جو شرعی لحاظ سے اور واقعی مسکین ہو اس کی معاونت کریں تاکہ اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو اور پیشہ ور گدا گروں کی حوصلہ شکنی بھی ہو۔



روزے کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

چاند دیکھ کر روزہ رکھنا

سوال کیا روزہ رکھنا چاند دیکھنے سے مشروط ہے؟ قرآن و حدیث سے مسئلہ بتادیں۔

جواب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَصُومُوا حَتَّى تَرَوْا الْهِلَالَ وَلَا تَفْطُرُوا حَتَّى تَرَوْهُ فَإِنْ غَمَّ عَلَيْكُمْ فَأَقْدُرُوا لَهُ »
 [بخاری، کتاب الصوم: باب قول النبی إذا رأيتم الهلال فصوموا (۱۹۰۶)، مسلم (۱۰۸۰)]
 ”تم روزہ نہ رکھو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو اور افطار نہ کرو حتیٰ کہ چاند دیکھ لو۔ اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو گنتی پوری کر لو۔“
 سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« صُومُوا لِرُؤْيَيْهِ وَ أَفْطِرُوا لِرُؤْيَيْهِ فَإِنْ غُيِبَ عَلَيْكُمْ فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ » [بخاری،
 کتاب الصوم: باب قول النبی إذا رأيتم الهلال فصوموا (۱۹۰۹)، مسلم (۱۰۸۱)]

”چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو اور اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کی گنتی کے تیس (۳۰) دن پورے کر لو۔“

یعنی شعبان کی انتیس تاریخ کو چاند دیکھو، اگر نظر آ جائے تو دوسرے دن روزہ رکھو اور اگر نظر نہ آئے یا مطلع ابر آلود ہو تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کر کے رمضان کا روزہ رکھو۔ شک کا روزہ کسی صورت میں بھی نہیں رکھنا چاہیے۔

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ”جس شخص نے اس دن (یعنی شک کے دن) کا روزہ رکھا اس نے یقیناً ابوالقاسم رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کی۔“ [ابن ماجہ، کتاب الصیام: باب ما جاء في صيام يوم الشك (۱۶۴۵)، ابو داؤد (۲۳۳۴)، ترمذی (۶۸۶)، نسائی (۲۱۹۰)، دارمی (۱۶۸۲)]

واضح رہے کہ رویت ہلال کے لیے عادل و قابل اعتماد ایک شخص ہی کی گواہی کافی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَهُ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ » [ابوداؤد، کتاب الصوم: باب شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان (۲۳۴۲)، دارمی،
 کتاب الصیام: باب الشهادة على رؤية هلال رمضان (۱۶۹۸)، دارقطنی (۱۵۶/۲)، بیہقی (۲۱۲/۴)،
 ابن حبان (۸۷۱)، حاکم (۴۲۳/۱)، تلخیص الحبیر (۱۸۷/۲)]

”لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے تو آپ ﷺ نے

خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان کے چاند کی رویت کے بارے میں ایک عادل مسلمان کی گواہی کفایت کر جاتی ہے۔ اس کی تائید میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

«جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنِّي رَأَيْتُ الْهَيْلَالَ يَعْنِي رَمَضَانَ فَقَالَ أَتَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ نَعَمْ قَالَ يَا بِلَالُ! أَدِّنْ فِي النَّاسِ فَلْيَصُومُوا غَدًا» [ابو داؤد، کتاب الصیام: باب فی شہادۃ الواحد علی رویۃ ہلال رمضان (۲۳۴۰)، بیہقی (۲۱۲/۴)، المنتقی لابن الجارود (۳۷۹)]

”ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: ”میں نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے بلال! لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔“

یہ روایت نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی، مستدرک حاکم اور طحاوی میں بھی موجود ہے لیکن اس کی سند میں سماک بن حرب از عمرہ از عباس کے طریق سے مروی ہے اور اس سند میں اضطراب ہے۔ بہر کیف میں نے بطور تائید اس کو ذکر کیا ہے وگرنہ یہ مسئلہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

رمضان کے چاند کے لیے ایک فرد کی گواہی

سوال کیا رمضان المبارک کا چاند دیکھنے کے لیے ایک شخص کی گواہی کفایت کرتی ہے؟

جواب رمضان کی رویت ہلال کے لیے ایک عادل اور قابل اعتماد شخص کی گواہی کافی ہے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«تَرَاءَى النَّاسُ الْهَيْلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ»

”لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔“ [ابو داؤد، کتاب الصوم: باب فی شہادۃ الواحد علی رویۃ ہلال رمضان: (۲۳۴۲)، سنن الدارمی (۱۶۹۸)، ابن حبان (۸۷۱)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے چاند کی رویت کے بارے میں ایک مسلمان عادل شخص کی گواہی کافی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی گواہی پر خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس مسئلہ کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگا ”میں نے رمضان کا چاند دیکھ لیا ہے تو آپ نے فرمایا: ”کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ پھر آپ نے فرمایا: ”کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟“ اس نے کہا:

”ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔“ [ابوداؤد کتاب الصیام: باب فی شہادۃ الواحد علی رؤیة ہلال رمضان (۲۳۴۰)، بیہقی (۲۱۲/۴)]
لہذا ایک عادل کی گواہی پر روزہ رکھ لیا جائے۔

سحری کھانا لازمی ہے؟

سوال کیا روزہ رکھنے کے لیے سحری کھانا ضروری ہے اور کیا یہ سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے؟
جواب حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَسَحَّرُوا وَ لَوْ بِجُزْءِ مِائَةٍ» [موارد الظمان (۸۸۴)]

”سحری کھاؤ اگرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے ہو۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سحری کھانے کے لیے بیدار ہونا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَصَلُّ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَ صِيَامِ أَهْلِ الْكِتَابِ أَكَلَةُ السَّحْرِ» [مسلم، کتاب الصیام: باب فضل السحور و تاکید استحبابہ (۱۰۹۶)]

”ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کا کھانا ہے۔“

سحری میں اللہ تعالیٰ نے برکت بھی رکھی ہوئی ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السُّحُورِ بَرَكَهً» [بخاری، کتاب الصوم: باب برکۃ السحور من غیر ایجاب (۱۹۲۳)]

”سحری کھاؤ اس لیے کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔“

حضرت عریاض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«دَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِلَى السُّحُورِ فِي رَمَضَانَ فَقَالَ هَلُمَّ إِلَيَّ الْغَدَاءِ

الْمُبَارَكِ» [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب من سَمِيَ السُّحُورِ الْغَدَاءِ (۲۳۴۴)، نسائی (۲۱۶۴)، موارد الظمان (۸۸۲)، نیل المقصود (۲۳۴۴)]

”مجھے رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک میں سحری کھانے کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”صبح کے با برکت کھانے کی طرف آؤ۔“

سیدنا ابودرداء رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کا شاہد حسن سند کے ساتھ صحیح ابن حبان میں موجود ہے۔ [موارد الظمان (۸۸۱)،

[۱۸۴/۳]

سحری کے لیے بہترین چیز

سوال مہربانی فرما کر ہماری رہنمائی فرمادیں کہ سحری میں کونسی چیز افضل ہے؟

جواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« نِعْمَ سُحُورُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ » [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب من سَمِيَ السُّحُورَ الْغَدَاءَ (۲۳۴۵)، موارد

الظَّمَان (۸۸۳)، (۱۸۶/۳)]

”مومن کی بہترین سحری کھجور ہے۔“

تاخیر سے سحری کھانا

سوال ہمیں ایک بھائی نے بتایا کہ دیر سے سحری کھانا زیادہ ثواب کا باعث ہے کیا یہ درست ہے؟

جواب سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَنَا مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُؤَخِّرَ سُحُورَنَا وَنَعَجَلَ فِطْرَنَا وَ أَنْ نَمْسِكَ يَمِينَنَا عَلَى شِمَائِلِنَا

فِي صَلَاتِنَا » [موارد الظمان (۸۸۵)، طبرانی کبیر (۱۱/۱۹۹)، (۱۱۴۸۵)]

”یقیناً ہم انبیاء صلی اللہ علیہم وسلم کا گروہ ہیں، ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی سحری میں تاخیر کریں اور افطاری جلدی کریں اور نماز

میں دائیں ہاتھ کو بائیں پر رکھیں۔“

اس کی سند صحیح ہے اور اس کے کئی ایک شواہد بھی ہیں۔

اذانِ سحری کی شرعی حیثیت

سوال کیا نماز کی طرح سحری کے لیے بھی اذان کہی جاسکتی ہے؟ اور قرآن و حدیث میں اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ بِلَالًا يُوذِّنُ بِلَيْلٍ فَكُلُوا وَ اشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ قَالَ وَ كَانَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ

رَجُلًا أَعْمَى لَا يُنَادِي حَتَّى يُقَالَ لَهُ أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ » [بخاری، کتاب الأذان: باب اذان

الأعمى إذا كان له من يخبره (۶۱۷)، مسلم، کتاب الصیام (۱۰۹۲)]

”یقیناً بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتے ہیں، سو تم کھاؤ، پیو یہاں تک کہ عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے۔“ (راوی

نے) کہا: ”عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ناپینا تھے، وہ اتنی دیر تک اذان نہیں دیتے تھے جب تک انھیں کہا نہ جائے کہ تو

نے صبح کر دی، تو نے صبح کر دی۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَمْنَعَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا نَزَلَ مِنْ سُحُورِهِ فَإِنَّهُ يُؤَدُّنُ بِلَيْلٍ لِيَرْجِعَ قَائِمُكُمْ وَ لِيُنْبِتَ نَائِمُكُمْ »

[بخاری، کتاب الأذان : باب الأذان قبل الفجر (۶۲۱)]

”تم میں سے کسی کو بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سحری کرنے سے نہ روکے، اس لیے کہ وہ رات کو اذان دیتے ہیں تاکہ قیام کرنے والا لوٹ آئے اور سونے والا بیدار ہو جائے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« وَ كَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا إِلَّا أَنْ يَنْزِلَ هَذَا وَ يَصْعَدَ هَذَا » [نسائی، کتاب الأذان: باب هل يؤذنان جميعا

أو فرادی (۶۴۰)]

”دونوں کی اذان میں اتنا وقفہ ہوتا کہ یہ اذان کہہ کر اترتا اور وہ چڑھ جاتا۔“

علامہ سندھی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اس حدیث سے مراد دونوں کے درمیان وقفے کی قلت ہے نہ کہ حد کا تعین۔“ نیز امام

نوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” قَالَ الْعُلَمَاءُ مَعْنَاهُ أَنَّ بِلَالَ كَانَ يُؤَدُّنُ قَبْلَ الْفَجْرِ وَ يَتَرَبَّصُّ بَعْدَ أَذَانِهِ لِلدُّعَاءِ وَ نَحْوَهُ ثُمَّ

يَرُقُبُ الْفَجْرَ فَإِذَا قَارَبَ طُلُوعَهُ نَزَلَ فَأَخْبَرَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ فَيَتَأَهَّبُ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ رَضِيَ

اللَّهُ عَنْهُ بِالطَّهَارَةِ وَ غَيْرِهَا ثُمَّ يَرُقِي وَ يَشْرَعُ فِي الْأَذَانِ مَعَ أَوَّلِ طُلُوعِ الْفَجْرِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ ”

[شرح مسلم للنووی (۱۷۷/۷)]

”علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ فجر سے پہلے اذان دیتے تھے اور اذان کے بعد دعا وغیرہ

کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ جب طلوع فجر قریب ہوتی تو اتر آتے اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خبر کر دیتے تو وہ وضو وغیرہ کی

تیاری کرتے پھر اوپر چڑھ جاتے اور فجر طلوع ہوتے ہی اذان شروع کر دیتے۔“

غرض سحری کی اذان اور صبح صادق میں اتنا وقفہ ضرور ہونا چاہیے جس سے آدمی آسانی سے سحری کر لے، قیام کرنے والا

واپس پلٹ آئے، سویا ہوا بیدار ہو جائے اور روزے کی تیاری کر لے، کیونکہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کھانے پینے سے مانع نہ تھی، اس

لیے کہ وہ صبح کاذب میں ہوتی تھی۔

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ اس حدیث کی رو سے سمجھایا ہے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

« تَسَحَّرْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ثُمَّ قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ قُلْتُ كَمْ كَانَ بَيْنَ الْأَذَانِ وَ السُّحُورِ ؟

قَالَ قَدَرُ خَمْسِينَ آيَةً » [بخاری، کتاب الصوم : باب قدر کم بين السحور و صلاة الفجر (۱۹۲۱)]

”ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔“ میں (انس رضی اللہ عنہ) نے کہا:

”اذان اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟“ تو انھوں نے کہا: ”پچاس آیات کے برابر۔“

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سحری کے وقت فرمایا:

« يَا أَنَسُ ! إِنِّي أُرِيدُ الصَّيَامَ أَطْعَمْنِي شَيْئًا فَاتَيْتُهُ بَتَمْرٍ وَ إِنَاءٍ فِيهِ مَاءٌ وَ ذَلِكَ بَعْدَ مَا أَدَّنَ بِلَالٌ فَقَالَ يَا أَنَسُ ! انْظُرْ رَجُلًا يَأْكُلُ مَعِيَ فَدَعَوْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَجَاءَ فَقَالَ إِنِّي قَدْ شَرِبْتُ شُرْبَةً سَوِيْقٍ وَ أَنَا أُرِيدُ الصَّيَامَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَنَا أُرِيدُ الصَّيَامَ فَتَسَحَّرَ مَعَهُ ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ » [نسائی، کتاب الصیام: باب السحور بالسويق والنمر (۲۱۶۶)]

”اے انس! میرا روزے کا ارادہ ہے، مجھے کوئی چیز کھلاؤ۔“ میں آپ کے پاس کھجور اور پانی والا برتن لایا اور یہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد کا قصہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے انس! کوئی آدمی تلاش کر جو میرے ساتھ کھانا کھائے۔“ میں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دعوت دی تو وہ تشریف لائے اور کہا: ”میں نے ستو کا ایک گھونٹ پی لیا ہے اور روزے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”میں بھی روزے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ سحری کی پھر کھڑے ہوئے، دو رکعت سنت پڑھی اور پھر نماز صبح کے لیے گھر سے نکلے۔“

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان بلال رضی اللہ عنہ کے بعد اتنا وقفہ ضرور ہوتا تھا جس میں آدمی سحری کا انتظام کر کے کھانا کھالے۔ لہذا دونوں اذانوں کے درمیان اتنا وقفہ ضرور ہونا چاہیے جس میں سحری کا بندوبست ہو سکے۔

اذان کے دوران کھانا پینا

(سوال) کیا اذان شروع ہوتے ہی سحری کھانے سے رک جانا ضروری ہے یا اذان ختم ہونے تک کھا پی سکتے ہیں؟

(جواب) مؤذن کے بارے میں اگر یہ معروف ہو کہ وہ فجر طلوع ہونے کے ساتھ ہی اذان دیتا ہے تو ایسی صورت میں اس کی اذان سنتے ہی کھانے پینے اور دیگر تمام مفطرات سے رک جانا ضروری ہے، لیکن اگر کیلنڈر کے اعتبار سے ظن و تخمین سے اذان دی جائے تو ایسی صورت میں اذان کے دوران کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ نبی ﷺ کی حدیث ہے، آپ نے فرمایا:

« إِنَّ بِلَالًا يُنَادِي بِلَيْلٍ فَكُلُوا وَ اشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ »

”بلال رات میں اذان دیتے ہیں سو کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتوب اذان دیں۔“ [بخاری، کتاب الاذان:

باب الاذان قبل الخیر (۶۲۰)]

نیز فرمایا: ”جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا۔“ [بخاری، کتاب الإیمان: باب

فضل من استبرأ الدينہ (۵۲)]

لیکن اگر یہ بات متعین ہو کہ مؤذن کچھ رات باقی رہنے پر طلوع فجر سے پہلے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے اذان دیتا ہے، جیسا کہ بلال کرتے تھے، تو ایسی صورت میں مذکورہ بالا حدیث پر عمل کرتے ہوئے کھاتے پیتے رہنے میں کوئی حرج نہیں،

یہاں تک کہ طلوع فجر کے ساتھ اذان دینے والے مؤذن کی اذان شروع ہو جائے۔

سحری کھانے کا آخری وقت

سوال کیا دوران اذان سحری کھائی جاسکتی ہے؟ یا اذان کے شروع ہوتے ہی کھانا بند کر دیا جائے۔ صحیح مسئلہ کی طرف رہنمائی فرمادیں۔

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَبَيِّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾

[البقرة: ۱۸۷]

”اور کھاؤ پو یہاں تک کہ تمہارے لیے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے۔“

اس آیت کریمہ میں ”الخیط الأبيض“ سے مراد صبح صادق اور ”الخیط الأسود“ سے مراد رات ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو میں نے اونٹ باندھنے والی ایک سیاہ رسی اور ایک سفید رسی اپنے تکیے کے نیچے رکھ لی۔ میں رات کے وقت انھیں دیکھنے لگا تو مجھے صاف نظر نہ آئیں۔ میں نے صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر سارا ماجرا سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ إِنَّمَا ذَلِكَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبَيَاضُ النَّهَارِ ﴾ [بخاری، کتاب الصوم: باب قول الله تعالى: ﴿ وَكُلُوا

وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَبَيِّنَ لَكُمُ ﴾ [(۱۹۱۶)]

”اس آیت کریمہ میں سیاہ اور سفید دھاگے سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سحری کا وقت بتا دیا ہے کہ صبح صادق تک تم کھا پی سکتے ہو، وقت کی حدود متعین کرنے میں کچھ وسعت معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس طرح آج گھڑیاں موجود ہیں ظاہر بات ہے زمانہ رسالت اور زمانہ خلفائے راشدین وغیرہ میں یہ ایجادات موجود نہ تھیں، لوگ ستاروں اور چاند کے ساتھ رات کے اوقات معلوم کرتے تھے۔ اس لیے اگر سحری میں ایک دو منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کوئی قیامت پانہیں ہوتی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ إِذَا سَمِعَ أَحَدُكُمْ النِّدَاءَ وَ الْإِنَاءَ عَلَىٰ يَدِهِ فَلَا يَضَعُهُ حَتَّىٰ يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ ﴾ [ابو داؤد،

کتاب الصوم: باب فی الرجل یسمع النداء والانیاء فی یدہ (۲۳۵۰)، حاکم (۴۲۶/۱)، بیہقی (۴/۲۱۸)، دارقطنی (۲۱۶۲)]

”جب تم میں سے کوئی آدمی اذان سے اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس برتن کو حاجت پوری کرنے سے پہلے نہ رکھے۔“

مولانا عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

﴿ وَ فِيهِ إِبَاحَةٌ الْأَكْلِ وَالشُّرْبِ مِنَ الْإِنَاءِ الَّذِي فِي يَدِهِ عِنْدَ سَمَاعِ الْأَذَانِ لِلْفَجْرِ وَ أَنْ لَا

يَضَعُهُ حَتَّىٰ يَقْضِيَ حَاجَتَهُ ﴾ [مرعاة المفاتيح (۴۶۹/۶)]

”اس حدیث میں فجر کی اذان سنتے وقت اس برتن سے کھانے اور پینے کی اباحت معلوم ہوتی ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ وہ اسے اپنی حاجت پوری کرنے سے پہلے نہ رکھے۔“

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کا شاہد بھی موجود ہے۔ [مسند احمد (۳/۴۸۸)]

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [مرعاة المفاتیح (۶/۴۷۰)]

روزے کے لیے نیت کرنا

(سوال) کیا روزے کی بھی نیت ہے اور کیا یہ درست ہے کہ اگر نیت نہ کی تو روزہ نہ ہوگا؟

(جواب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ لَمْ يُجْمِعِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ » [ابو داؤد، کتاب الصوم: باب النية في الصيام (۲۴۵۴)، ترمذی، کتاب الصوم: باب ما جاء لا صيام لمن لم يعزم من الليل (۷۳۰)، نسائی، کتاب الصيام (۲۳۳۴)، دارمی (۱۷۰۵)]

”جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں ہے۔“

چونکہ تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور نیت کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں، مثلاً روزہ کی نیت نہ کی گئی اور روزہ جیسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں تو روزہ نہ ہوگا بلکہ فاقہ ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ نیت کے لیے زبان سے تلفظ کی ضرورت نہیں۔ یہ دل کا فعل ہے۔ بعض حضرات نے روزے کی نیت کے یہ الفاظ وضع کیے ہیں: ”وَبَصَوْمٍ عَدِ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ“ (میں نے ماہ رمضان کے کل کے روزے کی نیت کی) یہ الفاظ کسی حدیث سے ثابت نہیں اور نیت بھی کل آنے والے دن کی کر رہا ہے۔ علامہ ابن منظور رقمطراز ہیں: ”أَصْلُ الْعَدِ وَهُوَ الْيَوْمُ الَّذِي يَأْتِي بَعْدَ يَوْمِكَ“ ”عَدَا كَأَصْلِهِ“ ”یہ ہے کہ وہ دن جو تیرے آج کے دن کے بعد ہوگا۔“ [لسان العرب (۱۰/۲۶۷)]

بعض حضرات نے لفظ ”عَدَا“ کا مطلب یہ بیان کیا ہے: ”آئندہ کل، دور کا دن جس کا انتظار ہو۔“ [مصباح اللغات (ص ۵۹۳)]

لہذا یہ الفاظ معنوی طور پر بھی درست معلوم نہیں ہوتے۔

روزے کے لیے زبان سے نیت کی حیثیت

(سوال) نیت زبان سے کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ نیز نیت کے مروجہ الفاظ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) ہر سال رمضان المبارک کے آنے سے قبل ہی افطاری و سحری کے اوقات کے تجارتی کیلنڈر شائع ہو کر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن پر اوقات نامہ، روزہ رکھنے کی نیت ”وَبَصَوْمٍ عَدِ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ“ کے الفاظ بھی عموماً دیکھے

گئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے کل کے رمضان کے روزے کی نیت کی۔ جہاں تک نیت کا تعلق ہے تو تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور نیت کے بغیر کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ مثلاً اگر نماز کی نیت کی طرح روزہ کی نیت نہ کی گئی اور روزہ جیسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں اور اس کے لوازمات کو بھی ادا کرنے میں سارا دن کوئی کوتاہی نہ کی، تو پھر بھی روزہ نہ ہوگا بلکہ فاقہ ہوگا جس کا اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں ہے۔“ [ابو داؤد، کتاب الصوم: باب النية فى الصيام (۲۴۵۴)، ترمذی، کتاب الصوم: باب ما جاء لا صيام لمن لم يعزم من الليل (۷۳۰)، نسائی، کتاب الصيام (۲۳۳۴)]

تمام عبادات میں نیت ضروری ہے، چاہے نماز ہو، زکوٰۃ ہو یا روزہ۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

”تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔“ [بخاری، کتاب بدء الوحی (۱)]

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اعمال کی دو اقسام ہیں:

۱۔ وہ اعمال جو اصل مقصد کے لیے ہوں جیسے نماز، روزہ وغیرہ، ان کی نیت ضروری ہے، اگر نیت نہ کی جائے گی تو اعمال باطل ہوں گے۔

۲۔ وہ اعمال جو اصل مقصد کے لیے تو نہیں لیکن اصل مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں جیسے وضو اور غسل، ان کی نیت اگر نہ بھی کی جائے تو درست ہوگا۔

آخر الذکر مسئلہ کا حکم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی رائے اور قیاس تک محدود ہے۔ شرعی دلائل میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ کوئی دلیل اس مسئلہ کی مؤید ہے۔ کیونکہ «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» کے الفاظ مطلق اعمال پر دلالت کر رہے ہیں، اس سے کوئی عبادت بھی (چاہے وہ واسطہ ہو یا بذات خود عبادت) مستثنیٰ نہیں ہے۔

روزے میں نیت احتیاف کے ہاں بھی ضروری ہے مگر مروجہ نیت من گھڑت اور خود ایجاد کردہ ہے۔ چنانچہ احادیث مبارکہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نیت زبان سے نہیں ہوتی بلکہ اس کا محل دل ہے۔ دل سے نیت ضروری ہے۔ اس بات کی شہادت فقہ کی معتبر کتب میں بھی موجود ہے کہ نیت کا محل دل ہے زبان نہیں۔ لیکن اگر یہ الفاظ زبان سے ادا کر بھی لیے جائیں تو نیت، نیت نہیں رہتی بلکہ کلام بن جاتی ہے، جس کا جواز کہیں موجود نہیں ہے۔ جملہ عبادات مثلاً طہارت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ میں بالاتفاق نیت کی جگہ دل ہے زبان نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَالشَّرْعُ خَصَّصَهُ بِالْإِرَادَةِ الْمُتَوَجِّهَةِ نَحْوَ الْفِعْلِ لِابْتِعَاءِ رِضَاءِ اللَّهِ وَامْتِنَالِ حُكْمِهِ“

[فتح الباری]

”شریعت نے نیت کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی کام کے ارادے کے لیے خاص کیا ہے۔“

معلوم ہوا کہ اعمال میں اعتبار قلبی نیت کا ہوگا، اگر اس کے خلاف زبان سے کچھ کہے تو اعتبار محض لفظوں کا نہیں ہوگا۔ اگر محض زبان سے نیت کرے مگر دل میں نہ ہو تو بالاتفاق یہ ناجائز ہے کیونکہ نیت تو قصد و عزم کا نام ہے۔ لہذا روزہ دار اور نمازی کو روزہ رکھنے اور نماز شروع کرنے سے پہلے الفاظ کے ساتھ نیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ لفظی نیتیں بدعت اور من گھڑت ہیں، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”ہر گھڑی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔“ [نسائی،

کتاب صلاة العیدین: باب کیف الخطبة (۱۵۷۹)]

معزز قارئین! نماز اور روزہ دونوں ہی اہم ترین عبادتیں ہیں، لیکن اگر ان کو بھی بدعات سے نہ بچایا گیا اور اہل بدعت کے حربے کو ناکام نہ بنایا گیا تو پھر ہماری کوئی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہ ہوگی۔ لہذا روزے سے پہلے بول کر نیت کرنے کی کوئی وقعت نہیں، صرف دل ہی میں پختہ ارادے کے ساتھ روزے کی نیت کر لینا قابل قبول ہوگا۔

روزے کا اجر ضائع کر دینے والے اعمال

سوال وہ کون سے ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے روزے کا اجر ضائع ہو جاتا ہے ازراہ کرم نشاندہی فرمادیں۔

جواب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ » [بخاری، کتاب الصوم: باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم (۱۹۰۳)]

”جس آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ وحدہ لا شریک لہ کو اس کا کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَإِذَا كَانَ يَوْمٌ صَوْمٍ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصُحَبْ فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ إِنِّي امْرُؤٌ صَائِمٌ » [بخاری، کتاب الصوم: باب هل يقول لاني صائم إذا شتمت (۱۹۰۴)]

”جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو وہ شہوت انگیز گفتگو نہ کرے اور نہ شور و غوغا سے کام لے، اگر اسے کوئی گالی گلوچ کرے یا اس سے لڑائی کرے تو کہہ دے: ”میں روزہ دار ہوں۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« كُمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الظَّمْأُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهْرُ » [دارمی (۲۷۳۳)، احمد (۳۷۳/۲)، حاکم (۱۳۱/۱)، بیہقی (۲۷۰/۴)، شرح السنة (۲۴۷/۶)، ابن ماجہ (۱۶۹۰)]

” کتنے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزہ سے پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی قیام کرنے والے ایسے ہیں جنہیں اپنے قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دار کو حالت روزہ میں گالی گلوچ، بدکلامی، فحش گوئی، تہمت طرازی، عیب جوئی، دروغ گوئی، جھوٹ کی اشاعت، جھوٹ پر عمل، کذب بیانی، غیبت اور دیگر شیطانی امور سے اجتناب از حد ضروری ہے وگرنہ روزے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جو آدمی بھوکا پیاسا رہ کر امور بالا کا مرتکب ہوگا اس کا روزہ نہیں بلکہ فاقہ ہوگا۔

اسی طرح شب زندہ دار ہو کر اخلاق رذیلہ کا پیکر بنے اور برے اعمال کا مرتکب ہو تو اسے رات کی بیداری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے ملکی اخبارات و جرائد کے ایڈیٹر حضرات کو بھی سوچنا چاہیے جو جھوٹ کی اشاعت اور جرائم کو ہوا دینے سے رمضان المبارک میں بھی باز نہیں آتے اور تقریباً تمام اخبارات فاحشہ اور بدکار عورتوں کی تصاویر نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ اگر حالت روزہ میں ایسے امور سے اجتناب نہ کیا گیا تو روزے کا کوئی فائدہ نہیں۔

روزہ توڑ دینے کا کفارہ

(سوال) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر روزہ توڑ دے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

(جواب) جو آدمی کسی بھی وجہ سے عمداً روزہ توڑ دے اس کے لیے یہ کفارہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کرے۔ اگر یہ طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ [بخاری، کتاب الصوم: باب إذا جامع فی رمضان (۱۹۳۶)]

روزہ افطار کرنے کا وقت

(سوال) روزہ جلدی افطار کرنا چاہیے یا تاخیر سے قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کیا احکامات ہیں؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ﴾ [البقرة: ۱۸۷]

”روزہ رات تک پورا کرو۔“

یعنی رات ہوتے ہی روزہ افطار کر دو، تاخیر مت کرو۔ رات (لیل) کی ابتدا غروب آفتاب سے ہوتی ہے۔ علامہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی رقمطراز ہیں:

”الَلَّيْلُ وَاللَّيْلَةُ مِنْ مَغْرِبِ الشَّمْسِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ الصَّادِقِ أَوْ الشَّمْسِ“ [القاموس

المحیط (۱۳۶۴)]

”رات غروب شمس سے لے کر فجر صادق کے طلوع ہونے تک یا طلوع شمس تک ہے۔“

علامہ ابن منظور الافریقی فرماتے ہیں: ”مَبْدُئُهُ مِنْ غُرُوبِ الشَّمْسِ“ (رات کی ابتدا غروب شمس سے ہے۔)

[لسان العرب (۳۷۸/۱۲)، المعجم الأوسط (۸۵۰)]

ائمہ لغات کی توضیح سے معلوم ہوا کہ لیل کی ابتدا غروب آفتاب سے ہوتی ہے، لہذا جوں ہی سورج غروب ہو روزہ افطار کر لیا جائے، تاخیر نہ کی جائے کیونکہ تاخیر سے روزہ افطار کرنا یہود و نصاریٰ کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا يَزَالُ الدِّينُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ لِأَنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى يُؤَخِّرُونَ » [ابوداؤد،

كتاب الصوم: باب ما يستحب من تعجيل الفطر (۲۳۵۳)، ابن ماجہ، كتاب الصيام: باب ما جاء في

تعجيل الإفطار (۱۶۹۸)، ابن خزيمة (۲۰۶۰)، ابن حبان (۸۸۹)، حاکم (۴۳۱/۱)]

”دین ہمیشہ غالب رہے گا جب تک لوگ افطاری میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ یہود و نصاریٰ افطاری کرنے میں تاخیر کرتے ہیں۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ دیر سے کھولنا یہود و نصاریٰ کا کام ہے اور ان کے قبیحین کا روزہ موجودہ دور میں بھی مسلمانوں سے دس یا پندرہ منٹ بعد افطار ہوتا ہے۔ کئی لوگ افطاری کے لیے سائرن کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور سائرن بھی غروب آفتاب کے بعد دیر سے بجایا جاتا ہے، اس کے بارے میں یاد رہے کہ عبادات کے لیے سائرن بجانا بھی یہود و نصاریٰ کا عمل ہے۔ اہل اسلام کے ساتھ اس عمل کا کوئی تعلق نہیں بلکہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ کھول دینا چاہیے:

« عَنْ سَهْلِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا

عَجَّلُوا الْفِطْرَ » [بخاری، كتاب الصوم: باب تعجيل الافطار (۱۹۵۷)، مسلم، كتاب الصيام: باب

فضل السحور (۱۰۹۸)]

”سیدنا سهل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تک لوگ روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے بھلائی سے رہیں گے۔“

« عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَهُنَا

وَ أَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَهُنَا وَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ » [بخاری، كتاب الصوم: باب متى

يحل فطر الصائم (۱۹۵۴)، مسلم، كتاب الصيام (۱۱۰۰)]

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب رات ادھر سے آجائے اور دن ادھر سے پیٹھ پھیر جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزہ دار روزہ کھول دے۔“

« عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ أُمَّتِي

عَلَى سُنتِي مَا لَا تَنْتَظِرُ بِفِطْرِهَا النَّجُومَ » [موارد الظمان (۸۹۱)]

”سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت ہمیشہ میری سنت پر رہے گی جب تک روزے کی افطاری کے لیے ستاروں کا انتظار نہیں کرے گی۔“

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ افطاری کا وقت غروب آفتاب ہے، اس لیے روزہ سورج غروب ہوتے ہی افطار کر لیں، دیر نہ کریں۔

کس چیز سے روزہ افطار کرنا چاہیے؟

سوال مہربانی فرما کر ہمیں آگاہ فرمادیں کہ رسول اکرم ﷺ کس چیز سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے؟

جواب سلمان بن عامر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ فَإِنَّهُ بَرَكَةٌ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ فَإِنَّهُ طَهُورٌ »

[ترمذی، کتاب الزکاة، باب ما جاء فی الصدقة علی ذی القرباة (۶۵۸) ابو داؤد، (۲۳۵۵)، احمد (۱۸، ۱۷/۴)، ابن ماجہ (۱۶۹۹)، دارمی (۱۷۰۸)، موارد الظمان (۸۹۲)]

”جب تم میں سے کوئی روزہ کھولے تو وہ کھجور سے کھولے کیونکہ اس میں برکت ہے اگر کھجور نہ پائے تو پانی سے روزہ کھولے اس لیے کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔“

« عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ عَلَى رُطَبَاتٍ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ رُطَبَاتٍ فَعَلَى تَمْرَاتٍ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ » [ابوداؤد، کتاب الصيام: باب ما يفطر عليه (۲۳۵۶)، ترمذی (۶۹۶)، دارقطنی (۱۸۵/۲)، مستدرک حاکم (۴۳۲/۱)]

”انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے سے پہلے چند تازہ کھجوریں کھا کر روزہ افطار کرتے تھے، اگر تازہ کھجوریں دستیاب نہ ہوتیں تو خشک کھجوریں کھا کر افطار کرتے، اگر وہ بھی نہ ملتیں تو پانی کے چند گھونٹ بھر لیتے۔“

« عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ صَلَّى صَلَاةَ الْمَغْرِبِ حَتَّى يُفْطِرَ وَ لَوْ عَلَى شُرْبِيَّةٍ مِنْ مَاءٍ » [موارد الظمان (۸۹۰)، مسند ابی یعلیٰ (۴۲۴/۶)]

”انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں نے نبی کریم ﷺ کو افطاری سے پہلے مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، اگرچہ آپ ﷺ پانی کے ایک گھونٹ ہی پر افطار کرتے۔“

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کھجور کے ساتھ روزہ کھولنا بہتر ہے اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کر لیں۔ روزے کی وجہ سے جسم میں نقاہت و کمزوری واقع ہوتی ہے، کھجور سے جسم کو تقویت ملتی ہے، کھجور نہایت مفید اور مقوی غذا ہے۔

روزہ افطار کرنے کی دعا

سوال ہمیں پتا چلا ہے کہ افطاری کی بعض دعائیں من گھڑت یا ضعیف ہیں تو صحیح دعا کونسی ہے؟

جواب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ: ذَهَبَ الظَّمْأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَ نَبَتَ

الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ » [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب القول عند الافطار (۲۳۵۷)، مستدرک حاکم (۴۲۲/۱)

دارقطنی (۱۱۸۵/۲) امام حاکم اور امام ذہبی رضی اللہ عنہما نے اسے صحیح کہا ہے جب کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار کرتے تو کہتے: ”پیارا چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اگر اللہ نے چاہا تو اجر ثابت ہو گیا۔“

نیز « اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَکَ صُیْمٌ وَ عَلٰی ذِکْرِکَ اَفْطَرْتُ » یہ دعا مرسل روایت میں ہے اور مرسل روایت محدثین

کے ہاں ضعیف کی اقسام سے ہے۔

فرضی روزوں کی قضا اور نفلی روزے

سوال جس شخص کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو اس کے لیے نفلی روزے مثلاً شوال کے چھ روزے، عشرہ ذی الحجہ کے

روزے اور عاشوراء کا روزہ رکھنا کیسا ہے؟

جواب جس کے ذمہ رمضان کے روزوں کی قضا ہو علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق نفلی روزوں سے پہلے اس پر رمضان کے

روزوں کی قضا واجب ہے، کیونکہ فرائض نوافل سے اہم ہیں۔ [مجموع فتاویٰ لابن باز: (۳۹۲/۱۵)]

روزہ میں بھول کر کھانا پینا

سوال جس شخص نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھاپی لیا اس کا کیا حکم ہے؟

جواب ایسے شخص پر کچھ حرج نہیں اور اس کا روزہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَنۡحَطَاْنَا ﴾ [البقرة: ۲۸۶]

”اے ہمارے رب! ہم اگر بھول گئے یا غلطی کر بیٹھے تو ہماری گرفت نہ کر۔“

نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر کچھ کھا لیا یا پی لیا، وہ اپنا روزہ پورا کر لے، کیونکہ اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے۔“

[بخاری کتاب الصوم: باب الصائم اذا اکل أو شرب ناسیا (۱۹۳۳)، مستدرک حاکم: (۴۳۰/۱)]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ”جس نے رمضان میں بھول کر روزہ توڑ دیا تو اس پر نہ قضا ہے نہ کفارہ۔“

اس حدیث امام حاکم نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ میں جماع اور دیگر تمام مفطرات شامل ہیں۔

تارک نماز کے روزے کا حکم

(سوال) تارک نماز کے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر وہ روزہ رکھے تو کیا اس کا روزہ درست ہے؟

(جواب) صحیح بات یہ ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے والا کافر ہے، لہذا جب تک وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ نہ کر لے اس کا روزہ اور اسی طرح دیگر عبادات درست نہیں، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ وَ لَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [الانعام: ۸۸]

”اور اگر انہوں نے شرک کیا ہوتا تو وہ سب اکارت ہو جاتا جو وہ کرتے تھے۔“

نیز اس معنی کی دیگر آیات اور احادیث بھی تارک نماز کے اعمال اکارت ہو جانے کی دلیل ہیں۔

لیکن کچھ اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ تارک نماز اگر نماز کی فرضیت کا معترف ہے لیکن سستی و بے پروائی کی وجہ سے نماز چھوڑتا ہے، تو اس کا روزہ اور دیگر عبادات برباد نہیں ہوں گی، لیکن پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، یعنی عمداً نماز ترک کرنے والا کافر ہے، بھلے وہ نماز کی فرضیت کا معترف ہو، کیونکہ اس قول پر بے شمار دلائل موجود ہیں، انہی دلائل میں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”بندہ کے درمیان اور کفر و شرک کے درمیان بس نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔“ [مسلم، کتاب الایمان:

باب بیان اطلاق اسم الکفر (۸۲)]

اور آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

”ہمارے اور ان (کافروں) کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز ہے، تو جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔“

[ترمذی، کتاب الایمان: باب ما جاء فی ترک الصلاة (۱۶۲۱)]

اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے بریدہ بن حصین اسلمی رضی اللہ عنہ کے طریق سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اس بارے میں امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے احکام اور نماز چھوڑنے کے احکام پر مشتمل ایک مستقل رسالہ ”حکم تارک الصلاة“ میں سیر حاصل گفتگو کی ہے، یہ رسالہ بڑا مفید اور قابل مطالعہ ہے، اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

روزے کی حالت میں قے آنا

(سوال) روزہ کی حالت میں کسی کو خود بخود قے آجائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ وہ اس روزہ کی قضا کرے یا نہ کرے؟

(جواب) روزہ کی حالت میں خود بخود قے آجانے سے روزہ کی قضا نہیں لیکن اگر کسی نے عمداً قے کی تو اسے اس روزہ کی قضا کرنی ہوگی، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

”جسے خود بخود قے آجائے اس پر قضا نہیں، اور جس نے عمداتے کی اس پر قضا ہے۔“ [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب الصائم یستقی عامداً: (۲۳۸۰)]

اس حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

جھوٹ بولنے والے کا روزہ

سوال جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولے یا جھوٹی بات پر عمل کرے تو کیا اس کا روزہ اللہ کے ہاں قبول ہو جاتا ہے؟

جواب روزے کی حالت میں جھوٹ بولنے والے یا جھوٹی باتوں پر عمل کرنے والے کا روزہ ضائع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَ شَرَابَهُ »

[صحیح بخاری کتاب الصوم: باب من لم يدع قول الزور والعمل به (۱۹۰۳)]

”جس آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں۔“

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث میں ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كُمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الظَّمْأُ وَ كُمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ »

[سنن الدارمی، کتاب الرقاق (۲۷۲۳)]

”کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں اور کتنے ہی قیام کرنے والے ایسے ہیں جنہیں اپنے قیام سے بیداری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

مذکورہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ روزہ دار آدمی کو حالت روزہ میں گالی گلوچ، تہمت طرازی، عیب جوئی، جھوٹ پر عمل اور اس کی اشاعت وغیرہا جیسے اعمال قبیحہ سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے ورنہ اسے روزے سے سوائے فاقہ کے کچھ حاصل نہ ہو گا، اللہ کریم کو وہی روزہ قبول ہوگا جو منع کیے گئے کاموں سے بچایا ہوا ہوگا۔

ہوائی سفر کرنے والے کا وقت افطار

سوال اگر کوئی روزہ دار سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ قبل یا اس سے کم وقت میں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے اور وہ شہر سے دور بھی ہو جاتا ہے تو اس صورت میں روزہ کس وقت افطار کیا جائے گا؟

جواب اگر روزہ دار جہاز میں سورج غروب ہونے سے قبل سوار ہوا ہے تو وہ جہاز میں اس وقت تک افطار نہیں کرے گا جب تک وہ سورج کو غروب ہوتا نہ دیکھ لے یا سورج غروب ہو جائے یا وہ کسی ایسے شہر میں اترے جہاں سورج غروب ہو چکا ہے۔

اس کی دلیل میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَاهُنَا وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَا وَعَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ »

[بخاری، کتاب الصوم: باب متى يحل فطر الصائم (۱۹۵۴)]

”جب رات اس سمت سے آئے اور دن اس سمت سے چلا جائے اور سورج غروب ہو جائے تو اس وقت روزہ دار روزہ افطار کر لے۔“

اور صحیح مسلم میں ہے: ”عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان میں سفر میں تھے کہ جب غروب شمس قریب ہو گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: ”اے فلاں! سواری سے نیچے اتر کر ہمارے لیے ستوتیار کرو۔“

تو اس نے کہا: ”ابھی تو دن باقی ہے (یعنی ابھی سورج غروب نہیں ہوا)۔“ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ”نیچے اتر کر ستوتیار کرو، پس اس نے نیچے اتر کر ستوتیار کیے اور نبی اکرم ﷺ کے پاس لے کر آیا تو نبی اکرم ﷺ نے وہ پیے اور ہاتھ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”جب سورج اس سمت سے غائب ہو جائے اور رات اس سمت سے آجائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔“ [مسلم، کتاب الصیام: باب وقت انقضاء الصوم وخروج النهار (۱۱۰۱)]

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب تم رات کو اس سمت سے آتا دیکھو تو اس وقت روزہ دار روزہ افطار کر لے۔“ [بخاری، کتاب الصوم: باب متى يحل فطر الصائم: (۱۹۵۵)]

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”یعنی مشرق کی سمت سے دن آجائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کا اندھیرا محسوس ہونے لگے۔“ [فتح الباری (۴/۲۵۰)]

غروب شمس سے رات کا آنا اور دن کا چلے جانا ثابت ہوتا ہے اور اس وقت ہی صائم افطار کرتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔ پس یہ مسئلہ غروب شمس سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے جب سورج ایسے مقام پر غائب ہو جہاں سے صائم اسے دیکھ سکتا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بغیر تردد کے روزہ افطار کرے۔ جیسا کہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب سورج مکمل غائب ہو جائے اور مشرق سے تاریکی ظاہر ہو جائے تو اس وقت صائم افطار کرے گا اور آسمان پر باقی سرخی کا کوئی اعتبار نہیں۔ [مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۱۵)، (۲۱۶)]

شیخ ابن باز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جب جہاز ریاض سے غروب شمس سے پہلے مغرب کی جانب پرواز کر جائے تو آپ اس وقت تک روزے کی حالت میں ہوں گے جب تک سورج غروب نہ ہو جائے اور آپ اس وقت فضا میں ہوں، یعنی سورج غروب ہونے تک آپ افطار نہیں کر سکتے۔ یا دوسری صورت میں آپ کسی ایسے شہر میں اتر جائیں جہاں سورج غائب ہو چکا ہے۔“

(مجموع فتاویٰ ومقالات: [۳۲۲/۱۵])

حاصل کلام یہ کہ جب تک سورج غروب نہ ہو جائے جہاز میں سوار صائم روزہ افطار نہیں کر سکتا۔ (واللہ اعلم!)

آکسیجن اور روزہ

(سوال) کیا کسی ایسے مریض کو جسے سانس کی تکلیف ہو، آکسیجن وغیرہ گیس لگائی جاسکتی ہے جبکہ اسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے، کیا اس عمل سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

(جواب) آکسیجن یا کوئی اور گیس جو سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، جس کی وجہ درج ذیل ہیں۔

① یہ ایک ہوا ہے جو سانس کی بحالی کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ہوا سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

② اس گیس یا آکسیجن میں کوئی غذائی مواد یا دوائی نہیں ہوتی جو جسم میں داخل ہو۔ ڈاکٹر محمد علی الہار لکھتے ہیں: ”ایسی آکسیجن جو سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی غذائی مواد یا دوائی نہیں ہوتی اور یہ زیادہ تر سانس کی بحالی کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور ہوا میں سانس لینا انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے اور ہوا کے جسم میں داخل ہونے سے روزے کے فاسد ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔“ (مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی (۲۴۰/۲/۱۰))

اسی طرح ڈاکٹر حسان شمس پاشا لکھتے ہیں: ”جو آکسیجن سانس کے مریضوں کو لگائی جاتی ہے، اس میں کوئی غذائی اجزا یا دیگر جسم میں داخل ہونے والا مواد نہیں ہوتا اور یہ سانس کی بحالی کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔“

حاصل کلام یہ ہے کہ اس طرح کی گیس وغیرہ کا استعمال روزے کو فاسد نہیں کرتا۔ (واللہ اعلم!)

مریض کا روزہ

(سوال) روزے دار مریض کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا روزہ توڑنا اس کے لیے جائز ہے؟ اور مرض کی وجہ سے روزہ ترک کرنا کب واجب ہوتا ہے؟

(جواب) روزے دار کے لیے اس کے مرض کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے یعنی بعض حالات میں اس کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہوتا ہے اور کبھی ناجائز، اسی طرح کبھی اس کے لیے روزہ چھوڑنا واجب ہوتا ہے اور کبھی افضل۔ یہ مریض اور بیماری کے حساب سے حکم لگایا جاتا ہے۔

شیخ صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض امراض سے روزہ متاثر نہیں ہوتا مثلاً زکام یا ہلکا سرور یا وائنت کا درد اور اس جیسے دیگر امراض، ان امراض سے روزہ ترک کرنا حلال نہیں۔ اگرچہ بعض علماء اس آیت کریمہ: ”وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا“ کو سامنے رکھتے ہوئے ترک روزہ کو درست قرار دیتے ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں بے شک یہ حکم معلل بعلة ہے، وہ یہ ہے کہ اگر روزہ ترک کرنے میں اس کے لیے آسانی ہو تو ہم کہیں گے کہ روزہ ترک کرنا افضل ہے اور اگر روزہ رکھنے سے اس کا مرض متاثر نہیں ہوگا تو اس پر روزہ رکھنا واجب ہے اور روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

دوسری حالت یہ ہے کہ جب روزہ اس پر شاق ہو مگر اسے تکلیف نہ پہنچائے تو روزہ رکھنا یا ترک کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جب روزہ اس پر شاق ہو اور اسے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو، مثلاً مکمل بیمار آدمی یا شوگر کا مریض یا اس جیسے دیگر امراض ہوں تو اس صورت میں روزہ رکھنا حرام ہے۔

یعنی ایسا مرض جو ہلاکت کا سبب بنتا ہو خواہ وہ شوگر کا مرض ہو یا کوئی اور مرض ہو، مگر جب مریض کو اس کی بیماری سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو جبکہ اسے کوئی مستند ڈاکٹر روزہ رکھنے کی اجازت بھی دے دے تو اس پر روزہ رکھنا ضروری ہے۔

بحری، بری اور فضائی سفر میں روزہ کی رخصت

(سوال) ایسا شخص جس نے ہوائی جہاز یا گاڑی میں سفر کرنا ہے اور اسے مشقت کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا تو کیا وہ روزہ ترک کر سکتا ہے؟

(جواب) ایسے شخص کے لیے سفر میں روزہ ترک کرنا جائز ہے، خواہ سفر ہوائی جہاز میں ہو۔ اس لیے کہ روزہ ترک کرنے کی وجہ سفر میں مشقت نہیں بلکہ سفر ہی ہے، خواہ اسے سفر میں مشقت حاصل ہو یا نہ ہو۔ روزہ ترک کرنا اس کے لیے جائز ہے، اور قرآن وحدیث کے عمومی دلائل اس پر موجود ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [البقرة: ۱۸۴]

”پس تم میں جو مریض ہو یا مسافر ہو تو وہ دیگر ایام میں روزوں کی گنتی مکمل کرے۔“

اس آیت کریمہ میں سفر کی وجہ سے روزہ ترک کرنے کا جواز ملتا ہے، اس میں مشقت کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ایک حدیث ہے کہ محمد بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان میں آیا تو وہ سفر کی تیاری کر رہے تھے اور ان کی سواری اور ساز و سامان تیار ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں انھوں نے کھانا منگوا کر کھایا تو میں نے ان سے پوچھا: ”کیا یہ عمل سنت ہے؟“ تو انھوں نے کہا: ”ہاں! سنت ہے۔“ پھر سواری پر سوار ہو گئے۔“ [ترمذی، کتاب الصوم: باب ما جاء فيمن أكل ثم خرج يريد سفرا (۷۹۹، ۸۰۰)، بیہقی (۲۴۸/۴)]

اس حدیث مبارکہ کو امام ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے ”صحیح الترمذی (۷۹۹)“ میں ذکر کیا ہے۔ اب انس رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں کوچ کرنے سے قبل ہی روزہ نہیں رکھ رہے۔ حالانکہ انہیں ابھی کوئی مشقت بھی نہیں پہنچی اور اس عمل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

امام ترمذی رضی اللہ عنہ یہ حدیث درج کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ اکثر اہل علم نے اس حدیث کو دلیل بنا کر یہ فرمایا ہے کہ مسافر کے لیے درست ہے کہ وہ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی روزہ افطار کرے، مگر نماز اپنے شہر یا ہستی سے نکلنے سے قبل قصر نہیں کر سکتا۔ یہی مذہب اسحاق بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ یعنی اسحاق بن راہویہ کا بھی ہے۔

عبید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں صحابی رسول ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ماہ رمضان میں کشتی میں سوار تھا کہ

انہوں نے کشتی روکی پھر ان کے لیے کھانا لایا گیا حالانکہ ابھی ہم گھروں سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ ابوبصرہ رضی اللہ عنہ نے دسترخوان منگوا کر کہا: ”قریب آ جاؤ۔“ میں نے کہا: ”آپ گھروں کو نہیں دیکھ رہے (یعنی ہم ابھی زیادہ دور نہیں آئے؟)“ تو ابوبصرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے رغبتی کرتا ہے۔“ پھر انہوں نے کھانا کھا لیا۔“

[مسند احمد (۱۸/۴۸۸) بیہقی ۴/۲۴۶]

اب ابوبصرہ رضی اللہ عنہ نے کشتی میں سوار ہوتے ہی روزہ افطار کر لیا اور سفر کی مشقت کا انتظار نہیں کیا۔ پس ان دلائل سے ثابت ہوا کہ سفر میں مشقت و تکلیف کا کوئی اعتبار نہیں اور شارع نے سفر میں افطار کر۔۔ کا یہ وصف بیان نہیں کیا۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر کرتے تو ان میں سے بعض کا روزہ ہوتا اور بعض روزہ نہیں رکھتے تھے لیکن کوئی دوسرے پر نکتہ چینی نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ سفر میں روزہ سے رخصت ہے۔ اب جس نے روزہ رکھ لیا تو اس نے بھی درست کام کیا اور اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ رخصت قبول کرنے کو پسند کرتا ہے، جس طرح کہ وہ دیگر عطا کردہ امور پر عمل کو پسند کرتا ہے۔

حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے روزوں کی قضا

سوال حیض و نفاس والی عورتوں کے لیے روزہ رکھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب حیض اور نفاس والی عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ حیض اور نفاس کے وقت وہ روزہ توڑ ویں، حیض اور نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا جائز نہیں اور نہ ایسی حالت میں نماز اور روزہ صحیح ہے، انہیں بعد میں صرف روزوں کی قضا کرنی ہوگی، نماز کی نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، ان سے سوال کیا گیا کہ کیا حاضرہ عورت نماز اور روزے کی قضا کرے؟ تو انہوں نے فرمایا:

”ہمیں روزوں کی قضا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔“ [ابوداؤد، کتاب

الطہارۃ: باب فی الحائض لاتقضى الصلاة (۲۶۳)]

عائشہ رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ حدیث پر علماء کا اتفاق ہے کہ حیض و نفاس والی عورتوں کو صرف روزوں کی قضا کرنی ہے نماز کی نہیں اور یہ اللہ سبحانہ کی طرف سے ایک طرح کی رحمت اور آسانی ہے کیونکہ نماز ایک دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے اس لیے نماز کی قضا مذکورہ عورتوں پر بھاری تھی، اس لیے برخلاف روزہ سال میں ایک بار فرض ہے اور وہ ماہ رمضان کا روزہ ہے، اس لیے اس کی قضا میں کوئی مشقت و دشواری نہیں۔

دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال

سوال کیا ٹوتھ پیسٹ کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب دوران روزہ ٹوتھ پیسٹ کے ذریعے دانت صاف کرنے سے بالکل اسی طرح روزہ نہیں ٹوٹتا جیسے مسواک کرنے سے

نہیں ٹوٹتا، اسی طرح آنکھ اور ناک میں دوا کے قطرے بھی ڈالے جاسکتے ہیں اور اگر ان قطروں کا ذائقہ حلق میں محسوس کرے تو اس روزہ کی قضا کر لینا احتیاط کی بنا پر ہے، واجب نہیں کیونکہ آنکھ اور کان کھانے پینے کے راستے نہیں ہیں، البتہ ناک کے قطرے استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ ناک کھانے پینے کے راستے میں شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا: ”ناک میں (وضو کرتے وقت) خوب اچھی طرح پانی چڑھاؤ الا کہ تم روزہ دار ہو۔“

لہذا مذکورہ حدیث اور اس معنی کی دیگر احادیث کی روشنی میں اگر کسی نے روزہ کی حالت میں ناک کے قطرے استعمال کیے اور حلق میں اس کا اثر محسوس ہوا تو اس روزہ کی قضا واجب ہے۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM

اعتکاف کے مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

اعتکاف کی شرعی حیثیت

(سوال) مہربانی فرما کر ہماری رہنمائی فرمادیں کہ اعتکاف کی شرعی حیثیت کیا ہے اور یہ کہ یہ کس رات سے شروع ہوتا ہے؟
(جواب) لغوی اعتبار سے اعتکاف کا معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھ جانا اور نفس کو اس کے ساتھ لگائے رکھنا ہے اور شرعی اعتبار سے تمام دنیاوی معاملات ترک کر کے عبادت کی نیت سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی خاطر مسجد میں ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے۔ اعتکاف بیٹھنے والے کو ”مُعْتَكِفٌ“ اور جائے اعتکاف کو ”مُعْتَكِفٌ“ کہا جاتا ہے۔ اعتکاف سال میں کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ نبی ﷺ سے سوال کے مہینے کا اعتکاف بھی ثابت ہے لیکن آپ ﷺ رمضان المبارک میں ہمیشہ اعتکاف بیٹھتے تھے۔ آپ نے رمضان کے درمیانے عشرے کا بھی اعتکاف کیا ہے لیکن افضل آخری عشرے کا اعتکاف ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ آخری عشرے کا اعتکاف کرتے رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

« أَلَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعُشْرَ الْأَوَّخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ - تَعَالَى ثُمَّ اعْتَكَفَ أَرْوَاحُهُ مِنْ بَعْدِهِ » [بخاری، ابواب الاعتكاف: باب الاعتكاف في العشر الأواخر (۲۰۲۶)]

”نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فوت کر دیا پھر آپ کے بعد آپ کی بیویاں اعتکاف کرتی تھیں۔“

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَلَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ فِي الْعُشْرِ الْأَوْسَطِ مِنْ رَمَضَانَ فَاعْتَكَفَ حَتَّى إِذَا كَانَ لَيْلَةَ إِحْدَى وَعِشْرِينَ وَ هِيَ اللَّيْلَةُ الَّتِي يُخْرَجُ مِنْ صَبِيحَتِهَا مِنْ اعْتِكَافِهِ قَالَ مَنْ كَانَ اعْتَكَفَ مَعِيَ فَلْيُعْتَكِفِ الْعُشْرَ الْأَوَّخِرَ » [بخاری، ابواب الاعتكاف: باب الاعتكاف في العشر الأواخر (۲۰۲۷)]

”رسول اللہ ﷺ رمضان کے درمیانے عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے حسب معمول اعتکاف کیا، جب اکیسویں رات ہوئی، یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو آپ ﷺ اپنے اعتکاف سے نکلتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے وہ آخری عشرے کا بھی اعتکاف بیٹھے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَتَعَكَّفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَكَانَ الَّذِي يُرِيدُ أَنْ يَتَعَكَّفَ فِيهِ » [ابن ماجه، كتاب الصيام: باب ماجاء فيمن يتنهدى الاعتكاف و قضاء الاعتكاف (۱۷۷۱)، نسائی (۷۱۰)، احمد (۲۴۵۹۸)]

”رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جائے اعتکاف میں داخل ہو جاتے۔“
اعتکاف کے طریقے کے متعلق اہل علم کے دو اقوال ہیں:

① ایک قول یہ ہے کہ اعتکاف مسنون آخری عشرے کا ہے اور آخری عشرے کا آغاز میں رمضان کا سورج غروب ہوتے ہی ہو جاتا ہے لہذا معتکف کو چاہیے کہ وہ اکیسویں رات شروع ہوتے ہی مسجد میں آجائے، رات بھر تلاوت قرآن، ذکر الہی، تسبیح و تہلیل اور قیام میں مصروف رہے اور نماز فجر ادا کر کے اپنے اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جائے۔

② دوسرا موقف یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے آخری عشرے کا اعتکاف کیا اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ فجر پڑھ کر اعتکاف کی جگہ میں داخل ہوتے تھے لیکن اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ وہ اکیس کی یا بیس کی صبح ہے۔ بہتر یہ ہے کہ معتکف بیس رمضان کی فجر پڑھ کر اعتکاف کا آغاز کرے تاکہ آخری عشرے کی اکیسویں کی طاق رات جائے اعتکاف میں گزارے، کیونکہ اعتکاف لیلۃ القدر کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے، جب آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ درمیانے عشرے کا اعتکاف کیا۔

کئی صحابہ کرام یہ اعتکاف کر کے اپنا بوریا بستر باندھ کر گھروں کو چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے وہ آخری عشرے کا بھی اعتکاف کرے۔“ یہ بیس رمضان کو فرمایا تھا۔ غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آخری عشرے کی اکیسویں رات بعد از غروب آفتاب شروع ہوتی ہے، آپ نے بیسویں کے دن کا صحابہ سے اعتکاف کروایا حالانکہ آپ انہیں رات کو بھی بلا سکتے تھے اور کہہ دیتے کہ تم نے اعتکاف کے مقام پر داخل ہونا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بیس کی صبح کو مسجد میں آجائے تو ذہنی طور پر لیلۃ القدر کی تلاش کے لیے تیار ہو جائے گا اور جائے اعتکاف سے مانوس بھی ہو جائے گا۔ اس طرح اس کی اکیسویں رات معتکف میں گزرے گی۔ جب کہ دوسرے موقف کے لحاظ سے ان کی اکیسویں رات جائے اعتکاف سے باہر گزرے گی، جو ایک نقص بھی ہے لہذا زیادہ مناسب اور موزوں یہ ہے کہ بیسویں کی صبح کو مسجد میں آئے اور نماز ادا کرنے کے بعد اپنے معتکف میں تیار ہو کر بیٹھے۔ اس صورت میں دونوں احادیث پر عمل ہو جائے گا۔ صرف آخری عشرے سے بارہ گھنٹوں کا اضافہ ہوگا اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

دوسرا موقف مبنی بر احتیاط ہے وگرنہ اعتکاف تو ایک دن یا رات کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَذَرْتُ فِي الْحَاهِلِيَّةِ أَنْ

أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ قَالَ أَوْفِ بِبَنْدِرِكَ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الاعتکاف لیلہ (۲۰۳۲)]

”سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ”میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کی نذر مانی تھی۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی نذر پوری کرو۔“ سنوم ہوا کہ اعتکاف ایک عشرے سے کم کا بھی ہو سکتا ہے۔

اعتکاف کے لیے نیت

سوال کیا دیگر اعمال کی طرح اعتکاف کے لیے بھی نیت کرنا ضروری ہے؟

جواب چونکہ اعتکاف عبادت ہے اس لیے اس کے لیے بھی نیت ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر عبادت کے لیے نیت کو لازمی قرار دیا ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » [بخاری، کتاب بدء الوحي: باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله (۱)]

”تمام اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔“

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے زبان سے کوئی تلفظ ثابت نہیں۔ یہ دل کا فعل ہے۔ بعض لوگوں نے مسجد میں داخل ہو کر اعتکاف کے لیے: ”نَوَيْتُ سُنَّةَ الْإِعْتِكَافِ“ (میں نے اعتکاف کی نیت کی) کے الفاظ مختص کر رکھے ہیں، یہ غلط ہیں اور کسی حدیث سے ثابت نہیں ہیں، اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔

جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے

سوال جائے اعتکاف میں کس وقت داخل ہونا چاہیے اور اعتکاف میں جائز امور کون کون سے ہیں؟

جواب اعتکاف کے متعلق اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔

[بخاری، کتاب الاعتکاف: باب الاعتکاف فی العشر الأواخر (۲۰۲۶)]

دوسری حدیث ہے:

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھ کر جائے اعتکاف میں داخل ہو جاتے۔“ [ابوداؤد، کتاب الصیام: باب الاعتکاف: (۲۴۶۴)]

ان احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے عام اہل علم یہ بات لکھتے ہیں کہ آخری عشرہ کا آغاز بیس رمضان کا سورج غروب ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔ لہذا محکم کو چاہیے کہ اکیسویں رات شروع ہوتے ہی مسجد میں آجائے۔ رات بھر تلاوت قرآن، ذکر، تسبیح و تہلیل اور نوافل میں مصروف رہے اور صبح نماز فجر ادا کر کے اپنے اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جائے۔

جبکہ دوسرا موقف جو ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اعتکاف کا آغاز نماز صبح کے بعد کرتے آئیں یا بیس کی صبح کو، اس کا تعین واضح نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ معتکف بیس رمضان کی فجر کی نماز پڑھ کر اعتکاف کا آغاز کرے تاکہ آئیں کی رات معتکف میں آئے کیونکہ اعتکاف لیلیۃ القدر کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے لیلیۃ القدر میں دو عشرے اعتکاف کیا۔ نہ ملی تو پھر آپ ﷺ نے تیسرے اور آخری عشرے کا اعتکاف کیا، تسلسل بھی جاری رکھا حتیٰ کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ اعتکاف کر رہے تھے ان میں سے بعض بیسوں کی صبح اپنا بویا بستر اٹھا کر گھر میں بھی پہنچا چکے تھے۔ تب آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ”جو میرے ساتھ اعتکاف کر رہا ہے وہ اپنے اعتکاف کو جاری رکھے۔“ بیسوں رمضان تھی اور صحابہ نے پھر سے آخری عشرے کا آغاز کر دیا۔ [بخاری، کتاب الاعتکاف: باب الاعتکاف فی العشر الأواخر (۲۰۲۷)]

ذرا غور فرمائیں کہ اگر آخری عشرے کا اعتکاف اکیسویں رات بعد از غروب آفتاب شروع ہوتا تو آپ ﷺ نے بیسوں کے دن کا اعتکاف صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیوں کروایا، آپ ﷺ انہیں اکیسویں رات ہی کو بلا لیتے اور کہہ دیتے کہ تم نے معتکف تو توڑ پھوڑ دیا ہے اب رات مسجد میں گزارو اور کل صبح یعنی اکیسویں کی صبح کی نماز کے بعد دوبارہ داخل ہو جاؤ۔ (مولانا عبدالسلام بستوی کے ”اسلامی خطبات“) ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اگر بیس کی صبح کو مسجد میں آجائے تو ذہنی طور پر لیلیۃ القدر کی تلاش کے لیے اکیسویں کو پورا تیار ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے موقف کے لحاظ سے اکیسویں رات جائے اعتکاف سے باہر گزار دی اور اعتکاف کے ارادے سے اکیس کی صبح کو معتکف میں داخل ہوا تو آخری عشرے سے ایک رات خارج ہو جائے گی جو ایک نقص بھی ہے، لہذا زیادہ مناسب اور موزوں یہ ہے کہ بیسوں کی صبح کو مسجد میں آجائے اور نماز کی ادائیگی کے بعد اپنے معتکف میں تیار ہو کر بیٹھ جائے۔ اس صورت میں دونوں احادیث پر بہتر عمل ہو جائے گا صرف آخری عشرہ سے ۱۲ گھنٹوں کا اضافہ ہوگا اور اس اضافے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حافظ عبداللہ بہاولپوری رضی اللہ عنہ بھی اسی موقف کے قائل تھے اور یہ موقف مبنی بر احتیاط ہے۔ واللہ اعلم۔

جانز امور: معتکف کے لیے حالت اعتکاف میں نہانا، سر میں کنگھی کرنا، تیل لگانا اور ضروری حاجات مثلاً پیشاب، پاخانہ، فرض غسل وغیرہ کے لیے جانا درست ہے اور اعتکاف بیٹھنے والے کو شرعی بلا عذر اپنے معتکف سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

[بخاری (۱/۲۷۲)]

دوران اعتکاف ممنوع افعال

(سوال) مہربانی فرما کر ان امور کے متعلق آگاہی فرمادیں اعتکاف میں جن سے رک جانا چاہیے؟

(جواب) ① جماع و ہم بستری کرنا۔ [البقرة: ۱۸۷]، ابن ابی شیبہ (۳/۲۹)، عبد الرزاق (۴/۳۶۳) ② بیمار پرسی کے لیے باہر نکلنا۔ ③ کسی کے جنازے میں شریک ہونا۔ ④ کسی ضروری حاجت کے بغیر باہر نکلنا۔ [ابوداؤد، کتاب الصیام:

باب المعتکف يعود المريض (۲۴۷۳) بیہقی (۴/۳۱۷)]

خواتین کا اعتکاف

سوال بعض خواتین گھر میں اعتکاف بیٹھ جاتی ہیں تو کیا ضروری ہے کہ خواتین بھی مسجد ہی میں اعتکاف کریں؟
جواب خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ مسجد ہی میں آکر اعتکاف بیٹھیں، ان کے لیے گھر میں اعتکاف بیٹھنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ [البقرة: ۱۸۷]

”اور تم ان عورتوں سے جماع نہ کرو اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو۔“
 اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اعتکاف مسجد میں کیا جاتا ہے۔ ازواج مطہرات بھی مسجد ہی میں اعتکاف کیا کرتی تھیں جیسا کہ اس کے متعلق حدیث پیچھے بیان کر دی گئی ہے۔

دوران اعتکاف چند جائز کام

- سوال** ہمیں ان کاموں کے متعلق بتادیں جنہیں اعتکاف میں سرانجام دیا جاسکتا ہے؟
- جواب** ① کسی ضروری حاجت کے لیے انسان مسجد سے نکل سکتا ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب هل يخرج المعتكف بحوائجہ الی باب المسجد (۲۰۳۵)]
- ② مسجد میں خیمہ لگانا۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الأخیبة فی المسجد (۲۰۳۴)]
- ③ اعتکاف کرنے والے کی بیوی اس سے ملاقات کے لیے مسجد میں آسکتی ہے اور وہ بیوی کو محرم ساتھ نہ ہونے کی صورت میں گھر چھوڑنے تک ساتھ جاسکتا ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب هل يخرج المعتكف لحوائجہ الی باب المسجد (۲۰۳۵)]
- ④ استحاضہ کی بیماری میں مبتلا عورت اعتکاف کر سکتی ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب اعتکاف المستحاضة (۲۰۳۷)]
- ⑤ اعتکاف کرنے والا اپنا سر مسجد سے باہر نکال سکتا ہے اور اس کی بیوی حالت حیض میں بھی ہو تو اسے کنگھی کر سکتی ہے اور اس کا سر دھو سکتی ہے۔ [بخاری، ابواب الاعتکاف: باب الحائض ترجل رأس المعتكف (۲۰۲۸، ۲۰۲۹)]

لیلة القدر کی تلاش

سوال لیلة القدر کسی خاص رات میں واقع ہوتی ہے یا پورے عشرے میں کسی بھی رات؟ مہربانی فرما کر جواب سے مطلع فرمائیں۔
جواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« تَحَرُّوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوَتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَّخِرِ مِنْ رَمَضَانَ » [بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر:

باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الأواخر (۲۰۱۷)]

”شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے، ان میں سے کوئی خاص رات متعین نہیں۔ یہ بعض دفعہ اکیسویں رات کو بھی پائی گئی ہے۔ [مسلم (۱۱۶۷)] اور بعض دفعہ ستائیسویں رات کو بھی۔ [مسلم (۷۶۲)]

لیلۃ القدر کی علامات

(سوال) لیلۃ القدر کی بعض لوگ بہت سی نشانیاں بیان کرتے ہیں ان میں سے قرآن و سنت میں کوئی علامات وارد ہوئی ہیں؟

(جواب) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« صَبِيحَةُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ تَطْلُعُ الشَّمْسُ لَا شُعَاعَ لَهَا كَأَنَّهَا طَشْتُ حَتَّى تَرْتَفِعَ » [مسلم، کتاب

صلاة المسافرين و قصرها: باب الندب الأكيد الى قيام ليلة القدر (۷۶۲)، كنز العمال (۲۴۰۵۳)]

”شب قدر کی صبح کو سورج کے بلند ہونے تک اس کی شعاع نہیں ہوتی، وہ ایسے ہوتا ہے جیسے کہ تھالی۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لیلۃ القدر کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَيُّكُمْ يَذْكُرُ حِينَ طَلَعَ الْقَمَرُ وَ هُوَ مِثْلُ شِقِّ جَفْنَةٍ » [مسلم، کتاب الصيام: باب فضل ليلة

القدر والحث على طلبها (۱۱۷۰)]

”تم میں سے کون اسے یاد رکھتا ہے، (اس رات) جب چاند نکلتا ہے تو ایسے ہوتا ہے جیسے بڑے تھال کا کنارہ۔“

ایک اور روایت میں ہے:

« لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةٌ سَمْحَةٌ طَلْقَةٌ لَا حَارَّةَ وَلَا بَارِدَةَ تُصْبِحُ الشَّمْسُ صَبِيحَتَهَا ضَعِيفَةً حَمْرَاءَ »

[مسند بزار (۴۸۶/۱)، مسند طرابلسی (۳۴۹)، ابن حزمیہ (۲۳۱/۳)]

”شب قدر پرسکون و معتدل رات ہے جس میں نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ اس کی صبح کو سورج اس طرح طلوع

ہوتا ہے کہ اس کی سرخی مدہم ہو جاتی ہے۔“

شیخ سلیم الہلالی اور شیخ علی حسن عبد الحمید نے اس روایت کی سند کو حسن کہا ہے۔ [صفة صوم النبی (ص ۹۰)]

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے شب قدر کی بہت زیادہ فضیلت معلوم ہوتی ہے لہذا اس عظیم رات میں قیام، تلاوت قرآن، کثرت دعا جیسے امور بخشش کو ضرور اختیار کیجیے اور اپنی بخشش کا سامان پیدا کر لیں۔ وہ انسان کتنا ہی بد نصیب ہوگا جسے یہ ماہ مبارک نصیب ہو لیکن وہ اپنی بخشش اور جہنم سے رہائی نہ کروا سکے۔

حج کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا حکم

(سوال) جو شخص استطاعت کے باوجود فریضہ حج ادا نہیں کرتا اسلام کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟
(جواب) ہر صاحب استطاعت شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جیسا کہ پیچھے دلائل ذکر کر دیے گئے ہیں۔ امام ابن قدامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

”وَاجْمَعَتِ الْأُمَّةُ عَلَىٰ وَجُوبِ الْحَجِّ عَلَى الْمُسْتَطِيعِ فِي الْعُمْرِ مَرَّةً وَاحِدَةً“ [المغنی (۶/۵)]

”امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ صاحب استطاعت پر عمر میں ایک مرتبہ حج واجب ہے۔“

قرآن کی اس آیت: ﴿مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ کی تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ”الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ“ یعنی زاد سفر اور سواری مروی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر (۱/۴۱۴)]

اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس سامان سفر اور سواری کا انتظام ہو اس پر حج فرض ہے اور جو آدمی طاقت کے باوجود حج نہ کرے وہ ایک فرض کا تارک ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَنْ أَطَاقَ الْحَجَّ فَلَمْ يَحُجَّ فَسَوَاءٌ عَلَيْهِ مَاتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا» [تفسیر ابن کثیر (۱/۴۱۵)]

”جو شخص حج کی طاقت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے، برابر ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر۔“

لہذا صاحب استطاعت آدمی بیت اللہ کا حج ضرور کرے اور کوشش کرے کہ استطاعت ہوتے ہوئے جلد حج کر لے کیونکہ موت کا علم کسی کو نہیں نہ جانے وہ کب آن گھیرے اور بندہ اس مبارک عمل سے محروم رہ جائے۔ اس لیے اپنی زندگی میں اس فریضہ کو جلد ادا کر لینا چاہیے۔

حج کتنی مرتبہ فرض ہے؟

(سوال) کیا ایک حج کر لینے والے کو اگر موقع مل جائے اور وہ عمرہ کر لے تو اس پر دوبارہ حج فرض ہو جائے گا؟ نیز پہلی بار عمرے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) حج صرف زندگی میں ایک بار فرض ہے، عمرہ کر لینے پر دوبارہ حج فرض ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے

پس تم حج کرو۔“ تو ایک آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟“ آپ خاموش رہے یہاں تک کہ اس نے یہ بات تین مرتبہ کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اگر میں ”ہاں“ کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہیں رکھ سکو گے۔“ پھر آپ نے فرمایا: ”میں تمہارے لیے جو چیز چھوڑ دوں اسے تم چھوڑ دیا کرو، اس کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، پس جب میں تمہیں کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو اسے حسب استطاعت کرو اور جب کسی چیز سے منع کر دوں تو اسے چھوڑ دو۔“

[مسلم، کتاب الحج: باب فرض الحج مرة في العمر: (۱۳۳۷)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج زندگی میں ایک بار فرض ہے دو بار نہیں۔

عمرہ بھی آدمی پر ایک دفعہ ہی واجب ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”کوئی شخص ایسا نہیں مگر اس پر حج اور عمرہ ضروری ہے۔“ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اللہ کی کتاب میں حج کے ساتھ عمرے کا بھی ذکر ہے۔“ جیسا کہ فرمایا: ”حج اور عمرہ پورا کرو۔“ [البقرة: ۱۹۴]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ”کتاب العمرة، باب وجوب العمرة وفضلها“ قائم کر کے یہ آثار ذکر کیے ہیں اور سمجھایا ہے کہ عمرہ واجب ہے۔

حج کی کون سی قسم افضل ہے

(سوال) ہمارے لیے حج کی کون سی قسم افضل ہوگی جبکہ ہم نے ابھی سے قربانی کے جانور کیلئے رقم اپنے وکیل کو جمع کرادی ہے؟
(جواب) حج کی تین قسمیں ہیں، پہلے ان کی معرفت اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آپ جان لیں کہ ہم نے حج کا کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے:

① **حج تمتع**: حج تمتع یہ ہے کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھیں اور ”لَبَيْكَ اللَّهُمَّ عُمْرَةً“ کہیں پھر تلبیہ جائیں، مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کریں۔ مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت پڑھیں، اس کے بعد صفا و مروہ کی سعی کریں، بال کٹوائیں اور احرام کھول دیں اور عام معمول کے مطابق زندگی بسر کریں اور اب آپ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہیں، پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھیں اور مناسک حج ادا کریں۔

② **حج قرآن**: اس کے لیے میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھیں، مکہ پہنچ کر عمرہ کریں لیکن احرام نہیں کھولیں گے اور نہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوں گے بلکہ حالت احرام ہی میں رہیں گے اور اس حالت میں ۸ ذوالحجہ کو منیٰ چلے جائیں اور احکام حج ادا کریں۔

③ **حج مفرد**: اس صورت میں صرف منیٰ سے حج کی نیت کر کے احرام باندھیں، طواف قدوم اور سعی کریں مگر احرام نہ کھولیں بلکہ اسی طرح منیٰ چلے جائیں اور تمام مناسک پورے کر کے احرام کھول دیں۔

یہ حج کی تین اقسام بالاتفاق صحیح ہیں، اب اختلاف یہ ہے کہ ان میں سے افضل قسم کون سی ہے؟ بعض نے حج قرآن کو افضل قرار دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حج کیا تھا اور بعض نے تمتع کو افضل قرار دیا۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی تمنا کی تھی۔ بعض نے کہا اگر قربانی لے کر جا رہا ہو تو حج قرآن افضل ہے اور اگر قربانی لے کر نہ گیا ہو تو حج تمتع افضل ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح دلائل کی رو سے حج تمتع افضل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اگرچہ حج قرآن کیا تھا مگر افسوس کا اظہار کیا تھا اور فرمایا تھا:

”جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی ہے وہ اگر پہلے معلوم ہو جاتی تو اپنے ساتھ قربانی نہ لاتا۔“ [صحیح بخاری، کتاب التمنی: باب قول النبی لو استقبلت من امری ما استدرت (۷۲۲۹)، ابو داؤد (۱۷۸۴)]

جن صحابہ کرام کے پاس قربانی کے جانور نہیں تھے اور انہوں نے حج قرآن کی نیت سے احرام باندھے ہوئے تھے آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں اور قرآن کی نیت ختم کر کے تمتع کی نیت کر لیں جیسا کہ صحیح مسلم (۱۲۱۸) اور بیہقی (۳۳۸/۳) میں موجود ہے۔

اور جنہوں نے آپ کے اس حکم کو مشورہ سمجھا اور احرام نہ کھولا آپ نے ان پر شدید ناراضی کا اظہار فرمایا جیسا کہ [صحیح مسلم (۱۵۵، ۶۵۴/۸)، ابن خزیمہ (۲۶۰۶)، بیہقی (۱۹/۵) اور مسند احمد (۱۷۵/۶)] میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں موجود ہے۔ لہذا نبی کریم ﷺ کا حج تمتع کی تمنا کرنا اور جن صحابہ کے پاس قربانیاں نہ تھیں انہیں عمرہ کر کے احرام کھولنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ حج تمتع افضل ہے اور یہی کثیر اہل علم کا موقف ہے۔ جیسا کہ [نبیل الاوطا (۱۳۰/۴، ۱۳۱) اور الفتح الربانی (۹۰/۱۱-۹۹)] وغیرہ میں مرقوم ہے۔

دوران طواف جوتا ساتھ اٹھانا

(سوال) کیا حالت طواف میں اپنے ساتھ جوتا اٹھانا جائز ہے؟

(جواب) بیت اللہ کے طواف کے وقت جوتا ساتھ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، اگر جوتا صاف ستھرا ہو، کوئی گندگی نہ لگی ہو تو اسے پاؤں میں پہنے رکھیں پھر بھی درست ہے کیونکہ صاف دستری جوتی کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثبوت کئی ایک احادیث صحیحہ صریحہ میں موجود ہے۔ جیسا کہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ننگے پاؤں اور جوتا پہن کر بھی نماز پڑھتے تھے۔ (ابو داؤد کتاب الصلاة: باب الصلاة فی النعل: ۶۵۳)

لہذا صاف جوتے میں عبادت کرنا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے؟

(سوال) اضطباع کسے کہتے ہیں؟ کیا ہر طواف میں اضطباع ضروری ہے، اگر نہیں تو کم از کم کتنے چکروں میں ضروری ہے؟

(جواب) اضطباع یہ ہے کہ احرام کی اوپر والی چادر کو اپنی دائیں بغل کے نیچے سے گزار کر اپنے بائیں کندھے پر ڈال لیں اور اپنا دایاں کندھا نیچا رکھیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

”نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ نے جعرانہ سے (احرام باندھ کر) عمرہ کیا اور بیت اللہ کے گرد رمل چال سے طواف کیا اور اپنی اوپر والی چادر کو اپنی دائیں بغلوں کے نیچے سے گزار کر انھیں اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔“ [ابوداؤد، کتاب

المناسک: باب الاضطباع فی الطواف (۱۸۸۴)]

یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف اضطباع کی حالت میں کیا اور آپ پر سبز چادر تھی۔“ [سنن ابی داؤد، کتاب

المناسک: باب الاضطباع فی الطواف (۱۸۸۳)]

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

”اضطباع اور رمل ہر اس طواف میں سنت ہے جس کے بعد سعی ہے اور اضطباع تمام چکروں میں سنت ہے برخلاف رمل کے، رطواف کے دوران اضطباع مستحب نہیں اور عوام الناس جو ابتدائے احرام سے لے کر حج یا عمرے میں اضطباع کیے رکھتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ نماز کی حالت میں مکروہ ہے۔“ [تحفة الاحوذی (۲/۲)، مرعاة المفاتیح

(۱۲۳/۹)]

مقام ملتزم پر دعا کرنا

(سوال) مقام ملتزم پر آپ ﷺ نے کس وقت گزرگذا کر دعا کرنے کا حکم دیا ہے؟ حج یا عمرہ یا دونوں میں؟

(جواب) حجر اسود اور باب کعبہ کے درمیان والی جگہ جسے ملتزم کہتے ہیں، اس کے ساتھ چٹنا اور اس پر اپنا سینہ، ہاتھ، بازو اور چہرہ رکھنا رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے جیسا کہ ابوداؤد (کتاب المناسک باب الملتزم) اور ابن ماجہ (باب الملتزم) وغیرہما میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، اس التزام کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں، یہ پورے موسم حج میں کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ میں داخل ہوتے وقت ہی کر لیا کرتے تھے۔

رمل کس طواف میں ضروری ہے؟

(سوال) رمل کس طواف میں ضروری ہے؟

(جواب) پہلے طواف کے صرف پہلے تین چکروں میں مردوں کے لیے رمل چال اور بقیہ چار چکروں میں عام چال سے چلنا

سنت سے ثابت ہے۔ امام نووی رضی اللہ عنہ نے اس پر تمام ائمہ و فقہاء کا اجماع نقل کیا ہے۔ [الفتح الربانی (۲۳/۱۲)]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”نبی ﷺ حج اور عمرہ کے لیے آنے پر سب سے پہلے جو طواف کرتے اس میں تین چکر

دوڑ کر (زل) لگاتے اور باقی چار چکروں میں عام چال چلتے، پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت پڑھتے، پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الحج: باب استلام الحجر الأسود، حین يقدم مكة أول ما يطوف و يرمل ثلاثا (۱۶۰۳)]

حج یا عمرے سے واپسی پر دعوت کرنا

(سوال) کیا حج یا عمرہ سے واپسی پر دوست احباب کی دعوت کرنا مسنون ہے؟

(جواب) سفر حج سے واپس آنے پر دوستوں کی دعوت کرنا مستحب ہے جیسا کہ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (سفر حج) سے واپس مدینہ منورہ لوٹے تو لوگوں کی دعوت کے لیے یوں اہتمام کیا کہ ایک اونٹ یا گائے (راوی کوشک ہے) ذبح کی۔ [بخاری، کتاب الجهاد والسير: باب الطعام عند القدم (۳۰۸۹)]



حج سے متعلق چند متفرق مسائل

دوران حج حیض و نفاس والی عورت کیا کرے؟

(سوال) اگر دوران حج عورت پر حیض و نفاس کی حالت طاری ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

(جواب) جب ۸ ذوالحجہ کو منیٰ کی طرف روانگی کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو روتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اب سب لوگ منیٰ میں جا رہے ہیں اور میں بدستور حالت حیض میں ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

” (غسل کر لو اور حج کا احرام باندھ لو اور) سب وہ ارکان ادا کرو جو حاجی کریں البتہ بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔“

[بخاری، کتاب الحيض: باب تقضى الحائض المناسك كلها الا الطواف (۳۰۵)]

اسی طرح سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹا (محمد بن ابی بکر) پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”غسل کر لو اور کس

کر لگوٹ باندھ لو اور پھر احرام کی حالت اختیار کر لو۔“ [مسلم، کتاب الحج: باب حجة النبي (۱۲۱۸)]

ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنے کا حکم

(سوال) کیا مکہ میں رہتے ہوئے بار بار عمرہ کرنے کی ممانعت آئی ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

(جواب) مکہ مکرمہ میں رہ کر ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا درست ہے، جس طرح کثرت سے طواف بیت اللہ درست ہے۔ اس کے لیے احرام حرم سے باہر جا کر بھی باندھا جاسکتا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقام تعمیم (مسجد عائشہ) سے احرام باندھنے کا واقعہ ہے۔ اسی طرح مکہ میں حرم کے اندر اپنی رہائش سے بھی احرام باندھنا درست ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« فَمَنْ كَانَ دُونَهُنَّ فَمَهَلُهُ مِنْ أَهْلِهِ حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ يُهْلُونَ مِنْهَا » [بخاری، کتاب الحج:

باب مهل أهل الشام (۱۵۲۶)]

”جو لوگ میقات کے اندر ہیں وہ اپنی رہائش سے احرام باندھیں گے حتیٰ کہ مکہ والے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔“

اگر کوئی کہے کہ مکہ میں رہ کر بار بار عمرہ کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے تو جواب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں رہ کر بار بار طواف کرنا بھی تو ثابت نہیں۔ کیونکہ آپ عمرہ کر کے اپنے ساتھیوں سمیت مکہ سے باہر اٹح میں ٹھہر گئے تھے اور آٹھ ذوالحجہ کو وہاں سے منیٰ چلے گئے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ طواف سے منع نہیں کیا گیا تو جواب یہ ہے کہ عمرہ کرنے سے بھی منع نہیں کیا گیا۔ (واللہ اعلم)

میت کی طرف سے حج کرنا

(سوال) کیا میت کی طرف سے حج کیا جاسکتا ہے؟

(جواب) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا: ”میری والدہ نے حج کرنے کی نذر

مانی تھی لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی تو کیا اس کی طرف سے حج ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”اگر اس کے ذمے قرض ہوتا تو تم اسے ادا کرتے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ

حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔“ [بخاری، کتاب الجزاء الصید، باب الحج والنذور عن المیت والرجل

یحج عن المرأة (۱۸۵۲)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے حج کیا جاسکتا ہے۔

حج بدل کا حکم

(سوال) حج بدل اور عمرہ بدل کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ رہنمائی فرمادیں۔

(جواب) کسی ایسے مسلمان کی طرف سے حج کرنا جو مالدار ہو لیکن کمزوری، بڑھاپے یا کسی دائمی مرض کی وجہ سے معذور ہو ”حج

بدل“ کہلاتا ہے۔ یہ درست ہے بشرطیکہ حج بدل کرنے والا پہلے خود اپنا حج کر چکا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سنا

کہ وہ کہہ رہا تھا: «لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرَمَةَ» یعنی ”شبرمہ کی طرف سے لیک۔“ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ”یہ شبرمہ کون

ہے؟“ اس نے کہا ”میرا بھائی ہے“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ عَنْ شُبْرَمَةَ» ”پہلے خود اپنا حج کرو

پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔“ [ابوداؤد، کتاب المناسک: باب الرجل یحج عن غیرہ (۱۸۱۱)]

حج بدل کرنے والا شخص قریبی رشتہ دار ہو، یہ ضروری نہیں، دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج کو قرض کے

ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا قرض دوسرا کوئی بھی شخص ادا کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ غریبوں کے قرض کی

ادا نیگی کے ضامن بن جایا کرتے تھے۔ نیز مرد کی طرف سے عورت اور عورت کی طرف سے مرد حج بدل کر سکتا ہے۔

عمرہ بدل بھی کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سیدنا ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میرا باپ بہت بوڑھا ہے، وہ حج

اور عمرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔“ [ترمذی، کتاب

الحج: باب منہ (۹۳۰)]

رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت

(سوال) رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے موقع پر کیا پڑھا جائے؟

(جواب) مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں پر حاضر ہوں تو وہی دعا پڑھیں جو رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس وقت سکھائی تھی جب انھوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تھا: ”قبروں کی زیارت کے موقع پر میں کیا کہوں؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کلمات کہا کرو:

«السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُسْلِمِينَ وَ يَرْحَمُ اللَّهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَ الْمُسْتَأْخِرِينَ وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَلْآحِقُونَ» [مسلم، کتاب الجنائز: باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها (۹۷۴)]

”دیار میں رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو اور اللہ تعالیٰ رحم فرمائے جو ہم سے پہلے چلے گئے اور جو ہم سے پیچھے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم تمہیں ملنے والے ہیں۔“

آب زمزم کے فوائد

(سوال) کیا آب زم زم کو دیگر پانیوں پر فضیلت حاصل ہے نیز اس کے فوائد کیا ہیں؟

(جواب) بلاشبہ آب زمزم کے فضائل بہت زیادہ ہیں اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہے اور بہت زیادہ برکتوں والا ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُ مَاءٍ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ مَاءُ زَمَزَمَ فِيهِ طَعَامُ الطُّعْمِ وَ شِفَاءُ السُّقْمِ» [مسند بزار (۱۱۷۱) - كشف الأستار (الترغيب والترهيب (۱۷۵۴)، امام ہنسی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اسے بزار اور طبرانی نے المعجم الصغير میں روایت کیا ہے اور بزار کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [مجمع الزوائد (۲۸۶/۳)]

”زمین کی سطح پر سب سے بہتر پانی زمزم کا پانی ہے، اس میں پینے والوں کے لیے کفایت ہے اور بیماری کی شفا ہے۔“

آب زمزم کی فضیلت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب معراج ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام نے آکر زمزم کے پانی سے آپ کے قلب مبارک کو غسل دیا۔ [بخاری، کتاب الصلاة: باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء (۳۴۹)]

اور یہ بات کئی ایک ائمہ نے اپنے مشاہدات میں بیان کی ہے کہ آب زمزم واقعی کھانے سے کفایت کرتا ہے۔ امام ابن قیم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”میں نے ایسے آدمی کا مشاہدہ کیا ہے جو آب زمزم سے گنتی کے دن غذائیت حاصل کرتا رہا، تقریباً نصف ماہ یا اس سے زائد اور اسے بھوک نہیں لگتی تھی۔ لوگوں کے ساتھ عام آدمی کی طرح طواف کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بعض

اوقات اس پر یہ کیفیت چالیس دن تک رہتی۔“ [زاد المعاد (۴/۳۹۳)]

علامہ فاکہی نے لکھا ہے کہ صفیہ بنت جبرہ کہتی ہیں: ”میں نے ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا کا ایک بڑا پیالہ دیکھا جو مسجد میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں زمزم کا پانی ڈالا جاتا تھا، جب ہم اپنے گھر والوں سے کھانا مانگتے تو وہ کہتے: ”ام ہانی کے پیالے کی

طرف چلے جاؤ۔“ [اخبار مکہ (۲/۴۷)]

زمزم کے پانی کے بہت سارے فوائد ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زمزم جس نیک مقصد کے لیے پیا جائے اللہ تبارک و تعالیٰ وہ پورا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ فاکہی نے ایک روایت نقل کی ہے:

”جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے حج کیا، ہم نے بھی ان کے ساتھ حج کیا، جب انھوں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی پھر زمزم کے پاس سے گزرتے ہوئے صفا کو نکلنے لگے تو کہا: ”اے لڑکے! میرے لیے زمزم کا ایک ڈول نکال۔“ ان کے لیے ڈول نکالا گیا، انھوں نے پیا اور اپنے سر اور چہرے پر بھی ڈالا اور کہا:

”زَمَزْمٌ شِفَاءٌ وَ هِيَ لِمَا شُرِبَ لَهُ“ [اخبار مکہ (۲/۳۷)] اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب ”جزء ماء زمزم لما شرب له“ میں فرماتے ہیں: ”یہ سند موقوف ہونے کے ساتھ حسن ہے اور اس حدیث کے لیے جس بھی سند پر میں واقف ہوا ہوں ان سب سے بہتر ہے۔“

”زمزم شفاء ہے اور جس مقصد کے لیے پیا جاتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔“

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ روایت اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے، اس لیے کہ اس میں جو بات بتائی گئی ہے اس میں رائے اور اجتہاد کو دخل نہیں۔ سنن ابن ماجہ میں ایک روایت ان لفظوں سے موجود ہے:

«مَاءُ زَمَزْمٍ لِمَا شُرِبَ لَهُ» [ابن ماجہ، کتاب المناسک: باب الشرب من زمزم (۳۰۶۲)، ابن ابی شیبہ (۳۵۸۱/۴)، احمد (۳۵۷۱۳)، اخبار اصفہان (۳۷۱۲)، عقیلی (۳۰۳۱۲)، تاریخ بغداد (۱۷۹/۳)]

”زمزم کے پانی سے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے اسے پیا جائے۔“

اس روایت کو علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح ابن ماجہ (۲۴۸۴)]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَاءُ زَمَزْمٍ لِمَا شُرِبَ لَهُ إِنْ شَرِبْتَهُ تَسْتَشْفِي بِهِ شِفَاكَ اللَّهُ وَإِنْ شَرِبْتَهُ لِشَبْعِكَ أَشْبَعَكَ اللَّهُ بِهِ وَإِنْ شَرِبْتَهُ لِيُقْطَعَ ظِمَاكَ قَطَعَهُ اللَّهُ وَ هِيَ هَزْمَةٌ جَبْرِيْلَ وَ سُقْيَا اللَّهِ إِسْمَاعِيْلَ» [دارقطنی

(۵۴۵۱۲)، (۲۷۰۲)، مستدرک حاکم (۳۷۳۱۱)]

”زمزم کا پانی جس غرض سے پیا جائے وہ پوری ہوتی ہے، اگر تم اس لیے پیو کہ اس کے ذریعے تم کو شفا چاہیے تو اللہ تعالیٰ تمہیں شفا عطا کرے گا اور اگر تم نے اس لیے پیا کہ تم سیراب ہو جاؤ تو اللہ تمہیں سیراب کر دے گا اور اگر تم اس لیے پیو کہ تم اپنی پیاس ختم کر دو تو اللہ اسے ختم کر دے گا۔ یہ جبریل علیہ السلام کے پاؤں کی ضرب ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسماعیل علیہ السلام کو پلانا ہے۔“

بہت سارے محدثین نے آب زمزم کو مختلف نیک مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مقاصد پورے کر

دیے۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اپنی کتاب ”جزء ماء زمزم لما شرب له“ میں فرماتے ہیں: ”میں نے اسے ایک مرتبہ پیا اور اللہ سے دعا کی کہ مجھے حفظ حدیث میں امام ذہبی جیسی اہلیت عطا کر دے، میں اس وقت حدیث کا ابتدائی طالب علم تھا۔ پھر میں

نے ایک مدت بعد حج کیا جو تقریباً بیس سال کے قریب ہے، اس وقت میں اپنے اندر اس سے زائد رتبے کی طلب پاتا تھا پھر میں نے اس سے اونچے رتبے کا سوال کیا، مجھے اللہ سے امید ہے کہ میں اسے پالوں گا۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ابو بکر بن المقرئ کے فوائد میں سے سوید بن سعید کے طریق سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ”میں نے ابن مبارک کو زمزم میں داخل ہوتے دیکھا تو انھوں نے کہا: ”اے اللہ! عبداللہ بن مؤمل نے مجھے ابوالتریب از جابر حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آب زمزم جس مقصد کے لیے پیا جائے وہ حاصل ہو جاتا ہے“ اے اللہ! میں اس لیے پی رہا ہوں کہ قیامت کے دن کی پیاس سے بچ جاؤں۔“ اس مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا رسالے کا مطالعہ کریں۔

حج کے موقع پر کی قربانی

(سوال) کیا حج کے موقع پر کسی جانے والی قربانی سنت ابراہیم ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

(جواب) حج کے موقع پر جو قربانی کی جاتی ہے وہ سنت ابراہیم ہی ہے۔ مفسر قرآن حکیم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابوالطفیل نے سوال کیا:

”يَزْعَمُ قَوْمُكَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعَى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَأَنَّ ذَلِكَ سُنَّةٌ“

”آپ کی قوم کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مردہ کے درمیان سعی کی ہے اور یہ سنت ہے۔“ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”انھوں نے سچ کہا ہے۔“

بلاشبہ جب ابراہیم علیہ السلام کو ارکان حج کا حکم دیا گیا تو سعی کے مقام پر شیطان ان کے سامنے آیا، اس نے آگے نکلنے کی کوشش کی تو ابراہیم علیہ السلام اس پر سبقت لے گئے پھر جبرائیل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کو جمرہ عقبہ کے پاس لے گئے، پھر ان کے سامنے شیطان آگیا تو انھوں نے اسے سات کنکریاں ماریں یہاں تک کہ وہ چلا گیا، جمرہ وسطی کے پاس پھر سامنے آگیا، انھوں نے اسے پھر سات کنکریاں ماریں۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ اسماعیل علیہ السلام نے سفید قمیص زیب تن کی ہوئی تھی، وہ کہنے لگے: ”اے میرے ابا جان! میرے پاس اس کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں جس میں آپ مجھے کفن دے سکیں۔“ ابراہیم علیہ السلام وہ قمیص اتارنے کی کوشش کرنے لگے تو انھیں پچھلی جانب سے آواز دی گئی: ”اے ابراہیم! بلاشبہ تو نے خواب سچا کر دکھایا۔“ ابراہیم علیہ السلام نے جب مڑ کر دیکھا تو اچانک ایک سفید سنگوں والا مینڈھا موجود تھا۔ [مسند احمد (۱/۲۹۷)، (۴/۴۳۷)، المعجم الكبير (۲۶۸/۱۰)، مسند طرابلسی (۲۶۹۷)، بیہقی (۱۵۳/۵)، شعب الایمان (۴۰۷۷)، تفسیر ابن کثیر (۳۵۲/۵)، تہذیب الآثار (ص ۶۰۱)، تفسیر طبری (۵۱۶/۲)]

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو ارکان حج کا جب حکم ملا تھا اور شیطان کو جمرات کے پاس کنکریاں ماری

تھیں، اس موقع پر اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید مینڈھا قربانی کے لیے دے دیا اور ان کے خواب کو سچا کر دیا۔ لہذا حج کے موقع پر قربانی کرنا سنت ابراہیمی ہے، اس میں کسی بھی اہل علم کو اختلاف نہیں۔ یہ چند متجددین کے ناقص اجتہاد کا کرشمہ ہے، وہ ایسے شوٹے چھوڑ کر اسلام کی تعلیمات پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں لیکن یہ چراغ پھونگوں سے بجھایا نہ جائے گا اور تا قیامت سنت ابراہیمی زندہ رہے گی۔ ان شاء اللہ!



WWW.KITABOSUNNAT.COM

KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

جنازے کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

میت کو غسل دینے کا طریقہ

- (سوال) میت کو غسل دینے کا مسنون طریقہ بیان فرما کا مسنون فرمائیں؟
- (جواب) ① میت کو تین مرتبہ یا اس سے زیادہ مرتبہ حسب ضرورت غسل دیا جائے۔
- ② غسل دینے کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔
- ③ غسل دیتے وقت پانی میں نظافت و طہارت کی غرض سے بیری کے پتے ڈال دینے چاہئیں یا جو بھی اس کے قائم مقام ہو مثلاً صابن وغیرہ۔
- ④ میت کو آخری مرتبہ غسل دیتے وقت پانی میں کوئی خوشبو ملا لینی چاہیے۔ کافر مل جائے تو یہ سب سے بہتر ہے۔
- ⑤ عورت کے بالوں کی مینڈھیاں کھول کر بال اچھی طرح دھوئے جائیں۔
- ⑥ پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرنی چاہیے۔
- ⑦ عورت کے بالوں کی تین مینڈھیاں بنا کر انہیں اس کے پیچھے ڈال دینا چاہیے۔
- ⑧ غسل دیتے وقت میت کے داہنے اعضا اور وضو کی جگہوں سے ابتدا کرنی چاہیے۔
- ⑨ اگر فوت ہونے والا شخص محرم ہو تو اسے خوشبو نہیں لگائی جائے گی۔
- ⑩ غسل دیتے وقت کسی کپڑے یا تولیے وغیرہ کے ساتھ میت کے سر کو ڈھانپ کر رکھنا ضروری ہے۔
- ⑪ میت کو غسل دینے والے کے لیے بعد میں خود غسل کرنا مستحب ہے۔
- ⑫ معرکے میں شہید ہونے والے کو غسل نہیں دیا جائے گا۔
- ⑬ میدان جنگ کے شہید کے علاوہ دیگر شہداء (مثلاً پیٹ کے مرض سے فوت ہونے والا، طاعون سے اور جل کر فوت ہونے والا وغیرہ) کو بالاتفاق غسل دیا جائے گا۔

میت کو غسل دینے والے پر غسل

(سوال) کیا میت کو غسل دینے والے پر غسل اور کندھا دینے والے پر وضو واجب ہو جاتا ہے؟

(جواب) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو میت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔“ [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب فی الغسل من غسل الميت (۳۱۶۱)]

اور ابن ماجہ میں ہے:

”جو میت کو غسل دے وہ غسل کرے۔“ [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء فی غسل الميت (۱۴۶۳)]
 نانا ابو داؤد تو اسے منسوح سمجھتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کے بعد لکھا ہے لیکن انہوں نے ناخ بیان نہیں کیا۔
 امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن زید کے ایک بیٹے کو خوشبو لگائی، اٹھایا، نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔ [بخاری، کتاب الجنائز: باب غسل الميت، ووضوءہ بالماء و السدر]

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ گویا امام بخاری نے اشارہ کیا ہے کہ ابو داؤد والی روایت کمزور ہے پھر انہوں نے اس پر کلام کیا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جب ان کو سعید بن زید بن عمرو کی وفات کی خبر ملی تو اس وقت وہ عقیق میں تھے، خبر ملتے ہی آئے اور ان کو غسل دیا، کفنا یا اور خوشبو لگائی پھر اپنے گھر آئے اور غسل کیا، غسل کرنے کے بعد انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

”میں نے غسل دینے کی وجہ سے غسل نہیں کیا، اگر وہ نجس ہوتے تو میں انہیں ہاتھ نہ لگاتا، میں نے تو گرمی کی وجہ سے غسل کیا ہے۔“ [فتح الباری: (۱۲۵۱۳)]

ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں۔“
 معلوم ہوا کہ میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں اور اٹھانے والے پر وضو ضروری نہیں۔ البتہ اگر کوئی غسل یا وضو کرے تو درست ہے۔

میاں بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا

(سوال) کیا میاں بیوی کسی ایک کی موت پر ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں؟

(جواب) میاں بیوی میں سے جو بھی پہلے وفات پا جائے دوسرا اسے غسل دے سکتا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« رَجَعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْبَقِيعِ فَوَجَدَنِي وَ أَنَا أَجِدُ صُدَاعًا فِي رَأْسِي وَ أَنَا أَقُولُ وَارَأْسَاهُ فَقَالَ بَلْ أَنَا يَا عَائِشَةُ ! وَارَأْسَاهُ ثُمَّ قَالَ: مَا ضَرَّكَ لَوْ مِتَّ قَبْلِي فَقُمْتُ عَلَيْكَ فَعَسَلْتُكَ وَ كَفَنْتُكَ وَ صَلَّيْتُ عَلَيْكَ وَ دَفَنْتُكَ » [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء فی

غسل الرجل امرأته و غسل المرأة زوجها (۱۴۶۵)، دارقطنی (۱۸۰۹)، السنن الكبرى للبيهقي (۳۹۶/۶)، کتاب الجنائز: باب الرجل يغسل امرأته إذا ماتت دارمی (۳۹/۱) مسند ابی یعلیٰ (۵۶/۸)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک آدمی کے جنازے سے فارغ ہو کر) بقیع سے واپس لوٹے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حالت میں پایا کہ میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عائشہ! بلکہ میرے

سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔“ پھر فرمایا: ”تجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہوگئی تو میں تجھے غسل دوں گا اور کفن پہناؤں گا اور تیرا جنازہ پڑھوں گا اور تجھے دفن کروں گا۔“

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا غَسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرُ نِسَائِهِ» [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء في غسل امرأته و غسل المرأة زوجها (۱۴۶۴)، مسند ابی یعلیٰ (۴۶۸/۷)، مسند احمد (۲۶۷/۶)، ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب فی ستر المیت عند غسله (۳۱۴۱)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۹۸/۳)، مستدرک حاکم (۵۰/۳)، موارد الظمان (۲۱۵۷)، شرح السنة (۳۰۸/۵)، مسند شافعی (۲۱۱/۱)]

”اگر مجھے پہلے یہ بات یاد آجاتی جو مجھے بعد میں یاد آئی ہے تو رسول اللہ ﷺ کو آپ کی بیویوں کے سوا کوئی غسل نہ دیتا۔“

قاضی شوکانی رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اوپر والی حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

”فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْمَرْأَةَ يُغْسَلُهَا زَوْجُهَا إِذَا مَاتَتْ وَ هِيَ تُغْسَلُ قِيَّاسًا“ [نیل الأوطار (۳۱/۴)]

”اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت جب مر جائے تو اسے اس کا خاوند غسل دے سکتا ہے اور اس دلیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت بھی خاوند کو غسل دے سکتی ہے۔“

کیونکہ شوہر اور بیوی کا ایک پردہ ہے، جس طرح مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح عورت بھی مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ علامہ محمد بن اسماعیل صاحب سبل السلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”فِيهِ دَلَالَةٌ عَلَى أَنَّ لِلرِّجَالِ أَنْ يُغْسِلَ زَوْجَتَهُ وَ هُوَ قَوْلُ الْجَمْهُورِ“ [سبل السلام (۷۴۲، ۷۴۱/۲)]

”اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے اور یہی قول جمہور ائمہ محدثین کا ہے۔“

اسی طرح سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی اہلیہ محترمہ سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دیا تھا۔ امام مالک رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں:

«أَنَّ أَسْمَاءَ بِنْتَ عَمِيْسٍ غَسَلَتْ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ حِينَ تُوُفِّيَ» [موطا للامام مالك، كتاب الجنائز (۱۳۳)، عبد الرزاق (۴۱۰/۳)، الأوسط لابن المنذر (۳۳۵/۵)، شرح السنة (۳۰۸/۵)]

”جس وقت ابو بکر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے انھیں غسل دیا۔“

سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ فَاطِمَةَ أَوْصَتْ أَنْ يُغْسِلَهَا زَوْجُهَا عَلِيٌّ وَ أَسْمَاءُ فَغَسَلَهَا» [دار قطنی، کتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر (۱۸۳۳)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۹۶/۳)، مصنف عبد الرزاق (۴۱۰/۳)، شرح السنة (۳۰۹/۵)، مسند شافعی (۲۱۱/۱)، حلیة الأولیاء (۴۳/۲)]

”بلاشبہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی کہ انھیں ان کا خاوند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا غسل دیں تو

ان دونوں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔“

علامہ احمد حسن محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”يَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْمَرْأَةَ يُغَسَّلُهَا زَوْجُهَا وَ هِيَ تُغَسَّلُ بِاجْتِمَاعِ الصَّحَابَةِ لِأَنَّهُ لَمْ يُنْقَلْ مِنْ سَائِرِ

الصَّحَابَةِ إِنَّكَارَ عَلَى أَسْمَاءَ وَعَلِيٍّ فَكَانَ إِجْمَاعًا“ [حاشیہ بلوغ المرام (۱۰۵)]

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو اس کا شوہر غسل دے سکتا ہے اور وہ اپنے شوہر کو غسل دے سکتی

ہے، اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ اسماء بنت عمیس اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما پر کسی بھی صحابی کا انکار منقول

نہیں، تو یہ مسئلہ اجماعی ہوا۔“

عورت کا اپنے شوہر کو غسل دینا تو سب اہل علم کے ہاں متفق علیہ ہے۔ [الأوسط لابن المنذر (۳۳۴/۵)]

البتہ مرد کا اپنی بیوی کو غسل دینا مختلف فیہ ہے۔ جمہور ائمہ و محدثین کے ہاں یہ جائز و درست ہے اور یہی بات صحیح ہے جیسا

کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔

امام ابو بکر محمد بن ابراہیم المعروف بابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے علقمہ، جابر بن زید، عبدالرحمن بن اسود، سلیمان بن یسار، ابوسلمہ بن

عبدالرحمن، قتادہ، حماد بن ابی سلیمان، مالک، اوزاعی، شافعی، احمد ابن حنبل اور اسحاق بن راہویہ جیسے کبار ائمہ و محدثین رضی اللہ عنہم سے

یہی بات نقل کی ہے۔ [الأوسط (۳۳۶-۳۳۵/۵)]



کفن دینے کا بیان

کفن کا کپڑا

(سوال) کیا کفن کے لیے ایک کپڑا کافی ہے یا تین کپڑے پہنانے چاہئیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمادیں۔

(جواب) میت کیلئے کفن کا کپڑا اتنا ہونا چاہیے جو اس کے تمام بدن کو ڈھانپ لے جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ يَوْمًا فَذَكَرَ رَجُلًا مِّنْ أَصْحَابِهِ قُبِضَ فَكُفِّنَ فِي كَفْنٍ غَيْرِ طَائِلٍ وَ قَبِرَ لَيْلًا فَزَجَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ يُقْبَرَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهِ إِلَّا أَنْ يَضْطَرَّ إِنْسَانٌ إِلَى ذَلِكَ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَفَّنَ أَحَدَكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنُ كَفَنَهُ » [مسلم، كتاب الجنائز: باب في تحسين كفن الميت (٩٤٣)، المتفق لابن الحارود (٥٤٦)، ابو داؤد (٣١٤٨)، نسائي (٣٣١/٤)، مسند احمد (٢٩٥/٣)، مستدرک حاکم (٣٦٨/١)، بيهقي (٤٠٣/٣)، شرح السنة (٤١٥/٥)]

”بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنے ایک صحابی کا ذکر کیا جو فوت ہو گیا تھا۔ اسے ایسے کپڑے میں کفن دیا گیا جو لمبا نہ تھا اور رات کے وقت قبر میں اتارا گیا تو نبی ﷺ نے رات کے وقت آدمی کو قبر میں اتارنے سے ڈانٹا، یہاں تک کہ اس پر جنازہ پڑھا جائے۔ بجز اس کے کہ انسان اس بات کی طرف مجبور ہو جائے اور نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو اسے اچھا کفن دے۔“

سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا وَلِيَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنُ كَفَنَهُ » [ترمذی، كتاب الجنائز: باب أمر المومن بإحسان كفن أخيه (٩٩٥)، ابن ماجه (١٤٧٤)]

”جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کا ولی بنے تو اسے اچھا کفن دے۔“

اچھا کفن دینے کا مفہوم یہ ہے کہ کفن میں نظافت، سترائی، موٹائی ہو اور وہ ستر کو ڈھانپنے والا اور متوسط ہو۔ [تحفة

الأحوذی (٥١/٤)]

میت کو ایک کپڑے میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا جب وہ جنگ احد میں شہید کر دیے گئے۔ [ترمذی (٣٨٥٣)، ابو داؤد (٣١٥٥)، نسائي (٣٨٠/٤)، عبد الرزاق (٤٢٧/٣)، مسند

احمد (۱۰۹۱۵)، مسند حمیدی (۱۵۵)، المنتقی لابن الجارود (۵۲۲)۔
اسی طرح سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی ایک ہی کپڑے میں کفن دیا گیا۔ [مسند احمد (۶/۳۹۵)، حلیۃ الأولیاء (۱۳۵/۱)، طبرانی (۳۶۷۴)]

اسی طرح شداو بن الہاد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک صحابی کے شہید ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے جبہ مبارک میں کفن دیا اور اس کا جنازہ پڑھا اور اللہ سے اس کے لیے دعا کی: ”اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، تیری راہ میں مہاجر ہو کر نکلا اور شہید کر دیا گیا، میں اس پر گواہی دیتا ہوں۔“ [عبدالرزاق (۹۵۹۷)، شرح معانی الآثار (۱/۲۹۱)، مستدرک حاکم (۳/۵۹۵)، بیہقی (۱۵۱/۴)، دلائل النبوة (۲۲/۴)، نسائی (۲۷۷/۱)]

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بھی ہے کہ جب انھیں شہید کیا گیا تو ان کی بہن صفیہ رضی اللہ عنہا انھیں کفن دینے کے لیے دو کپڑے لے کر آئیں لیکن ان کے پہلو میں ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ والا سلوک کیا گیا اور اس انصاری کے لیے کفن کا کپڑا نہ تھا تو ایک کپڑا اسے دے دیا گیا۔ [بیہقی (۳/۴۰۱)]

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی کپڑا میسر ہو تو اس میں بھی کفن دیا جا سکتا ہے البتہ کفن کے لیے تین کپڑے ہونا مستحب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« كُفِّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ يَمَانِيَّةٍ لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا عَمَامَةٌ »
[بخاری، کتاب الجنائز: باب الكفن بغير قميص (۱۲۷۱)، المنتقی لابن الجارود (۵۲۱)، ابوداؤد (۳۱۵۱)، نسائی (۳۵۱/۴)، ترمذی (۹۹۶)، ابن ماجہ (۱۴۶۹)، مسند احمد (۶/۱۱۸)، مسند طیبلسی (۱۴۵۳)، عبد الرزاق (۳/۴۲۱)، بیہقی (۳/۳۹۹)]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تین یعنی کپڑوں میں کفن دیا گیا، ان میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔“

کفن تین کپڑوں سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کفن دیا گیا تھا یہ اس کے خلاف ہے اور پھر اس میں مال کا ضیاع بھی ہے۔ عورت کا کفن مرد کی طرح ہے، دونوں کے کفن میں تفریق پر کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔ عورت کے کفن کے پانچ کپڑوں کے بارے میں جو روایات مروی ہیں وہ ثابت نہیں۔ مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ [احکام الجنائز للألبانی]

عورت کا کفن

(سوال) عورت کے کفن کے کتنے کپڑے ہونے چاہئیں، کیا عورت کے لیے پاجامہ جائز ہے؟

(جواب) عام فقہاء و محدثین کا کہنا ہے کہ عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے (۱) ازار (تہ بند)۔ (۲) قمیص۔ (۳) خمار یعنی اوڑھنی (جس کو دامنی یا سر بند بھی کہتے ہیں)۔ (۴) اور (۵) دولفافی یعنی دو بڑی چادریں جس میں لپیٹا جائے۔ اس کی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ لیلیٰ بنت قائف رضی اللہ عنہا ثقیفہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

”میں ان عورتوں میں تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو غسل دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے

ہمیں تہ بند دیا پھر قمیص پھر خمار (اورھنی) پھر ایک چادر پھر اس کے بعد ایک دوسرے کپڑے میں لپیٹی گئیں اور رسول اللہ ﷺ دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے پاس سیدہ ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) کا کفن تھا، آپ ہمیں ایک ایک کپڑا کر کے دیتے تھے۔“ [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب فی کفن المرأة: (۳۱۵۷)، مسند احمد: (۳۸۰۱۶)]

لیکن یہ روایت درست نہیں، اس کی سند میں نوح بن حکیم مجہول آدمی ہے، اس کی عدالت نامعلوم ہے اسی طرح اس میں داؤد نامی آدمی کا بھی کوئی پتا نہیں کہ وہ کون ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) جب فوت ہوئی تھیں تو رسول اللہ ﷺ میدان بدر میں تھے، ان کے پاس موجود نہ تھے۔ ملاحظہ ہو: [نصب الرایة: (۲۵۸/۲)]

اس لیے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَالْمَرْأَةُ فِي ذَلِكَ كَالرَّجُلِ إِذْ لَا دَلِيلٌ عَلَى التَّفْرِيقِ“ [احکام الجنائز: (ص ۸۵/)]

”اس مسئلہ میں عورت بھی مرد کی طرح ہے، عورت اور مرد کے کفن میں فرق کی کوئی دلیل موجود نہیں۔“

نبی کریم ﷺ کو تین سفید سوتی حواری چادروں میں کفن دیا گیا، اس میں نہ قمیص تھی اور نہ پگڑی۔

[مسند احمد: (۴۰/۶)، (۱۱۸)]

لہذا مسنون یہی ہے کہ میت مرد ہو یا عورت اسے تین کپڑوں میں دفنایا جائے۔ واللہ اعلم!

کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا

سوال میت کے کفن پر کلمہ یا قرآنی آیات لکھنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا اس سے میت کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟

جواب میت کے کفن پر قرآنی آیات، کلمہ شہادت، اہل بیت کے اسماء اور دیگر دعائیہ کلمات لکھنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فوت ہوئے، آپ کی بیٹیاں، بیٹے، زوجہ محترمہ وغیرہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے آپ ﷺ یا آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے کفن پر دعائیہ کلمات وغیرہ لکھے ہوں اور ظاہر ہے جو کام رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں نہیں ہوا اور نہ خیر القرون ہی میں اس کا کوئی وجود ہے تو وہ بدعت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَحَدَتْ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [بخاری، کتاب الصلح: باب إذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود (۲۶۹۷)]

”جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔“

امام ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا:

”فِي الْكُفْنِ هَلْ يَجُوزُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهِ سُورَةٌ مِنَ الْقُرْآنِ يَسَّ وَالْكَهْفُ وَ أَى سُورَةٍ أَرَادَ أَوْ لَا يَحِلُّ هَذَا خَوْفًا مِنْ صَدِيدِ الْمَيِّتِ وَ سَيْلَانِ مَا فِيهِ عَلَى الْآيَاتِ وَ أَسْمَاءِ اللَّهِ تَعَالَى

الْمُبَارَكَةِ الْمُحْتَرَمَةِ الشَّرِيفَةِ“

”کیا کفن پر قرآنی سورتیں لیں، الکھف یا جو بھی سورت لکھنا چاہے، جائز ہے یا یہ حلال نہیں میت کے بدن سے پیپ نکلنے اور آیات مقدسہ اور اسمائے مبارکہ پر بہ جانے کے خوف سے؟“

تو انھوں نے جواب دیا: ”لَا يَجُوزُ ذَلِكَ“ (یہ جائز نہیں ہے۔) [فتاویٰ و مسائل ابن الصلاح (۲۶۲/۱)]

اس فتویٰ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان آیات مقدسہ اور اسمائے حسنیٰ کی توہین کا پہلو بھی اس میں موجود ہے۔ میت کا وجود پھٹ سکتا ہے یا گل سڑ سکتا ہے اور میت کے بدن سے پیپ نکلنے کی وجہ سے ان اسماء کی توہین ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے بھی یہ درست نہیں ہے۔ بہر کیف انسان کی نجات عقائدِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ پر ہے اور جو اس دنیا کی زندگی میں بوئے گا وہی آخری زندگی میں کاٹے گا، قبرِ اخروی زندگی کا پہلا مرحلہ ہے۔ وہاں اعمال ہی کام آئیں گے اور عقائد کی بنا پر نجات ہوگی۔ جو آدمی دنیا کی زندگی میں بہترین اعمال کر کے گیا وہ تو سوالوں کے جواب دے گا اور جو یہاں اللہ کا باغی تھا، اس کے لیے مشکل ہوگی اور کفن پر لکھی ہوئی تحریریں اس کے کام نہیں آئیں گی۔ جو لوگ عہد نامے، قرآن حکیم، یا دیگر دعاؤں پر مشتمل مجموعے میت کیساتھ قبر میں رکھ دیتے ہیں، یہ بالکل عبث اور کسی کام نہیں آئیں گے، ہمیں ایسے اعمال سرانجام دینے چاہئیں جو رسول اللہ ﷺ کی سنت و حدیث سے ثابت ہوں یا قرآن کریم سے ماخوذ ہوں۔ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ جنازے کی بدعات کے تحت لکھتے ہیں:

” كِتَابَةُ اسْمِ الْمَيِّتِ وَ اَنَّهُ يَشْهَدُ الشَّهَادَتَيْنِ وَ اَسْمَاءِ اَهْلِ الْبَيْتِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ بِتَرْبَةِ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنْ وُجِدَتْ وَ الْقَاءُ ذَلِكَ فِي الْكُفْنِ وَ كِتَابَةُ دُعَاءِ عَلِيِّ الْكُفْنِ“

[احکام الجنائز للألبانی (ص ۳۱۲)]

”میت کا نام لکھنا اور یہ کہ وہ شہادتین کی گواہی دیتا تھا اور حسین رحمۃ اللہ علیہ کی مٹی اگر پائی جائے تو اس کے ساتھ اہل بیت کے نام لکھ کر کفن میں رکھنا اور کفن پر دعا لکھنا یہ سب بدعات و خرافات میں سے ہیں۔“



نماز جنازہ کا بیان

نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا

(سوال) کیا نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا ضروری ہے یا کہ جفت بھی بنائی جاسکتی ہیں؟

(جواب) نماز جنازہ کے لیے طاق صفیں بنانا ضروری نہیں بلکہ جفت بھی بنائی جاسکتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جب نجاشی کی وفات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ أَخَا لَكُمْ قَدْ مَاتَ فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلَيْهِ قَالَ فَقُمْنَا فَصَفْنَا صَفَيْنِ » [صحیح مسلم کتاب

الجنائز باب صلوة النبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى النَّحَاشِيِّ وَهُوَ غَائِبٌ (۹۵۲)]

”یقیناً تمہارا بھائی فوت ہو چکا ہے، اٹھو اس کا جنازہ پڑھو۔“ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”ہم اٹھے اور آپ نے

ہماری دو صفیں بنا دیں۔“

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ جنازے کی صفیں دو بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ نجاشی کا جنازہ پڑھانے کے لیے آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو صفیں بنائی تھیں۔ لہذا طاق صفیں بنانا کوئی ضروری نہیں۔

نماز جنازہ میں رفع الیدین

(سوال) ان روایات کی حیثیت کیا ہے جن میں پہلی تکبیر کے علاوہ رفع الیدین کی ممانعت ہے؟

(جواب) کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ نماز جنازہ میں صرف پہلی تکبیر ہی کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے اور باقی تکبیروں کے ساتھ رفع الیدین نہیں کرنا چاہیے۔ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں وہ ضعیف روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةٍ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فِي أَوَّلِ تَكْبِيرَةٍ وَوَضَعَ

الْيَمِينَ عَلَى الْيُسْرَى » [ترمذی، کتاب الجنائز: باب ما جاء في رفع الیدین علی الجنائز (۱۰۷۷)،

دارقطنی (۱۸۱۳)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۸۱/۴)]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے جنازے پر تکبیر کہی، پہلی تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔“

یہ روایت ضعیف ہے، اس میں تین علتیں ہیں:

① پہلی علت یہ ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن یعلیٰ الاسلمی القطوانی ہے، اس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مضطرب الحدیث ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اسے بیچ قرار دیا ہے۔ امام ابو حاتم نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۱۹۲/۶)، المغنی فی الضعفاء (۵۳۳/۲)، کتاب الضعفاء والمتروکین (۲۰۶/۳)، میزان الاعتدال (۴۱۵/۴)، الکامل فی ضعفاء الرجال (۲۶۸۸/۷)، الکاشف (۳۷۹/۲)، تقریب التہذیب (ص ۳۸۰)]

امام ابن القطان الفاسی نے بھی اس روایت کے ضعیف ہونے کی ایک وجہ یحییٰ بن یعلیٰ الاسلمی ابو زکریا القطوانی کو قرار دیا ہے۔ [بیان الوهم والإیہام (۴۲۱/۳)]

② دوسری علت یحییٰ بن یعلیٰ الاسلمی کا استاد ابو فروہ یزید بن شان ہے۔ امام احمد ابن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام ابو حاتم، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام دارقطنی، امام جوزجانی، امام ابو زرعہ رازی، امام ازدی، امام حاکم اور امام عقیلی رحمہم اللہ نے اسے ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۲۱۱/۶)، المغنی فی الضعفاء (۵۳۸/۲)، میزان الاعتدال (۴۲۷/۴)، تقریب التہذیب (۲۸۲)، کتاب الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی (۲۱۰/۳)]

③ تیسری علت یہ ہے کہ اس کی سند میں امام زہری "عن" سے روایت کرتے ہیں اور وہ مدلس ہیں، مدلس کا معنی مردود ہے۔ لہذا ان تین علتوں کی وجہ سے مذکورہ روایت صحیح نہیں۔

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ عَلَى الْحَنَازَةِ فِي أَوَّلِ تَكْبِيرِهِ ثُمَّ لَا يَعُودُ» [دارقطنی، کتاب الجنائز (۱۸۱/۴)، تحفة الأحوذی (۱۹۱/۴)]

”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے پر پہلی تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔“

اس کی سند میں الفضل بن السکن الکوئی راوی ہے جس کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ غیر معروف ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [المغنی فی الضعفاء (۱۹۱/۲)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ عدم رفع الیدین والی روایات درست نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”رَوَى الدَّارُ قُطْنِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى عَلَى الْحَنَازَةِ رَفَعَ يَدَيْهِ فِي أَوَّلِ تَكْبِيرِهِ ثُمَّ لَا يَعُودُ وَ إِسْنَادُهُمَا ضَعِيفَانِ وَ لَا يَصِحُّ فِيهِ شَيْءٌ“ [تلخیص الحبير (۳۳۲/۲)]

”دارقطنی نے عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز جنازہ ادا کرتے

تو پہلی تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں کی سندیں ضعیف ہیں اور اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔“

نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا حکم

(سوال) کیا نماز جنازہ میں ہر تکبیر پر رفع الیدین کیا جائے گا؟ مہربانی فرما کر دلیل کے ساتھ واضح فرمادیں۔

(جواب) نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کے بارے میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت مروی ہے جس میں ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ عِنْدَ التَّكْبِيرِ فِي كُلِّ صَلَاةٍ وَعَلَى الْجَنَائِزِ» [طبرانی أوسط (۸۴۱۲)، (۱۹۱/۶)، مجمع البحرين في زوائد المعجمين (۱۲۸۲)، مجمع الزوائد (۴۱۵۴)، (۱۳۷/۳)]

”رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں اور جنازوں پر تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔“

اس روایت کی سند انتہائی ضعیف ہے، اس میں کئی ایک علتیں ہیں:

- ① امام طبرانی کے استاد موسیٰ بن عیسیٰ الجزری کے حالات نہیں ملے۔
- ② موسیٰ بن عیسیٰ کا استاد صہیب بن محمد بن عباد بھی مجہول ہے۔

③ عباد بن صہیب البصری متروک ہے۔ [المغنی فی ضعفاء الرجال (۵۱۴/۱)، تقریب التہذیب (ص ۱۹۷)]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۳/۲۵۰)]

اور جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ منکر الحدیث قرار دے دیں اس سے روایت لینا جائز نہیں۔ [میزان الاعتدال (۲/۱)]

لہذا یہ سند تو انتہائی ضعیف ہے البتہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

«عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى عَلَى الْجَنَائِزِ رَفَعَ يَدَيْهِ فِي كُلِّ تَكْبِيرَةٍ وَإِذَا انْصَرَفَ سَلَّمَ»

”سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز جنازہ ادا کرتے تو ہر تکبیر میں رفع الیدین کرتے تھے اور جب پھرتے تو سلام کہتے تھے۔“

اس کے بعد خود ہی فرمایا ہے:

”اسی طرح عمر بن شبہ نے اسے مرفوع بیان کیا ہے اور ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی ہے، انھوں نے یزید بن ہارون سے اسے مقوف روایت کیا ہے اور یہی درست ہے۔“ [علل الدارقطنی بحوالہ نصب الراية (۲/۲۸۵)،

تلخیص الحیبر (۱/۳۳۳)]

یزید بن ہارون کی یحییٰ بن سعید سے روایت کرنے میں ثقات کی ایک جماعت نے متابعت کی ہے۔ بعض نے متابعت تامہ اور بعض نے متابعت قاصرہ۔ جن روایات کی اسناد میں یہ متابعت کی گئی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① امام نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا صَلَّى عَلَى الْجَنَازَةِ رَفَعَ يَدَيْهِ» [جزء رفع اليدين للبخارى (۱۱۱)، (ص ۱۹۵)، مع جلاء العينين]

”بلاشبہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز جنازہ ادا کرتے تو رفع الیدین کرتے تھے۔“

② «عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ مَعَ كُلِّ تَكْبِيرَةٍ عَلَى الْجَنَازَةِ» [مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الجنائز: باب يرفع يديه في التكبير على الجنائز (۱۸۱/۲)]

”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جنازے پر ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔“

③ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي كُلِّ تَكْبِيرَةٍ عَلَى الْجَنَازَةِ وَإِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ» [جزء رفع اليدين (۱۶۰)، (ص ۱۹۵)، مع جلاء العينين]

”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرتے اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو پھر بھی رفع الیدین کرتے تھے۔“

④ امام نافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَرْفَعُ فِي التَّكْبِيرَاتِ الْأَرْبَعِ عَلَى الْجَنَازَةِ» [عبد الرزاق (۶۳۶۰)، (۲/۲۷۰)]

”سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جنازے پر چاروں تکبیروں میں رفع الیدین کیا کرتے تھے۔“

مذکورہ بالا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع و موقوف صحیح روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے۔ نیز عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نماز جنازہ میں تکبیرات کے ساتھ رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَقَدْ صَحَّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي تَكْبِيرَاتِ الْجَنَازَةِ رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ» [تلخیص الحبیر (۳۳۳/۱)]

”عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح ثابت ہے کہ وہ جنازے کی تکبیروں میں رفع الیدین کیا کرتے تھے، اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے۔“

امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ میں رفع الیدین کے متعلق لکھا ہے:

«فَرَأَى أَكْثَرَ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِمْ أَنْ يَرْفَعَ الرَّجُلُ

يَدِيهِ فِي كُلِّ تَكْبِيرَةٍ عَلَى الْجَنَازَةِ وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ الْمُبَارَكِ وَالشَّافِعِيِّ وَاحْمَدَ وَاسْحَاقَ“
[ترمذی مع تحفة الأحمذی (۱۹۰/۲)]

”اکثر اہل علم صحابہ کرام اور ان کے علاوہ کے نزدیک نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا چاہیے اور یہی قول عبد اللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔“ پھر فرماتے ہیں: ”بعض اہل علم نے کہا ہے کہ صرف پہلی مرتبہ ہی رفع الیدین کرنا چاہیے، یہ قول سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا ہے۔“
علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ كَثِيرٌ مِنْ أئِمَّةِ بَلْخِ اجْتَارُوا رَفَعَ الْيَدَيْنِ عِنْدَ كُلِّ تَكْبِيرَةٍ فِيهَا“ [المبسوط (۶۴/۲)]
”کثیر ائمہ بلخ نے نماز جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کو اختیار کیا ہے۔“

نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا

سوال کیا نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور بعض لوگوں کا اسے مکروہ کہنا کیسا ہے؟

جواب نماز جنازہ ادا کرنا مسلمان کا حق ہے اور صحیح حق کی ادائیگی تب ہی ہوتی ہے جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ادا کیا جائے۔ دورِ حاضر میں دیکھا گیا ہے کہ جنازہ پڑھنے کے لیے ایک تو افراد کی بہت کمی ہوتی ہے، لوگ اسے فرض کفایہ سمجھ کر رسمی طور پر ادا کرنے لگے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنازہ پڑھانے والے افراد بھی ایک آدھ منہ میں جنازہ پڑھا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ میت کے ساتھ صحیح وفاداری تب ہی ہوتی ہے جب اس آخری وقت میں اس کا جنازہ سنت کے مطابق ادا کیا جائے۔ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورت پڑھیں۔ سورہ فاتحہ پڑھنا تو لازم ہے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① حضرت طلحہ بن عبد اللہ بن عوف کہتے ہیں:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَلَى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ قَالَ لَتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنائز (۱۳۳۵)، ابو داؤد (۳۱۹۸)، ترمذی (۱۰۲۷)]

”میں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی، انھوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: ”(یہ اس لیے ہے) تاکہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے۔“

② حضرت طلحہ بن عبد اللہ بن عوف ہی بیان کرتے ہیں:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَلَى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُوْرَةَ وَ

جَهَرَ حَتَّىٰ أَسْمَعَنَّا فَلَمَّا فَرَغَ أَخَذَتْ بِيَدِهِ فَسَأَلَتْهُ قَالَ سُنَّةٌ وَحَقٌّ» [نسائی، کتاب الجنائز: باب الدعاء (۱۹۸۹، ۱۹۹۰)، المنتقى لابن الجارود (۵۳۶، ۵۳۷)، بیہقی (۳۸/۴)، مسند ابی یعلیٰ (۶۷/۵)، الأوسط لابن المنذر (۴۳۷/۵)]

”میں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ ادا کی تو انھوں نے سورۃ فاتحہ اور ایک سورت جہری طور پر پڑھی حتیٰ کہ ہمیں سنایا۔ جب فارغ ہوئے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ”یہ سنت اور حق ہے۔“

ایک اور روایت میں بھی یہی الفاظ موجود ہیں۔ [کتاب الأم للشافعی (۱/۲۷۰)، بیہقی (۴/۳۹)، شرح السنة (۳۵۳/۵)، المحلی (۱۲۹/۵)، مسند طرابلسی (۲۷۴۱)، دارقطنی (۲/۷۲)، شرح معانی الآثار (۱۱/۵۰)، مستدرک حاکم (۱/۳۵۸)]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ اور ایک اور سورت پڑھ کر تعلیم دے دی ہے کہ نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنا مسنون ہے اور جب صحابی رسول ﷺ کہے کہ یہ عمل سنت ہے تو اس سے مراد سنت رسول ﷺ ہی ہوتی ہے جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

”جس سال حجاج بن یوسف عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ کرنے کے لیے مکہ میں اترا، اس زمانہ میں اس نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کیا: ”عرفہ کے دن آپ عرفات کی قیام گاہ میں کیا کرتے ہیں؟“ سالم نے کہا: ”اگر تو سنت چاہتا ہے تو عرفہ کے دن ظہر کی نماز کو جلدی ادا کر لے۔“ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ”سالم نے سچ کہا ہے، کیونکہ سنت نبوی ادا کرنے کے لیے لوگ ظہر و عصر کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔“ امام زہری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے سالم سے پوچھا: ”کیا رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تھا؟“ تو سالم نے کہا: ”وَهَلْ تَتَّبِعُونَ فِي ذَٰلِكَ إِلَّا سُنَّتَهُ“ (یعنی اس فعل سے مراد محض سنت کا اتباع ہی تو ہے۔) [بخاری، کتاب الحج: باب الجمع بین الصلاتین بعرفة (۱۶۶۲)]

معلوم ہوا کہ صحابی جب مطلق طور پر لفظ سنت بولتے ہیں تو مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہی ہوتی ہے۔ حدیث کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« جَلَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعِينَ وَجَلَدَ أَبُو بَكْرٍ أَرْبَعِينَ وَعُمَرُ ثَمَانِينَ وَكُلُّ سُنَّةٍ » [مسلم، کتاب الحدود: باب حد الخمر (۱۷۰۷)]

”نبی کریم ﷺ نے چالیس کوڑے لگائے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگائے اور یہ سب سنت ہے۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مطلق سنت سے مراد اولاً سنت رسول ﷺ ہی ہوتی ہے، نیز خلیفہ راشد کے فعل کو بھی سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت امام حاکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”وَقَدْ أَجْمَعُوا عَلَى أَنَّ قَوْلَ الصَّحَابِيِّ سُنَّةٌ حَدِيثٌ مُسْنَدٌ“ (فقہاء و محدثین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابی کا کہنا کہ یہ سنت ہے مندرجہ حدیث کے حکم میں ہے۔) [مستدرک حاکم (۱/۳۵۸)]

امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُولُونَ السُّنَّةَ إِلَّا لِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى“ [الأم (۱/۲۴۰)، حاشیہ نصب الرایۃ (۲/۲۷۱)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت کا لفظ صرف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر بولتے تھے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔“

واضح رہے کہ یہ متفق علیہ قاعدہ ہے اور فقہ و اصول کی معتبر کتب میں موجود ہے۔ [ملاحظہ ہو: عمدة القاری (۱۴۰۸)، المجموع (۲۳۲/۵)، التحریر لابن الہمام (۱۴۹/۳)، فتح القدیر شرح ہدایۃ (۲/۹۵۲)، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (۱۲/۶۳۸)، نصب الرایۃ (۱/۴۱۳)، فتح الباری (۳/۲۰۴)، الفیہ سیوطی (ص/۲۱۱)، شرح نخبۃ الفکر (ص/۱۱۰)، الباعث الحثیث (ص/۴۴۱)، ارشاد الفحول (ص/۹۳)، المغنی لابن قدامة (۳/۴۰۳)] بذل المحمود (۲/۱۲۶)

لہذا اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

③ ابو امامہ بن سہیل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”السُّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْحَنَائِزِ أَنْ يُكَبَّرَ ثُمَّ يَقْرَأُ بِأَمِّ الْقُرْآنِ ثُمَّ يُصَلِّيَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يُخْلِصُ الدُّعَاءَ لِلْمَيِّتِ وَلَا يَقْرَأُ إِلَّا فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى ثُمَّ يُسَلِّمُ فِي نَفْسِهِ عَنْ يَمِينِهِ“ [عبد الرزاق (۲۸/۶۴۲)، (۳/۴۸۹)، المنتقى لابن الجارود (۵۴۰)، فتح الباری (۳/۲۰۳)، نسائی (۱۹۹۱)، الأوسط لابن المنذر (۵/۴۳۷)]

”نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلی تکبیر کہیں پھر سورۃ فاتحہ پڑھیں پھر (دوسری تکبیر کے بعد) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں پھر (تیسری تکبیر کے بعد) میت کے لیے خلوص کے ساتھ دعا کریں، پہلی تکبیر کے سوا کسی میں قراءت نہ کریں پھر آہستہ سے دائیں جانب سلام پھیر دیں۔“

④ ابو امامہ بن سہیل بن حنیف سے روایت ہے اور وہ انصار کے بڑے لوگوں اور علماء میں سے تھے اور ان صحابہ کے

بیٹوں میں سے ہیں جو بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی نے انھیں خبر دی:

”أَنَّ السُّنَّةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْحَنَائِزِ أَنْ يُكَبَّرَ الْإِمَامُ ثُمَّ يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ سِرًّا فِي نَفْسِهِ ثُمَّ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيرَاتِ الثَّلَاثِ“ [شرح معانی الآثار (۱/۵۰۰)، مستدرک حاکم (۱/۳۶۰)،

بیہقی (۴/۴۰۱)، اسے امام حاکم اور امام ذہبی رضی اللہ عنہما نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔]

”نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر سورۃ فاتحہ آہستہ پڑھے پھر نماز کو باقی تین تکبیروں میں ختم کر دے۔“

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”هَذَا هُوَ الْأَوْلَى لِثُبُوتِ ذَلِكَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابِهِ“ [التعليق الممجد (ص ۱۶۹)]

”نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا ہی اولیٰ ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت ہے۔“

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ائمہ کا نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کی مشروعیت میں اختلاف ہے۔ امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن مسعود، حسن بن علی، عبد اللہ بن زبیر اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم کا نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنا نقل کیا ہے اور یہی بات امام شافعی اور امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے۔“ [عمدة القاری (۱۳۹/۸)]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَمِنَ السُّنَّةِ قِرَاءَةُ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ لِأَنَّهَا خَيْرُ الْأَدْعِيَةِ وَأَجْمَعُهَا“ [حجة الله البالغة (۲/۳۶)]

”نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کی قراءت کرنا سنت ہے، اس لیے کہ یہ تمام دعاؤں سے بہترین اور جامع ہے۔“

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: ”پہلی تکبیر میں سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔“ [غنية الطالبين (۲/۱۳۳)]

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار اور اکابر علمائے احناف کے فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین کا طریقہ اور معمول ہے اور اس کے مکروہ ہونے پر کوئی واضح اور صریح دلیل موجود نہیں۔

سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت ملانا

سوال کیا نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنا بھی ثابت ہے؟

جواب نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ طلحہ بن عبد اللہ

فرماتے ہیں:

«صَلَّيْتُ حَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةِ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَ سُورَةَ فَجَهَرَ حَتَّى سَمِعْنَا فَلَمَّا أَنْصَرَفَ أَخَذْتُ بِيَدِهِ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ سُنَّةٌ وَ حَقٌّ» [المنتقى لابن الجارود (۵۳۷)،

نسائی، کتاب الجنائز، باب الدعاء (۱۹۸۶)، بیہقی (۳۸/۴)، مسند ابی یعلیٰ (۲۶۶۱)]

”میں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو انھوں نے سورۃ الفاتحہ اور ایک (اور) سورت پڑھی اور بلند آواز سے قراءت کی، یہاں تک کہ ہم نے سن لیا۔ جب وہ نماز سے پھرے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ”یہ سنت اور حق ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ الفاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بالکل صحیح ہے اور سنت رسول ﷺ ہے، کیونکہ جب کوئی صحابی کسی مسئلے کے بارے میں یہ کہے کہ یہ سنت ہے تو اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہوتی ہے۔ اکثر ائمہ محدثین ﷺ کا یہی قول ہے۔ بلکہ امام حاکم رحمہ اللہ نے تو اس پر اجماع نقل فرمایا ہے:

”وَ قَدْ أَجْمَعُوا عَلَى أَنَّ قَوْلَ الصَّحَابِيِّ سُنَّةَ حَدِيثٍ مُسْنَدٌ“ [مستدرک حاکم (۳۵۸/۱)]

”فقہاء و محدثین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صحابی کا کہنا کہ یہ سنت ہے، سند حدیث ہے۔“

لہذا ثابت ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت پڑھنا بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

نماز جنازہ میں قراءت

(سوال) نماز جنازہ میں قراءت سری کی جائے گی یا جہری؟

(جواب) نماز جنازہ میں قراءت جہری اور سری دونوں طرح درست ہے البتہ دلائل کی رو سے سری طور پر پڑھنا زیادہ درست ہے۔ دلیل یہ ہے۔

ابو امامہ بن سہیل بن حنیف سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے انہیں خبر دی:

« أَنَّ السُّنَّةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ أَنْ يُكَبِّرَ الْإِمَامُ ثُمَّ يَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ سِرًّا فِي نَفْسِهِ ثُمَّ يَخْتِمُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيرَاتِ الثَّلَاثِ » [شرح معانی الآثار (۵۰۰/۱) مستدرک حاکم (۳۶۰/۱) بیہقی (۴۰/۴)]

”نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ امام تکبیر کہے پھر سری طور پر سورۃ فاتحہ پڑھے پھر نماز کو باقی تین تکبیروں میں ختم کرے۔“

امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما نے اس کی سند کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ جہری قراءت کے قائل حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ سیدنا عوف بن مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ وَهُوَ يَقُولُ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ » [مسلم، کتاب الجنائز: باب الدعاء الميت في الصلاة (۹۶۳)]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازے کی نماز پڑھائی، میں نے آپ ﷺ کی دعا سے (ان کلمات کو) یاد کر لیا،

آپ ﷺ کہہ رہے تھے: ”اے اللہ! اس کو بخش دے، اس پر رحم فرما اور اس کو عافیت و معافی سے نواز دے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی نے آپ ﷺ کے جنازہ پڑھانے سے یہ دعا حفظ کی اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب

آپ نے جہری پڑھی ہو۔ بہر کیف سری پڑھنا حدیث سے صراحتاً اور جہری پڑھنا استدلالاً ثابت ہے۔ اس لیے آہستہ پڑھنا

زیادہ بہتر ہے۔

نماز جنازہ میں میت پر نام لے دعا مانگنا

سوال کیا نماز جنازہ میں میت پر نام لے کر دعا مانگنا جائز ہے؟

جواب سیدنا واٹلہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل الفاظ ثابت ہیں:

«اللَّهُمَّ إِنَّ فُلَانًا بَنَ فُلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ فَقِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ» [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت (۳۲۰۲)]

”اے اللہ! بے شک فلاں بن فلاں تیری پناہ میں ہے، تو اسے عذاب قبر سے بچا۔“

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنازہ میں یہ دعائیت کا نام لے کر پڑھنی چاہیے کیونکہ فلاں بن فلاں سے مراد ہی خاص شخص ہوتا ہے۔ صرف لفظ فلاں بن فلاں دہرا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس حدیث کے متعلق شیخ شمس الحق عظیم آبادی عون المعبود میں فرماتے ہیں:

”فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى اسْتِحْبَابِ تَسْمِيَةِ الْمَيِّتِ بِاسْمِهِ وَ اسْمِ أَبِيهِ وَ هَذَا إِنْ كَانَ مَعْرُوفًا وَ إِلَّا جُعِلَ مَكَانَ ذَلِكَ اللَّهُمَّ إِنَّ عَبْدَكَ أَوْ نَحْوَهُ“

”اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ میت پر اس کا اور اس کے باپ کا نام لینا جائز ہے یہ اس وقت ہو گا جب اس کا نام معلوم ہوگا لیکن اگر اس کا نام معلوم نہیں تو پھر ”اللَّهُمَّ إِنَّ عَبْدَكَ“ کہا جائے گا یا اس کی مثل کوئی اور الفاظ۔“

نماز جنازہ میں دعائیں

سوال کیا نماز جنازہ میں اپنے مسلمان بھائی کے لیے ایک سے زیادہ دعائیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب جب کوئی موحد مسلمان فوت ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ ادا کرنا دوسرے مسلمانوں پر حق ہے اور نماز جنازہ میں

اخلاص کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ» [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت (۳۱۹۹)، ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب الدعاء في الصلاة على الحنزة (۱۴۹۷)، بیہقی (۴۰/۴)، صحیح ابن حبان (۷۵۴)]

”جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھنے لگو تو اس کے لیے اخلاص سے دعا کرو۔“

اسی طرح ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«الْسَّنَّةُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْحَنَازَةِ أَنْ تُكَبَّرَ ثُمَّ تَقْرَأُ بِأَمِّ الْقُرْآنِ ثُمَّ تُصَلِّيَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ تَخْلُصُ الدُّعَاءَ لِلْمَيِّتِ وَلَا تَقْرَأُ إِلَّا فِي التَّكْبِيرَةِ الْأُولَى ثُمَّ تُسَلِّمُ فِي نَفْسِهِ
عَنْ يَمِينِهِ [المنتقى لابن الجارود (٥٤٠)، عبد الرزاق (٦٤٢٨)، مستدرک حاکم (٣٦٠/١)، بیہقی
(٣٩١/٣)]

”نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تم تکبیر کہو پھر سورہ فاتحہ پڑھو (پھر دوسری تکبیر کہو) پھر نبی ﷺ پر درود پڑھو (پھر تیسری تکبیر کہو) پھر میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرو اور پہلی تکبیر کے علاوہ کسی میں قراءت نہ کرو (پھر چوتھی تکبیر کہو) پھر اپنی دائیں جانب آہستہ سے سلام پھیر دو۔“

ان دونوں صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرنی چاہیے اور لفظ ”الدعا“ مصدر ہے اس کا اطلاق قلیل و کثیر پر ہوتا ہے لہذا ایک سے زیادہ دعائیں بھی جنازے میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے عام بھائی نماز جنازہ میں یہ دعا پڑھتے ہیں:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنثَانَا اللَّهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَيَّ الْإِسْلَامَ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَيَّ الْإِيمَانَ اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ وَ لَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ» [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء في الدعاء في الصلاة على الجنائز (١٤٩٨)، مسند احمد (٨٨٠٩)، صحيح ابن حبان (٨٥٧)]

”اے اللہ! ہمارے زندہ اور مردہ، حاضر اور غائب، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت کو بخش دے۔ اے اللہ! ہم میں سے جسے بھی تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے جسے بھی فوت کرے اسے ایمان پر فوت کر۔ اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کر اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کر۔“

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ دعا عام ہے، میت کے لیے خاص نہیں ہے اس میں زندہ مردہ، مرد عورت، چھوٹے بڑے، حاضر غائب سب کے لیے دعا ہے اور ہمیں خاص میت کے لیے بھی دعا کا حکم ہے تو لامحالہ اس دعا کے ساتھ خاص میت کی بخشش والی دعا بھی مانگنی پڑے گی جیسا کہ حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی روایت میں دعا موجود ہے:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَ أَكْرِمْ نُزُلَهُ وَ وَسِّعْ مُدْخَلَهُ وَ اغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَ التَّلْجِ وَ الْبَرْدِ وَ نَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَ أَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهِ وَ أَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ وَ زَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهِ وَ ادْخُلْهُ الْجَنَّةَ وَ اعِزَّهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ عَذَابِ النَّارِ» [مسلم، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت في الصلاة (٩٦٣)]

”اے اللہ! اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما اور اسے عافیت دے اور اس سے درگزر فرما، اس کی مہمان نوازی کر، اس کی قبر کو فراخ کر دے، اس کے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں کے ساتھ دھو دے۔ اسے گناہوں سے ایسے صاف کر دے جیسے تو نے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا ہے، اسے اس کے گھر کے بدلے میں زیادہ بہتر گھر عطا

فرما، اس کے گھر والوں کے بدلے میں زیادہ بہتر گھر والے عطا فرما اور اس کی بیوی کے بدلے میں اسے زیادہ بہتر بیوی عطا فرما اور اسے جنت میں داخل فرما اور اسے قبر کے عذاب سے اور آگ کے عذاب سے بچا۔“

شہاد بن الہادیؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ پر ایمان لایا اور آپ کے تابع ہو گیا، پھر کہنے لگا: ”میں آپ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔“ نبی ﷺ نے اس کے متعلق اپنے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی۔ جب ایک جنگ ہوئی تو نبی ﷺ کو کچھ غنیمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اسے تقسیم کر دیا، اس کا بھی حصہ نکالا اور اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ وہ ساتھیوں کی سواریاں چرایا کرتا تھا، جب آیا تو انھوں نے اس کا حصہ اسے دیا۔ وہ پوچھنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ اس کے ساتھی نے کہا: ”تمہارا حصہ ہے جو نبی ﷺ نے تمہارے لیے نکالا ہے۔“ اس دیہاتی نے اپنا حصہ لیا اور نبی ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے مال غنیمت سے تمہارا حصہ نکالا ہے۔“ وہ کہنے لگا: ”میں اس کے لیے آپ کے پیچھے نہیں چلا بلکہ میں تو اس مقصد کے لیے آپ کے پیچھے لگا ہوں کہ مجھے (اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) یہاں تیر لگے تو میں فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم اللہ سے سچ کہو گے تو اللہ بھی تم سے سچ کا سلوک کرے گا۔“ تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ دشمن سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور شہید ہو گیا، اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ اس کو وہیں تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”کیا یہ وہی ہے؟“ صحابہ نے عرض کیا: ”جی ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس نے اللہ تعالیٰ سے سچ کہا تو اللہ نے اس سے سچ کا سلوک کیا۔“ پھر نبی ﷺ نے اسے خود اپنے جے میں کفن دیا اور سامنے رکھ کر اس پر جنازہ پڑھا:

« فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيلِكَ فَقَتِلَ شَهِيدًا أَنَا شَهِيدٌ عَلَى ذَلِكَ » [نسائی، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الشهيد (۱۹۵۲)، مستدرک حکم (۵۹۵/۳)، بیہقی (۱۵۱۴)، السنن الکبریٰ للنسائی (۲۰۸۰)، شرح معانی الآثار (۲۸۱۸)، (۳۰۱۲)]

”تو آپ کی دعا سے جو الفاظ ظاہر ہوئے ان میں سے چند ایک یہ تھے: ”اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، تیری راہ میں ہجرت کر کے نکلا، پس شہید ہو کر قتل ہوا، میں اس بات پر گواہ ہوں۔“

اس حدیث میں بھی ”فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ“ قابل توجہ الفاظ ہیں۔ آپ ﷺ کی دعا میں سے جو الفاظ ظاہر ہوئے، وہ صحابی نے بیان کر دیے۔ معلوم ہوا اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے دعا کی جو ظاہر نہیں ہوئی۔ لہذا نماز جنازہ میں متعدد دعائیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یزید بن رکانہ بن مطلبؓ سے روایت ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامًا لِلْجَنَازَةِ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا قَالَ اللَّهُمَّ عَبْدُكَ وَابْنُ أَمَتِكَ إِحْتَاجُ إِلَى رَحْمَتِكَ وَأَنْتَ غَنِيٌّ عَنْ عَذَابِهِ إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَرِّدْ فِي حَسَنَاتِهِ وَإِنْ كَانَ مُسِيئًا فَتَحَاوَزْ عَنْهُ، ثُمَّ يَدْعُو مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَدْعُو » [طبرانی کبیر (۲۴۹/۲۲)، (۶۴۷)، مجمع الزوائد (۴۱۶۷)، (۱۴۰۱۳)، الإصابة (۵۱۰۱۶)]

”نبی کریم ﷺ جب نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ دعا فرماتے: ”اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیری بندی کا بیٹا ہے، تیری رحمت کا محتاج ہو گیا ہے اور تو اس کو عذاب دینے سے بے پروا ہے۔ اگر یہ احسان کرنے والا تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر گناہ گار تھا تو اس سے درگزر فرما۔“ پھر آپ اس کے بعد جو اللہ چاہتا دعا کرتے۔“

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ جنازے میں کئی دعائیں مانگتے تھے۔ اس حدیث کے آخری الفاظ ”پھر اس کے بعد جو اللہ چاہتا دعا کرتے“ اس مسئلے میں صریح نص ہیں۔ مذکورہ بالا صحیح دلائل سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ مسلمان مومن کا جنازہ پڑھتے وقت ایک سے زائد دعائیں مانگی جاسکتی ہیں، رسول کریم ﷺ کے مبارک عمل سے یہ ثابت ہے اور شرعاً بالکل صحیح اور درست ہے۔

نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا

(سوال) کیا نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی سید رسول ﷺ سے ثابت ہے؟

(جواب) نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی صحیح ہے اور دونوں طرف بھی۔ ایک طرف سلام پھیرنے والی حدیث یہ ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ فَكَبَّرَ عَلَيْهَا أَرْبَعًا وَسَلَّمَ تَسْلِيمَةً وَاحِدَةً» [دارقطنی (۱۹۱)، حاکم (۳۶۰/۱)]

”بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھا، اس پر چار کبیریں کہیں اور ایک سلام پھیرا۔“

اس حدیث کے بعد امام حاکم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

«وَقَدْ صَحَّحَتِ الرَّوَايَةُ فِيهِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى وَابْنِ هُرَيْرَةَ أَنَّهُمْ كَانُوا يُسَلِّمُونَ عَلَى الْجَنَازَةِ تَسْلِيمَةً وَاحِدَةً»

”سیدنا علی، سیدنا عبد اللہ بن عمر، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا جابر بن عبد اللہ، سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفیٰ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے صحیح روایات سے ثابت ہے کہ وہ جنازے پر ایک سلام پھیرا کرتے تھے۔“

رہا یہ مسئلہ کہ عموماً جو جنازوں پر سلام پھیرا جاتا ہے وہ دونوں طرف ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

نے فرمایا:

«ثَلَاثٌ جِلَالٍ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُنَّ تَرَكَهُنَّ النَّاسُ إِحْدَاهُنَّ التَّسْلِيمُ عَلَى الْجَنَازَةِ مِثْلَ التَّسْلِيمِ فِي الصَّلَاةِ» [بیہقی (۴۳/۴)]

”تین کام رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے جنہیں لوگوں نے ترک کر دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نماز جنازہ پر اس طرح سلام پھیرنا جس طرح نماز میں سلام پھیرا جاتا ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حید قرار دیا ہے۔ [شرح مسلم (۲۳۹/۵)]

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس حدیث کو امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔“ [مجمع الزوائد (۳۴/۳)]

اور نماز میں دونوں طرف سلام پھیرنا صحیح ثابت ہے لہذا نماز جنازہ میں جو عموماً اہل حدیث اور دیگر حضرات دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں بالکل جائز و درست ہے اور اسی طرح ایک طرف سلام پھیرنا بھی مشروع ہے۔

نماز جنازہ کے فوراً بعد دعا

(سوال) جیسا کہ ہمارے ہاں مروج ہے نماز جنازہ کے فوراً بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ملتا ہے یا یہ خود ساختہ بدعت ہے؟

(جواب) نماز جنازہ ادا کرنے کا جو طریقہ کتب احادیث میں ملتا ہے اس میں میت کے لیے دعا کرنے کے دو مواقع کا ذکر ہے۔ ایک دعا نماز جنازہ کے اندر اور دوسری دعا قبر میں میت کو دفن کرنے کے بعد۔ نماز جنازہ کے بعد وہیں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر دعا کرنے کا جو رواج بریلوی یا بعض دیوبندی حضرات میں پایا جاتا ہے اس کا ثبوت نہ اللہ کے رسول ﷺ سے ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم ہی سے۔ قرآن مجید سے اشارۃً میت کے لیے دعا کے دو مواقع معلوم ہوتے ہیں۔ جب آپ ﷺ نے منافق عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ ادا کی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّتَّ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ﴾ [التوبة: ۸۴]

”اے پیغمبر! ان میں سے کوئی مرجائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی ادا نہ کرنا اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہی ہونا۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون میں نماز جنازہ ادا کرنے اور دفن کے بعد قبر پر دعا کرنے کا طریقہ ضرور موجود تھا اور ان سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حق میں آیت کے اندر صریحاً ممانعت کر دی ہے۔

اگر تیسری دعا کا وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی ضرور روک دیتے۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے تو فقہائے احناف نے بھی منع کیا ہے، جیسا کہ سید الحموی رقمطراز ہیں:

”لَا يَقُومُ بِالِدَعَاءِ بَعْدَ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ لِأَنَّهُ يَشْبَهُ الزِّيَادَةَ فِي صَلَاةِ الْجَنَازَةِ“ [كشف الرموز علی

الکنز (۱۳۱)]

”نماز جنازہ کے بعد دعا نہ کرو، اس لیے کہ یہ نماز جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔“

نماز جنازہ سے فراغت کے فوراً بعد دعا کروانے کے قائل حضرات کی دلیل یہ حدیث ہے: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ

فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ» [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الدعاء للميت (۳۱۹۹)]

انہوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ”جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھ چکو تو اس کے لیے خالص دعا کرو۔“ حالانکہ اس کا ترجمہ یہ ہے: ”جب تم نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لیے خالص دعا کرو۔“ پہلا ترجمہ تو حدیث کی روح کے خلاف ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جب میت پر نماز جنازہ ادا کی جائے تو نہایت اخلاص کے ساتھ میت کے لیے دعا کی جائے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جنازہ تو بغیر اخلاص کے ساتھ پڑھ لو اور بعد میں اخلاص کے ساتھ دعا کرو۔

جس اصول کے تحت یہ ترجمہ کیا گیا ہے اگر تسلیم کر لیا جائے تو مندرجہ ذیل آیت اور حدیث کے مفہوم کو کیا یہ صحیح سمجھیں گے۔ قرآن میں ہے ﴿وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾ ”جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو۔“ اگر ان حضرات کا ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا: ”جب تم قرآن پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ سے شیطان مردود کی پناہ مانگو۔“ کیا یہ اسے صحیح تسلیم کریں گے اور پھر اس پر عمل کریں گے۔ اور ایک حدیث میں ہے:

«وَإِذَا لَبِسْتُمْ وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَأَبْدُوا بِمِيَامِنِكُمْ» [ابوداؤد، کتاب اللباس: باب فی الانتعال (۴۱۴۱)]

”جب تم لباس پہنو اور وضو کرو تو دائیں طرف سے شروع کرو۔“

اگر ان کی منطق تسلیم کر لی جائے تو ترجمہ یوں ہوگا: ”جب تم لباس پہن لو اور وضو کر لو تو پھر دائیں جانب سے شروع کرو۔“

معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مذکورہ حدیث سے استدلال بالکل بے بنیاد ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کے فوراً بعد کوئی دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں بلکہ دین میں ایک ایجاد ہے۔

مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا

سوال مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا کیسا ہے؟

جواب نماز جنازہ مسجد میں بھی ادا کی جاسکتی ہے، دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«لَمَّا تُوَفِّي سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَاصٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَرْسَلَ أَرْوَاحَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَمْرُؤًا بِحَنَازِرِهِ فِي الْمَسْجِدِ فَيُصَلِّيَنَّ عَلَيْهِ فَفَعَلُوا فَوَقَفَ بِهِ عَلَى حُجْرِهِنَّ يُصَلِّيَنَّ عَلَيْهِ أُخْرِجَ بِهِ مِنْ بَابِ الْحَنَائِزِ الَّتِي كَانَ إِلَى الْمَقَاعِدِ فَبَلَّغَهُنَّ أَنَّ النَّاسَ عَابُوا ذَلِكَ وَقَالُوا مَا كَانَتْ الْحَنَائِزُ يُدْخَلُ بِهَا الْمَسْجِدَ فَبَلَّغَ ذَلِكَ عَائِشَةُ فَقَالَتْ مَا أَسْرَعُ النَّاسُ إِلَيَّ أَنْ يَعْيبُوا مَا لَا عِلْمَ لَهُمْ بِهِ عَابُوا عَلَيْنَا أَنْ يَمْرُؤًا بِحَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ وَمَا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَلَى سُهَيْلِ بْنِ بَيْضَاءَ إِلَّا فِي جَوْفِ الْمَسْجِدِ» [مسلم، كتاب الجنائز: باب الصلاة على الجنائز في المسجد (۹۷۳)، مسند احمد (۷۹/۶)، ابو داؤد، كتاب الجنائز: باب الصلاة على الجنائز في المسجد (۳۱۹۰)، ترمذی (۱۰۳۳)، نسائی (۱۹۶۹، ۱۹۷۰)، ابن ماجه (۱۵۱۸)، شرح معانی الآثار (۳۳۰/۱)، بیہقی (۵۱/۴)، الأوسط لابن المنذر (۴۱۶/۵)، عبد الرزاق (۶۵۷۸)، شرح السنة (۳۵۰/۵)، ابن ابی شیبہ (۱۱۹۷۰)]

”جب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ازواج مطہرات نے پیغام بھیجا کہ ان کا جنازہ مسجد میں لائیں تاکہ وہ بھی ان پر نماز جنازہ پڑھ لیں۔ سوانحوں نے ایسا ہی کیا۔ ازواج مطہرات کے حجروں کے پاس جنازہ رکھا گیا کہ وہ بھی نماز پڑھ لیں اور جنازہ کو باب الجنائز سے جو مقاعد کی طرف تھا، نکالا گیا۔ ازواج کو یہ بات پہنچی کہ لوگ اسے معیوب سمجھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جنازے مسجد میں داخل نہیں کرنے چاہئیں، جب یہ بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا: ”لوگ جلدی عیب لگانے لگ جاتے ہیں، اس بات میں جس کا انھیں علم نہیں ہوتا۔ انھوں نے ہم پر عیب لگایا کہ جنازہ مسجد میں لایا گیا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد ہی میں ادا کی تھی۔“

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”هَذَا الْحَدِيثَانِ يَدُلُّانِ عَلَى مَشْرُوعِيَّةِ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَائِزِ فِي الْمَسْجِدِ قَالَ الْحَافِظُ فِي الْفَتْحِ وَ بِهِ قَالَ الْجَمْهُورُ“ [عون المعبود (۱۸۲/۳)، فتح الباری (۱۹۹/۳)]

”یہ دونوں حدیثیں مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنے کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں فرماتے ہیں: ”یہی جمہور ائمہ و محدثین کا قول ہے۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ دَلِيلٌ لِلشَّافِعِيِّ وَ الْأَكْثَرِينَ فِي جَوَازِ الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ فِي الْمَسْجِدِ وَ مِمَّنْ قَالَ بِهِ أَحْمَدُ وَ إِسْحَاقُ“ [شرح مسلم للنووی (۳۴/۷)]

”اس حدیث میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر فقہاء و محدثین کی دلیل ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے اور یہی قول امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔“

علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ الْحَدِيثُ يَدُلُّ عَلَى جَوَازِ إِدْخَالِ الْمَيِّتِ فِي الْمَسْجِدِ وَ الصَّلَاةِ عَلَيْهِ فِيهِ وَ بِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ وَ أَحْمَدُ وَ إِسْحَاقُ وَ الْجَمْهُورُ“ [مرعاة المفاتيح (۳۸۶/۵)]

”مذکورہ حدیث میت کو مسجد میں داخل کرنے اور اس پر مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے پر دلالت کرتی ہے اور یہی قول امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور جمہور فقہاء و محدثین رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔“

② عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”مَا صَلَّيَ عَلَى أَبِي بَكْرٍ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ“ [ابن ابی شیبہ (۳/۴۴)، (۱۱۹۶۷)، عبد الرزاق (۵۲۶/۳)، (۶۵۷۶)، شرح السنة (۳۵۱/۵)، الأوسط لابن المنذر (۵/۴۱۵)، الإقناع (۱/۶۰۱)، بیہقی (۵۲/۴)]

”ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر مسجد ہی میں جنازہ پڑھا گیا۔“

③ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”صَلَّيَ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي الْمَسْجِدِ“ [موطاء، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الجنائز في المسجد (۱۹۹/۱)، ابن ابی شیبہ (۱۱۹۶۹)، عبد الرزاق (۶۵۷۷)، الأوسط لابن المنذر (۵/۴۱۵)، بیہقی (۵۲/۲)، طحاوی (۴۹۲/۱)، شرح السنة (۳۵۱/۵)]

”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ مسجد میں ادا کی گئی۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کرنا صحیح و درست ہے بلکہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کیونکہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جنازے میں ہزاروں انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی مگر کسی نے بھی انکار نہیں کیا اور یہ جنازے مسجد میں ادا کیے گئے تھے۔

نماز جنازہ میں خواتین کی شرکت

① سوال کیا خواتین نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہیں؟

② جواب اگر خواتین نماز جنازہ ادا کرنا چاہیں تو ادا کر سکتی ہیں۔ عبد اللہ بن ابی طلحہ اپنے باپ ابو طلحہ سے بیان کرتے ہیں کہ جب عمیر بن ابی طلحہ فوت ہوئے تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو بلایا، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور عمیر پر ان کے گھر میں نماز جنازہ ادا کی، نبی ﷺ آگے تھے اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے تھے اور ام سلیم رضی اللہ عنہا ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے تھیں اور ان کے ساتھ ان کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ [المستدرک للحاکم (۳۶۵/۱)، (۱۳۵۰)]

امام حاکم اور امام ذہبی نے اس حدیث کو بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: ”عورتوں کے نماز جنازہ ادا کرنے کی اباحت پر یہ ایک سنت غریبہ ہے۔“ اسی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا نماز جنازہ پڑھنا صحیح مسلم (۹۷۳/۹۹۱) وغیرہ میں مذکور ہے۔ لہذا خواتین اگر نماز جنازہ ادا کرنا چاہیں تو وہ بھی شرکت کر سکتی ہیں البتہ انہیں اپنے حجاب اور پردے کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔

مردہ بچے کی نماز جنازہ

① سوال بچہ اگر مردہ پیدا ہو تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(جواب) مردہ یا ناتمام بچے کی نماز جنازہ ادا کرنا شرعاً مشروع و جائز ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّائِبُ يَسِيرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِي يَمْشِي خَلْفَهَا وَآمَامَهَا وَعَنْ يَمِينِهَا وَعَنْ يَسَارِهَا قَرِيبًا مِّنْهَا وَالسَّقَطُ يُصَلِّي عَلَيْهِ وَيُدْعَى لِيَوْمِ الدِّيَةِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ » [ابو داؤد، كتاب الجنائز: باب المشي أمام الجنازة (۳۱۸۰)، احمد (۱۷۷۰۹)]

”مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سوار جنازہ کے پیچھے چلے اور پیدل آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اس سے قریب رہ کر چلیں اور ناتمام بچے پر بھی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کے ماں باپ کے لیے رحمت اور بخشش کی دعا کی جائے۔“
علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ”ناتمام“ سے مراد وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو، پھر وفات پائے۔ البتہ اس سے پہلے کی صورت میں اگر ساقط ہو جائے تو اس پر نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ وہ میت کہلا ہی نہیں سکتی۔“ [احکام الجنائز (ص ۸۱)]
اس بات کی وضاحت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس مرفوع روایت سے ہوتی ہے:

« إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجَمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يَكُونُ فِي ذَلِكَ مُضْغَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يُرْسِلُ اللَّهُ الْمَلَكَ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ » [مسلم، كتاب القدر: باب كيفية خلق الأدمى فى بطن أمه (۲۶۴۳)]

”یقیناً تمہاری تخلیق کا طریقہ کار یہ ہے کہ چالیس دن تک وہ ماں کے پیٹ میں نطفے کی شکل میں پڑا رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن تک لوتھڑے کی شکل میں، پھر اتنے ہی دن تک بوٹی کی طرح رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔“

لہذا جس بچے کے چار ماہ مکمل ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو، وہ ناتمام پیدا ہوا ہو تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جاسکتی ہے اور جو روح پھونکے جانے سے قبل ہی ساقط ہو جائے، اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس کو میت نہیں کہا جاسکتا۔ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ بچہ زندہ پیدا ہو خواہ اس نے سانس ایک دفعہ ہی لیا ہو، اس کی دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں:

« إِذَا اسْتَهَلَّ السَّقَطُ صَلَّيْ عَلَيْهِ وَوَرَّتْ » [احکام الجنائز للالبانی (ص ۸۱)، تلخیص الحیبر (۱۴۶/۶)، المجموع (۲۵۵/۵)، نقد التاج الجامع للأصول الخمسة (۲۹۳)]

”جب پیدا ہونے والا بچہ جنینے تو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور وہ وارث بھی ہوگا۔“

یہ روایت ضعیف ہے۔

خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال کیا خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھنا ممنوع ہے؟

جواب سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”ایک آدمی بیمار ہو گیا، اس پر چیخ پکار کی گئی، اس کا پڑوسی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اس نے کہا: ”وہ مر گیا ہے۔“ آپ ﷺ نے کہا: ”تجھے کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے کہا: ”میں نے اسے دیکھا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہ نہیں مرا۔“ وہ آدمی واپس لوٹا تو اس آدمی پر چیخ پکار کی جارہی تھی، اس نے آکر آپ ﷺ کو بتایا: ”وہ مر گیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ نہیں مرا۔“ وہ پھر واپس لوٹا تو اس پر چیخ پکار کی جارہی تھی۔ اس آدمی کی بیوی نے کہا: ”تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر انھیں خبر دے۔“ تو اس آدمی نے کہا: ”اے اللہ! اس پر لعنت کر۔“ پھر وہ آدمی اندر آ گیا۔ اس نے جا کر دیکھا کہ اس نے اپنے نیزے کے پھل کے ساتھ اپنا گلا کاٹ لیا ہے۔“ پھر وہ نبی ﷺ کے پاس گیا اور آپ ﷺ کو خبر دی کہ وہ اب مر گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تجھے کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے کہا: ”میں نے اسے دیکھا ہے کہ اس نے اپنے نیزے کے پھل سے اپنا گلا کاٹ لیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا لَا أُصَلِّيْ عَلَيْهِ» ”میں اس پر جنازہ نہیں پڑھوں گا۔“ [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الإمام لا يصلی علی من قتل نفسه (۳۱۸۵)، ترمذی (۱۶۱/۲)، ابن ماجہ (۱۵۲۶)، حاکم (۳۶۴/۱)، بیہقی (۱۹۱۴)، مسند طرابلسی (۷۷۹)، مسند احمد (۸۷۱۵)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنے والے پر آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

مولانا عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ روایت اور اس سے پہلے ایک خائن آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی روایت نقل کر کے لکھا ہے:

”اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق بدکار مسلمان کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ یہی مذہب حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہما وغیرہ کا ہے۔ مگر امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ فاسق کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہیے۔ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے خود بذاتہ لوگوں کی عبرت و تنبیہ کے لیے نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے پڑھی تھی۔“ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نسائی کی روایت میں ہے: ”لیکن میں اس کے جنازے کی نماز نہیں پڑھوں گا۔“

[کتاب الجنائز: (ص ۶۱۱، ۶۲)]

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہر کیف مسلم معاشرے کے ممتاز صاحب علم و بصیرت افراد ایسے لوگوں کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائیں۔ البتہ عوام الناس پڑھ لیں کیونکہ مرنے والا مسلمان آدمی ہے۔ جب قوم کے ممتاز افراد ایسے لوگوں کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائیں گے تو اس طرح ایسے فاسق اور بے عمل افراد کو تنبیہ ہوگی اور برائی کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

شہید کی نماز جنازہ کا حکم

(سوال) کیا شہید کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ دلائل کی رو سے صراحت فرما منون فرمائیں۔

(جواب) شہید کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری نہیں البتہ اگر کوئی پڑھ لے تو جائز ہے۔ جو لوگ شہید معرکہ کے جنازے کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کے پیش نظر یہ حدیث ہے:

«عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أَحَدٍ فِي تَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ يَقُولُ أَيُّهُمُ أَكْثَرُ أَخَذًا لِلْقُرْآنِ فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلَى أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ وَقَالَ أَنَا شَهِيدٌ عَلَى هَوْلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِي دِمَائِهِمْ وَلَمْ يَغْسَلُوا وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ» [بخاری، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الشهيد (۱۳۴۳)]

”جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”نبی ﷺ احد کے مقتولین میں سے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے پھر فرماتے: ”ان میں سے کسے زیادہ قرآن یاد تھا؟“ جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کر کے آپ ﷺ کو بتایا جاتا تو آپ ﷺ اسے لحد میں آگے کر دیتے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں ان پر قیامت کے دن گواہ ہوں گا۔“ آپ نے ان کے غولوں ہی میں انھیں دفن کر دینے کا حکم دیا، نہ تو انھیں غسل دیا گیا اور نہ ان کا جنازہ پڑھا گیا۔“

ان علماء کا کہنا ہے کہ صحیح بخاری کی یہ حدیث اس بات پر صریح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہداء کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ یہ حضرات ان احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ ادا کی۔ کیونکہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کے خلاف ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شہداء کی نماز جنازہ پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ یہ احادیث تین مختلف اوقات سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں سے دو موقعوں کی احادیث کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور اگر کسی نے اختلاف کیا ہے تو محض وہم کی بنا پر کیا ہے۔

① پہلا موقع غزوہ احد کے علاوہ دوسرے موقع پر شہید ہونے والوں کی نماز جنازہ ہے۔ شداؤ بن الہماؤ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”ایک دیہاتی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ پر ایمان لایا اور آپ کا تابع ہو گیا، پھر کہنے لگا: ”میں آپ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔“ نبی ﷺ نے اس کے متعلق اپنے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی۔ جب ایک جنگ ہوئی تو نبی ﷺ کو کچھ غنیمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اسے تقسیم کر دیا، اس کا حصہ بھی نکالا اور اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کو دے دیا۔ وہ ساتھیوں کی سواریاں چرایا کرتا تھا۔ جب آیا تو انھوں نے اسے وہ حصہ دے دیا۔ کہنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”تمہارا حصہ ہے جو نبی ﷺ نے تمہارے لیے نکالا ہے۔“ اس نے وہ لے لیا اور لے کر نبی ﷺ کے پاس آ گیا، کہنے لگا: ”یہ کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے یہ تمہارا حصہ نکالا ہے۔“ کہنے لگا: ”میں اس کے لیے آپ کے پیچھے نہیں چلا بلکہ میں تو اس (مقصد) کے لیے آپ کے پیچھے چلا ہوں کہ مجھے (حلق کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ) یہاں تیر لگے اور میں فوت ہو کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم اللہ سے سچ کہو گے تو اللہ بھی تم سے سچ کا سلوک کرے گا۔“ تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ دشمن سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے پاس لایا گیا اور اسے وہیں تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا یہ وہی ہے؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ”ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا:

« صَدَقَ اللَّهُ فَصَدَّقَهُ ثُمَّ كَفَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جُبَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَدَّمَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ فَكَانَ مِمَّا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيلِكَ فَقَتِلَ شَهِيدًا أَنَا شَهِيدٌ عَلَى ذَلِكَ » [نسائی، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الشهداء (۱۹۵۰)]

”اس نے اللہ تعالیٰ سے سچ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے سچ کا سلوک کیا۔“ نبی ﷺ نے اسے خود اپنے جعبے میں کفن دیا، اسے آگے رکھ کر اس پر جنازہ پڑھی۔ جنازے میں سے آپ ﷺ کے جو الفاظ ظاہر ہوئے ان میں سے چند یہ تھے: ”اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے، ہجرت کر کے تیری راہ میں نکلا پس شہید ہو کر قتل ہوا میں اس بات پر گواہ ہوں۔“

اس صحیح اور صریح حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے شہید معرکہ کا جنازہ خود پڑھایا ہے، اگر احد کے شہداء کا جنازہ آپ ﷺ نے نہ بھی پڑھا ہو تو یہ حدیث ہی شہید کے جنازہ کے سنت ہونے کے لیے کافی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص اعتراض برائے اعتراض کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے: « فَصَلَّى عَلَيْهِ » کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے دعا کی۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو نماز جنازہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ میت سامنے رکھ کر صرف دعائیں کی جاتی بلکہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور اس کے لیے ”فَصَلَّى عَلَيْهِ“ کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

④ دوسرا موقع آٹھ سال بعد شہدائے احد کی نماز جنازہ ہے۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَلَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا فَصَلَّى عَلَى أَهْلِ أُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنِيرِ فَقَالَ إِنِّي فَرَطُ لَكُمْ وَ أَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ وَ إِنِّي وَ اللَّهُ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الْأَنْ وَ إِنِّي أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الْأَرْضِ أَوْ مَفَاتِيحَ الْأَرْضِ وَ إِنِّي وَ اللَّهُ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي وَ لَكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا » [بخاری، کتاب الجنائز: باب الصلاة على الشهداء (۱۳۴۴)]

”نبی ﷺ ایک دن نکلے اور آپ نے احد والوں پر اس طرح نماز جنازہ پڑھی جس طرح آپ میت پر پڑھتے تھے، پھر واپس منبر کی طرف آئے اور فرمایا: ”میں پہلے جا کر تمہاری ضروریات کا انتظام کرنے والا ہوں اور اللہ کی قسم! اس وقت میں اپنا حوض دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں اور اللہ کی قسم! میں تمہارے متعلق اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ایک دوسرے کے مقابلے پر دنیا

میں رغبت کرو گے۔“

دیگر کتب احادیث کی روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ جنازہ آٹھ سال بعد پڑھا۔

اس حدیث سے شہید کی نماز جنازہ ثابت ہوتی ہے۔ بعض لوگ، جنہوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ شہید کی نماز جنازہ کو تسلیم ہی نہیں کرنا، اس حدیث کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں جا کر شہدائے احد کے لیے دعا کی، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے شہداء کی نماز جنازہ پڑھی کیوں کہ صلاۃ کا معنی دعا بھی ہے مگر گزشتہ حدیث کے الفاظ میں اس تاویل کی گنجائش ہی نہیں۔ الفاظ یہ ہیں: «فَصَلَّى عَلَىٰ أَهْلِ أُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ» یعنی ”آپ نے احد والوں پر اس طرح صلاۃ پڑھی جس طرح میت پر پڑھتے تھے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے باقاعدہ ان کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ“ کے الفاظ اس تاویل کی تردید کرتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد دعا ہے۔“ [نبیل الأوطار (۴/۴۴)]

علاوہ ازیں آپ کا یہ عمل صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ آپ میت کے دفن ہونے سے پہلے کسی وجہ سے نماز جنازہ نہ پڑھ سکتے تو قبر پر جا کر صفیں بنا کر نماز جنازہ پڑھتے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”أَخْبَرَنِي مَنْ مَرَّ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى قَبْرِ مَنبُودٍ فَأَمَّهُمْ وَصَلَّوْا خَلْفَهُ قُلْتُ مَنْ حَدَّثَكَ هَذَا يَا أَبَا عَمْرٍو؟ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا“ [بخاری، کتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن (۱۳۳۶)]

”مجھے اس شخص نے خبر دی جو نبی ﷺ کے ساتھ ایک الگ تھلگ قبر کے پاس سے گزرا تو نبی ﷺ نے ان کی امامت کروائی اور انہوں نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ سلیمان فرماتے ہیں: ”میں نے شعبی سے کہا کہ اے ابو عمرو! آپ کو یہ حدیث کس نے بیان کی؟“ تو انہوں نے فرمایا: ”ابن عباس رضی اللہ عنہما نے۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«أَنَّ أَسْوَدَ رَجُلًا أَوْ امْرَأَةً كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَ لَمْ يَعْلَمْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مَا فَعَلَ ذَلِكَ الْإِنْسَانُ؟ قَالُوا مَاتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ أَفَلَا آذَنْتُمُونِي؟ فَقَالُوا إِنَّهُ كَانَ كَذًّا وَ كَذًّا قِصَّتُهُ فَقَالَ فَحَقَّرُوا شَأْنَهُ قَالَ فَذَلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ قَالَ فَآتَى قَبْرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ» [بخاری، کتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن (۱۳۳۷)]

”ایک سیاہ مرد یا عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا تو وہ فوت ہو گیا اور نبی ﷺ کو اس کی وفات کا علم نہ ہو سکا۔ آپ ﷺ نے ایک دن اسے یاد کیا اور فرمایا: ”اس آدمی کا کیا ہوا؟“ لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! وہ فوت ہو گیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟“ انہوں نے کہا: ”اس کا واقعہ اس طرح

ہوا۔“ گویا انھوں نے اس کے معاملے کو معمولی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے اس کی قبر بتاؤ؟“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”آپ اس کی قبر پر گئے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔“

صحیح بخاری میں شہدائے احد کی آٹھ سال بعد نماز جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر پہلے فرصت نہ مل سکے تو کئی سال بعد بھی میت کی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے جس میں شہید بھی شامل ہیں اور اگر وہ احادیث ثابت ہوں جن میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے موقع پر بھی شہداء کی نماز جنازہ پڑھی تو آٹھ سال بعد کی نماز جنازہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے نماز جنازہ پڑھی ہو تو کئی سال بعد دوبارہ قبر پر پڑھنا جائز ہے۔

③ تیسرا موقع جنگ احد کے موقع پر شہدائے احد کی نماز جنازہ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ صحیح بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہدائے احد کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس مفہوم کی روایت مروی ہے مگر جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہو جائے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر شہداء کی نماز جنازہ پڑھی ہے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ اصول ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق جب ایک آدمی یہ بیان کرے کہ یہ واقعہ نہیں ہوا اور دوسرا یہ بیان کرے کہ یہ واقعہ ہوا ہے اور دونوں سچے ہوں تو اس شخص کی بات تسلیم کی جائے گی جو واقعہ ثابت ہونے کا راوی ہے اور پہلے کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ اسے علم نہیں ہو سکا۔

امام شوکانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ أَيْضًا أَحَادِيثُ الصَّلَاةِ قَدْ شَدَّ مِنْ عَضَدِهَا كَوْنُهَا مُثَبَّتَةً وَ الْإِثْبَاتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّفْيِ وَ هَذَا مُرَجَّحٌ مُعْتَبَرٌ“ [نیل الأوطار (۴/۴۴)]

”شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھنے کی احادیث کو قوی قرار دینے والوں کو اس بات سے مزید قوت حاصل ہوتی ہے کہ یہ احادیث جنازے کا اثبات کرتی ہیں اور اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے اور ترجیح کی یہ وجہ ایسی ہے کہ ماننی پڑتی ہے۔“

رہا یہ سوال کہ سیدنا جابر اور انس رضی اللہ عنہما جلیل القدر صحابی ہیں، ان سے یہ بات کیسے مخفی رہ سکتی ہے تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو لائق ہونے والی پریشانی کی حالت میں تمام لوگ اگر جنازے پر نہ پہنچ سکے ہوں اور نہ انھیں اس بات کا علم ہوا ہو تو یہ ممکن ہے۔ خصوصاً سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ ہونا اور جنازے پر نہ پہنچ سکرنا تو عین ممکن ہے کیونکہ وہ احد کے معرکہ میں شریک ہی نہیں ہو سکے جیسا کہ امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے:

”وَ كَانَ جَابِرٌ قَدْ أَطَاعَ أَبَاهُ يَوْمَ أُحُدٍ وَ قَعَدَ لِأَجْلِ إِخْوَاتِهِ ثُمَّ شَهِدَ الْحَنْدَقَ وَ بَيْعَةَ الشَّجَرَةِ“ [سیر اعلام النبلا (۱۹۰/۱۳)]

”اور جابر رضی اللہ عنہ نے احد کے دن اپنے والد کی اطاعت کی تھی اور اپنی بہنوں کی وجہ سے گھر میں رہ گئے تھے، پھر جنگ خندق میں اور بیعت رضوان میں حاضر ہوئے تھے۔“

خود ان کا بیان ہے: ”میں والد صاحب کے منع کرنے کی وجہ سے بدر اور احد میں شریک نہیں ہوا، جب وہ شہید ہو گئے تو

میں کسی غزوے سے پیچھے نہیں رہا۔“ [مسلم، کتاب الجهاد: باب عدد غزوات النبی (۱۸۱۳)]

نیز سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اس وقت چھوٹی عمر کے بچے تھے۔ جن احادیث میں احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

① سیدنا عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ يَوْمَ أُحُدٍ بِحَمْرَةَ فَسَجَى بِبُرْدَةٍ ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهِ فَكَبَّرَ تَسْعَ تَكْبِيرَاتٍ ثُمَّ أَتَى بِالْقَتْلِ يَصِفُونَ وَيُصَلِّي عَلَيْهِمْ وَعَلَيْهِ مَعَهُمْ» [شرح معانی الآثار للطحاوی (۲۹۰/۱)]

”رسول اللہ ﷺ نے احد کے دن حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حکم دیا تو انھیں ایک چادر کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا پھر آپ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی اور ان پر نو تکبیریں کہیں۔ پھر دوسرے مقتول لائے گئے، وہ صفوں میں رکھے جاتے تھے اور آپ ان کی نماز جنازہ پڑھتے تھے اور ان کے ساتھ حمزہ کی بھی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔“

علامہ البانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’اس کی سند حسن ہے، اس کے تمام راوی معروف ثقہ ہیں۔‘ [احکام الجنائز و بدعها (ص ۸۲)]

② عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”لَمَّا وَقَفَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى حَمْرَةَ أَمَرَ بِهَ فَهَبِيَ إِلَى الْقَبْلَةِ ثُمَّ كَبَّرَ عَلَيْهِ تِسْعًا ثُمَّ جَمَعَ إِلَيْهِ الشُّهَدَاءَ كُلَّمَا أَتَى بِشَهِيدٍ وَضَعَ إِلَى حَمْرَةَ فَصَلَّى عَلَيْهِ وَعَلَى الشُّهَدَاءِ مَعَهُ حَتَّى صَلَّى عَلَيْهِ وَعَلَى الشُّهَدَاءِ ائْتَيْنِ وَ سَبْعِينَ صَلَاةً“ [طبرانی کبیر (۱۰۷/۳)]

”جب رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر (نماز جنازہ کے لیے) کھڑے ہوئے اور ان کے متعلق حکم دیا تو ان کی تیاری کر کے انھیں قبلہ کی طرف لٹا دیا گیا۔ پھر آپ نے ان پر نو تکبیریں کہیں، پھر دوسرے شہداء کو ان کے ساتھ اکٹھا کیا، جب کوئی شہید لایا جاتا تو حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لٹا دیا جاتا۔ آپ ﷺ اس پر اور اس کے ساتھ دوسرے شہید پر نماز جنازہ پڑھتے تھے حتیٰ کہ آپ نے اس پر اور دوسرے شہداء پر بہتر (۷۲) دفعہ نماز جنازہ پڑھی۔“

علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ [احکام الجنائز و بدعها (ص ۱۰۴)]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شہید معرکہ کی نماز جنازہ رسول اللہ ﷺ سے کئی احادیث سے ثابت ہے۔ اگر جنگ احد کے موقع پر شہداء کی نماز جنازہ والی احادیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں رہتا اور اگر ان کی صحت پر اطمینان نہ بھی ہو تو گلے میں تیر لگنے سے شہید ہونے والے صحابی کی نماز جنازہ اور شہدائے احد پر آٹھ سال بعد جنازہ والی احادیث کے بعد شہدائے معرکہ کی نماز جنازہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

غائبانہ نماز جنازہ

(سوال) غائبانہ نماز جنازہ کی شرعی حیثیت کے متعلق بتا کر عند اللہ ماجور ہوں؟

(جواب) غائبانہ نماز جنازہ درست ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلَّى فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ تَكْبِيرَاتٍ» [بخاری، کتاب الجنائز: باب التكبير على الجنائز اربعا (۱۳۳۳)]

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی موت کی اطلاع اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر جنازہ گاہ کی طرف نکلے، ان کی صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔“

اس حدیث سے غائبانہ نماز جنازہ کا ثبوت ملتا ہے اور جس شخص کی نماز جنازہ میت حاضر ہونے کی صورت میں ہو سکتی ہے، غائب ہونے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ شہید کی نماز جنازہ کے مسنون ہونے کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں۔ بعض لوگ غائبانہ نماز جنازہ کے سرے ہی سے منکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف نجاشی ہی کے ساتھ خاص تھا کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زمین کے تمام پردے ہٹا دیے گئے اور نجاشی کی میت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ روایت اوہام و خیالات میں سے ہے (یعنی اس کی کچھ حقیقت نہیں)۔“ [المجموع (۲۵۳/۵)]

رہا نجاشی کے ساتھ خاص ہونا تو یہ بات اس لیے درست نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل امت کے لیے نمونہ ہے۔ ہاں اگر کسی عمل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وضاحت فرمادی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے تو الگ بات ہے اور یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صرف اس شخص کی غائبانہ نماز جنازہ درست ہے جس کی اس علاقے میں نہ پڑھی گئی ہو جہاں وہ فوت ہوا۔ ان کا استدلال ان الفاظ سے ہے جو اس حدیث کی بعض روایات میں آتے ہیں: «إِنَّ أَحَا لَكُمْ قَدْ مَاتَ بِغَيْرِ أَرْضِكُمْ» ”تمہارا بھائی تمہارے علاقے سے باہر فوت ہو گیا ہے۔“

ان حضرات کا کہنا ہے کہ نجاشی کی نماز جنازہ وہاں نہیں پڑھی گئی تھی۔ ہمارے علم کے مطابق حدیث کے ان الفاظ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ نجاشی کی نماز جنازہ وہاں کسی نے نہیں پڑھی تھی۔ علاقہ غیر میں فوت ہونے سے یہ بات ضروری نہیں کہ وہاں کوئی بھی مسلمان موجود نہ ہو اور کسی نے بھی نجاشی کی نماز جنازہ نہ پڑھی ہو۔ علاقے سے باہر فوت ہونے کی وجہ سے غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے لیے وہاں پہنچنا مشکل ہے۔

میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا

(سوال) کیا ایک میت کی ایک سے زائد مرتبہ نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

(جواب) ایک میت کی بار بار نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔

① عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرِ قَدِّ دُفِنَ لَيْلًا فَقَالَ مَتَى دُفِنَ هَذَا؟ فَقَالُوا الْبَارِحَةَ قَالَ أَفَلَا أَذْنُومُنِي؟ قَالُوا دَفَّنَاهُ فِي ظُلْمَةِ اللَّيْلِ فَكَرِهْنَا أَنْ نُوقِظَكَ فَقَامَ فَصَفَّفْنَا خَلْفَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب صفوف الصبيان مع الرجال في الجنائز (۱۳۲۱)]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس میں میت کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کب دفن کیا گیا؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ”کل رات۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟“ انھوں نے کہا: ”ہم نے اسے رات کی تاریکی میں دفن کیا ہے اور آپ کو بیدار کرنا ہم نے مناسب نہیں جانا۔“ آپ ﷺ کھڑے ہوئے، ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف باندھی اور آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ ادا کی۔“

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« اَنَّ امْرَأَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُ الْمَسْجِدَ أَوْ شَابًا فَقَفَدَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا أَوْعَنَهُ فَقَالُوا مَاتَ قَالَ أَفَلَا كُنْتُمْ أَذْنُومُنِي؟ قَالَ فَكَانَهُمْ صَعَرُوا أَمْرَهَا أَوْ أَمْرَهُ فَقَالَ دُلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ فَدَلُّوهُ فَصَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ إِنَّ هَذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا وَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَنْوِرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِي عَلَيْهِمْ » [مسلم، کتاب الجنائز: باب الصلاة على القبر (۹۵۶)]

”ایک سیاہ فام عورت یا مرد مسجد میں جھاڑو دیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے گم پایا تو اس کے بارے میں پوچھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا: ”وہ فوت ہو گیا ہے۔“ آپ ﷺ نے کہا: ”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گویا اس معاملے کو چھوٹا سمجھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے اس کی قبر کے متعلق خبر دو۔“ انھوں نے رہنمائی کی۔ آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ ادا کی پھر فرمایا: ”یہ قبریں اپنے اہل پر تاریکی سے بھری ہوتی ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ان پر میری نماز کی وجہ سے روشنی کر دیتا ہے۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک بار نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد نبی ﷺ نے اپنے صحابہ سمیت دوبارہ بھی اسی میت کی نماز جنازہ پڑھی۔ لہذا بار بار نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں:

« وَبِهَذَا الْحَدِيثِ ذَهَبَ الشَّافِعِيُّ إِلَى جَوَازِ تَكَرُّارِ الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ » [مرقاة المفاتيح (۱۴۷/۴)]

”اس حدیث کی بنا پر امام شافعی رضی اللہ عنہ میت پر نماز جنازہ کے تکرار کے جواز کی طرف گئے ہیں۔“

امام ابن منذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے قرظ بن کعب کو ایک جنازہ پڑھانے کا حکم دیا جس پر ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔“ [الأوسط لابن المنذر (۴۱۲/۵)]، ابن ابی شیبہ

[۲۳۹/۳)، عبدالرزاق (۶۵۴۳)]

حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”جب قبر پر نماز جنازہ ثابت ہوگئی تو جب میت قبر سے باہر ہو تو اس وقت بطریق اولیٰ ثابت ہوگی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”میرے نماز پڑھنے سے اللہ ان کی قبریں روشن کر دیتا ہے۔“ مگر ان لوگوں کی دوہری غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”جس مسلمان کی نماز جنازہ میں چالیس آدمی توحید والے شریک ہو جائیں اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ان کے سفارش قبول کرے گا۔“ تو کیا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چالیس سے کم افراد نماز جنازہ نہ پڑھیں۔ نیز زکوٰۃ کے بارے میں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”ان کے مالوں سے صدقہ لو۔ تاکہ اس صدقے کے ذریعے تو ان کا ظاہر و باطن پاک کرے اور ان کے لیے دعا کرو، بلاشبہ تیری دعا ان کے لیے تسلی ہے۔“

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ لینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا خاصہ ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ان کے لیے تسلی ہے کسی اور کی نہیں۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جو لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے انھوں نے بھی یہی آیت پیش کر کے کہا تھا کہ زکوٰۃ کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک تھا اب نہیں۔ اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی۔ لہذا اس قسم کے دلائل سے خاصہ ثابت نہیں ہوا کرتا بلکہ کوئی واضح دلیل ہونی چاہیے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی نماز جنازہ پڑھی، اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ نہیں بلکہ عام ہے۔“ [فتاویٰ اہل حدیث

[۴۶۶۲، ۴۶۱۱۲)]

لہذا اگر نماز جنازہ دوبارہ پڑھ لی جائے تو کوئی حرج نہیں بار بار نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔

نماز جنازہ میں قہقہہ ناقص وضو نہیں؟

سوال کیا نماز جنازہ میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و حدیث سے کی رو سے مسئلہ بتادیں۔

جواب احناف کے نزدیک نواقض وضو میں سے قہقہہ بھی ہے اور یہ صرف رکوع و سجود والی نماز کے ساتھ خاص ہے، نماز جنازہ میں چونکہ رکوع و سجود نہیں اس لیے اگرچہ اس سے گریز کرنا چاہیے تاہم جنازے میں اگر کوئی شخص زور زور سے ہنسنے تو شریعت کی نظر میں اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب قدوری (ص ۲۰۷) میں ہے:

”وَالْقَهْقَهَةُ فِي كُلِّ صَلَاةٍ ذَاتِ رُكُوعٍ وَ سُجُودٍ“

”ہر رکوع اور سجدے والی نماز میں قہقہہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔“

قدوری میں بین السطور لکھا ہے:

”أَحْتَرَزَ بِهِ عَنْ صَلَاةِ الْحَنَازَةِ وَ سَجْدَةِ التَّلَاوَةِ“

”رکوع اور سجدے کی قید لگا کر نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت سے احتراز کیا گیا ہے۔“

اگر کہا جاتا کہ قہقہہ سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو درست تھا مگر کہا یہ گیا کہ نماز میں قہقہہ سے نماز کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے، بالکل غلط اور بے دلیل بات ہے۔ احناف جو روایات پیش کرتے ہیں وہ ضعیف ہیں اور حاشیہ قدوری میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ یہ روایتیں مرسل ہیں اور مرسل محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام سے ہے۔

غروب کے وقت نماز جنازہ ادا کرنا

(سوال) کیا سورج غروب ہوتے وقت نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟

(جواب) عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيهِنَّ أَوْ أَنْ نَقْبِرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا حِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَارِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ وَحِينَ يَقُومُ قَائِمُ الظَّهِيرَةِ حَتَّى تَعْمِلَ الشَّمْسُ وَحِينَ تَضَيِّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ حَتَّى تَغْرُبَ» [مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها باب الأوقات التي نهى عن الصلاة فيها (۸۳۱)، ابو داؤد (۳۱۹۲)، نسائی (۵۶۱)، ترمذی (۱۰۳۰)، ابن ماجہ (۱۵۱۹)، ابو عوانة (۳۸۶/۱)، بیہقی (۳۲/۴)، مسند طیبالسی (۱۰۰۱)، مسند احمد (۱۵۲/۴)]

”تین اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھنے اور مردے دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، جب سورج واضح طور پر طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ بلند ہو جائے، جب دوپہر کے وقت عین سر پر ہوتی کہ ڈھل جائے اور جس وقت غروب ہونے کے لیے مائل ہو رہا ہوتی کہ غروب ہو جائے۔“

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«وَلَا تَجُوزُ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الْأَوْقَاتِ الثَّلَاثَةِ الَّتِي تَحْرُمُ الصَّلَاةَ فِيهَا إِلَّا لِضُرُورَةٍ لِحَدِيثِ عَقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ» [احکام الجنائز و بدعها (ص ۱۶۵)]

”جن تین اوقات میں نماز ادا کرنا حرام ہے ان میں نماز جنازہ ادا کرنا جائز نہیں سوائے ضرورت کے، عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے۔“

محمد بن ابی حرمہ کہتے ہیں:

”نہب بنت ابی سلمہ فوت ہو گئیں اور اس زمانے میں مدینہ کے حاکم طارق تھے۔ نماز صبح کے بعد ان کا جنازہ لایا گیا اور بقیع میں رکھا گیا اور طارق صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھاتے تھے۔ ابن ابی حرمہ کہتے ہیں میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سنا وہ نہب کے گھر والوں سے کہتے تھے: ”یا تو تم نماز جنازہ اب پڑھ لو یا اسے لیٹ کر دو، یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے۔“ [بیہقی، کتاب الجنائز: باب من کره الصلاة والقبر في الساعات الثلاث (۳۲/۴)،

مؤطا مترجم (ص ۱۸۸)]

نماز جنازہ عصر کے بعد اور صبح کے بعد پڑھی جائے، جب یہ دونوں نمازیں اپنے وقت میں پڑھی جائیں یعنی صبح اندھیرے میں پڑھی جائے اور عصر آفتاب زرد ہونے سے پہلے پڑھی جائے۔ زیاد کو علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی:

”أَنَّ جَنَازَةً وَضَعَتْ فِي مَقْبَرَةِ أَهْلِ الْبَصْرَةِ حِينَ أَصْفَرَتِ الشَّمْسُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهَا حَتَّى غَرُبَتِ الشَّمْسُ فَأَمَرَ أَبُو بَرزَةَ الْمُنَادِي فَنَادَى بِالصَّلَاةِ ثُمَّ أَقَامَهَا فَتَقَدَّمَ أَبُو بَرزَةَ فَصَلَّى بِهِمُ الْمَغْرِبَ وَفِي النَّاسِ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَ أَبُو بَرزَةَ مِنَ الْأَنْصَارِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوا عَلَى الْجَنَازَةِ“ [بيهقی (۴/۳۲)]

”اہل بصرہ کے قبرستان میں سورج کے زرد ہونے کے وقت ایک جنازہ رکھا گیا، اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ ابو بزرہ رضی اللہ عنہ نے مؤذن کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لیے اذان کہے۔ اس نے اذان کہی پھر اقامت کہی، ابو بزرہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر انھیں مغرب کی نماز پڑھائی اور لوگوں میں انس بن مالک اور ابو بزرہ رضی اللہ عنہ انصاری موجود تھے پھر انھوں نے نماز جنازہ پڑھی۔“

عبدالرحمن بن حمید بن عبدالرحمن بن عوف فرماتے ہیں:

”وَ أُتِيَ بِجَنَازَةِ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ فَسَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ يَقُولُ صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ الْآنَ وَالْآنَ فَآخِرُوا حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ“ [الأوسط لابن المنذر (۵/۳۹۶)]

”رافع بن خدیج کا جنازہ نماز فجر کے بعد لایا گیا، میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے ہوئے سنا: ”اپنے ساتھی پر اب نماز جنازہ پڑھ لو ورنہ اسے لیٹ کر حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے۔“

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج جب نکل رہا ہو یا عین سر پر ہو یا غروب ہونے کے قریب ہو تو نماز جنازہ وغیرہ ادا نہیں کرنا چاہیے۔ امام احمد، امام اسحاق، امام مالک، امام اوزاعی، امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ وغیرہم ائمہ کا یہی نقطہ نظر ہے۔ [دیکھیے: تحفة الأحوذی (۱۰۲/۴)]

جب کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جن اوقات میں نماز مکروہ ہے ان میں نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔“ [تحفة الأحوذی (۱۰۲/۴)]

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اگر کہا جائے کہ نماز جنازہ بھی تو نماز ہے اور ان اوقات میں ہر نماز منع ہے تو امام شافعی رضی اللہ عنہ نے کیسے کہہ دیا ہے کہ ان اوقات میں نماز جنازہ ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ان اوقات میں ہر نماز منع نہیں بلکہ صرف وہ نمازیں منع ہیں جن کے لیے کوئی سبب نہیں اور جو اسباب والی نمازیں ہیں وہ ان اوقات میں جائز ہیں اور نماز جنازہ اسباب والی نمازوں میں سے ہے۔“ [تحفة الأحوذی (۱۰۳/۴)]

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”ان تین اوقات میں لوگوں نے نماز جنازہ ادا کرنے اور میت کو دفن کرنے کے جواز میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ ان اوقات میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ یہی قول عطا، نخعی، اوزاعی، ثوری، اہل الرائے، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دن یا رات کے کسی بھی وقت میں نماز اور میت کی تدفین درست و مباح ہے اور جماعت کا قول حدیث کی موافقت کی وجہ سے اولیٰ ہے۔“ [معالم السنن (۴/۳۲۷)]

امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی بات کو قبول کیا ہے۔ [الأوسط لابن المنذر (۵/۳۹۶)]

اور راقم کے نزدیک بھی یہی بات زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اس کی تائید عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”بعد نماز عصر اور بعد نماز فجر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ ہاں آفتاب طلوع ہونے کے وقت اور غروب ہونے کے وقت اور ٹھیک دوپہر کو آفتاب کے کھڑے ہونے کے وقت نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے۔“ [کتاب الجنائز: ۴۸]

WWW.KITABOSUNNAT.COM



تدفین کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

میت کو قبر میں اتارنا

(سوال) میت کو قبر میں اتارنے کے مسنون طریقہ سے آگاہ فرمادیں؟

(جواب) میت کو قبر میں اتارنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ میت کو پاؤں کی جانب سے قبر میں اتارا جائے۔ ابو اسحاق روایت کرتے ہیں:

« أَوْصَى الْحَارِثُ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنِ يَزِيدَ فَصَلَّى عَلَيْهِ ثُمَّ أَدْخَلَهُ الْقَبْرَ مِنْ قِبَلِ رِجْلِي الْقَبْرِ وَقَالَ هَذَا مِنَ السُّنَّةِ » [ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب فی المیت یدخل من قبل رجله (۳۲۱۱) بیہقی (۵۴/۴)، ابن ابی شیبہ (۳۲۸/۳)]

”حارث نے وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ عبد اللہ بن یزید رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔ انھوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، پھر ان کو قبر میں پاؤں کی طرف سے داخل کیا اور فرمایا: ”یہ سنت میں سے ہے۔“ اس حدیث کے بارے میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ سند صحیح ہے اور یہ سنت میں سے ہے اور مسند حدیث کی طرح ہے۔“

صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کے بارے میں یوں کہنا کہ یہ سنت میں سے ہے، اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

” وَأَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُولُونَ السُّنَّةُ إِلَّا لِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى “ [کتاب الام (۲۴۰/۱)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت کا لفظ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر بولتے ہیں، ان شاء اللہ۔“ امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے:

” كُنْتُ مَعَ أَنَسٍ فِي جَنَازَةِ فَامَرَ بِالْمَيْتِ فَأَدْخَلَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيْهِ “ [ابن ابی شیبہ (۳۲۷/۳)، مسند احمد (۴۲۹/۱)]

”میں ایک جنازے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، انھوں نے میت کے متعلق حکم دیا تو وہ پاؤں کی جانب سے قبر میں داخل کی گئی۔“

عمر بن مہاجر سے روایت ہے: ”عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا بیٹا جب فوت ہوا تو انھوں نے بھی پاؤں کی طرف سے قبر میں داخل کرنے کا حکم دیا۔“ [ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۸)]

سنن ابن ماجہ میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف سے قبر مبارک میں رکھا گیا لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں عطیہ عوفی راوی ضعیف ہے۔ [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء فی إدخال الميت القبر (۱۰۰۲)]

مندرجہ بالا صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا مسنون ہے۔

میت کو قبر میں اتارنے والا کیا کہے؟

سوال میت کو قبر میں اتارنے والے شخص اگر کوئی مسنون دعائیں پڑھنا چاہیں تو وہ کیا ہیں؟

جواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب تم اپنے مردوں کو قبر میں اتارو تو کہو: «بِسْمِ اللَّهِ وَ عَلَى سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ» اور ایک روایت میں ہے: «بِسْمِ اللَّهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ» [ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب فی الدعاء للمیت إذا وضع فی قبره (۳۲۱۳)، ابن ماجہ (۱۰۰۰)، ترمذی (۱۰۴۶)، صحیح ابن حبان (۷۷۳)، حاکم (۳۶۶/۱)، بیہقی (۵۵/۴)، احمد (۲۷/۲-۴۰)]

ایک اور روایت میں ہے:

«الْمَيِّتُ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ فَلْيَقُلِ الَّذِينَ يَضَعُونَهُ حِينَ يُوَضَعُ فِي اللَّحْدِ: بِسْمِ اللَّهِ وَ بِاللَّهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ» [حاکم (۳۶۶/۱)]

”جب میت کو قبر میں رکھا جائے تو اسے لحد میں رکھتے وقت قبر میں اتارنے والے لوگ کہیں: «بِسْمِ اللَّهِ وَ بِاللَّهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ»۔“

ان روایات سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں اتارنے والے حضرات یہ دعا پڑھیں کیونکہ یہی مسنون ہے۔

تدفین کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا

سوال کیا مرنے کے بعد میت کو کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنا ثابت ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمادیں؟

جواب جب کوئی موحد مسلمان فوت ہو جائے تو اسے قبر میں دفن کرنے کے بعد اس کے حق میں حساب کی آسانی اور ثابت قدمی کیلئے دعا کرنا مسنون ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ جیسا کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو کہتے: ”اپنے بھائی کے لیے بخشش کی دعا

کرد اور اس کیلئے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔“ [ابو داؤد، کتاب الجنائز: باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف (۳۲۲۱)، مستدرک حاکم (۳۷۰/۱)، بیہقی (۵۶/۴)]

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فِی الْحَدِيثِ مَشْرُوعِيَّةُ الْاِسْتِغْفَارِ لِلْمَيِّتِ عِنْدَ الْفَرَاغِ مِنْ دَفْنِهِ وَ سَوَالُ التَّسْبِيْتِ لَهُ لِاَنَّهُ يُسْتَلُّ فِیْ تِلْكَ الْحَالِ“ [عون المعبود (۲۰۹/۳)]

”اس حدیث سے میت کے لیے اس کے دفن سے فارغ ہوتے وقت بخشش کی دعا کرنے کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرنا بھی۔ اس لیے کہ اس سے اسی حالت میں سوال کیا جاتا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ میت کو کلمہ شہادت اور سوال و جواب کی تلقین کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ اسی حدیث کی شرح میں مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس حدیث میں میت کے دفن سے فارغ ہونے کے وقت دعا کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے ثابت قدمی کا سوال کرنا اور بلاشبہ زندوں کی دعا مردوں کو نفع دیتی ہے۔ اس حدیث میں دفن کے وقت تلقین کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں جیسا کہ شافعیہ کے ہاں تلقین کی عادت ہے اور نہ کوئی مرفوع صحیح حدیث تلقین کے بارے میں موجود ہے اور ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں جو روایت بیان کی گئی ہے وہ ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔“

[مرعاة المفاتیح (۲۳۰/۱)]

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”آپ رضی اللہ عنہ قبر کے پاس قراءت کے لیے نہیں بیٹھتے تھے اور نہ میت کو تلقین کرتے تھے جیسا کہ لوگ آج کرتے ہیں۔“ [زاد المعاد (۵۲۳/۱)]

اس ضمن میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے جو مروی روایت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سعید بن عبد اللہ الاودی نے کہا: ”میں ابو امامہ کے پاس حاضر ہوا، وہ حالت نزع میں تھے، انھوں نے فرمایا: ”جب میں مرا جاؤں تو میرے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تمہارا کوئی بھائی مر جائے تو تم اس کی قبر پر مٹی برابر کر چکو تو تم میں سے کوئی ایک اس کی قبر کے سر ہانے کھڑا ہو جائے، پھر کہے: ”اے فلاں ابن فلاں!“ وہ سن رہا ہوتا ہے لیکن جواب نہیں دیتا پھر کہے: ”اے فلاں ابن فلاں!“ تو وہ اٹھ کر برابر بیٹھ جاتا ہے پھر کہے: ”اے فلاں ابن فلاں! تو وہ کہتا ہے: ”ہماری رہنمائی کرو، اللہ تیرے اوپر رحم کرے،“ لیکن تم سمجھتے نہیں پھر کہے: ”وہ بات یاد کر جس پر تو دنیا سے گیا تھا یعنی ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کی شہادت۔“ اور اسے کہا جائے: ”بے شک تو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر اور قرآن کے امام ہونے پر راضی تھا۔“ اس لیے کہ منکر و نکیر میں سے ہر ایک اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے: ”آ میرے ساتھ چل، ہم اس کے پاس نہیں بیٹھیں گے۔ جسے اس کی دلیل و حجت و تلقین کی گئی تو پھر ان دونوں کے ماوراء اللہ تعالیٰ اس کا

نوح بن جاتا ہے۔“ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اگر اس کی ماں کو نہ جانتا ہو تو پھر؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو حوا کی طرف منسوب کر کے کہے: ”اے فلاں ابن حوا۔“

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اسے طبرانی نے ”المعجم الكبير“ میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں راویوں کی ایک جماعت ہے جنہیں میں نہیں پہچانتا۔“ [مجمع الزوائد (۳/۴۸۸)]
امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ حدیث مرفوعاً ثابت نہیں۔“ [زاد المعاد (۱۰/۵۲۳)]
امام صنعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ائمہ محققین کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس پر عمل بدعت ہے۔ آپ ان لوگوں کی کثرت سے دھوکا مت کھائیں جو یہ کرتے ہیں۔“ [سبل السلام (۲/۷۷۳)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ [المجموع (۵/۳۰۴)]

حافظ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [إحياء العلوم (۴/۴۲۰)]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ [سلسلة الاحادیث الضعيفة (۲/۶۴)، (۵۹۹)]

اسی طرح قبر پر تلقین کے لیے مندرجہ ذیل روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَقِنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ» [مسلم، کتاب الجنائز: باب تلقين الموتى لا اله الا الله (۹۱۶)]
”اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔“

یہ روایت مفصل طور پر صحیح ابن حبان میں موجود ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے مراد قریب الموت شخص کو ”لا الہ الا اللہ“ کی تلقین کرنا ہے تاکہ اس کی موت کلمہ توحید پر آئے۔ سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَقِنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مِنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عِنْدَ الْمَوْتِ دَخَلَ الْجَنَّةَ

يَوْمًا مِنَ الدَّهْرِ وَإِنْ أَصَابَهُ قَبْلَ ذَلِكَ مَا أَصَابَهُ» [صحیح ابن حبان (۷۱۹)، الموارد]

”اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو، جس کا آخری کلام موت کے وقت لا الہ الا اللہ ہو وہ کبھی نہ کبھی

جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس کو اس سے قبل جو مصیبت پہنچی ہوگی پہنچے گی۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ «لَقِنُوا مَوْتَاكُمْ» والی حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے مرنے کے بعد اسے

دفن کر کے لا الہ الا اللہ کی تلقین کی جائے بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب انسان قریب المرگ ہو تو اسے لا الہ الا اللہ

پڑھنے کو کہا جائے تاکہ اس کے جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی قریب المرگ آدمی کو لا الہ الا اللہ کہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النجار کے ایک آدمی کی عیادت کے لیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا: ”لا الہ الا اللہ کہو۔“ اس نے کہا:

کیا لا الہ الا اللہ کہنا میرے لیے بہتر ہے؟“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں!“ [مسند احمد (۳/۱۵۲، ۱۵۴)، یہ حدیث

مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔]

مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا قَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِنُوا مَوْتَكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَالْمَرَادُ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا عِنْدَ

دَفْنِ الْمَيِّتِ“ [مرعاة المفاتيح (۱/۲۳۰)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ”اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو“ کا مطلب موت کے وقت ہے نہ کہ میت کو دفن کرنے کے وقت۔“

اس لیے کہ لا الہ الا اللہ کو جانتے ہوئے دنیا سے گیا تو جنت میں داخل ہو گیا، مرنے کے بعد لا الہ الا اللہ کی تلقین مفید نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد میت کو دفن کر کے قبر پر تلقین کا ثبوت کسی بھی صحیح حدیث سے نہیں ملتا۔ شوافع کے ہاں جو اس کو مستحب کہا گیا ہے اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ہمارے ہاں جو لوگ یہ تلقین کرتے ہیں وہ حنفی ہیں اور حنفی مذہب میں بھی اس کا کوئی جواز نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”تلقین کی صورت یہ ہے کہ حالت نزع کے وقت موت کے غرغرے سے پہلے اونچی آواز میں اس کے پاس کہا جائے، جسے وہ سن لے ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ یہ نہ کہا جائے کہ کلمہ پڑھ (بلکہ صرف پڑھا جائے) اور یہ جو تلقین موت کے بعد ہوتی ہے ہمارے نزدیک ظاہر الروایۃ وہ نہ کی جائے جیسا کہ عینی شرح الہدایۃ اور معراج الدراریۃ میں ہے۔“ [فتاویٰ عالمگیری (۱/۱۵۷)]

علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس تلقین سے مقصود ”میت کا آخری کلام کلمہ شہادت ہو“ یہ قبر کے اوپر تلقین کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔“ یہ تلقین جو مرنے کے بعد ہوتی ہے وہ ہمارے نزدیک ظاہر الروایۃ میں جائز نہیں۔“ [البنایۃ فی شرح الہدایۃ (۳/۲۰۷)]

علامہ علاء الدین الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”قریب المرگ کو کلمہ شہادت کی تلقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے کی جائے کہ اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ میت سے مراد یہاں وہ شخص ہے جس پر جان کنی کا وقت ہو اس لیے کہ اس کی موت قریب ہے۔ اسے میت قریب الموت ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔“ [بدائع الصنائع (۱/۴۴۳)]

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ یہ عمل کتاب و سنت کے علاوہ فقہ حنفیہ کی ظاہر الروایۃ کے اعتبار سے بھی ثابت نہیں لہذا جو بھی اس پر عمل کرتے ہیں وہ قرآن و سنت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی مخالفت کر رہے ہیں۔



قبروں کے مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

قبر پر قرآن پڑھنا

(سوال) قبروں پر قرآن مجید پڑھنا کیا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) میت کی تدفین کے بعد قبر پر جا کر قرآن خوانی کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ مثلاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے جب قبرستان والوں کے لیے کچھ کہنے کا سوال کیا تو آپ ﷺ نے صرف ایک دعا سکھائی، قرآن پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس بات کی مزید تائید رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

« لَا تَجْعَلُوا بِيُوتِكُمْ مَقَابِرَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ »

[مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب استحباب صلاة النافلة في بيته و جوازها في المسجد (۷۸۰)]

”اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ، بے شک شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان سورہ بقرہ پڑھنے کی جگہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:

« صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوها قُبُورًا » [مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها: باب

استحباب صلاة النافلة في بيته و جوازها في المسجد (۷۷۷)]

”اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انھیں قبریں نہ بناؤ۔“

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی اسی طرح قرآن بھی نہیں پڑھا جائے گا۔ لہذا یہ عمل جو آج کل عوام میں رائج ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

میت کے لیے دعا کا حکم

(سوال) کیا میت کے لیے دعا کی غرض سے قبر پر کھڑا ہونا یا بیٹھنا درست ہے؟

(جواب) زیارت قبور شرعاً جائز ہے اور اس کا مقصود فکر آخرت ہے تاکہ آدمی قبرستان میں حاضر ہو کر عبرت پکڑے کہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور میں اس حیات مستعار میں اپنی اخروی زندگی کے لیے ایسے اعمال صالحہ سرانجام دے لوں کہ وہاں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ جب بھی کوئی آدمی قبرستان میں جائے تو اسے چاہیے کہ آخرت یاد کرے اور مرنے والوں کے لیے بخشش کی دعا کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَدْ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ قَدْ أُذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ فزُورُوهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ
الْآخِرَةَ » [ترمذی، کتاب الجنائز: باب ما جاء في الرخصة في زيارة القبور (۱۰۵۴)، مسلم (۹۷۷)]
”میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب محمد (ﷺ) کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت مل گئی، لہذا تم
اب قبروں کی زیارت کرو، یہ آخرت یاد دلاتی ہیں۔“
رسول اللہ ﷺ نے قبرستان جا کر یہ دعا پڑھنے کے لیے بتلائی:

« السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لِلْآحِقُونَ أَسْأَلُ اللَّهَ
لَنَا وَلَكُمْ الْعَافِيَةَ » [مسلم، کتاب الجنائز: باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها (۹۷۵)]
”اس بستی کے رہنے والے مومنو! اور مسلمانو! تم پر سلامتی ہو اور بے شک ہم اگر اللہ نے چاہا تو تمہارے ساتھ ملنے
والے ہیں، ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت طلب کرتے ہیں۔“

عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے ہو کر کہتے:
« اِسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ وَ اَسْأَلُوا لَهُ بِالتَّيْبِ فَإِنَّهُ يُسْأَلُ » ”اپنے بھائی کے لیے بخشش کی دعا کرو اور اس کے لیے
ثابت قدمی مانگو، اس سے اب سوال کیا جا رہا ہے۔“ (ابوداؤد، کتاب الجنائز: باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت
الانصراف (۳۲۲۱)، حاکم (۳۷۰/۱)]

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان جا کر ان کے لیے بخشش کی دعا کرے اور اللہ تعالیٰ سے عافیت و مثبتیت کا سوال
کرے۔ یاد رہے کہ مردوں کے لیے بخشش کی دعا کا تو جواز ہے لیکن مردوں سے حاجتیں مانگنا، مرادیں پوری کروانا، نفع و
نقصان کے حصول کے لیے فریاد کرنا، ان کے نام پر قبروں کے نزدیک جانور ذبح کرنا، نذر نیا دینا اور چڑھاوے چڑھانا
ناجائز و حرام ہیں، ان کے جواز کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔

جو لوگ قبرستان میں جا کر ان سے حاجت طلب کرتے ہیں اور انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر پکارتے ہیں، ان سے
اولادیں طلب کرتے اور رزق مانگتے ہیں، انہیں اپنی آفات و بلیات میں غائبانہ پکارتے ہیں، وہ صریح شرک کا ارتکاب کرتے
ہیں اور اکثر عورتیں جو زیارت قبر کو جاتی ہیں ان کا کثرت کے ساتھ قبروں کی زیارت کرنا اللہ کی لعنت کا حق دار ٹھہرنا ہے۔
پھر وہاں جا کر جو خلاف شرع امور سرانجام دیتی ہیں اور جعلی پیروں کے سامنے بے حجاب آتی جاتی ہیں، یہ بھی بالکل حرام اور
ناجائز ہے۔ لہذا قبرستان جا کر مسنون عمل کے سوا کوئی کام نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل توحید زندہ و مردہ، مرد و زن، چھوٹے
بڑوں کو معاف فرمائے اور درجات کی بلندی کرے اور جنت الفردوس میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں جگہ دے۔ (آمین!)

میت کے سرہانے سورۃ بقرہ پڑھنا

(سوال) ہمارے ہاں کسی مردہ کو دفن کرنے کے بعد قبر کے سرہانے سورۃ بقرہ کا پہلا رکوع اور قبر کی پائنتی کی جانب سورۃ بقرہ کا

آخری رکوع پڑھنا رائج ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں بتائیں کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟

(جواب) میت کو دفن کرنے کے بعد قبر کے سرہانے سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پاؤں کی جانب آخری آیات جو تلاوت کی جاتی ہیں اس کی بنیاد ایک ضعیف روایت پر ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے ”کتاب الجنائز، باب دفن المیت (۷۱۷۱)“ میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «إِذَا مَاتَ أَحَدُكُمْ فَلَا تَحْسِبُوهُ وَأَسْرِعُوا بِهِ إِلَى قَبْرِهِ وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِهِ فَاتِحَةُ الْبَقْرَةِ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقْرَةِ» [رواه البيهقي في شعب الايمان وقال: والصحيح انه موقوف عليه]

”جب تم میں سے کوئی آدمی وفات پا جائے تو اس کو روک کر نہ رکھو بلکہ اسے اس کی قبر کی طرف جلدی لے چلو اور اس کے سر کی جانب سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اور پاؤں کی جانب سورہ بقرہ کی آخری آیات پڑھی جائیں۔“

اسے بیہقی نے شعب الايمان میں روایت کیا ہے اور کہا ہے: ”صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔“

صاحب مشکوٰۃ نے امام بیہقی کی شعب الايمان سے روایت نقل کر کے آگے امام بیہقی کا اس پر جو حکم نقل کیا ہے، یہ ہمیں شعب الايمان میں نہیں ملا۔ کیونکہ یہ روایت شعب الايمان میں ”باب فی الصلوة علی من مات من أهل القبلة، فصل فی زیارة القبور (۹۲۹۴) (۱۶/۷)“ میں موجود ہے، اس پر امام بیہقی نے لکھا ہے: ”وَلَمْ يُكْتَبْ إِلَّا بِهَذَا الْإِسْنَادِ فِيمَا أَعْلَمُ وَقَدْ رَوَيْنَا الْقِرَاءَةَ الْمَذْكُورَةَ فِيهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَوْقُوفًا عَلَيْهِ“ ”میرے علم کے مطابق یہ روایت اسی سند کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس میں مذکورہ قراءت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت کی گئی ہے۔“ اور یہ السنن الکبریٰ بیہقی ”باب ماورد فی قراءة القرآن عند القبر (۵۶/۴)“ میں بھی موجود نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ مرفوع روایت شعب الايمان کے علاوہ ”طبرانی کبیر (۲/۲۰۸/۲) اور امام خلال کی ”کتاب القراءة عند القبور (ق) (۲/۲۵)“ میں مروی ہے جیسا کہ علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے مشکوٰۃ کی تحقیق ثانی (۲/۲۲۳) میں ذکر کیا ہے، اس کی سند میں یحییٰ بن عبد اللہ بن الضحاک البالی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں ”واہ“ کزور راوی ہے۔ ازدی کہتے ہیں: ”الضُّعْفُ عَلٰی حَدِيثِهِ بَيْنَ“ اس کی روایت میں کزوری واضح ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں: ”لَا يُعْتَدُّ بِهِ“ اسے شمار نہ کیا جائے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں یہ ثقہ راویوں سے مفصل روایت بیان کرتا ہے اور ان میں وہم کا شکار ہو جاتا ہے اور جس روایت میں یہ متفرد ہو اس میں ساقط الاحتجاج ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی روایت میں ضعف نمایاں ہے۔ [تہذیب التہذیب (۱۵۳/۶)، المغنی فی الضعفاء (۲/۵۲۱) میزان الاعتدال (۳۹۰/۴)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ضعیف ہے۔“ (تقریب مع تحریر (۹۱/۴) اسی طرح اس کا استاذ ایوب بن نہیک الحلی مولیٰ آل سعد بن ابی وقاص بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اسے ابو حاتم وغیرہ نے ضعیف اور ازدی نے متروک قرار دیا ہے۔) (میزان الاعتدال (۲۹۴/۱))

امام ذہبی ”المغنی فی الضعفاء (۱۵۱/۱) میں لکھتے ہیں: ”ترکوه“ محدثین نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ ابن ابی حاتم رازی فرماتے ہیں: ”سَمِعْتُ أَبَا زُرْعَةَ يَقُولُ: لَا أُحَدِّثُ عَنْ أَيُّوبَ بْنِ نَهْيِكٍ لَمْ يُقْرَأْ عَلَيْنَا حَدِيثُهُ وَقَالَ هُوَ مُنْكَرٌ

الْحَدِيثِ“ (الحرح والتعديل (۲/۲۵۹) ”میں نے ابو زرہ رازی سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ میں ایوب بن نہیک سے روایت بیان نہیں کرتا اس کی روایت انھوں نے ہم پر نہیں پڑھی اور فرمایا وہ منکر الحدیث ہے۔“

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ اب رہا اس کا موقوف ہونا تو یہ موقوفاً بھی صحیح ثابت نہیں۔ امام بیہقی سے صاحب مشکوٰۃ نے جو اس کا موقوفاً صحیح ہونا نقل کیا ہے، تو امام صاحب نے یہ فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث بجائے مرفوع کے موقوف ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس کی موقوف سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ روایت السنن الکبریٰ بیہقی (۴/۵۶) میں ”عبدالرحمن بن العلاء بن اللجلاج عن ابیہ“ کے طریق سے مروی ہے کہ العلاء بن اللجلاج نے اپنے بیٹوں سے کہا جب تم مجھے میری قبر میں داخل کرنے لگو تو مجھے لحد میں رکھو اور کہو ”بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلَىٰ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ“ اور میرے اوپر مٹی ڈالو اور میرے سر کے نزدیک سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھو، میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا وہ اسے مستحب سمجھتے تھے۔“ علامہ زیلعی نے نصب الراية (۲/۳۰۲) میں اور علامہ بیہقی نے ”مجمع الزوائد (۳/۴۲۳)“ میں طبرانی کبیر (۲۹/۲۲۰) کے حوالے سے یہ روایت درج کی ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ”فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ ذَلِكَ“ ”میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنی“ اس پر علامہ زیلعی نے سکوت اختیار کیا ہے اور علامہ بیہقی نے کہا ہے: ”رِجَالُهُ مُؤْتَفِقُونَ“ اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے۔

لیکن یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح نہیں کیونکہ اس میں عبدالرحمن بن العلاء بن اللجلاج شامی مجہول ہے، اس سے مبشر بن اسماعیل الکحلی کے سوا کسی نے روایت نہیں کی۔ (میزان الاعتدال (۲/۵۷۹) حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے تقریب (۵/۳۹۷) میں اسے مقبول لکھا ہے اور شعيب الرناؤط نے تحرير تقريب التهذيب (۷/۳۴۲) میں کہا ہے کہ یہ مجہول ہے اور اسے روایت کرنے میں مبشر بن اسماعیل الکحلی متفرد ہے۔ شیخ البانی مشکوٰۃ (۲/۲۲۳) تحقیق ثانی میں رقمطراز ہیں: ”والموقوف لا یصح اسنادہ فیہ عبد الرحمن بن العلاء بن اللجلاج وهو مجہول“ ”موقوف کی سند صحیح نہیں، اس میں عبدالرحمن بن العلاء بن اللجلاج مجہول ہے۔“ مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس روایت کی بنیاد پر سورۃ بقرہ کے پہلے اور آخری رکوع کا پڑھنا رواج ہوا ہے وہ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی کوئی صحیح سند موجود ہے اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تَقْرَأُ فِيهِ سُورَةَ الْبَقَرَةِ »

[مسلم، کتاب صلوة المسافرین : باب استحباب صلوة النافلة فی بیتہ و جوازها فی المسجد (۷۸۰)]

”اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ یقیناً شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھروں میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے نہ کہ قبرستان میں۔ یہ حدیث بالکل اسی طرح ہے جیسے دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ وَلَا تَخَذُوهَا قُبُورًا» (صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین: باب استحباب صلوة

النافلة فی بیتہ (۷۷۷)

”اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور انھیں قبریں نہ بناؤ۔“

معلوم ہوا جیسے قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جاتی اسی طرح قرآن بھی نہیں پڑھا جائے گا، لہذا مذکورہ رواج پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قبر سے سورۃ الملک پڑھنے کی آواز آنا

(سوال) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک صحابی نے لاعلمی میں ایک قبر پر خیمہ گاڑ لیا، اندر سے سورۃ ملک پڑھنے کی آواز آئی، صاحب قبر نے اول سے آخر تک اس سورت کی تلاوت کی، آپ رضی اللہ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ سورت عذاب قبر روکنے والی اور اس سے نجات دینے والی ہے۔“ (ترمذی) کیا یہ حدیث صحیح ہے؟

(جواب) یہ روایت ترمذی شریف ابواب فضائل القرآن: باب ما جاء فی فضل سورة الملك (۲۸۹۰) اور مشکوٰۃ (۲۱۵۴) اور اثبات عذاب القبر للبيهقي (۱۴۶) میں موجود ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں: ”فَرَدَّ بِهِ يَحْيَىٰ بْنُ عَمْرٍو بْنِ مَالِكٍ وَهُوَ ضَعِيفٌ“ ”اس کے بیان کرنے میں یحییٰ بن عمرو بن مالک متفرد ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔“

علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر الدر المنثور (۲۶۶/۶) میں، حاکم، ترمذی، ابن مردویہ، ابن نضر اور دلائل النبوة از بیہقی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے۔ (نیز دیکھیں: کتاب الروح (ص ۱۲۸)، جامع الاصول (۳۶۵/۹)، تحفة الذاکرین از شوکانی (ص ۲۷۲))

اس روایت کے راوی یحییٰ بن عمرو بن مالک النکری البصری کو امام یحییٰ بن معین، امام ابو زرہ امام ابو داؤد، امام نسائی اور دولابی نے ضعیف کہا ہے اور حماد بن زید نے کذب کی تہمت دی ہے۔ امام عقیلی فرماتے ہیں: ”اس کی روایت کی متابعت نہیں کی جاتی۔“ امام احمد فرماتے ہیں: ”یہ کوئی چیز نہیں ہے۔“ امام ساجی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”یہ منکر الحدیث ہے۔“

[تہذیب التہذیب (۱۶۵/۶)، المغنی فی الضعفاء (۵۲۵/۲)، الحرج والتعدیل (۷۳۲/۹)، میزان الاعتدال (۳۹۹/۴)، الضعفاء الکبیر (۴۲/۴)]

لہذا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

پکی قبریں بنانا

(سوال) آج کل پکی قبریں بنانے کا خوب رواج ہے کیا ایسا کرنا شرعی اعتبار سے درست ہے؟

(جواب) پکی قبریں بنانا اسلام میں قطعاً ناجائز ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُحَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُقَعَّدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُنْبَى عَلَيْهِ »
 [مسلم، کتاب الجنائز: باب النهی عن تحصيص القبر (۹۷۰)، ابو داؤد (۳۲۲۵)]
 ”رسول اللہ ﷺ نے پختہ قبریں بنانے اور ان پر بیٹھنے اور عمارت تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔“
 اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کچی قبریں بنانا اور ان پر عمارت تعمیر کرنا ناجائز و ممنوع ہے۔

قبروں پر مسجدیں بنانا

سوال قبر پر مسجد بنالینا کیسا ہے؟

جواب قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب
 ما يكره من اتخاذ المساجد على القبور (۱۳۳۰)]
 ”اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔“
 ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عیسائیوں کے متعلق فرمایا:

”ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہوتا ہے تو یہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک مخلوق میں
 سے بدترین لوگ ہیں۔“ [بخاری، کتاب الجنائز: باب بناء المسجد على القبر (۱۳۴۱)]
 امام ابن حجر عسقلانی نے قبروں کو مسجدیں بنالینا کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔ [الزواجر (۱/۱۲۰، ۱۲۱)]

قبر کی اونچائی

سوال قبر کی اونچائی صحیح حدیث کے مطابق کتنی ہونی چاہیے؟

جواب سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے لحد (قبر کے ایک طرف جو خلا ہوتا ہے) بنائی گئی، اس پر کچھ
 اینٹیں نصب کی گئیں اور آپ ﷺ کی قبر زمین سے تقریباً ایک باشت بلند کی گئی۔ [صحیح ابن حبان (۲۱۶۰)]
 اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ قبر سے نکلنے والی مٹی ہی اوپر ڈالی جائے، اسے کوہان نما بنایا جائے اور
 مزید مٹی ڈال کر اسے اونچا نہ کیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

عورتوں کا قبرستان جانا

سوال عورتوں کا قبرستان جانا کیسا ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ نے کثرت کے ساتھ قبرستان جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔

ابن ماجہ (۱۵۷۳، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶) میں ابو ہریرہ، ابن عباس اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں۔ البتہ اگر صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں، جزع و فزع اور داویلا نہ کریں، رونے دھونے سے باز رہیں اور شرعی آداب کا لحاظ رکھیں تو پھر کبھی کبھار جانے کی رخصت معلوم ہوتی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یقیق میں جانا صحیح مسلم (۹۷۴/۱۰۳) اور نسائی (۲۰۳۹) وغیرہ میں موجود ہے، اس سے نبی اممہ حدیث نے عورت کے لیے زیارت قبر کے جواز کی دلیل لی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو قبرستان میں جا کر دعا کرنا سکھلایا ہے۔ قصہ مختصر عورت کبھی کبھار زیارت قبور کو جاسکتی ہے اگر وہ شرعی پابندیاں ملحوظ خاطر رکھے وگرنہ نہیں اور عصر حاضر میں عورتیں اکثر بن سنور کر قبروں پر جاتی ہیں اور وہاں رونا دھونا اور داویلا بھی کرتی ہیں، اس لیے ان کا زیارت قبور کو جانا درست نہیں، پھر یہ کثرت سے حاضری دیتی ہیں جو لعنت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ (آمین!)



جنازہ کے متفرق مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا

(سوال) کیا میت کو دیکھ کر کھڑے ہونا جائز ہے؟

(جواب) نبی ﷺ نے مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست کی جب بنیاد رکھی تو اس کے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی احکام نازل ہوئے۔ کئی ایسے تھے جن پر پہلے عمل تھا لیکن بعد میں ان میں تغیر و تبدل ہوا۔ مثال کے طور پر پہلے آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر آپ ﷺ کی دلی خواہش پر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اسی طرح شروع شروع میں شراب کی کلی ممانعت نہ تھی لیکن بعد میں اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح پہلے جب آپ ﷺ کے پاس سے کوئی جنازہ گزرتا تو آپ ﷺ اسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ یہودی اور یہودیہ کی میت کے لیے بھی کھڑے ہوئے۔ جب سے کہا گیا کہ آپ ﷺ یہودی کے جنازہ کے لیے کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا اس میں جان نہ تھی۔“ [بخاری، کتاب الجنائز: باب من قام لحنازة يهودى (۱۳۱۱) مسلم (۹۶۱)]

آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی فرمایا:

”جب تم جنازہ دیکھو تو اس کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور جو ساتھ چل رہا ہو، وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک اسے زمین پر نہ رکھ دیا جائے۔“ [بخاری، کتاب الجنائز: باب من تبع جنازة فلا يقعد حتى توضع (۱۳۱)، مسلم (۹۵۹)]

لیکن اس کے بعد نبی ﷺ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«قَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَنَازَةٍ فَقَمْنَا ثُمَّ جَلَسَ فَجَلَسْنَا» [مسلم، کتاب الجنائز:

باب نسخ القيام للحنازة (۹۶۲) مسند احمد (۸۳، ۸۲/۱)، ابو داؤد (۳۱۷۵)]

”رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے لیکن پھر بیٹھ گئے تو ہم بھی بیٹھ گئے۔“

اور موطا مالک میں یہ الفاظ ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُومُ فِي الْحَنَائِزِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدُ» [موطا (۲۳۲/۱)]

”رسول اللہ ﷺ (پہلے) جنازے کے لیے کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔“

واقہ بن عمرو بن سعد بن معاذ نے کہا: ”میں بنو سلمہ کے ایک جنازہ میں حاضر ہوا، میں کھڑا ہوا تو نافع بن جبیر نے کہا:

”بیٹھ جایے، میں تمہیں عنقریب اس کے متعلق ایک حدیث بتاؤں گا۔“ پھر بیان کیا: ”مجھے مسعود بن الحکم الرزقی نے بتایا کہ

انھوں نے سیدنا علیؓ کو کوفہ میں کہتے ہوئے سنا، وہ فرما رہے تھے:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَنَا بِالْقِيَامِ فِي الْجَنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذَلِكَ وَ أَمَرَنَا

بِالْحُلُوسِ » [احمد (۸۲/۱)، (۶۲۳)، بیہقی (۲۷/۴)، کتاب الاعتبار للحازی (۹۱)]

”آب ﷺ نے ہمیں جنازہ کے لیے کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا، اس کے بعد آپ ﷺ بیٹھے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔“

ان احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ عبدالرحمن مبارک پوری ”کتاب الجنائز (۳۶)“ اور علامہ البانیؒ ”احکام الجنائز (۷۷)“ میں لکھتے ہیں کہ قیام پہلے مشروع تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ اور علامہ شوکانی نے امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب نسخ کا نقل کیا ہے جب کہ امام احمد، امام اسحاق بن راہویہؒ کا عدم نسخ کا۔ یعنی یہ لوگ نسخ کے قائل نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جواز کے طور پر ہے۔

سوگ کا مسنون طریقہ

(سوال) یہ جو ہمارے ہاں رائج ہے کہ مردہ کی تدفین کے بعد وارثین مردہ کے گھر کے باہر چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور تعزیت کے لیے آنے والے فاتحہ خوانی کے لیے کہتے ہیں اور تمام حاضرین ہاتھ اٹھا کر فاتحہ خوانی کرتے ہیں اور اسی طرح تین دن ایسے ہی چٹائیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں اور لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور وارثین مردہ تمام کاروبار چھوڑ کر بیٹھ رہتے ہیں، اس کی کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں، نیز کتاب وسنت کی روشنی میں تعزیت اور سوگ کا صحیح طریقہ بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(جواب) کسی آدمی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد تعزیت کے لیے کسی خاص جگہ، گھر، مسجد اور دارہ (ڈیرا، چوپال، بیٹھک اور مقبرہ) وغیرہ کا تعین کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ عبداللہ الجلیؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

« كُنَّا نَعُدُّ الْاجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَ صَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النَّيَاحَةِ » (مسند احمد (۶۹۰۵)، ابن ماجہ (۱۶۱۲)، المسند الجامع (۴/۴۹۷))

”ہم میت کے دفن کے بعد اہل میت کی طرف اکٹھا ہونا اور کھانا پکانا نوحہ میں سے شمار کرتے تھے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کے گھر مرگ ہو جائے وہاں اکٹھا ہونا اور کھانا پکانا صحابہ کرام جنہم نوحہ میں شمار کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کھانا اگرچہ کسی اور نے بھیجا ہو میت والے گھر بیٹھ کر کھانا حرام ہے، دور سے آنے والے مہمان بھلے کھالیں لیکن قریبی محلہ دارگریز کریں اور دیر تک نہ بیٹھا جائے، بلکہ تعزیت کر کے جلدی اٹھ جائے تاکہ اجتماع کی شکل پر اس حدیث کی زد میں نہ آجائے۔

علامہ البانیؒ اہل میت کے ہاں بعض امور سے اجتناب کے بارے لکھتے ہوئے کہتے ہیں: ”الْاجْتِمَاعُ لِلتَّعْزِيَةِ

فِي مَكَانٍ خَاصٍّ كَالدَّارِ أَوْ الْمَقْبَرَةِ، وَالْمَسْجِدِ“ (احکام الجنائز (ص: ۲۰۱))

”کسی خاص مکان جیسے گھر، مقبرہ یا مسجد میں تعزیت کے لیے اجتماع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

پھر اس کے بعد جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ حدیث بیان کرتے ہیں اور اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”وَ أَكْرَهُ الْمَأْتَمَ وَ هِيَ الْجَمَاعَةُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ بُكَاءٌ فَإِنَّ ذَلِكَ يُحَدِّدُ الْحُزْنَ وَيُكَلِّفُ الْمُؤَنَّةَ مَعَ مَا مَضَى فِيهِ مِنَ الْأَثَرِ“ (کتاب الام، باب القيام للحنازة ۳۱۸/۱)

”میں ماتمی اجتماع کو مکروہ سمجھتا ہوں اگرچہ ان کے لیے آہ و بکا نہ ہو کیونکہ یہ چیز غم کو تازہ کرتی ہے اور تکلیف کو بڑھاتی ہے، اس لیے کہ اس بارے حدیث گزر چکی ہے۔“

امام اسحاق بن ابراہیم بن ہانی جو امام احمد ابن حنبل کے اجل تلامذہ میں سے تھے، کہتے ہیں: ”سُئِلَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ رَحِمَهُ اللَّهُ عَنِ الْبَيْتُوتَةِ عِنْدَ أَهْلِ الْمَيِّتِ قَالَ: أَكْرَهُهُ“ (مسائل ابن ہانی ۹۶۱)

امام احمد سے اہل میت کے ہاں رات بسر کرنے کے بارے سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا: ”میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں۔“

امام رافعی ”شرح الوجیز“ میں تعزیت کے بارے لکھتے ہیں:

”هِيَ سُنَّةٌ وَ يُكْرَهُ الْجُلُوسُ لَهَا“

”تعزیت کرنا سنت ہے اور اس کے لیے بیٹھنا مکروہ ہے۔“ (روضۃ الطالبین ۱۴۴/۲)

امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”أَمَّا الْجُلُوسُ لِلتَّعْزِيَةِ فَنَصَّ الشَّافِعِيُّ وَالْمُصَنِّفُ وَسَائِرُ الْأَصْحَابِ عَلَى كَرَاهِيَتِهِ وَنَقَلَهُ الشَّيْخُ أَبُو حَامِدٍ فِي التَّلْبِيْقِ وَآخَرُونَ عَنْ نَصِّ الشَّافِعِيِّ قَالُوا يَعْنِي بِالْجُلُوسِ لَهَا أَنْ يُجْتَمَعَ أَهْلُ الْمَيِّتِ فَيَقْصِدُ هُمْ مَنْ أَرَادَ التَّعْزِيَةَ قَالُوا بَلْ يَنْبَغِي أَنْ يَنْصَرِفُوا فِي حَوَائِجِهِمْ فَمَنْ صَادَفَهُمْ عَزَا بِهِمْ وَلَا فَرْقَ بَيْنَ الرَّجَالِ وَالنِّسَاءِ فِي كَرَاهَةِ الْجُلُوسِ لَهَا“ (المجموع ۳۰۶/۵)

خلاصہ کلام اس عبارت کا یہ ہے کہ امام شافعی اور صاحب کتاب اور دیگر اصحاب شوافع تعزیت کے لیے بیٹھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اہل میت اپنی ضروریات اور کاموں میں لگے رہیں اور جو آدمی انھیں ملے ان سے تعزیت کر لیں، مردوں اور عورتوں کے لیے تعزیت کے لیے بیٹھنے کی کراہت میں مجموعی فرق نہیں یعنی تعزیت کی خاطر عورتیں اکٹھی ہو کر بیٹھیں یا مرد دونوں کے لیے مکروہ ہے۔ امام ابوالمظفر ابن ہبیرہ لکھتے ہیں:

”فَأَمَّا الْجُلُوسُ لِلتَّعْزِيَةِ فَقَالَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ هُوَ مَكْرُوهٌ وَلَمْ نَجِدْ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ نَصًّا فِي هَذَا“ (الافصاح عن معانی الصحاح ۱۵۱/۱)

”تعزیت کے لیے بیٹھنے کو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے مکروہ قرار دیا ہے اور امام ابوحنیفہ سے اس کے متعلق ہمیں کوئی نص نہیں ملی۔“

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ تعزیت کے لیے جو رواجی طریقہ موجود ہے اس کے بارے کوئی صحیح حدیث، اثر صحابی اور ائمہ

اربعہ وغیرہ سے جواز کہیں بھی مروی نہیں بلکہ ائمہ محدثین کے ہاں یہ مکروہ ہے اور جب مطلق طور پر مکروہ کا لفظ بولا جائے تو حرام ہی مراد ہوتا ہے جیسا کہ کتب فقہ میں مرقوم ہے اور تعزیت کے لیے تین دنوں کا تعین بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں، عوام میں جو یہ روایت متداول ہے: ”لَا عَزَاءَ فَوْقَ ثَلَاثِ“ ”تین دنوں سے اوپر تعزیت نہیں“ اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے کیونکہ صحیح حدیث میں تین دنوں کے بعد تعزیت ثابت ہے۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَهَلَ آلَ جَعْفَرٍ ثَلَاثًا أَنْ يَأْتِيَهُمْ ثُمَّ آتَاهُمْ » [ابوداؤد، کتاب

الترجل: باب في حلق الرأس (٤١٩٢)، مسند احمد (٢٧٩/٣) (١٧٥٠) طبقات ابن سعد (٣٧٠، ٣٦٦/٤)،

نسائی کبری (٨٦٠٤)، الآحاد والمثاني (٤٣٤)، سنن النسائي (٥٢٤٢)]

”بے شک نبی ﷺ آل جعفر کے ہاں آنے سے تین دن تک رکے رہے پھر اس کے بعد ان کے ہاں آئے۔“

معلوم ہوا کہ تعزیت کے لیے تین دن خاص نہیں ہیں بلکہ تین دنوں کے بعد بھی جب مناسب خیال کرے تعزیت کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جعفر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد ان کے گھر والوں کے ہاں آنے سے تین دن تک رکے رہے پھر تشریف لائے۔ تعزیت ایسے الفاظ سے کرے جو اہل میت کے لیے تسلی کا باعث ہوں اور ان کے غم و دکھ کو ہلکا کریں اور انھیں صبر و تحمل پر ابھارے۔ نبی اکرم ﷺ جب کسی کیلئے تعزیت کرتے تو اسے صبر و تحمل اور نیکی کے کاموں کی تلقین کرتے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی طرف ان کی بیٹی نے پیغام بھیجا کہ میرا بیٹا وفات کے قریب ہے آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں تو آپ نے سلام بھیجا اور کہا:

« إِنَّ لِلَّهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أُعْطِيَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمًّى » (بخاری، کتاب الجنائز: باب

قول النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْذِبُ الْمَيِّتَ بِبَعْضِ بَكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ (١٢٨٤) مسند طيالسي (٦٣٦)،

مسلم (٩٢٣)، ابوداؤد (٣١٢٥)، ابن ماجه (١٥٨٨)، نسائي (١٨٦٧)، ابن حبان (٤٦١)، شرح السنة

(١٥٢٧) (٤٢٦/٥)]

”یقیناً اللہ کے لیے ہے جو اس نے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے عطا کیا اور ہر چیز کا اس کے ہاں وقت مقرر ہے (اس

لیے تم صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو)۔“

یہ تعزیت کے الفاظ اگرچہ قریب المرگ کے بارے وارد ہوئے ہیں لیکن مرنے والے کے حق میں زیادہ اولیٰ ہیں، اس لیے امام نووی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے ”وأحسن ما يعزى به“ یہ حدیث زیادہ بہتر ہے ان کلمات کے بارے جن سے تعزیت کی جاتی ہے۔ (کتاب الاذکار (٤٦٧)

اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ تعزیت کر لے اور اگر یہ الفاظ یاد نہ ہوں تو جو الفاظ تسلی و صبر کے لیے مناسب سمجھے کہہ دے۔ سلف صالحین سے مختلف حسب حال الفاظ منقول ہیں جن کی تفصیل کے لیے امام نووی کی کتاب الاذکار (٢٠١٣، ١٩٩) ملاحظہ ہو: وہ لکھتے ہیں:

”أَمَّا لَفْظَةُ التَّعْزِيَةِ فَلَا حَجَرَ فِيهِ فَبِأَيِّ لَفْظٍ عَزَاهُ حَصَلَ“

”تعزیت کے لیے الفاظ میں کوئی تنگی نہیں جس بھی لفظ سے تعزیت کر لے مقصد حاصل ہو جائے گا۔“ نیز دیکھیں

احکام الجنائز للشیخ البانی (ص ۲۰۶)

لہذا اہل میت تین دن تک چٹائیاں بچھا کر اس غرض سے نہ بیٹھے رہیں کہ تعزیت کیلئے لوگ آئیں گے بلکہ وہ اپنے کام کریں، جو شخص بھی تعزیت کیلئے ملے اس سے ہم کلام ہو اور تعزیت کرنے والے مناسب حال الفاظ سے صبر و تحمل وغیرہ کی تلقین کریں۔ یہ بھی یاد رہے کہ میت کے لیے فاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب ہبہ کرنا بھی نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔

جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے باواز بلند ذکر کرنا

(سوال) جیسا کہ عموماً جنازوں میں دیکھا جاتا ہے کہ میت کے ساتھ بہ آواز بلند کلمہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کیا قرآن وحدیث سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟

(جواب) نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی بھی صحیح حدیث میں جنازے کے ساتھ ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا ثابت نہیں بلکہ اس کی کراہت منقول ہے۔ سیدنا قیس بن عماد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«كَانَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُونَ رَفْعَ الصَّوْتِ عِنْدَ الْجَنَائِزِ»

[بیہقی (۷۴/۷)]

”نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں کے پاس آواز بلند کرنا ناپسند کرتے تھے۔“

امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جان لیجیے! صحیح اور مختار بات اور جس پر سلف صالحین تھے وہ یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے خاموشی ہو۔“

جنازے کیساتھ آواز نہ قراءت کے ذریعے بلند کی جائے اور نہ ذکر وغیرہ ہی کیساتھ۔ [کتاب الأذکار (ص ۲۰۳)]

اس صراحت سے بھی معلوم ہوا کہ جنازے کے ساتھ ذکر و اذکار یا قراءت وغیرہ کی آواز بلند کرنے کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا۔ جو کام نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنا

(سوال) آج کل اہل میت کے ہاں مہمانوں کی طرح کھانا پیش کیا جاتا ہے کیا یہ درست ہے یا خود میت والوں کے لیے کھانا تیار کرنا چاہیے؟

(جواب) قرہمی رشتہ داروں یا پڑوسیوں کو چاہیے کہ جن کا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو ان کے کھانے کا بندوبست کریں۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اصْنَعُوا لِي لَالٍ جَعْفَرٌ طَعَامًا فَقَدْ آتَاهُمْ مَا

يَسْغَلُهُمْ» [مستدرک حاکم (۳۷۲/۱)]

”جب حضرت جعفر طیار کی وفات کی خبر آئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو، ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو ان کو مشغول رکھے گی۔“

اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا

جریر بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«كُنَّا نَرَى الْإِجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَ صُنْعَةَ الطَّعَامِ مِنَ النَّيَّاحَةِ» [مسند احمد (۶۹۰۵)]

”ہم اہل میت کے ہاں جمع ہونا اور وہاں کھانا تیار کرنے کو نوحہ شمار کرتے تھے۔“

شیخ احمد شاہ رحمہ اللہ، مسند احمد کے حاشیہ پر رقمطراز ہیں:

”صنعة الطعام“ کا مطلب یہ ہے کہ اہل میت ان لوگوں کے لیے جو ان کے ہاں تعزیت کے لیے آتے ہیں کھانا تیار کریں..... حالانکہ سنت یہ ہے کہ لوگ اہل میت کے لیے کھانا تیار کریں نہ کہ اہل میت لوگوں کے لیے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب جعفر رحمہ اللہ شہید ہوئے تو کہا تھا: ”آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرو۔“ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ ایسے کھانے کے متعلق فرماتے ہیں:

”هِيَ بَدْعَةٌ قَبِيحَةٌ“ (یہ قبیح بدعت ہے) [فتح القدیر (۴۷۳/۱)]

البتہ جو مہمان دور دراز سے سفر کر کے آئیں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا درست ہے کیونکہ وہ اہل میت کے طعام

کے ضمن ہی میں آتے ہیں۔

اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دینا

سوال کیا کوئی شخص اجنبی عورت کے جنازے کو کندھا دے سکتا ہے؟

جواب جب کوئی مسلمان مرد یا عورت فوت ہو جائے تو حقوق العباد میں سے ایک حق یہ ہے کہ اس کے جنازے میں جائیں اور جنازے کو اٹھائیں۔ جنازہ اٹھانے والے اور پیچھے جانے والے مرد ہی ہوتے ہیں عورت کیلئے یہ کام مکروہ ہے۔ نبی ﷺ نے عورت کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے محرم اور غیر محرم میں فرق نہیں کیا۔ کوئی بھی مسلمان میت کو کندھا دے سکتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلَامِ وَ عِبَادَةُ الْمَرِيضِ وَ اتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَ

إِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَ تَشْمِيتُ الْعَاطِسِ» [بخاری، کتاب الجنائز: باب الأمر باتباع الجنائز (۱۲۴۰)،

مسلم (۲۱۶۲)، عمل اليوم والليلة للنسائی (۲۲۱)، ابو داؤد (۵۰۳۰)، بیہقی (۳۸۶/۳)]

”مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں، سلام کا جواب دینا، بیمار کی عیادت کرنا، جنازوں کے پیچھے چلنا، دعوت قبول

کرنا اور چھینک مارنے والے کو جواب دینا۔“

اسی طرح ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عُوذُوا الْمَرْضَى وَ اتَّبِعُوا الْحَنَائِزَ تَذَكَّرُكُمْ الْآخِرَةَ» [مسند ابی یعلیٰ (۱۱۱۹)، موارد الظمان (۷۰۹)، مسند احمد (۳۱/۳)، مسند بزار (۵۲۲)، ابن ابی شیبہ (۲۳۵/۳)، شرح السنہ (۳۸۷/۵)، الأدب المفرد (۵۱۸)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۳۷۹/۳)]

”بیماروں کی عیادت کرو، جنازوں کے پیچھے چلو، یہ تمہیں آخرت یاد دلائیں گے۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ مردوں کو جنازوں کے پیچھے جانے کا حکم ہے اور نبی ﷺ نے اس عورت کے جنازہ میں محرم و غیر محرم کی تخصیص نہیں کی، نیز عورتوں کو جنازوں کے پیچھے آنے سے منع کیا گیا ہے۔ سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«نُهِنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْحَنَائِزِ وَ لَمْ يُعَزَمْ عَلَيْنَا» [بخاری، کتاب الجنائز: باب اتباع النساء الجنائز (۱۲۷۸)، مسلم (۹۳۸)، ابوداؤد (۳۱۶۷)، ابن ماجہ (۱۵۷۷)، مسند احمد (۴۰۸/۶)، عبد الرزاق (۴۵۴/۳)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۷۷/۴)]

”ہمیں جنازوں کے پیچھے جانے سے روک دیا گیا اور ہمیں منع میں تاکید نہیں کی گئی۔“

اس سے ثابت ہوا کہ جنازوں کے ساتھ جانے کا حکم مردوں کو ہے عورتوں کو نہیں لہذا مرد ہی جنازے کو کندھا دیں گے۔ میت کو اٹھانے اور قبر میں اتارنے کے لیے محرم کی شرط کا کوئی ثبوت نہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں ”باب حمل الرجال الجنائز دون النساء“ میں بھی یہ سمجھایا ہے کہ جنازہ اٹھانا مردوں کا کام ہے عورتوں کا نہیں، بلکہ ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر محرم آدمی عورت کی میت کو قبر میں اتار سکتا ہے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«شَهِدْنَا بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا عَلَى الْقَبْرِ فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ فَقَالَ هَلْ فِيكُمْ مِنْ أَحَدٍ لَمْ يُقَارِفِ اللَّيْلَةَ؟ فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ أَنَا قَالَ فَأَنْزَلُ فِي قَبْرِهَا فَنَزَلَ فِي قَبْرِهَا فَقَبَّرَهَا» [بخاری، کتاب الجنائز: باب من يدخل قبر المرأة (۱۳۴۲)]

”ہم نبی ﷺ کی بیٹی کے جنازے میں موجود تھے، آپ ﷺ قبر پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس نے آج رات صحبت نہیں کی۔“ ابوطلمحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں نے (نہیں کی)۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اس کی قبر میں اترو۔“ تو ابوطلمحہ رضی اللہ عنہ قبر میں اترے اور انھیں قبر میں دفنایا۔“

ابوطلمحہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کو قبر میں اتارنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر محرم مرد عورت کو جب قبر میں اتار سکتا ہے تو اسے جنازے میں کندھا دینے سے کون سی چیز مانع ہے۔

تین دن کے بعد تعزیت کا حکم

(سوال) کیا تعزیت صرف تین دن تک محدود ہے یا اس کے بعد بھی اہل میت کے پاس جا کر تعزیت کی جاسکتی ہے؟

(جواب) تعزیت تین دن کے بعد بھی ہو سکتی ہے، آدمی جب بھی مفید محسوس کرے تعزیت کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا، اس کا سپہ سالار زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور کہا:

”اگر زید شہید کر دیے گئے تو تمہارے امیر جعفر رضی اللہ عنہ ہوں گے اور اگر جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو تمہارے امیر عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہوں گے۔“ اس لشکر کی جب دشمن سے ٹکرائی ہوئی تو زید رضی اللہ عنہ جھنڈا پکڑے ہوئے لڑے اور شہید ہو گئے پھر جعفر رضی اللہ عنہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، پھر عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا پکڑا اور وہ بھی لڑے اور شہید ہو گئے، پھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جھنڈا پکڑا تو اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح دے دی۔ ان کی خبر جب نبی ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ لوگوں کی طرف نکلے، اللہ کی حمد و ثنا کی اور فرمایا: ”بلاشبہ تمہارے بھائیوں نے دشمن کا سامنا کیا، زید نے جھنڈا پکڑا اور شہید ہو گئے..... پھر خالد بن ولید ”سیف من سیوف اللہ“ نے جھنڈا پکڑا تو اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح دی۔“ پھر آپ تین دن تک آل جعفر کے ہاں جانے سے رکے رہے پھر اس کے بعد ان کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ نے فرمایا: ”آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، میرے بھائی کے دونوں بیٹوں کو بلاؤ۔“ ہمیں لایا گیا۔ ہم ایسے لگتے تھے جیسے چوزے ہوتے ہیں، آپ نے فرمایا: ”سرمونڈنے والے کو بلاؤ۔“ سرمونڈنے والا لایا گیا، اس نے ہمارے سرمونڈ دیے پھر آپ نے فرمایا: ”محمد بن جعفر ہمارے چچا ابو طالب کا ہم شکل ہے اور عبد اللہ شکل اور اخلاق میں میرے مشابہ ہے۔“ پھر آپ نے میرا ہاتھ بلند کر کے دعا کی: ”اے اللہ! جعفر کے پیچھے اس کے اہل کلا والی بن جا اور عبد اللہ کے ہاتھ میں برکت دے۔“ یہ بات آپ نے تین مرتبہ کہی۔ کہتے ہیں پھر ہماری والدہ آئیں، انہوں نے ہماری یتیمی کا ذکر کیا اور آپ کو اپنا غم بتانے لگیں، آپ نے فرمایا: ”تمہیں ان کی تنگ دستی کا فکر کیوں ہے، میں دنیا اور آخرت میں ان کا سر پرست ہوں۔“ [مسند احمد (۲۰۴/۱) (۱۷۵۰) تحقیق احمد شاکر]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین دن کے بعد بھی تعزیت ہو سکتی ہے۔

جمعہ کے روز فوت ہونا

(سوال) کیا جمعہ کے دن فوت ہونے کی کوئی فضیلت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہو وہ جنتی ہوتا ہے، قرآن و سنت سے اس کی وضاحت کریں۔

(جواب) جمعہ کے دن فوت ہونے والے کے بارے میں ذکر کردہ فضیلت کا مجھے علم نہیں، البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ جنت میں داخلے کے لیے صحیح اعمال صالحہ اور خاتمہ بالخیر کی ضرورت ہے، جس شخص کا عقیدہ بالکل صحیح ہو اور وہ کسی کفر و شرک کے ارتکاب

کے بغیر اس دنیا سے چلا گیا تو اللہ اسے ضرور اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ نبی ﷺ کی کئی ایک احادیث صحیحہ میں یہ بات موجود ہے کہ جس شخص کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا اور اگر اللہ کے ساتھ شرک کیا ہو یا کسی صریح کفر کا ارتکاب کیا ہو اور اس پر توبہ نہیں کی اور موت آگئی تو ایسے شخص کا جنت میں داخلہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعمال اور عقیدہ صحیحہ پر قائم رکھے اور کفر و شرک سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرنا

(سوال) کیا قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کرتے ہوئے پڑھنے کے لیے کہنا چاہیے یا اس کے پاس یاد دہانی کے لیے کلمہ پڑھا جائے؟ صحیح رہنمائی فرمائیں۔

(جواب) قریب المرگ شخص کو کلمہ توحید کی تلقین کا حکم ہے اور تلقین سے مراد صرف کلمہ توحید پڑھ کر سنانا نہیں بلکہ اسے کہا جائے کہ وہ بھی پڑھے۔ اس کے کئی ایک دلائل موجود ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، آپ نے فرمایا:

”ماموں جان! لا الہ الا اللہ کہو۔“ اس انصاری نے کہا: ”ماموں یا چچا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں، بلکہ ماموں۔“

اس نے پوچھا: ”کیا لا الہ الا اللہ کہنا میرے حق میں بہتر ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”ہاں۔“ [مسند احمد (۱۵۴/۳)،

یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے]

اس حدیث سے پتا چلا کہ قریب المرگ کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔



تجارت کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

سوڈی مال کا کیا کیا جائے؟

(سوال) ایک شخص سوڈی لین دین کرتا رہا پھر اللہ نے اسے ہدایت دے دی اور اس نے اسے چھوڑ دیا اب جو سوڈی رقم ہے اس کا کیا کرے؟

(جواب) اس مسئلہ میں لازماً دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ ہے کہ توبہ کے بعد بہت زیادہ سوڈی رقم ابھی لوگوں کے ذمے ہے، جو ان سے وصول کرنی ہے تو اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ تُبْتِغُوا رُؤُوسَ أَمْوَالِكُمْ لَا تَغْلِبُوا وَلَا تَكُونُوا مَكْرُومِينَ﴾ [البقرة: ۲۷۹]

”اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارے اصل اموال ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرے۔“

حضرت سلیمان بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

«أَلَا إِنَّ كُلَّ رَبٍّ مِنْ رَبِّهَا أَهْلِيَّةٌ مَوْضُوعٌ إِنْ تُبْتِغُوا رُؤُوسَ أَمْوَالِكُمْ لَا تَغْلِبُوا

وَلَا تَغْلَبُوا» [ابوداؤد، کتاب البيوع: باب في وضع الرباء (۳۳۳۴)]

”خبردار! آج سے جاہلیت کا سوڈم کر دیا گیا ہے، اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے اصل اموال ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ جو سوڈا بھی تک نہیں لیا گیا اسے لینا حرام ہے۔ صرف اپنا اصل مال واپس لے اور اگر واپس کرنے والا تنگ دست ہے تو اسے خوش حالی تک مہلت دے دینی چاہیے یا ویسے ہی اسے معاف کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

[البقرة: ۲۸۰]

”اور اگر وہ تنگ دست ہو تو آسانی تک مہلت دو اور اگر تم صدقہ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“

اور دینے والے کو بھی چاہیے کہ وہ اس کا اصل مال ہی واپس کرے، زیادہ مت دے۔ نہ اسلام میں سوڈ لینا جائز ہے اور نہ دینا۔ افسوس ہے کہ ہمارے مسلمان حکمران سوڈ دینے کے لیے لوگوں سے دولت جمع کر رہے ہیں۔ باقی یہ بات ہے کہ طرفین

کی رضا مندی حرام کام کو حلال نہیں کر سکتی جیسا کہ زنا اور قوم لوط کا فعل ہے، بالکل سود بھی ایسے ہی ہے۔ اس مسئلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ سائل نے بہت سا سودی مال اپنے پاس جمع کیا ہوا ہے اب توبہ کے بعد وہ اس کا کیا کرے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک قاعدے کے تحت اس کا حل پیش کیا ہے، ان کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ چیز جو کسی فاسد سودے سے حاصل کی جائے اسے دو لحاظ سے دیکھا جائے گا۔ اگر تو بیع کرنے والا اس بیع کے باطل ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے اور وہ بیع کی وجہ سے یا طرفین کی رضا مندی کی وجہ سے جس چیز پر قابض ہوتا ہے تو وہ اس کا غاصب شمار ہوگا کیونکہ اس نے ایسی چیز حاصل کی ہے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، اس لیے وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا اور اگر عقد کرنے والا اس کو صحیح سمجھتا ہے جیسا کہ ذمی لوگ خنزیر، سود، شراب وغیرہ کی آپس میں بیع کرتے ہیں۔ جو اس نے مسلمان ہونے سے پہلے خرید و فروخت سے رقم حاصل کی ہے وہ اس کا اصل مال شمار ہوگا۔ اسی طرح اگر مسلمان اجتہاد یا کسی کی تقلید کی بنا پر اس کو صحیح سمجھتے ہوئے بیع کرتا رہا ہے اور مال اس کے ہاتھ میں ہے تو وہ اس کا اصل مال ہی شمار ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ ذَرُّوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾ [البقرة: ۲۸۹]

”اور جو سود سے باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے، یہ حکم نہیں دیا کہ جو پہلے بھی لیا ہوا ہے اسے واپس کر دو۔

[مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ (۲۱۱/۲۹)، تفسیر المنار لرشید رضا (۹۷/۳)]

پہلی صورت میں جب کہ ایک مسلمان جان بوجھ کر، حرام کو حرام جانتے ہوئے سودی کاروبار کرتا رہا، بعد میں توبہ کر لی، اب اس کے پاس اس حرام سودی کمائی کا مال موجود ہے اور وہ اس سے جان چھڑانا جاتا ہے تو اس کا حل یہی ہے کہ وہ مال جس سے لیا ہے اسے واپس کر دے کیونکہ لیتے وقت وہ جانتا تھا کہ میں ظلم و زیادتی سے یہ مال حاصل کر رہا ہوں۔ اب اگر وہ مال واپس کرنا ممکن ہی نہیں ہے تو ﴿لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ پر عمل ہوگا۔ اگر چاہے تو صدقہ کر دے اور سچے دل سے توبہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ سودی کاروبار کرتا رہے اور کہے بعد میں صدقہ کر دوں گا۔ یہ تو توبہ کے بعد اس کے لیے حلال اور جائز نہیں۔ اس صدقہ سے نیت یہ ہو کہ میں اس مال سے بیع جاؤں۔ اس صدقہ سے نیکی، ثواب اور تقرب الی اللہ کی نیت نہ ہو کیونکہ حرام چیز سے ثواب اور تقرب الی اللہ حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی کو پسند کرتا ہے۔“

بینک میں رقم رکھنا

(سوال) کیا بینک میں رقم رکھی جاسکتی ہے جبکہ بندہ اس پر سود بھی نہ لے؟

(جواب) بینک میں رقم رکھنا درست نہیں خواہ آپ سود لیتے ہوں یا نہ لیتے ہوں کیونکہ بینک اس رقم کو سودی کاروبار میں استعمال

کرتا ہے اور یہ گناہ کے کام میں تعاون کی وجہ سے حرام ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة: ۲]

”نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔“

اگر کسی شخص کو بینک کے علاوہ امانت رکھنے کے لیے کوئی اور جگہ میسر نہ آئے تو اس مجبوری کی وجہ سے اتنی دیر تک بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنی رقم رکھ لے جب تک اس کا صحیح انتظام نہیں ہو جاتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ [الانعام: ۱۱۹]

”اور اللہ تعالیٰ نے جو تمہارے اوپر حرام کیا ہے اس کی تفصیل تمہارے لیے بیان کر دی ہے الا کہ تم کسی بات پر مجبور ہو جاؤ۔“

اور جب اس کے لیے آپ کو کوئی صحیح جگہ مل جائے تو آپ اپنی رقم بینک سے نکال لیں اور اس کو صحیح مقام پر منتقل کر دیں تاکہ گناہ پر تعاون سے بچ جائیں۔

بینک میں ملازمت کرنا

سوال بینک کی ملازمت کرنا شریعت کی نگاہ میں کیسا ہے؟

جواب بینک کی ملازمت اختیار کرنا حرام ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكِلَ الرِّبَا وَمُوكَلَّهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيَهُ وَقَالَ

هُمُ سَوَاءٌ » [مسلم، کتاب المساقاة: باب لعن آكل الربا و مؤكله (۱۵۹۸)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ یہ سب لوگ گناہ میں برابر ہیں۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سود لکھنے والا بھی لعنت کا مستحق ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے کے ساتھ گناہ میں برابر کا شریک ہے۔ اس لیے بینک کی نوکری کرنا، کلرک و نیجر بننا حرام ہے اور سود خور کے ساتھ مل کر جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرتا ہے، وہ گناہ میں شریک ہے، لہذا یہ سروس چھوڑ کر کوئی جائز اور حلال کام اختیار کر لینا چاہیے۔

انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت

سوال کیا انعامی بانڈز خریدنا اور ان پر انعام حاصل کرنا جائز ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مطلع فرمائیں؟

(جواب) حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے انعامی بانڈز سود ہی کی ایک صورت ہے جس کے ساتھ جوئے کی آمیزش کی گئی ہے۔ حکومت انعامی بانڈز فروخت کر کے بہت سے لوگوں سے رقم جمع کرتی ہے اور ان کو گارنٹی دیتی ہے کہ آپ کی اصل رقم محفوظ ہے۔ اگر آپ کا نمبر نکل آیا تو انعام دیا جائے گا۔ یہ انعام اس ساری جمع شدہ رقم کا سود ہے جو حرام ہے اور اگر جائز بھی ہو تو ان تمام لوگوں کا حق ہے جنہوں نے رقم جمع کرائی ہے۔ مگر وہ ان سب کا حق صرف اتفاق سے نکل آنے والے نمبروں کو دیتے ہیں جس کی بنیاد کسی استحقاق یا قاعدے پر نہیں، صرف بخت و اتفاق پر ہے اور اس کا نام جوا ہے۔ اس لیے انعامی بانڈز خریدنا حرام ہے۔ انعامی بانڈز کی دوسری صورت جس میں انعام نہ نکلنے کی صورت میں خریدنے والے کے پیسے ضائع ہو جاتے ہیں صاف جوا اور حرام ہے، جس طرح قسمت کی پڑیا، لاٹری کی تمام صورتیں، اخبارات کے پزل (معے) مختلف قسم کے ریفل ٹکٹ سب جوئے کی صورتیں ہیں اور حرام ہیں۔ ایسے انعامات سے تیار ہونے والے کھانے اور منعقد کی جانے والی تقریبات بھی حرام ہیں اور اس میں شرکت بالکل ناجائز ہے۔

قسطوں پر اشیاء خریدنے کا حکم

(سوال) کیا قسطوں پر اشیاء حاصل کرنا ناجائز ہے؟

(جواب) قسطوں پر خریدنے کی صورت میں بھی اگر اشیاء کی قیمتیں وہی ہوں جو نقد کی صورت میں ہیں تو ان کی بیع جائز ہے بصورت دیگر ناجائز ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ » [مسند احمد (۴۳۲/۲)، بیہقی (۳۴۳/۵)]

”رسول اللہ ﷺ نے ایک چیز کی دو قیمتیں (مقرر کرنے سے) منع فرمایا ہے۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْ كَسُهُمَا أَوْ الرِّبَا » [ابن حبان (۲۲۶/۸)، (۴۹۵۳)، مستدرک حاکم (۴۵۱۲)، بیہقی (۳۴۳/۵)، امام حاکم رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے ان کی موافقت کی ہے۔]

”جو شخص کسی چیز کی دو قیمتیں مقرر کرے گا یا تو وہ کم قیمت لے گا یا پھر وہ سود ہوگا۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« لَا تَحِلُّ صَفَقَتَانِ فِي صَفَقَةٍ » [الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان (۲۴۲/۸)]

”ایک عقد میں دو معاملے کرنا حلال نہیں۔“

امام سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جب تو یہ کہے کہ میں یہ چیز تمہارے ہاتھ نقد اتنے میں اور ادھار اتنے کی بیچتا ہوں تو یہی ”بیعتان فی بیعة“ ہے اور یہ مردود ہے اور یہی وہ تجارت ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔“ [عبد الرزاق (۱۶۳۲)، شرح السنۃ (۱۴۳۱/۸)]

امام سہاک بن حرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”کوئی شخص کوئی چیز بیچتے وقت کہے یہ چیز ادھار اتنے پر اور نقد اتنے پر بیچتا ہوں تو یہ ”بیعتین فی بیعة“ ہے۔“

[مسند احمد (۳۹۸/۱)]

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ ادھار کی صورت میں رقم بڑھانا سود ہے، لہذا ایسا کاروبار کرنا درست نہیں، یہ سود لینا اور دینا ہے اور لعنت کا حق دار بننے کے مترادف ہے لہذا دکاندار اور گاہک کو ایسے معاملات سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔

بیمہ کی شرعی حیثیت

(سوال) بیمہ کی شرعی حیثیت کیا ہے جبکہ بعض علماء نے اس کے جواز کے فتوے بھی دیے ہیں؟

(جواب) بیمہ مطلقاً ناجائز اور حرام ہے خواہ زندگی کا ہو یا مکان اور گاڑیوں وغیرہ کا کیونکہ یہ اپنی اصل وضع میں جوئے اور سود کا مرکب ہے اور اسلام میں سود اور جوا دونوں حرام ہیں۔ اگر مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کی موت یا املاک کا نقصان ہو جائے تو کمپنی کو نقصان ہوتا ہے اور اگر وہ پوری قسطیں جمع کرادے تو کمپنی کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ قسطیں پوری ادا ہو سکیں گی یا نہیں؟ اور سود اس لیے ہے کہ بیمہ دار اگر پوری قسطیں جمع کروائے تو اس کو اس رقم کے ساتھ سود دیا جاتا ہے۔ بیمہ سے وراثت کا شرعی نظام ختم ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ بیمہ کی رقم بیمہ دار کے مرنے کے بعد اس کے ناخرد کردہ شخص کو دی جاتی ہے جب کہ ہر شرعی وارث ترکہ کا مستحق ہوتا ہے۔ جو چیز قرآن و سنت کے نظام کو درہم برہم کرنے والی ہو، وہ کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جائز اور شرعی اسباب بروئے کار لانے کے بعد مستقبل میں پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے جائیں۔ بیمہ اس سے فرار ہے کیونکہ اس میں حوادث کی پیش بندیاں ناجائز طریقوں سے پہلے ہی ہو رہی ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم بھی تو دنیا میں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی آل اولاد چھوڑی تھی۔ جب انھوں نے ایسے ناجائز تحفظات کا انتظام نہیں کیا تو آج کے مسلمانوں کو کیوں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟

باقی جس حدیث میں ہے کہ جو آدمی اپنے ورثاء کو مرتے وقت غنی چھوڑ جائے وہ بہتر ہے، اس فرمان کو غور سے پڑھیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مستقبل کی احتیاطی تدبیر کے متعلق نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز موجود جائداد کو بلا وجہ خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں، بعد میں وہ وارثوں کے کام آئے گی۔ باقی اسٹیٹ لائف والوں کا یہ کہنا کہ ہمارا شراکت دار نفع و نقصان میں شریک ہوتا ہے، جھوٹ اور دروغ گوئی ہے اور سادہ لوح انسانوں کو اپنے گناہ میں پھنسانے کا ایک حیلہ ہے۔ کیونکہ بیمہ کمپنی اگرچہ اس رقم سے تجارت بھی کرتی ہو لیکن اس کے منافع

میں سے ایک معین اور طے شدہ حصہ بیمہ وار کے کھاتے میں جمع کرتی ہے اور بلاشبہ یہ سود ہے کیونکہ اصل رقم کے علاوہ معین اور طے شدہ منافع کے ادا کرنے کا نام ہی سود ہے۔ اگر یہ نفع اور نقصان ہی کی بنیاد پر قائم ہو تو پھر بھی بیمہ کرانے والوں کو حسب معاہدہ معینہ رقم نہیں ملنی چاہیے بلکہ کمی بیشی کے ساتھ نفع اور نقصان دونوں میں شریک رہنا چاہیے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ بیمہ کمپنیاں عام طور پر اصل رقم سے جو کچھ زائد دیتی ہیں اس کی شرح اور مقدار پہلے ہی سے متعین کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی کمپنی اس کو معین نہ بھی کرتی ہو بلکہ زائد رقم کو سالانہ نفع اور نقصان کا لحاظ کر کے فیصد پر رکھتی ہو، تب بھی یہ طریقہ بیمہ کے جائز ہونے کی وجہ نہیں بن سکتا، کیونکہ اس کاروبار میں نقصان کا سوال ہی نہیں۔ پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ بیمہ کمپنیاں تمام حاصل شدہ سرمایہ سود پر آگے دے دیتی ہیں اور سودی معاملے میں واقع نقصان کی ذمہ داری قبول نہیں کی جاتی۔ پھر ان کمپنیوں کے متفقہ اصولوں میں سے بعض ایسے اصول بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ سارا کاروبار اور ڈھانچہ ہی شرعاً ناجائز بن جاتا ہے۔ یہ نظام یہودیوں کا ایجاد کردہ ہے۔ جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تاکہ مسلمانوں کو اسلام نے جو سرمایہ کے محفوظ رکھنے اور مال میں اضافہ کرنے، حوادث کی صورت میں مالی معاونت اور پسماندگان کی مالی امداد کے بارے میں جو ربانی ہدایات دی ہیں ان سب چیزوں سے محروم کر کے اسلام سے دور کر دیا جائے۔ وہ پڑھے لکھے اور نام نہاد علماء جنہوں نے یہودیوں کے غزوہ فکری سے شکست خوردہ ہو کر یورپ کے موجودہ اقتصادی نظام کی چند خوبیاں اور خوشنما پہلوؤں کو دیکھ کر بیمہ جو سراسر جوا اور سود ہے، کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، ایسے لوگوں کا کردار انتہائی قابل مذمت ہے اور بعض تو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ یورپ کی ذہنی غلامی نے ان کے دماغوں پر یہ عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ ایسے علماء کو ایسا فتویٰ دینے سے پہلے اس آیت کریمہ کو اچھی طرح پڑھ لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھو۔ یقیناً اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔“ [النحل: ۱۱۶]

حرام کھانے کا انجام

(سوال) کیا حرام کھانے والا جنت میں داخل نہ ہوگا؟

(جواب) نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتْ النَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ »

[احمد (۳۲۱/۳)، مستدرک حاکم (۴۲۲/۴)، امام حاکم اور امام ذہبی رحمہم اللہ نے اس حدیث کو صحیح

قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام ابن حبان رحمہم اللہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [موارد الظمان (ص ۳۷۸)]

”وہ گوشت جس نے حرام سے پرورش پائی ہو جنت میں داخل نہیں ہوگا اور جس گوشت نے حرام سے نشوونما پائی ہو

اس کے لیے جہنم کی آگ ہی اولیٰ ہے۔“

اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنا

سوال کیا حکومت یا کوئی اور ذمہ دار اشیاء کی قیمتیں مقرر کر سکتا ہے؟ شریعت کی رو سے مطلع فرمائیں۔

جواب عہد رسالت میں ایک مرتبہ مدینہ میں اشیاء کے نرخ بڑھ گئے جس پر لوگوں نے آپ ﷺ سے آکر شکایت کی جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« غَلَا السِّعْرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَدْ غَلَا السِّعْرُ فَسَعِّرْنَا فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَإِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَلْقَى رَبِّي وَكَيْسَ أَحَدٍ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ فِي دَمٍ وَلَا مَالٍ » [ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب فی کرہ ان یسعر (۲۲۰۰)، ابوداؤد (۳۴۵۱)، احمد (۱۵۶۱۳)، مسند ابی یعلیٰ (۱۶۰/۵)، بیہقی (۲۹/۶)، دارمی (۲۴۹/۲)، طبرانی کبیر (۷۶۱)]

”نبی کریم ﷺ کے زمانے میں (مدینہ میں) چیزوں کے نرخ بڑھ گئے، لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! نرخ بہت بڑھنے لگے ہیں، آپ ہمارے لیے قیمتیں مقرر فرمادیں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یقیناً اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے، وہی مہنگا کرنے والا ہے، وہی سستا کرنے والا ہے اور وہی رزق دینے والا ہے، میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملوں کہ کوئی شخص مجھ سے خون یا مال میں ظلم کی بنا پر مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔“

اس حدیث کے آخری الفاظ قابل توجہ ہیں ”میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر کسی کا خونی یا مالی حق نہ ہو“ اس سے معلوم ہوا کہ قیمتوں کو کنٹرول کرنا گاہک یا دکاندار کسی ایک پر ظلم ہے، جس کی ذمہ داری قبول کرنے پر آپ ﷺ آمادہ نہ تھے۔

حکومت جو اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول حاصل کرتی ہے اس کی ایک صورت یہ ہے کہ حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ فلاں فلاں اشیاء کی قیمتیں یہ ہیں، اس سے زیادہ قیمت پر یہ اشیاء فروخت نہیں کی جاسکتیں۔ اسی طرح حکومت کی جانب سے اشیاء کی قیمتیں مقرر کر کے باقاعدہ لسٹ دکانوں پر آدیزاں کر دی جاتی ہے تاکہ دکاندار اس سے زیادہ قیمت وصول نہ کر سکے اور اس کی چینگ کے لیے گاہے گاہے حکومت چھاپے بھی مارتی ہے لیکن اس کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ دکاندار اس ریٹ پر رڈی اور ناکارہ اشیاء فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر کوئی خریدار خالص اور عمدہ چیز کا طلب گار ہو تو اس سے علیحدہ ریٹ طے کرتے ہیں، البتہ اگر کوئی حکومتی آدمی آکر دکاندار سے اس مقرر ریٹ پر چیز طلب کرے تو دکاندار اسے خالص چیز مہیا کرتا ہے تاکہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے اور جرمانہ یا سزا سے بچ جائے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دکاندار اپنی کمیٹی کے افراد کے ذریعے یا کسی اور واسطے سے حکومتی عملہ کو رشوت دے کر بددیانتی پر مبنی حرکات کا مرتکب ہوتے ہیں اور گاہک کو ناخالص، ردی، بے کار اور گھٹیا اشیاء فروخت کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت جس چیز پر کنٹرول کرتی ہے، ملک کے مختلف حصوں میں اس کے ڈپو مقرر کر دیتی ہے تاکہ ان ڈپوزوں سے وہ چیز مقررہ ریٹ پر حاصل کی جاسکے۔ اس سے بھی بددیانتی کی متعدد راہیں کھلتی ہیں۔ ڈپو ہولڈرز اپنے واقف کار، عزیز و اقارب وغیرہ کو تو اشیاء فراہم کرتے ہیں جب کہ دیگر بہت سے افراد دمحروم رکھتے ہیں، بلکہ بہت سے افراد اس طرح ڈپوزوں پر ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ عورتیں اور بچے سارا دن لائونوں میں لگے ذلیل ہو رہے ہوتے ہیں اور اکثر ڈپو ہولڈرز ایسے افراد سے رشوت وصول کر کے اشیاء کو بچا کر بازار میں مختلف دکانداروں کو بلیک میں فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح چور بازاری کا نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بہر کیف اس طرح کی کئی خرابیاں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جن سے خریدار اور دکاندار کے درمیان کئی جرائم جنم لیتے ہیں۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تجارت اور لین دین کے مسائل و احکام]

مذکورہ حدیث کی شرح میں قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”اس حدیث اور اس معنی کی جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان سے قیمتوں کے کنٹرول کی حرمت میں استدلال کیا گیا ہے اور قیمتوں پر کنٹرول کرنا ظلم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے مالوں کے تصرف کا اختیار دیا گیا ہے اور قیمتوں پر کنٹرول ان پر مالی تصرف میں رکاوٹ ہے جب کہ حاکم وقت مسلمانوں کی خیر خواہی پر مامور ہے۔ اس کے لیے گاہک کو سستے داموں اشیاء کی خریداری میں نظر کرنا دکاندار کے لیے قیمت بڑھانے کی مصلحت میں نظر کرنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ جب یہ دونوں معاملے آمنے سامنے ہوں تو اس وقت لازم ہے کہ فریقین (دکاندار اور گاہک) کو اپنے معاملے میں اجتہاد کا اختیار دیا جائے۔ سودا بیچنے والے کو اس کی مرضی کے خلاف بیچنے پر پابند کرنا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف ہے: ”اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ سوائے اس صورت

کے کہ تمہاری تجارت باہمی رضا مندی سے ہو۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔“ [نبیل الاوطار (۲۴۸/۵)]

اسلامی معاشرے میں چونکہ تجارت بالکل آزاد ہے، اس لیے ہر چیز کھلے عام فروخت ہونی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تاجر برادری کے لوگ متقی، پرہیزگار اور صالح ہوتے تھے اور وہ مناسب ریٹ پر اشیاء فروخت کرتے تھے۔ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ تاجروں کی بد نیتی پر نہیں ہوتا تھا بلکہ سامان فروخت کی کمی اور اس کی کثرت طلب کی بنا پر قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ [دیکھئے: محملۃ البحوث الاسلامیہ (۲۰۸/۱)]

لیکن جب اشیاء خورد و نوش آسانی سے نہ پہنچنے دیتے ہوں تو یہ تاجر برادری کا ظلم ہے اور عوام الناس کی بھلائی کی خاطر ان کا ظلم روکنا عین انصاف اور حکومت کا حق ہے، تو اس ایک صورت میں اگر کنٹرول ہو جائے تو کوئی شرعی قباحت نہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کنٹرول کرنے سے انکار کیا تھا تو اس کے اسباب قدرتی تھے، تاجر برادری کے پیدا کردہ نہیں تھے، باہر سے غلہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”کنٹرول ریٹ بعض صورتوں میں ناجائز اور ظلم ہے اور بعض صورتوں میں عدل و انصاف اور جائز ہے۔“

جب کنٹرول ریٹ ایسی صورت پر مشتمل ہو کہ لوگوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو ناحق کسی چیز کو ایسی قیمت پر فروخت کرنے پر

مجبور کیا جائے جسے وہ ناپسند کرتے ہوں یا جو چیز اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مباح رکھی ہے، اس سے انھیں روکا جائے تو یہ حرام ہے۔ جب کنٹرول ریٹ عدل و انصاف پر مبنی ہو جیسا کہ انھیں کسی چیز کا جتنا معاوضہ مناسب ہو اس کے لیے انھیں مجبور کیا جائے اور جو کام ان پر حرام ہے اس کے کرنے سے روکا جائے جیسے مناسب معاوضے سے زیادہ قیمت لینا تو یہ کنٹرول جائز ہے بلکہ واجب ہے۔ پہلی صورت کی مثال سیدنا انس رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”جب لوگ اپنے سودے کو معروف طریقے پر ظلم کیے بغیر فروخت کریں اور قیمت یا تو اشیاء کی کمی کی وجہ سے بڑھ جائے یا لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ایسی صورت میں مخلوق کو مقررہ قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا ناحق ہے۔“

اور دوسری صورت کی مثال یہ ہے کہ سودا بیچنے والے افراد لوگوں کی ضرورت کے باوجود زیادہ قیمت کی وصولی کے بغیر بیچنا روک دیں تو ان پر واجب ہے کہ وہ سودے کو مناسب قیمت پر بیچیں۔ ایسی صورت میں (جب وہ زیادہ قیمتیں وصول کریں) انھیں مناسب قیمت کا پابند کر دینا چاہیے، ان پر لازم ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے لازم ٹھہرائی ہے اسے لازم پکڑیں۔ [الحسبۃ الإمام ابن تیمیہ (ص ۲۰۱)]

تقریباً یہی بات امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے۔ [الطرق الحکمیۃ (ص ۲۴۱، ۲۴۰، ۲۴۱)]

لہذا اگر تاجر برادری کی جانب سے ظلم ہو اور عوام الناس کی ضرورت کے باوجود بلاوجہ اشیاء کی فراہمی مناسب ریٹ پر نہ ہو تو انھیں مقررہ قیمت پر فروخت کا پابند کیا جاسکتا ہے اور اگر منڈیاں آزاد ہوں، گرانی تاجر برادری کی طرف سے پیدا نہ کی گئی ہو بلکہ قدرتی طور پر اشیاء کی قلت و کثرت کی بنا پر ہو تو اس صورت میں کنٹرول ریٹ درست نہیں۔

گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا

(سوال) کیا گروی رکھی ہوئی ہر چیز سے فائدہ حاصل کرنا ٹھیک ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ﴾ [النساء: ۲۹]

”اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔“

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَ أَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ » [مسلم، کتاب الحج: باب حجة النبی (۱۲۱۸)]

”بلاشبہ تمہارے خون اور اموال تم پر حرام ہیں۔“

ان واضح دلائل سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا مال مسلمان پر اصلاً حرام ہے۔ جواز تصرف کے لیے کسی شرعی دلیل کی ضرورت

ہے جو یہاں مفقود ہے۔ گروی رکھنے والا شخص اپنی گروی شدہ چیز کا مالک ہے اور اس کا اپنی چیز سے فائدہ اٹھانا تو معقول ہے جب کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے اس کی حیثیت امین کی ہے اور اس کے پاس پڑی ہوئی چیز امانت ہے جو رقم کے تحفظ کے لیے ہے، تو کسی کی امانت میں تصرف کرنا خیانت اور ناجائز ہے۔

اور حدیث میں جو خرچ کے عوض جانور کا دودھ دوہنے اور اس پر سواری کرنے کی اجازت ہے اس سے استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ یہ حدیث عمومی شرعی اصول کے منافی ہے، یہ صرف سواری کے ساتھ خاص ہے، اس پر عام قیاس کرنا درست نہیں۔ صحیح بخاری میں امام بخاری کا فہم بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ایک گروہ نے کہا ہے کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے وہ خرچ کے عوض گروی جانور پر سواری کر سکتا ہے اور

دودھ دوہ سکتا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے دو فائدوں کے علاوہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔“ [فتح الباری (۱/۴۱۵)]

پھر فرماتے ہیں کجہور اہل علم کا یہی مسلک ہے کہ جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے وہ گروی اشیاء سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ سلف صالحین سے کچھ ایسے صریح آثار بھی مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مقروض آدمی کے مال سے فائدہ اٹھانا درست نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ آیا تو میری ملاقات عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے کہا: ”آپ میرے گھر آئیں تو میں آپ کو ستو اور کھجور کھلاؤں گا اور آپ ایک عظیم گھر میں آئیں گے۔“ پھر فرمایا: ”تم ایک ایسی زمین پر ہو جس میں سود عام ہے، جب تمہارا کسی شخص پر حق ہو اور وہ تمہیں بھس، جو اور چارے کا گٹھا بطور تحفہ دے تو اسے قبول نہ کرنا کیونکہ یہ سود ہے۔“ [بخاری، کتاب مناقب الانصار: باب مناقب عبد اللہ بن سلام (۳۸۱۴)]

سالم بن ابی الجعد فرماتے ہیں: ”ہمارا ایک پڑوسی مچھلی فروش تھا، اس کے ذمے کسی آدمی کے پچاس درہم تھے۔ وہ قرض دینے والے کو مچھلی ہدیہ بھیجتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما آئے تو اس نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ”جو وہ تجھے تحفے میں دے رہا ہے اسے حساب میں شمار کرو۔“ [بیہقی (۳۵۰/۱۵)]

ان صحیح اور صریح آثار سے معلوم ہوا کہ قرض لینے والے شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مقروض کی کسی چیز سے فائدہ اٹھائے، لہذا اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز گروی رکھی گئی ہو تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اگر وہ فائدہ اٹھائے تو اصل رقم سے حساب کر کے اتنی رقم کم کر دی جائے گی اور اگر حق سے زائد فائدہ اٹھایا ہو تو یہ واپس کرنا ہوگا ورنہ سود ہوگا۔ (واللہ اعلم)

ناجائز کاروبار کے لیے دکان کرائے پر دینا

(سوال) کیا کوئی مالک مکان اپنی دکان یا مکان کسی ایسے شخص کو دے سکتا ہے جو اس میں غیر شرعی امور کا مرتکب ٹھہرے جبکہ وہ خود اس کام میں ملوث نہ ہو؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے فحاشی و بے حیائی پھیلانے سے منع فرمایا ہے اور جو لوگ ایسا کام کرتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [النور: ۱۹]

”یقیناً جو لوگ اہل ایمان میں برائی پھیلانے کے آرزو مند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“

ویڈیو فلمیں اور گانوں کی کیٹیشیں صراحتاً احکام خداوندی کی نافرمانی پر مشتمل ہیں جو شرعاً حرام ہیں۔ سورہ لقمان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴾ [لقمان: ۶]

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کے آلات خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکائیں اور اسے ہنسی و مذاق بنا لیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“

اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل سعادت جو کتاب الہی کے سماع سے فیض یاب ہوتے ہیں، کا ذکر کرنے کے بعد اہل شقاوت کا ذکر کیا ہے جو کلام اللہ کی تلاوت کے سماع سے اعراض کرتے ہیں لیکن ساز و موسیقی، نغمہ و سرود اور گانے وغیرہ خوب شوق سے سنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ صحابی رسول اور فقیہ امت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”لہو الحدیث سے مراد اللہ کی قسم! گانا بجانا ہے۔“ [حاکم (۴۱۱/۲)، ابن جریر (۶۲/۲۱)]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن بھی یہی فرماتے ہیں اور یہی تفسیر عکرمہ، حسن بصری، سعید ابن جبیر، قتادہ اور ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ [ابن جریر (۱۱/۲۱)]

لہذا جب گانا بجانا، آلات طرب، رقص و سرود شرعاً حرام ہیں اور ویڈیو فلمیں اور گانے کی کیٹیشیں فروخت کرنا بھی حرام ہیں تو ایسے کاموں کے لیے دکان کرایہ پر دینا فعل حرام میں تعاون ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ﴾ [المائدة: ۲]

”نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“

معلوم ہوا کہ گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا حرام ہے، لہذا فعل حرام کی تجارت کے لیے دکان کرائے پر دینا حرام ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ اسی طرح وہ مساجد جن کی دکانیں شیو، ویڈیو کیٹیشیں اور اس طرح کے دیگر امور کے لیے کرائے پر دی گئی ہیں ان کے متولیوں کو چاہیے کہ وہ فی الفور خالی کرائیں اور کسی جائز کام کرنے والے تاجر کو دے دیں تاکہ غضب الہی سے بچا جاسکے۔

شیبو کی کمائی

سوال کیا داڑھی مونڈنے والا (حجام) بھی گناہ گار ہوگا؟ اور اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل و صورت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور مرد و زن کے درمیان جو امتیازات رکھے ہیں ان میں سے ایک امتیاز اور فرق داڑھی ہے۔ داڑھی مرد کی زینت ہے اور یہ ایسی زینت ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء و رسل کو مزین فرمایا۔ اگر یہ بد صورتی اور قباحت کا باعث ہوتی تو یہ کسی نبی اور رسول کو اللہ تعالیٰ عطا نہ کرتا۔ داڑھی فطرتِ اسلام میں داخل ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللَّحْيَةِ» [مسلم، کتاب الطہارۃ، باب خصال الفطرۃ (۲۶۱)]

”دس خصالتیں فطرت سے ہیں، ان میں سے مونچھیں تراشنا اور داڑھی بڑھانا بھی ہے۔“

”إِعْفَاءُ اللَّحْيَةِ“ کا معنی یہ ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دے، اس میں کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

امام نووی رضی اللہ عنہما، ”أَوْفُوا، أَرْحُوا، أَرْجُوا اور وَقِرُوا پانچ طرح کے الفاظ نقل کر کے فرماتے ہیں: ”ان سب کا معنی ہے داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔“ [شرح مسلم (۱۲۹/۱)]

قاضی شوکانی رضی اللہ عنہما ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

”إِنَّ هَذِهِ الْأَشْيَاءَ إِذَا فَعِلْتَ اتَّصِفَ فَاعِلُهَا بِالْفِطْرَةِ الَّتِي فَطَرَهُ اللَّهُ الْعِبَادَ عَلَيْهَا وَ حَتَّهْمُ عَلَيْهَا وَ اسْتَحَبَّهَا لَهُمْ لِيَكُونُوا عَلَى أَكْمَلِ الصِّفَاتِ وَ أَشْرَفِهَا صُورَةً“ [نیل الاوطار (۱۳۰/۱)]

”ان اشیاء پر عمل کیا گیا تو ان کا عامل اس فطرت سے موصوف ہوا جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا اور ان کو اس پر رغبت دلائی اور ان کے لیے پسند فرمایا تاکہ وہ صورت کے لحاظ سے کامل ترین اور اعلیٰ صفات کے مالک بن جائیں۔“

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

”هِيَ السُّنَّةُ الْقَدِيمَةُ الَّتِي اخْتَارَهَا الْأَنْبِيَاءُ وَ اتَّفَقَتْ عَلَيْهَا الشَّرَائِعُ فَكَانَ مَا أَمَرَ جِبَلِيٌّ يَنْطُورُونَ عَلَيْهَا“ [نیل الاوطار (۱۳۰/۱)]

”یہ سنت قدیمہ ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا اور تمام شریعتیں اس پر متفق ہیں کیونکہ یہ پیدائشی اور طبعی چیز ہے جس پر سب اکٹھے ہیں۔“

صحیح مسلم کی اس حدیث سے واضح ہوا کہ داڑھی بڑھانا فطری اور جبلی امر ہے، اس کو منڈوانا یا کتروانا فطرت کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل ہے۔ علاوہ ازیں دیگر متعدد صحیح احادیث میں داڑھی رکھنے کا حکم موجود ہے اور یہ بات اصول میں ثابت ہے کہ

حکم و جوب پر دلالت کرتا ہے اور وجوب پر عمل نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور جو شخص کسی دوسرے شخص کی داڑھی مونڈتا ہے وہ اس کے ساتھ گناہ پر تعاون کرتا ہے جو شرعاً بالکل منع ہے۔ جب داڑھی مونڈنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے تو اس پر تعاون کرنا گناہ پر تعاون ہے اور شرعاً حرام ہے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ جس کام کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کی اجرت اور کمائی بھی حرام ہے لہذا داڑھی مونڈنا پھر اس پر اجرت لینا حرام ہے۔ اسی طرح داڑھی مونڈنے والے کو دکان کرائے پر دینا اس کے ساتھ فعل حرام پر تعاون ہے، یہ بھی حرام ہے۔

فوٹو گرافی کا پیشہ

(سوال) کیا فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا اسلام کی رو سے جائز ہے؟

(جواب) تصویریں بنانا کتاب و سنت کی رو سے قطعاً ناجائز اور کبیرہ گناہ ہے۔ آج کل تو یہ فعل اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اسمبلی سے لے کر ایک چکی جھونپڑی تک ہمارے ملک کے در و دیوار تصاویر سے مزین نظر آتے ہیں۔ جا بجا تصاویر آویزاں کر کے اللہ کی رحمت سے دوری اور لعنت کو حاصل کیا جا رہا ہے اور یہ وبا اس قدر پھیل چکی ہے کہ اس نے اپنی پلیٹ میں ہر خاص و عام کو لے لیا ہے۔ کوئی گناہ پورے معاشرے کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا ہے تو اس گناہ کو گناہ کہنا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بہر صورت کوئی گناہ کتنا ہی عام ہو جائے اس سے شرعی حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زبان نبوت سے صادر ہونے والا ایک ایک حکم اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ سابقہ اقوام عالم میں کفر و شرک کی گمراہی انہی تصاویر کی بنا پر آئی تھی۔ شیطان نے انہیں ورغلا کر تصویر سازی کی لعنت میں گرفتار کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَوْلَيْكَ إِذَا مَاتَ مِنْهُمْ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلَي قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّورَةَ

أَوْلَيْكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ » [بخاری، کتاب الجنائز: باب بناء المسجد على القبر (۱۳۴۱)]

”ان اہل کتاب میں کوئی نیک آدمی مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے پھر اس میں تصویریں رکھتے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین لوگ ہیں۔“

نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَلَمْ يَشْعِ الشِّرْكَ فِي الْأَمَمِ وَ لَمْ يَدْخُلْ فِيهِمْ إِلَّا مِنْ بَابِ التَّصْوِيرِ“ [تنقیح (۲۰۲/۳)]

”امتوں میں شرک کا پھیلاؤ اور داخلہ تصویر کی جانب سے ہوا۔“

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ كَانَ غَالِبَ كُفْرِ الْأَمَمِ مِنْ جِهَةِ الصُّورِ“ [فتح الباری (۱۷/۸)]

”اکثر امتوں میں کفر کی بیماری تصویروں کے ذریعے داخل ہوئی۔“

موجودہ دور میں جب کہ فاشی، عریانی، بے حیائی و بے پردگی کا سیل رواں تمام حدود پھیلاؤ چکا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ

یہ سارا فتنہ تصاویر کا شاخسانہ ہے اور یہ پورا سیلاب وی سی آر، ٹی وی، گندے اخبارات و رسائل کے ذریعے عروج پکڑ رہا ہے۔ تصویر کی حرمت پر دلائل بے شمار ہیں، چند ایک درج کیے جاتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِينَ يُضَاهِفُونَ بِخَلْقِ اللَّهِ » [بخاری، کتاب اللباس: باب ما وطنی من التصاویر (۵۹۰۴)]

”قیامت والے دن سخت ترین عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق میں نقل اتارتے ہیں۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

« وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوا حَبَّةً أَوْ شَعِيرَةً » [بخاری، کتاب التوحید: باب قول الله تعالى..... الخ (۷۵۰۹)]

”اس سے بڑا ظالم کون ہے جو عمل تخلیق میں میرا مقابلہ کرے؟ انھیں چاہیے کہ ایک چوٹی یا گندم یا جو کا ایک دانہ پیدا کر کے دکھائیں۔“

صاحب تنقیح الرواة رقمراز ہیں:

« وَفِيهِ حُرْمَةُ التَّصْوِيرِ وَإِنَّهُ مِنْ أَعْظَمِ الْمَعَاصِي وَالْمَنَاهِي لِأَنَّهُ تَشْبَهُ بِالْخَالِقِ »

[تنقیح الرواة (۲۵۳/۳)]

”اس حدیث میں تصویر کی حرمت پر دلیل ہے اور یقیناً یہ سب سے بڑے گناہوں اور منع کردہ اشیاء میں سے ہے، اس لیے کہ اس میں خالق کے ساتھ مشابہت ہے۔“

نواب صدیق حسن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں ہے:

”اس حدیث میں تصویر کو استعمال کرنے والے کے لیے وعید ہے، جس نے تصویر بنائی، اس نے خالق کے ساتھ اس کام میں مشابہت کی جو اس کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں اور جس شخص نے (مصور کی بنائی ہوئی) تصویر کو استعمال کیا گویا کہ وہ مصور کے فعل سے راضی ہے اور حدیث اگرچہ تکمیل کے متعلق وارد ہوئی ہے لیکن یہ ہر اس چیز کو شامل ہے جس میں تصویر ہے خواہ وہ کپڑا، گاؤں، کتے، کہنی کے نیچے سہارا دینے والی اشیاء سے ہو یا برتن، اسلحہ یا کتابوں کی جنس سے ہو۔ خواہ اس نے تصویر کو ہاتھ سے بنایا ہو یا کسی آلہ سے۔ اس لیے کہ آلات کے عمل کے ذریعے حاصل ہونے والی شکل پر بھی تصویر کا اطلاق درست بیٹھتا ہے۔ اس کا حکم تصویر کا حکم ہوگا اور اس کا استعمال تصویر کے استعمال ہی کی طرح ہوگا۔“ [الدین الخالص بحوالہ تنقیح الرواة (۲۵۳/۳)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ تصویر بنانے والے، خواہ وہ تصویر ہاتھ سے بنائیں یا آلے کے ذریعے، اس کو استعمال کرنے والے دونوں قسم کے افراد اس وعید کے مستحق ہیں جو حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَمَنْ صَوَّرَ صُورَةَ عَذِيبٍ وَكُلِّفَ أَنْ يَنْفُخَ فِيهَا وَكَيْسَ يَنْفُخُ » [بخاری، کتاب التعبير: باب

من كذب في حلمه (۷۰۴۲)

”جس شخص نے کوئی تصویر بنائی، اسے عذاب دیا جائے گا اور اس بات کا مکلف ٹھہرایا جائے گا کہ وہ اس تصویر میں روح پھونکے اور وہ پھونکنے والا نہیں ہوگا۔“

سیدنا ابو طلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيرٌ » [بخاری، کتاب اللباس: باب التصاویر (۵۹۴۹)]
 ”جس گھر میں کتا اور تصویریں ہوں اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔“

مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ تصویر بنانے والے افراد قیامت کے روز سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ان تصویروں میں روح پھونکنے کے لیے انھیں کہا جائے گا لیکن وہ ان میں روح نہیں پھونک سکیں گے۔ تصویر بنانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفت خلق میں مشابہت ہے اور اس فعل پر نبی مکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے جس بنا پر یہ کبیرہ گناہ ہے۔ یہ وعید ہر قسم کی تصویر کے متعلق ہے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کپڑا، کاغذ، درو دیوار یا نوٹوں اور کتابوں پر چھاپی جائے، خواہ ہاتھ سے بنائی جائے یا آلات کے ذریعے۔ ہمیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے اور اسی طرح وہ آدمی جو تصاویر بنواتا ہے وہ چونکہ اس فعل پر راضی ہے، اس کی رضا مندی کی بنا پر وہ بھی ان وعیدوں کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ تصاویر کا کاروبار اور خرید و فروخت کرنا بھی حرام ہے جیسا کہ اسلام میں شراب حرام ہے تو اس شراب کو بیچ کر قیمت لینا بھی حرام ہے۔

آج کل چونکہ ہماری حکومت اسلام سے بالکل عاری ہے اور ملک میں رہنے والے افراد پر یہ پابندی عائد ہے کہ وہ اپنا شناختی کارڈ بنوائیں اور تمام اداروں میں کام کرنے کے لیے شناختی کارڈ کے بغیر حکومت کوئی بات نہیں سنتی تو ایسے عالم میں اتنی تصویر بنانا جس کی ضرورت ہے اسی طرح جائز ہے جیسے موت کی کنکاش میں مبتلا انسان کو مردار وغیرہ کھانے کی اجازت ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة: ۱۷۳]

”جو شخص مجبور کر دیا جائے اور وہ بغاوت کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر (جان بچانے کے لیے حرام کھانے میں) کوئی گناہ نہیں۔“

ذخیرہ اندوزی

(سوال) ذخیرہ اندوزی کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

(جواب) ذخیرہ اندوزی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ » [مسلم، کتاب البيوع: باب تحريم الاحتكار في الأوقات (۱۶۰۵)]

”ذخیرہ اندوزی صرف نافرمان ہی کرتا ہے۔“

ذخیرہ اندوزی کا مطلب مہنگا کرنے کے لیے کسی چیز کا ذخیرہ کرنا ہے۔ جس طرح آج کل کئی لوگ بازار سے کوئی جنس خرید کر اس کی قلت پیدا کر دیتے ہیں اور جب وہ چیز لوگوں کو نہیں ملتی تو قیمت بڑھا کر بازار میں لے آتے ہیں۔ اگر کوئی چیز بازار میں نایاب ہو یا کم ملتی ہو تو اسے ذخیرہ کرنا حرام ہے۔ اگر کوئی جنس بازار میں وافر مقدار میں موجود ہے اور ذخیرہ کرنے سے لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تو ذخیرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ بنو نضیر کی کھجوروں میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال کا خرچ رکھ لیتے اور باقی فروخت کر دیتے تھے۔

بیع سلم کا حکم

سوال کیا بیع سلم جائز ہے؟ نیز بیع سلم کی وضاحت کریں۔

جواب بیع سلم کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ کوئی صاحب ضرورت کی بنا پر اپنی جنس تیار ہونے سے پہلے ہی اس کی بیع کر لیتا ہے کہ مجھے اتنی قیمت ابھی ادا کر دو تو جنس کے تیار ہونے پر میں اتنی جنس آپ کو دے دوں گا۔ اس کے بارے میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ ایک ایک، دو دو اور تین تین سالوں تک بیع سلم کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَّعْلُومٍ وَ وَزْنٍ مَّعْلُومٍ إِلَى أَجَلٍ مَّعْلُومٍ » [بخاری،

کتاب السلم: باب السلم فی وزن معلوم (۲۲۴۰)]

”جو شخص بیع سلم کرتا ہے وہ ماپنی جانے اور تولی جانے والی معلوم اشیاء میں معلوم مدت تک بیع کرے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بیع پر برقرار رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے بعد بھی یہ بیع کرتے رہے جیسا کہ بخاری شریف کی کئی احادیث سے ثابت ہے۔

زمین پر ناجائز قبضہ کرنے والے کی سزا

سوال کیا کسی کی جائداد پر ناجائز قبضہ کر لینا جرم ہے؟ اور اس کی سزا کیا ہے؟

جواب یہ عمل ناجائز اور حرام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا:

« فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحَرَمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا

فِي بَلَدِكُمْ هَذَا » [بخاری، کتاب العلم: باب قول النبی رب مبلغ أوعى من سامع (۶۷)، مسلم (۱۶۷۹)،

مسند احمد (۴۰/۵)، إرواء الغلیل (۲۷۸/۵)]

”بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے تمہارا یہ آج کا دن حرمت

والا ہے، جو تمہارے اس مہینے اور تمہارے اس شہر میں واقع ہوا ہے۔“

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اس ساری گفتگو سے مراد مالوں، جانوں اور عزتوں کی حرمت کی شدت کے ساتھ تاکید ہے اور ان کی پامالی سے ڈرانا ہے۔“ [شرح مسلم للنووی (۱/۱۱۱)]

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَأْخُذَنَّ أَحَدُكُمْ مَتَاعَ أَخِيهِ لِأَعْبَاءٍ وَلَا جَادًا وَمَنْ أَخَذَ عَصَا أَخِيهِ فَلْيُرِدَّهَا » [ابوداؤد،

كتاب الأدب: باب من يأخذ الشيء على المزاح (۵۰۰۳)، ترمذی (۲۱۶۰)]

”تم میں سے کوئی شخص بھی ہرگز اپنے بھائی کا سامان نہ لے، نہ ہنسی و مذاق کرتے ہوئے اور نہ شجیدگی کے ساتھ اور جس نے اپنے بھائی کی لاشی پکڑ لی اسے چاہیے کہ وہ واپس کر دے۔“

سیدنا ابو حمید ساعدی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيهِ بِغَيْرِ طَيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ قَالَ ذَلِكَ لِشِدَّةِ مَا حَرَّمَ اللَّهُ مِنْ

مَالِ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ » [ابن حبان، كتاب الجنائيات: باب ذكر الخبير الدال على ان الخ

(۵۹۷۸)، الموارد، مسند احمد (۴۲۵/۵)، بیہقی (۱۰۰/۱۶)، مجمع الزوائد (۱۷۱/۴)، غایة المرام

(ص ۲۶۲)]

”مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی لاشی اس کی رضا مندی کے بغیر لے۔“ (راوی حدیث نے) کہا:

”اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کرنے میں جو شدت اختیار کی ہے اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔“

اس مفہوم کی کئی ایک صحیح روایات اور بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی شدت

اور سختی کے ساتھ مسلمان کے مال کو مسلمان پر حرام قرار دیا ہے حتیٰ کہ ایک لکڑی بھی مسلمان کی اجازت کے بغیر لینے سے منع کر

دیا ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، آپ کے پاس دو آدمی زمین کے جھگڑے میں آئے۔ ایک نے کہا: ”اے اللہ کے

رسول! اس نے میری زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تیرے گواہ کہاں ہیں؟“ اس نے کہا: ”

میرے پاس گواہ نہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر اس کی قسم ہوگی۔“ امراء اقیس نے کہا: ”پھر تو قسم کھا کر یہ زمین

لے جائے گا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تیرے لیے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ جب وہ قسم کھانے کے لیے کھڑا ہوا تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے ظلم سے زمین چھین لی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا۔“

[احمد (۳۱۷/۴)، شرح معانی الآثار (۲۴۸/۴)]

سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

« مَنْ ظَلَمَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا طُوقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ » [بخاری، كتاب المظالم: باب إثم من ظلم

شيئا من الأرض (۲۴۵۲)، مسلم، كتاب المساقاة: باب تحريم الظلم و غصب الأرض وغيره (۱۶۱۰)]

”جس نے زمین (کے معاملہ) میں سے ذرا بھی ظلم کیا اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں کا طوق پہنا دے گا۔“
ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا لوگوں کے درمیان جھگڑا تھا انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا تو عائشہ نے کہا: ”اے ابو سلمہ! زمین کے جھگڑوں سے اجتناب کرو۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے ایک باشت برابر زمین ظلم سے حاصل کی تو زمین کا وہ حصہ سات زمینوں تک اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔“ [بخاری، کتاب المظالم: باب إذا أذن له أو أحله و لم يبين كم هو (۲۴۵۳)]

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بَغَيْرِ حَقِّهِ خُسْفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرْضِينَ» [بخاری، کتاب المظالم: باب إذا أذن له أو أحله (۲۴۵۴)]

”جس شخص نے زمین میں سے کچھ بھی ناحق لیا تو اسے قیامت والے دن اس کے بدلے سات زمینوں تک دھسا دیا جائے گا۔“

یعلیٰ بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

«أَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شَيْئًا مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بَغَيْرِ حَقِّهِ خُسْفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرْضِينَ ثُمَّ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ» [ابن حبان (۱۱۶۷)، الموارد، طبرانی کبیر (۲۷۰/۲۲)، مسند احمد (۱۷۳/۴)، مجمع الزوائد (۱۷۰/۴)]

”جس شخص نے بھی زمین میں سے ایک باشت برابر ظلم کیا اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک دھسا دے گا پھر قیامت والے دن وہ اسے لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک طوق پہنائے گا۔“

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَعْظَمُ الْغُلُولِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذِرَاعُ أَرْضٍ يَسْرِفُهُ رَجُلٌ فَيَطْوِقُهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ»

[فتح الباری (۱۰۵/۵)]

”اللہ کے ہاں قیامت والے دن سب سے بڑی خیانت ایک ہاتھ زمین ہوگی جسے آدمی چوری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک طوق پہنائے گا۔“

قاضی شوکانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”غصب کرنے والا گناہ گار ہے اور وہ چیز جو اس نے غصب کی ہے اسے واپس کرنا اس پر واجب ہے، کسی مسلمان کا

مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔“ [الدرر البہیة (ص ۸۸۱)]

نواب صدیق حسن خان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”غاصب اس لیے گناہ گار ہے کہ اس نے اپنے غیر کا مال باطل طریقے سے کھایا ہے یا اس پر زیادتی کرتے ہوئے غالب ہو گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اپنے مالوں کو آپس میں

باطل طریقے سے مت کھاؤ۔“ [الروضة الندية (۱۴۹/۲)]

مذکورہ بالا صحیح دلائل سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کی زمین، اس کے مال و متاع پر ناجائز تصرف و قبضہ کرنا حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے، اگر کوئی شخص کسی کی زمین پر قبضہ کر کے کاشتکاری کرے یا مکان تعمیر کرے تو اس سے زمین واپس لی جائے گی اور اسے صرف اس کے اخراجات ادا کر دیے جائیں گے۔

خورد و نوش کی اشیاء ادھار لینا

(سوال) کیا عام کھانے پینے کی چیزیں ادھار لینا اسلام میں جائز ہے؟

(جواب) ایسی اشیاء کے ادھار لینے کا شریعت میں جواز موجود ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار اناج خریدا اور اپنی زرہ بطور رہن اس کے پاس رکھی۔“ [بخاری، کتاب

الرهن: باب من رهن درعه (۲۵۰۹)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کی اشیاء ادھار لی جاسکتی ہیں۔

قرآن کی تعلیم پر معاوضہ لینا

(سوال) کیا قرآن مجید کی تعلیم خطبہ جمعہ اور امامت وغیرہ پر اجرت لینا جائز ہے؟

(جواب) قرآن مجید کی تعلیم، خطبہ جمعہ، امامت وغیرہ پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی ممانعت کے بارے میں قرآن و سنت کے اندر کوئی صریح نص موجود نہیں ہے جب کہ اس کے جواز کے دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں:

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا ایک بستی سے گزر ہوا، بستی والوں نے طلب کرنے پر بھی ان کی مہمان نوازی نہ کی۔ اچانک ان کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا۔ ان کے افراد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور پوچھا: ”تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟“ صحابہ میں سے ایک نے اجرت لے کر دم کرنے کی ہائی بھری۔ تو انھوں نے بکریوں کے ایک ریوڑ کا وعدہ کر لیا۔ صحابی رسول نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا اور متاثرہ جگہ اپنا لعاب لگایا تو وہ آدمی بالکل تندرست ہو گیا۔ وہ صحابی بکریاں لے کر واپس آیا تو دوسرے ساتھیوں نے کہا: ”تو نے کتاب اللہ پر اجرت لی ہے۔“ گویا انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا، پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہا: ”اے اللہ کے رسول! اس نے اللہ کی کتاب پر اجرت لی ہے۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابَ اللَّهِ» [بخاری، کتاب الطب: باب الشروط فی الرقیۃ (۵۷۳۷)]

”سب سے زیادہ جس چیز پر تم اجرت لینے کا حق رکھتے ہو وہ اللہ کی کتاب ہے۔“

صحیح بخاری کی اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن پر اجرت لی جاسکتی ہے۔ اس میں قرآن کی تعلیم، امامت اور خطبہ جمعہ

بھی داخل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ عام ہیں اور ان میں وہ شامل ہیں۔ اگر اجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ یہ نہ کہتے کہ میرا حصہ بھی نکالو جیسا کہ صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ تو ہمیشہ حلال اور پاکیزہ چیز ہی استعمال کرتے تھے۔

دوسری دلیل نکاح میں خاوند پر بیوی کے لیے حق مہر دینا ضروری ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا نکاح قرآن مجید کی تعلیم کو حق مہر ٹھہرا کر کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذْهَبْ فَقَدْ أَنْكَحْتَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ » [بخاری، کتاب النکاح: باب التزویج علی القرآن (۵۱۴۹)]

”جا، میں نے اس قرآن کے بدلے جو تیرے پاس ہے تیرا اس کے ساتھ نکاح کر دیا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خود قرآن مجید کی تعلیم کی اجرت دلوائی ہے۔ اگر اجرت درست نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کبھی قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر نہ کرتے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے:

”اس سے قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہوا۔“ [فتح الباری (۱۲۱/۹)]

لہذا ثابت ہوا کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت لی جاسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

جی پی فنڈ کی شرعی حیثیت

(سوال) ہم سرکاری ملازمین کا واسطہ جی پی فنڈ سے پڑتا ہے کیا شریعت اسلامیہ کی رو سے یہ جائز ہے؟

(جواب) جی پی فنڈ سے مراد وہ رقم ہے جو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے حکومت ہر ماہ کاٹتی ہے پھر ان کی ریٹائرمنٹ پر مع اضافہ انھیں دے دیتی ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے زائد وصول شدہ رقم سود ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ۲۷۸، ۲۷۹]

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے، چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو بس اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر تم نے توبہ نہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارا اصل مال ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اصل مال لینے کا حکم فرمایا ہے اور زائد رقم کی وصولی سے روک دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ سودی رقم لینا ایمان کے منافی ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے۔ اسی طرح احادیث میں سود لینے والوں پر لعنت مذکور ہے۔ لہذا ملازم آدمی صرف اپنی اصل رقم جو اس کی کاٹی جاتی ہے وہی وصول کر سکتا

ہے۔ زائد رقم اگر لیتا ہے تو وہ اس کا مالک نہیں۔ وہ یقیناً سود کھا کر لعنت کا مستحق بنتا ہے اور یہ بات حکومتی طبقہ جانتا ہے کہ جی پی فنڈ میں جو زائد رقم دی جاتی ہے وہ سود ہے جیسا کہ گورنمنٹ اکاؤنٹ میں جو فارم ملتا ہے اس کے خانہ نمبر ۱۴ میں یہ بات درج ہے کہ ”کیا ملازم اپنی جمع شدہ رقم پر سود کا خواہش مند ہے یا نہیں؟“ اگر ملازم چکھ دے کہ میں سود وصول نہیں کروں گا تو اس کی جمع شدہ رقم کو سود کی آلائش و آمیزش سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس لیے تمام ملازمین کو اس رقم کی وصولی سے اجتناب کرنا چاہیے۔



نکاح کے احکام

WWW. KITABOSUNNAT.COM

نکاح کے لیے ذات برادری ایک ہونا

(سوال) کیا نکاح کے لیے میاں بیوی کی ذات کا ایک ہونا ضروری ہے؟ کیا کوئی سید غیر سید سے شادی کر سکتا ہے؟

(جواب) لڑکی سیدہ ہاشمیہ ہو یا کوئی اور اس کا نکاح کسی بھی مسلمان لڑکے سے بلا تردد درست ہے۔ کیونکہ ترجیح اور برتری کی بنیاد نسلی امتیازات اور خاندانی حسب نسب، جاہ و جلال، مال و زر، ذات و برادری وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ تقویٰ، پرہیزگاری، اللہ کے خوف وغیرہ جیسی صفات عالیہ پر موقوف ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اس کی وضاحت اچھی طرح فرمادی تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر، سفید کو سیاہ پر کوئی برتری نہیں۔ ہر مسلمان کی حرمت برابر مقدس ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴾ [الحجرات: ۱۳]

”اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تم سب کو مختلف قومیں اور قبیلے اس لیے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان لیا کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا خبردار ہے۔“

یعنی ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر تم سب برابر ہو لہذا کسی بھی فرد کا اپنے حسب نسب پر فخر کرنا اور دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنا جہالت و بے وقوفی ہے۔ اگرچہ باعتبار اصلی تم سب ایک اور یکساں ہو لیکن تمہارا مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں منقسم ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس لیے ہم نے تمہاری تقسیم کردی مگر اس تقسیم کا مقصد برتری اور کمتری نہیں، عزت اور ذلت کا معیار قائم کرنا نہیں بلکہ ایک دوسرے کی پہچان اور معرفت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی ایک کو دوسرے پر خاندانی حسب نسب اور نسلی امتیازات کی وجہ سے کوئی ترجیح نہیں، ترجیح تو تقویٰ و پرہیزگاری پر موقوف ہے، لہذا سید اور غیر سید یکساں ہیں اور اولاد آدم ہی سے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰]

”بے شک مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور مسلم معاشرے کے یکساں فرد اور معزز ارکان ہیں۔ یعنی

- سیدہ لڑکی کا نکاح غیر سید مسلمان کے ساتھ جائز ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں:
- ① رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا تھا حالانکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام تھے اور بی بی زینب رضی اللہ عنہا قریشی خاتون تھیں۔
 - ② اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا نکاح فاطمہ بنت قیس القریشیہ رضی اللہ عنہما سے ہوا۔
 - ③ سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بہن سے ہوا۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ حبشی غلام تھے جن کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کیا تھا اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ قبیلہ قریش کے سربراہ اور معروف تاجر تھے۔
 - ④ ابوحنیفہ بن عتبہ بدری رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی عتبیہ بنت ولید بن عتبہ کا نکاح سیدنا سالم رضی اللہ عنہ، جو ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، کے ساتھ کر دیا۔
 - ⑤ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم بنت فاطمہ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔
 - ⑥ نبی کریم ﷺ نے اپنی دونوں بیٹیوں سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح یکے بعد دیگرے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا تھا جب کہ آپ ہاشمی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اموی تھے۔
 - ⑦ سیدنا علی بن حسین جو زین العابدین کے نام سے معروف ہیں، کا نکاح شہر بانو بنت یزید جرد بن شہریار سے ہوا۔ لہذا کتاب و سنت کی رو سے نکاح میں کفو کے لیے صرف دین کی شرط ہے اور دین کے علاوہ باقی چیزوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ ہمارے ملک میں جو یہ بات رائج اور معروف ہے کہ اپنی برادری کے علاوہ کسی دوسری برادری میں رشتہ نہیں کرنا چاہیے، سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ ساری باتیں قرآن و سنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔

اسلام میں جہیز کی حیثیت

- سوال** جہیز نہ ہونے کی وجہ سے کتنے ہی گھرانوں کی بچیاں سنت نکاح سے محروم ہیں جہیز کی شرعی حیثیت پر آشکار فرما کر عند اللہ ماجور ہوں؟
- جواب** شادی سے پہلے رشتے کی بات چیت کے وقت لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سر پرستوں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ کرنا خواہ وہ جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کی صورت میں ہو یا نقدی اور مختلف سامان کی صورت میں ہو اور رشتے کی منظوری کو اس پر معلق و موقوف کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے لڑکے والوں سے یہ کہنا کہ اگر آپ یہ رشتہ منظور کر لیں تو ہم جہیز میں نقد اور فلاں فلاں اشیاء دیں گے، سراسر غلط اور شریعت کے خلاف ہے۔ اس لین دین کی رسم کا نام چاہے جو بھی رکھا جائے یہ شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:
- ① ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے مطابق عمل کرنا اور زندگی کے تمام معاملات میں آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَ الْيَوْمَ الْآخِرَ وَ ذَكَرَ
اللَّهَ كَثِيرًا ﴾ [الأحزاب: ۲۱]

”تم میں سے جو کوئی اللہ اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔“

پھر آپ ﷺ کے بعد آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسوۂ حسنہ عملی نمونہ ہے جس کی پیروی اور اتباع و اقتداء سب کے لیے ضروری ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کے تمام افعال خند، عقیدہ، مکتبی اور شادی وغیرہ کی تقریبات کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے انجام دیا ہے لیکن ان کے ایام ہائے زندگی میں یہ رسومات اور مطالبات ہمیں نہیں ملتے۔ الغرض شرع میں اس کا وجود تک نہیں ہے۔

② ہر مسلمان کے لیے شریعت مطہرہ میں شادی کے موقع پر یا رشتہ طے کرتے وقت یا شادی کے بعد لڑکی والوں پر کسی قسم کا خرچ اور بوجھ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ یہ سارا بوجھ لڑکی کا لڑکے پر رکھا گیا ہے کہ یہ اس کو ضروریات زندگی کے اسباب مہیا کرے۔ اس لیے شوہر کو قرآن میں توام کہا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَ بِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ﴾
[النساء: ۳۴]

”مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس واسطے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نان و نفقہ اور مہر وغیرہ تمام اخراجات مرد کے ذمے ہیں۔ تو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے سر پرستوں سے کسی مال و متاع کا مطالبہ شریعت کی منشا کے خلاف ہے۔

③ ہندو مذہب میں لڑکی کو والدین سے وراثت نہیں ملتی، اس لیے لڑکے والے چاہتے ہیں کہ جیسے بھی ہو اور جس شکل میں بھی ہو لڑکی والوں سے زیادہ سے زیادہ مال و متاع حاصل کر لیا جائے، اس لیے وہ شادی کے موقع پر مذکورہ مطالبہ کرتے ہیں اور لڑکی والے ان کے مطالبے کو پورا کرتے ہیں۔ انہی کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو وراثت سے محروم کرتے ہیں، حالانکہ وراثت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور قرآن نے انہیں حدود اللہ کہا ہے اور اس کے ادا کرنے پر عظیم کامیابی کی خوشخبری سنائی ہے اور وراثت سے محروم کرنے پر ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وعید فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَ مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَ مَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ وَ يَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَ لَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴾ [النساء: ۱۳، ۱۴]

”یہ اللہ کی حدیں ہیں، جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اس کو وہ جنت میں داخل کرے گا، جس کے

نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اس کو جہنم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ وراثت کو ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ہے اور جو لوگ اس کی ادائیگی نہیں کرتے وہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے ابدی جہنم کی وعید ہے اور جہیز درحقیقت وراثت کی نفی ہے۔
 (۳) ان وجوہات کے علاوہ جہیز کے نقصانات اس قدر ہیں کہ عام طور پر غریب لوگوں کی بیٹیوں کا نکاح جہیز نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتا اور نوجوان لڑکیاں اسی طرح گھر میں بیٹھ کر اپنی عمر برباد کر دیتی ہیں اور کئی لڑکیاں نکاح نہ ہونے کے باعث مختلف جرائم کا شکار ہو جاتی ہیں جس کے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خلاف شرع کاموں سے محفوظ فرمائے اور جہیز جیسی لعنت سے بچنے کی توفیق دے۔ (آمین!)

اگر شادی کے لیے خرچہ محدود ہو تو؟

سوال کیا شادی کے لیے فراوانی کا ہونا ضروری ہے اگر تنگدست شخص شادی کر لے تو کوئی شرعی قباحت تو نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب دنیا کے رسوم و رواج سے دور رہ کر اگر آپ اسلامی نقطہ نظر سے سوچیں تو آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، آپ کا فقر اور تنگدستی ممکن ہے کہ اللہ نکاح کے ذریعے دور کر دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ أَنْكِحُوا الْآيَامَىٰ مِنْكُمْ وَ الصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ إِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ [النور: ۳۲]

”تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح ہوں ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلام اور باندیوں کا بھی اور وہ مفلس ہوں تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت والا، علم والا ہے۔“
 یعنی محض غربت اور تنگ دستی نکاح میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے، ممکن ہے نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ تنگ دستی، فقر اور محتاجی کو اپنے خاص فضل و کرم سے وسعت اور فراخی میں بدل دے۔

نبی کریم ﷺ کی صحیح حدیث ہے: ”تین شخص ایسے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے، ایک نکاح کرنے والا جو پاکدامنی کی نیت سے نکاح کرتا ہے، دوسرا مکاتب غلام جو ادائیگی کی نیت رکھتا ہے اور تیسرا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا۔“
 [ترمذی، ابواب فضائل جہاد: باب ما جاء في المجاهد والمكاتب والنكاح (۱۶۵۵)، عبد الرزاق (۹۵۴۲)، مستدرک حاکم (۲۱۷/۲)، نسائی، کتاب الجهاد: باب فضل الروححة في سبيل الله (۳۱۲۲)، ابن ماجہ، کتاب العتق، باب المكاتب (۲۵۱۸)، صحيح ابن حبان (۱۶۵۳)، الموارد، مسند ابی یعلیٰ (۴۱۰/۱۱)، شرح السنة (۷۱۹)]
 اہل بن سعد الساعدي رضی اللہ عنہم سے روایت ہے: ”ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول!

میں اس لیے آئی ہوں کہ آپ کے لیے اپنے نفس کو بہہ کروں۔“ رسول اللہ ﷺ نے اس پر اوپر سے نیچے تک نظر دوڑائی پھر اپنا سر نیچے کر لیا۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تو بیٹھ گئی۔ آپ کے صحابہ میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اگر آپ کو اس کی حاجت نہیں تو اس کو میرے ساتھ بیاہ دیجیے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے؟“ اس نے کہا: ”اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! (میرے پاس کچھ) نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے گھر جا کر دیکھ کہ تیرے پاس کچھ ہے کہ نہیں۔“ وہ چلا گیا پھر واپس آیا اور اس نے کہا: ”اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! میں نے کچھ نہیں پایا۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تلاش کر اگر چہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ واپس گیا اور پھر آیا اور کہنے لگا: ”اے اللہ کے رسول! لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں ملی لیکن میرا یہ تہ بند ہے، اس کا آدھا حصہ اسے دے دوں گا۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اپنے تہ بند کے ساتھ کیا کرے گا؟ اگر تو پہننے کا تو اس عورت پر اس میں سے کچھ نہ ہوگا اور اگر یہ عورت پہن لے گی تو تیرے اوپر کچھ نہ ہوگا۔“ وہ آدمی بیٹھ گیا، یہاں تک کہ اس کی مجلس لمبی ہو گئی، وہ پھر کھڑا ہوا اور چل دیا، رسول اللہ ﷺ نے اسے منہ پھیر کر جاتے ہوئے دیکھا تو اسے بلایا۔ جب وہ آیا تو آپ نے کہا: ”تیرے پاس قرآن کریم میں سے کیا ہے؟“ اس نے کہا: ”فلاں فلاں سورتیں۔“ آپ ﷺ نے کہا: ”تو انھیں اچھی طرح یاد رکھتا ہے۔“ اس نے کہا: ”ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جا، میں نے ان سورتوں کے عوض اس عورت سے تیرا نکاح کر دیا۔“ [بخاری، کتاب النکاح: باب تزویج المعسر (۵۰۸۷)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کیلئے شریعت میں لمبے چوڑے اخراجات نہیں ہیں، جس صحابی کا نکاح رسول اللہ ﷺ نے کیا اس کے پاس تو سوائے تہ بند کے کچھ نہ تھا۔ آج کون سا ایسا شخص ہے جس کے پاس کم از کم ایک جوڑا کپڑوں کا نہ ہو۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے پاس لباس وافر ہیں، رہائش کے لیے گھر موجود ہے۔ صحابی سے بڑھ کر معاشی حالت درست ہے۔ لہذا آپ رسومات اور رواجوں سے ہٹ کر سنت نبوی کے مطابق نکاح کروالیں۔ حق مہر کی بھی شرع میں کوئی مقدار کم یا زیادہ متعین نہیں، حسب استطاعت مہر ادا کر دیں۔ بدکاری و فحاشی کے اس سیل رواں میں پاکدامنی اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے اور نکاح بدکاری سے بچنے کا بہترین راستہ ہے۔ اس لیے گھر والوں کی بات تسلیم کر کے نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں، اللہ تعالیٰ مالی مشکلات کو اپنے فضل و کرم سے درست کر دے گا۔

بے نماز شخص کو لڑکی کا رشتہ دینا

سوال کیا کوئی شخص اپنی بیٹی کا رشتہ بے نمازی سے کر سکتا ہے؟

جواب بے نماز کو لڑکی کا رشتہ نہیں دیا جا سکتا بشرطیکہ لڑکی خود صوم و صلاۃ کی پابند ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ أَقْمَنَ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ﴾ [السجدة: ۱۸]

”کیا ایک مومن کسی فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔“

چونکہ بے نماز فاسق ہے اور فاسق مرد صوم و صلاۃ کی پابند عورت کا کفو نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایسے لڑکے کو رشتہ نہیں دینا چاہیے البتہ اگر لڑکی بھی بے نماز ہے تو الگ بات ہے۔

ولی کی اجازت کے بغیر نکاح

(سوال) ولی کے بغیر نکاح کی کیا شرعی حیثیت ہے اگر کوئی عورت خود اپنا نکاح کر لے تو کیا وہ نکاح ہو جائے گا؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو بدکاری، فحاشی، عریانی اور بے حیائی سے محفوظ رکھنے کے لیے نکاح کا حکم دیا ہے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ اسے راہ راست سے ہٹانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ موجودہ معاشرے میں بھی امت مسلمہ میں بدکاری و فحاشی کو عروج دینے کے لیے مختلف یہودی ادارے، ان کے قبیعین اور آزادی نسواں کے نام پر کئی انجمنیں اور ادارے بنا کر مسلمان ممالک میں فحاشی اور بے حیائی کے فروغ میں منہمک ہیں۔ یہ لوگ یورپ کی طرح مسلمان معاشرے کو بھی آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس جرم سے بچانے کے لیے اور آنکھ اور شرمگاہ کی حفاظت کے لیے مسلم مرد و زن کے لیے نکاح کی بڑی اہمیت بیان کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ أَنْكِحُوا الْاَيَامَى مِنْكُمْ وَ الصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَائِكُمْ اِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ [النور: ۳۲]

”تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو، اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔“

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَ لَيْسَتْغَفِيهِ الدِّينَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ ﴾ [النور: ۳۳]

”اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کا حکم بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جنہیں نکاح کی استطاعت نہ ہو وہ اپنے آپ کو پاک و صاف رکھیں اور بدکاری و زنا سے بچے رہیں۔ اس کی مزید تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿ يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغْضُ لِلْبَصْرِ وَ أَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءٌ ﴾ [بخاری، کتاب النکاح: باب قول النبی من استطاع

منکم الباءۃ (۵۰۶۵)، (۱۹۰۵)]

”اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص اسباب نکاح کی طاقت رکھتا ہو، وہ نکاح کر لے کیونکہ یہ نگاہ کو نیچا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جو اس کی استطاعت نہ رکھے وہ روزے رکھے کیونکہ روزے بندے کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ لَمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي» [ابن ماجہ، کتاب النکاح: باب ما جاء فی

فضل النکاح (۱۸۴۶)]

”نکاح کرنا میری سنت ہے، جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں۔“

اسی طرح قرآن مجید میں نکاح کو سکون اور محبت و رحمت کا باعث قرار دیا گیا ہے اور کہیں ”محسنین غیر مسافحین“ کہہ کر بدکاری سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ لہذا بدکاری اور زنا کاری سے بچنے کے لیے ہمیں نکاح جیسے اہم کام کو سرانجام دینا چاہیے اور اس کے لیے طریقہ کار رسول مکرم ﷺ کے بیان کردہ احکامات سے لینا چاہیے۔ آپ ﷺ نے نکاح کے جو اصول و ضوابط ذکر فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔ اگر لڑکی اپنی مرضی سے گھر سے فرار اختیار کر کے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے تو اس کا نکاح باطل قرار پاتا ہے۔ عورت کے لیے اولیاء کی اجازت کے مسئلے میں کتاب و سنت سے دلائل درج ذیل ہیں:

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَ لَوْ أَعَجَبَكُمْ﴾

[البقرة: ۲۲۱]

”اور (اپنی بیٹیاں) مشرکین کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور البتہ مومن غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ اچھا لگے۔“

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فِي هَذِهِ الْآيَةِ دَلِيلٌ بِالنَّصِّ عَلَىٰ أَنَّ لَانَكَاحَ الْإِبُولِيِّ“ [تفسیر قرطبی (۴۹/۳)]

”یہ آیت اس بارے میں نص ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں۔“

② ایک اور آیت میں ہے:

﴿وَ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرة: ۲۳۲]

”اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں ان کے خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔“

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا تو اس نے اسے طلاق دے دی یہاں تک کہ ان کی عدت پوری ہوگئی پھر وہ دوبارہ رشتے کے لیے آیا تو بھائی نے دوبارہ نکاح میں دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ [فتح الباری (۸۹/۹)، تفسر ابن کثیر (۳۰۲/۱)، شرح السنۃ (۴۴/۹)]
حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَهِيَ أَصْرُحُ دَلِيلٍ عَلَىٰ اِعْتِبَارِ الْوَلِيِّ وَ اَلَّا لَمَّا كَانَ لِعَضْلِهِ مَعْنَىٰ وَ لِاَنَّهَا لَوْ كَانَ لَهَا اَنْ تُزَوَّجَ نَفْسَهَا لَمْ تَحْتَجَّ اِلَىٰ اَخِيهَا وَ مَنْ كَانَ اَمْرُهُ اِلَيْهِ لَا يُقَالُ اَنَّ غَيْرَهُ مَنَعَهُ مِنْهُ“ [فتح الباری (۹۴/۹)]
”یہ آیت ولی کے معتبر ہونے پر سب سے زیادہ واضح دلیل ہے اور اگر ولی کا اعتبار نہ ہوتا تو اس کو روکنے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔ اگر معقل کی بہن کے لیے اپنا نکاح خود کرنا جائز ہوتا تو وہ اپنے بھائی کی محتاج نہ ہوتی اور اختیار جس کے ہاتھ میں ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ کسی نے اس کو روک دیا ہے۔“
امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”فَفِي الْآيَةِ دَلِيلٌ عَلَىٰ اَنَّهُ لَا يَجُوزُ النِّكَاحُ بِغَيْرِ وَلِيِّ.....“ [فتح الباری (۹۴/۹)] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: معالم التنزيل للبعثی (۲۱۱/۲)، المغنی لابن قدامة (۳۳۸/۷)، تفسیر ابن کثیر (۳۰۲/۱)

”یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ولی کے بغیر نکاح جائز نہیں، اس لیے کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن مطلقہ تھی اگر نکاح کا معاملہ ولی کی بجائے اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ اپنا نکاح خود کر لیتی اور اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿فَلَا تَعْضَلُوهُنَّ﴾ میں خطاب عورت کے اولیاء کو ہے۔“
علاوہ ازیں مندرجہ ذیل آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کے اولیاء ہی کو خطاب کیا ہے:

﴿ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامِي مِنْكُمْ ﴾ [النور: ۳۲]

﴿ فَاَنْكِحُوهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ﴾ [النساء: ۲۰]

اس مسئلے کی مزید وضاحت کئی ایک صحیح احادیث سے ہوتی ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① دور جاہلیت میں ولی کی اجازت سے نکاح کے علاوہ بھی نکاح کی کئی صورتیں رائج تھیں جن کی تفصیل ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہے، وہ فرماتی ہیں:

﴿ فَنِكَاحُ مِنْهَا نِكَاحُ النَّاسِ الْيَوْمَ يَخْطُبُ الرَّجُلُ اِلَى الرَّجُلِ وَلَيْتَهُ اَوْ ابْنَتَهُ فَيَتَصَدَّقُهَا ثُمَّ يَنْكِحُهَا ﴾

”ان میں سے ایک نکاح جو آج کل لوگوں میں رائج ہے کہ آدمی دوسرے آدمی کے پاس اس کی زیر ولایت لڑکی یا اس کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجتا، اسے مہر دیتا پھر اس سے نکاح کر لیتا۔“

پھر انھوں نے نکاح کی کچھ دوسری صورتیں ذکر کیں جو ولی کی اجازت کے بغیر رائج تھیں۔ آخر میں فرمایا:

« فَلَمَّا بُعِثَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ هَدَمَ نِكَاحَ الْجَاهِلِيَّةِ كُلَّهُ إِلَّا نِكَاحَ النَّاسِ

الْيَوْمَ » [بخاری، کتاب النکاح: باب من قال "لا نکاح الا بولی" (۵۱۲۷)]

”جب محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام نکاح منہدم کر دیے سوائے اس نکاح کے جو آج کل رائج ہے۔“

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوْلَاهَا فَإِنَّا كَأَنَّهَا بَاطِلٌ فَإِنَّا كَأَنَّهَا بَاطِلٌ »

[ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الولی (۲۰۸۳)]

”جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔“

③ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّ » [مسند احمد (۳۹۴/۴)، دارمی (۱۳۷/۲)، حاکم (۱۲۹/۲)، ابوداؤد

(۲۰۸۵)، ترمذی (۱۱۰۲)، طبرانی کبیر (۳۵۱/۸) دارقطنی (۲۱۹/۳)]

”ولی کے بغیر نکاح نہیں۔“

شخص الحق عظیم آبادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ الْحَقُّ أَنَّ النِّكَاحَ بِغَيْرِ الْوَلِيِّ بَاطِلٌ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ أَحَادِيثُ الْبَابِ « [عون المعبود (۱۹۱/۲)]

”حق یہی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح باطل ہے جیسا کہ اس پر باب کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے اور یہ روایت نکاح کی صحت میں شرط ہے یعنی اگر ولایت

مفقود ہوئی تو نکاح درست نہیں ہوگا۔ [بداية المجتهد (۷/۲)]

امام ابن قدامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”يَقِينًا وَ لِي كَيْفَ نِكَاحٌ صَحِيحٌ أَوْ عَوْرَتِ أَيْمَانِهِ أَوْ عَوْرَتِ مَنْ يَدُلُّ عَلَيْهِ أَحَادِيثُ الْبَابِ « [عون المعبود (۱۹۱/۲)]

کرانے کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ولی بنانے کی مختار ہے، اگر اس نے ایسا کیا تو نکاح صحیح نہیں

ہوگا۔ [المعنى (۳۴۵/۹)]

امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”إِنَّ الْعَقْدَ بِغَيْرِ وَلِيِّ بَاطِلٌ « [کتاب الأم مختصر للإمام مزنی (ص/۱۶۳)]

”ولی کے بغیر نکاح باطل ہے۔“

امام سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّي وَعَلَى هَذَا.....“ [موسوعة فقه سفیان نوری (ص ۷۹۳/۱)]

”ولی کے بغیر نکاح نہیں اور اسی بنا پر عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ اپنے نکاح کے لیے اپنے ولی کے علاوہ کسی اور کو متعین کرے اور جب اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح خود کر سکے تو اس کے لیے کسی دوسری عورت کا نکاح کروانا بالاولیٰ جائز نہیں۔“

امام حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّي“ [موسوعة فقه الحسن بصری (۸۹۷)]

”ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔“

امام ابراہیم رضی اللہ عنہ جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے استاد الاستاد ہیں، فرماتے ہیں:

”لَيْسَ الْعَقْدُ بَيْنَ النِّسَاءِ إِنَّمَا الْعَقْدُ بَيْنَ الرِّجَالِ“ [ابن ابی شیبہ (۲۰۸/۱)، موسوعة فقه ابراہیم

النخعی (۱۶۷۷/۱)]

”عقد قائم کرنا عورتوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مردوں کے ہاتھ میں ہے۔“

ان تمام دلائل وحوالہ جات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنت اور جمہور ائمہ محدثین کے نزدیک عورت کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو عورت اپنا نکاح خود کر لیتی ہے ایسا نکاح باطل ہے اور ان کے درمیان جدائی کرادی جائے گی تاکہ وہ ناجائز فعل کے مرتکب نہ ہوں۔

کورٹ میرج کی شرعی حیثیت

(سوال) میرج کورٹ کے متعلق شرعی احکام سے آگاہ فرمادیں؟

(جواب) موجودہ معاشرے میں امت مسلمہ کے اندر فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو عام کرنے کے لیے مختلف یہودی ادارے آزادی نسواں کے نام سے اٹھنے والی تحریکیں اور یہود و نصاریٰ کے تحت اسلامیات کی ڈگریاں لینے والے پروفیسرز اور وکلاء اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا اور لڑکی عشق معاشقے کے مارے گھر سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں تو انھیں پولیس اور نام نہاد عدالتوں کا سہارا مل جاتا ہے۔ وہ اپنی اس غلط روش کو ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کے بندھن کا روپ دے لیتے ہیں۔ آج کل نوجوان لڑکیوں کی خودسری اور گھروں سے فرار کی وبا عام ہے۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ بعض نام نہاد علماء بھی انھیں سند جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان بد قماش اور آوارہ لڑکیوں کی تائید کر کے معزز اور شریف والدین کی بے عزتی اور بے بسی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن اس تاریک دور میں بعض سچ ایسے بھی ہیں جو عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اس بے راہ روی پر قابو پانے کے لیے ایسی لڑکیوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور کتاب و سنت کے دلائل کو مد نظر رکھ کر صحیح فیصلہ بھی کر جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ

آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اکثر حج بھی فیصلے کیے جا رہے ہیں کہ اگر لڑکا اور لڑکی گھر سے فرار ہو کر کے عدالت کے سامنے یا پولیس ہی کے سامنے ازدواجی زندگی کا اقرار کر لیں تو یہ نکاح صحیح شمار ہوگا حالانکہ کتاب و سنت کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے۔ اس نکاح کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس نکاح میں لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرتی ہے اور یہ بات پچھلے مسئلے میں ثابت کی جا چکی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں ولی کی اجازت کے بغیر کیا گیا نکاح باطل و ناجائز ہے۔

والد کی موجودگی میں چچا کی ولایت

(سوال) کیا والد کی موجودگی میں چچا ولی بن سکتا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

(جواب) یہ جائز نہیں۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”إِنْ زَوَّجَ الْمَرْأَةَ الْوَالِيَّ الْأَبْعَدُ مَعَ حُضُورِ الْوَالِيِّ الْأَقْرَبِ بِغَيْرِ إِذْنِهِ فَاجَابَتْهُ إِلَى زَوْجِهَا فَالْعَقْدُ فَاسِدٌ“ [المغنی (۳۶۴/۷)]

”اگر عورت کا دور کا ولی قریبی ولی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح کر دیتا ہے تو یہ نکاح فاسد ہے خواہ عورت اس کو قبول ہی کر لے۔“

کیونکہ ولی ہونا تعصیب سے ہے، جس طرح قریبی عصبہ کے ہوتے ہوئے دور والے عصبات محروم ہوتے ہیں اسی طرح قریبی ولی کی موجودگی میں دور والے کو اس کا اختیار نہیں ہے اور میراث میں یہ ترتیب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ قریبی ولی دوسرے اولیاء سے عورت کی مصلحت پر زیادہ حریص ہوتا ہے اور اس پر شفقت اور رحم کے لحاظ سے بھی دوسروں سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے یہ حق صرف اسی کو ہونا چاہیے۔ ہاں اگر یہ خود کسی دوسرے کو اجازت دے دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (واللہ اعلم)

بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح

(سوال) کیا کوئی شخص اپنی بیوی کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کر سکتا ہے؟ قرآن و سنت کی رو سے راہ نمائی کریں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے رشتوں کی حلت و حرمت کا ذکر بڑی ہی صراحت سے کیا ہے، اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکمل توضیح فرمائی ہے۔ سائل کی مراد اگر یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دینے یا اس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کرنا تو یہ بالکل جائز و درست ہے، اگر مراد بیوی کی موجودگی میں اس کی بھانجی یا بھتیجی سے نکاح کرنا تو یہ حرام ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کسی عورت سے اس کی پھوپھی کی موجودگی میں یا پھوپھی سے اس کی بھتیجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے، اسی طرح اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کسی عورت سے اس کی خالہ کی موجودگی میں یا خالہ سے اس کی

بھانجی کی موجودگی میں نکاح کیا جائے اور نہ چھوٹی بہن کی موجودگی میں اس کی بڑی بہن سے اور بڑی کی موجودگی میں

چھوٹی سے نکاح کیا جائے۔“ [ترمذی، کتاب النکاح : باب ماجاء لا تنکح المرأة علی عمتها (۱۱۲۶)]

امام ترمذی رحمہ اللہ اس باب میں فرماتے ہیں: ”عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث حسن صحیح ہے اور عام اہل علم کا اس پر عمل ہے۔“ آدمی کے لیے کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو ایک نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں۔ اس پر ہمارے علم میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کسی عورت سے اس کی پھوپھی یا خالہ کی موجودگی میں یا پھوپھی سے بھتیجی کی موجودگی میں نکاح کر لیا تو دوسری سے کیا ہوا نکاح فسخ کیا جائے گا، عام اہل علم کی یہی رائے ہے۔

لہذا کسی بھی عورت سے اس کی پھوپھی یا خالہ کی موجودگی میں نکاح کرنا درست نہیں۔ اسی طرح بیوی کی پھوپھی یا خالہ سے بھانجی یا بھتیجی کی موجودگی میں بھی نکاح درست نہیں۔ اگر اس طرح کیا گیا ہے تو اسے ختم کیا جائے۔

نکاح سے پہلے مباشرت

(سوال) اگر نکاح سے پہلے لڑکا اور لڑکی مباشرت کر بیٹھیں تو کیا بعد میں ان کا نکاح ہو سکتا ہے؟

(جواب) اس میں کوئی شک نہیں کہ زنا کبیرہ گناہ ہے۔ کسی انسان سے اگر یہ گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اس پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیتا ہے تو قرآن میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَ لَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُونَ وَ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۝ يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ يَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ ﴾ [الفرقان: ۶۸-۷۰]

”اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرتا ہے وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔ قیامت کے دن اس کے لیے عذاب دوگنا کیا جائے گا اور وہ اس میں ذلیل ہو کر رہے گا، مگر جن لوگوں نے ایسے گناہوں سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر زنا سے توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور جب اس نے توبہ کر لی اور اس کا معاملہ حاکم تک نہ پہنچا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تو پھر اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، دنیا میں اس پر حد لازم نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ سے بعض محرمات سے اجتناب کے لیے بیعت لی۔ ان میں ایک زنا بھی تھا آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ »

[بخاری، کتاب الایمان: باب علامة الایمان حب الأنصار (۱۸)]

”جس نے بیعت پوری کی اس کا اجر اللہ پر ہے اور جو ان میں سے کسی چیز میں مبتلا ہو گیا اور اسے دنیا ہی میں اس کی سزا دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گی اور اگر وہ کسی گناہ کو پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو وہ اللہ کی طرف ہے، اگر چاہے تو وہ اسے بخش دے اور اگر چاہے تو عذاب دے۔“

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی سے زنا وغیرہ سرزد ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اس کے اقرار اور اصرار کے بغیر دنیا میں اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اس سے بڑھ کر اگر کسی کو کسی دوسرے مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس پر حد لازم آتی ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو آپس میں معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« تَعَاَفُوا الْحُدُودَ فِيمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَّغْنِي مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجِبَ » [ابوداؤد، کتاب الحدود: باب يعنى عن الحدود (۴۳۷۶)]

”آپس میں حدود معاف کرو، جو مجھ تک پہنچ گئی وہ واجب ہو گئی۔“

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر امام، حاکم یا قاضی تک نہیں پہنچی تو حد واجب نہیں ہوئی۔ مذکورہ صورت میں زانی کا حد لگنے کے بغیر زانیہ سے نکاح ہو سکتا ہے جب دونوں سچی توبہ کر لیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ان سے کسی نے سوال کیا:

« إِنِّي كُنْتُ أَلِيمًا بِأَمْرَاءٍ أَتَيْتُ مِنْهَا مَا حَرَّمَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيَّ فَرَزَقَ اللَّهُ مِنْ ذَلِكَ تَوْبَةً فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَزَوَّجَهَا فَقَالَ النَّاسُ إِنَّ الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا لَيْسَ هَذَا فِي هَذَا أَنْكِحُهَا فَمَا كَانَ هُنَا فِي هُنَا مِنْ أَلِيمٍ فَعَلَيَّْ » [تفسیر ابن کثیر (۲۶۴/۳)]

”میں ایک عورت سے حرام کار تکاب کرتا رہا ہوں، مجھے اللہ نے اس فعل سے توبہ کی توفیق دی، میں نے توبہ کر لی۔ میں نے اس عورت سے شادی کا ارادہ کر لیا تو لوگوں نے کہا: ”زانی مرد صرف زانیہ عورت اور مشرکہ عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”یہ اس بارے میں نہیں ہے، تو اس سے نکاح کر لے، اگر اس کا گناہ ہوا تو وہ مجھ پر ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورت جنہوں نے بدکاری کا فعل کیا ہے اگر توبہ کر لیتے ہیں تو بغیر شرعی حد کے ان کا نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نہیں کہا کہ پہلے حد لگواؤ پھر نکاح کرو۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ حمل کے وقت جو ان

دونوں کا نکاح ہو تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اس نے عدت میں نکاح کیا اور عدت میں نکاح صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ أُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ٤]

”حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَعْرِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ﴾ [البقرة: ٢٣٥]

”اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک عدت ختم نہیں ہو جاتی۔“

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”قَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَىٰ أَنَّهُ لَا يَصِحُّ الْعُقْدُ فِي مَدَّةِ الْعِدَّةِ“ [تفسیر ابن کثیر (١/٥٧٤)]

”اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں۔“

اس لیے اگر نکاح سے پہلے کیے گئے جماع سے اگر لڑکی حاملہ ہو چکی ہے تو ان کا نکاح درست نہیں بلکہ وضع حمل کے بعد انہیں نکاح کرنا چاہیے تھا لہذا وہ دوبارہ نکاح کریں اور اگر نکاح کے وقت لڑکی حاملہ نہیں تھی تو ان کا باہمی نکاح بالکل درست ہے، اس پر کسی قسم کا عیب لگانا جائز نہیں۔

بالغ اولاد کا نکاح

(سوال) میں نے ایک دینی جملہ میں پڑھا ہے کہ اگر اولاد بالغ ہو جائے تو والدین کو چاہیے کہ جلد از جلد اولاد کی شادی کر دیں تاکہ نفی نہ پھیلے، اگر والدین ایسا نہیں کریں گے تو اس قسم کی نفی کا گناہ ماں باپ کے ذمہ ہوگا۔ براہ کرم اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

(جواب) یہ بات صحیح اور درست ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو والدین کو ان کی شادی کا جلد بند و بست کرنا چاہیے تاکہ وہ کسی قسم کے گناہ میں ملوث نہ ہوں۔ ابو سعید خدری اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس کے ہاں بچہ پیدا ہو وہ اس کا اچھا سا نام رکھے اور اسے ادب سکھائے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کی شادی کر دے، اگر وہ بالغ ہو گیا، اس نے اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کر لیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہو

گا۔“ [شعب الایمان للبیہقی (٨٦٦٦)]

عمر بن خطاب اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ برس کی ہوگی اور اس نے اس کی شادی نہ کی اور لڑکی نے گناہ کا ارتکاب

کر لیا تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔“ [شعب الایمان (٨٦٨٠)]

پہلی روایت کو علامہ البانی نے ”سلسلة الاحادیث الضعیفة (۶۳/۲) میں ضعیف قرار دیا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کی سند میں ابوبکر بن ابی مریم راوی ضعیف ہے اور انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے متن کو امام حاکم نے شاذ قرار دیا ہے۔ [شعب الایمان: (۴۰۳/۶)]

بہر کیف باپ اگر نکاح کر دینے پر قادر ہو اور نکاح نہ کرے تو قصور وار ہے اور گناہ کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے زجر و تہدید کرتے ہوئے اس بات سے ڈرایا گیا ہے۔ لہذا ہمیں اپنی بالغ اولاد کا مناسب رشتہ ملتے ہی نکاح کر دینا چاہیے تاکہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہ کر لیں۔

بالغ لڑکی کا نکاح

(سوال) بسا اوقات والدین لڑکی کی شادی میں اس کی تعلیم کی غرض سے دیر کرتے ہیں جبکہ لڑکے کی طرف سے شادی کا مطالبہ بھی ہوتا ہے یا ابھی لڑکی کا رشتہ طے نہیں ہوا لیکن والدین اس کے بالغ ہونے کے بعد صرف دنیاوی تعلیم کی غرض سے شادی میں تاخیر کرتے ہیں، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) جس کسی کے ہاں لڑکی بالغ ہو جائے اور اس کا مناسب رشتہ مل رہا ہو تو اس کی شادی میں تاخیر کرنا شرعی احکامات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تمہارے پاس ایسا آدمی پیغام نکاح لے کر آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس کو رشتہ دے

دو۔“ [ابن ماجہ، کتاب النکاح: باب الأکفاء (۱۹۶۷)]

نکاح کی تاکید میں آپ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

”اے نوجوانوں کی جماعت! جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھے وہ شادی کرے، اس لیے کہ شادی نگاہ کو پست

کرنے والی اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی ہے۔“ [بخاری، کتاب النکاح: باب قول النبی ﷺ من استطاع

منکم الباءة فلیتزوج (۵۰۶۵)]

مسلمان والدین کو چاہیے کہ وہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا بہانہ بنا کر شادی سے انکار نہ کریں۔ یونیورسٹی کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کا حصول عورت کے لیے ضروری نہیں۔ عورت کے لیے اتنا ہی مناسب ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم لکھنا پڑھنا، قرآن مجید، تفسیر و حدیث سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائے اور اگر مزید تعلیم کی ضرورت ہو تو وہ اپنے شوہر سے اجازت لے کر تعلیم حاصل کر سکتی ہے یا شادی سے قبل حصول تعلیم کی شرط لگا سکتی ہے۔ ہمارے ماحول میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ عشق معاشقے کی داستانیں تو عام ہیں اولادیں والدین کی نگرانی سے نکل کر معاشرتی بگاڑ کا باعث بن چکی ہیں۔ پہلے اس سے کہ لڑکیاں اور لڑکے فعل حرام کا ارتکاب کریں ان کا شرعی طریقے سے نکاح کر دینا ہی مناسب اور شریعت کا تقاضا ہے۔ لہذا تعلیم کا بہانہ بنا کر شادی سے تاخیر کرنا درست نہیں ہے۔

کم سن بچی کا نکاح

سوال کیا کم سن بچی کی شادی کرنا جائز ہے اور کیا بلوغت کے بعد بچی کو انکار کرنے کا اختیار حاصل ہوگا؟

جواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُنْكَحُ الثَّيْبُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ وَلَا الْبِكْرُ إِلَّا بِإِذْنِهَا قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَا إِذْنُهَا؟ قَالَ أَنْ

تَسُكَّتْ » [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی الاستیمار (۲۰۹۲)]

”بیوہ کا نکاح اس کی اجازت حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت حاصل کیے بغیر نہ کیا

جائے۔“ لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اس کی اجازت کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کا خاموش رہنا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالغ لڑکی سے اس کے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے اور جب وہ نابالغہ ہوتی ہے تو بچپن میں

اس سے اجازت نہیں لی جاتی۔ اس کا ولی نکاح کر سکتا ہے بعد از بلوغت اس لڑکی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا نکاح اگر منسوخ

کرانا چاہے تو کرا سکتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« إِنْ جَارِيَةٌ بَكَرًا آتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ

فَخَيَّرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی البکر یزوجها أبوها و لا

یستامرھا (۲۰۹۶)]

”ایک کنواری لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور بیان کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کیا ہے اور وہ ناپسند

کرتی ہے تو نبی کریم ﷺ نے اسے اختیار دے دیا۔“

علامہ احمد حسن دہلوی رقم طراز ہیں:

”الْحَدِيثُ يَدُلُّ عَلَى تَحْرِيمِ إِجْبَارِ الْآبِ لِابْنَتِهِ الْبَكْرِ عَلَى النِّكَاحِ وَغَيْرِهِ مِنَ الْأَوْلِيَاءِ

بِالْأَوْلَى“ [تنقيح الرواة (۱۰/۳)]

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے، تو باپ

کے علاوہ لڑکی کے اولیاء کے لیے بالاولیٰ جبر کی ممانعت ہے۔“

مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکی کو بالغ ہو جانے کے بعد اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا بچپن کا کیا ہوا نکاح منسوخ

کرا سکتی ہے۔ منسوخ کے لیے چاہیں تو ثالثی شرعی عدالت کی طرف رجوع کر لیں تاکہ مزاحمت وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کی اہلیہ سے نکاح

سوال کیا شہید کی اہلیہ سے نکاح کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسلام میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ شہداء کی ازواج نے دوسری

شادی کی ہو؟

(جواب) شہید کی اہلیہ عدت گزار کر اگر عقد ثانی کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، چند ایک ذکر کی جاتی ہیں۔

عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ عاتکہ بنت زید رضی اللہ عنہا کی شادی عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے طے پائی تھی، بہت خوبصورت تھیں، ان کا خاوند ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کے کہنے پر انہیں طلاق دے دی تھی۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کی جدائی میں کچھ شعر کہے جو ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سن لیے پھر انہوں نے رجوع کی اجازت دے دی، اس کے بعد طائف کے حصار میں انھیں تیر لگا اور شدید زخمی ہوئے اور مدینہ جا کر فوت ہو گئے۔

ان کی وفات کے بعد عاتکہ بنت زید سے زید بن الخطاب نے شادی کر لی، وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے، ان کی شہادت کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی، ان کی شہادت کے بعد ان سے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔ [تفصیل کے لیے الاصابة: (۴/۳۵۸)، (۳۵۶)]

اسی طرح اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے جعفر بن ابی طالب المعروف جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے شادی کی، ان کی شہادت کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا، پھر ان سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔ [تفصیل کے لیے الاصابة: (۴/۲۳۱)]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا نے علی رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا، ان کی شہادت کے بعد امامہ رضی اللہ عنہا نے مغیرہ بن نوفل سے شادی کر لی۔ دیکھیں۔ [طبقات ابن سعد (۱۲۷/۸)، اسد الغابہ (۵/۱۴۰۰)، اسعیاب (۲/۷۲۸)]

ام حرام رضی اللہ عنہا کا نکاح عمرو بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ احد کے میدان میں ان کی شہادت ہوئی، اس کے بعد ام حرام رضی اللہ عنہا نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا اور قبرص میں اپنے خاوند کے ساتھ شریک ہو کر شہید ہو گئیں۔ [الاصابة (۴/۴۴۱)]

ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا مہاجرات صحابیات میں سے ہیں، ان کا نکاح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ زید رضی اللہ عنہ جب غزوہ موتہ میں شہید ہوئے تو زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے نکاح ہو گیا پھر ان سے طلاق ہو گئی تو عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں، ان کی وفات کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا۔ [الاصابة (۴/۴۹۱)]

الغرض تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ شہداء کی ازواج نے اپنے خاوندوں کی شہادت کے بعد شادیاں کی ہیں، اسلام میں ایسی شادی میں کوئی قباحت نہیں جاہل لوگ بیوہ عورت سے شادی کرنا اچھا نہیں سمجھتے، اسلام نے اس رسم بد کو بھی ختم کیا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عاتکہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ باقی شادیاں بیوہ خواتین سے کیں اور امت مسلمہ کو بتا دیا کہ بیوہ عورت سے شادی کرنا معیوب نہیں ہے۔

اولاد کی تمنا میں شادی کرنا

(سوال) کیا اولاد کی آرزو کے لیے شادی کرنا ناجائز ہے؟ کتاب و سنت سے وضاحت کریں۔

(جواب) شادی کے بعد خاوند اور بیوی کی بڑی آرزو اور تمنا نیک اولاد کا حصول ہے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ انسان اس بات

کا خواہش مند ہے کہ اللہ اسے ایک ایسا وارث عطا کرے جو اس کے بعد اس کی املاک، مال و متاع اور جائیداد کا صحیح تصرف کرے اور اس کے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مدد و معاون اور صحیح جانشین بن سکے۔ اولاد نسل انسانی کی بقا کا سبب و ذریعہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ انسان کو اس کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

”اب تم اپنی بیویوں سے شب باشی کیا کرو اور اللہ نے جو تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“

(البقرہ: ۱۸۷)

کئی ایک ائمہ مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ ”اللہ نے تمہارے لیے جو لکھ دیا ہے“ سے مراد اولاد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر وغیرہ) اس دنیا میں سب سے برگزیدہ ہستیاں انبیاء و رسل کی گزری ہیں، ان ہستیوں نے نیک اولاد کو حاصل کرنے کی نہ صرف تمنا کی ہے بلکہ اللہ سے دعائیں مانگی ہیں۔ جدالانبیاء ابراہیم علیہ السلام کی دعا یہ ہے:

﴿ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴾ [صافات: ۱۰۰]

”اے اللہ! میرے پروردگار! مجھے نیکو کار اولاد عطا کر۔“

ذکر یا علیؑ نے بڑھاپے کے عالم میں یوں دعا کی:

”اے میرے پروردگار! میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو مجھے اپنے پاس سے

ایک وارث عطا کر جو میری اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو اور اے میرے پروردگار! اس کو پسندیدہ انسان

بن۔“ [مریم: ۵۶]

رسول مکرم ﷺ نے بھی شادی کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

”زیادہ محبت کرنے اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو میں تمہاری وجہ سے دیگر امتوں پر فخر کروں گا۔“

[ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی تزویج الأبکار (۲۰۵۰)]

ان آیات و احادیث کا واضح مطلب یہ ہے کہ اولاد کا حصول شادی کے مقاصد میں سے ہے، اس لیے اولاد کے لیے شادی

کرنا بالکل جائز و درست ہے۔

عورت کسی کا نکاح کروا سکتی ہے

سوال کیا عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے یا وہ کسی اور کی ولیہ بن سکتی ہے؟

جواب صحیح دلائل سے ثابت ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا اور نکاح کے قیام کے لیے عورت کے ولی کا ہونا از حد ضروری

ہے۔ اسلامی شریعت میں عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنا نکاح خود کرے یا کسی دوسری عورت کا نکاح

کرے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةَ الْمَرْأَةَ وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةَ نَفْسَهَا فَإِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِي تُزَوِّجُ نَفْسَهَا » [السنن

الکبری للبيهقي (۱۱۰/۷)، دارقطنی (۲۲۷/۳) [

”عورت عورت کی شادی نہ کروائے اور نہ عورت اپنی شادی خود کرے، جو عورت اپنی شادی خود کرتی ہے وہ زانیہ ہے۔“
علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

”فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْمَرْأَةَ لَيْسَ لَهَا وَلَايَةٌ فِي الْإِنِّكَاحِ لِنَفْسِهَا وَلَا لِغَيْرِهَا فَلَا عِبَارَةَ لَهَا فِي النِّكَاحِ إِجَابًا وَلَا قَبُولًا فَلَا تُزَوِّجُ نَفْسَهَا بِإِذْنِ الْوَلِيِّ وَلَا غَيْرِهِ وَلَا تُزَوِّجُ غَيْرَهَا بِوَلَايَةٍ وَلَا بِوَكَالَةٍ وَلَا تُقْبَلُ النِّكَاحُ بِوَلَايَةٍ وَلَا وَكَالَةٍ وَهُوَ قَوْلُ الْجَمْهُورِ“ [سبل السلام (۱۳۲۱/۳)]
”اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورت کو اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کروانے کا اختیار نہیں ہے، لہذا نکاح کے سلسلے میں ایجاب و قبول کے بارے میں عورت معتبر نہیں۔ ولی وغیرہ کی اجازت کے ساتھ اپنی شادی خود نہ کرے اور نہ کسی دوسری عورت کی شادی ولایت و وکالت کے ساتھ کرے۔ عورت کی ولایت و وکالت کے ساتھ نکاح قبول نہیں کیا جائے گا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔“

علامہ صنعانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ عورت ایجاب و قبول کے بارے میں معتبر نہیں ہے اور نہ نکاح میں عورت کی ولایت اور وکالت ہی کو قبول کیا گیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”نزویج نکند زن زن را یعنی زن را ولایت نمی باشد در انکاح نفسی خود و انکاح غیر خود پس نیست او را عبارت در نکاح نہ ایجابا و نہ قبولاً“ [مسک الختام شرح بلوغ المرام (۳۴۲/۳)]

”عورت عورت کی شادی نہ کرے یعنی عورت کو اپنا یا کسی دوسری عورت کا نکاح کروانے میں ولایت حاصل نہیں ہے لہذا نکاح کے سلسلے میں ایجاب و قبول کے متعلق عورت معتبر نہیں ہے۔“
حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ قَدْ صَحَّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا أَنْكَحَتْ رَجُلًا مِنْ بَنِي أُخِيَّهَا فَضَرَبَتْ بَيْنَهُمْ بِسِتْرٍ ثُمَّ تَكَلَّمَتْ حَتَّى إِذَا لَمْ يَبْقَ إِلَّا الْعَقْدُ أَمَرَتْ رَجُلًا فَانْكَحَ ثُمَّ قَالَتْ لَيْسَ إِلَيَّ النِّسَاءُ نِكَاحٌ“ [فتح الباری (۱۸۶/۹)، ابن بی شیبہ (۴۵۸/۳)، عبد الرزاق (۲۰۱/۶)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کے بیٹوں میں سے ایک کے نکاح کا بندوبست کیا۔ انھوں نے ان کے درمیان پردہ لگا دیا پھر بات کی، یہاں تک کہ جب عقد کے علاوہ کوئی معاملہ باقی نہ رہا تو انھوں نے ایک مرد کو حکم دیا اس نے نکاح کر دیا پھر فرمایا: ”نکاح کا قائم کرنا عورتوں کا کام نہیں۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کے انتظامات وغیرہ میں عورت اپنا کردار پردے کے اندر رہ کر ادا کر سکتی ہے لیکن نکاح پڑھانے کی اسے اجازت نہیں۔ اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی پاکباز عورت یہ کام نہیں کر سکتیں تو آج

کی کوئی عورت کیسے کر سکتی ہے؟ اس مسئلے کی مزید تائید سیدنا علیؑ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

« لَا تَشْهَدُ الْمَرْأَةُ يَعْني الْخُطْبَةَ وَ لَا تُنْكِحُ » [ابن ابی شیبہ (۴۵۸/۳)، (۱۵۹۶۳)]

”عورت خطبہ نہ دے اور نہ نکاح کروائے۔“

امام ابوحنیفہؒ کے استاد الامام ابوہریرہؓ نے فرماتے ہیں:

” لَيْسَ الْعَقْدُ بِيَدِ النِّسَاءِ وَ إِنَّمَا الْعَقْدُ بِيَدِ الرِّجَالِ ” [ابن ابی شیبہ (۴۵۸/۳)، (۱۵۹۵۸)]

موسوعة فقه إبراهيم النخعي (۶۷۷/۱)

”عقد نکاح عورت کے ہاتھ میں نہیں، عقد نکاح صرف مرد کے ہاتھ میں ہے۔“

مندرجہ بالا صحیح احادیث و آثار سے معلوم ہوا کہ عقد نکاح مرد کے اختیار میں ہے اور نکاح کا خطبہ پڑھنا جو مسنون ہے اور ایجاب و قبول کروانا یہ سب مرد کا حق ہے، عورت اس معاملے میں معتبر نہیں ہے۔

دلہن کے لیے بیوٹی بکس کا استعمال

سوال کیا ایک لڑکی یا نئی دلہن اپنے خاندان کے لیے سرنخی وغیرہ یعنی بیوٹی بکس استعمال کر سکتی ہے؟ دلیل سے واضح کریں۔

جواب صحیح حدیث سے عورت کا خوشبو لگانا ثابت ہے اور عورتوں کی خوشبو ایسی ہوتی ہے جس کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے سرنخی و پاؤڈر وغیرہ اور بو مخفی ہوتی ہے۔ عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ مجھے نبی ﷺ نے فرمایا:

”بے شک مردوں کی بہترین خوشبو وہ ہے جس کی بو ظاہر ہو اور رنگ پوشیدہ ہو اور عورتوں کی بہترین خوشبو وہ ہے جس

کا رنگ ظاہر ہو اور اس کی بو مخفی ہو۔“ [ترمذی، کتاب الادب: باب ما جاء في طيب الرجال والنساء (۲۷۸۸)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت رنگ والی خوشبو لگا سکتی ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں انسؓ سے حدیث ہے وہ

بیان کرتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمن بن عوفؓ پر زردی کا نشان دیکھا تو پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے کہا: ”میں نے

ایک عورت سے ایک نواۃ سونے کے عوض نکاح کیا ہے۔“ آپ نے فرمایا: ”اللہ تیرے لیے برکت نازل کرے ولیمہ کرو

اگرچہ ایک بکری ہو۔“ [مسلم، کتاب النکاح: باب الصداق و جواز کونه تعليم قرآن و خاتم حديد (۱۴۲۷)]

عبدالرحمن بن عوفؓ پر زعفران کی زردی کا نشان لگا تھا، ظاہر ہے شادی کے موقع پر ان کی دلہن سے یہ لگا تھا جس سے

معلوم ہوا کہ دلہن کی تیاری میں اسے میک اپ کرانا درست ہے۔

اسی طرح عائشہؓ کی شادی کے موقع پر اسماء بنت عمیس نے انھیں زیب و زینت کی تھی جیسا کہ مسند احمد (۳۳۸/۶)

وغیرہ میں موجود ہے۔ لہذا دلہن کی زیب و زینت، بیوٹی پارلر یا عام خواتین کا رنگ والی خوشبو استعمال کرنا جیسے زعفران اور سرنخی

وغیرہ، بالکل جائز و درست ہے۔

شادی کی تقریب میں بینڈ باجے

سوال کیا شادی کی تقریبات میں بینڈ باجوں کا اہتمام کرنا مسلمان کے لیے جائز ہے؟ مہربانی فرما کر کتاب و سنت سے جواب دیں۔

جواب گانا بجانا اور موسیقی وغیرہ شرعی طور پر حرام ہے اور اس کو بطور پیشہ اختیار کر لینا بھی حرام ہے۔ اس کی حرمت اور شیطانی فعل ہونے پر درج ذیل نصوص دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴾ [لقمان: ۶۰]

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو غافل کرنے والے آلات خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے گمراہ کریں اور اسے ہنسی مذاق بنائیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“

اس آیت کریمہ میں کلمہ ”لہو الحدیث“ سے مراد گانا بجانا اور آلات موسیقی ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں! لہو الحدیث سے مراد گانا بجانا اور آلات موسیقی ہیں۔“ [مستدرک حاکم (۱۸۲/۳)، (۳۵۹۵)]

سورہ بجم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ۚ وَ تَضْحَكُونَ ۚ وَ لَا تَبْكُونَ ۚ وَ أَنْتُمْ سَامِدُونَ ﴾

[النجم: ۵۹، ۶۱]

”کیا تم اس (قرآن) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو، رو تے نہیں، بلکہ تم کھیل رہے ہو۔“

اس آیت میں لفظ (سَامِدُونَ) کی تفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کی گئی ہے ”قبیلہ بنو حمید کی لغت میں ”سَمَد“ سے مراد گانا ہے، جب کوئی شخص گانا گائے تو کہا جاتا ہے ”أَسَمَدَ لَنَا۔“ امام مجاہد رضی اللہ عنہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ بعض نسخوں میں حمید کی بجائے یمن کا ذکر ہے۔ [تفسیر مجاہد مع حاشیہ (ص ۶۳۳)، المصباح المنیر (ص ۱۳۳۵)]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ اسْتَفْزِرُ مِنْ اسْتَطْعَتٍ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اجْلِبُ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجْلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ ﴾ [بنی اسرائیل: ۶۴]

”اور ان میں سے تو جس کسی کو بھی اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا اور ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا۔“

اس آیت کریمہ میں ﴿بِصَوْتِكَ﴾ (اپنی شیطانی آواز) سے مراد موسیقی، آلات طرب، راگ رنگ، رقص و سرود، گانے

بجانے اور ہر خوش آواز ہے جو اللہ کی معصیت کی طرف لے جاتی ہے۔

ان آیات مقدسہ سے واضح ہوتا ہے کہ گانا بجانا، بینڈ باجا اور دوسرے آلات موسیقی اور شیطانی آوازیں حرام اور گمراہی کے آلے ہیں، ان کی خرید و فروخت کرنے پر ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے، لہذا اسے ذریعہ معاش بنانا حرام ہے اور اس کے ذریعے کمائی گئی روزی ہرگز پاک نہیں ہو سکتی۔ ایسے امور سے فی الفور باز آ جانا چاہیے اور ایسے کسی بھی کام میں تعاون کرنا یا اپنی خوشی کے مواقع میں ان شیطانی کاموں کو رائج کرنا قطعاً ناجائز و حرام ہے۔

ناجائز امور پر مشتمل شادی میں شرکت

(سوال) بد قسمتی سے آج کل شادیوں میں اللہ اور رسول کے احکامات کی دھیماں بکھیری جاتی ہیں اور دوسری طرف دعوت قبول کرنے کا حکم نبوی ہے تو ایسی شادیوں میں شرکت شرعی طور پر ضروری ہے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذَا مِثْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَ الْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴾ [النساء: ۱۴۰]

”اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں۔ ورنہ تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ اگر تم ایسی مجالس و محافل اور پروگراموں میں شرکت کرو گے جہاں احکامات الہیہ کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اور تم اس پر نکیر نہیں کرو گے تو تم بھی گناہ میں ان کے برابر کے شریک رہو گے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ إِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَ إِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴾ [الانعام: ۶۸]

’اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جائیں یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر آپ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں۔“

تفسیر احسن البیان میں ہے: ”آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ کو ہے لیکن مخاطب امت مسلمہ کا ہر فرد ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک تاکیدی حکم ہے جسے قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ہر وہ مجلس مراد ہے جہاں اللہ اور رسول ﷺ

کے احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہے یا عملاً ان کا استخفاف کیا جا رہا ہو یا اہل بدعت و اہل زلیغ اپنی تاویلات رکیکہ اور توجیہات خفیہ کے ذریعے آیات الہی کو توڑ مڑور رہے ہوں۔ ایسی مجالس میں غلط باتوں پر تنقید کرنے اور کلمہ حق بلند کرنے کی نیت سے تو شرکت جائز ہے، بصورت دیگر سخت گناہ اور غضب الہی کا باعث ہے۔“ [تفسیر احسن البیان (ص ۱۷۷)]

ایسی مجالس جہاں منکرات و منہیات ہوں یا ایسی دعوتیں جہاں احکام خداوندی کی تولاً یا فعلاً خلاف ورزی ہو رہی ہو ان میں شرکت کرنا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں ناپسندیدہ اور قابل نفرت تھا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

« عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ صَنَعْتُ طَعَامًا فَدَعَوْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ فَدَخَلَ فَرَأَى سِتْرًا فِيهِ تَصَاوِيرٌ فَخَرَجَ وَقَالَ: إِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ تَصَاوِيرٌ »

[نسائی، کتاب الزينة: باب التصاوير (۵۳۵۳)]

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کھانا تیار کیا تو نبی ﷺ کو دعوت دی، آپ ﷺ آئے، گھر میں داخل ہوئے تو ایک تصویروں والا پردہ دیکھا۔ آپ ﷺ گھر سے نکل گئے اور فرمایا: ”فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جہاں تصویریں ہوں۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جس دعوت میں آپ کو شریک ہونے کے لیے کہا جائے، اگر آپ کے علم میں ہو کہ وہاں منکرات و منہیات ہیں تو ایسی دعوت پر نہ جائیں اور اگر وہاں پہنچنے پر علم ہو تو وہاں سے واپس آ جائیں کیونکہ اس مجلس میں حاضر و شریک رہنا جائز نہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ”میں نے ایک چھوٹا گدا خریدا، اس میں تصاویر تھیں (نبی ﷺ جب باہر سے تشریف لائے) تو آپ دروازے پر کھڑے ہو گئے، اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے کہا: ”میں اپنے جرم کی اللہ کی طرف توبہ کرتی ہوں۔“ آپ ﷺ نے کہا: ”یہ گدا کیا ہے؟“ میں نے کہا: ”میں نے یہ اس لیے بنایا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں، اس کو اپنے نیچے رکھیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان تصویروں کو بنانے والے قیامت کے دن عذاب دیے جائیں گے۔ انھیں کہا جائے گا جو تم نے پیدا کیا ہے اس میں روح ڈالو اور یقیناً فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں تصویریں ہوں۔“ [بخاری، کتاب اللباس:

باب من کره القعود على الصور (۵۹۵۷)، مسلم (۲۱۰۷)، مسند احمد (۴۶۱/۶)، مؤطا (۷۴۶)]

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جہاں احکامات شرعیہ کی خلاف ورزی ہو، آپ وہاں شرکت نہ کریں، اگر جائیں تو ان منکرات سے لوگوں کو روکیں اور انھیں دعوت دے کر سمجھائیں۔ ایک اور حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

« مَنْ كَانَ يَوْمًا مِنَ يَوْمِ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَقْعُدَنَّ عَلَى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ » [مسند احمد

(۱۲۶/۱)، مسند ابی یعلیٰ (۱۹۲۵)، مستدرک حاکم (۲۸۸/۴)، ترمذی (۲۸۰۱)]

”جو آدمی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسے دسترخوان پر ہرگز نہ بیٹھے جہاں شراب پیش کی جا رہی ہو۔“

امام حاکم اور امام ذہبی رضی اللہ عنہما نے اسے صحیح کہا ہے، علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۹۴۹)]

ملک شام کے ایک عیسائی چودھری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت کی تو انھوں نے کہا:

« إِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَكُمْ مِنْ أَجْلِ الصُّورِ الَّتِي فِيهَا » [بيہقی (۲۶۸/۷)، فتح الباری (۱/۵۳۱)،
الأدب المفرد (۱۲۴۸)]

”ہم تمہارے معبد خانوں میں تصویروں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے۔“

ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک شخص نے دعوت کی تو انہوں نے دریافت کیا: ”أَفِي الْبَيْتِ صُورَةٌ؟“ کیا گھر میں تصویر ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ تو انہوں نے داخل ہونے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ اس نے تصویر کو توڑا پھر آپ داخل ہوئے۔ [بیہقی (۲۶۸/۷)، فتح الباری (۹/۲۴۹)]

امام اوزاعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« لَا نَدْخُلُ وَلَيْمَةَ فِيهَا طَبْلٌ وَلَا مِعْرَافٌ » [آداب الزفاف للألبانی (ص ۱۶۶)]
”ہم ایسے ویسے میں داخل نہیں ہوتے جس میں طبلے سارنگیاں ہوں۔“

مکلاوہ کی رسم بد

(سوال) کیا مکلاوہ جائز ہے؟ یعنی شادی کے دوسرے دن ولیمہ کے بعد لڑکی والوں کا لڑکی اور لڑکے کو چند دن کے لیے اپنے گھر لے جانا جائز ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت کریں۔

(جواب) ایک مسلمان کے لیے زندگی گزارنے کا نمونہ واسوہ رسول کریم ﷺ ہیں، آپ کی سیرت ہمارے لیے ہر مسئلہ میں راہنمائی کا کام دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنی شادیاں بھی کیں اور اپنی بیٹیوں کی بھی۔ مکلاوے کا جو رواج ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، لڑکی اور لڑکا شادی کے بعد اپنی مرضی سے جب چاہیں اپنے سسرال یا عزیز واقارب کو ملنے جائیں، دنوں کی کوئی قید قرآن و حدیث میں نہیں۔ سلف صالحین سے بھی اس طرح شادی کے دوسرے دن ہی لڑکی کو لے جانا ثابت نہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ باعث نصیحت درج کرتے ہیں کہ امام سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ جو اہل مدینہ میں سے بڑے عالم اور سید التابیین میں شمار ہوتے ہیں، ان کی بیٹی کا رشتہ خلیفہ عبدالملک نے اپنے بیٹے ولید کے لیے طلب کیا جو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا اور انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے ایک شاگرد کثیر بن المطلب بن ابی وداعہ سے کی۔ ابن ابی وداعہ کا بیان ہے کہ میں سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے پاس جایا کرتا تھا کہ کچھ دن میں ان کی مجلس میں حاضر نہ ہوا جب دوبارہ ان کی مجلس میں گیا تو انہوں نے پوچھا: ”تم کہاں تھے؟“ میں نے کہا: ”میری اہلیہ فوت ہو گئی تھی اس وجہ میں سے کچھ مصروف ہو گیا۔“ امام سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے گئے: ”تم نے ہمیں خبر کیوں نہ دی، ہم اس کے جنازے میں شرکت کرتے۔“ پھر فرمانے لگے: ”کیا تم نے کسی نئی عورت سے شادی کی ہے؟“ میں نے کہا: ”اللہ آپ پر رحم کرے مجھے کون رشتہ دے گا، میں تو صرف دو یا تین درہموں کا مالک ہوں۔“ امام سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں تمہیں رشتہ دوں گا۔“ میں نے کہا: ”آپ ایسا کریں گے؟“ انہوں نے کہا: ”ہاں!“ پھر انہوں نے اللہ کی حمد و ثنا اور

نبی ﷺ پر درود شریف پڑھا اور مجھ سے دو یا تین درہم حق مہر کے عوض اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا، میں اٹھا اور فرط مسرت کی وجہ سے مجھے کوئی کام نہ سوجھا، میں اپنے گھر گیا اور سوچنے لگا کہ کس سے قرض لوں۔ میں نے مغرب کی نماز ادا کی اور گھر لوٹا اور اکیلا ہی روزے کی حالت میں تھا، میں نے اپنا روزہ روٹی اور زیتون سے افطار کیا تو میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا: ”کون؟“ اس نے کہا: ”سعید“ میں ہر اس شخص کے بارے سوچنے لگا جس کا نام سعید تھا، سوائے سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ، اس لیے کہ سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ چالیس سال سے اپنے گھر اور مسجد کے درمیان ہی دیکھے گئے تھے۔ میں باہر نکلا تو سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کھڑے تھے، میں نے کہا: ”اے ابو محمد! (سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کی کنیت) آپ مجھے پیغام بھیج دیجئے، میں خود حاضر ہو جاتا، تو انہوں نے کہا: ”نہیں تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ تمہارے پاس آیا جائے، تم اکیلے آدمی تھے، میں نے تمہارے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور میں نے ناپسند کیا کہ تم اکیلے رات بسر کرو، یہ تمہاری بیوی ہے۔“ وہ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ پھر انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے اندر کر دیا، اور دروازہ بند کر دیا عورت شرم و حیا کا پتلا تھی، میں نے دروازہ بند کیا پھر پیالہ چراغ کے سائے تلے رکھ دیا تاکہ وہ اسے نہ دیکھ سکے، پھر میں گھر کی چھت پر چڑھ گیا، پڑوسیوں کو بلایا، وہ آگئے، کہنے لگے: ”تمہاری کیا حالت ہے؟“ میں نے انہیں بتایا تو وہ اس کے پاس آئے اور میری ماں کو بھی خبر پہنچ گئی وہ آئیں، کہنے لگیں: ”میرا چہرہ تیرے چہرے پر حرام ہو اگر تم اس کے قریب جاؤ تا وقتیکہ میں تین دن اس کا امتحان نہ لے لوں۔“ میں تین دن رکا رہا پھر اس کے پاس گیا۔ وہ تمام لوگوں سے زیادہ حسینہ و جمیلہ اور سب سے زیادہ قرآن کی حافظہ اور سنت رسول ﷺ کی عالمہ اور سب سے زیادہ خاوند کے حق کو پہچاننے والی تھی، پھر میں ایک ماہ تک سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے ہاں نہ گیا، ایک ماہ بعد جب ان کے پاس گیا تو وہ اپنے حلقہ درس میں تھے، میں نے سلام کیا انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور اختتام مجلس تک کوئی بات نہ کی۔ جب میرے علاوہ سب چلے گئے تو انہوں نے کہا: ”اس انسان کا کیا حال ہے؟“ میں نے کہا: ”بہت اچھا، اے ابو محمد! جسے دوست پسند کرتا ہے اور دشمن ناپسند کرتا ہے۔“ کہنے لگے: ”اگر تمہیں کوئی چیز ناپسند لگے تو لاٹھی سے کام لو۔“ میں اپنے گھر واپس آ گیا، انہوں نے میرے پیچھے ۲۰ ہزار درہم بھیجے۔ [حلیۃ الاولیاء: (۱۶۷/۲)]،

(۱۶۷)، سیر اعلام النبلاء (۲۳۳/۴)، (۲۳۴)

امام سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر رسم و رواج کا سلف صالحین کے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ ہارات، جہیز، مکلاوہ، سہرے گانے اور ڈھول وغیرہ سب ہندوانہ رواج ہیں، جو برصغیر پاک و ہند میں مسلم و ہندو اختلاط کی وجہ سے پھیل چکے ہیں۔ ہمیں ہر قسم کے رسم و رواج اور بدعات و خرافات سے اپنے ماحول کو پاک و صاف کرنا چاہیے۔ امام سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی شادی ایک بادشاہ کے بیٹے کے بجائے ایک دیدار شخص سے ہوئی اور شادی کے دوسرے دن بیٹی کو لینے نہیں چلے گئے تھے بلکہ ان کا داماد ایک ماہ بعد اکیلا حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ بہر کیف شادی کے بعد لڑکی اور لڑکا باہمی رضامندی سے جب چاہیں آجاسکتے ہیں، دوسرے دن جانا رسم ہے اس کو توڑنا چاہیے۔

بارات کی شرعی حیثیت اور مسنون شادی کے لوازمات

(سوال) کیا شادی کے موقع پر دولہا کے ساتھ بارات کا جانا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) شادی بیاہ کے موقع پر مروجہ بارات لے جانا شرعاً بالکل ثابت نہیں، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ عہد رسالت مآب اور خلفائے راشدین کے ایام ہائے خلافت میں کہیں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نکاح کے لیے دولہا، دو گواہ اور لڑکی کے ولی و سرپرست کا ہونا کافی ہے۔ رسول کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں آپ کے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شادیاں ہوئیں، کسی نے بھی بارات کا اہتمام نہیں کیا۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر زردی کا نشان دیکھا تو فرمایا: ”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے کہا: ”میں نے ایک عورت سے سونے کی ایک ڈلی کے برابر مہر کے ذریعے نکاح کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تیرے لیے برکت ڈالے، ولیمہ کرو، اگرچہ ایک بکری ہی ہو۔“ [مسلم، کتاب النکاح: باب الصداق و جواز کونہ تعلیم

قرآن و خاتم حدید (۱۴۲۷)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی کا علم رسول اللہ ﷺ کو اس وقت ہوا جب آپ نے عبدالرحمن پر زعفران کا زرد رنگ دیکھا۔ اگر اسلام میں بارات کا کوئی تصور ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے بلایا جاتا۔ لیکن اسلام میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ نبی ﷺ یا کسی بھی صحابی کی شادی پر بارات ساتھ گئی ہو۔

نبی کریم ﷺ سے آپ کی پیاری بیٹی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگنے کے لیے علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی آپ کے پاس تشریف لے گئے تھے لیکن آپ ﷺ کے جلال و ہیبت کی وجہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”تمہیں کون سی چیز لائی ہے، کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟“ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں خاموش ہو گیا۔“ پھر آپ نے ایسے ہی کہا میں پھر خاموش ہو گیا۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَعَلَّكَ جَعْتَ تَخَطُّبُ فَاطِمَةَ؟)) ”شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے منگنی کے لیے آئے ہو۔“ تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ہاں!“ آپ نے پوچھا: ”کیا تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کچھ ہے۔“ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یا رسول اللہ! نہیں اللہ کی قسم!“ آپ نے فرمایا: ”تیری لوہے کی زرہ کہاں ہے جو میں نے تجھے پہنائی تھی؟ کہنے لگے: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں علی کی جان! وہ تو حطمیہ ہے، اس کی قیمت چار درہم بھی نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تیرے نکاح میں دیا، تو اس زرہ کو بھیج دے جس کے ساتھ تو فاطمہ کو حلال کرے گا۔“ یعنی بطور مہر دے کر اسے اپنے لیے حلال بنا لو۔ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کا یہی حق مہر تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں۔ [دلائل النبوة للبيهقي (۱۶۰/۳)، البداية والنهاية (۳۰۲/۳)۔ اسد الغابة (۲۱۶/۸)، (۲۱۵)]

اس واقعہ سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ کائنات کے افضل ترین بندوں میں سے علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہما کی شادی پر نہ بارات کا میلا اور نہ رسم و رواج کو کوئی دخل۔ علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی منگنی کے لیے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حق مہر پوچھ

کر اپنی پیاری لخت جگر فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کا نکاح کر دیا۔ صحیح اسلامی طریقہ یہی ہے کہ جس گھر میں نکاح کا ارادہ ہو وہاں لڑکا پیغام نکاح دے، وہ گھر والے اگر منظور کر لیں تو جلد نکاح کر دیں، رسم درواج کا قطعاً انتظار نہ کریں، اسی میں خیر و فلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ صحیح سنت رسول پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخشے اور ہر قسم کے ہندوانہ رسم درواج سے بچائے۔ (آمین!)

شادی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا

(سوال) آپ کا مضمون ”شادی کے کھانے کی شرعی حیثیت“ غزوہ میں نظروں سے گزرا، آپ نے ولیمہ پر مدلل بحث کی ہے مگر اصل مسئلہ شادی ہال میں لڑکی والوں کی طرف سے دی جانے والی دعوت ہے، جس پر آج کل اخبارات میں بھی بحث جاری ہے۔ براہ کرم قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر بھی تفصیلاً روشنی فرمائیے تاکہ لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں؟

(جواب) اگر آپ اس مضمون کو غور سے پڑھتے تو اس سوال کا جواب آپ کو اس مضمون میں مل جاتا۔ قرآن و سنت کی رو سے شادی کے موقع پر جو دعوت ثابت ہے وہ ولیمہ ہے، جس کے میں نے کئی ایک دلائل ذکر کیے اور محدثین نے جو دعوت کی اقسام بیان کی ہیں ان کا بھی اجمال سے تذکرہ کیا ہے۔ جس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ لڑکی والوں کے گھر لڑکے والے جو بارات لے کر جاتے ہیں اور لڑکی والے اپنے دوست احباب کو بلا لیتے ہیں اور پھر ان سب کے لیے ضیافت کا بندوبست کیا جاتا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں۔ بارات کے بارے میں راقم نے غزوہ میں پہلے بحث کر دی ہے کہ موجودہ بارات کا تصور اسلام میں نہیں ہے اور ہمیں خیر القرون میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شادی کے موقع پر جو دعوت ہوتی ہے وہ ولیمہ ہی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی شادی کے موقع پر بھی ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آپ نے ولیمہ کرنے کے لیے کہا۔ لہذا شادی پر یہی دعوت ہونی چاہیے خواہ شادی ہال میں ہو یا کسی حویلی اور گھر میں، یہی شرعاً ثابت ہے۔

دعوت ولیمہ پر سلامی

(سوال) کیا دعوت ولیمہ پر سلامی دینا قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) مسلمانوں نے جب سے اسلام کے احکامات کو پس پشت ڈالا ہے اس وقت سے ان کے اندر بے شمار خرابیاں داخل ہو گئیں، کئی ایک ایسے اعمال سرانجام دیے جاتے ہیں جن کی اسلام میں کوئی دلیل موجود نہیں ہوتی۔ منجملہ ان امور میں سے شادی بیاہ کے مسائل بھی ہیں۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر اکثر و بیشتر ہندوانہ رسم درواج کی پابندی کی جاتی ہے، شادی کے موقع پر دعوت ولیمہ کر کے مہمانوں کو بلا کر ان سے نیوٹا وصول کرنا بھی ہندوانہ رسم ہے اور برصغیر پاک و ہند میں ہندوؤں کے اختلاط سے یہ رسم بھی اہل اسلام میں داخل ہو چکی ہے اور پھر یہ نیوٹا ایک قرض ہے، اگر آج کسی کی شادی پر ایک سو روپیہ دیا جاتا ہے تو کل یہ امید ہوتی ہے کہ دو سو ملے گا اور اگر کوئی شخص ادانہ کرے تو اس سے ناراضی ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ کم از کم ہماری گھر پہنچ تو دے دیں اور اگر کوئی شخص صرف لیا ہوا پیسا واپس کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی بھانجی ختم کر دی

ہے۔ ہندوستان میں کنبوہ برادری ایسی اشیاء کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں:

”کنبوہ برادری کے مسلمان جہیز نہیں دیتے تھے اور عروس کے گھر رسم (مہندی) بھی نہیں بھیجتے تھے اور نکاح میں یا شہب عروسی کو یا حنا بندی کے موقع پر شربت پلانے کے بعد براتیوں سے نیوتا یا ننگ بھی نہیں لیتے تھے، کیوں کہ یہ لوگ فرط غیرت سے ان کاموں کو مکروہ سمجھتے تھے۔“ [ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ص ۱۵۳/۱۵۴)، (۱۵۴) اگر کوئی فرد کسی دوسرے پر احسان و نیکی یا تنگی میں اس کا تعاون کرنا چاہے تو اسے اپنے اس احسان کا بدلہ زیادہ مال لینے کی توقع سے نہیں کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر۔“ [المدثر: ۶]

ہمارے ہاں ولیموں کی دعوت میں یہی خواہش کارفرما ہوتی ہے کہ آج اگر اتنے پیسے دیں گے تو کل ہماری شادی پر زیادہ ملیں گے۔ لہذا اس ہندوانہ رسم کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ صرف شادی کے بعد حسب استطاعت دعوت ولیمہ ہے۔ کھانا کھانے والوں سے گھر بلا کر پیسے وصول کرنا ایک انتہائی مضحکہ خیز حرکت ہے، اللہ تعالیٰ اجتناب کی توفیق بخشنے۔ (آمین!)

نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کرنا

(سوال) ہمارے ہاں رسم ہے کہ نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کیے جاتے ہیں کیا یہ سنت طریقہ ہے؟

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں اپنی زندگی کے تمام معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ زندگی کے معاملات میں سے ایک اہم معاملہ نکاح کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی صحابہ اور صحابیات کے نکاح پڑھائے لیکن کسی بھی صحیح حدیث سے ہمیں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ آپ نے کسی نکاح میں نکاح کے بعد چھوہارے تقسیم کیے ہوں اور یہ تو ایک ہندوانہ رسم ہے۔ تاہم مسلمانوں میں اس فعل کا رواج چند ضعیف اور موضوع روایات کی بنا پر ہے۔ ان کا مختصر تجزیہ درج ذیل ہے:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَ بَعْضَ نِسَائِهِ فَنَشَرَهُ عَلَيْهِ التَّمْرُ» [بیہقی (۲۸۷/۷)، الکامل

فی ضعفاء الرجال (۲/۷۴۱)]

”رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی عورت سے شادی کی تو آپ ﷺ پر خشک کھجوریں بکھیری گئیں۔“

اس روایت کی سند میں الحسن بن عمرو سیف العبدی راوی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام بخاری رحمہما نے اسے کذاب کہا ہے اور امام ابو حاتم رازی رحمہما نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ [المعنی فی ضعفاء الرجال (۱/۲۵۴)، کتاب

الضعفاء والمتروکین (۱/۲۰۸)]

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ”یہ راوی متروک ہونے کا مستحق ہے۔“ [کتاب المجروحین (۲/۲۱۳)]
 اس کی متابعت ابن ابی داؤد نے کی ہے لیکن اس کی سند میں سعید بن سلام راوی کذاب ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کذاب، امام بخاری نے روایات گھڑنے والا وضاع اور امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے متروک اور باطل روایات بیان کرنے والا قرار دیا ہے۔“ [کتاب الموضوعات (۲/۲۶۴)]

ثابت ہوا کہ یہ روایت باطل و موضوع ہے۔

② سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا زَوَّجَ أَوْ تَزَوَّجَ نَشَرَ تَمْرًا» [بیہقی (۷/۲۸۸)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کی شادی کرتے یا خود شادی کرتے تو خشک کھجوریں بکھیرتے۔“

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اس کی سند میں عاصم بن سلیمان المصری راوی ہے جسے عمرو بن علی نے جھوٹ اور وضع حدیث کی طرف منسوب کیا ہے۔“ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اسے بہت سارے محدثین نے کذاب قرار دیا ہے۔“ [المغنی فی ضعفاء الرجال (۱/۵۰۶)]

ثابت ہوا یہ روایت بھی جھوٹی ہے۔

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ”مجھے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری آدمی

کی شادی میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور انصاری کا نکاح کر دیا اور فرمایا: ”الفت، خیر اور اچھے کاموں کو لازم پکڑو، اپنے ساتھی کے سر پر دف بجاؤ۔“ تو اس کے سر پر دف بجائی گئی اور میوے اور شکر کے پیکٹ لائے گئے، آپ نے وہ صحابہ پر بکھیر دیے، لیکن قوم رک گئی اور انھوں نے اسے لوٹا نہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کس قدر عمدہ بردہاری ہے، لوٹنے کیوں نہیں؟“ انھوں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! آپ نے اس اور اس

دن ہمیں لوٹنے سے منع کیا تھا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے تمہیں لشکروں کی لوٹ مار سے روکا تھا، ولیموں کی

لوٹ سے نہیں روکا، لہذا تم لوٹو۔“

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ہم سے چھین رہے تھے۔“

[الکامل (۱/۳۱۲)، الموضوعات لابن الجوزی (۲/۲۶۰)]

یہ روایت بھی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کی سند میں بشیر بن ابراہیم انصاری راوی ہے۔ امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام

ادزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”وہ میرے نزدیک روایات گھڑنے والوں میں سے ہے۔“ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”وہ ثقہ

راویوں پر روایتیں گھڑتا ہے۔“ [میزان الاعتدال (۱/۳۱۱)]

یہ روایت ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے لیکن اس میں بھی حازم اور لمازہ دونوں راوی مجہول ہیں۔ [الموضوعات

لابن الجوزی (۲/۲۶۶)]

④ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری مرد اور عورت کی شادی میں شریک ہوئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارا شاہد کہاں ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ہمارا شاہد کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دف۔“ تو وہ دف لائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے ساتھی کے سر پر بجاؤ۔“ پھر وہ اپنے برتن چھوہاروں وغیرہ سے بھر کر لائے اور انھوں نے چھوہارے وغیرہ بکھیرے تو لوگ اسے حاصل کرنے سے ڈرے۔ جب آپ نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا: ”آپ ﷺ نے لوٹ سے منع کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے لشکروں میں لوٹ سے منع کیا تھا، شادی اور اس قسم کے مواقع سے منع نہیں کیا۔“ [الموضوعات (۲/۲۶۶)]

اس کی سند میں خالد بن اسماعیل راوی ہے جو ثقہ راویوں پر روایات گھڑتا ہے جیسا کہ امام ابن عدی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اور امام ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس سے کسی صورت بھی حجت پکڑنا جائز نہیں۔“ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس مسئلے میں کچھ بھی ثابت نہیں۔“ [بیہقی (۷/۲۸۸)]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ نکاح کے موقع پر چھوہارے بانٹنے اور بکھیرنے کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں اور یہ صرف ایک رواج ہے جو مسلمانوں میں رائج ہو چکا ہے، اس لیے اس سے بچنے ہی میں خیر ہے۔

لوٹنیوں سے مباشرت

(سوال) کیا لوٹنیوں سے مباشرت کے لیے نکاح ضروری ہے؟ نیز اسلام اس ضمن میں کیا احکامات دیتا ہے؟ وضاحت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(جواب) اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے درج ذیل آیات پر غور کیجیے:

① ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَنِّي وَثَلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ آذُنِي أَلَّا تَعُولُوا﴾ [النساء: ۳]

”اور اگر تمہیں خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو پھر دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند آئیں دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے یا پھر وہ کنیریں اور باندیاں ہیں جو تمہارے قبضے میں ہوں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ بات زیادہ درست ہے۔“

② ﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ [النساء: ۲۴]

”نیز تمام شوہروں والی عورتیں بھی تم پر حرام ہیں مگر وہ باندیاں جو تمہارے قبضے میں آئیں۔“

③ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فِتْيَانِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾

[النساء: ۲۵]

”جو شخص کسی آزاد مومنہ عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ کسی مومنہ باندی سے نکاح کر لے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کا حال خوب جانتا ہے۔ (کوئی عورت آزاد یا لونڈی) سب ایک ہی جنس سے ہیں لہذا ان کے مالکوں کی اجازت سے تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔“

﴿ وَ الَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ اِلَّا عَلَىٰ اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴾ [المومنون: ۵-۷]

”وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا لونڈیوں کے وہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔“

ان آیات میں موجود شرمگاہوں کی حفاظت کے عمومی حکم سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے دو قسم کی عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، ایک ”ازواج“ اور دوسری ”مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ“۔ لفظ ازواج کا اطلاق عرب زبان کے معروف استعمال اور قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق صرف ان عورتوں پر ہوتا ہے جو باقاعدہ نکاح میں لائی گئی ہوں اور معروف طریقے کے مطابق ان سے عقد قائم کیا گیا ہو۔ اس کے لیے اردو میں بیوی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جب کہ ”مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ“ عربی محاورہ اور قرآنی لغت کے اعتبار سے لونڈی و باندی پر بولا جاتا ہے، یعنی وہ عورت جو آدمی کی ملک اور قبضے میں ہو۔ اس طرح یہ آیات وضاحت کرتی ہیں کہ مملوکہ لونڈی سے بھی مالک کو جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ہے اور اس کے جواز کی بنیاد نکاح نہیں بلکہ صرف ملکیت ہے۔ اگر اس کے لیے نکاح شرط ہوتا تو اسے ازواج سے علیحدہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ مملوکہ ہوئے کی صورت میں وہ بھی ازواج میں داخل ہوتیں۔

حاملہ عورت سے صحبت کرنا

(سوال) کیا حاملہ عورت سے اس کا شوہر صحبت کر سکتا ہے، کتاب و سنت میں اس کا کیا حکم ہے؟

(جواب) آذی کے لیے اپنی حاملہ عورت سے جماع کرنا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ نِسَاءُ كُمْ حَرَّتْ لَكُمْ ﴾ [البقرہ: ۲۲۳]

”تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے:

”مومن لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں البتہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے نہیں۔“ [المومنون: ۶۷۵]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مطلقاً بیوی کے ساتھ صحبت کو جائز رکھا ہے، منع وہاں ہوگا جہاں کوئی دلیل ہوگی۔ لہذا حالت حمل میں منع نہیں کیا گیا، اس لیے آدمی صحبت کر سکتا ہے۔ دوران حیض صحبت منع ہے، اسی طرح پچھلے حصے میں صحبت بھی منع ہے۔ حدیث میں ایسے شخص پر لعنت وارد ہے کیونکہ وہ گندگی اور نجاست کا محل ہے۔ نفاس کی حالت میں بھی ممانعت کا ہی حکم ہے۔

ولادت سے کتنی مدت بعد مرد عورت کے پاس جائے

(سوال) بچہ کی پیدائش کے کتنے دن بعد آدمی عورت کے پاس جائے گا؟ پوری وضاحت فرمائیں۔

(جواب) ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

”نفاس والی عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نفاس کے بعد چالیس دن تک بیٹھی رہتی تھیں۔“ [مسند احمد:

(۶/۳۰۰)، ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب ما جاء فی وقت النفساء (۱/۳۷۱)]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس والی عورتیں چالیس دن تک نماز چھوڑیں گی سوائے اس کے جو اس سے

پہلے نفاس کے خون سے پاب ہو جائے، تو وہ غسل کرے اور نماز پڑھے۔“

معلوم ہوا کہ بچے کی ولادت کے بعد چالیس دن تک عورت نماز نہیں پڑھے گی اور نہ شوہر اس کے ساتھ صحبت کرے گا۔

اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہو جائے اور عورت طہر کی حالت میں آجائے تو غسل کرے۔ خون رک جانے کے بعد مرد اپنی اہلیہ کے ساتھ صحبت کر سکتا ہے۔ نفاس کا وہی حکم ہے جو حیض کا حکم ہے۔

عورت کے حقوق

(سوال) عام طور پر مجلات و رسائل میں عورت کے ذمہ جو واجبات ہیں انھیں ہی بیان کیا جاتا ہے کیا مردوں پر ان کی بیویوں کے کوئی حقوق نہیں؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس طرح مردوں کے حقوق رکھے ہیں اسی طرح خواتین کے بھی حقوق بیان کیے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورت پر قسم قسم کے مظالم روا رکھے جاتے تھے، عورت کا زندہ دفن کیا جانا، وراثت سے محرومی، نا انصافی وغیرہ بیماریاں عام تھیں۔ اللہ نے عورت کو قدر و منزلت سے نکال کر انصاف پر مبنی حقوق سے نوازا اور مرد کو حسن معاشرت کا حکم صادر کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [النساء: ۱۹]

”بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کرو۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ [البقرہ: ۲۲۸]

”اور عورتوں کا (مردوں پر) ویسا ہی حق ہے جیسا دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے، البتہ مردوں کو

عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔“

ان آیات بینات سے واضح ہوا کہ خواتین کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جیسے مردوں کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

”ایمان والوں میں سے کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے اچھے ہیں اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب میں سے اچھا ہوں۔“ [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها (۱۱۶۲)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مومن مرد مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کی ایک عادت کو ناپسند کرے گا تو دوسری عادت سے راضی ہو جائے گا۔“ [مسلم، کتاب الرضاع: باب الوصیة بالنساء (۷۱۵)]

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا:

”یا رسول اللہ! ہماری بیوی کا ہم پر کیا حق ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”جب تم کھانا کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم لباس پہنو تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو اور برے طریقے سے پیش نہ آؤ اور تم اسے سوائے گھر کے نہ چھوڑو۔“ [ابوداؤد، کتاب النکاح باب فی حق المرأة علی زوجها (۲۱۴۲)]

مذکورہ بالا نصوص صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ خواتین کے بھی مردوں پر حقوق ہیں، جو مرد اپنی خواتین سے ناروا سلوک کرتے ہیں، ان کے لباس، خوراک اور گھر کا خیال نہیں رکھتے، ان سے حسن معاشرت کی بجائے گالی گلوچ سے پیش آتے ہیں انہیں عذاب الہی سے ڈر جانا چاہیے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کی وفادار ہے اور اپنے بستر پر اس کی غیر موجودگی میں کسی غیر کو داخل نہیں ہونے دیتی اور اس کے بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے تو مرد کا بھی حق ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ وقت گزارے، اس کے دکھ درد میں شریک ہو، اچھے لوگ وہی ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے مرد ایسے ہیں جو حقوق الناس سے یکسر غافل ہیں، قیامت والے دن جہاں حقوق اللہ کا سوال ہوگا وہاں حقوق الناس کے بارے بھی پوچھ گچھ ہوگی، اللہ تعالیٰ صحیح عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

خاندانی منصوبہ بندی

سوال کیا کسی مجبوری کی بنا پر نسل منقطع کرنے کا آپریشن کروایا جاسکتا ہے بالخصوص جب زچہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو؟

جواب قطع نسل کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر و بیوی میں سے کسی ایک کے توالذ و تواسل والے اعضاء میں داخلی یا خارجی ایسی تبدیلی کر دی جائے جس کی وجہ سے وہ ابدی طور پر اولاد کی نعمت سے محروم ہو جائیں اور بچہ جنم دینے کے بالکل قابل نہ رہیں۔ جیسا کہ گزشتہ دور میں مردوں کو خنسی کر دیا جاتا تھا اور آج کے ترقی یافتہ دور میں نسل بندی اور آپریشن وغیرہ کیا جاتا ہے۔ یہ صورت ناجائز و حرام ہے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«رَدَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونِ التَّبْتَلِ وَ لَوْ أَذِنَ لَهُ لَا نَحْتَصِينَا»
[بخاری، کتاب النکاح: باب ما یکره من التبتل والخصاء (۵۰۷۳)، مسلم (۱۴۰۲)، ترمذی (۱۰۸۳)، نسائی (۳۲۱۴)، ابن ماجہ (۵۹۳/۲)، مسند احمد (۱۷۵/۱)، دارمی (۲۱۶۷)]

”رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو نکاح کے بغیر رہنے سے منع کر دیا۔ اگر آپ انھیں اجازت دے دیتے تو ہم خصی ہو جاتے۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

«كُنَّا نَغْرُوا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَيْسَ لَنَا شَيْءٌ فَقُلْنَا أَلَا نَسْتَحْصِيهِ؟
فَنَهَانَا عَنْ ذَلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ لَنَا أَنْ نَنكِحَ الْمَرْأَةَ بِالثُّوبِ ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا
تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾» [بخاری، کتاب
النکاح: باب ما یکره من التبتل والخصاء (۵۰۷۵)]

”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے اور ہمارے پاس ہماری کوئی بیوی نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے کہا: ”کیا ہم خصی نہ ہو جائیں؟“ آپ ﷺ نے ہمیں اس سے منع کیا پھر ہمیں رخصت دی کہ ہم ایک کپڑے کے عوض عورتوں سے نکاح کر لیں پھر آپ ﷺ نے ہم پر قرآن کی یہ آیت پڑھی: ”اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نس بندی یا بذریعہ اپریشن آلات توالد و تناسل میں ایسا تغیر و تبدل کرنا جس سے نسل کا سلسلہ منقطع ہو جائے بالکل ناجائز و حرام ہے۔ البتہ بعض اوقات ایسی صورت کچھ خواتین کے ساتھ پیش آ جاتی ہے کہ ان کے اعضاء تولید اس قابل نہیں ہوتے کہ جن سے فطری اور طبعی طریقے سے ولادت ہو سکے۔ مجبوراً غیر فطری طریقے سے بذریعہ اپریشن بچہ پیدا ہوتا ہے اور ماہر ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق بذریعہ اپریشن دو یا تین مرتبہ ولادت کے بعد عورت میں بچہ جنم دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی بلکہ جان کے ضیاع کا قوی اندیشہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عورت کا حاملہ ہونا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اضطراری اور مجبوری کی حالت میں جب ماہر مسلمان ڈاکٹرز فیصلہ دے دیں کہ یہ عورت اب ولادت کے قابل نہیں رہی تو ایسی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہے کہ ولادت کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔ کیونکہ اسلام کا اصول ہے:

”الضُّرُورَاتُ تُبْسِحُ الْمَحْضُورَاتِ“ (شدید مجبوری حرام اشیاء کو جائز بنا دیتی ہے۔)

لہذا شدید مجبوری کی صورت میں ماہر مسلمان ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق اپریشن کروایا جاسکتا ہے۔

شادی کے دو ماہ بعد بچے کی پیدائش

(سوال) اگر شادی کے دو ماہ بعد کسی کے ہاں بچہ کی پیدائش ہو جائے تو کیا اسے جائز اولاد تصور کیا جاسکتا ہے؟

(جواب) شادی کے دو ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ کس طرح حلال کا ہو سکتا ہے جب کہ روح چار ماہ بعد پھونکی جاتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ

ذَلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللَّهُ الرُّوحَ» [بخاری، کتاب القدر: باب (۶۵۹۴)، مسلم (۲۶۴۳)]

”بلاشبہ تم میں سے ایک کو اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک (نطفہ کی صورت میں) جمع کیا جاتا ہے، پھر اس کے مثل جما ہوا خون، پھر اس کے مثل گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے، اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے، اس کے رزق، نیک بخت یا بد بخت ہونے کا، پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔“ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ چار ماہ کے بعد بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کم از کم دو ماہ اور ولادت تک لگتے ہیں۔ یعنی کم از کم شادی کے چھ ماہ بعد اگر بچہ پیدا ہو تو اسے اہل علم نے حلال شمار کیا ہے اور اس کے باپ کی طرف منسوب کرنا درست قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَ وَضَعَتْهُ كُرْهًا وَ حَمَلُهُ وَ فِصَالُهُ

ثَلَاثُونَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف: ۱۵]

”اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے تکلیف جھیل کر اسے اٹھائے رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنم دیا اور اس کا حمل اور دودھ چھڑائی کا زمانہ تیس مہینے ہے۔“ اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے یعنی اڑھائی سال بیان کی ہے جس میں چوبیس ماہ یعنی دو سال مدت رضاعت ہے اور باقی جو چھ ماہ بچتے ہیں وہ مدت حمل ہے کیونکہ مدت رضاعت کی قرآن کریم نے خود وضاحت کر دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرة: ۲۳۳]

”مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرنے کا ہو۔“

اس آیت کریمہ میں ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ کہہ کر یہ بات بتا دی ہے کہ مدت رضاعت دو برس ہی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنْ اشْكُرْ لِي وَ

لِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴾ [لقمان: ۱۴]

”اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں احسان کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف در تکلیف کی صورت میں اٹھائے رکھا اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے تاکہ تو میرا شکر یہ ادا کرے اور اپنے والدین کا بھی، میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ ﴿ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ﴾ کہہ کر دودھ چھڑانے کی مدت دو برس ہی بتائی ہے۔ لہذا شادی کے چھ ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ تو حلالی شمار ہوگا، اس سے کم مدت والا بچہ حلال نہیں ہوگا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ قَدْ اسْتَدَلَّ عَلَيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ بِهَذِهِ الْآيَةِ مَعَ الَّتِي فِي لُقْمَانَ : ﴿ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ﴾ وَ قَوْلِهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى : ﴿ وَ الْوَالِدَاتُ يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ عَلَى إِنْ أَقَلَّ مُدَّةَ الْحَمَلِ سِتَّةَ أَشْهُرٍ وَ هُوَ اسْتِنْبَاطُ قَوِيٍّ وَ صَحِيحٌ وَ وَافِقٌ عَلَيْهِ عُثْمَانُ وَ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ “ [تفسیر ابن کثیر (۲۵۷/۷)]

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سورۃ احقاف کی اس آیت کو سورۃ لقمان کی آیت (۱۴) اور سورۃ بقرہ کی آیت (۲۳۳) کے ساتھ ملا کر استدلال کیا ہے کہ مدت حمل کم از کم چھ ماہ ہے، یہ استنباط قوی اور صحیح ہے اور اس پر ان کی موافقت عثمان رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کی ہے۔“

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” فَالرِّضَاعُ أَرْبَعَةٌ وَعِشْرُونَ شَهْرًا وَ الْحَمْلُ سِتَّةَ أَشْهُرٍ “

” مدت رضاعت چوبیس ماہ اور مدت حمل چھ ماہ ہے۔“

علامہ شافعی رحمہ اللہ نے سورۃ لقمان اور سورۃ بقرہ کی مدت رضاعت والی آیات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

” بَيْنَ أَنْ أَمَدَ الْفِصَالِ عَامَانِ وَ هُمَا أَرْبَعَةٌ وَعِشْرُونَ شَهْرًا فَإِذَا طَرَحَتْهَا مِنَ الثَّلَاثِينَ بَقِيَتْ ”

” سِتَّةَ أَشْهُرٍ فَتَعَيَّنَ كَوْنُهَا أَمَدَ الْحَمَلِ وَ هِيَ أَقَلُّهُ وَ لَا خِلَافَ فِي ذَلِكَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ “ [تفسیر

أضواء البيان (۳۸/۵)]

”سورۃ لقمان اور سورۃ بقرہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بیان کی ہے جو چوبیس مہینے

ہے، جب چوبیس ماہ کو آپ تیس ماہ میں سے نفی کر دیں تو باقی چھ ماہ رہ جائیں گے جس سے حمل کی مدت متعین ہو

جائے گی اور یہ کم از کم مدت ہے اور اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔“

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” وَ فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ أَقْلَ مُدَّةِ الْحَمَلِ سِتَّةَ أَشْهُرٍ لِأَنَّهُ إِذَا حُطَّ مِنْهُ الْفِصَالُ حَوْلَانَ لِقَوْلِهِ

تَعَالَى : ﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ بَقِيَ ذَلِكَ “ [تفسیر بیضاوی (۳۹۴/۲)]

”اس آیت کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ کی رو سے جب دو سال دودھ چھڑانے کی مدت کو تیس ماہ سے نکال دیا جائے تو چھ ماہ باقی رہ

جاتے ہیں۔“

تفسیر جلالین میں ہے:

”سِتَّةَ أَشْهُرٍ أَقَلُّ مُدَّةِ الْحَمْلِ وَالْبَاقِي أَكْثَرُ مُدَّةِ الرَّضَاعِ“ [تفسیر جلالین (ص ۶۶۸/۱)]

”چھ ماہ کم از کم مدت حمل ہے اور باقی دو سال زیادہ سے زیادہ مدت رضاعت ہے۔“

علامہ زخمری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَهَذَا دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ أَقَلَّ الْحَمْلِ سِتَّةَ أَشْهُرٍ لِأَنَّ مُدَّةَ الرَّضَاعِ إِذَا كَانَتْ حَوْلَيْنِ لِقَوْلِهِ عَزَّ

وَجَلَّ: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ بَقِيَتْ لِلْحَمْلِ سِتَّةَ أَشْهُرٍ“ [تفسیر

الکشاف (۴/۳۰۲)]

”یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے، اس لیے کہ اللہ کے فرمان: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾

کی رو سے مدت رضاعت دو سال ہے تو پھر (تیس ماہ میں سے چوبیس ماہ نفی کر دیں تو) مدت حمل چھ ماہ رہ جاتی ہے۔“

علامہ محمد آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”اس آیت کریمہ سے علی اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ کم از کم مدت

حمل چھ ماہ ہے، اس لیے کہ جب تیس ماہ میں سے دو سال دودھ چھڑانے کے نکال لیں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی

وجہ سے کہ ”مائیں اپنی اولاد کو دو سال مکمل دودھ پلائیں جن کا ارادہ مدت رضاعت کو پورا کرنے کا ہو“ تو حمل کے

لیے یہی چھ ماہ باقی رہ جاتے ہیں اور یہی بات اطباء نے بھی کہی ہے۔ جالیئوس نے کہا ہے: ”زمانہ حمل کی مقدار کے

متعلق میں بڑا سخت متلاشی تھا تو میں نے دیکھا ایک عورت نے ۱۸۳ راتوں میں بچے کو جنم دیا۔“ (یعنی چھ ماہ اور چار

پانچ راتیں) ابن سینا نے اس مشاہدے کا دعویٰ کیا ہے۔“ [تفسیر روح المعانی (۲۶/۱۸)]

اس آیت کریمہ کی مزید تفسیر دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو:

⊗ تفسیر فتح القدیر للشوکانی (۵/۱۸) ⊗ تفسیر أيسر التفاسير (۴/۲۳۱)

⊗ تفسیر المراغی (۲۷/۱۸) ⊗ تفسیر معالم التنزیل (۴/۱۶۷)

⊗ أحكام القرآن لأبي بكر ابن العربي (۴/۱۶۹۷) ⊗ تفسیر مدارك (۲/۵۵۳)

⊗ تفسیر قاسمی (۸/۴۴۵) ⊗ تفسیر فتح البیان (۶/۳۰۰)

بچہ بن عبد اللہ جہنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ہمارے قبیلے کے ایک شخص نے جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا، چھ ماہ پورے ہوتے ہی اسے بچہ پیدا ہو گیا۔ اس

کے شوہر نے اس بات کا ذکر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کی جانب ایک آدمی بھیجا۔ وہ

تیار ہو کر آنے لگی تو اس کی بہن نے آہ و بکا شروع کر دی۔ اس عورت نے اپنی بہن سے کہا: ”تم کیوں روتی ہو، اللہ

کی قسم! میں نے اللہ کی مخلوق میں سے اس آدمی کے علاوہ کسی سے اختلاط نہیں کیا، اللہ جو چاہے گا میرے متعلق فیصلہ

کرے گا۔“ جب وہ شخص اس عورت کو لے کر عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو رجم کرنے کا حکم دیا تو یہ

بات علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی۔ وہ تشریف لائے اور خلیفۃ المسلمین عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ”آپ کیا کرنے لگے ہیں؟“ تو

خليفة نے جواب دیا: ”اس عورت نے چھ ماہ پورے ہوتے ہی بچہ کو جنم دیا ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ تو علی رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ”کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟“ تو انہوں نے کہا: ”کیوں نہیں۔“ علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”کیا آپ نے یہ آیت نہیں سنی: ﴿وَ حَمَلُهُ وَ فَصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ ”اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ ہے“ اور اللہ نے فرمایا ہے: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ ”مت رضاعت دو سال ہے“ جب تیس ماہ سے چوبیس ماہ نکال دیں تو باقی چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔“ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میرا خیال ہی اس طرف نہیں گیا، جاؤ اس عورت کو میرے پاس لے آؤ۔“ پس لوگوں نے اس عورت کو اس حال میں پایا کہ وہ اس حمل سے فراغت حاصل کر چکی تھی۔ ہجرت بن عبد اللہ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اللہ کی قسم! ایک کو دوسرے کو سے اور ایک انڈا دوسرے انڈے سے اتنا مشابہ نہیں ہوتا جتنا اس عورت کا یہ بچہ اپنے باپ کے مشابہ تھا۔“ پھر جب لڑکے کے والد نے اسے دیکھا تو کہا: ”اللہ کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے، مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔“ [تفسیر ابن کثیر (۲۵۸/۷)، تفسیر ابن ابی حاتم (۳۲۹۳/۱۰)، تفسیر الدر المنثور (۹/۶)]

مذکورہ بالا توضیح سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شادی کے چھ ماہ بعد جو بچہ پیدا ہو اسے حلال کا شمار کیا جاتا ہے اور اس کے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو بچہ شادی کے دو ماہ بعد پیدا ہو وہ کسی طرح بھی حلال کا نہیں ہوگا۔ اس میں بدکاری کو یقینی طور پر دخل ہے۔ والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ بچوں کو بالغ ہونے کے بعد جتنا جلدی ممکن ہو مناسب رشتہ تلاش کر کے شادی کے بندھن میں باندھ دیں تاکہ وہ حرام کاری سے بچ سکیں، جو والدین بلاوجہ اپنے بچوں کی شادیاں لیٹ کر دیتے ہیں ان میں سے اکثریت ایسوں کی ہے جو مختلف گلی محلوں، سڑکوں، پارکوں، چوکوں، چوراہوں، ہوٹلوں اور ٹائٹ کلبوں میں اپنی جوانی برباد کر دیتے ہیں اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ہندوانہ رسومات کو بالائے طاق رکھ کر کتاب و سنت کے مطابق اپنی اولاد کو بہت جلد رشتہ ازدواج میں منسلک کر دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کر کے پاکباز، متقی اور صالح انسان بن سکیں۔

طویل عرصہ بیرون ملک رہنے والے کے نکاح کا حکم

(سوال) کیا شادی شدہ آدمی کا نکاح دو سال بیرون ملک رہنے کے بعد باقی رہتا ہے یا نہیں یا دوبارہ نکاح کرنا چاہیے؟

(جواب) شادی شدہ آدمی کا نکاح اس وقت ٹوٹتا ہے یا رشتہ ازدواج ختم ہوتا ہے جب وہ اپنی اہلیہ کو طلاق دے ڈالے اور رجوع نہ کرے حتیٰ کہ عدت گزر جائے یا عورت خلع لے لے یا دونوں میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے اور دین اسلام سے خارج ہو جائے، بصورت دیگر نکاح قائم رہتا ہے، شوہر بیوی سے خواہ کتنا عرصہ دور رہے اور اگر مرد عورت کے نزدیک نہ جانے کی قسم کھالے جسے شریعت میں ایلاء کہتے ہیں تو اگر یہ قسم چار ماہ سے کم مدت کی ہے تو اس کی حیثیت عام قسم کی ہے اگر مدت پوری ہونے سے پہلے ہم بستری کر لیتا ہے تو قسم کا کفارہ دینا ہوگا، اگر مدت پوری کرے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں، لیکن اگر اس نے ہمیشہ کے لیے قسم کھائی ہو یا چار ماہ سے زیادہ کی قسم کھائی ہے تو اسے بیوی کے مطالبہ پر صرف چار ماہ کی مدت دی جائے گی،

اگر یہ مدت پوری کرنے کے بعد اپنی بیوی سے ہم بستری کر لیتا ہے تو اس پر صرف کفارہ واجب ہوگا اور اگر ہم بستری نہیں کرتا تو اسے طلاق پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر طلاق نہیں دیتا تو عورت سے دفع ضرر کے لیے حاکم وقت شوہر کی طرف سے طلاق کو نافذ کر دے گا۔ (ملاحظہ ہو تیسیر الرحمن لیبان القرآن از دکتور لقمان سلفی [۱۲۶])

لہذا مرد کا بیوی سے صرف دور رہنے سے طلاق واقع نہیں ہو جائے گی تا وقتیکہ وہ طلاق نہ دے ڈالے، یا عورت خلع نہ لے۔ عام طور پر جو لوگ اپنے ملک سے کسی کاروبار، نوکری وغیرہ کی غرض سے باہر جاتے ہیں تو شوہر اور بیوی باہمی رضامندی ہی سے یہ کام کرتے ہیں اور مرد کئی کئی سال باہر رہتے ہیں اور عورتیں اس پر اعتراض نہیں کرتیں بلکہ اس بات پر خوشی محسوس کرتی ہیں۔ سلف صالحین کے دور میں مرد حضرات جہاد فی سبیل اللہ میں کئی کئی سال اپنے گھر سے دور رہتے یا حصول علم کے لیے لے لے سفر کرتے تھے۔ کہیں سے بھی یہ بات نہیں ملتی کہ اس بعد اور دوری کی بنا پر دونوں کا نکاح ختم ہونے کا کسی نے فتویٰ صادر کیا ہو۔ (واللہ اعلم!)

ایک سے زیادہ بیویوں کے مابین عدل کا حکم

سوال جیسا کہ قرآن و حدیث کے احکامات ہیں کہ جو شخص ایک سے زیادہ بیویاں رکھے وہ ان میں عدل کرتے ہیں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ عدل کن امور میں ہے اور کیسے ممکن ہے؟

جواب جس آدمی کی دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس پر ان کے درمیان نان و نفقہ، رہائش اور رات بسر کرنے میں عدل کرنا واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ [النساء: ۳]

”اگر تمہیں ڈر ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی کافی ہے۔“

معلوم ہوا کہ عورتوں کے درمیان عدل کرنا واجب ہے اور جو شخص اپنی بیویوں کے درمیان عدل سے کام نہیں لیتا اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

« مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ يَمِيلُ لِاحْدَاهُمَا عَلَى الْآخْرَى جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَجُرُّ أَحَدَ شِقِيهِ مَائِلًا »

[مسند احمد (۲/۲۹۵)، ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی القسم بین النساء (۲۱۳۳)]

”جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف مائل ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی ایک جانب مقلوب ہوگی۔“

البتہ اگر دل میں کسی کی محبت زیادہ ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے، اس پر مواخذہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

بیوی یا شوہر کا راز افشا کرنے کا شرعی حکم

سوال اگر کوئی عورت یا مرد آپس کی راز کی باتیں دوسروں کو بتائے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) عورت ہو یا مرد دونوں میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی جنسی گفتگو اور دیگر پوشیدہ اسرار و رموز کی باتیں کسی دوسرے کے آگے ظاہر کریں، اس لیے کہ ایسے لوگ شریعت کی نظر میں بہت برے ہیں اور اللہ کے ہاں ان کا بہت برا ٹھکانا ہو گا۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”بے شک اللہ کے نزدیک قیامت والے دن سب لوگوں سے برا ٹھکانا اس آدمی کا ہو گا جو اپنی اہلیہ کے پاس جاتا ہے اور اس کی اہلیہ اس کے پاس آتی ہے پھر وہ اس کے راز پھیلا دیتا ہے۔“ [صحیح مسلم، کتاب النکاح: باب تحريم افشاء سرا المرأة (۱۴۳۷)]

دوسری حدیث میں ہے:

”امانت کی سب سے زیادہ خیانت کرنے والا وہ آدمی ہے جو اپنی اہلیہ کے ہاں رات بسر کرتا ہے وہ اس کے ہاں رات گزارتی ہے پھر وہ اس کے راز افشا کرتا ہے۔“ [مسلم، کتاب النکاح: باب تحريم افشاء سرا المرأة: (۱۴۳۱)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

”اس حدیث سے آدمی کے لیے اس کی اہلیہ کے درمیان جاری رہنے والے امور اور ان کی تفصیل بیان کرنے اور پھیلانے کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔“ [شرح نووی (۸/۱۰)]

لہذا مردوزن کو اس بات میں محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اپنے اندرونی معاملات یعنی ایک دوسرے کے جسمانی راز اور اپنی جنسی گفتگو کسی دوسرے فرد سے بیان نہ کریں۔ ہمارے معاشرے میں یہ بیماری عام ہے کہ مرد جنسی معلومات ذکر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے، اسی طرح خواتین اپنی سہیلیوں سے اپنے شوہروں کے ساتھ گزرنے والے مخصوص حالات بلا جھجک بیان کرتی اور پوچھتی ہیں۔ ایسے معاملات سے مکمل گریز کرنا چاہیے۔

حرمت رضاعت

(سوال) کیا حرمت رضاعت دودھ پینے والے کے بہن بھائیوں پر بھی لاگو ہوگی یا یہ صرف اسی تک محدود رہے گی؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حرام رشتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَ أُمَّهَاتُكُمُ اللَّائِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ [النساء: ۲۳]

”اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔“

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«الرَّضَاعَةُ تُحَرِّمُ مَا تُحَرِّمُ الْوَلَادَةُ» [احمد (۱۷۸/۶)، بیہقی (۱۰۹/۷)، عبد الرزاق (۱۳۹۰۴)،

ابوداؤد (۲۰۵۵)، ترمذی (۱۱۴۷)، سنن سعید بن منصور (۹۵۳)، ابن حبان (۴۲۰۹)]

”رضاعت وہ رشتے حرام کر دیتی ہے جو رشتے ولادت حرام کرتی ہے۔“

مراد یہ ہے کہ جس طرح آدمی کے لیے نسا ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی حرام ہیں اسی طرح رضاعی ماں بہن وغیرہ بھی حرام ہیں۔ رضاعی ماں اور بہن تو قرآن کی نص کے ساتھ حرام ہیں اور باقی رشتے حدیث کی نص کے ساتھ حرام ہیں۔ رضاعت کا حکم صرف اس آدمی کے لیے ہے جس نے دودھ پیا ہے، اس کے بھائی بہنوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ رضاعت متعدی نہیں ہوتی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَلَا يَتَعَدَّى التَّحْرِيمُ إِلَى أَحَدٍ مِنْ قَرَابَةِ الرَّضِيعِ فَلَيْسَتْ أُخْتُهُ مِنَ الرِّضَاعَةِ أُخْتًا وَلَا بِنْتًا لِأَبِيهِ إِذْ لَا رِضَاعَ بَيْنَهُمْ وَالْحِكْمَةُ فِي ذَلِكَ أَنَّ سَبَبَ التَّحْرِيمِ مَا يَنْفَصِلُ مِنْ أَجْزَاءِ الْمَرْأَةِ وَزَوْجِهَا وَهُوَ اللَّبَنُ فَإِذَا اغْتَدَى بِهِ الرَّضِيعُ صَارَ جُزْءًا مِنْ أَجْزَائِهِمَا فَانْتَشَرَ التَّحْرِيمُ بَيْنَهُمْ بِخِلَافِ قَرَابَاتِ الرَّضِيعِ لِأَنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْمُرْضِعَةِ وَلَا زَوْجِهَا نَسَبٌ وَلَا سَبَبٌ وَاللَّهُ أَعْلَمُ“ [فتح الباری (۱/۸۱۶)]

”دودھ پینے والے بچے کے قریبی رشتہ داروں کی طرف حرمت متعدی نہیں ہوتی۔ اس دودھ پینے والے بچے کی رضاعی بہن اس کے بھائی کی رضاعی بہن نہیں ہے اور نہ اس کے باپ کی بیٹی ہے اس لیے کہ ان کے درمیان رضاعت نہیں ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ حرمت کا سبب وہ دودھ ہے جو عورت اور اس کے خاوند کے اجزا سے جدا ہوتا ہے اور جب دودھ پینے والا بچہ اس دودھ کے ذریعے غذا حاصل کرتا ہے تو وہ ان دونوں کے اجزا میں سے ایک جزو ہوتا ہے تو ان کے درمیان حرمت منتشر ہو جاتی ہے۔ دودھ پینے والے بچے کے قریبی رشتہ داروں میں یہ بات نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان کے درمیان اور دودھ پلانے والی اور اس کے خاوند کے درمیان نہ نسبی رشتہ ہے اور نہ حرمت کا سبب ہے۔“

امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَلَا بَأْسَ أَنْ يَتَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ الَّتِي أَرْضَعَتْ ابْنَهُ وَكَذَلِكَ يَتَزَوَّجُ ابْنَةُ هَذِهِ الْمَرْأَةِ الَّتِي هِيَ رَضِيعُ ابْنِهِ وَلَا حَيْثُ هَذَا الْعُلَامُ الْمُرْضِعُ أَنْ يَتَزَوَّجَ الْمَرْأَةَ الَّتِي أَرْضَعَتْ أَخَاهُ وَ يَتَزَوَّجُ ابْنَهَا الَّتِي هِيَ رَضِيعُ أَحِيهِ“ [الإقناع (۱/۳۰۸)]

”اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ آدمی اپنے بیٹے کی رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح کرے، اسی طرح اس کا بھائی بھی اس کی رضاعی ماں اور رضاعی بہن سے نکاح کر سکتا ہے۔“

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”فَأَمَّا الْوَالِدُ الْمُرْتَضِعُ فَإِنَّ الْحُرْمَةَ تَنْتَشِرُ إِلَيْهِ وَإِلَى أَوْلَادِهِ وَإِنْ نَزَلُوا وَلَا تَنْتَشِرُ إِلَى مَنْ فِي دَرَجَتِهِ مِنْ إِخْوَانِهِ وَأَخَوَاتِهِ وَلَا إِلَى أَعْلَى مِنْهُ كَأَبِيهِ وَآمِهِ وَأَعْمَامِهِ وَعَمَّاتِهِ وَأَخْوَالِهِ وَ

خَالَاتِهِ وَ أَحْدَادِهِ وَ حَدَّاتِهِ فَلَا يَحْرُمُ عَلَى الْمُرْضِعَةِ نِكَاحَ أَبِي الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ لِأَخِيهِ وَ لَا عَمِّهِ وَ لَا خَالَهِ وَ لَا يَحْرُمُ عَلَى زَوْجِهَا نِكَاحَ أُمِّ الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ لَا أُخْتِهِ وَ لَا عَمَّتِهِ وَ لَا خَالَتِهِ وَ لَا بَأْسَ أَنْ يَتَزَوَّجَ أَوْلَادَ الْمُرْضِعَةِ وَ أَوْلَادَ زَوْجِهَا إِخْوَةَ الطِّفْلِ الْمُرْتَضِعِ وَ أَخَوَاتِهِ“
[المغنی لابن قدامة (۱۱/۳۱۸، ۳۱۹)]

”رضاعت کی بنا پر حرمت دودھ پینے والے لڑکے اور اس کی اولاد کی طرف منتشر ہوتی ہے اور اگرچہ نیچے تک ہوں (یعنی اس کے پوتے اور پڑپوتے وغیرہ) یہ حرمت اس کے بھائیوں اور بہنوں کی طرف اور اس سے اوپر رشتوں کی طرف منتشر نہیں ہوتی، جیسے دودھ پینے والے کا باپ، ماں، چچا، پھوپھیاں، ماموں، خالائیں، دادے، نانے، دادیاں، نانیاں۔ دودھ پلانے والی کا دودھ پینے والے کے باپ، بھائی، چچا اور ماموں کے ساتھ نکاح حرام نہیں اور نہ اس کے خاندان پر دودھ پینے والے کی ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ حرام ہیں اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دودھ پلانے والی کی اولاد اور اس کے خاندان کی اولاد دودھ پینے والے کے بھائیوں اور بہنوں سے نکاح کریں۔“

یہی بات نواب صدیق حسن خان قنوجی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمائی ہے۔ [الروضۃ الندیۃ (۲/۲۵۰)]

لہذا وہ اولاد جن کا آپس میں رضاعت کا تعلق ہے، ان کے دیگر بہن بھائیوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہو سکتا ہے، شرعاً کوئی مانع موجود نہیں۔

رضاعت کا مسئلہ

(سوال) ندیم جب پیدا ہوا تو اس کے گیارہ دن بعد اس کی والدہ فوت ہو گئی، پونے دو سال تک ندیم کو اس کی ایک پھوپھی نے دودھ پلایا، پھر ایک سانحہ ہوا جس میں ندیم کی دادی کا بیٹا فوت ہو گیا۔ ندیم دودھ پینے کے لیے چیخ رہا تھا تو اس کی دادی نے ایک دفعہ یا دو دفعہ دودھ پلایا، آیا قرآن و حدیث کی روشنی میں ندیم اپنی پھوپھی جس کا اس نے دودھ پیا ہے، کے علاوہ باقی پھوپھیوں کی کسی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہے؟

(جواب) شرع کی رو سے جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں مدت رضاعت دو سال ہے، اگر بچہ اس مدت کے اندر دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے اور دودھ کی مقدار اتنی ہو جو بچے کے لیے غذا کا کام دے اور بچے کی آنتیں بھر دے۔ جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:

”وہی دودھ پلانا حرمت ثابت کرتا ہے جو چھاتی سے نکل کر آنتوں کو پھاڑے اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے

پہلے ہو۔“ [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء أن الرضعة لا تحريم إلا في الصغر دون الحولين (۱۱۵۲)]

اور جمہور ائمہ محدثین کے نزدیک یہ دودھ پینا پانچ بار ہے۔ اس کی دلیل وہ مشہور حدیث ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قرآن کریم میں دس بار دودھ پینے کے بعد حرمت رضاعت کا حکم نازل ہوا تھا پھر

پانچ بار کے ذریعے حکم سابق منسوخ کر دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت یہی پانچ بار دودھ پینے کا حکم موجود تھا۔ احادیث میں ”رضعات“ کا لفظ آیا ہے جو ”رضعہ“ کی جمع ہے، جس کے معنی خوب سیر ہو کر دودھ پینے کے ہیں کہ آنتیں بھر جائیں یا بچہ جب ایک بار چھاتی کو منہ لگاتا ہے پھر اپنی مرضی سے چھوڑ دیتا ہے تو یہ ایک بار ہے، اس طرح پانچ بار دودھ پیے تو حرمت ثابت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ایک یا دو بار دودھ پلانا حرمت ثابت نہیں کرتا۔“ [صحیح مسلم، کتاب الرضاع: باب فی المصۃ والمصتان (۱۴۵۰)]
ام الفضل رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

”ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ میرے گھر تشریف فرما تھے، اس نے کہا: ”اے اللہ کے نبی! میری ایک بیوی ہے، میں نے اس پر دوسری عورت سے شادی کی ہے اور میری پہلی بیوی کا دعویٰ ہے کہ اس نے اس عورت کو ایک یا دو بار دودھ پلایا ہے جس سے میں نے دوسری شادی کی ہے تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”ایک یا دو بار

دودھ پینا حرام نہیں کرتا۔“ [مسلم، کتاب الرضاع: باب فی المصۃ و المصتان: (۱۴۵۱)]

مندرجہ بالا احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ ایک یا دو بار دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، لہذا سائل مذکور نے جو صورت بیان کی ہے اس میں ندیم اپنی اس پھوپھی کی بیٹیوں سے نکاح نہیں کر سکتا جس کا پونے دو سال تک دودھ پیا ہے البتہ باقی پھوپھیوں کی بیٹیوں سے کر سکتا ہے کیونکہ دادی کا دودھ اس نے ایک یا دو بار پیا ہے جس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

ایک دفعہ دودھ پینے سے رضاعت

(سوال) ایک لڑکے نے اپنی خالہ کا ایک مرتبہ دودھ پیا تو کیا اس لڑکے کا اپنی خالہ کی لڑکی سے نکاح ہو سکتا ہے؟

(جواب) اگر بچے کو اس کی حالت شیر خوارگی میں اس طرح دودھ پلایا گیا ہو کہ وہ اس کے بدن کی غذا بن جائے خواہ کسی طرح بھی پلایا جائے تو اس سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الرِّضَاعَةُ مِنَ الْمَحَاغَةِ» [صحیح مسلم، کتاب الرضاع: باب إنما الرضاعة من المحاعة (۱۴۵۵)]
”رضاعت بھوک سے ثابت ہوگی۔“

یعنی جس رضاعت سے بچے کی بھوک دور ہو جائے وہ باعث حرمت ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس رضاعت سے حرمت ثابت ہوگی جو آنتوں کو پھاڑ دے اور یہ دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔“ [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء أن الرضاعة لا تحرم إلا في الصغر دون الحولين: (۱۱۵۲)]

یعنی جس رضاعت سے دودھ سے آنتیں بھر کر ایک دوسری سے جدا ہو جائیں۔ محدثین کی اکثریت اس بات کی طرف گئی ہے کہ ایسے دودھ کی تعداد پانچ مرتبہ دودھ پینا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں اس کی تائید میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے اور قرآن حکیم نے جو مطلق طور پر رضاعت ذکر کی ہے، ان احادیث نے اس اطلاق کو مقید کر دیا ہے اور عام کی تخصیص ہو گئی ہے،

ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دودھ چوس لینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ایک مرتبہ چوسنا یا دو مرتبہ چوسنا حرام نہیں کرتا، حرام کرنے کی مقدار پانچ رضعات ہیں۔“ [مسلم، کتاب الرضاع:

باب فی المصۃ والمصتان (۱۴۵۰)]

یعنی بچہ ایک مرتبہ پستان منہ میں لے کر دودھ چوستا ہے پھر اپنی مرضی سے بغیر کسی عارضے کے چھوڑ دے تو یہ ایک مرتبہ ہے، اس طرح پانچ دفعہ اگر کسی بچے کے بارے ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں ہوگی اور اس عورت کی بیٹی اس کی رضاعی بہن ہوگی۔ اس کے ساتھ نکاح حرام ہوگا کیونکہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہی رضاعت سے بھی حرام ہیں۔

صورت مسئلہ میں ایک مرتبہ دودھ پینے کا ذکر کیا گیا ہے اگر یہ بات ٹھیک ہے تو اس لڑکے کا اس لڑکی سے نکاح بالکل درست ہے۔ حرمت رضاعت کی مقدار مکمل نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب!

بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی

(سوال) اگر کوئی شخص غلطی سے اپنی اہلیہ کا دودھ پی لے تو کیا میاں بیوی والا رشتہ قائم ہے یا کہ ختم ہو جاتا ہے؟

(جواب) یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ایک آدمی نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ”میں نے اپنی اہلیہ کا دودھ چوس لیا ہے اور وہ میرے پیٹ میں

چلا گیا ہے۔“ تو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں سمجھتا ہوں وہ تجھ پر حرام ہو چکی ہے۔“ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: ”تم اس آدمی کو جو فتویٰ دے رہے ہو اس پر غور کرو؟“ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: ”آپ کیا کہتے ہیں؟“

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”رضاعت صرف وہی ہے جو دو سال میں ہو۔“ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جب تک یہ

عالم تم میں موجود ہے تم مجھ سے کسی چیز کے بارے سوال نہ کرو۔“ [الموطا للمالک، کتاب الرضاع (۱۴)، مسند

احمد (۱/۴۳۲)، ارواء الغلیل (۷/۲۲۳)، (۲۲۴)]

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ حرمت رضاعت جس مدت میں ہوتی ہے وہ دو سال تک ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے بھی

تین مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ مدت رضاعت دو سال ہے، لہذا بڑی عمر میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی اور نہ مرد پر

عورت حرام ہوتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فقیہ امت کا فتویٰ قرآن حکیم کے بالکل مطابق ہے اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی

اس کی تائید کر دی ہے۔ یاد رہے کہ عورت کا دودھ مرد کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت کے بچوں کے لیے ہے، کتاب و سنت کی

نصوص سے ماں کا دودھ بچوں ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے۔

بہن کا دودھ پینے والے کی اولاد

(سوال) اگر کسی شخص نے اپنی بہن کا دودھ پیا ہو تو کیا اس شخص اور اس کی بہن جس کا اس نے دودھ پیا ہے ان دونوں کی

اولادوں کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے رضاعت کی بنا پر بھی وہ رشتے حرام کیے ہیں جو نسبی طور پر حرام ہیں۔ یعنی جس طرح سگی ماں، بہن، بیٹی، بھتیجی، بھانجی، پھوپھی اور خالہ حرام ہیں اسی طرح یہ رضاعی رشتے بھی حرام ہیں۔ لہذا جس شخص نے اپنی بہن کا دودھ پیا ہے، بہن کی اولاد اس شخص کے بھائی بہن ہوں گے اور اس شخص کی اولاد کے چچا اور پھوپھیاں ہوں گے جن کا باہمی نکاح حرام ہے۔ مذکورہ صورت میں تو سگے باپ کا رضاعی بھائی مذکورہ شخص کی اولاد کا چچا لگتا ہے۔ خیر القرون میں ایسی مثال ملتی ہے کہ رضاعی باپ کا بھائی جو دودھ پینے والی لڑکی کا چچا لگتا ہے اس کے ساتھ مذکورہ لڑکی کا نکاح حرام ٹھہرا جیسا کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”ابوالقیس کے بھائی افرح نے نزول حجاب کے بعد میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی، میں نے کہا: میں اسے اتنی دیر تک اجازت نہیں دوں گی جب تک اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب نہ کر لوں۔ اس لیے کہ اس کے بھائی ابوالقیس نے مجھے دودھ نہیں پلایا بلکہ مجھے ابوالقیس کی بیوی نے دودھ پلایا ہے۔ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ابوالقیس کے بھائی افرح نے میرے پاس آنے کی اجازت مانگی، میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں آپ سے اس کے بارے میں اجازت طلب کر لوں۔“ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تجھے اجازت دینے سے کیا چیز مانع ہوئی؟ وہ تیرا چچا ہے۔“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! یقیناً مرد نے مجھے دودھ نہیں پلایا بلکہ ابوالقیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو اس کو اجازت دے دے، اس لیے کہ وہ تیرا چچا لگتا ہے۔“ عروہ راوی حدیث بیان کرتا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی لیے فرماتی تھیں:

« حَرَّمُوا مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا تُحَرِّمُونَ مِنَ النَّسَبِ » [مسلم، کتاب الرضاع: باب تحريم الرضاعة من

ماء الفحل (۱۴۴۵)، مسند احمد (۴۴/۶)، ابن کثیر (۳۷۸/۶)]

”جو رشتے نسب سے حرام سمجھتے ہو وہی رشتے رضاعت سے حرام سمجھو۔“

مذکورہ بالا مفصل حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح نسب سے رشتے حرام ہوتے ہیں اسی طرح رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے اس سے پچھلا مسئلہ دیکھیے۔

وٹہ سٹہ کا نکاح

(سوال) وٹہ سٹہ کیا ہے؟ اور وٹہ سٹہ کی شادی کا کیا حکم ہے؟

(جواب) شرعی طور پر اس نکاح کو شغار کہا جاتا ہے اور شغار کی ممانعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی ایک صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا شِغَارَ فِي الْإِسْلَامِ » [مسلم، کتاب النکاح: باب تحريم نكاح الشغار و بطلانه (۱۴۱۵)، مسند

احمد (۳۵-۹۱/۲)]

”اسلام میں شغار (یعنی وندہ سٹہ کا نکاح) نہیں ہے۔“

یہ روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الشُّغَارِ» [مسلم، کتاب النکاح: باب تحریم نکاح الشغار و بطلانہ (۱۴۱۵)، موطا (۲۴)، کتاب الأم للشافعی (۷۶/۵)، بخاری، کتاب النکاح: باب الشغار (۵۱۱۲)، ابو داؤد، کتاب النکاح: باب الشغار (۲۰۷۴)، ابن ماجہ (۱۸۸۳)، مسند احمد (۷/۶)]

”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغار (وندہ سٹہ کا نکاح) سے منع فرمایا ہے۔“

نیز یہی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں بھی مروی ہے اور انس رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ، ابن حبان اور مسند احمد میں موجود ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، مسند طیالسی اور مسند احمد میں موجود ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مسلم، بیہقی اور مسند احمد وغیرہ میں موجود ہے۔

اس صحیح ترین حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وندہ سٹہ کی شادی شرعی طور پر ناجائز و حرام ہے اور شغار کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا بہن یا کسی بھی عورت کو جو اس کی زیر ولایت ہو اس شرط پر کسی سے بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن یا کسی بھی عورت کو جو اس کی زیر ولایت ہو، اس کے خاندان کے کسی مرد سے بیاہ دے۔ یہ شرط شرعاً ناجائز ہے کیونکہ ایسی کوئی شرط کتاب و سنت میں موجود نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«كُلُّ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَهُوَ بَاطِلٌ» [مسند احمد (۲/۲۱۳)، بخاری، کتاب البيوع: باب إذا اشترط في البيع شرطاً لا تحل (۲۱۶۸)، مسلم (۱۵۰۴)]

”ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔“

صحیح بخاری وغیرہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«مَا بَالُ رَجَالٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطًا لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَإِنْ كَانَ مِائَةً شَرْطٍ»

”ایسے لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں موجود نہیں ہیں، ایسی شرط جو کتاب اللہ میں موجود نہیں وہ باطل ہے خواہ وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں؟“

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«وَلَا يَجِلُّ نِكَاحُ الشُّغَارِ وَهُوَ أَنْ يَتَزَوَّجَ هَذَا وَوَلِيَّتَهُ هَذَا عَلَيْهِ أَنْ يُزَوِّجَهُ الْآخَرَ وَوَلِيَّتَهُ أَيْضًا سِوَاءَ ذَكَرَ فِي كُلِّ ذَلِكَ صَدَاقًا لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا أَوْ لِأَحَدَاهُمَا ذُونَ الْآخَرَى أَوْ لَمْ يَذْكُرْ فِي شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ صَدَاقًا كُلُّ ذَلِكَ سِوَاءٌ» [المحلى لابن حزم (۱۱۸/۹)]

”وندہ سٹہ کا نکاح حلال نہیں اور وندہ سٹہ کا نکاح یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی زیر ولایت لڑکی سے اس شرط پر

نکاح کرے کہ دوسرا آدمی بھی اپنی زیر ولایت لڑکی کو اس طرح اس کے ساتھ بیاہ دے گا۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ انھوں نے ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے مہر ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو یا ایک کا مہر ذکر کیا ہو اور دوسری کا نہ کیا ہو یا دونوں میں سے کسی کا بھی حق مہر ذکر نہ کیا ہو، یہ تمام صورتیں برابر ہیں۔“

اور شغاری جو تفسیر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آئی ہے کہ ایک آدمی اپنی بیٹی اس شرط پر دوسرے کو بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی اسے بیاہ دے گا تو ان دونوں کا مہر نہ ہوگا، تو یہ نافع رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ صحیح روایت میں موجود ہے کہ عبد اللہ فرماتے ہیں:

« قُلْتُ لِنَافِعِ مَا السُّنْعَارُ؟ قَالَ يُنْكَحُ ابْنَةَ الرَّجُلِ وَ يُنْكَحُهُ ابْنَتُهُ بِغَيْرِ صَدَاقٍ وَ يُنْكَحُ أُخْتِ

الرَّجُلِ وَ يُنْكَحُهُ أُخْتَهُ بِغَيْرِ صَدَاقٍ » [بخاری، کتاب الحیل، باب الحيلة فی النکاح (۶۹۶۰)]

”میں نے نافع رضی اللہ عنہ سے کہا: ”شغاری کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”شغاری یہ ہے کہ کوئی شخص کسی آدمی کی بیٹی سے اس طرح نکاح کرے کہ دوسرا اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دے اور دونوں کے درمیان مہر نہ ہو اور آدمی کی بہن سے اس طرح نکاح کرے کہ وہ اسے اپنی بہن نکاح میں دے دے اور دونوں کے درمیان حق مہر نہ ہو۔“

اگرچہ شغاری اس تعریف میں یہ اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ امام مالک رضی اللہ عنہ یا نافع رضی اللہ عنہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح ہے لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ یہ نافع کی تشریح ہے اور اس میں مہر کی قید اتفاق ہے۔ شغاری اصل نکاح کا مشروط کرنا ہے کہ دوسرا بھی اپنی زیر ولایت لڑکی کا نکاح اس سے کر دے اور یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث کے ساتھ ثابت ہے۔ عبد الرحمن بن ہرمز الاعرج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

” إِنْ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْعَبَّاسِ أَنْكَحَ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ الْحَكَمِ ابْنَتَهُ وَ أَنْكَحَهُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ ابْنَتَهُ وَ سَكَّانَا جَعَلَا صَدَاقًا فَكَتَبَ مُعَاوِيَةَ إِلَى مَرْوَانَ يَأْمُرُهُ بِالتَّفْرِيقِ بَيْنَهُمَا وَ قَالَ فِي كِتَابِهِ: هَذَا السُّنْعَارُ الَّذِي نَهَى عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ“ [ابوداؤد، کتاب النکاح:

باب فی الشغار (۲۰۷۵)، مسند احمد (۹۴/۴)، ابن حبان (۱۲۶۸)]

”عباس بن عبد اللہ بن عباس نے عبد الرحمن بن حکم کو اپنی بیٹی نکاح میں دی اور عبد الرحمن بن حکم نے عباس کو اپنی بیٹی نکاح میں دے دی اور ان دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو خط لکھ کر حکم دیا کہ دونوں نکاحوں میں جدائی کر دی جائے اور اپنے خط میں لکھا: ”یہی وہ شغاری ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔“

امام ابن حزم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” فَهَذَا مُعَاوِيَةُ بِحَضْرَةِ الصَّحَابَةِ لَا يُعْرَفُ لَهُ مِنْهُمْ مُخَالَفٌ يَفْسَخُ هَذَا النِّكَاحَ وَ إِنْ ذَكَرَا فِيهِ الصَّدَاقَ وَ يَقُولُ إِنَّهُ الَّذِي نَهَى عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَارْتَفَعَ

الإشْكَالُ جُمْلَةً“ [المحلی لابن حزم (۱۲۲/۹)]

”یہ معاویہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اس نکاح شغار کو فتح کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ان کی مخالفت کرنے والا نہیں۔ اگرچہ اس میں دونوں نے مہر کا ذکر بھی کیا ہے اور فرماتے ہیں: ”یہ وہ نکاح ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے روکا ہے۔“ اس سے تمام اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔“

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جسے شغار قرار دیا تھا، معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے مطابق ان دونوں نکاحوں میں تفریق کروا دیتے ہیں، اگرچہ انھوں نے مہر کا ذکر کیا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ نکاح شغار میں اصل چیز شرط ہے اور مہر ایک اتفاقی قید ہے۔ یہ قید لگائی جائے یا نہ لگائی جائے، نفس مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوگی اور اس شرط کی بنیاد پر یہ نکاح حرام ہے۔ ایسے مشروط نکاح میں تفریق کروا دینی چاہیے۔

ہاں اگر کسی آدمی نے اپنی زیر ولایت لڑکی کا نکاح کسی دوسرے آدمی سے کر دیا اور کوئی رشتہ کی شرط نہیں لگائی اور پھر بعد میں دوسرے آدمی کا پروگرام بن گیا کہ وہ پہلے کو رشتہ دے دے تو اسے شغار یعنی وٹہ سٹہ نہیں کہا جاتا اور نہ اس کی ممانعت حدیث میں کہیں موجود ہے۔

نکاح پر نکاح

س: اگر کوئی امام مسجد بغیر جانچ پڑتال کے کسی عورت کا نکاح پر نکاح پڑھا دے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور کیا اس کا اپنا نکاح قائم ہے یا ٹوٹ گیا؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

ج: بشرط صحت سوال نکاح پر نکاح پڑھنا حرام ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حرام رشتے بیان کرتے ہوئے خاوند والی عورتوں کا بھی ذکر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ [النساء: ۲۴]

یعنی جب عورت کسی کین نکاح میں ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنا حلال نہیں۔

اسلام میں نکاح پر نکاح تو درکنار منگنی پر منگنی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلَى خِطْبَةِ أُخِيهِ حَتَّى يَنْكِحَ أَوْ يَتْرُكَ))

[بخاری، کتاب النکاح: باب لا يخطب على خطبة اخيه حتى ينكح أو يترك (۵۱۴۴)]

”کوئی آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ کرے یہاں تک کہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے۔“

جب کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کا پیغام دیا ہو تو اس پر پیغام دینا منع ہے تو نکاح پر نکاح کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ لہذا اس دوسرے نکاح میں فوراً جدائی کر دینی چاہیے اور اتنی دیر تک انھیں جدا رکھنا چاہیے جب تک پہلا خاوند طلاق نہ دے دے یا اس سے خلع لے لیا جائے پھر عدت گزرنے پر ان کا نکاح کیا جائے۔ نکاح خوان کے علم میں اگر یہ بات تھی تو

انتہائی غلط حرکت ہے اور اگر معلوم نہ تھا، بے خبری میں نکاح پڑھا دیا، بعد میں علم ہوا تو اپنے کیے پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں، اگر اس امام کے عقیدے میں صریح کفر و شرک نہیں تو اس کے پیچھے نماز درست ہے اور اس کے اس غلط فعل کی بنا پر اس کے اپنے نکاح پر کوئی اثر نہیں۔

شادی سے پہلے کوئی شرط عائد کرنا

(سوال) شادی کے وقت اگر کوئی ایسی پابندی عائد کی جائے جو خلاف شرع نہ ہو، جیسے عورت شرط لگائے کہ مجھے میرا خاندان شادی کے بعد دینی تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روکے گا تو کیا ایسی شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے؟

(جواب) نکاح منعقد کرتے وقت شرع کے مطابق اگر کوئی پابندی ہو تو اس کو پورا کرنا چاہیے کیونکہ مسلمان اپنی شرائط و عہد کو پورا کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

”جن شروط کے ذریعے تم شرم گاہوں کو حلال کرتے ہو ان کو پورا کرنا زیادہ لائق و مناسب ہے۔“ [بخاری، کتاب

النکاح: باب الشروط فی النکاح (۵۱۰۱)]

لہذا اگر عورت کی طرف سے نکاح کے وقت یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ شادی کے بعد دینی تعلیم حاصل کرے گی اور خاندان نے اس شرط کو قبول کیا تو نکاح کے بعد مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کی اس شرط کو پورا کرے اور دینی تعلیم کے حصول میں اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے۔ اگر خاندان غفلت کرے یا مانع ہو تو عورت اس کو اس بات کی طرف توجہ دلائے اور خیر خواہی کے جذبے سے اسے سمجھائے اور اپنا حق اور شرط حاصل کر لے۔

زبردستی کا نکاح درست نہیں

(سوال) اگر لڑکی نے قرآن مجید پڑھا کیا ہو اور کتب ستہ پڑھی ہوں اور لڑکا ان پڑھ اور جاہل ہو، لڑکی رشتہ پر راضی نہ ہو اور والدین زبردستی نکاح کرنا چاہیں تو کیا زبردستی کرنا شرعاً درست ہے؟

(جواب) جس طرح شریعت میں نکاح کے لیے ولی کا ہونا از حد ضروری ہے اسی طرح لڑکی کی رضا مندی حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بیوہ عورت کا نکاح اس کا امر حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح اس کا اذن حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے۔“ آپ ﷺ سے کہا گیا اس کا اذن کیا ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”خاموش رہنا اس کا اذن اور اجازت ہے۔“

[کتاب النکاح: باب استیذان الثیب فی النکاح بالنطق رقم الحدیث (۳۴۷۳)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کنواری بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت حاصل کر کے کیا جائے اور بیوہ و مطلقہ کا نکاح اس کے امر سے کیا جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ اس کے باپ نے اس

کا نکاح کر دیا ہے اور وہ اسے ناپسند کرتی ہے تو نبی ﷺ نے اسے اختیار دے دیا۔“ [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی البکر یزوجھا آبوھا ولا یستأمرھا (۲۰۹۶)، صحیح ابن ماجہ (۱۲۷/۲)]

اس حدیث کی شرح میں علامہ احمد حسن دہلوی فرماتے ہیں:

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی کنواری بیٹی کو نکاح پر مجبور کرے تو باپ کے علاوہ لڑکی کے اولیاء اور دیگر رشتہ داروں کے جبر اور سختی کرنے کی بالادلی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔“ [تفہیم الرواۃ

(۱۰/۳):

لہذا والدین کو چاہیے کہ اپنی دیندار بیٹیوں کے لیے دیندار رشتوں کا انتخاب کریں اور اپنی بالغ اولاد سے نکاح پر اجازت بھی حاصل کریں، زبردستی نکاح کرنے سے گریز کریں، زبردستی کا کیا ہوا نکاح بعد میں اکثر و بیشتر والدین کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا ہے۔

حلالہ کی شرعی حیثیت

(سوال) مہربانی فرما کر حلالہ کی وضاحت فرمادیں اور یہ بھی بتادیں کہ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) شوہر جب اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی ہے جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے ہم بستری نہ کرے۔ وہ خاوند اسے خود بخود طلاق دے تو پھر یہ عورت اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ طَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

”اب اگر تیسری بار اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس پر حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ اگر دوسرا خاوند اس کو طلاق دے دے تو پہلا خاوند اور یہ بیوی آپس میں ملاپ کر سکتے ہیں (یعنی نیا نکاح پڑھا کر) اگر دونوں یہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔“

اس کے برعکس لوگوں نے جو یہ طریقہ ایجاد کر رکھا ہے کہ دوسرے خاوند سے اس غرض سے نکاح کیا جائے کہ وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ ایک رات یا اس سے کم و بیش حصہ گزار کر طلاق دے دے تو یہ حلال ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لُعِنَ الْمُحِلُّ وَالْمُحَلَّلُ لَهُ » [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب فی التحلیل (۲۰۷۶)]

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کی گئی ہے۔“

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِالتَّيْسِ الْمُسْتَعَارِ؟ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ الْمُحَلَّلُ لَعَنَ اللَّهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلُ لَهُ » [ابن ماجہ، کتاب النکاح: باب المحلل والمحلل له (۱۹۳۶)]

”کیا میں تمہیں ادھار کے سانڈ کی خبر نہ دو؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیوں نہیں؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حلالہ کرنے والا ادھار مانگے ہوئے سانڈ کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کرے۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حلالہ کرنا اور کرانا حرام ہے اور دونوں فریق لعنتی ہیں اور جو لوگ اس عمل کو جائز سمجھتے ہیں ان کا موقف صحیح احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

متعہ کا شرعی حکم

(سوال) متعہ کی تعریف اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ شیعہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا ثبوت لاتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

(جواب) لغوی اعتبار سے متعہ کا معنی ہے فائدہ حاصل کرنا جیسا کہ امام ابو بکر جصاص نے لکھا ہے۔ [احکام القرآن (۲/۱۴۶)] اور اصطلاحی اعتبار سے متعہ کا معنی ہے: ”خاص مدت کے لیے کسی قدر معاوضہ پر نکاح کیا جائے۔“ لیکن فقہ جعفریہ کی اصطلاح میں جب کوئی مرد کسی عورت کو وقت مقررہ اور اجرت مقررہ کے عوض مجامعت کی خاطر ٹھیکا پر حاصل کرے تو اس فعل کو متعہ کہتے ہیں، جیسا کہ شیعہ کی کتاب میں لکھا ہے:

”إِنَّمَا هِيَ مُسْتَأْجِرَةٌ“ [فروع کافی (۲/۱۹۱)]

”مسموعہ عورت ٹھیکا کی چیز ہوتی ہے۔“

ابتدائے اسلام میں متعہ حلال تھا جسے بعد میں قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ شروع اسلام میں جتنی مرتبہ بھی متعہ حلال ہوا وہ صرف شدید ضرورت اور غزوات وغیرہ میں حالت سفر میں ہوا ہے۔ کسی موقع پر بھی اس کی حلت حضر میں نہیں ہوتی۔ امام ابو بکر محمد بن موسیٰ حازی رقمطراز ہیں:

”إِنَّمَا كَانَ ذَلِكَ يَكُونُ فِي أَسْفَارِهِمْ وَلَمْ يَبْلُغْنَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبَاحَهُ لَهُمْ

وَهُمْ فِي بُيُوتِهِمْ“ [الاعتبار للحازمی (ص ۳۳۱)]

”متعہ کی حلت سفروں میں ہوئی اور ہمیں کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے حالت حضر میں متعہ کی اجازت دی ہو۔“

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّمَا كَانَتِ الْمُتَعَّةُ لِحَوْفِنَا وَ لِحَرْبِنَا» [السنن الكبرى (۲۰۷/۷)]

”حالت خوف اور غزوات کی وجہ سے متعہ حلال ہوا تھا۔“

ان حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ متعہ صرف اضطراب اور ضرورت شدیدہ کے وقت ہی مباح تھا، عام حالات میں نہیں جیسا کہ شیعہ حضرات سمجھتے ہیں۔ قرآنی نصوص اور صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ متعہ قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے اور اسلام نے نفسانی خواہش کی تکمیل کے دو ہی طریقے روار کھے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوبِهِمْ حَافِظُونَ ۚ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ

مَلُومِينَ ۚ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴾ [المومنون: ۵-۷]

وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کو لٹنڈیاں ہوں، وہ قابل ملامت نہیں۔ البتہ جو ان کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قرآن نے حلت جماع کو دو چیزوں یعنی شادی اور لٹنڈی ہی میں منحصر کیا ہے اور متعہ کی عورت ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں۔ زوجہ اس لیے نہیں کہ لوازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نفقہ، ایلاء و ظہار اور لعان وغیرہ کی مستحق نہیں اور ظاہر ہے کہ لٹنڈی بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی بیع، ہبہ اور اعتاق وغیرہ بھی جائز نہیں۔ علمائے شیعہ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ متعہ کے لیے حاصل کی ہوئی عورت زوجیت میں داخل نہیں۔ چنانچہ ان کی کتاب اعتقادات ابن بابویہ میں تصریح ہے:

”أَسْبَابُ حِلِّ الْمَرْأَةِ عِنْدَنَا أَرْبَعَةُ النِّكَاحِ وَ مِلْكُ الْيَمِينِ وَ الْمُتَعَّةُ وَ التَّحْلِيلُ وَ قَدْ رَوَى أَبُو بَصِيرٍ فِي الصَّحِيحِ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ الصَّادِقِ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْمُتَعَةِ أَهِيَ مِنَ الْأَرْبَعَةِ قَالَ لَا“

”ہمارے ہاں عورت کی حلت کے چار اسباب ہیں، پہلا نکاح، دوسرا ملک یمین یعنی لٹنڈی ہونا، تیسرا متعہ اور چوتھا حلالہ اور ابو بصیر نے صحیح میں امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ کیا متعہ چار سے ہے؟“ تو فرمایا: ”نہیں!“ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”هَذَا يَفْتَضِي تَحْرِيمَ نِكَاحِ الْمُتَعَةِ لِأَنَّ الْمُتَمَتِّعَ بِهَا لَا تَجْرِي مَجْرَى الزَّوْجَاتِ لَا تَرِثُ وَ لَا تُورَثُ وَ لَا يَلْحَقُ بِهِ وَ لَدَهَا وَ لَا يَخْرُجُ مِنْ نِكَاحِهَا بِطَلَاقٍ يَسْتَأْنِفُ لَهَا وَ إِنَّمَا يَخْرُجُ بِإِقْضَاءِ الَّتِي عُقِدَتْ عَلَيْهَا وَ صَارَتْ كَالْمُسْتَأْجِرَةِ“ [تفسیر قرطبی (۷۲/۱۲)]

”یہ آیت متعہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ مجموعہ عورت زوجات یعنی بیویوں کے حکم میں نہیں ہے۔ مجموعہ عورت نہ خود کسی کی وارث ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے اور نہ بیچ کا الحاق متعہ کرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ طلاق ہی کے ساتھ اس سے جدا ہوتی ہے بلکہ طے شدہ مدت کے ختم ہوتے ہی خود بخود اس سے علیحدہ ہو جاتی

ہے۔ لہذا یہ بیوی کے حکم میں نہیں بلکہ یہ اجرت پر حاصل شدہ چیز ہے۔“
ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ حِفْتُمْ أَنْ لَا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ [النساء: ۳]

”جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان میں سے دو دو، تین تین اور چار چار سے نکاح کر لیکن اگر تمہیں ان کے ساتھ
انصاف نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایک بیوی ہی رکھو یا وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں ہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح چار تک محدود ہے اور متعہ میں کوئی عدد مقرر نہیں ہوتا جیسا کہ شیعہ کی معتبر کتاب ”تہذیب
الأحكام، کتاب النکاح“ میں ہے: ”تَزْوُجٌ مِنْهُنَّ أَلْفًا فَإِنَّهُنَّ مُسْتَأْجِرَاتٌ“ ”چاہے ہزار عورتوں سے متعہ کرو کیونکہ وہ تو
ٹھیکے کی چیز ہے۔“

اس آیت سے دوسرا مقصود ایسی صورتوں کا بیان کرنا ہے جس میں حق تلفی کا خوف نہ ہو اور یہ معنی متعہ و حلالہ میں بہ نسبت
منکوحہ و مملوکہ کے زیادہ ہے کیونکہ مملوکہ کے کچھ ایسے حقوق ہیں جن کو ادا نہ کرنا ظلم ہے متعہ کی عورت کے خلاف، اس کے لیے
مقرر اجرت کے سوا کوئی حق نہیں اور حلالہ میں تو یہ بھی نہیں ہے، مفت کا سودا ہے۔ پس اگر متعہ و حلالہ جیسے کام حلال ہوتے تو
اس موقع پر ان کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ ان میں حق تلفی کا کوئی خوف نہیں۔ حرمت متعہ کے متعلق دو قرآنی آیات کے بعد اب چند
ایک صحیح احادیث ملاحظہ ہوں۔

سیدنا سہرہ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَأْتِيهَا النَّاسُ إِلَيَّ قَدْ كُنْتُ أَذْنُتُ لَكُمْ فِي الْأُسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ حَرَّمَ ذَلِكَ
إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيلَهَا وَلَا تَأْخُذُوا بِمَا اتَّيَمُّوهُنَّ شَيْئًا»

[مسلم، کتاب النکاح: باب نکاح المتعہ و بیان انہ ابیح ثم نسخ..... الخ (۱۴۰۶)]

”اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت کے دن تک
کے لیے حرام کر دیا ہے سو جن کے پاس ان میں سے کوئی ہو تو اسے چاہیے کہ اسے چھوڑ دے اور جو چیز تم ان کو دے
چکے ہو وہ واپس نہ لو۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ نِكَاحِ الْمُتَعَةِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَعَنْ لُحُومِ الْحُمْرِ الْأَهْلِيَّةِ»

[مسلم، کتاب النکاح: باب نکاح المتعہ و بیان..... الخ (۱۴۰۷)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز نکاح متعہ اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمادیا۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« حَرَّمَ الْمُتَعَةَ الطَّلَاقُ وَالْعِدَّةُ وَالْمِيرَاثُ » [دارقطنی (۲۰۸/۳)]
 « طلاق، عدت اور میراث نے متعہ کو حرام کر دیا ہے۔ »

امامیہ شیعہ کی معتبر کتاب فروع کافی اور تہذیب الاحکام میں بھی سیدنا علیؑ سے مروی ہے:

« حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ لِحُومِ الْحُمْرِ الْأَهْلِيَّةِ وَنِكَاحِ الْمُتَعَةِ »
 [تہذیب الاحکام (۱۸۶/۲)، استبصار (۱۴۲/۳)، فروع کافی (۱۹۲/۲)]
 « رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز گھریلو گدھوں کا گوشت اور متعہ حرام کر دیا۔ »

سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وہ متعہ کو حلال سمجھتے تھے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ابن عباسؓ کچھ عرصہ تک متعہ کو شدید ضرورت میں جائز سمجھتے رہے پھر بعد میں انھیں اس کے نسخ و حرمت کے بارے میں پتا چلا تو انھوں نے اس سے بھی رجوع کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ متعہ کو حرام ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے، وہ فرماتے ہیں:

« إِنَّمَا كَانَتِ الْمُتَعَةُ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ حَتَّى إِذَا نَزَلَتِ الْآيَةُ: ﴿إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ » [ترمذی، کتاب النکاح: باب ما جاء في تحريم نكاح المتعة (۱۱۲۲)]

”متعہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ تو وہ منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد ابن عباسؓ نے فرمایا: ”زوجہ اور مملوکہ کے علاوہ ہر طرح کی شرمگاہ سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔“

امام ابو بکر جصاصؒ ابن عباسؓ کے رجوع کے متعلق فرماتے ہیں:

« وَلَا نَعْلَمُ أَحَدًا مِنَ الصَّحَابَةِ رَوَى عَنْهُ تَجْرِيدُ الْقَوْلِ فِي إِبَاحَةِ الْمُتَعَةِ غَيْرَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَدْ رَجَعَ عَنْهُ حِينَ اسْتَقَرَّ عِنْدَهُ تَحْرِيمُهَا بِتَوَاتُرِ الْأَخْبَارِ مِنْ جِهَةِ الصَّحَابَةِ » [احکام القرآن (۱۰۲/۲)]

”تمام صحابہؓ میں سوائے ابن عباسؓ کے کوئی بھی حلت متعہ کا قائل نہیں اور انھوں نے بھی متعہ کے جواز سے

اس وقت رجوع کر لیا تھا جب تمام صحابہؓ سے متعہ کی حرمت ان کے ہاں تواتر کے ساتھ ثابت ہو گئی۔“

مندرجہ بالا تمام دلائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ متعہ قیامت تک کے لیے حرام ہے اس کی کوئی صورت بھی جائز و مباح نہیں۔



طلاق کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

طلاق کا مسنون طریقہ

(سوال) براہ کرم طلاق کے مسنون طریقہ سے آگاہ فرما کر عند اللہ ماجور ہوں؟

(جواب) اسلام کے طریقہ طلاق میں مسلمان مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ تین طلاقیں تین مرتبہ اس طریقے سے دے کہ حالت طہر جس میں اس نے جماعت نہیں کی، میں ایک طلاق دے اور بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ اگر خاوند دوران عدت اسے رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے لیکن اگر وہ رجوع نہ کرے اور عدت ختم ہو جائے تو پھر وہ نئے نکاح کے ساتھ اس کو واپس لا سکتا ہے اور اگر شوہر ضرورت نہ سمجھے تو عورت کسی اور مرد کے ساتھ نکاح کرنے کی مجاز ہے اور اگر پہلی طلاق کے بعد شوہر نے اسے دوبارہ اپنی زوجیت میں لے لیا، پھر دوبارہ دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے اور صلح صفائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو وہ دوسری مرتبہ طلاق دے سکتا ہے اور اس دوسری طلاق کے بعد عدت کے اندر شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ عدت گزر جانے کے بعد اگر وہ رکھنا چاہے تو تجدید نکاح ہوگی۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی دے دی تو پھر یہ عورت قطعی طور پر اس خاوند کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اب رجوع کا حق ختم ہے۔ عورت عدت گزار کر کسی اور مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ نکاح صحیح شرعی طریقے کے مطابق مستقل بنسے کی نیت سے ہو گا نہ کہ شوہر اول کے لیے حلال ہونے کی غرض سے۔ اب اگر اس کا یہ خاوند بھی فوت ہو گیا یا اس نے گھریلو ناچاقی کی بنا پر اسے طلاق دے دی تو یہ عورت اگر دوبارہ پہلے شوہر کی طرف لوٹنا چاہے تو عدت کے بعد اس کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے اور ایسا واقعہ ہزاروں میں سے شاید کوئی ایک آدھ ہوا ہو۔ اس طریقہ طلاق کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ فَاِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْعٍ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ۲۲۹]

”طلاق دو مرتبہ ہے، پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے مطابق اپنی بیوی کو رہنے دے یا اچھی طرح سے رخصت کر دے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات کے مطابق ابتدائے ہجرت میں جاہلی دستور کے مطابق مرد عورتوں کو کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے۔ مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔ اس صورتحال کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ رجعی طلاق جس میں رجوع کی گنجائش ہو، زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہے، اس کے بعد یا تو عدت کے اندر رجوع کرنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ تیسری طلاق دینا ہے۔

طلاق رجعی کے بعد

(سوال) طلاق رجعی کے بعد اگر میاں بیوی اکٹھے رہنا چاہیں تو کیا نئے نکاح کے بعد ایسا کیا جا سکتا ہے؟ براہ کرم قرآن و حدیث کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔

(جواب) ایسی صورت میں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوبارہ نکاح کر لیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ [البقرة: ۲۳۲]

” اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو، پھر ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں (پہلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو اگر دستور کے موافق آپس میں رضا مند ہو جائیں۔“

اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ طلاق رجعی جو دو مرتبہ ہے، اس مدت میں اگر عورت کی عدت مکمل ہو چکی ہو اور وہ دونوں رضا مندی کے ساتھ بسنا چاہیں تو انہیں دوبارہ نکاح کرنا پڑے گا اور عورت کے اولیاء کو بھی چاہیے کہ اسے مت روکیں۔ سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

” أَنَّ مَعْقِلَ بْنَ يَسَارٍ زَوْجَ أُخْتِهِ رَجُلًا فَطَلَّقَهَا تَطْلِيقَةً فَبَانَتْ مِنْهُ ثُمَّ جَاءَ يَخْطُبُهَا فَأَبَى عَلَيْهِ وَقَالَ أَفَرَشْتِكَ كَرِيمَتِي ثُمَّ طَلَّقْتَهَا ثُمَّ جِئْتَ تَخْطُبُهَا لَا وَاللَّهِ لَا أَزْوِجُكَهَا قَالَ وَكَانَتْ الْمَرْأَةُ قَدْ هَوَيْتَ أَنْ تَرُاجِعَهُ فَاَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ ﴾ [البقرة: ۲۳۲] فَقَالَ نَعَمْ أَزْوِجُكَهَا “ [بیہقی (۱۳۸/۷)، المعجم الكبير للطبرانی (۴۶۷/۲۰)]

” معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی کے ساتھ کیا۔ اس نے اسے ایک طلاق دے دی۔ (عدت گزر گئی) تو معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن اس سے علیحدہ ہو گئی، پھر وہ پیغام نکاح لے کر آیا تو معقل رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا: ”میں نے اپنی معزز بہن کا نکاح تجھ سے کیا تھا تو نے اسے طلاق دے دی، اب تو پھر پیغام نکاح لے کر آ گیا ہے، اللہ کی قسم! اب میں تیرے نکاح میں نہیں دوں گا۔“ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن بھی لوٹنا چاہتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی یہ آیت نازل فرمادی: ”جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو اپنے (پہلے) خاوندوں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو۔“ اس کے بعد معقل رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ہاں! تجھ سے نکاح کر دیتا ہوں۔“

مذکورہ بالا صحیح حدیث میں مذکور واقعہ سے معلوم ہوا کہ جب عورت کو اس کا شوہر ایک طلاق دیتا ہے اور خاوند عدت کے اندر رجوع نہیں کرتا تو عدت ختم ہونے کے بعد اگر وہ مرد اور عورت باہم رضا مندی کے ساتھ اکٹھے رہنا چاہتے ہوں تو تجدید نکاح

سے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری مرتبہ کبھی زندگی میں تعلقات میں کشیدگی ہوگئی اور مرد نے اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی تو بھی عدت کے اندر رجوع کا حق ہے اور عدت ختم ہونے کے بعد دونوں نئے نکاح سے جمع ہو سکتے ہیں۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا شرعی حکم

(سوال) کیا یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیتا ہے تو اس سے تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی؟ یا صرف ایک؟ قرآن و سنت کی رو سے وضاحت فرمادیں۔

(جواب) دور جاہلیت میں لوگ اپنی بیویوں کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور عدت کے اندر رجوع کرتے رہتے تھے، نہ عورت کو صحیح بساتے اور نہ آزاد ہی کرتے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ بیوی کو تنگ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اس دستور کو ختم کرنے کے لیے دوبار رجوع کا حق دے دیا اور تیسری بار بالکل ان کا رشتہ ختم کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ فَاِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْحٍ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ۲۲۹]

”طلاق (جس کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے) دو بار ہے، پھر دو طلاقوں کے بعد یا تو دستور کے مطابق اپنی بیوی کو رہنے دے یا پھر اچھی طرح سے رخصت کر دے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ﴾ فرمایا ہے اور لفظ مرتان مرۃ کا مشبیہ ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ طلاق دو مرتبہ ہے، وقفہ بعد وقفہ ہے نہ کہ اکٹھی دو طلاقیں اور اس کی کئی ایک مثالیں بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيْسَ تَأْذِنُكُمْ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهْرِ وَ مِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثَ عَوْرَاتٍ لَكُمْ﴾ [النور: ۵۸]

”اے ایمان والو! تم سے تین مرتبہ تمہارے غلام اور نابالغ بچے بھی اجازت طلب کریں، نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد اور یہ تین اوقات تمہارے لیے پردے کے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿ثَلَاثَ مَرَّاتٍ﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ”مرۃ“ کی جمع ہے اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ یہ تین اوقات وقفہ بعد وقفہ ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ مرۃ میں دفعہ کا مفہوم شامل ہے، لہذا ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ دو مرتبہ وقفہ بعد وقفہ طلاق ہے جس میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے۔ اگر بیک وقت ان طلاقوں کو نافذ کر دیا جائے تو مرد کو اللہ تعالیٰ نے جو سوچ بچار کا وقفہ فراہم کیا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ میں بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دینے کو شرع سے مذاق قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

”ایک آدمی نے عہد رسالت میں اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو اللہ کے نبی ﷺ اس پر ناراض ہوئے اور فرمایا:

« اَيْلَعُبُ بِكِتَابِ اللَّهِ وَ اَنَا بَيْنَ اَظْهَرِكُمْ » ” کیا میری موجودگی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔“ [نسائی، کتاب الطلاق : باب الثلاث المجموعه و ما فيه من التغليظ (۳۴۳۰)]

اس روایت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں دے دینا شریعت کے ساتھ مذاق ہے اور حرام و ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ کے بعد فرمایا:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

” پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے (یعنی تیسری طلاق) تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے پھر اگر وہ (یعنی دوسرا شوہر) اسے طلاق دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر انھیں یقین ہے کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔“

مراد یہ ہے کہ اس طرح وقفہ بعد وقفہ تیسری طلاق واقع ہوجائے تو عورت مرد کے لیے قطعی طور پر حرام ہو جائے گی، تا وقتیکہ عورت کا گھر آباد کرنے کی غرض سے کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو اور وہ حسب دستور زندگی گزاریں اور کبھی ناچاتی ہو اور دوسرا شوہر طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو پھر پہلے شوہر کی طرف بیوی لوٹ سکتی ہے۔ بیک وقت اکٹھی تین طلاقیں دے دینے سے صرف ایک رجعی طلاق ہی واقع ہوتی ہے، شریعت اسلامیہ کا یہی فتویٰ ہے اور عہد رسالت میں بھی یہی طریقہ کار تھا جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَبِي بَكْرٍ وَ سَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَ اِحْدَاةٍ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعَجَلُوا فِيهِ أَمْرٌ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ آنَاةٌ فَلَوْ أَمْضِيَتْ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ » [احمد (۳۱۴/۱)]

”رسول اکرم ﷺ، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”جس کام میں لوگوں کے لیے سوچ بچار کی مہلت دی گئی تھی اس میں انھوں نے جلدی کی، اگر ہم ان پر تینوں طلاقیں لازم کر دیں..... تو پھر انھوں نے اس فیصلے کو ان پر لازم کر دیا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت اور عہد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں اکٹھی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں اور عہد رسالت کا فیصلہ شرعی فیصلہ تھا کیونکہ دین رسول اکرم ﷺ پر مکمل ہوا۔ آپ کے بعد کسی شخص پر وحی نازل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہما نے جو فیصلہ کیا وہ تہدیداً اور سزا کے طور پر تھا نہ کہ شرعاً اس طرح درست تھا اور اگر یہ فیصلہ شرعی تھا تو عہد رسالت، عہد ابی بکر اور خود ان کے ابتدائی دو سالوں میں جو فیصلہ تھا پھر اس کی کیا حیثیت ہے؟ لہذا یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی اکٹھی تین طلاقیں تین نہیں بلکہ ایک رجعی طلاق ہی شمار ہوگی۔

حالت حیض میں دی گئی طلاق

(سوال) حالت حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی یا اسے شمار نہیں کیا جائے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مسئلہ بتادیں۔
(جواب) برحق مسلک یہی ہے کہ حالت حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ جمہور ائمہ محدثین رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں:

① سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور وہ حالت حیض میں تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَرَّةٌ فَلْيَرَّاجِعْهَا.....» «اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے اس حالت میں رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے، پھر حائضہ ہو پھر پاک ہو جائے، پھر اگر چاہے تو اس کے بعد روک لے اور اگر چاہے تو چھوٹے سے پہلے طلاق دے دے۔ یہ وہ عدت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔»

[بخاری، کتاب الطلاق: باب و قول الله تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ.....﴾ (۵۲۵۱)، ابوداؤد (۲۱۷۹)، ابن ماجہ (۲۰۱۹)، ابن الجارود (۷۳۴) مسند شافعی (۱۶۳۰)، بیہقی (۳۲۳/۷)، مسند طیالسی (۱۸۵۳)، مسند احمد (۵۴۶/۲)]

جمہور محدثین و فقہاء کے ہاں اس حدیث میں محل استدلال «فَلْيَرَّاجِعْهَا» کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے رجوع کا حکم دیا۔ اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع نہ ہوتا۔ بعض لوگوں نے یہاں رجوع کا لغوی معنی مراد لیا ہے کہ اسے پہلی حالت میں لوٹائے نہ کہ اس کی طلاق شمار کی جائے۔ یہ بات دو لحاظ سے غلط ہے:

① لفظ کو شرعی حقیقت پر محمول کرنا اسے لغوی حقیقت پر محمول کرنے پر مقدم ہے جیسا کہ اصول فقہ کی کتب میں یہ اصول موجود ہے۔

② عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جنہوں نے طلاق دی تھی، انہوں نے خود اس کی تصریح کی ہے کہ یہ طلاق شمار کی گئی ہے، لہذا اسے بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

③ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

«أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ وَ هِيَ حَائِضٌ فَاتَىٰ عُمَرُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَجَعَلَهَا وَاحِدَةً» [مسند طیالسی (۶۸)، دارقطنی (۳۸۶۷)، بیہقی (۳۲۶/۷)]

”ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی اور وہ حائضہ تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے یہ سارا معاملہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے اسے ایک طلاق قرار دیا۔“
 حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”هَذَا نَصٌّ فِي مَوْضِعِ الْخِلَافِ فَيَجِبُ الْمَصِيرُ إِلَيْهِ“ [فتح الباری (۳۵۳/۹)]

”یہ حدیث حائضہ عورت کی طلاق کے وقوع میں اختلاف پر نص ہے، لہذا اس کی طرف لوٹنا واجب ہے۔“
اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب عورت کو حالت حیض میں طلاق دی جائے تو وہ ایک طلاق شمار ہوتی ہے اور یہ صحیح حدیث اس طلاق کے وقوع پر نص کی حیثیت رکھتی ہے۔

⑤ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ عورت کو طلاق کس طرح دی جاتی ہے؟ انھوں نے کہا مجھے سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

« طَلَّقْتُ امْرَأَتِي فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ حَائِضٌ فَذَكَرَ ذَلِكَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَعَيَّظَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي ذَلِكَ فَقَالَ لِيُرَاجِعَهَا ثُمَّ يُمِسُهَا حَتَّى تَحِيضَ حَيْضَةً وَتَطْهُرَ فَإِنْ بَدَأَ لَهُ أَنْ يُطَلِّقَهَا طَاهِرًا قَبْلَ أَنْ يَمَسَّهَا فَذَلِكَ الطَّلَاقُ لِلْعِدَّةِ كَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ عُمَرَ فَرَأَجَعْتُهَا وَحَسِبْتُ لَهَا التَّطْلِيْقَةَ الَّتِي طَلَّقْتُهَا » [نسائی، کتاب الطلاق: باب وقت الطلاق للعدة التي أمر الله عز وجل أن يطلق لها النساء (۳۴۲۰)]

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ حالت حیض میں تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ اس سے رجوع کرے، پھر اس کو روکے رکھے حتیٰ کہ اسے ایک ماہواری آجائے اور وہ پاک صاف ہو جائے پھر اگر اس کے لیے ظاہر ہو کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے تو طہارت کی حالت میں جماع سے پہلے طلاق دے، یہ وہ طلاق ہے جو عدت کے لیے ہے جیسے اللہ عزوجل نے وحی نازل کی ہے۔“ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ”میں نے اس سے رجوع کر لیا اور جو طلاق میں نے اسے دی تھی وہ شمار کی۔“

اس حدیث کے دیگر طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ طَلَّقَهَا تَطْلِيْقَةً فَحُسِبَتْ مِنْ طَلَّاقِهَا وَرَأَجَعَهَا عَبْدُ اللَّهِ كَمَا أَمَرَهُ »

[مسند احمد (۲۸۹/۱۰)، بیہقی (۳۲۴/۷)، دارقطنی (۳۸۵۱)، المسند المستخرج لأبي نعیم (۱۴۹/۴)]

”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی، اس کی وہ طلاق شمار کی گئی پھر عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے رجوع کر لیا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا تھا۔“

اس حدیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ طلاق جو انھوں نے حالت حیض میں دی تھی، شمار کی گئی تھی۔

⑥ یونس بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: ”ایک آدمی نے اپنی بیوی کو اس وقت طلاق دی جب وہ حائضہ تھی تو (اس کا کیا حکم ہے؟)“ اس پر انھوں نے کہا: ”تم ابن عمر رضی اللہ عنہما کو پہچانتے ہو؟ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو اس وقت

طلاق دی جب وہ حالت حیض میں تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو اس وقت ابن عمر رضی اللہ عنہما طلاق دینا چاہے تو اسے طلاق دے دے۔“ میں نے کہا: ”کیا اسے اللہ کے رسول ﷺ نے طلاق شمار کیا؟“ تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ”آپ مجھے بتائیں اگر کوئی عاجز ہو اور حماقت کا ثبوت دے تو اس کی عاجزی اور حماقت کی وجہ سے وہ فرض ساقط ہوگا؟ (ہرگز نہیں۔ مطلب کہ یہ طلاق شمار ہوگی)۔“ [بخاری، کتاب الطلاق: باب مراجعة الحائض (۵۳۳۳)، مسلم (۱۴۷۱)، مسند احمد (۶۷/۹)، سنن سعید بن منصور (۱۰۴۹)، ابو داؤد (۲۱۸۴)، ترمذی (۱۱۷۵)، نسائی (۳۴۲۹)، ابن ماجہ (۲۰۲۲)، طحاوی (۵۲/۳)، دارقطنی (۳۸۶۱)، بیہقی (۳۲۵/۷)]

یونس بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا:

«أَفْتَحْتَسِبُ بِهَا؟ فَقَالَ مَا يَمْنَعُهُ» [بیہقی (۳۲۶/۷)]

”کیا آپ نے اسے طلاق شمار کیا؟“ تو انھوں نے کہا: ”اس سے کون سی چیز مانع ہے؟“

⑤ انس بن سیرین رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا انھوں نے کہا: ”ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دی، وہ حالت حیض میں تھی، عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ اس سے رجوع کرے۔“ میں نے کہا: ”کیا یہ طلاق سمجھی جائے گی؟“ تو انھوں نے کہا: ”چپ رہ، اور کیا سمجھی جائے گی؟“ [بخاری، کتاب الطلاق: باب إذا طلقت الحائض تعد بذلك الطلاق (۵۲۵۲)، مسلم (۱۴۷۱)، ابن الجارود (۷۳۵)، طحاوی (۵۲/۳)، دارقطنی (۳۸۴۸)، بیہقی (۳۲۶/۷)، مسند احمد (۳۱۷/۹)]

درج بالا تمام دلائل اس بات کا ثبوت ہیں کہ حالت حیض میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ یہی جمہور ائمہ محدثین کا مذہب ہے اور یہی کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہے۔

دوران حمل دی گئی طلاق

سوال مہربانی فرما کر مجھے اس مسئلہ کے بارے میں بتادیں کہ دوران حمل اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب دوران حمل دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں ہے:

”انھوں نے اپنی عورت کو طلاق دے دی اور وہ حالت حیض میں تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَرَّةٌ فَلْيُرَاجِعْهَا ثُمَّ لِيُطَلِّقْهَا طَاهِرًا أَوْ حَامِلًا» [مسلم، کتاب النکاح: باب تحريم طلاق الحائض

بغير رضاها..... الخ (۱۴۷۱)]

”عبداللہ کو حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے (حیض کے بعد) طہر میں طلاق دے یا دوران حمل طلاق دے۔“
قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس روایت کو بخاری کے علاوہ ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔“ [نیل الأوطار (۶/۲۲۱)]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ”طلاق کی چار صورتیں ہیں، دو حلال ہیں اور دو حرام۔ جو حلال ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے اس طہر میں طلاق دے جس میں جماع نہ کیا ہو، دوسری یہ کہ اس وقت طلاق دے جب حمل ظاہر ہو جائے اور جو حرام ہیں ان میں سے ایک یہ کہ حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق دے، دوسری یہ کہ جماع کے بعد طلاق دے اور حمل کا کچھ علم نہ ہو۔“ [دارقطنی (۳۸۴۵)، بیہقی (۷/۳۲۵)]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موقوف روایت سے معلوم ہوا کہ حاملہ عورت کو بھی طلاق دی جاسکتی ہے اور یہ طلاق بدی نہیں بلکہ سنی ہے اور اس طلاق کی عدت وضع حمل ہے جیسا کہ سورہ طلاق میں اس کی وضاحت موجود ہے:

﴿ وَ أُولَاتِ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ۴]

”اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے۔“

اس آیت کریمہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حاملہ کی عدت بچہ جنم دینے تک ہے، عورت خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ۔
امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

”حاملہ عورت مطلقہ ہو یا بیوہ، دونوں کی عدت بچے کی پیدائش ہے خواہ یہ عمل طلاق یا خاوند کی موت کے بعد فوراً وقوع پذیر ہو جائے۔ جمہور علمائے سلف و خلف کا یہی قول ہے۔“ [تفسیر ابن کثیر (۴/۳۸۱)]

قرآن مجید کی نص اور صریح سنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کے بچہ پیدا ہوتے ہی نکاح ختم ہو چکا ہے اور اب رجوع نہیں، اگر آدمی کی طلاق پہلی یا دوسری ہے تو از سر نو نکاح ہو سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ [البقرة: ۲۳۲]

”جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔“

اس آیت کریمہ میں دو رجعی طلاقوں کی عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح کا حکم ذکر کیا گیا ہے یعنی اگر شوہر نے پہلی یا دوسری طلاق دی ہو اور عدت گزر چکی ہو تو دوبارہ اگر باہمی رضامندی سے اکٹھے ہونا چاہیں تو نکاح کر کے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

زبردستی دلوائی جانے والی طلاق

(سوال) اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اس پر عمل کر گزرتا ہے تو کیا یہ طلاق

شمار ہوگی؟

(جواب) زبردستی طلاق شرعاً کالعدم ہے، اس کا وقوع نہیں ہوتا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ تَحَاوَزَ لِأُمَّتِي عَمَّا تَوَسَّوَسُ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ بِهِ وَ مَا اسْتَكْرَهُوا

عَلَيْهِ» [ابن ماجہ، کتاب الطلاق: باب طلاق المکره والناسی (۲۰۴۴)]

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت کے سینوں کے خیالات و وساوس کو معاف کر دیا ہے، جب تک وہ ان خیالات کو عملی

جامہ نہیں پہنا لیتے یا بات نہیں کر لیتے اور اس بات کو بھی معاف کر دیا ہے جس پر انہیں مجبور کر دیا گیا ہو۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جبراً طلاق دلوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا طَلَّاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ» [ابن ماجہ، کتاب الطلاق: باب طلاق المکره والناسی (۲۰۴۶)]

”طلاق اور آزادی زبردستی نہیں ہوتی۔“

امام ابو عبید اور امام قسیمی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں: ”اغلاق کا معنی اکراہ ہے۔“ اسی طرح ابن درید اور ابو طاہر نعمتین کے نزدیک

بھی اس کا معنی اکراہ ہے۔ [المغنی لابن قدامہ (۳۵۱/۱۰)، شرح السنۃ (۲۲۲/۹)]

صحیح بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«طَلَّاقِ السُّكْرَانِ وَالْمُسْتَكْرَهُ لَيْسَ بِجَائِزٍ» [بخاری، کتاب النکاح: باب الطلاق فی الاغلاق

والکره والسکران الخ]

”نفسے والے آدمی اور مجبور کی طلاق جائز نہیں۔“

امام ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«أَنَّ طَلَّاقَ الْمُكْرَهِ لَا يَقَعُ وَ رُوِيَ ذَلِكَ عَنْ عُمَرَ وَعَلِيٍّ وَ ابْنِ عُمَرَ وَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَ ابْنِ الزُّبَيْرِ

وَ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ وَ بِهِ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَيْرٍ وَ عِكْرِمَةُ وَ الْحَسَنُ وَ جَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَ شُرَيْحٌ وَ

عَطَاءٌ وَ طَاوُسٌ وَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَ ابْنُ عَوْنٍ وَ أَيُّوبُ السُّخْتِيَانِيُّ وَ مَالِكٌ وَ

الْأَوْزَاعِيُّ وَ الشَّافِعِيُّ وَ إِسْحَاقُ وَ أَبُو ثَوْرٍ وَ أَبُو عُبَيْدٍ» [المغنی لابن قدامہ (۳۵۰/۱۰)]

”جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہ مذہب سیدنا عمر، سیدنا علی، سیدنا عبد اللہ بن عمر، سیدنا عبد اللہ بن عباس، سیدنا عبد اللہ

بن زبیر اور سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی بات امام عبد اللہ بن عمیر، امام عکرمہ، امام حسن بصری، امام

جابر بن زید، امام شریح، امام عطاء، امام طاووس، امام عمر بن عبد العزیز، امام ابن عون، امام ابو ثور اور امام ابو عبید رضی اللہ عنہم

نے کہی ہے۔“

کتاب و سنت کی نصوص اور مذکورہ امہ کرام کی تصریحات کے مطابق جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔

بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا

(سوال) ایک شخص کا نکاح ہوا مگر اس نے بیوی سے ہم بستری نہیں کی، کیا وہ اسے طلاق دے سکتا ہے؟ نیز بیوی کی عدت کیا ہوگی؟

(جواب) بیوی سے ہم بستر ہوئے بغیر طلاق دینا شرعاً جائز و مباح ہے اور ایسی عورت پر کوئی عدت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا فَمَعَّوَهُنَّ وَسَرَخُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴾ [الأحزاب: ۴۹]

”اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں چھوٹنے سے پہلے طلاق دے ڈالو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت نہیں جس کے پورا ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کرو۔“

اس آیت کریمہ میں عدت کے ساتھ ساقط ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مرد کا حق رجوع ختم ہو جاتا ہے اور عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر والے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

” هَذَا أَمْرٌ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا طَلَّقَتْ قَبْلَ الدُّخُولِ بِهَا لَا عِدَّةَ عَلَيْهَا فَتَذْهَبُ فَتَرْجُو فِي فَوْرِهَا مَا شَاءَتْ “ [تفسیر ابن کثیر (۳/۵۴۸)]

”اس مسئلہ پر علماء کے درمیان اجماع ہے کہ جب عورت کو دخول سے قبل طلاق دے دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں، طلاق کے فوراً بعد وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔“

گزشتہ آیت میں موجود الفاظ ﴿ أَنْ تَمْسُوهُنَّ ﴾ کے مفہوم میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد جماع ہے یا صرف خلوت ہے یعنی عورت کو خلوت کے بعد جماع سے پہلے چھوڑ دے تو کیا عورت پر عدت ہے؟ امام احمد ابن حنبل، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم قول یہ ہے کہ عورت کے ساتھ خلوت اختیار کی مگر جماع نہیں کیا اور طلاق دے دی تو عورت پر عدت واجب ہے۔ [الہدایۃ مع الشرح فتح القدیر (۴/۱۳۵)، حاشیہ ابن عابدین (۳/۵۰۴)، المہذب مع المجموع (۱۶/۴۱۴)، المغنی (۸/۹۹)، الإنصاف للمرداوی (۹/۲۷۰)]

اور یہی بات خلفائے راشدین اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور عروہ، علی بن حسن، عطاء، زہری، ثوری، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ المغنی لابن قدامہ میں موجود ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے زرارہ بن اونی سے نقل کیا ہے:

”خلفائے راشدین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جس آدمی نے پردہ لٹکا لیا یا دروازہ بند کر لیا تو مہر واجب ہو گیا اور عدت ضروری ہو گئی۔“ [السنن الکبریٰ للبیہقی (۷/۲۵۵)]

یہ فیصلے مشہور ہوئے اور کسی صحابی نے اس پر کبیر نہیں کی تو ان فقہاء و محدثین کے ہاں اجماع کی شکل اختیار کر گئے۔

شیخ عبدالرحمن سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”دخول دمس سے مراد وہی ہے جیسا کہ اس پر اتفاق کیا گیا ہے یا کہ اس طرح خلوت ہے اگرچہ اس خلوت میں وہی نہیں ہوئی جیسا کہ اس پر خلفائے راشدین نے فتویٰ صادر کیا ہے اور یہ صحیح ہے جو عورت پر داخل ہوا اس کے ساتھ وہی کی یا نہیں کی جب اسے خلوت حاصل ہوگئی تو عورت پر عدت واجب ہوگئی۔“ [تفسیر الکریم الرحمان فی تفسیر کلام المنان (۲/۴۷۸)]

دوسرا قول یہ ہے کہ عورت کے ساتھ جب تک دخول نہ ہو عدت واجب نہیں، صرف خلوت کے ساتھ عدت واجب نہیں ہوتی۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جدید قول ہے۔ [المہذب (۱۶/۴۱۴)]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ کے حکم میں واضح ہے کہ مطلقہ پر چھونے سے پہلے عدت نہیں ہے اور مس سے مراد صحیح طریقے سے آنا ہے۔ اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں جانتا۔ پھر بعض مفتیوں نے ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ شوہر خلوت اختیار کر کے دروازہ بند کرے اور پردے گرا دے اور وہ احرام والی یا روزہ دار نہ ہو۔“ [معرفۃ السنن والآثار (۶/۴۰)]

مذکورہ بالا دلائل پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ زیادہ محتاط جمہور کا موقف ہے، اس لیے کہ اس میں عقد زوجیت کا احترام بھی ہے اور خلوت استمتاع کی نوع سے خالی بھی نہیں ہے۔ لہذا بیوی سے ہم بستری کے بغیر اگر طلاق دے ڈالے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

غصہ میں طلاق

(سوال) ایک آدمی نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی، جب شوہر سے کہا گیا کہ تم نے اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے غصہ کی وجہ سے کچھ یاد نہیں ہے اور بیوی بھی کہتی ہے کہ میں اس وقت بے ہوش تھی مجھے نہیں پتا اس نے کیا کہا۔ شوہر حلفیہ بیان دینے کو تیار ہے کہ اس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں تھے اور غصہ میں پتا نہیں کیا کہا ہے، کیا ایسے وقت میں طلاق ہو جاتی ہے؟

(جواب) اگر شوہر کا یہ بیان درست ہے اور وہ حلف دیتا ہے کہ اس نے غصہ میں پتا نہیں کیا کہا ہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی، اسے اصطلاح فقہاء میں ”طلاق الغضبان“ کہتے ہیں، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

« لَا طَّلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ » [مسند احمد: (۶/۲۷۶)۔ ابوداؤد (۳/۲۱۹۳)، ابن ماجہ:

(۲۰۴۶)، ابن ابی شیبہ، (۱۵/۴۹۱)]

”اغلاق کی حالت میں نہ طلاق ہے اور نہ غلام و لونڈی کا آزاد کرنا۔“

امام ابوداؤد اغلاق کے متعلق فرماتے ہیں: ”میں سمجھتا ہوں اس سے مراد غصہ ہے۔“ اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”اغلاق کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا دل اس طرح معلق ہو جائے کہ وہ کلام کا علم و ارادہ نہ کر سکے، اس میں مکروہ، مجنون اور جس کی عقل نشہ یا غصے کی وجہ سے زائل ہو چکی ہو سب کی طلاق داخل ہے، جو مقصد و ارادہ کھو بیٹھیں اور ہوش نہ ہو اور یہ نہ سمجھ سکیں کہ ان کی زبان سے کیا نکلا ہے۔“ اور امام ابن القیم نے فرمایا: ”غصہ کی تین قسمیں ہیں ایک وہ غصہ جو عقل کو زائل کر دے اور غصے والے کو یہ شعور نہ ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے، ایسے شخص کی طلاق بلا اختلاف واقع نہیں ہوگی۔“ (زاد المعاد: ۵/۲۱۴)

لہذا اگر بات واقعی اسی طرح ہے جیسے شوہر حلفاً کہتا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

غیر مدخولہ کی عدت

(سوال) اگر کسی عورت کو رخصتی سے قبل طلاق دے دی جائے تو کیا اس پر عدت ہے؟

(جواب) ایسی عورت جسے خاوند نے جماع سے پہلے طلاق دے دی ہو اس پر کوئی عدت نہیں، وہ عدت گزارے بغیر عقد ثانی کر سکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے ایمان والو! جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں چھونے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرو۔“ (الاحزاب: ۴۹)

لہذا جب غیر مدخولہ عورت کو طلاق دی جائے تو عدت گزارے بغیر وہ نکاح ثانی کر سکتی ہے اور اگر پہلے خاوند کے پاس آنے کا ارادہ ہو تو دوبارہ نکاح کر کے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔

بیوہ کی عدت اور احکام

(سوال) مہربانی فرما کر ہمیں بیوہ کی عدت کے احکام سے اور اس بات سے آگاہ فرمادیں کہ دوران عدت اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے؟

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَتُوفُونَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُونَ اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَ عَشْرًا ﴾ [البقرة: ۲۳۴]

”اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن عدت میں رکھیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عدت وقات چار ماہ دس دن بیان فرمائی ہے۔ یہ آیت کریمہ ہر طرح کی عورت خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ اور جوان ہو یا بوڑھی، اس کی عدت وقات کو شامل ہے۔ صرف حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سورہ طلاق میں اس کی عدت وضع حمل بتائی گئی ہے۔ تو جب عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو وہ اس گھر میں عدت گزارے گی جہاں

اس کا خاوند فوت ہو یا جہاں اس کے خاوند کی وفات کی خبر اس کے پاس پہنچی۔
 فریجہ بنت مالک بن سنان جو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ اس کا خاوند اپنے بھگورے غلاموں کی طلب میں نکلا تو اس نے انہیں پالیا۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس کی وفات کی خبر آچکی ہے۔ پھر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ”کیا میں اپنے گھر بنو خدرہ میں واپس چلی جاؤں؟ جہاں میرے والدین رہتے ہیں کیونکہ میرے خاوند نے میرے لیے کوئی ذاتی گھر نہیں چھوڑا۔“ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اسے رخصت دے دی پھر بلا کر فرمایا:

«أَمْكُنِّي فِي بَيْتِكَ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ» [ابوداؤد، کتاب الطلاق: باب فی المتوفی عنها تنتقل (۲۳۰۰)، موطا (۴۶۲)، مسند احمد (۳۷۰/۶)، ترمذی (۱۲۰۴)، ابن ماجہ (۲۰۳۱)، دارمی (۱۶۸/۲)، ارواہ الغلیل (۱۲۳۱)]

”تو اپنے اسی گھر میں ٹھہری رہ یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔“

تو انہوں نے وہاں چار ماہ دس دن عدت گزار لی۔ فرماتی ہیں: ”جب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو انہوں نے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے مجھے پیغام بھیجا۔ میں نے انہیں اس بات کی اطلاع دی تو انہوں نے بھی یہی فیصلہ صادر فرمایا۔“
 اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو اسی گھر میں عدت گزارنی چاہیے جس گھر میں اس کا خاوند فوت ہو جائے یا جس گھر میں اسے خاوند کے فوت ہونے کی اطلاع آئے اور دوران عدت عورت کو زیب و زینت کرنا منع ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«إِنَّ أُمَّرَأَةً تُوَفِّي زَوْجَهَا فَخَشَوْا عَلَى عَيْنَيْهَا فَأَتَوْا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنُوهُ فِي الْكُحْلِ فَقَالَ لَا تَكْجُلُ فَقَالَتْ كَأَنْتِ إِحْدَاكُنَّ تَمْكُثُ فِي شَرِّ أَحْلَاسِهَا أَوْ شَرِّ بَيْتِهَا فَإِذَا كَانَ حَوْلَ فَمَرَّ كَلْبٌ رَمَتْ بِبَعْرَةٍ فَلَا حَتَّى تَمْضِيَ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا» [بخاری، کتاب الطلاق: باب الكحل للحادة (۵۳۳۸)، مسلم (۱۴۸۸)]

”ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو انہیں اس کی آنکھیں خراب ہونے کا ڈر لاحق ہوا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرمہ کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ سرمہ نہ لگائے، (کیا وہ دور اچھا تھا جب جاہلیت کے زمانے میں) عورت ایک سال کے لیے خراب کپڑے یا برے سے جھوپڑے میں پڑی رہتی تھی۔ جب سال پورا ہوتا تو وہ اونٹ کی بیٹنی کی سی ہوتی جب کتا سانے سے گزرتا (اگر کتا نہ گزرتا تو وہ اسی طرح پڑی رہتی) دیکھو وہ چار ماہ تک سرمہ نہ لگائے۔“

حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«دَخَلْتُ عَلَى أُمِّ حَبِيبَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ تُوَفِّي أَبُوهَا أَبُو سُفْيَانَ بْنِ

حَرْبٍ فَدَعَتْ أُمَّ حَبِيبَةَ بِطَيْبٍ فِيهِ صُفْرَةٌ خَلُوقٍ أَوْ غَيْرُهُ فَدَهَنْتُ مِنْهُ جَارِيَةً ثُمَّ مَسَّتْ بِعَارِضِيهَا ثُمَّ قَالَتْ وَاللَّهِ مَا لِي بِالطَّيِّبِ مِنْ حَاجَةٍ غَيْرَ أَنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَا يَحِلُّ لِأَمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُحَدَّ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا عَلَى زَوْجِ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا» [بخاری، کتاب الطلاق: باب تحد المتوفى عنها أربعة أشهر وعشرا (۵۳۳۴)، مسلم (۱۴۸۶)، ابوداؤد (۲۲۹۹)، ترمذی (۵۰۰/۳)، نسائی (۲۰۱/۶)، مسند احمد (۲۳۵/۶)]

”میں ام حبیبہ نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ کے پاس اس وقت آئی جب ان کے باپ ابوسفیان فوت ہوئے تو ام حبیبہ نے زرد رنگ کی خوشبو وغیرہ منگوائی اور اس میں سے تھوڑی سی ایک چھوٹی بچی کو لگائی، پھر اپنے رخساروں پر لگائی، پھر فرمایا: ”اللہ کی قسم! مجھے خوشبو کی ضرورت نہیں (کیونکہ وہ بیمار تھیں) مگر میں نے اس لیے لگائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے، آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والی عورت کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، سوائے بیوی کے کہ وہ اپنے شوہر پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔“ ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ ایسی عورتیں جن کے خاوند وفات پا جائیں وہ دوران عدت زیب و زینت مثلاً خوشبو لگانا، سرمہ ڈالنا، نیا لباس پہننا، زیورات زیب تن کرنا وغیرہ جیسے امور سے اجتناب کریں اور جس گھر میں خاوند فوت ہوا ہو اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزارے یا وہاں جہاں اسے خاوند کی وفات کی اطلاع ملے۔ اس کے بعد وہ اپنے والدین کے گھر جا سکتی ہے یا نئی شادی کرنا ہو تو کروا سکتی ہے۔ دوران عدت ان امور سے اجتناب لازم ہے۔

کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوتا ہے؟

سوال اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے کہہ دے کہ تو مجھ پر ایسے ہے جیسے میرا باپ تو کیا عورت کی طرف سے بھی ظہار ہوگا اور اس پر کفارہ ہوگا؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح فرمائیں۔

جواب کتاب و سنت کی رو سے ظہار اسی صورت ہوتا ہے جب شوہر اپنی اہلیہ کو اپنی ماں سے تشبیہ دے ڈالے، اللہ پاک نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّالِيُ وَلَذَنَّهُمْ﴾

(المجادلة: ۲)

”جو لوگ تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کریں وہ ان کی مائیں نہیں۔ ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنم دیا ہے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ظہار مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لیے اگر عورت مرد کو باپ کہہ دے تو یہ ظہار نہیں

سمجھا جائے گا۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔ [بداية (المجتهد ۲/۹۳)، المبسوط للسرخسی (۲/۲۲۷)، حاشیہ ابن عابدین (۳/۴۶۷)، المہذب (۱۶/۱۱۹)، الانصاف للمرداوی (۲۰۰/۹)]

اور عورت پر رانج قول کی رو سے کفارہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن حکیم نے کفارہ بھی مرد کے لیے بتایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا ذَلِكَ تَوْعَظُونَ بِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فِإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [المجادلة: ۴۳]

”وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے ظہار کر لیتے ہیں پھر اپنے قول کی طرف لوٹ آتے ہیں تو چھونے سے پہلے گردن آزاد کرنا ہے۔ یہ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ جو گردن آزاد کرنے کی ہمت نہ پائے تو وہ دو ماہ متواتر چھونے سے قبل روزے رکھے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، یہ اس لیے ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

سنن ابی داؤد میں خولہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اوس بن صامت نے مجھ سے ظہار کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کرنے حاضر ہوئی اور اللہ کے رسول مجھ سے مجادلہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ”اللہ سے ڈرو تو تیرے چچا کا بیٹا ہے۔“ یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا:

﴿ قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا ﴾ (المجادلة: ۱)

”حقیقت اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔“

آپ نے فرمایا: ”اوس ایک گردن آزاد کرے۔ میں نے کہا: ”وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا۔“ آپ نے فرمایا: ”دو ماہ کے لگا تار روزے رکھ لے۔“ میں نے کہا: ”اللہ کے رسول! وہ بوڑھا آدمی ہے روزے نہیں رکھ سکتا۔“ آپ نے فرمایا: ”وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔“ میں نے کہا: ”اس کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہیں۔“ ”آپ کے پاس اس وقت ایک بڑی زنبیل کھجوروں کی لائی گئی (تو آپ نے وہ اسے دے دی)۔ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں ایک دوسری زنبیل سے اس کی مدد کروں گی۔“ آپ نے فرمایا: ”تم نے احسان کیا، جاؤ اس کی جانب سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو اور اپنے چچا زاد کی طرف لوٹ جا۔“ [ابو داؤد، کتاب الطلاق: باب فی الظہار (۲۲۱۴)]

اس حدیث سے بھی واضح ہو گیا کہ کفارہ مرد کے ذمہ ہے لہذا قرآن وحدیث کی رو سے ظہار اور کفارہ مرد ہی پر ہوگا، عورت کے اس فعل شنیع کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

خلع طلاق یا فسق نکاح

(سوال) بیوی کا اپنے خاوند سے خلع لے لینا آیا طلاق شمار ہوگا یا اسے فسق نکاح کہیں گے نیز اسکے احکامات کیا ہیں؟
(جواب) کتاب و سنت کی واضح نصوص کی رو سے خلع فسق نکاح شمار ہوتا ہے اور عورت ایک ماہواری کی عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرانے کی مجاز ٹھہرتی ہے کیونکہ خلع طلاق نہیں فسق نکاح ہے۔ اس کی عدت ایک حیض ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص نے سوال کیا: ”ایک شخص نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دے دیں اور پھر عورت نے اس سے خلع لے لیا کیا اب وہ اس عورت سے شادی کر سکتا ہے؟“ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”ہاں! خلع طلاق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کے شروع اور آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع اس کے درمیان ہے۔ خلع کوئی چیز نہیں۔“ پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْعٌ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: ۲۲۹] ”طلاق (رجعی) دومرتبہ ہے، پھر اچھے طریقے سے روک لینا ہے یا شائستگی سے چھوڑ دینا ہے۔“ پھر انھوں نے پڑھا: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: ۲۳۰] ”اگر (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد عورت اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔“ [تفسیر ابن کثیر بتحقیق عبدالرزاق مہدی (۱/۵۵۳)]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا مطلب یہ ہے کہ طلاق والی آیت کریمہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے پھر آگے تیسری طلاق کا ذکر ہے۔ خلع ان کے درمیان میں بیان کیا ہے اگر خلع کو طلاق شمار کیا جائے تو تین کی بجائے چار طلاقیں بن جاتی ہیں جس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے لہذا ثابت ہوا کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسق نکاح ہے اور اگر کوئی آدمی اپنی منکوحہ کو دو طلاقیں دے چکا ہے پھر اس کے بعد عورت خلع حاصل کر لیتی ہے اس کے بعد ان کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے کیونکہ خلع کو تیسری طلاق نہیں بلکہ اسے فسق نکاح قرار دیا جائے گا۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد فرماتے ہیں:

”یہی وہ بات ہے کہ جس کی طرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گئے ہیں کہ خلع طلاق نہیں بلکہ فسق نکاح ہے اور یہی روایت امیر المومنین عثمان بن عفان اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے۔

امام طاؤس اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے اور یہی بات امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابو ثور، امام داؤد ظاہری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم مذہب بھی یہی ہے اور یہی بات آیت کریمہ سے ظاہر ہے۔“ [تفسیر ابن کثیر (۱/۵۵۳)]

بعض ائمہ کے نزدیک خلع طلاق بائنہ ہے لیکن اس کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ قرآنی آیت کے ظاہر سے یہی معنی متبادر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ اِمْرَاةً ثَابِتِ بِنِ قَيْسٍ اِخْتَلَعَتْ مِنْهُ فَحَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِدَّتَهَا حَيْضَةً »

[ابو داؤد، کتاب الطلاق: باب فی الخلع (۲۲۲۹)، ترمذی، کتاب الطلاق: باب ما جاء فی الخلع (۱۱۸۵)، المستدرک علی الصحیحین (۲۰۶/۲)، اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔]
 ” بلاشبہ ثابت بن قیس رحمہ اللہ کی بیوی نے ان سے خلع لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ایک حیض قرار دی۔“
 امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

” یہ سب سے بڑی دلیل ہے اس بات پر کہ خلع فسخ نکاح ہے، طلاق نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ” طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔“ اگر خلع لینے والی عورت مطلقہ شمار ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے ایک حیض عدت گزارنے پر اکتفا نہ کرتے۔“ [معالم السنن (۶۵۶/۳)]

مذکورہ روایت کو بعض راویوں نے مرسل بھی بیان کیا ہے لیکن جب کوئی روایت ایک طریق سے مرسل اور دوسرے طریق سے موصول مروی ہو تو روایت موصول ہی سمجھی جاتی ہے اور یہ کوئی علت قاصر نہیں ہوتی جیسا کہ اصول حدیث کی کتب میں واضح ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ اس مسئلے میں اہل علم صحابہ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کا قول کہ خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہے، کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

” اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے تو یہ مذہب قوی ہے۔“ [ترمذی مع تحفة الأحمودی (۴۰۸/۴)]

مذکورہ بالا صحیح دلائل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جس عورت نے اپنے شوہر سے خلع لے لیا ہو اس کی عدت ایک حیض ہے تین نہیں اور وہ ایک حیض عدت گزارنے کے بعد اگر کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہو تو کروا سکتی ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ دلائل کی رو سے یہی موقف قوی و درست ہے۔ جو لوگ خلع کو طلاق شمار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی واضح اور پختہ دلیل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک تین حیض عدت گزار کر اس کا عقد ثانی ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

طلاق اور خلع میں فرق

(سوال) طلاق سے بھی میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے اور خلع سے بھی۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

(جواب) طلاق اور خلع میں یہ فرق ہے:

- ① مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے جب کہ خلع یافتہ عورت کی عدت ایک حیض ہے۔
- ② صحیح شرعی طلاق ایسے طہر میں ہوتی ہے جس میں شوہر نے بیوی سے ہم بستری نہ کی ہو، جب کہ خلع کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں۔
- ③ طلاق کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر ہی میں عدت گزارتی ہے جب کہ خلع کے بعد عورت فوراً اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے اور اپنے والدین وغیرہ سے جا ملتی ہے۔

۳) طلاق کی صورت میں خاوند بیوی سے اپنا دیا ہوا حق مہر نہیں لے سکتا جب کہ خلع کی صورت میں لے سکتا ہے۔

شوہر کی خبر نہ ملنے پر عورت کے لیے حکم

سوال اگر کسی عورت کا شوہر گم ہو جائے اور اس کی کہیں سے کوئی خبر نہ ملے تو شریعت ایسی عورت کے نئے نکاح کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

جواب ایسے آدمی کو اصطلاحی طور پر مفقود الخمر کہا جاتا ہے اور جب عورت کو اپنے شوہر کے لاپتا ہونے کی یقینی خبر مل جائے تو اس وقت سے چار سال گزرنے پر اس کے مرنے کا حکم لگا دیا جائے گا اور اس کے بعد چار ماہ دس دن بیوہ کی عدت گزار کر عورت دوسری جگہ اگر نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق کوئی مرفوع روایت تو موجود نہیں البتہ آثار صحابہ موجود ہیں۔ سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں:

« تَرَبَّصُ امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ أَرْبَعَ سِنِينَ ثُمَّ تَعْتَدُ عِدَّةَ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا وَتَزَوِّجُ إِنْ شَاءَتْ »
[سنن سعید بن منصور (۱۷۵۲)، موطا (ص/۳۳۲)، السنن الکبریٰ للبیہقی (۴۴۵/۷)، مصنف عبد الرزاق (۸۸/۷)]

”مفقود آدمی کی بیوی چار سال انتظار کرے پھر شوہر کے فوت ہونے والی عدت گزارے یعنی چار ماہ دس دن اور اس کے بعد اگر چاہے تو شادی کرے۔“
حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے:

« إِنْ عُمِرَ وَعُثْمَانُ قَضِيًّا فِي الْمَفْقُودِ أَنَّ الْمَرْأَةَ تَتَرَبَّصُ أَرْبَعَ سِنِينَ وَارْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا بَعْدَ ذَلِكَ ثُمَّ تَزَوِّجُ إِلَى آخِرِهِ » [بیہقی (۴۴۵/۷)، مصنف عبد الرزاق (۸۵/۷)]

”بے شک عمر بن خطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما دونوں خلفاء نے مفقود شوہر کے بارے میں فیصلہ دیا کہ اس کی بیوی چار سال تک انتظار کرے اور اس کے چار ماہ دس دن بعد یعنی بیوہ عورت کی عدت گزار کر شادی کرے۔“
جاہر بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« تَنْتَظِرُ الْمَرْأَةُ الْمَفْقُودِ أَرْبَعَ سِنِينَ » [سنن سعید بن منصور (۱۷۵۶)، بیہقی (۴۴۵/۷)]

”بے پتا شوہر کی بیوی چار سال انتظار کرے۔“

سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« إِذَا فُقِدَ فِي الصَّفِّ تَرَبَّصَتْ سَنَةً إِذَا فُقِدَ فِي غَيْرِ الصَّفِّ فَأَرْبَعَ سِنِينَ » [مصنف عبد الرزاق (۸۹/۷)]

”جب آدمی صفِ قتال میں بے پتا ہو جائے تو عورت ایک سال انتظار کرے اور جب لڑائی کی صف کے علاوہ گم ہو جائے تو چار سال انتظار کرے۔“

امام قنادہ بن دعامہ السدوسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جب ایسی عورت کا معاملہ حاکم تک پہنچایا جائے اور چار سال گزر جائیں تو ایسے آدمی کا مال اس کے ورثا میں تقسیم کر دیا جائے یعنی چار سال کے بعد اس کی موت کا حکم لگا دیا جائے گا پھر اس کی جائداد وغیرہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔“ [مصنف عبد الرزاق (۷/۹۰)]

امام محمد بن مسلم المعروف ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ [فتح الباری (۹/۴۳۱)]
حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”و تَبَّتْ أَيْضًا عَنْ عُثْمَانَ وَ ابْنِ مَسْعُودٍ فِي رِوَايَةٍ وَ عَنْ جَمْعٍ مِنَ التَّابِعِينَ كَالنَّخَعِيِّ وَ عَطَاءٍ وَ الزُّهْرِيِّ وَ مَكْحُولٍ وَ الشَّعْبِيِّ وَ اتَّفَقَ أَكْثَرُهُمْ عَلَى أَنَّ التَّاجِيلَ مِنَ الْيَوْمِ تُرْفَعُ أَمْرُهَا لِلْحَاكِمِ وَ عَلَى أَنَّهَا تَعْتَدُ عِدَّةَ الْوَفَاةِ بَعْدَ مَضِيِّ الْأَرْبَعِ سِنِينَ“ [فتح الباری (۹/۴۳۱)]
”یہ بات عثمان رضی اللہ عنہ، ایک روایت کے مطابق عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت جیسے نخعی، عطاء، زہری، مکحول اور شعبی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور اکثر کا ان میں سے اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ مقررہ مدت اس دن سے شروع ہوگی جب عورت کا معاملہ حاکم کی طرف پہنچا دیا جائے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ چار سال گزرنے کے بعد وہ شوہر کی وفات کی عدت گزارے گی۔“

اس کے برعکس فقہ حنفی میں ہے کہ جس کا شوہر بے پتا ہو جائے تو اس کی عورت اتنا انتظار کرے کہ شوہر کی عمر نوے برس کی ہو جائے تو پھر اس کے مرنے کا حکم لگایا جائے گا۔ اشرف علی تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں:

”اس (عورت) کا شوہر بالکل بے پتا ہو گیا، معلوم نہیں مر گیا یا زندہ ہے تو وہ عورت اپنا دوسرا نکاح نہیں کر سکتی بلکہ انتظار کرتی رہے کہ شاید آجائے۔ جب انتظار کرتے کرتے اتنی مدت گزر جائے کہ شوہر کی عمر نوے برس کی ہو جائے تو اب حکم لگا دیں کہ وہ مر گیا ہوگا۔ وہ عورت ابھی جوان ہو اور نکاح کرنا چاہے تو شوہر کی عمر نوے برس کی ہونے کے بعد عدت پوری کر کے نکاح کر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس بے پتا مرد کے مرنے کا حکم کسی شرعی حاکم نے لگایا ہو۔“

[بہشتی زیور (ص ۳۰۱)]

اسی بہشتی زیور کے نیچے حاشیہ میں اس مسئلے کا حوالہ قنادی عالمگیری (۲/۹۱۵) اور ہدایہ (۲/۶۰۲) سے دیا گیا ہے لیکن حنفی حضرات کا اپنے اس مسئلے پر فتویٰ نہیں ہے، یہ اس مسئلے میں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ اصل بہشتی زیور کے مذکورہ صفحہ کے حاشیہ پر لکھا ہے:

”لیکن آج کل شدت ضرورت کی وجہ سے علماء نے امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دے دیا ہے، ان کے نزدیک اتنی مدت شرط نہیں، اگر کسی کو ضرورت ہو تو علماء سے مفصل طور پر معلوم کر کے اس پر عمل کر سکتا ہے۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ کا مذہب وہی ہے جو اوپر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر علماء کا بیان کیا گیا ہے۔ اشرف علی تھانوی کی وضاحت

سے معلوم ہوا کہ حنفی علماء نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کو ترک کر دیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کو اختیار کیا ہے۔ اس بات پر ان کے دیوبند سہارنپور اور تھانہ بھون کے جید علماء کے دستخط ثبت ہیں۔ ان علماء کی تفصیل ”الحیلة الناجزة“ جو جدید طرز پر ”احکام طلاق و نظام شرعی عدالت“ کے نام سے شائع ہوا ہے (مطبوعہ الفیصل ناشران و تاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور) اس کے صفحہ ۲۲ تا ۲۵ میں موجود ہے۔

مذکورہ بالا آثار صحابہ کرام اور ائمہ دین، محدثین اور حنفی علماء کی تصریحات سے معلوم ہوا کہ جس عورت کا شوہر لا پتا ہو جائے تو اس کے یقینی طور پر لا پتا ہو جانے کے بعد یا جب معاملہ عدالت کی طرف لایا جائے، حاکم وقت تک پہنچانے کے بعد عورت چار سال تک انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر اگر نیا نکاح کرانا چاہے تو کروا سکتی ہے اور یہی راجح ترین موقف ہے جس کی پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تصدیق ہوتی ہے۔

WWW. KITABOSUNNAT.COM



قربانی کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

گیارہویں کی نیت سنت یا بدعت؟

سوال بعض لوگ قربانی میں بھی گیارہویں کی نیت کر لیتے ہیں کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب یقیناً قربانی کے جانور کو صرف رضائے الہی ہی کے لیے ذبح کرنا چاہیے کیونکہ جانوروں کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کرنا، غیر اللہ کے نام پر چھوڑ دینا، ایسی جگہ ذبح کرنا جہاں غیر اللہ کی عبادت اور شرک ہوتا ہو، سب حرام ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللَّهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهُ وَ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ وَ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ أَوَى مُحَدِّثًا وَ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْأَرْضِ» [مسلم، کتاب الأضاحی: باب تحريم الذبيح لغير الله تعالى و لعن فاعله (۱۹۷۸)]
 ”اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو اپنے والد پر لعنت کرے، اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے لیے ذبح کرے۔ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اللہ تعالیٰ اس آدمی پر لعنت کرے جو زمین کی علامات کو بدلے۔“

بعض نا سمجھ لوگ قربانی جیسی عظیم عبادت میں گیارہویں کی نیت کر لیتے ہیں اور اپنے عمل کو ضائع کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور بزرگوں کی محبت میں آ کر اپنے رب کی ناراضی مول نہیں لینا چاہیے اور اس کی عظمت و بڑائی اور کبریائی کو نہیں بھولنا چاہیے۔

جن جانوروں کی قربانی جائز نہیں

سوال براہ کرم قرآن اور حدیث کی روشنی میں آگاہ فرمادیں کہ کن جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں؟

جواب ① سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْأَذْنَ» [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما يكره من الضحایا (۲۸۰۴)]

”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آنکھ اور کان اچھی طرح دیکھیں۔“

② سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« أَلَّا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْهُ مَاذَا يُتَّقَى مِنَ الضَّحَايَا فَأَشَارَ بِيَدِهِ فَقَالَ أَرْبَعًا أَلْعَرَجَاءُ الْبَيْنِ ظُلْعُهَا وَالْعَوْرَاءُ الْبَيْنِ عَوْرُهَا وَالْمَرِيضَةُ الْبَيْنِ مَرَضُهَا وَالْعَجْفَاءُ الَّتِي لَا تُنْقَى » [مسند احمد (۳۰۱/۴)]

”رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ”کس جانور کی قربانی سے بچنا چاہیے؟“ آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا: ”چار قسم کے جانوروں سے بچنا چاہیے، لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو، بھیگا جس کا بھیگا پن ظاہر ہو، بیمار جس کی بیماری واضح ہو اور کمزور و لاغر جس کی ہڈیوں میں گودانہ ہو۔“

حاملہ جانور کی قربانی

سوال کیا حاملہ جانور کی قربانی درست ہے؟ اور اس کے پیٹ کے بچے کا کیا حکم ہے، اسے کھانا درست ہے یا نہیں؟
جواب حاملہ جانور کی قربانی کرنا درست ہے اور اس کے پیٹ کا بچہ حلال ہے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا:

« نَنْحَرُ النَّاقَةَ وَ نَذْبِحُ الْبَقْرَةَ وَالشَّاةَ فَنَجِدُ فِي بَطْنِهَا الْحَيْنِينَ أَنْلَقِيَهُ أَمْ نَأْكُلُهُ؟ قَالَ: كُلُّوهُ إِنْ شِئْتُمْ فَإِنَّ ذَكَاتَهُ ذَكَاةُ أُمِّهِ » [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما جاء في ذكاة الحنين (۲۸۷۲)]

”اے اللہ کے رسول! ہم اونٹنی، گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں تو اس کے پیٹ میں بچہ پاتے ہیں، کیا ہم اسے پھینک دیں یا کھالیں؟“ آپ نے فرمایا: ”اگر تم چاہو تو اسے کھا لو بے شک اس کا ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ اونٹنی بکری یا گائے کی قربانی درست ہے اور اس کے پیٹ کا بچہ بھی حلال ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ماں کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ کا بچہ ذبح کیے بغیر کھانے کا جواز ہے، بعض لوگوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے جو پیٹ کے بچے کو کھانا جائز نہیں سمجھتے، تاویل یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بچے کو اسی طرح ذبح کیا جائے جیسا کہ اس کی ماں کو ذبح کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ اس تاویل کا مکمل طور پر ابطال کرتا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے ارشاد میں فرمایا ہے: ”پس یقیناً اس کا ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔“ آپ نے ذبح کیے بغیر بچے کے حلال ہونے کی علت ذکر کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے؟

سوال رسول اللہ ﷺ کیسا جانور قربان کرتے تھے کیا حدیث سے اس کی رہنمائی میسر آسکتی ہے؟
جواب ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَحِّي بِكَبْشٍ أَقْرَنَ فَحَبِلَ يَنْظُرُ فِي سَوَادٍ وَ يَأْكُلُ فِي سَوَادٍ وَيَمْشِي فِي سَوَادٍ » [ابوداؤد، كتاب الضحايا: باب ما يستحب من الضحايا (۲۷۹۶)]
 ”رسول اللہ ﷺ ایسا مینڈھا ذبح کرتے جو موٹا تازہ سینگوں والا ہوتا تھا، جس کی آنکھیں، منہ اور ٹانگیں سیاہ ہوتیں۔“

بھینس کی قربانی

سوال کیا بھینس کی قربانی قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟

جواب قربانی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾

[الحج: ۳۴]

”اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کی جگہ مقرر کی تھی تاکہ جو جانور اللہ تعالیٰ نے ان کو مویشی چوپایوں میں سے دیے تھے ان پر اللہ کا نام ذکر کریں۔“

اس آیت کریمہ میں قربانی کے جانوروں کے لیے ﴿بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ کے الفاظ ذکر کیے ہیں اور ”انعام“ سے مراد یہاں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں جن کی تشریح قرآن پاک کی دوسری آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَ فَرَسًا كُلُّوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا خُطُوبَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ ثَمَنِيَّةَ أَزْوَاجٍ مِنَ الضَّانِ أَنْثِينَ وَ مِنَ الْمَعْرِزِ أَنْثِينَ قُلْ ءَالِ الذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنثِيَيْنِ أَمَا اسْتَمَلْتُمْ عَلَيْهِ أَرْحَامَ الْأُنثِيَيْنِ نَبِئُونِي بِعِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَ مِنَ الْإِبِلِ أَنْثِينَ وَ مِنَ الْبَقَرِ أَنْثِينَ ﴾ [الانعام: ۱۴۲-۱۴۴]

”اور اس نے چوپایوں میں سے بار برداری والے (یعنی بڑے بڑے) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) چوپائے بھی پیدا کیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ یہ چوپائے آٹھ قسم کے ہیں، بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو۔ کہہ دیجیے کیا اللہ تعالیٰ نے دونوں زحرام کیے یا دونوں مادہ کو یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہوئے ہیں؟ تم مجھے کسی دلیل سے بتاؤ اگر تم سچے ہو اور اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انعام کا اطلاق اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری پر ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ ﴿مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾ کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

”وَ الْأَنْعَامُ هُنَا الْإِبِلُ وَ الْبَقَرُ وَ الْغَنَمُ وَ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ هِيَ الْأَنْعَامُ فَهِيَ كَقَوْلِكَ صَلَاةُ الْأُولَى

وَمَسْجِدِ الْجَامِعِ“ [تفسیر قرطبی (۳۰۱/۲)]

”الْأَنْعَامُ سے مراد یہاں اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے اور ”بَهِيمَةَ الْأَنْعَامِ“ سے مراد انعام ہی ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے آپ کہتے ہیں صلاۃ الاولیٰ اور مسجد الجامع۔“

نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں:

”انعام“ کی قید اس لیے لگائی گئی کہ قربانی انعام کے سوا اور کسی جانور کی درست نہیں اگرچہ اس کا کھانا حلال ہی ہو۔“ [ترجمان القرآن: (۷۴۱)]

مزید فرماتے ہیں:

”﴿بَهِيمَةَ الْأَنْعَامِ﴾ سے اونٹ اور گائے اور بکری مراد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں مفصل بیان فرمایا۔“ [ترجمان القرآن: (۷۲۷)]

مذکورہ آیت کی تفسیر میں قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَفِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى أَنَّ الْقُرْبَانَ لَا يَكُونُ إِلَّا مِنَ الْأَنْعَامِ دُونَ غَيْرِهَا“ [فتح القدیر (۴۵۲/۳)]

”اس میں اشارہ ہے کہ انعام کے علاوہ دوسرے جانوروں کی قربانی نہیں ہوتی۔“

اور پھر انعام کی تشریح میں فرماتے ہیں:

”وَهِيَ الْإِبِلُ وَالْبَقَرُ وَالْغَنَمُ“ [فتح القدیر (۴۵۱/۳)]

”اور وہ اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں۔“

مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ ﴿بَهِيمَةَ الْأَنْعَامِ﴾ سے مراد اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہیں اور انہیں کی قربانی کرنی چاہیے۔ بھینس ان چار قسم کے چوپایوں میں سے نہیں۔ علامہ سید سابق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَلَا تَكُونُ إِلَّا مِنَ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَلَا يُحْزَى مِنْ غَيْرِ هَذِهِ الثَّلَاثَةِ يَقُولُ اللَّهُ سُبْحَانَهُ ﴿لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾“ [فقہ السنۃ (۲۶۴/۳)]

”قربانی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری کے علاوہ جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وہ یاد کریں اللہ تعالیٰ کا نام اس جانور پر جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مویشی چوپایوں میں سے عطا کیا۔“

یہی موقف حافظ عبد اللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ اہل حدیث (۴۲۶/۲) میں اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں: ”بعض نے جو یہ لکھا ہے: ”الْحَامُوسُ نَوْعٌ مِنَ الْبَقَرِ“ کہ بھینس گائے کی قسم سے ہے، یہ بھی اسی زکاۃ کے لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بھینس دوسری جنس ہے۔“ احناف کے ہاں بھینس کی قربانی کی جاسکتی ہے اور یہ بقر میں داخل ہے۔ ہدایہ میں ہے:

”وَ يَدْخُلُ فِي الْبَقَرِ الْحَامُوسُ لِأَنَّهُ مِنْ جَنْسِهِ“ [الهدایۃ، کتاب الاضحیۃ (۴/۳۵۹)، طبع بیروت]

”گائے میں بھینس داخل ہے اس لیے کہ یہ گائے کی جنس سے ہے۔“

فتاویٰ ثنائیہ میں لکھا ہے:

”حجاز میں بھینس کا وجود ہی نہ تھا پس اس کی قربانی نہ سنت رسول ﷺ سے ثابت ہوتی ہے نہ تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے، ہاں اگر اس کو جنس بقر سے مانا جائے جیسا کہ حنفیہ کا قیاس ہے یا عموم ”بِهَيْمَةِ الْأَنْعَامِ“ پر نظر ڈالی جائے تو حکم جواز قربانی کے لیے یہ علت کافی ہے۔ (از مولانا ابوالعلاء نظر احمد کسوانی۔)۔“ [فتاویٰ ثنائیہ (۱/۸۱۰)]

ائمہ اسلام کے ہاں جاموس (بھینس) کا جنس بقر سے ہونا مختلف فیہ ہے۔ منیٰ براحتیاط اور رائج یہی موقف ہے کہ بھینس کی قربانی نہ کی جائے بلکہ مسنون قربانی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری سے کی جائے، جب یہ جانور موجود ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے مشتبہ امور سے اجتناب ہی کرنا چاہیے اور دیگر بحث و مباحثے سے بچنا ہی اولیٰ و بہتر ہے۔

دودانتے سے کمتر کی قربانی

(سوال) کیا دودانتے جانور سے کم عمر کی قربانی کرنا جائز نہیں، جبکہ نبی ﷺ نے ایک صحابی کو بکرا کا بچہ ذبح کرنے کی اجازت دی تھی؟

(جواب) قربانی کے جانور کے لیے جو شرائط شریعت مطہرہ نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قربانی والا جانور دو دانٹا ہو اور اگر یہ ملنا مشکل ہو یا اسے خریدنے کی ہمت نہ ہو تو بھیڑ کا کھیرا قربان کرنا جائز و درست ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَذْبَحُوا إِلَّا الْمُسِنَّةَ إِلَّا أَنْ يَعْسَرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوا جَذَعَةً مِنَ الضَّأْنِ» [مسلم، کتاب الأضاحی

باب سن الأضاحیہ (۱۹۶۳)، ابوداؤد (۲۷۹۷)، ابن ماجہ (۳۱۴۱)، نسائی (۴۳۸۳)، ابن خزیمہ

(۲۹۱۸)، مسند ابی یعلیٰ (۲۳۲۳)، بیہقی (۲۶۹/۹)، مسند احمد (۳۱۲/۳)، مسند ابی عوانہ

(۲۲۸/۵)، ابن الجارود (۹۰۴)]

”تم دودانتے کے سوا ذبح نہ کرو، لیکن اگر تمہارے اوپر تنگی ہو تو بھیڑ کا کھیرا ذبح کر لو۔“

بعض لوگ دودانتے کی جگہ مطلقاً بھیڑ کے کھیرے کی قربانی درست قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کلیب بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا فِي سَفَرٍ فَحَضَرَ الْأَضْحَى فَجَعَلَ الرَّجُلُ مِمَّا يَشْتَرِي الْمُسِنَّةَ بِالْحَذَعَتَيْنِ وَ الثَّلَاثَةِ فَقَالَ

لَنَا رَجُلٌ مِنْ مَرْبِئَةَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَحَضَرَ هَذَا الْيَوْمَ

فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَطْلُبُ الْمُسِنَّةَ بِالْحَذَعَتَيْنِ وَ الثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

إِنَّ الْحَذَعَ يُوفَى مِمَّا يُوفَى مِنْهُ الثَّنِيَّةُ» [مسند احمد (۲۰۴/۳)، مستدرک حاکم (۲۲۶/۴)،

بیہقی (۲۷۱/۹)، ابن ابی شیبہ (۲۱۰/۱۴)]

”ہم سفر میں تھے کہ قربانی والی عید کا وقت آ گیا، ہم میں سے ہر کوئی دو یا تین کم عمر جانوروں کے بدلے دو دانتا خریدنے لگا۔ مزینہ قبیلے کے ایک آدمی نے ہم سے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ یہ دن آ گیا تو ہر شخص دو یا تین کم عمر جانوروں کے بدلے دو دانتا طلب کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ کھیر اس کام پر پورا اترتا ہے جس کام میں دو دانتا پورا ہے۔“

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«كُنَّا مَعَ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَالُ لَهُ مُحَاشِيعُ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ فَعَزَّتِ الْغَنَمُ فَأَمَرَ مُنَادِيًا فَنَادَى أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ أَنَّ الْجَدْعَ يُوفِّي مِمَّا تُوَفِّي مِنْهُ الثَّنِيَّةُ» [ابو داؤد، کتاب الضحایا: باب ما يجوز في الضحایا من السن (۲۷۹۹)،

ابن ماجہ (۳۱۴۰)، ابیرانی کبیر (۷۶۴۱/۲۰)، مستدرک حاکم (۲۲۶/۴)، بیہقی (۲۷۰/۹)]

”ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ایک آدمی کے ساتھ تھے جسے محاشع کہا جاتا ہے، وہ بنو سلیم میں سے تھا، بکریاں کم پڑ گئیں تو آپ ﷺ نے ایک منادی کرنے والے کو حکم دیا، اس نے منادی کی کہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں: ”بلاشبہ بھیڑ کا کم عمر بچہ اس چیز سے پورا پورا کفایت کرتا ہے جس سے دو دانتا کام آتا ہے۔“

اس حدیث نے اس بات کی توضیح کر دی کہ یہ حکم دو دانتا جانور کم ہونے کی صورت میں تھا۔ اس میں اور جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں۔ وہ بھی عسرت و تنگی اور دو دانتے کی قلت کی صورت میں بھیڑ کا کم عمر بچہ قربانی کرنے پر دلالت کرتی ہے اور اس روایت کا سیاق بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ابو کباش کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ملا اور ان سے سوال کیا تو انھوں نے کہا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا ہے:

«نِعْمَ أَوْ نِعْمَتِ الْأُضْحِيَّةِ الْجَدْعُ مِنَ الضَّانِ» [مسند احمد (۶۱۱/۱۵)، مسند اسحاق بن راہویہ (۴۰۷)، بیہقی (۲۷۱/۹)، ترمذی (۱۴۹۹)]

”بہترین قربانی بھیڑ کا کھیرا ہے۔“

اس کی سند کد ام بن عبد الرحمن السلمی اور ابو کباش کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یہ بھی مروی ہے:

«الْجَدْعُ مِنَ الضَّانِ خَيْرٌ مِنَ السَّيِّدِ مِنَ الْمَعْرِ» [مسند احمد (۴۰۲/۲)، مستدرک حاکم (۲۲۷/۴)]

”بھیڑ کا کم عمر بچہ بکری کے دو دانتے سے بہتر ہے۔“

اس کی سند میں ابو ثفال المری ثمامہ بن وائل ضعیف ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق ایک روایت ہلال رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«يَحْوِزُ الْجَدْعُ مِنَ الضَّانِ أُضْحِيَّةً» [ابن ماجہ، کتاب الأضاحی: باب ما تجزى من الأضاحی

(۳۱۳۹)، مسند احمد (۶/۳۶۸)، بیہقی (۹/۲۷۱)، شرح مشکل الآثار (۵۷۲۳) [”بھیڑ کا کم عمر بچہ قربانی کے لیے جائز ہے۔“

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ام محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی مجہولہ ہے اور ام بلال بنت ہلال بھی اس روایت کے سوا کہیں معروف نہیں۔

اب رہی عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں بکریاں دیں اور انھوں نے اپنے ساتھیوں پر تقسیم کر دیں تو بکری کا ایک سالہ بچہ باقی رہ گیا، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«صَحَّحَ بِهِ أَنْتَ» [ابن ماجہ، کتاب الأضاحی: باب ما تجزی من الأضاحی، (۳۱۳۸)، بخاری (۵۵۵۵)، مسلم (۱۹۶۵)، مسند طرابلسی (۱۰۰۲)، مسند احمد (۲۸/۵۳۸)، سنن نسائی (۷/۲۱۸)، ابن حبان (۵۸۹۸)، بیہقی (۹/۲۶۹)، شرح السنة (۱۱۱۶)، مسند ابی عوانة (۵/۲۱۱)، ابن خزيمة (۲۹۱۶)]

”تو اس کی قربانی کر۔“

یہ حدیث عام نہیں ہے کہ ہر کسی کو اجازت ہو کہ وہ بکری کا ایک سالہ بچہ ذبح کر لے بلکہ یہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ سنن بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:

«صَحَّحَ بِهَا أَنْتَ وَ لَا أَرَحْصُهُ لِأَحَدٍ فِيهَا بَعْدُ» [السنن الكبرى للبيهقي (۹/۲۶۹)]

”تو اسے قربان کر لے، اس میں کسی اور کے لیے میں رخصت نہیں دیتا۔“

امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے سنن بیہقی میں یوں باب قائم کیا ہے:

”بَابُ لَا يُجْزَى الْحَذُّعُ إِلَّا مِنَ الضَّانِ وَ حَذَّهَا وَ يُجْزَى الشَّيْءُ مِنَ الْمَعَزِ وَ الْإِبِلِ وَ الْبَقَرِ“

”کم عمر (کھیرا) صرف بھیڑ کا کفایت کرتا ہے بکری، اونٹ اور گائے میں (صرف) دو دانٹا کفایت کرتا ہے۔“

لہذا بکری کا کھیرا صرف چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خاص تھا، جن میں سے عقبہ بن عامر اور ابو بردہ رضی اللہ عنہما ہیں اور زید بن خالد رضی اللہ عنہ کو بھی آپ ﷺ نے بکری کا کھیرا قربانی کرنے کیلئے دیا تھا۔ [مسند احمد (۳۶/۲۰)، ابن حبان (۵۸۹۹) مسند بزار (۳۷۷۶)، ابو داؤد (۲۷۹۸)، طبرانی کبیر (۵/۲۴۲)، بیہقی (۹/۲۷۰)]

یہ معاملات ابتدائی معلوم ہوتے ہیں، بعد میں شرع میں اس بات کا تقرر ہو گیا کہ بکری کا کھیرا قربانی کے لیے کفایت نہیں کرتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

”وَ فِي الْحَدِيثِ أَنَّ الْحَذَّعَ مِنَ الْمَعَزِ لَا يُجْزَى وَ هُوَ قَوْلُ الْحَمَّهَوْرِ“ [فتح الباری (۱۰/۱۰۰)]

”اس حدیث میں دلیل ہے کہ بکری کا کھیرا قربانی کے لیے کفایت نہیں کرتا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔“

قربانی کا جانور کیسا ہو؟

سوال) قربانی کا جانور کیسا ہونا چاہیے؟

جواب نبی کریم ﷺ جب مینڈھا قربانی کرتے تو وہ خوبصورت موٹا تازہ ہوتا تھا جیسا کہ ابھی حدیث میں ہے کہ آپ نے دو سینگوں والے چتکبرے خاصی مینڈھے ذبح کیے۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا مینڈھا خرید کر لانے کا حکم دیا جو سینگوں والا ہو، جس کی ٹانگیں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں۔ [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما يستحب من الضحایا (۲۷۹۲)، مسند احمد (۷۸/۶)]
ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ایسا مینڈھا قربانی کیا کرتے تھے جو موٹا تازہ ہوتا، جس کی آنکھیں، ٹانگیں اور منہ سیاہ ہوتا۔ [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما يستحب من الضحایا (۲۷۹۶)]

جانور خریدتے وقت اس کے کان اور آنکھیں اچھی طرح دیکھ لینی چاہئیں، علی رضی اللہ عنہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم (قربانی کا جانور خریدتے وقت) اس کی آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیں۔ [ابن خزیمہ (۲۹۱۵، ۲۹۱۴)۔ مستدرک حاکم: (۱/۴۶۷، ۴/۲۲۰)، مسند ابی یعلیٰ (۳۳۳)، مسند بزار (۱۲۰۳)، مجمع الزوائد (۲۲/۴)]

براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قربانی والے جانوروں میں کن عیوب سے بچنا ضروری ہے؟ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا، چار عیوب ہیں:

① لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

② جس کا بھینگا پن ظاہر ہو۔

③ بیمار جس کی بیماری عیاں ہو۔

④ لاغر و کمزور جس کے جسم میں چربی اور ہڈی میں گودا نہ ہو۔ [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما یکرہ من الضحایا (۲۸۰۲)]
علی رضی اللہ عنہ کی اوپر ذکر کردہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایسا جانور نہ لیا جائے جس کا کان سامنے یا پیچھے کی جانب سے کٹا ہوا ہو اور نہ ایسا جانور ہو جس کے کان لمبائی میں چیرے ہوئے ہوں یا جس کے کان میں گول سوراخ ہو۔ لہذا قربانی کا جانور موٹا تازہ ہونا چاہیے اور مذکورہ عیوب سے مبرا اور پاک ہونا چاہیے۔

اونٹ کی قربانی میں کتنے آدمی شریک ہوں؟

سوال کیا اونٹ کی قربانی میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟

جواب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، عیدالاضحیٰ آئی تو ہم گائے میں سات افراد اور اونٹ میں دس اشخاص شریک ہوئے۔ [ترمذی، کتاب الاضاحی: باب فی الاشتراك فی الاضحیہ (۱۵۰۱)]
جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے حدیبیہ کے سال سات سات آدمیوں کی طرف سے اونٹ اور گائے کو ذبح کیا۔

[ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب البقر والجوزور عن کم تجزئ (۲۸۰۹)]

ان دونوں صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں سات حصے بھی ہو سکتے ہیں اور دس بھی، یہ شرعی سہولت ہے، اس پر

قربانی کا وقت

سوال قربانی کا صحیح وقت کونسا ہے؟ نماز عید سے پہلے قربانی کرنا کیسا ہے اور قربانی کتنے دن کی جاسکتی ہے؟ قرآن و سنت کی رو سے آگاہ فرمادیں۔

جواب قربانی کا وقت نماز عید کے بعد ہے۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يَذْبَحُ لِنَفْسِهِ وَ مَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهُ وَ أَصَابَ سُنَّةَ

الْمُسْلِمِينَ » [بخاری، کتاب الأضاحی: باب قول النبی لابی بردة (۵۰۵۶)]

”جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کیا وہ اسے اپنے لیے ذبح کرتا ہے اور جس نے نماز کے بعد ذبح کیا اس کی قربانی پوری ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کے طریقے کو اپنایا۔“

اور یہ وقت تیرہ ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ کو ایام تشریق کہتے ہیں اور حدیث میں آتا ہے کہ ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ ذَبْحٌ » [فتح الباری (۱۱/۱۰) نیل الاوطار (۵/۱۲۵)، زاد المعاد (۲/۳۱۸)]

”سارے ایام تشریق ذبح کے دن ہیں۔“

قربانی کے گوشت اور کھالوں کا مصرف

سوال قربانی کے گوشت اور کھالوں کا صحیح مصرف کیا ہے اور کیا کھال مجاہدین کو دینا درست ہے؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الْبَدَنُ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَ اطْعَمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ كَذَلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ [الحج: ۳۶]

”اور قربانی کے اونٹ ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں سے مقرر کیے ہیں، تمہارے لیے اس میں بھلائی ہے۔ تم ان پر اللہ کا نام لو۔ ایک پاؤں سے بندھے اور تین پاؤں سے کھڑے ہوں، پھر جب ان کے پہلو گر پڑیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور انہیں بھی کھلاؤ جو مانگتے نہیں اور جو مانگتے ہیں، ہم نے انہیں تمہارے لیے مطیع کر دیا ہے تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کا ذکر کیا ہے جو حج و عمرہ کے موقع پر حرم میں کی جاتی ہے اور دوسری قربانی وہ ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر تمام مسلمان اپنے گھروں میں کرتے ہیں۔ اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کی حدیث ملاحظہ ہو:

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ ضَحَّى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثِيَّةٍ وَ بَقِيَ فِي بَيْتِهِ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ ! نَفَعَلْ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِي ؟ قَالَ كُلُّوْا وَ أَطْعَمُوا وَ اذْجِرُوا فَإِنَّ ذَلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جَهْدًا فَأَرَدْتُ أَنْ تُعِينُوا فِيهَا » [بخاری، کتاب الأضاحی: باب ما یوکل من تعلیق لحوم الأضاحی و ما یتزود منها (۵۵۶۹)]

”جس نے تم میں سے قربانی کی ہے وہ تیسرے دن کے بعد اس حال میں صبح نہ کرے کہ اس کے گھر میں قربانی کے گوشت سے کوئی چیز باقی ہو۔“ آئندہ سال صحابہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! جس طرح ہم نے پچھلے سال کیا تھا کیا (اب بھی) اسی طرح کریں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ کرو۔ اس سال لوگوں کو مشقت تھی تو میں نے ارادہ کیا کہ تم اس میں سے ان کی مدد کرو۔“

مذکورہ بالا آیت کریمہ اور صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت آدمی خود بھی کھا سکتا ہے اور عزیز و اقارب اور فقراء و مساکین کو بھی دے سکتا ہے اور جو مصرف قربانی کے گوشت کا ہے وہی مصرف قربانی کی کھال کا ہے یعنی قربانی کی کھال خود بھی استعمال کر سکتا ہے، عزیز و اقارب کو بھی دے سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”عہد رسالت میں قربانی کے موقع پر اہل بادیہ کے کچھ گھر مدینہ آ کر آباد ہو گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تین دن کے لیے قربانی کا گوشت رکھ کر باقی صدقہ کر دو۔“ پھر اس کے بعد والے سال میں لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیزے بناتے ہیں اور چربی پکھلاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بات کیا ہے؟“ تو انھوں نے کہا: ”آپ نے تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تمہیں صرف ان لوگوں کی خاطر منع کیا تھا جو باہر سے آ کر یہاں رہنے لگے تھے، اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو۔“ [مسلم، کتاب الأضاحی: باب النهی عن أكل لحوم الأضاحی بعد ثلاث و نسخه (۱۹۷۱)]

اس صحیح حدیث سے واضح ہو گیا کہ جس طرح آدمی قربانی کا گوشت خود کھا سکتا ہے اسی طرح کھال بھی استعمال کر سکتا ہے، عزیز و اقارب، دوست احباب کو دے سکتا ہے اور کھال کو صدقہ بھی کر سکتا ہے اور قرآن حکیم میں مصارف صدقات میں ”نبی سبیل اللہ“ کی اصطلاح صحیح تفاسیر کی روشنی میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ لہذا کھال مجاہدین کو دینا بالکل جائز اور درست ہے۔ البتہ کھال یا گوشت بیع کر خود اس کی رقم نہیں کھا سکتا اور اگر کھال صدقہ کر دے اور گوشت کا بھی زیادہ حصہ تقسیم کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر اسی طرح کیا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ أَنْ يَقُومَ عَلَى بُدْنِهِ وَ أَنْ يَقْسِمَ بُدْنَهُ كُلَّهَا لِحُومِهَا وَ جُلُودِهَا وَ جِلْدِهَا » [بخاری، کتاب الحج: باب يتصدق بجلود الهدى (۱۷۱۷)]
 ”رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کی قربانیوں کی نگرانی کریں اور تمام قربانیوں کے گوشت، چمڑے اور ان کے جھول تقسیم کر دیں۔“

جو لوگ کہتے ہیں کہ کھالیں صرف فقراء اور مساکین کا حق ہے انہیں چاہیے کہ وہ مذکورہ بالا احادیث کے مقابلے میں ایسی حدیث پیش کریں کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو کہ کھالیں صرف فقراء اور مساکین کا حق ہیں، دوسرے کسی کا نہیں۔ وہ ایسی حدیث کبھی پیش نہیں کر سکتے۔

عورت کا قربانی کا جانور ذبح کرنا

(سوال) کیا عورت اپنا قربانی کا جانور خود ذبح کر سکتی ہے؟

(جواب) مسلمان عورت اگر جانور ذبح کرنے کا سلیقہ رکھتی ہو تو اپنی قربانی خود ذبح کر سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری (قبل الحدیث: ۵۵۵۹) میں روایت لائے ہیں کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی قربانیاں خود ذبح کریں۔ یہ روایت مصنف عبدالرزاق، کتاب المناسک (۳/۳۸۹)، (۷۱۶۹) میں بھی موجود ہے۔

علامہ یعنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس حدیث میں دلیل ہے کہ عورتیں جب اچھی طرح ذبح کر سکتی ہوں تو وہ اپنی قربانیاں خود ذبح کر سکتی ہیں۔“ [عمدة القاری (۱۵۵/۲۱)]

اسی طرح صحیح بخاری (۵۵۰۵) میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی عورتوں کے لیے جانور کا ذبح کرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔ کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ایک عورت نے پتھر کے ساتھ ایک بکری ذبح کر دی تو نبی ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو کھانے کا حکم دیا۔“ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ عورت کا ذبیحہ جائز و درست ہے۔

جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ لٹانا

(سوال) کیا جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کرنا کسی حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کرنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذبیحہ والے دن دو سیٹوں والے چتکبرے ٹھی مینڈھے ذبح کیے، جب انہیں قبلہ رخ کیا تو آپ نے یہ دعا پڑھی:

((لِيُنِي وَجْهِي لِلذِّى فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلَى مِثْلَةِ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ

أَمْرَتْ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ اللَّهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنِ مُحَمَّدٍ وَأُمَّتِهِ بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ))

پھر آپ نے انہیں ذبح کر دیا۔ [سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا: باب ما يستحب من الضحایا (۲۷۹۵)، ابن ماجہ، کتاب الاضاحی: (۳۱۲۱)، ابن خزیمہ (۲۸۹۹)، مسند احمد (۳/۳۷۰)]
اس حسن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کو ذبح کرتے وقت قبلہ رخ کر لیا جائے۔

قربانی کا جانور خود ذبح کرنا

سوال کیا قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے؟

جواب قربانی کا جانور خود ذبح کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ خود اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کیا کرتے تھے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحَرَ سَبْعَ بَدَنَاتٍ بِيَدِهِ قِيَامًا وَضَحَى بِالْمَدِينَةِ بِكَبْشَيْنِ

أَقْرَبَيْنِ أَمْلَحَيْنِ» [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب ما يستحب من الضحایا (۲۷۹۳)]

”نبی کریم ﷺ نے کھڑے سات اونٹ اپنے ہاتھ سے نحر کیے اور مدینہ میں دو سینگوں والے چتکبرے مینڈھے ذبح کیے۔“

سب اہل خانہ کی طرف سے ایک قربانی

سوال کیا تمام گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی جائز ہے؟

جواب ایک قربانی پورے گھر والوں کی طرف سے کفایت کر جاتی ہے۔

عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قربانی کیسے ہوتی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا:

”نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک ایک قربانی کرتا تھا۔“

[ترمذی، کتاب الاضاحی: باب ما جاء ان الشاة الواحدة تجزئ عن اهل بيت (۱۵۰۵)]

میت کی طرف سے قربانی کرنا

سوال کیا میت کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟

جواب میت کی طرف سے مستقل قربانی کرنے کی کوئی خاص دلیل موجود نہیں، البتہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا مینڈھا لانے کا حکم دیا جس کے ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں وہ آپ کے پاس قربانی کے لیے لایا گیا پھر آپ نے کہا اے عائشہ چھری لاؤ پھر آپ نے کہا اس کو تیز کرو، میں نے ایسا کیا پھر آپ نے چھری پکڑ لی اور مینڈھے کو ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا پھر فرمایا: «بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةٍ مُحَمَّدٍ» "اللہ کے نام کے ساتھ اے اللہ! محمد، آل محمد اور امت محمد (ﷺ) کی طرف سے قبول فرما۔" پھر اسے ذبح

کردیا۔ [صحیح مسلم، کتاب الاضاحی: باب استحباب استحسان الضحیة وذبحها مباشرة بلا توكيل (۱۹۶۷)]
یہ قربانی رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں کی، اس سے دلیل لی جاتی ہے کہ آپ نے یہ قربانی اپنی امت کی طرف سے بھی کی جب کہ آپ کے کئی امتی اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے، اسی طرح جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کے پاس دو موٹے تازے، سیگوں والے چتکبرے، نھی مینڈھے لائے گئے، آپ نے ان دونوں میں سے ایک کو لٹایا اور کہا: "اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، محمد (ﷺ) کی طرف سے اور محمد (ﷺ) کی امت میں سے جس نے تیری توحید کی گواہی دی اور میرے لیے پیغام پہنچانے کی شہادت دی اس کی طرف سے۔" [مجمع الزوائد (۲۷/۴)، ارواء الغلیل (۲۰۱/۴)]:

ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قربانی کا ارادہ کرتے تو دو موٹے تازے سیگوں والے چتکبرے مینڈھے خریدتے، جب آپ نماز اور خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو عید گاہ ہی میں ان دو میں سے ایک مینڈھے کو لایا جاتا، آپ اسے ذبح کرتے اور کہتے: "اے اللہ! یہ میری امت کے ان سب لوگوں کی طرف سے ہے جنہوں نے تیری توحید کی گواہی دی اور میرے پیغام پہنچانے کی شہادت دی۔" پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا، آپ اسے ذبح کرتے اور فرماتے: "اے اللہ! یہ محمد (ﷺ) اور آل محمد (ﷺ) کی طرف سے ہے۔" آپ ان دونوں کے گوشت کو مسکینوں کو کھلاتے، خود بھی کھاتے اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلاتے۔ [مسند احمد (۳۹۱/۶)، (۳۹۲)، مسند بزار (۱۲۰۸)، مجمع الزوائد (۲۲/۴)]:
ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے ان تمام لوگوں کی طرف سے قربانی کرتے تھے جو اللہ کی توحید اور آپ کے پیغام الہی پہنچانے کی شہادت دیتے تھے اور آپ کی امت میں آپ کی زندگی میں موجود اور فوت ہونے والے سب ہی شامل ہیں۔

نحر کرنے کا طریقہ

(سوال) نحر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

(جواب) جانوروں کو ذبح کرنے کے رسول اللہ ﷺ نے دو طریقے بتائے ہیں، ان میں سے ایک تو وہ طریقہ ہے جو معروف ہے کہ جانور کو لٹا کر تکبیر کہہ کے اس کے گلے پر چھری پھیر دی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ نحر کرنا ہے، یہ اونٹ کے ساتھ خاص ہے اگر کسی شخص نے اونٹ کی قربانی کرنی ہو تو اس کا سنت طریقہ نحر کرنے کا یہ ہے کہ اسے اس طرح کھڑا کریں کہ اس کی اگلی

بائیں ٹانگ کو ران کے ساتھ ملا کر باندھ دیں اور تین ٹانگوں پر کھڑا کر دیں پھر تکبیر پڑھ کر اس کے سینے اور گردن کی جڑ کے درمیان والے گڑھے میں نیزہ، خنجر یا تیز دھار والا کوئی آلہ ماریں جس سے اس کی شاہ رگ کٹ جائے۔ [ملاحظہ ہو، مرعاۃ (۱-۲۷۱۷) لفتح الربانی (۱۳/۵۷،۵۵)]

کیا پاکستانی قوم کو قربانی معاف ہے؟

(سوال) کیا پاکستانی قوم کو مقروض ہونے کی وجہ سے قربانی معاف ہے؟

(جواب) دین اسلام کے خلاف یہودی، عیسائی اور بے دین تو میں مختلف اوقات میں مختلف سازشوں کے جال بنتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے کہ ”قرض اتارو، ملک سنوارو“ سکیم میں بھر پور حصہ لینا چاہیے، اس کے بعد قربانی کرنی چاہیے۔ قربانی جیسی اہم سنت کو ایک سودی قرضے کے ذریعے ختم کرنا جرم عظیم ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انسان اپنی ضروریات زندگی کے تحت قرض لے سکتا ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی کئی ایک واضح نصوص موجود ہیں اور اس قرض کی ادائیگی کا بھی شریعت ہمیں حکم کرتی ہے لیکن سود پر قرض لینا یعنی قرض کے ساتھ زائد رقم کی ادائیگی حرام ہے۔

زمانہ جاہلیت میں قرض کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں سود در سود کی بنا پر اصل رقم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا حتیٰ کہ تھوڑی سی رقم بھی پہاڑ بن جاتی جس کی ادائیگی انتہائی گراں ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے اس نظام کے خاتمے کے لیے کئی ایک آیات نازل کیں جن میں اسے بالکل حرام قرار دے دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ”اگر کوئی شخص تنگ دست و ضرورت مند ہے اور وہ قرض لیتا ہے تو اسے آسانی تک مہلت دے دو۔“ اگر قرض معاف کر دیا جائے تو اسے بہتر قرار دیا گیا۔ اس کی فضیلت میں بھی کئی ایک احادیث صحیحہ صریحہ موجود ہیں۔ سودی نظام اور اسلامی نظام میں بہت زیادہ فرق ہے، سودی نظام سراسر ظلم و زیادتی، سنگ دلی اور خود غرضی پر مبنی ہے کیونکہ سود لینے والا یہ نہیں دیکھتا کہ جسے رقم بطور قرض دی ہے، اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کو تو اپنے متعین نفع سے غرض ہوتی ہے جبکہ دین اسلام دوستی، ہمدردی، تعاون اور ایک دوسرے کو سہارا دینے کا نظام ہے۔ مسلمان اس پر رحمت نظام کو نہ اپنائیں تو اس میں اسلام کا کیا تصور ہے؟

نواز شریف کی ”قرض اتارو، ملک سنوارو“ سکیم خالصاً اسی سودی نظام پر مشتمل ہے کیونکہ اصل رقم جس کی ادائیگی کرنی ہے، بہت تھوڑی ہے جب کہ اس پر سود در سود کی شکل میں کئی گنا زیادتی ہو چکی ہے۔ لہذا نواز شریف صاحب کو بحیثیت مسلم یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہم صرف اصل رقم واپس کریں گے۔ باقی سودی رقم ہم ادا نہیں کریں گے کیونکہ سود کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور سود خور کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے والا قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

[آل عمران: ۱۳۰]

”اے ایمان والو! گنا چوگنا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ امید ہے کہ فلاح پا جاؤ گے۔“

نبی مکرم ﷺ نے سود کی مذمت کرتے ہوئے اس پر لعنت کی ہے۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَعْنُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِكْلَ الرِّبَا وَ مُوَكَّلَهُ وَ كَاتِبَتِهِ وَ شَاهِدِيهِ وَ قَالَ هُمْ

سَوَاءٌ» [مسلم، کتاب المساقاة، باب لعن اكل الربا و موكله (۱۰۹۸)، مسند احمد (۳۰۴/۳)، ابو

یعلیٰ (۱۸۴۹)، بیہقی (۲۷۵/۵)، شرح السنة (۵۴/۸)]

”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا یہ

گناہ میں برابر ہیں۔“

سیدنا ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رَأَيْتُ أَبِي اشْتَرَى عَبْدًا حَجَامًا فَأَمَرَ بِمَحَاجِمِهِ فَكَسِرَتْ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ إِنَّ رَسُولَ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الدِّمِّ وَ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَ كَسْبِ الْأَمَةِ وَ لَعْنِ الْوَأَشِيمَةِ

الْمُسْتَوْشِمَةِ وَ اِكْلِ الرِّبَا وَ مُوَكَّلَهُ وَ لَعْنِ الْمُصَوِّرِ» [بخاری، کتاب البيوع: باب ثمن الكلب

(۲۲۳۸)، مسند احمد (۳۰۸/۴، ۳۰۹)، مسند طيالسی (۱۰۴۳) طبرانی کبیر (۲۲/۲۹۵، ۲۹۶)،

بیہقی (۶/۶)]

”میں نے اپنے باپ کو دیکھا انھوں نے ایک غلام خریدا جو حجام تھا۔ انھوں نے اس کے حجامت کے ہتھیار توڑ ڈالنے کا

حکم دیا تو وہ توڑ دیے گئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا: ”نبی ﷺ نے خون کی قیمت، کتے کی قیمت،

باندی کی (ناجائز) کمائی سے منع فرمایا ہے اور گودنے والی، گدوانے والی، سود کھانے اور کھلانے والوں پر لعنت کی اور

تصویر بنانے والے پر بھی لعنت کی۔“

اسی طرح یہی حدیث سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنن ابی داؤد (۳۳۳۳)، ترمذی (۱۲۰۶)، مسلم (۲۲۷۷)، مسند احمد

(۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۳، ۴۰۳)، مسند طيالسی (۳۳۳)، ابن حبان (۱۱۱۲) اور بیہقی (۲۷۵/۵) میں مروی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ، ذَلِكَ

بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا﴾ [البقرة: ۲۷۵]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر ہاؤلا کر دیا ہوتا ہے اور اس حالت

میں ان کے جھٹلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو

حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾

[البقرة: ۲۷۸، ۲۷۹]

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی ایمان لائے ہو، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کرو (اور سود چھوڑ دو) تو تم اپنا اصل سرمایہ لینے کے حق دار ہو، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

اس آیت کریمہ میں ایسی سخت وعید ہے جو کسی اور مصیبت و نافرمانی کے ارتکاب پر وارد نہیں ہوئی۔ اسی لیے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”جو شخص اسلامی مملکت میں سود چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سے توبہ کرائے اور ہازنہ آنے کی صورت میں اس کی گردن اڑا دے۔“ [تفسیر ابن کثیر (۱/۴۴۲)، دار السلام، الطبری (۲۵۱۶)]

لیکن ہمارے ملک کی حالت اس سے بھی اتر ہے، یہاں ایک فرد ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے حکمران خود سودی نظام کو برقرار رکھنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس سودی نظام میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ نکلنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ جو ایک حکمران بھی تھے، انھوں نے سود کی حرمت کے ساتھ ہی سارا سودی نظام جو زمانہ جاہلیت سے تھا، یکسر ختم کر ڈالا۔ جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث جو آپ ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے اس آخری خطبے میں ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ كُلَّ رِبَاٍ مِنْ رَبِّا الْحَاہِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ وَ أَوَّلُ رِبَاٍ أَضَعَهُ أَبَانَا رَبِّا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ﴾

[صحیح مسلم، کتاب الحج: باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۲۱۸)، مسند احمد (۷۳/۵)، المنتقى لابن الجارود (۴۶۸)، مؤطا، کتاب البيوع (۸۳)، ابن ماجه، (۳۰۷۴)، ابو داؤد (۲۱۴۵)]

”یقیناً جاہلیت کا تمام سود چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔“

بلکہ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے ساتھ فرمایا:

﴿ لَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾ [مسند احمد (۷۳/۵)، (۲۰۶۹۵)]

”تمہارے لیے اصل سرمایہ ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

یعنی اگر اصل زر سے زیادہ وصول کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے ظلم ہوگا اور اگر تمہیں اصل زر بھی نہ دیا جائے تو یہ تم پر ظلم ہوگا۔ مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی آدمی نے سود پر لین دین کیا ہو تو اسے سود کی حرمت معلوم ہونے پر سارا معاملہ ختم کر دینا چاہیے، صرف اپنا اصل سرمایہ لینا چاہیے۔

لہذا ہماری حکومت کو جہاد کا علم تھامتے ہوئے ان یہودی بینکوں کو صرف اصل رقم جو قرض لی ہے، اسے واپس کرنا چاہیے نہ کہ اس پر سود در سود کیونکہ کسی مسلم حکمران کو ایسے سودی نظام کی حمایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے ختم کرنے کے لیے جہاد کرنا چاہیے۔ پوری قوم کو جو ایسے سودی نظام میں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ انتہائی افسوس ناک ہے اور قوم کا بھی اتنی خطیر

رقم سود اتارنے کے لیے جمع کروانا سود پر تعاون ہے جو شرعاً حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة: ۲]

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں آپس میں تعاون کرو، گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔“

معلوم ہوا کہ اس سودی کام میں تعاون کرنا گناہ ہے اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں یہودی بینکوں سے قرض جن سرمایہ داروں اور وڈیروں نے لیا ہے، حکومت کو چاہیے کہ ان خاندانوں کو پکڑے اور ان سے اصل رقم وصول کرے، غریب عوام کو اس کام میں ملوث کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

لہذا پوری قوم کو خواہ مخواہ مقرض قرار دے کر قربانی جیسی سنت جلیلہ سے محروم کرنا بھی دین اسلام کے خلاف سازش اور یہودیت کی حمایت ہے۔ ہر مسلم کو جو قربانی کرنا چاہتا ہے، اس سازش سے بچنا چاہیے اور سنت ابراہیمی کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔



عقیدہ کے مسائل

WWW.KITABOSUNNAT.COM

عقیدہ کی شرعی حیثیت

(سوال) کیا عقیدہ کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؟ بعض لوگ اسے غیر مشروع کہتے ہیں۔

(جواب) مسلمانوں کے ہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسلام نے اس کے متعلق کچھ احکامات دیے ہیں جن میں سے ایک اہم مسئلہ عقیدہ کا بھی ہے۔ عقیدہ کے متعلق صحیح احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا سرہ بن جناب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيدَتِهِ تُدْبِحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُحَلِّقُ رَأْسَهُ» [ابوداؤد، کتاب الضحاہا: باب فی العقیقة (۲۸۳۷)، ترمذی (۱۵۲۲)، بخاری (۵۴۷۲)، نسائی (۴۲۱۹)، ابن ماجہ (۳۱۶۵)، مسند احمد (۱۲۰۷/۵)، دارمی (۸۱/۲)]

”ہر لڑکا اپنے عقیدے کے ساتھ گروی ہے، اس کی طرف سے ساتویں دن زنج کیا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے۔“
گروی کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی طرف سے عقیدہ نہ کیا جائے تو وہ قیامت والے دن سفارش نہیں کرے گا۔ [تحفة

الأحوذی (۹۷/۵)]

② سیدنا سلمان بن عامر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَأَهْرِيْقُوا عَنْهُ دَمًا وَآمِيْطُوا عَنْهُ الْأَذْيَ» [بخاری، کتاب العقیقة: باب إماطة الأذى عن الصبي فی العقیقة (۵۴۷۲)، مسند احمد (۱۸/۴)، بیہقی (۲۹۸/۹)، ابوداؤد (۲۸۳۹)، ابن ماجہ (۳۱۶۴)، ابن خزیمہ (۲۰۶۷)، مسند حمیدی (۸۲۳)، دارمی (۸۱/۲)]

”ہر لڑکے کے ساتھ عقیدہ ہے پس اس کی طرف سے خون بہاؤ یعنی عقیدہ کرو اور اس سے گندگی دور کرو۔“
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہو تو اس کا عقیدہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور گندگی دور کرنے کا مطلب ہے کہ اس کا سر منڈایا جائے۔

③ ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَتَانِ وَ عَنِ الْحَارِيَةِ شَاةٌ» [ابوداؤد، کتاب الضحاہا: باب فی العقیقة (۲۸۳۴)، نسائی (۴۲۲۱)، ترمذی (۱۵۱۴)، ابن ماجہ (۳۱۶۲)، ابن حبان (۱۰۶۰)، دارمی (۸۱/۲)، مسند حمیدی (۳۴۵)، مسند احمد (۴۲۲/۶)]

”لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔“

③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُمْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ»
[ترمذی، کتاب الضحایا: باب ما جاء فی العقیقة (۱۵۱۳)، ابن ماجہ (۳۱۶۳)، مسند احمد (۳۱/۶)]
”یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں برابر ایک جیسی ذبح کی جائیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔“

⑤ حضرت ابو بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا وُلِدَ لِأَحَدِنَا غُلَامٌ ذَبَحَ شَاةً وَ لَطَخَ رَأْسَهُ بِدَمِهَا فَلَمَّا جَاءَ اللَّهُ بِالْإِسْلَامِ كُنَّا نَذْبَحُ شَاةً وَ نَحْلِقُ رَأْسَهُ وَ نَلْطِخُهُ بِزَعْفَرَانَ» [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب فی العقیقة (۲۸۴۳)، بیہقی (۳۰۲/۹)]
”زمانہ جاہلیت میں جب ہمارے ہاں کسی کے گھر لڑکا پیدا ہوتا تو وہ ایک بکری ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچے کا سر رنگتا، جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو ہم بکری ذبح کرتے اور اس کا سر موٹاتے اور اسے زعفران مل دیتے۔“

⑥ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْيَهُودَ تَعْتُقُ عَنِ الْغُلَامِ كَبْشًا وَ لَا تَعْتُقُ عَنِ الْجَارِيَةِ فَعَقُّوْا وَ اذْبَحُوا عَنِ الْغُلَامِ كَبْشَيْنِ
عَنِ الْجَارِيَةِ كَبْشًا» [بیہقی (۳۰۲/۹)، مسند بزار (۱۲۳۳)، کشف الاستار]
”یہود لڑکے کی طرف سے ایک مینڈھا ذبح کرتے اور لڑکی کا عقیقہ نہیں کرتے، لیکن تم عقیقہ کرو اور لڑکے کی طرف سے دو مینڈھے اور لڑکی کی طرف سے ایک مینڈھا ذبح کرو۔“

علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو حفص الشاعر اور اس کے باپ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔ [مجمع الزوائد (۵۸/۳)] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عقیقہ کے متعلق ایک صحیح حدیث بھی مروی ہے جس کے راویوں کو علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ نے صحیح کے راوی کہا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَأَهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَ أَمِيْطُوْا عَنْهُ الْآذَمِيْ» [مسند بزار (۱۲۳۶)، کشف الاستار]
”ہر لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے اذیت دور کرو۔“

④ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ حقوق پسند نہیں کرتا۔“ گویا کہ آپ نے یہ نام ناپسند کیا اور فرمایا:

«مَنْ وُلِدَ لَهُ وَ لَدَّ فَآحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكَ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ

شَاةٌ» [ابوداؤد، کتاب الضحایا: باب فی العقیقة (۲۸۴۲)، نسائی (۴۲۲۳)، بیہقی (۳۰۰/۹)]
 ”جس کے ہاں بچہ پیدا ہو وہ اس کی طرف سے پسند کرے تو قربانی کرے، لڑکے کی طرف سے دو برابر عمر کی بکریاں
 اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔“

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْعُقُوقَ“ (اللہ عقوق پسند نہیں کرتا) حدیث کے اس جملے میں عقیقہ کی توہین نہیں ہے اور نہ اس کے
 وجوب کو گرانا مقصود ہے صرف آپ نے نام کو ناپسند کیا ہے اور یہ پسند کیا ہے کہ اس کا اس سے بہتر کوئی نام ہو جیسے
 نیکہ یا ذبیحہ وغیرہ۔“

⑧ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

» أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنْ نَفْسِهِ بَعْدَ مَا بُعِثَ نَبِيًّا « [مسند بزار (۱۲۳۷)، كشف
 الأستار، عبد الرزاق (۷۹۶۰)، طبرانی اوسط (۵۲۹/۱)، (۹۹۸)]
 ”بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہونے کے بعد اپنی طرف سے عقیقہ کیا۔“

مسند بزار کی سند میں عبد اللہ بن الحرر ہے، جس کے متعلق امام بزار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ انتہائی کمزور ہے، اس کی وہ
 روایت لکھی جاتی ہے جو اس کے علاوہ کسی کے پاس نہ پائی جائے۔“

مجمع الزوائد میں علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اسے امام بزار اور امام طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور طبرانی کے
 راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے بیہم بن جمیل اور وہ ثقہ ہے اور طبرانی کے شیخ احمد بن مسعود الخياط المقدسی کا ترجمہ میزان میں
 نہیں ہے۔“

مجمع الزوائد کے محقق علامہ عبد اللہ محمد الدرویش فرماتے ہیں: ”احمد بن مسعود کا ترجمہ مختصر طور پر ابن عساکر کی تاریخ دمشق
 میں موجود ہے۔“ [دیکھیے: سیر اعلام النبلاء (۲۴۴/۱۳)، بغیة الرائد فی تحقیق مجمع الزوائد (۹۴/۴)]

⑨ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

» أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحُسَيْنِ وَالْحُسَيْنِ كَبْشًا كَبْشًا « [ابوداؤد،
 کتاب الضحایا: باب فی العقیقة (۲۸۴۱)، ابن الجارود (۹۱۱)، نسائی (۴۲۲۴)، عبد الرزاق
 (۳۳۰/۴)، مشکل الآثار (۴۵۷/۱)، طبرانی کبیر (۱۱۸۳۸)، بیہقی (۲۹۹/۲)، حلیۃ الأولیاء (۱۱۶/۷)]
 ”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقے میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔“

سنن نسائی کی روایت میں ہے: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کیے۔“

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح نسائی (۳۹۳۵)، إرواء الغلیل (۳۷۹/۴)]

⑩ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ بِكَبْشَيْنِ» [مجمع الزوائد (٦١٨٨)، مسند بزار (١٢٣٥)، كشف الأستار، مسند ابى يعلى (٢٩٤٥)، بيهقى (٢٩٩/٩)، المطالب العالیه (٢٢٦١)، ابن حبان (١٠٦١)، طبرانی الأوسط (١٨٩٩)، إرواء الغلیل (٣٨١/٤) اس کی سند میں فتادہ مدلس ہے۔]

”بے شک رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو مینڈھے عقیدہ کیے۔“

⑪ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ» [مسند ابى يعلى (١٩٣٣)، مجمع الزوائد (٦١٨٧)]

”بے شک رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیدہ کیا۔“

علامہ بیہقی فرماتے ہیں:

”اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن اس کی سند میں ابوالزیر مدلس ہے۔“

⑫ سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«الْعَقِيقَةُ حَقٌّ عَلَى الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَتَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ» [مجمع الزوائد (٦١٨٦)، مسند احمد (٤٥٦/٦)، طبرانی کبیر (١٨٣/٢٤)، علامہ ہیثمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے راوی قابل حجت ہیں۔]

”عقیدہ حق ہے لڑکے کی طرف سے دو برابر بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔“

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ بچے کی ولادت پر عقیدہ کرنا اسلامی احکامات کا حصہ ہے اور اس کے متعلق نبی ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ عقیدے کی مشروعیت پر ائمہ محدثین کا اتفاق ہے، صرف اس کے مسنون یا واجب ہونے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔

لہذا بعض جدید مفکرین اور نام نہاد دانش وروں نے جو اس کی مشروعیت کا انکار کیا ہے یہ اسلامی احکامات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا پھر تجاہل عارفانہ۔ بہر کیف احادیث رسول کی مشروعیت پر بالکل واضح ہیں اور اس پر امت مسلمہ کا مسلسل عمل چلا آ رہا ہے۔

عقیدہ کے لیے اونٹ اور گائے ذبح کرنا

⑬ سوال کیا عقیدہ کے لیے بکرے اور چھترے ذبح کرنا ضروری ہے، گائے یا اونٹ سے عقیدہ نہیں کیا جاسکتا؟

⑭ جواب عقیدہ کے بارے میں مسنون یہ ہے کہ بکرے، چھترے ذبح کیے جائیں، اونٹ یا گائے ذبح نہ کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گائے اور اونٹ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نبی ﷺ نے نہ اونٹ اور گائے کا عقیدہ کیا اور نہ اس

میں عقیدہ کے لیے حصہ ڈالا۔ اگر یہ چیز مشروع ہوتی تو نبی ﷺ سے اس کی ضرور رخصت مل جاتی۔ آپ ﷺ نے عقیدہ میں مینڈھے ذبح کیے۔ جیسا کہ گزشتہ مسئلہ میں مذکور صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں مجہم طبرانی کی جس روایت میں مذکور ہے کہ اونٹ اور گائے کے ساتھ بھی عقیدہ کیا جاسکتا ہے، وہ من گھڑت اور موضوع ہے۔ اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ وُلِدَ لَهُ غُلَامٌ فَلْيُعَقِّقْ مِنَ الْإِبِلِ أَوْ الْبَقَرِ أَوْ الْغَنَمِ» [طبرانی صغیر (۲۲۹)، مجمع الزوائد (۶۱۹۵)]
 ”جس کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو تو وہ اونٹ یا گائے یا بکری سے عقیدہ کرے۔“

اس روایت کی سند میں درج ذیل علل ہیں:

① امام طبرانی کے استاد ابراہیم بن احمد بن مروان الواسطی کے بارے میں امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ راوی قوی نہیں ہے۔“ [لسان المیزان (۴۱/۱)، میزان الاعتدال (۱۳۳/۱)، المغنی فی الضعفاء (۱۵/۱)، تاریخ بغداد (۵/۶)، تاریخ اسلام للذہبی (رقم الترجمة/۱۰۸)]

② عبد الملک بن معروف الخياط الواسطی غیر معروف ہے اور کتب رجال میں اس کا ترجمہ موجود نہیں۔ شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ غیر معروف ہے اور کتب رجال میں اس کا ترجمہ بھی موجود نہیں۔“ [إرواء الغلیل (۴/۳۹۴)]

③ مسعد بن السبع الباہلی کذاب راوی ہے۔ علامہ بیہمی مجمع الزوائد میں اس روایت کے بعد فرماتے ہیں: ”اس کی سند میں مسعد بن السبع ہے اور وہ کذاب ہے۔“ علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ ہلاک کرنے والا ہے۔“ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس کی تکذیب کی ہے۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ہم نے لے عرصے سے اس کی روایت کو پھاڑ دیا ہے۔“ [میزان الاعتدال (۹۸/۴)، لسان المیزان (۶/۶۹۱)]

④ حرث بن سائب التمیمی الہلالی البصری راوی مختلف فیہ ہے۔ امام ابو حاتم رازی نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں: ”یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔“ اور ساجی نے کہا: ”یہ ضعیف ہے۔“ جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صدوق یخطی۔“ بیہمی نے ثقہ کہا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے کتاب الثقات میں درج کیا ہے۔ [تحریر تقریب التہذیب (۱/۲۶۲)]

⑤ حسن بصری مدلس ہیں اور ان کی روایت معتن ہے اور مدلس راوی کے بارے میں یہ قاعدہ اصول حدیث میں موجود ہے کہ جب تک وہ اپنے استاد سے حدیث سننے کی وضاحت نہ کرے تب تک اس کی روایت صحیح نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ہم مدلس راوی سے حدیث قبول نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ اپنی حدیث میں ”حدثنی“ یا ”سمعت“ کہے۔“

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ سند ساقط ہے اور اول سے آخر تک اس میں علل قاعدہ ہیں اور سب سے قوی علت مسعد بن السبع کا کذاب ہونا ہے۔ کذاب راوی کی حدیث موضوع قرار دی جاتی ہے۔ لہذا یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے اس

سے استدلال کرنا درست نہیں اور اس روایت کا غلط ہونا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے جس میں مذکور ہے کہ عبدالرحمن بن ابی بکر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا:

«عَقِي عَنْهُ جَزُورًا فَقَالَتْ مَعَاذَ اللَّهِ وَ لَكِنْ مَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاتَانِ

مُكَافَتَانِ» [بیہقی (۳۰۱/۹)]

”اس کی طرف سے ایک اونٹ عقیدہ کر دو۔“ انھوں نے کہا: ”معاذ اللہ لیکن جو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ”دو بکریاں ایک جیسی۔“

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ [ارواء الغلیل (۴/۳۹۰)]

مذکورہ بالا دلائل سے واضح ہو گیا کہ گائے اور اونٹ عقیدہ میں ذبح نہیں کیے جائیں گے۔ عقیدہ میں مسنون بھیڑ بکریاں ذبح کرنا ہی ہیں اور ان کی قلت بھی نہیں ہے۔

عقیدہ کے موقع پر رسم مہندی

(سوال) کیا عقیدہ کے موقع پر مہندی لگانا احادیث سے ثابت ہے؟

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں عبادات و معاملات میں رسول اکرم ﷺ کا اسوہ اپنانے کا پابند بنایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا عقیدہ کیا لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کی خواتین اور دیگر صحابیات کے بارے میں کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں کہ انھوں نے مہندی، گانا بجانا، طبلے سارنگیاں وغیرہ جیسی محرمات کا ارتکاب کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک رسم ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ عقیدہ کا صحیح ثواب تب ملے گا جب اسے سنت رسول کے مطابق کیا جائے۔ حدیث نبوی ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» [مسلم، کتاب الأفضیة: باب نقض الأحكام الباطلة

ورد محدثات الأمور (۱۷۱۸)]

”جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔“

لہذا ایسا عمل کبھی اللہ کے ہاں درجہ قبولیت تک نہیں پہنچتا جو شرع کے خلاف ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بعید ہو۔



کھانے پینے کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

مسلمان کا اہل کتاب کے ساتھ کھانا

(سوال) کیا مسلمان اہل کتاب سے لے کر یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کوئی چیز کھا سکتا ہے؟

(جواب) اہل کتاب عیسائیوں اور یہودیوں سے کوئی چیز لے کر کھانا اور ان کیساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ طَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ ﴾ [المائدة: ۵]

”اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ”اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے نکاح تمہارے لیے حلال ہے۔“ اور ظاہر ہے کہ بیوی کھانا بھی پکائے گی اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا بھی جائے گا۔ البتہ ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: ”ہم اہل کتاب کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں، وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر پکاتے ہیں اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اگر تمہیں ان کے علاوہ برتن مل جائیں تو ان میں کھاؤ اور اگر ان کے علاوہ نہ ملیں تو ان کو پانی سے دھولو اور ان میں

کھاؤ۔“ [ابو داؤد، کتاب الأطعمة: باب فی استعمال آتية أهل الكتاب (۳۸۳۹)، إرواء الغلیل (۷۵/۱)] صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک عورت کا مشکیزہ لے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا: ”خود

بھی پیو اور جانوروں کو بھی پلاؤ۔“ [بخاری، کتاب التیمم: باب الصعیذ الطیب وضوء المسلم (۳۴۴)] اس حدیث پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ مشرکین کے برتنوں میں اگر نجاست نہ ہو اور اس کا یقین ہو تو ان کا استعمال جائز ہے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی غیر مسلم سے کھانے کی چیز لے کر کھانا (جس میں نجاست نہ ہونے کا یقین ہو) جائز ہے۔ البتہ ذبیحہ صرف اہل کتاب کا جائز ہے، مشرکین کا ذبیحہ جائز نہیں۔ کفار سے لی ہوئی عام اشیاء اگر ان کے پاک ہونے کا یقین نہ ہو تو انہیں کھانا جائز نہیں۔ وہ برتن ضرورت کے وقت دھونے کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں۔

لہسن کھایا جاسکتا ہے

(سوال) نبی ﷺ نے لہسن کھا کر مسجد جانے سے منع فرمایا ہے تو کیا یہ حرام ہے جبکہ بعض علماء اسے حرام قرار دیتے ہیں؟

(جواب) حدیث نبوی ﷺ ہے:

« أَنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ أَكْلِ الثُّومِ وَعَنْ لُحُومِ الْحُمْرِ

الْأَهْلِيَّةِ » [بخاری، کتاب المغازی: باب غزوة خيبر (۴۲۱۵)]

”نبی کریم ﷺ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کے گوشت اور لہسن کھانے سے منع فرمادیا۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لہسن کھانے سے روکا ہے لیکن نبی کریم ﷺ کا یہ روکنا اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ جبرائیل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور فرشتوں کو اس کی بو سے تکلیف ہوتی تھی تو نبی کریم ﷺ نے یہ پسند نہ کیا کہ میں ان کو تکلیف دوں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان بنے تو آپ اپنا بچا ہوا کھانا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو بھیج دیتے۔ ایک مرتبہ آپ نے سارا کھانا واپس کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ کھایا..... ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس میں لہسن ہے۔“ تو ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ”اے اللہ کے رسول! کیا یہ حرام ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا وَ لَكِنِّي أَكْرَهُهُ مِنْ أَجْلِ رِيحِهِ » [ترمذی، ابواب الأطعمة: باب ما جاء في كراهية أكل الثوم والبصل (۱۸۰۷)]

”نہیں، حرام نہیں بلکہ میں اس کی بو کی وجہ سے اسے ناپسند کرتا ہوں۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا:

« كُلُّوهُ فَإِنِّي لَسْتُ كَأَحَدِكُمْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ أُوذِيَ صَاحِبِي » [ترمذی، ابواب الأطعمة: باب ما جاء في الرخصة في أكل الثوم مطبوخا (۱۸۱۰)]

”تم اسے کھاؤ، میں تم جیسا نہیں ہوں (یعنی میرے پاس جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے ہیں) مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے ساتھی (یعنی جبرائیل علیہ السلام) کو تکلیف نہ پہنچا دوں۔“

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام نہیں کیا بلکہ صحابہ کو کھانے کے لیے بھی کہا اور اپنے لیے صرف اس لیے ناپسند کیا کہ اس میں بو ہے اور امت کو بھی روک دیا کہ کچا لہسن کھا کر مسجد میں نہ آئیں کیونکہ فرشتے بھی باجماعت نماز کے لیے حاضر ہوتے ہیں تو انہیں ان کی بو سے تکلیف ہوتی ہے یا نماز کے وقت سے اتنی دیر پہلے کھالے کہ نماز کے وقت تک اس کی بو جاتی رہے۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد کی حدیث میں ہے:

« مَنْ أَكَلَ مِنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرُبْنَا حَتَّى يَذْهَبَ رِيحُهَا أَوْ رِيحُهُ » [ابوداؤد، کتاب الأطعمة باب في أكل الثوم (۳۸۲۶)]

”جو اس (لہسن کے) درخت سے کھائے وہ اس وقت تک ہمارے پاس نہ آئے جب تک اس کی بو ختم نہیں ہو جاتی۔“

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَنْ أَكَلَهُمَا فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا وَ قَالَ إِنْ كُنْتُمْ لَا بُدَّ أَكَلِيهِمَا فَاَمِيْتُوْهَا طَبَخًا » [ابو داؤد،

كتاب الأطعمة: باب في أكل الثوم (۳۸۲۷)]

”جو شخص ان دونوں (یعنی لہسن اور پیاز) کو کھالے وہ ہماری مسجد کے قریب تک نہ آئے“ اور فرمایا: ”اگر تم اس کو

ضرور کھانا چاہتے ہو تو پکا کر ان کی بو ختم کر لو۔“

سیدنا علیؑ سے مروی روایت میں ہے:

« نُهِيَ عَنِ أَكْلِ الثُّومِ إِلَّا مَطْبُوعًا » [ابو داؤد، كتاب الأطعمة: باب في كراهية ذم الطعام (۳۷۶۳)]

”لہسن کھانے سے منع کیا گیا ہے سوائے پکے ہوئے کے۔“

ان تمام احادیث سے پتا چلتا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں جو ممانعت ہے وہ اس کے حرام ہونے کی وجہ سے نہیں، صرف بو کی وجہ سے ہے اور اگر پکا کر بو ختم ہو جائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں اور عام آدمی ایسے وقت میں استعمال کر سکتا ہے جب نماز کا وقت ابھی دور ہو اور نماز کے وقت تک اس کی بو ختم ہو سکتی ہو۔

برائے مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام

(سوال) کیا برائے مرغی کا گوشت حلال ہے یا حرام؟

(جواب) برائے مرغی کے گوشت کو اس وجہ سے حرام نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی خوراک خون اور مردار وغیرہ سے تیار ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے سے پہلے دو باتیں سمجھنا بہت ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حلت اور حرمت ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے ذوق اور مزاج کے ساتھ ہو۔ جسے انسانی ذوق چاہے اس کو حلال اور جسے چاہے حرام سمجھ لے بلکہ یہ آسمانی شریعت ہے جس کا خالق کائنات نے اپنے بندوں کو مکلف بنایا ہے۔ اس لیے حلال وہی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان پر حلال کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَ هَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ

الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴾ [النحل: ۱۱۶]

”اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھو یقیناً

وہ کامیاب نہیں ہوں گے جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔“

دوسری بات یہ ہے کہ حلال اور حرام عقل کے تابع نہیں اور نہ قیاسات اور مادی وسائل ہی سے ان کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ اسے مادی وسائل اور عقل کے تابع بناتے ہیں وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے گھوڑے کے گوشت کو حلال قرار دیا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے اور خچر کو

حرام قرار دیا ہے۔ یہ دونوں جانور شکل و صورت میں، کھانے پینے اور پیدائش میں ایک دوسرے کی مشابہت رکھتے ہیں البتہ شکل میں تھوڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح گھریلو گدھا اور جنگلی گدھا دونوں کو شریعت میں حرام (گدھا) کہا گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مشابہت بھی رکھتے ہیں، اس کے باوجود گھریلو گدھے کا گوشت حرام ہے اور جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے۔ اگر اہل علم اور ان اشیاء کے سپیشلسٹ گھوڑے اور جنگلی گدھے کے حلال ہونے میں اور خچر اور گھریلو گدھے کے حرام ہونے میں فرق معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ہرگز شرعی علت تک نہ پہنچ سکیں گے حالانکہ یہ اشیاء مادی اور حسی وسائل کے لحاظ سے ایک ہی چیز شمار ہوتی ہیں۔ کون ہے جو مادی لحاظ سے ان کی حلت اور حرمت کی علت بیان کر سکے؟ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حلال اور حرام آسمانی شریعت ہے، مادی، حسی اور عقلی وسائل کے تابع نہیں۔ یہ دونوں باتیں ذہن نشین کرنے کے بعد اب جواب کی طرف آئیے۔ قرآن مجید اور سنت نبوی (ﷺ) میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے برا کر مرغی کا حرام ہونا ثابت ہو سکے بلکہ حدیث سے مرغی کا حلال ہونا ثابت ہے، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُ دَجَاجًا» [صحيح بخاری، كتاب الذبائح و الصيد: باب

لحم الدجاج (۵۰۱۷)]

”میں نے نبی اکرم ﷺ کو مرغی کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا۔“

یہ حدیث صحیح مسلم، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں بھی ہے۔ امام بخاری نے اس پر باب باندھا ہے: ”باب لحم

الدجاج“ اور امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی باب باندھا ہے: ”باب ما جاء في اكل الدجاج“

نبی مکرم ﷺ تو پاکیزہ کھانا ہی کھاتے تھے اور ایسے کھانے کے قریب تک نہیں جاتے تھے جس میں کراہت ہو۔ نبی مکرم ﷺ کا مرغی کا گوشت کھانا اس کے حلال ہونے کی واضح دلیل ہے، اس کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ مرغی کے گوشت کو حرام قرار دے، صرف اس شبہ سے کہ اس کی خوراک میں حرام چیزیں استعمال ہوتی ہیں، کیونکہ حلت اور حرمت میں جانور کی غذا کا اعتبار نہیں، بلکہ شریعت کا اعتبار ہے۔ کیونکہ بعض جانور ایسے ہیں کہ جن کی خوراک پھل، سبزیاں اور حلال اشیاء ہیں اس کے باوجود وہ حرام ہیں مثلاً گیدڑ، بندر وغیرہ، ایسے جانوروں کو کھانا ہرگز حلال نہیں حالانکہ ان کی خوراک پاکیزہ ہوتی ہے مگر شریعت نے انھیں حرام قرار دیا ہے۔

اگر حرام اور حلال ہونے کی علت جانور کے کھانے (خوراک) کو تسلیم کر لیں کہ جس کی خوراک پاک اور حلال ہوگی اس کا گوشت حلال اور جس کی خوراک نجس اور حرام ہوگی اس کا گوشت حرام ہوگا تو فرض کریں کہ کوئی شخص خنزیر کے بچے کو پیدائش ہی سے گھر میں پالتا ہے اسے حلال اور پاک غذا مہیا کرتا ہے تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟ اگر اس بارے میں کوئی شخص اپنی عقل کو فیصل مانے کا تو اس کے مطابق تو حلال ہوگا کیونکہ اس نے کبھی حرام اور نجس چیز کھائی ہی نہیں اور اپنا فیصلہ اگر شریعت کی طرف لے جائے گا تو پھر یہ حرام ہوگا۔

ان تمام دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت و حرمتیں جانور کی خوراک کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہوگا۔

شبهہ کا رد:

جو لوگ برا کر مرغی کو حرام قرار دیتے ہیں وہ اسے جلالہ پر قیاس کرتے ہیں جسے نبی مکرم ﷺ نے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْلِ الْجَلَالَةِ وَالْأَبَانِيهَا » [ابو داؤد، کتاب الأَطْعَمَةِ: باب النهي عن أكل الجلالة (۳۷۸۵)، ترمذی (۱۸۲۴)، ابن ماجہ (۳۱۸۹)]
 ”نبی کریم ﷺ نے جلالہ کے کھانے سے اور ان کے دودھ سے منع کیا ہے۔“

اس حدیث سے جلالہ کی قطعی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے استعمال سے اس وقت تک روکا گیا ہے جب تک کہ اس گندی خوراک کی بدبو زائل نہ ہو جیسا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صحیح اثر سے ثابت ہے:

« إِنَّهُ كَانَ يَحْبِسُ الدَّجَاجَةَ الْجَلَالَةَ نَأْلًا » [ابن ابی شیبہ، کتاب الأَطْعَمَةِ: باب في لحوم الجلالة (۲۴۵۹۸)]

”عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جلالہ مرغی کو تین دن بند رکھتے تھے (پھر استعمال کر لیتے تھے)۔“

علامہ ناصر الدین البانی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۵۱/۸، ۲۵۰۰)]

یہ صرف اس لیے کرتے تھے تاکہ اس کا پیٹ صاف ہو جائے اور گندگی کی بو اس کے گوشت سے جاتی رہے۔

اگر جلالہ کی حرمت گوشت کی نجاست کی وجہ سے ہوتی تو وہ گوشت جس نے حرام پر نشوونما پائی ہے کسی بھی حال میں پاک نہ ہوتا۔ جیسا کہ ابن قدامہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

”وَلَوْ نَحَسَّتِ الْجَلَالَةُ لَمَا طَهَّرْتُ بِالْحَبْسِ“ [المغنی (۴۱/۹)]

”اگر جلالہ نجس ہوتی تو دو تین دن بند کرنے سے بھی پاک نہ ہوتی۔“

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس صحیح اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ جلالہ کی حرمت اس کے گوشت کا نجس اور پلید ہونا نہیں بلکہ علت اس کے گوشت سے گندگی کی بدبو وغیرہ کا آنا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَالْمُعْتَبَرُ فِي جَوَازِ أَكْلِ الْجَلَالَةِ زَوَالُ رَائِحَةِ النَّحَاسَةِ إِنْ تَعَلَّفَ بِالشَّيْءِ الطَّاهِرِ عَلَى الصَّبْحِ“ [فتح الباری (۵۶۵/۹)]

”جلالہ کا کھانے کے لائق ہونے میں معتبر چیز نجاست وغیرہ کی بدبو کا زائل ہونا ہے۔ یعنی جب بدبو زائل ہو جائے تو اس کا کھانا درست ہے۔“

علامہ صنعانی رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے ہیں:

”قِيلَ بَلِ الْإِعْتِبَارُ بِالرَّائِحَةِ وَالتَّنِينِ“

”جلالہ کے حلال ہونے میں بدبو کے زائل ہونے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔“ [سبل السلام (۷۷/۳)]

جلالہ کے بارے میں اہل لغت کے اقوال جان لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اکثر اہل لغت نے لکھا ہے:

”الْحَلَالَةُ هِيَ الْبَقْرَةُ الَّتِي تَتَّبِعُ النَّحَّاسَاتِ“

”جلالہ وہ گائے ہے جو نحاسات کو تلاش کرتی ہے۔“ [لسان العرب (۳۳۶/۲)، الصحاح للجوهري (۱۶۵۸/۴)،

القاموس المحيط (۵۹۱/۱)]

ابن منظور الافریقی لکھتے ہیں:

”وَالْحَلَالَةُ مِنَ الْحَيَوَانَاتِ الَّتِي تَأْكُلُ الْحِلَّةَ الْعُدْرَةَ“ [لسان العرب (۳۳۶/۲)]

”جلالہ وہ حیوان ہے جو انسان کا پاخانہ وغیرہ کھاتا ہے۔“

اس قول کے مطابق براہِ مرفی جس کو لوگ حرام قرار دیتے ہیں، جلالہ بنتی ہی نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کا پاخانہ نہیں کھاتی۔ لہذا اسے جلالہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں جلالہ کی علت نہیں پائی جاتی اور جب علت نہ رہی تو جلالہ والا حکم بھی اس پر نہیں لگ سکتا۔ لہذا براہِ مرفی جس کی غذا حلال اور حرام چیزوں کے مرکبات سے تیار ہوتی ہے وہ حلال ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کی غذا کا اعتبار نہیں بلکہ شریعت کا اعتبار ہے۔ آخر میں یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہے کہ مرفی کی خوراک میں جو خون، مردار اور دوسری حرام اشیاء ڈالی جاتی ہیں اگرچہ یہ انسانوں کے لیے حرام ہیں لیکن جانوروں کے لیے حرام نہیں کیونکہ وہ تو مکلف ہی نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے انسانوں کے لیے جن اشیاء کا کھانا حرام قرار دیا ہے ان کی خرید و فروخت بھی (چند ایک جانور چھوڑ کر) حرام قرار دی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ - ثَلَاثًا - إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيْهِمُ الشُّحُومَ فَبَاعُوهَا وَ أَكَلُوا أَثْمَانَهَا وَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى إِذَا حَرَّمَ عَلَى قَوْمٍ أَكَلُ شَيْءٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ»

”اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے۔“ آپ ﷺ نے یہ کلمات تین مرتبہ دہرائے پھر کہا: ”اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کا کھانا حرام کر دیا تو انھوں نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت استعمال کرنا شروع کر دی اور یقیناً اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کسی چیز کا کھانا حرام کر دیتا ہے تو اس کی قیمت (خرید و فروخت) بھی ان پر حرام کر دیتا ہے۔“ [سنن ابی داؤد،

کتاب البیوع: باب فی ثمن الخمر والمیتة (۳۴۸۸)، مسند احمد (۲۴۷/۱)]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ الْحُمْرَ وَ كَمَنَهَا وَ حَرَّمَ الْمَيْتَةَ وَ كَمَنَهَا وَ حَرَّمَ الْحِنْزِيرَ وَ كَمَنَهُ» [ابو داؤد، کتاب

البیوع: باب فی ثمن الخمر والمیتة (۳۴۸۵)]

”بے شک اللہ نے شراب، مردار اور خنزیر کو حرام قرار دیا ہے اور ان کی قیمتیں بھی حرام کی ہیں۔“

رسول کریم ﷺ کے ان فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا کھانا انسان کے لیے حرام ہے، ان کی خرید و فروخت کرنا بھی حرام ہے (سوائے چند جانوروں کے جیسے کہ گھریلو گدھا ہے)۔ ایسا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہے اور حرام کھائی کھانے اور جمع کرنے میں معروف ہے۔

ہمارے ان بھائیوں کو چاہیے کہ وہ مرنے کی خوراک تیار کرنے میں حرام اشیاء کی خرید و فروخت سے اجتناب کریں، خوراک میں مردار اور خون ڈالنے کی بجائے مچھلی کا چورا ڈال لیں۔ جب حلال چیز کی خرید و فروخت میں کفایہ ہے تو پھر حرام کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو قرآن و سنت پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟

سوال کیا گھوڑا اور جنگلی گدھا حلال ہے؟

جواب گھوڑا حلال ہے، اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

« أَأَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ وَ أَذِنَ فِي لُحُومِ الْحَيْلِ » [مسلم، كتاب الصيد والذبائح: باب إباحة أكل لحم الحيل (۱۹۴۱)، بعاری، كتاب المغازی: باب غزوة خيبر (۴۲۱۹)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گدھوں کے گوشت کے بارے میں منع کیا اور گھوڑے کے گوشت کی اجازت دی۔“
حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« أَكَلْنَا لَحْمَ فَرَسٍ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » [مسند احمد (۳۴۶/۶)، (۲۶۹۳۰)، مسلم (۱۹۴۲)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم نے گھوڑے کا گوشت کھایا۔“

مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے مروی ہے کہ عطاء بن ابی رباح سے ابن جریج نے گھوڑے کے گوشت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا:

”لَمْ يَزَلْ سَأَلُكَ يَا كُنُوزُ قُلْتُ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نَعَمْ“

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگ ہمیشہ اس کو کھاتے رہے ہیں۔ میں نے کہا: ”کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام؟“ تو انھوں نے کہا: ”ہاں۔“ [مصنف ابن ابی شیبہ (۲۵۰/۱۸)]

امام صلاح الدین خلیل بن یکلدی الحلای نے اپنی کتاب ”توفیة الکیل لمن حرم لحوم الحیل“ میں لکھا ہے:

”جمہور سلف و خلف ائمہ محدثین سوید بن غفلہ، علقمہ بن اسود، اصحاب عبد اللہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، شریح، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابن شہاب زہری، حماد بن ابی سلیمان، امام شافعی، احمد بن حنبل، قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن العیسانی، اسحاق بن راہویہ، داؤد ظاہری، عبد اللہ بن مبارک اور جمہور اہل حدیث کے نزدیک گھوڑا حلال ہے۔ اس کی حلت میں کوئی شک و شبہ نہیں صرف امام ابو حنیفہ اور بعض مالکیوں نے اسے حرام یا مکروہ کہا تھا۔“

ہمارے ملک میں چونکہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو امام ابو حنیفہ کے مقلد ہیں اور ان کے ہاں گھوڑا حرام سمجھا جاتا

ہے۔ اس لیے جب اس کی حلت کی بات کی جاتی ہے تو اسے بڑا عجیب سمجھا جاتا ہے اور لوگ مختلف انداز سے اس کے متعلق سوال کرتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں کئی حرام اشیاء مثلاً سود، شراب، جوا اور غیر اللہ کے نام پر دی ہوئی اشیاء وغیرہ لوگ سرعام استعمال کرتے ہیں اور ان پر کبھی اتنے سوال نہیں اٹھائے جاتے صرف اس لیے کہ یہ چیزیں لوگوں کی ہڈیوں میں رچ چکی ہیں اور جوئی کسی ایسی چیز کی حلت کے متعلق سوال ہو جو ان کے ہاں غیر معروف ہو تو بلا سوچے سمجھے اس پر حرمت کا فتویٰ جڑ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے ابو یوسف اور امام محمد اس کی حلت کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام طحاوی حنفی کا قول ہے۔ ”فتح الباری (۵۶۰/۹)“ اور فقہ حنفی کی معروف کتاب ”مدیۃ المصلیٰ (اردو)“ میں جوٹھے پانی کے بیان میں لکھا ہے: ”امام ابوحنیفہ کی گھوڑے کے جھوٹے پانی میں چار روایات ہیں: ایک میں نجس، ایک میں مہلک، ایک میں مکروہ اور ایک میں پاک ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک پاک ہے اس واسطے کہ اس کا گوشت حلال ہے۔“ کنز الدقائق (فارسی)، مترجم ملا نصیر الدین کرمانی میں ہے کہ اسی طرح ایک حدیث میں ہے:

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُحُومِ الْحُمْرِ وَالْخَيْلِ وَالْبِغَالِ »
 ”نبی کریم ﷺ نے گدھے، گھوڑے اور فخر کے گوشت سے منع کیا۔“

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، اس میں عکرمہ بن عمار یحییٰ بن ابی کثیر سے بیان کرتا ہے، جب عکرمہ بن عمار یحییٰ سے بیان کرے تو حدیث ضعیف ہوتی ہے۔

⊗ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں:

”أَحَادِيثُهُ عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ ضَعِيفٌ“
 ”اس کی حدیثیں یحییٰ بن ابی کثیر سے ضعیف ہیں۔“

⊗ امام بخاری کہتے ہیں:

”حَدِيثُهُ عَنْ يَحْيَى مُضْطَرِبٌ“
 ”یحییٰ سے اس کی حدیث مضطرب ہے۔“

⊗ امام نسائی کہتے ہیں:

”لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ إِلَّا فِي يَحْيَى“

”سوائے یحییٰ کے اس میں کوئی حرج نہیں۔“

اسی طرح گھوڑے کے گوشت کی حرمت میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بھی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، لیکن وہ حدیث بھی شاذ اور منکر ہے۔ پھر اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ خیبر میں شریک ہوئے حالانکہ وہ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

جنگلی گدھے کے بارے میں بھی صحیح بخاری شریف میں حدیث ہے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ہم نبی کریم ﷺ کے

ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ہم میں احرام پہنے ہوئے اور کچھ بغیر احرام کے تھے..... میں نے ایک جنگلی گدھا شکار کیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس لے آیا:

« فَقَالَ بَعْضُهُمْ كُلُّوْا وَ قَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَأْكُلُوْا فَاتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ أَمَامَنَا فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ كُلُّوْهُ حَلَالٌ » [بخاری، کتاب جزاء الصيد: باب لا يعين المحرم الحلال فى قتل الصيد (۱۸۲۳)]

”تو بعض نے کہا کھا لو اور بعض نے کہا نہ کھاؤ۔ میں نبی کریم (ﷺ) کے پاس آیا جو ہم سے آگے تھے اور پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو کھا لو، یہ حلال ہے۔“
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام طحاوی حنفی کا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

” قَالَ الطَّحَاوِيُّ وَ قَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى حِلِّ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ “ [فتح الباری (۶۵۶/۱)]
” علماء کا جنگلی گدھے کے حلال ہونے پر اجماع ہے۔“

یہ بھی یاد رہے کہ جنگلی گدھا ایک اور جانور ہے، نام میں اشتراک کی وجہ سے اسے گھریلو گدھا نہ سمجھا جائے۔ ابو یوسف، محمد اور امام شافعی کے نزدیک گھوڑے کے گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

مولوی ثناء اللہ امرتسری پانی پتی حنفی نے اپنی کتاب ”مَا لَا بُدَّ مِنْهُ (۱۱۰)“ میں لکھا ہے: ”اسپ حلال است“ یعنی گھوڑا حلال ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی بھی دہلی زبان میں گھوڑے کی حلت کا اقرار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

” گھوڑی کا کھانا جائز ہے لیکن بہترین نہیں۔“ [بہشتی زبور (۵۶/۳)]

بلکہ خود امام ابو حنیفہ نے اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور گھوڑے کی حلت کے قائل ہو گئے تھے۔ علامہ آلوسی حنفی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے:

” إِنَّهُ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى “

” امام ابو حنیفہ نے اپنی وفات سے تین دن قبل گھوڑے کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا اور اسی قول پر فتویٰ ہے۔“
اسی طرح جامع الرموز میں ہے:

” إِنَّهُ رَجَعَ عَنْ حُرْمَتِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ عَنْ حُرْمَةِ لَحْمِهِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى “ [جامع الرموز، کتاب الذبائح (۳۵۰/۳)]

” امام ابو حنیفہ نے اپنی وفات سے تین دن قبل گھوڑے کی حرمت سے یعنی اس کے گوشت کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا اور اس پر فتویٰ ہے۔“

آخر میں چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی آیت: ﴿ وَ الْخَيْلِ وَ الْبَعَالِ وَ الْحَمِيرِ لَتَرْكُبُوَهَا وَ زِينَةً ﴾ کہ ”گھوڑے، خچر اور گدھوں کو سواری کے لیے زینت بنایا ہے“ اس سے گھوڑے کی حرمت پر استدلال

کرتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہ آیت بالاتفاق کمی ہے اور گھوڑے کی حلت کا حکم مدنی ہے، ہجرت سے تقریباً ۶ سال بعد۔ اگر نبی کریم اس آیت سے گھوڑے کی حرمت سمجھتے تو اس کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ پھر یہ آیت گھوڑے کی حرمت میں نص بھی نہیں اور حدیث میں اس کی حلت کی صراحت موجود ہے۔

نوٹ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے سابقہ موقف سے رجوع رد المحتار، کتاب الذبائح (۴۳۲/۹)، طبع بیروت میں بھی موجود ہے۔

کھانے میں مکھی کا گرنا

(سوال) اگر کھانے میں مکھی گر جائے تو کیا کیا جائے؟

(جواب) اگر کسی آدمی کے کھانے میں مکھی گر کر مر جائے یا ابھی زندہ ہی ہو تو وہ اسے ایک دفعہ ڈبو کر نکال دے اور کھانا کھالے، اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابٍ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي إِحْلَائِهِ جَنَاحِيَهُ دَاءٌ وَ فِي الْأُنْحُرَى شِفَاءٌ » [بخاری، کتاب بدء الخلق: باب اذا وقع الذباب في شراب احدكم..... الخ (۴۳۲۰)]

”جب کسی آدمی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو وہ اسے ڈبو کر نکال دے کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔“

لہذا اگر کسی آدمی کے کھانے یا پینے والی اشیاء میں مکھی گر جائے یا اس کی مثل کوئی اور چیز گرے تو اس کو نکال کر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔



جہاد کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

جہاد کے لیے والدین کی اجازت

سوال جہاد میں شریک ہونے کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت کے متعلق دو طرح کی احادیث موجود ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں:

”ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہتا تھا تو آپ ﷺ

نے فرمایا: ”کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر انھیں میں جہاد کرو۔“

[صحیح بخاری، کتاب الجہاد: باب الجہاد باذن الأبوين (۳۰۰۴)]

اس طرح عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہی سے ایک روایت میں ہے کہتے ہیں:

”ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اس نے پوچھا: ”سب سے افضل عمل کون سا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نماز

ادا کرنا۔“ اس نے کہا: ”پھر کون سا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جہاد کرنا۔“ تو اس نے کہا: ”میرے والدین ہیں۔“ آپ ﷺ

نے فرمایا: ”میں تجھے والدین کے ساتھ خیر کا حکم دیتا ہوں۔“ اس نے کہا:

« وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَأَجَاهِدَنَّ وَلَا تَرَكْنَهُمَا قَالًا فَأَنْتَ أَعْلَمُ » [ابن حبان: (۱/۴)]

”اس ہستی کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا! میں ضرور جہاد کروں گا اور انھیں ضرور چھوڑ کر جاؤں گا۔“ آپ

نے فرمایا: ”پھر تو بہتر جانتا ہے۔“

اہل علم نے ان دونوں احادیث کے متعلق دو قسم کی توجیہات بیان کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہما یہ حدیث نقل کرنے

کے بعد فرماتے ہیں:

”دونوں احادیث میں موافقت کرتے ہوئے یہ صورت نکلتی ہے کہ یہ فرض عین جہاد پر محمول ہے۔ یعنی جب جہاد فرض

عین ہو تو والدین کی اجازت ضروری نہیں۔“ [فتح الباری: (۱/۶)]

دوسری توجیہ یہ ہے کہ والدین کی اجازت والے مسئلہ کو امام یا شرع کے مکلف آدمی کے سپرد کر دیا جائے، اب دونوں

صورتوں میں مصلحت جس کا تقاضا کرے اسے مقدم کرنا واجب ہے۔ انصار و مہاجرین جہاد کرتے تھے اور ہم نے ذخیرہ احادیث

میں سے کسی بھی حدیث میں نہیں دیکھا کہ وہ ہر غزوے میں والدین کی اجازت کا التزام کرتے ہوں۔ [کتاب الروضة الندية:

(۳۳۳/۲)، جدید محقق: (۲/۷۱۹)]

ہمارے نزدیک یہ دوسری توجیہ زیادہ ذہنی ہے، اس لیے کہ دونوں احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرام نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے اپنے امام اور قائد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے ان کا فیصلہ کیا اور ابن حبان کی صحیح حدیث کے مطابق بات یہ ہے کہ جب مجاہد صحابی نے والدین کو چھوڑ کر جہاد میں جانے کا عزم کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ڈانٹا یا منع نہیں کیا بلکہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا اور فرمایا: ”تو اپنی حالت کو بہتر جانتا ہے۔“ اس لیے اگر کوئی شرع کا مکلف آدمی اپنے گھریلو حالات کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لے کہ وہ جہاد پر جانا چاہتا ہے تو والدین کی اجازت کے بغیر بھی جاسکتا ہے۔

قرآن و حدیث میں فی سبیل اللہ سے مراد

سوال قرآن میں یا حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ آیا ہے، کیا اس سے مراد صرف جہاد ہے یا کوئی اور عمل بھی ہے؟

جواب قرآن و سنت میں فی سبیل اللہ کا لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اکثر مقامات پر جہاد مراد ہے اور مسلمان کا ہر نیک عمل بھی فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مصارفِ زکوٰۃ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبہ ۶۰]

”صدقات صرف فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ اور جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو اور غلام آزاد کرنے، مقروض اور فی سبیل اللہ اور مسافروں کے لیے ہیں، اللہ کی طرف سے فریضہ ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔“

اس آیت کریمہ میں آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف ”فی سبیل اللہ“ ہے، اس سے مراد جہاد ہے۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَأَمَّا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْهُمْ الْمُغْرَاةُ الَّذِينَ لَا حَقَّ لَهُمْ فِي الدِّيْوَانِ“ (المصباح المنير فی تہذیب تفسیر ابن کثیر (ص ۵۷۶/۷) ”فی سبیل اللہ سے مراد وہ مجاہدین ہیں جن کا وظیفہ خواروں کے رجسٹر میں کوئی حق نہیں۔“

اسی طرح قرآن حکیم میں بیشتر مقامات پر فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا گیا ہے۔ اب ایک حدیث ذکر کرتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن آدمی کا ہر نیک عمل فی سبیل اللہ شمار ہوتا ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ رَجُلًا مَرَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَى أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ مِنْ جِلْدِهِ وَنَشَاطِهِ مَا أَعْجَبَهُمْ فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! لَوْ كَانَ هَذَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَبِي نَبِيٍّ كَبِيرِينَ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَإِنْ كَانَ يَسْعَى عَلَى نَفْسِهِ لِيُعْفِقَهَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَإِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلَى أَهْلِهِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَإِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى رِيَاءً

وَمُفَاخَرَةً فَهَوَّ فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ» [طبرانی کبیر (۱۹/۱۲۹)، طبرانی صغیر (۲/۶۰)، اس حدیث کو شیخ البانی نے شواہد کی بنا پر صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح الترغیب والترہیب (۲/۳۰۶) (۱۶۹۲)، (۲/۴۲۴) (۱۹۵۹)]

”ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی قوت اور چستی دیکھی جس نے انہیں درط حیرت میں ڈال دیا، کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! کاش کہ یہ اللہ کی راہ میں ہوتا۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنے نکلا ہے تو یہ نبی سبیل اللہ ہے اور اگر یہ اپنے بوڑھے عمر رسیدہ والدین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کی غرض سے نکلا ہے تو پھر بھی نبی سبیل اللہ ہے اور اگر یہ اپنے نفس کی خاطر دوڑ رہا ہے کہ اسے پاک صاف رکھے تو پھر بھی نبی سبیل اللہ ہے اور اگر اپنے اہل کے لیے دوڑ رہا ہے تو پھر بھی نبی سبیل اللہ ہے اور اگر ریاکاری اور مفاخرت کے لیے دوڑ رہا ہے تو پھر شیطان کی راہ میں ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین، اولاد، اہل و عیال اور اپنے نفس کو سنوارنے کی خاطر دوڑ دھوپ کرنا بھی نبی سبیل اللہ ہے۔ لہذا نبی سبیل اللہ میں جہاد بھی ہے اور یہ امور خیر بھی لیکن یاد رہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کثیرہ میں نبی سبیل اللہ جہاد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ابوعمس عبدالرحمان بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

«مَنْ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَرَمَهُ اللَّهُ عَلَى النَّارِ» [بخاری، کتاب الجمعة: باب المشى إلى الجمعة (۹۰۷، ۲۸۱۰)]

”جس کے قدم نبی سبیل اللہ غبار آلود ہوئے اس کو اللہ نے آگ پر حرام کر دیا۔“

یہ حدیث امام بخاری کتاب الجمعة: باب المشى إلى الجمعة اور کتاب الجہاد میں باب من اغبرت قدماه فی سبیل اللہ میں لائے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف چل کر جانا اور جہاد کے لیے نکلنا دونوں عمل نبی سبیل اللہ ہیں۔ (واللہ اعلم!)

جہاد کشمیر کی شرعی حیثیت

سوال کیا کشمیر کا جہاد شرعی جہاد ہے یا محض ایک علاقائی اور خطے کے حصول کی لڑائی؟ مہربانی فرما کر واضح کر دیں؟

جواب اسلام غلبہ چاہتا ہے اور غلبہ اسلام کا طریقہ کار اللہ تعالیٰ نے جہاد نبی سبیل اللہ بتایا ہے۔ جب تک مسلمان جہاد کرتے رہے ہمیشہ غالب و حکمران رہے، عزت و شرف ان کے قدم چومتے رہے اور جب مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کے جو مقاصد بیان کیے ہیں ان میں سے اہم ترین مقصد یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ چہار داغ عالم بلند ہو جائے، باطل ادیان مٹ جائیں، مشرکین کی بالادستی کا خاتمہ ہو جائے اور اس وقت تک یہ جہاد جاری رہے جب تک لوگ کلمہ پڑھ کر نماز و زکوٰۃ کو نہ اپنالیں یا پھر ذلیل ہو کر جزیہ ادا کرنا نہ شروع کر دیں۔

ہندوستان کا ہندو دنیا کا بدترین مشرک ہے۔ یہ بت پرست مشرک مشرکین مکہ سے بھی آگے ہے۔ کروڑوں ان کے معبود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہندوستان سے جہاد کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جہاد کا ایک اہم مقصد مشرک کو ختم کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ﴾ [الانفال: ۳۹]

”ان (کافروں) سے لڑو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور پورے کا پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے۔“

نیز جہاد مظلوموں کی مدد کرنے اور کافروں سے مقبوضہ علاقوں کو چھڑانے کے لیے بھی ضروری ہے۔ کافروں کے حملہ کی صورت میں مدافعتانہ قتال، معاہدہ کر کے توڑنے والوں کو سزا دینا، اپنے مقتولین کا بدلہ لینا، یہ سب اسباب جہاد کو فرض کر دیتے ہیں۔ یہ سب صورتیں مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوؤں سے جہاد کیا جائے۔ مسلمانوں کے علاقوں پر ان کا قبضہ ہے۔ شرعی لحاظ سے انھیں کافروں کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جہاد کرنا فرض ہے۔ مقبوضہ کشمیر، حیدرآباد دکن، جونا گڑھ وغیرہ مسلمان ریاستوں پر ہندوؤں نے جبراً قبضہ کیا ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۹۱]

”انھیں قتل کرو جہاں بھی تم انھیں پاؤ اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے۔“

اپنے علاقے واپس لینے کے لیے لڑنے والے طاقت کے ساتھیوں نے کہا تھا:

﴿ وَ مَا لَنَا أَنْ لَا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ أَبْنَانِنَا ﴾ [البقرة: ۲۴۶]

”اور ہم اللہ کے راستے میں کیوں نہ لڑائی کریں اور بلاشبہ ہمیں اپنے ملک اور بچوں سے نکال دیا گیا ہے۔“

مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا قتل، عورتوں کی عصمت دری، املاک، کھیتوں، دکانوں کا جلایا جانا اور ہزاروں افراد کا ہجرت پر مجبور کر دیا جانا، یہ سب حالات بھی جہاد کو فرض کر دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ

يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ

لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴾ [النساء: ۷۵]

”اور تم اللہ کے راستے میں کیوں لڑائی نہیں کرتے حالانکہ ضعیف مرد، عورتیں اور بچے کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس

بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور تو اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی دوست اور مددگار بنا۔“

ہندوؤں نے کشمیر میں استصواب رائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی جان و مال اور مساجد کی حفاظت کے معاہدے کیے

تھے اور اب تمام معاہدے توڑ دیے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوؤں سے جہاد کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ إِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ

لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿ [التوبة: ۱۲]

”اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو تم کفر کے اماموں سے لڑو۔ بے شک ان کا کوئی عہد نہیں تاکہ وہ باز آجائیں۔“

سات آٹھ لاکھ ہندو فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لیے کشمیر آئی ہے، ان سے لڑنا مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۹۰]

”اور اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔“

قرآن مجید اور صحیح احادیث کی نمنوں سے کشمیر کے موجودہ جہاد کی شرعی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان حالات میں کشمیر بلکہ ہندوستان کے اندر بھی ہندو سے جہاد کرنا فرض ہے اور یہ شریعت کا تقاضا ہے۔ جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ کی بحث ہمارے نزدیک اتنی اہم نہیں ہے کہ اس پر ساری توانائیاں صرف کر دی جائیں اور نہ ان میں تعارض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عملاً قتال میں حصہ لینا ہر فرد کے لیے ممکن نہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جہاد کے لیے جسمانی، عسکری اور دینی تربیت ضروری ہے اور پھر ہر فرد کا مقبوضہ کشمیر پہنچنا بھی مشکل ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کو نماز روزہ کی طرح فرض عین قرار دینا صحیح نہ ہوگا لیکن جہاد ایک وسیع عمل ہے۔ جہاد کی ترغیب اس کے لیے مالی وسائل مہیا کرنا، مجاہدین کی ٹریننگ، اسلحہ کی فراہمی، مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر کی دیکھ بھال کرنا، احادیث میں اسے بھی جہاد قرار دیا گیا ہے پھر کم از کم جہاد کے لیے دلی ارادہ اور عزم بھی جہاد کا حصہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ مَاتَ وَ لَمْ يَغْزُ وَ لَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهُ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ » [مسلم، کتاب الامارۃ

باب ذم من مات و لم یغزو و لم یحدث بنفسه بالغزو (۱۹۱۰)]

”جو مر گیا نہ اس نے جہاد کیا اور نہ اس نے جہاد کا ارادہ ہی کیا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔“

اس حدیث کے تحت مشکوٰۃ کے حاشیہ میں لکھا ہے: ”ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ جہاد کو مضبوط کرے اور اس میں فرض عین کی دلیل ہے۔“ [حاشیہ مشکوٰۃ (ص ۳۳۱)]

فرض عین اور فرض کفایہ کے بارے میں ہمارے پیش نظر مزید اصولی مباحث ہیں تاہم انھیں قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔ اس وقت مسلمان حکمرانوں پر کافروں کا تسلط ہے۔ وہ کھل کر نہ جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں اور نہ اس کی ترغیب اور تائید کر سکتے ہیں۔ اس لیے معروضی حالات کا تقاضا ہے کہ جہاد میں ہر مسلمان اپنی اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لے۔ علمائے کرام جہاد کی ترغیب و تحریش اور اس پر شکوک و شبہات کے ازالے میں اپنا حصہ ڈالیں، تاجر حضرات مالی تعاون کریں، دانشور اور صحافی کافروں کے پروپیگنڈے کا جواب دیں۔ وہ جہاد کو دہشت گردی کے نام سے بدنام کرتے ہیں۔ زندگی کے تمام طبقات میں جہاد کے لیے بیداری اور تائید ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ جہاد کی مخالفت اور اس میں شکوک و شبہات سے جہاد

کمزور یا ختم ہو جائے۔ اگر اللہ نہ کرے ایسا ہوا تو مسلمان موجودہ ذلت سے بھی بدتر ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گریں گے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ جہاد شروع ہوا ہے تو اس کو آگے بڑھنا چاہیے۔ مسلمان حکمرانوں کو کھلمی سے نکالنے کے لیے بھی جہاد کا قوت پکڑنا ضروری ہے۔ اسی راستے سے آزادیاں نصیب ہوں گی اور ایک اللہ کی غلامی کا اعزاز میسر آئے گا۔ ان شاء اللہ (حافظ احمد اللہ ﷺ)

ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت

سوال ہندوستان کے خلاف جہاد کی فضیلت میں جو حدیث وارد ہوئی ہے کیا وہ صحیح ہے؟

جواب یہ حدیث سند سمیت مندرجہ ذیل ہے:

« أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحِيمِ قَالَ حَدَّثَنَا أَسَدُ بْنُ مُوسَى قَالَ حَدَّثَنَا بَقِيَّةٌ قَالَ حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرِ الزُّبَيْدِيُّ عَنْ أَخِيهِ مُحَمَّدُ بْنُ الْوَلِيدِ عَنْ لُقْمَانَ بْنِ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ الْأَعْلَى بْنِ عَدِيٍّ الْبَهْرَانِيِّ عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِي حَرَّرَهُمَا اللَّهُ مِنَ النَّارِ عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَعِصَابَةٌ تَكُونُ مَعَ عَيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ » [نسائی، کتاب الجہاد: باب غزوة الهند (۳۱۷۷)]

”حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے (جہنم کی) آگ سے آزاد کر دیا ہے۔ ایک گروہ جو ہندوستان کے خلاف جہاد کرے گا اور دوسرا گروہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر دجال کے خلاف لڑے گا۔“

اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ و صدوق ہیں سوائے ابوبکر الزبیدی کے۔ اسے حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے مجہول الحال قرار دیا ہے۔ [تقریب التہذیب (ص ۳۹۷)]

یعنی اس کے حالات معلوم نہیں لیکن محمد بن ولید اس کا استاد، اس سے اس کے علاوہ عبد اللہ بن سالم بھی یہ حدیث بیان کرتے ہیں جیسا کہ مسند احمد (۲۷۸/۵) میں موجود ہے۔ عبد اللہ بن سالم کو امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے اکاشف (۵۵۵/۱) میں صدوق قرار دیا ہے اور اسی طرح حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے تقریب التہذیب میں نقل کیا ہے۔ لہذا اس سند میں ابوبکر الزبیدی کا مجہول الحال ہونا مضرت نہیں کیونکہ عبد اللہ نے اس کی متابعت کی ہے۔ اس لیے یہ روایت صحیح ہے۔

علامہ ناصر الدین البانی رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح الجامع الصغیر (۷۴۲/۲)، السلسلہ

الصحيحة (۱۹۳۴)]

لہذا ثابت ہوا کہ معترضین کا اس حدیث کی سند پر اعتراض درست نہیں ہے۔

کیا طالبان کسی غیر مسلم ملک سے مدد لیتے ہیں؟

سوال کیا میدان جہاد میں کفار و مشرکین سے مدد لینا جائز ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں ایک مشرک آپ کی مدد کے لیے آیا تو آپ نے فرمایا: «إِرْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ» «لوٹ جاؤ میں مشرک سے ہرگز مدد نہیں لوں گا۔» تو کیا واقعی یہ درست ہے کہ کفار و مشرکین سے تعاون لینا درست نہیں؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب کبار محدثین رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمان جب کفار کی طرف سے مطمئن نہ ہوں اور یہ ڈر لاحق ہو کہ یہ لوگ ہمارے دشمنوں کے لیے ہمارے راز فاش کر دیں گے اور ہماری قوت کو کمزور کر دیں گے تو ایسی صورت میں کفار و مشرکین سے مدد نہیں لی جائے گی۔ کیونکہ ایسی حالت میں استعانت مقصود و مطلوب کی نقیض ہوگی۔ ایسے کفار جن پر اعتماد نہ ہو انھیں بالخصوص لشکروں کی تیاری میں، خندقیں اور سرنگیں کھودنے میں، قلعے اور بکتر تعمیر کرنے میں، راستوں کی ہمواری اور اصلاح آلات و حرب میں ساتھ ملانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ البتہ اگر کسی کافر و مشرک پر اعتماد ہو اور وہ جنگ میں ہمارا حلیف ہو اور دوسرے کفار کے خلاف اور نصرت اسلام کے لیے اس کی مدد کی حاجت ہو تو اس وقت اس سے تعاون لینا راجح موقف کی رو سے درست ہے۔ یہ تعاون خواہ آلات حرب کی صورت میں ہو یا مال و متاع کی شکل میں، افرادی قوت ہو یا راستے کے لیے گائیڈز ہوں اس میں کوئی قباحت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد بہت سے مواقع پر کفار سے کروائی ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں سے بعض واقعات درج ذیل ہے جن میں کفار سے حسب ضرورت تعاون لیا گیا ہے:

① جب قریش نے رسول اللہ ﷺ کا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھا اور محسوس کیا کہ لوگ روز بروز محمد ﷺ کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں تو انہوں نے آپ کا بائیکاٹ کیا اور آپ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ اس وقت بنو ہاشم اور بنو المطلب نے آپ کا ساتھ دیا اور آپ کی حمایت و نصرت میں وہ بھی شعب ابی طالب میں آپ کے ساتھ تھے۔ [زاد المعاد: (۳۰/۱۳)، سیرۃ ابن ہشام (۱۷۵/۱)، السیرۃ لابن کثیر (۳۴/۲)]

نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ بنو ہاشم اور بنو المطلب تم چلے جاؤ مجھے تمہاری حمایت و نصرت کی کوئی حاجت نہیں۔

② پھر جب شعب ابی طالب کا حصار ختم ہوا، ابو طالب اور آپ ﷺ کی اہلیہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں تو رسول اللہ ﷺ پر اپنی قوم کے بے وقوف لوگوں کی جانب سے آفات و بلیات کی شدت ہوئی اور انہوں نے آپ کو تکالیف و مصائب سے دو چار کیا تو آپ طائف کے کافروں کی طرف نکل گئے تاکہ وہ آپ کی نصرت کے لیے آپ کی حمایت کریں اور آپ کو جگہ دیں۔ [زاد المعاد: (۳۱/۳)]

③ پھر جب وہاں سے امداد نہ ملی تو مکہ کی جانب آپ مقہور و محزون ہو کر واپس پلٹے اور نخلہ میں چند دن قیام کیا تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”آپ کفار مکہ کے ہاں کیسے داخل ہوں گے، انہوں نے تو آپ کو نکال دیا ہے؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے زید! جو حالات تم دیکھ رہے ہو اللہ تعالیٰ ان سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ بنا دے گا اور اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے نبی کو غلبہ دے گا۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریب ہوئے تو بنو خزاعہ قبیلے کے ایک کافر مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا اور کہا: ”کیا میں تیرے پڑوس میں داخل ہو سکتا ہوں؟“ اس نے کہا: ”ہاں! اس نے اپنے بیٹوں اور قوم کو آواز دی اور کہا: ”اسلحہ پہن لو اور بیت اللہ کے ارکان کے پاس جاؤ اور زبان سے کہہ رہا تھا: ”میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ داخل ہوئے یہاں تک کہ جب مسجد حرام کے قریب پہنچے تو مطعم بن عدی اپنی سواری پر کھڑا ہو گیا، اس نے بلند آواز سے کہا: ”اے قریش کے لوگو! میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے، تم میں سے کوئی شخص بھی انہیں نقصان نہ پہنچائے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکن کے قریب ہوئے، اس کا استلام کیا اور دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے گھر چلے گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹوں کے اسلحہ کی چھاؤں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر داخل ہوئے۔

[زاد المعاد: (۳۱۱/۳)، (۳۴)، السیرة النبویة لابن کثیر (۱۰۳/۲)، (۱۰۴)]

اس لیے آپ نے بدر کے قیدیوں کے بارے کہا تھا:

”اگر مطعم زندہ ہوتا پھر ان بدبودار لوگوں کے لیے مجھے کہتا تو میں اس کے لیے انہیں چھوڑ دیتا۔“

[صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس: باب ما من النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الأساری (۳۱۳۹)]

④ جب قریش نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ایذا دی تو آپ نے انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تا کہ انہیں اس کافر حکومت کی جانب سے حمایت نصیب ہو جائے، اس وقت نجاشی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

⑤ اسی طرح آپ کا مشرک چچا ابوطالب جس نے مرتے دم تک کلمہ طیبہ نہیں پڑھا تھا، اس کی حمایت و نصرت آپ کو حاصل رہی۔

⑥ ہجرت مدینہ سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایام ہائے مصائب میں ابن الدغنه کافر کی پناہ لی۔ [صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار (۳۹۰۵)]

⑦ جب آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو عبداللہ بن اریقظ الدیلی جو مشرک تھا اور راستوں کا بڑا ماہر تھا، اسے راستہ بتانے کے لیے اجرت پر رکھ لیا۔ [صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار (۳۹۰۵)]

اس میں بھی اس بات کی دلیل ہے کہ جب کسی مشرک پر اعتماد ہو کہ وہ دھوکا نہیں دے گا تو اس سے تعاون لیا جا سکتا ہے۔ اسے راستے کا گائیڈ بنایا جا سکتا ہے۔ کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا، اگر کفار سے راستے میں آمتنا سامنا ہو جاتا اور وہ آپ کی مدد کرتا تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کہتے کہ تم مشرک ہو ہماری مدد نہ کرو۔

⑧ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے وقت سراقہ بن مالک سے بھی مدد لی، سراقہ اس وقت مشرک تھا، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لایا تھا۔ [الاصابة (۳۵/۳)، اسد الغابة (۱۹۰۰)]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کو امان لکھ کر دی، وہ جسے بھی راستہ میں ملتا کہتا تم کفایت کیے گئے ہو، وہ ادھر نہیں ہیں اور جسے بھی ملتا

اسے واپس لوٹا دیتا۔ [صحیح بخاری: (۳۹۰۵)، (۳۹۰۶)]

یہ تو چند ایک واقعات تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مکی زندگی میں کفار سے حسب ضرورت تعاون لیا اور صحیح مسلم، مسند احمد اور الداری میں موجود عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے میدان میں لڑنے کے لیے کرنے والے مشرک سے آپ نے کہا تھا: ”واپس پلٹ جاؤ، ہم مشرک سے ہرگز مدد نہیں لیں گے“ اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں مشرک سے مدد لینا ناجائز ہو گیا تھا، اس لیے ہم وہ دلائل ذکر کرتے ہیں جن میں مدنی زندگی میں مشرکین و کفار سے حسب ضرورت تعاون لینے پر راہنمائی ملتی ہے۔

① غزوہ حنین میں جانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں عاریتاً لی تھیں۔ [مسند احمد (۴۰۰/۳)، (۴۰۱)، ابو داؤد (۳۵۶۲)، نسائی کبریٰ (۵۷۷۹) مستدرک حاکم: (۴۷۱/۲)]
غزوہ حنین فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ہوا اور صفوان اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

② نبی کریم ﷺ نے کفار کے ساتھ جو صلح حدیبیہ کی اس معاہدے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص محمد (ﷺ) کا حلیف بنا چاہے وہ ان کا حلیف بن جائے اور جو قریش کا حلیف بنا چاہے اسے بھی اجازت ہے، تو بنو خزاعہ مسلمانوں کے اور بنو بکر کے لوگ قریش کے حلیف بن گئے۔ [السیرة لابن ہشام (۳۱۸/۳)، السیرة لابن کثیر: (۳۲۱/۳)]
یہ صلح نبی کریم ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی، بنو خزاعہ کے مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کا حلیف بنا پسند کیا جس کا تقاضا تھا کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کے مددگار ہوں گے اور جب بنو خزاعہ پر ان کے دشمن حملہ کریں گے تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ پھر ہوا یہ کہ بنو خزاعہ پر بنو بکر نے حملہ کر دیا اور قریشیوں نے ان کا ساتھ دیا تو نبی ﷺ نے بدلہ لینے کے لیے ان پر چڑھائی کر دی اور یہ فتح مکہ کا سبب بن گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں الرحیق المختوم میں غزوہ فتح مکہ۔ اس واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت کفار سے معاہدہ کر کے اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑا جا سکتا ہے۔

③ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں: ”(احد کے) مقتولین میں بنو ثعلبہ کا ایک یہودی تھا، اس نے اس وقت جب جنگ کے بدلہ منڈلا رہے تھے اپنی قوم سے کہا: ”اے جماعت یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) کی مدد تم پر فرض ہے۔“ یہود نے کہا: ”مگر آج سبت (ہفتہ) کا دن ہے۔“ اس نے کہا: ”تمہارے لیے کوئی سبت نہیں۔“ پھر اس نے اپنی تلوار لی، ساز و سامان اٹھایا اور بولا: ”اگر میں مارا جاؤں تو میرا مال محمد (ﷺ) کے لیے ہے وہ اس میں جو چاہیں گے کریں گے۔“ اس کے بعد میدان جنگ میں گیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مخیر ترین بہترین یہودی تھا۔“ (الرحیق المختوم)

اس کی موت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کے اموال کو قبضے میں لے لیا اور عام صدقات مدینہ اسی مال سے ہوتے تھے۔ [مزید دیکھیں سیرة ابن ہشام: (۲۶/۲)، سیرة ابن ہشام مع روض الانف: (۳۷۵/۲)، مطبوعہ بیروت البدایہ والنہایہ: (۳۲/۴)، سیرة النبی اردو لابن کثیر: (۵۹/۲)، طبقات ابن سعد (۵۱/۱)، تاریخ مدینہ دمشق لابن عساکر (۲۲۹/۱۰)]

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان کے حق میں بہتر ہو تو اسے لڑائی میں حسب ضرورت شریک کیا جاسکتا ہے اور اس کے مال و متاع کو اسلام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

① ذی حرم صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

”تم رومیوں کے ساتھ امن والی صلح کرو گے پھر تم اور وہ ایک دشمن سے لڑائی کرو گے، تم مدد کیے جاؤ گے اور صلح سلامت رہو گے، غنیمت کا مال پاؤ گے پھر تم واپس پلٹو گے یہاں تک کہ ٹیلے والی چراگاہ کے پاس اترو گے تو عیسائیوں میں سے ایک آدمی صلیب اٹھا کر کہے گا: ”صلیب غالب آگئی۔“ اس پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی غضبناک ہو کر اسے توڑ ڈالے گا تو اس وقت روم کے عیسائی غدر کریں گے یعنی صلح والا معاہدہ توڑ ڈالیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے اور اسی (۸۰) جھنڈوں تلے آئیں گے، ہر جھنڈے کے ساتھ دس ہزار آدمی ہوں گے اور اللہ مسلمانوں کی جماعت کو شہادت کے ساتھ عزت عطا کرے گا۔“ [مسند احمد (۹۱/۴)، (۳۷۲/۵)، (۴۰۹)،

ابوداؤد (۴۲۹۲)]

اور اس معنی کی ایک حدیث صحیح بخاری (۳۱۷۶) میں بھی موجود ہے۔

اس صحیح حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار و مشرکین سے صلح کر کے مشترکہ دشمن کے ساتھ لڑا جاسکتا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ جب چاہے اپنے دین کی مدد کی فاسق و فاجر عیسائی کافر سے لے لے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے بارے کہا: ”یہ جہنمی ہے۔“ پھر جنگ کے وقت وہ بڑی شدت سے لڑا اور زخمی ہو گیا۔ آپ سے کہا گیا: ”یا رسول اللہ! جس کے بارے میں آپ نے جہنمی ہونے کا کہا تھا آج وہ بڑی شدت سے لڑا ہے۔“ بالآخر رات کے وقت وہ زخموں پر صبر نہ کر سکا اور اپنے آپ کو قتل کر بیٹھا۔ جب نبی ﷺ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے کہا:

«اللَّهُ أَكْبَرُ أَشْهَدُ أَنِّي عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ»

”اللہ سب سے بڑا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔“

پھر آپ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا انھوں نے لوگوں میں اعلان کیا کہ مسلمان کے سوا کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور بلاشبہ اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی لے لیتا ہے۔ [بخاری، کتاب الجہاد: باب ان اللہ لیؤید الدین بالرجل الفاجر (۳۰۶۲)]

اس مفہوم کی کئی ایک احادیث مجمع الزوائد (کتاب الجہاد، باب فی من یؤیدہم الاسلام (۵۴۸/۵) تا (۵۵۰)) میں موجود ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

”اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ: ”بے شک اللہ اس دین کی مدد فرات کے کنارے ربیعہ قبیلے کے نصاریٰ سے لے لے گا، تو میں کوئی اعرابی نہ چھوڑتا مگر اسے قتل کر دیتا یا وہ مسلمان ہو جاتا۔“

[مسند بزار (۱۷۳۳)، مجمع الزوائد (۹۵۶۵)، ابویعلیٰ (۲۳۶)]

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ بوقت ضرورت اگر کافر سے مسلمان کو مدد حاصل کرنا پڑے تو مدد لی جاسکتی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام (۲۷۶/۴) میں بھی تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے اور علامہ البانی نے ”التعلیقات الرضیة علی الروضة لنندیة (۴۴۳/۳)“ میں اسے جید قرار دیا ہے۔ اسی طرح دیکھیں الروضة النندیة (۵۴۲/۳)، (۵۴۳ مع التعلیقات الرضیة، السیل الحرار (۷۱۷/۳) بیہقی (۳۷/۹)۔ حنفی فقہاء کا موقف ملاحظہ ہو ردالمحتار لابن عابدین شامی (۴/۱۴۸، ۱۴۷/۴)، شرح السیر الکبیر للسرخسی (۴/۱۵۱۶)، حنبلی مذہب کے لیے المغنی لابن قدامہ (۲۵۶/۹) اور اس مسئلہ کی مفصل بحث کے لیے کتاب ”صد عدون الملحدین“ للشیخ ربیع بن ہادی المدخلی کا مطالعہ مفید رہے گا۔ واللہ اعلم! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«وَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَآخَرُونَ: إِنَّ كَانَ الْكَافِرُ حُسْنَ الرَّأْيِ فِي الْمُسْلِمِينَ وَدَعَتِ الْحَاجَةُ إِلَى الْإِسْتِعَانَةِ أُسْتَعِينَ بِهِ وَإِلَّا فَيُكْرَهُ وَحُمِلَ الْحَدِيثَيْنِ عَلَى هَذَيْنِ الْحَالَيْنِ وَإِذَا حَضَرَتِ الْكُفْرُ بِالْإِذْنِ رُضِحَ لَهُ مِنَ الْغَنَائِمِ وَلَا يُسْهَمُ لَهُ هَذَا مَذْهَبُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَبِي الْحَنِيفَةَ وَالْجَمْهُورِ» [شرح صحيح مسلم للنووي (۱۲/۱۷۷)، دارالكتب العلمية بيروت]

”امام شافعی اور دیگر فقہاء و محدثین نے کہا ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں اور ان کی مدد کی حاجت ہو تو ان سے مدد لی جائے گی وگرنہ مکروہ ہوگی اور دونوں قسم کی احادیث کو ان حالتوں پر محمول کیا ہے اور جب کافر اجازت کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہو تو اسے غنیمت کے مال سے کچھ عطیہ دیا جائے گا، باقاعدہ اس کا حصہ نہیں نکالا جائے گا۔ یہ مذہب امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور جمہور محدثین کا ہے۔“

کافروں کی گردنیں کاٹنا

(سوال) پچھلے دنوں دلجوئی کی کارروائی میں میں کافر مسلمانوں کی گردنیں کاٹ کر ساتھ لے گئے، اس کے جواب میں ہمارے ساتھیوں نے بھی انڈین آرمی کی گردنیں کاٹیں، تو پاکستانی آرمی کے کرنل نے کہا یہ شرعی طور پر ٹھیک نہیں ہے، آپ قرآن و حدیث سے اس کی وضاحت کریں؟

(جواب) کفار کے ساتھ میدان قتال میں سختی کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ [الانفال: ۱۲]

”تم ان کفار کی گردنوں اور جوڑ جوڑ پر مارو۔“

اس آیت کریمہ میں مجاہدین کو شجاعت اور پامردی سے لڑنے کو کہا جا رہا ہے اور حکم دیا جا رہا ہے کہ میدان کارزار میں جب کفار سے سامنا ہو تو ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے جوڑ جوڑ پر مارو تا کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہیں۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کی گردنیں کاٹنا بالکل درست اور جائز ہے اور کتب احادیث و توارخ میں بے شمار

واقعات کفار کی گردنیں کاٹنے کے موجود ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب قصة عكل و عرينة) میں موجود ہے کہ قبیلہ عكل اور عرينہ کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کی آنکھوں میں گرم لوہے کی سلائیاں پھیر دینے اور ہاتھ پیر کاٹنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات میں قصاص کے اندر قتل کرنا، نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان وغیرہ کاٹنے کا حکم ہے۔ جب کفار مسلمانوں کی مقابلے میں میدان میں اتر آئیں تو ان کو قتل کرنا، گردنیں مارنا، ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا، جوڑ جوڑ پر ضربیں لگانا درست و جائز ہے، اس کی تفصیل کتب احادیث و توریخ میں موجود ہے۔

مسلمانوں سے لڑائی نہ کرنے والے کافروں سے سلوک

(سوال) کیا جو کفار مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے ان سے بھلائی اور حسن سلوک کر سکتے ہیں؟

(جواب) جو لوگ مسلمانوں سے ان کے دین کے متعلق جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا ہو ان کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کرنے سے شریعت مانع نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں قتال نہیں کیا اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان سے بھلائی اور حسن سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“ [الممتحنہ: ۸]

البتہ جو کفار مسلمانوں کے خلاف دین اسلام کے بارے میں جنگ چھیڑیں، انھیں ایذا پہنچائیں، ان کے بچوں، اہل و عیال، بوڑھوں اور جوانوں کا قتل عام کریں اور انھیں ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیں بلکہ انہوں نے کئی ایک اسلامی حکومتیں ختم کر دی ہوں اور دن رات ان کی کوشش امت مسلمہ کے خاتمہ کی ہو تو ان سے لڑائی کرنا فرض ہے تاکہ دین اسلام کا غلبہ جو مقصود و مطلوب ہے، حاصل کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ کی اگلی آیت (۹) میں فرمایا ہے:

”اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑائی کرتے ہیں اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی تو جو لوگ ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔“

اس آیت کریمہ سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ جو کفار مسلمانوں سے ان کے دین کے بارے میں جنگ کریں، انھیں گھروں سے نکالیں یا نکالنے پر کسی دوسری قوم کی مدد کریں، ان کی طرف دوستی و تعاون کا ہاتھ بڑھانے والا ظالم ہے، لہذا امریکہ و برطانیہ وغیرہ جیسے جلا، کفار جنہوں نے صلیبی جنگیں چھیڑ رکھی ہیں اور لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انھیں ان کے گھروں سے نکالا، ان پر آتش و آہن کی بارش کر دی، ان سے لڑنا فرض عین ہے اور ان سے دوستی کرنا ظلم ہے، جو ایسے کفار سے دوستی کرتا ہے اور ان کا تعاون کرتا ہے وہ انھیں جیسا ہے۔

کیا ”فی سبیل اللہ“ سے مراد جہاد ہے؟

(سوال) سورہ توبہ میں ”فی سبیل اللہ“ سے کیا مراد ہے؟ کیا اس میں کسی دینی ادارے کا قیام اور نظم و نسق شامل ہے یا نہیں؟ یعنی یہ اصطلاح عام ہے یا خاص؟

(جواب) سورہ توبہ کی اس آیت میں مصارف صدقات بیان کرتے ہوئے ایک مصرف ”فی سبیل اللہ“ ذکر کیا ہے، یہاں ”فی سبیل اللہ“ خاص اصطلاح ہے جو باقی سات کے مقابلے میں استعمال کی گئی ہے۔ اگر اسے عام سمجھا جائے تو فقراء و مساکین وغیرہ کو علیحدہ ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی، وہ سب بھی ”فی سبیل اللہ“ ہیں۔ کتاب و سنت میں ”فی سبیل اللہ“ عام معنی میں بھی آیا ہے جس سے مراد اسلام اور اللہ کی رضا والا راستہ ہے یا پھر خاص اصطلاح ”فی سبیل اللہ“ ہے جو جہاد کے لیے ہے۔ مذکورہ آیت میں یہاں اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے جیسے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں روکے گئے۔“ (البقرہ: ۵۴)

اسی طرح ایک جگہ اور فرمایا:

﴿ وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرہ: ۱۹۰]

”اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

اس میں انفاق فی سبیل اللہ جہاد کے لیے ہے جیسا کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی ہے۔ [ابوداؤد، کتاب الجہاد: باب فی قولہ عزوجل ”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ (۲۵۱۲)، ترمذی (۲۹۷۲)]

اور کئی ایک مفسرین نے بھی یہاں سے جہاد و قتال ہی مراد لیا ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر ”المجامع لاحکام القرآن“ میں فرمایا ہے: ”اس سے مراد لڑنے والے غازی ہیں“ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے مذہب کا حاصل بھی یہی ہے۔ مشہور درسی کتاب ”بداية المحتهد“ میں ”فی سبیل اللہ“ سے مراد جہاد اور رباط کو امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا مذہب بتایا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں ”احکام زکوٰۃ و عشر“ از حافظ عبدالسلام بھٹوی صاحب اور ”مسائل عشر پر تحقیقی نظر“ از مفتی عبدالرحمن الرحمانی صاحب۔ حافظ عبدالسلام فرماتے ہیں: ”خلاصہ یہ ہے کہ ”فی سبیل اللہ“ سے مراد دین کی سربلندی کے لیے جہاد و قتال کرنے والے لوگ ہیں، اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کسی طرح بھی دنیا میں اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، خواہ وہ دلیل و برہان کے ساتھ ہو یا ہاتھ اور زبان کے ساتھ، البتہ اس مدد کا اولین مصداق وہی لوگ ہیں جو کفار سے لڑائی میں مصروف ہیں یا کفار کے خلاف لڑائی کے کسی بھی شعبہ میں شریک ہیں۔“

[احکام زکوٰۃ و عشر: (ص ۴۳)]

البتہ یاد رہے کہ مدارس و مساجد یا دیگر جو بھی ادارے اسلام کی سربلندی کے لیے کام کر رہے ہیں ان پر بھی اپنے اموال میں سے ضرور خرچ کرنا چاہیے تاکہ یہاں سے حفاظ و علماء وغیرہ تیار ہو کر نکلیں اور دین اسلام کی سربلندی کے لیے کام کریں۔

مجاہدین کے کمانڈرز اور اساتذہ کی کثیر تعداد انھیں مدارس ہی سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے ان کے حقوق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ صدقات کے جو مصارف اللہ نے بیان کیے ہیں ان سب میں بقدر ضرورت حصہ ڈالنا چاہیے مگر حالات کے مطابق جس مد میں زیادہ ضرورت ہو اس کا زیادہ خیال رکھیں، اللہ تعالیٰ ہمیں امور خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

کفار دوست مسلمان حکمرانوں کے خلاف جہاد کی شرعی حیثیت

(سوال) ایسے حکمران جو کفار کے ساتھ محبت رکھتے اور ان کا ساتھ دیتے ہیں کیا ان کے خلاف لڑائی کرنا درست ہے اور کیا یہ کوشش جہاد تصور ہوگی؟

(جواب) اس وقت عالم کفر مسلمانوں کے خلاف ہر محاذ پر متحد ہو چکا ہے اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لیے مسلسل سازشوں میں مصروف ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین، کشمیر، چینیا وغیرہ میں آتش و آہن کا بارودی سلسلہ زوروں پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کفر کی سازش یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ کو متحد و متفق نہ ہونے دیا جائے اور ان کی قوتوں کو پارہ پارہ کر کے ختم کیا جائے۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں باہمی اتفاق و اتحاد ہونا چاہیے تاکہ سب مسلمان ایک مضبوط دیوار بن کر اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف نبرد آزما ہو کر اسلام اور اہل اسلام کا دفاع کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہودی سازشوں اور پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے امت مسلمہ کو ددکاموں کی طرف توجہ دلائی ہے:

①..... اللہ کا تقویٰ ②..... اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامنا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَ لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَ اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَ لَا تَفَرَّقُوا ﴾ [آل عمران: ۱۰۲، ۱۰۳]

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس کی تفرقہ بازی میں نہ پڑو۔“

جب مسلمان سب آپس میں مل کر اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کریں اور کتاب و سنت کے احکام پر سختی سے عمل پیرا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں گے تو اس بات کا امکان نہیں رہتا کہ ان کے درمیان افتراق و انتشار یا بغض و عداوت پیدا ہو۔ جب مسلمان باہم متفق و متحد ہو جائیں گے تو پھر اہل کفر کی سازشیں کارگر ثابت نہ ہو سکیں گی۔ (ان شاء اللہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَ اذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ رَسُولَهُ وَ لَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَ تَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَ اصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾

[الأنفال: ۴۵، ۴۶]

”اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ان آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجاہدین کو مقابلے کے وقت پوری دلجمعی اور ثابت قدمی کا حکم دیا ہے اور اس دوران اللہ کو بکثرت یاد رکھنے کی تلقین کی ہے کیونکہ مقابلہ کے وقت اللہ کی یاد ثابت قدمی کا باعث بن جاتی ہے اور کامیابی کا زینہ ثابت ہوتی ہے پھر اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور باہمی اختلافات اور جھگڑوں سے منع کر دیا ہے کیونکہ امت مسلمہ کا باہمی افتراق و انتشار اسلام اور اہل اسلام کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر مسلمان آپس میں لڑیں تو ان کی اندرونی لڑائی کی بنا پر ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور اسلام کی ساکھ کو سخت دھچکا لگتا ہے جو بالآخر شکست کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دوران پیش آنے والے مصائب پر صبر و تحمل اور ان پر قابو پانے کی تلقین کر دی اور ساتھ اپنی مدد کا سہارا بھی دے دیا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کا اندرونی اتحاد کتنا ضروری ہے۔ اہل کفر اور ان کے ہمنوا آج بھی یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ختم کر کے انھیں آپس میں لڑا کر کم ہمت کیا جائے اور ان کی شان و شوکت کو توڑ دیا جائے، جس کے لیے ان کی پوری کوشش ہے کہ امت مسلمہ کے افراد ہی کا چناؤ کر کے یہ کام ان سے لیا جائے اور جو لوگ عالم کفر کے خلاف برسر پیکار ہیں انھیں ان کی حکومتوں اور عوام کے ساتھ لڑا کر ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ ان نامساعد حالات میں انھوں نے یہ کام بعض مخلص مسلمانوں سے لینے کے لیے اپنی تنگ و دو شروع کر رکھی ہے اور بعض لوگ دیدہ و دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کام میں لگ چکے ہیں۔ وہ دراصل اسلام کی خدمت نہیں کر رہے بلکہ اہل کفر کی در پردہ حمایت کر رہے ہیں اور جو کام کفر چاہتا ہے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ اس دنیا میں جتنے بھی مسلم ممالک ہیں ان کے حکمرانوں میں اگرچہ عملی کوتاہیاں اور خامیاں موجود ہیں لیکن ان کے خلاف قتال کے لیے اٹھنا سلف صالحین کا منہج نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ان کی ہر ممکنہ طریقے سے اصلاح کریں اور انھیں اسلام اور اہل اسلام کی اہمیت سمجھائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جن حکمرانوں کے خلاف لڑنے کے لیے نکلنا چاہیے اس کے لیے چند امور پر توجہ دینا ضروری ہے۔

پہلے یہ اچھی طرح معلوم کر لینا چاہیے کہ ایسے شخص کا کفر ثابت ہو چکا ہے، وہ صریح اور واضح طور پر کافر ہو چکا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ کسی تاویل کی بنا پر یا کسی مجبوری کی بنا پر بظاہر کفار کا ساتھی ہو یا کسی معاملے میں جاہل و نادان واقف ہو تو ایسے افراد پر جب تک اسلام کی حقیقت واضح نہ کر دی جائے اور اس پر دلائل کے ساتھ اتمام حجت نہ کر دی جائے اتنی دیر تک اس کی تکفیر نہیں ہو سکتی اور عامۃ الناس کو ایسے فتوؤں سے دور رہنا چاہیے۔ یہ اکابر علماء کا کام ہے۔ فتویٰ صادر کرنے والے شخص کو چاہیے کہ یہ معلوم کرے کہ اسلام کا وہ مسئلہ اس تک کما حقہ پہنچایا جا چکا ہے یا نہیں؟ اس بات پر بھی کہ وہ مسئلہ کس حد تک واضح ہے اس میں کوئی پیچیدگی تو نہیں پائی جاتی اور اس شخص میں مسئلہ سمجھنے کی استعداد کتنی ہے؟ ایسے لوگوں پر پہلے مسئلہ کی حقیقت

دلائل و براہین کے ساتھ کھول کھول کر واضح کرنی چاہیے اور اتمام حجت کرنی چاہیے، پھر اس کے بعد اگر وہ کفر پر اصرار کرتا ہے تو اس کے ساتھ غیر مسلموں والا رویہ اختیار کیا جائے گا۔ اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۵]

”ہم نے خوشخبری دینے اور ڈرانے کے لیے رسول بھیجے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس (حق کو قبول نہ کرنے کی) کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔“
ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵۰]
”اور ہم اتنی دیر تک عذاب نہیں دیتے حتیٰ کہ رسول بھیج لیں۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب و سزا دینے سے پہلے اتمام حجت ضروری ہے۔ ہمیں اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح سوچ لینی چاہیے کہ کیا ہم نے ان کے پاس جا کر ان پر اسلام اور اہل اسلام کا معاملہ اچھی طرح روشن اور واضح کر دیا ہے اور ان پر شرعی احکام میں کوئی ابہام اور پیچیدگی تو نہیں چھوڑی یا کہ بغیر اتمام حجت ہی کے ہم لڑائی کے لیے تلے ہوئے ہیں اور اگر یہ حکمران کافر ثابت ہو بھی جائیں تو پھر جنگی حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے یہ بات عیاں اور واضح ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہود کے قبائل موجود تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدے کیے اور مدینہ کے اندر قتال نہیں کیا بلکہ یہود سے معاہدے کر کے منافقین کو ساتھ ملا کر باہر کے دشمن سے لڑائی کی ہے۔ پہلے باہر کے دشمن کا صفایا گیا، اس کے بعد یہود مدینہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہمیں صحیح احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ منافقین جن کے صریح کفر کا قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن وہ زبان سے کلمہ پڑھتے تھے، نبی کریم ﷺ نے انہیں بھی قتل کرنے سے منع کیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«كُنَّا فِي عَزَاةٍ نَكْسَعُ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ يَا لِلْأَنْصَارِ! وَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ يَا لِلْمُهَاجِرِينَ! فَسَمِعَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ مَا بَأْسَ دَعْوَى جَاهِلِيَّةٍ؟ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ دَعْوَاهَا فَإِنَّهَا مُنْتَنَةٌ فَسَمِعَ بِذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي قَحْطَانَ فَعَلَوْهَا؟ أَمَا وَاللَّهِ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ فَبَلَغَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! دَعْنِي أَضْرِبُ عُنُقَ هَذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُهُ لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ

مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ» [بخاری، کتاب التفسیر: باب قوله (سواء علیہم استغفرت لهم) (۴۹۰۵)]

”ہم ایک غزوہ میں تھے کہ ایک مہاجر صحابی نے ایک انصاری کی پشت کو ہاتھ یا پاؤں کے ساتھ ضرب لگائی تو انصاری نے مدد کے لیے انصار کو اور مہاجر نے مدد کے لیے مہاجرین کو پکارا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ بات سنی تو فرمایا: ”یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟“ صحابہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ایک مہاجر شخص نے ایک انصاری شخص کی پشت پر ضرب لگائی ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو چھوڑ دو یہ تو ایک قبیح اور خبیث کلمہ ہے۔“ عبد اللہ بن ابی نے جب یہ بات سنی تو اس نے کہا: ”اچھا اب بات یہاں تک پہنچ گئی ہے، اللہ کی قسم! اگر ہم مدینہ کی طرف واپس لوٹے تو جو سب سے زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل آدمی کو مدینہ سے نکال دے گا۔“ یہ بات نبی ﷺ کو پہنچی تو عمر رضی اللہ عنہما کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ”اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے، میں اس منافق کی گردن اتار دوں۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اس کو چھوڑ دو، کہیں لوگ باتیں نہ کرنے لگیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسلمانوں کی باہمی لڑائی اور جھگڑا شروع ہو جائے تو نبی ﷺ نے کلمہ پڑھنے والے کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے:

«أَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ حَدَّثَهُ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي مَجْلِسٍ فَسَارَهُ يَسْتَأْذِنُهُ فِي قَتْلِ رَجُلٍ مِّنَ الْمُنَافِقِينَ فَجَهَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَلَيْسَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ؟ قَالَ الْأَنْصَارِيُّ بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَلَا شَهَادَةَ لَهُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَيْسَ يَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَلَا شَهَادَةَ لَهُ قَالَ أَلَيْسَ يُصَلِّي؟ قَالَ بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَلَا صَلَاةَ لَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُولَئِكَ الَّذِينَ نَهَانِي اللَّهُ عَنْهُمْ» [مسند احمد (۴۳۳/۵) (۲۳۶۷۰)]

”ایک انصاری صحابی نے بیان کیا کہ وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ اپنی مجلس میں تھے، اس نے آپ سے چپکے سے بات کی تاکہ وہ آپ سے ایک منافق آدمی کے قتل کی اجازت حاصل کر سکے۔ آپ نے بلند آواز سے فرمایا: ”کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی گواہی نہیں دیتا؟“ انصاری نے کہا: ”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! لیکن اس کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟“ انصاری نے کہا: ”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! لیکن اس کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہ نماز نہیں پڑھتا۔“ اس نے کہا: ”کیوں نہیں لیکن اس کی نماز کا کوئی اعتبار نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے قتل سے اللہ نے مجھے منع کیا ہے۔“

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام کا اظہار کرتے ہوں ان کا قتل درست نہیں۔ ہمارے ممالک خصوصاً پاکستان مسلمانوں کا گھر ہے، یہاں رہ کر ہمیں آپس میں لڑائی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس وقت امت

مسلمہ کا جو مشترکہ دشمن ہے، اس کے خلاف آپس میں متحد ہو کر جہاد و قتال میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ جنگی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ اپنے ملک میں افراتفری اور انتشار و افتراق نہ ہو۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ ایسے حکمرانوں سے لڑنے سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ کیا ہمارے پاس اتنی ہمت و طاقت اور وسائل ہیں کہ ہم انھیں ہٹا کر صحیح اسلامی نظام کا قیام کر سکیں؟ یا اپنی اندرونی طاقت کمزور کر کے اسلام کی رہی سہی کسر بھی نکال دیں گے اور اٹلے نقصان کا سبب بن جائیں گے۔ مصر، شام، الجزائر جیسے کتنے ہی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، وہاں جہادی قوتوں کو حکمرانوں سے ٹکڑا کر پاش پاش کر دیا گیا اور دعوت و تبلیغ کے مراکز سل کر دیے گئے۔ اسلام کا نام لینے والے بعض افراد پس دیوار زنداں دکھیل دیے گئے اور بعض قتل کر دیے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ممالک میں اپنے حکمرانوں سے ٹکڑا کر قوت اسلامی کو ختم کرنا کوئی دانشمندی نہیں اور نہ اسے صحیح اسلامی جہاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جہاد کے لیے صریح کفار اور دشمن کی سر زمین کا انتخاب کیا جاتا ہے اور وہاں حسب موقع کارروائی کی جاتی ہے اور امت مسلمہ کو متفق و متحد ہو کر لڑنا پڑتا ہے۔

اس لیے جو لوگ ممالک اسلامیہ میں حکمرانوں کے خلاف لڑنے کو جہاد سے تعبیر کر رہے ہیں وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں اور شریعت کے اس قاعدے سے بے خبر ہیں کہ ”مفاسد کا ختم کرنا منافع کے حصول سے بہتر ہے۔“ اسی باہمی جنگ و جدل میں اسلام اور اہل اسلام ہی کا نقصان ہے اور نفع برائے نام ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں، لہذا ہمیں اس لڑائی کے مفاسد اور نقصانات پر غور کرتے ہوئے ایسے فتنہ و فساد سے باز رہنا چاہیے اور عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے سلف صالحین کے منہج پر قائم رہنا چاہیے۔



اسلامی آداب و احکام

www.KITABOSUNNAT.COM

”السلام علیکم“ کی بجائے دیگر فقرے

(سوال) کچھ لوگ ملاقات کے وقت ”السلام علیکم“ کی بجائے کچھ دوسرے جملے بولتے ہیں کیا ایسا کرنا درست ہے؟

(جواب) اسلام اخوت و محبت کا دین ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: ”تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“ ان کی باہمی محبت کو قائم رکھنے کے لیے اسلام نے بہت سارے احکام و آداب بیان کیے ہیں جن میں سے ایک ادب یہ ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو ”السلام علیکم“ کہیں۔ یہ مسلمانوں کے ذمے دوسرے مسلمانوں کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ إِذَا لَقِيْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَ إِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ وَ إِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانصَحْهُ وَ إِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللَّهَ فَشَمِّتْهُ وَ إِذَا مَرِضَ فَعُدُّهُ وَ إِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ »

[مسلم، کتاب السلام: باب من حق المسلم للمسلم رد السلام (۲۱۶۲)]

”مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں..... جب تو اس سے ملے تو سلام کہہ اور جب وہ تجھے دعوت دے تو قبول کر اور جب تجھ سے خیر خواہی طلب کرے تو اس کی خیر خواہی کر اور جب اسے چھینک آئے وہ اللہ کی حمد کرے تو اسے یرحمک اللہ“ کہہ اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کر اور جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جا۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ ملاقات کے وقت سلام کہنے کا حکم ہے، اگر دوسرا بھائی سلام میں پہل کر جائے تو اس کا جواب کم از کم ”وَ عَلَیْكُمْ السَّلَامُ“ کے الفاظ کے ساتھ دینا چاہیے اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ جب کوئی سلام کہے تو اس سے بہتر جواب دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ إِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا﴾

[النساء: ۸۶]

”اور جب تمہیں سلام کہا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہیں الفاظ کو لوٹا دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔“

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا تو اس نے کہا: «السَّلَامُ عَلَیْكَ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ» تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَ عَلَیْكَ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ» پھر ایک اور آیا اس نے کہا: «السَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَ رَحْمَتُهُ» آپ ﷺ نے اسے جواب میں کہا: «وَ عَلَیْكَ السَّلَامُ وَ

رَحْمَةُ اللَّهِ وَ بَرَكَاتُهُ» پھر ایک اور آیا اس نے کہا: «السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ وَ بَرَكَاتُهُ» آپ ﷺ نے اسے کہا: «وَعَلَيْكَ» اس آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: ”اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ کے پاس فلاں فلاں آیا، انھوں نے سلام کہا آپ نے ان کے جواب میں زیادہ کلمات کہے اس کی نسبت جو آپ نے مجھے جواب دیا ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے ہمارے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ [النساء: ۸۶]

”اور جب تمہیں سلام کہا جائے تو اس سے اچھا جواب دو یا انھیں الفاظ کو لوٹا دو۔“
ہم نے تجھ پر اسے لوٹا دیا ہے۔“

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ دَلَالَةٌ عَلَى أَنَّهُ لَا زِيَادَةَ فِي السَّلَامِ عَلَى هَذِهِ الصِّفَةِ السَّلَامِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ وَ بَرَكَاتُهُ إِذَا لَوْ شَرَعَ أَكْثَرَ مِنْ تِلْكَ لَزَادَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ“

[تفسیر ابن کثیر (۱/۵۸۳)]

”اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ سلام کہنے میں ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ سے زیادہ کلمات نہیں کہنے چاہئیں اگر اس سے زائد کلمات شروع ہوتے تو رسول اللہ ﷺ زیادہ کر دیتے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں ملاقات کے وقت زبان کے ساتھ سلام کے کلمات کہنے چاہئیں، سلام کی جگہ ”کی حال اے“ یا ”Good Morning“ وغیرہ کہنا درست نہیں۔ سلام کے کلمات کے بعد ”کی حال اے“ یا دوسرے کلمات سے حال وغیرہ معلوم کر لیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

سلام کا جواب محض ہاتھ کے اشارے سے دینا بھی درست نہیں۔ سلام کا جواب دینے کے لیے کلمات ہی کہنے چاہئیں جیسا کہ مذکورہ احادیث سے واضح ہے۔ البتہ اگر کوئی دور ہو تو سلام کے ساتھ اگر اشارہ بھی کیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ مجھے سلام کہا جا رہا ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الادب المفرد“ میں اس معنی کے کئی آثار نقل فرمائے ہیں۔ البتہ حالت نماز میں کوئی سلام کہہ دے تو اس کا جواب زبان سے نہیں بلکہ ہاتھ کے اشارے سے دیا جائے۔

ہاتھ کے اشارے سے سلام

(سوال) صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کہنے کا کیا حکم ہے، کیا اس سے کوئی ممانعت وارد ہوئی ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

(جواب) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَدْخُلُوا الْحَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا أَلَا أَدْلُكُمْ عَلَى مَا تَحَابُّونَ بِهِ؟ قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ » [الأدب المفرد (۱۰۰۹)]

”تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک ایمان نہیں لاؤ گے اور تم ایمان نہیں لاؤ گے حتیٰ کہ آپس میں محبت نہ کرنے لگو۔ کیا میں ایسے کام پر تمہاری رہنمائی نہ کروں کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟“ انہوں نے کہا: ”کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”آپس میں سلام کو پھیلا دو۔“ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أُعْبِدُوا الرَّحْمَنَ وَاطْعَمُوا الطَّعَامَ وَافْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ » [الأدب المفرد (۱۰۱۰)]

”رحمان کی عبادت کرو، (ساکین کو) کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کر دو تم جنتوں میں داخل ہو جاؤ گے۔“

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمیں آپس میں سلام کو عام کرنے کا حکم ہے اور یہ ہماری محبت کا ذریعہ ہے لیکن صرف ہاتھ کے اشارہ کے ساتھ سلام کرنا درست نہیں کیونکہ یہ یہود و نصاریٰ کا فعل ہے جس سے ہمیں روکا گیا ہے اور مختلف محکموں میں جو سیلوٹ کا طریقہ رائج ہے یہ بھی انہی کی تقلید کا نتیجہ ہے، مسلمان حکمرانوں اور عامۃ الناس کے لیے درست نہیں۔

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُسَلِّمُوا تَسْلِيمَ الْيَهُودِ وَ النَّصَارَى فَإِنَّ تَسْلِيمَهُمْ بِالْأَكْفِ وَالرُّؤُوسِ وَالْإِشَارَةِ » [السنن الكبرى للنسائی (۹۲/۲)، (۱۰۱۷۲)، عمل اليوم و الليلة (۳۴۰)، السلسلة الصحيحة (۱۷۸۳)]

”یہود و نصاریٰ کے سلام کی طرح سلام نہ کرو، بلاشبہ ان کا سلام ہاتھوں، سروں اور اشارے سے ہوتا ہے۔“

اس کا ایک شاہد بھی موجود ہے۔ [المعجم الأوسط للطبرانی (۱۸۴/۸)، (۷۳۷۶)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ [فتح الباری (۱۱/۱۹)]

یہ حدیث مختلف شواہد کی وجہ سے حسن ہے اور جامع ترمذی میں بھی موجود ہے۔ [ترمذی، کتاب الاستئذان: باب ما جاء في كراهية إشارة اليد بالسلام (۲۶۹۵)]

عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« كَانُوا يَكْرَهُونَ التَّسْلِيمَ بِالْيَدِ » [الأدب المفرد (۱۰۳۵)]

”سلف صالحین ہاتھ کے ساتھ سلام کرنا ناپسند کرتے تھے۔“

لہذا معلوم ہوا کہ ہمیں سلام کے مسنون کلمات ادا کرنے چاہئیں صرف ہاتھ کے ساتھ اشارہ کرنا، سر ہلانا یا ہتھیلی کے ساتھ سلام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے، سلف صالحین اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ حالت نماز میں کوئی سلام کہہ دے یا دور سے کوئی سلام کہے جو سنا نہ جاسکتا ہو تو سلام کے الفاظ کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ہاتھ کے اشارے سے نماز کی حالت میں سلام مستثنیٰ ہے اس لیے کہ جمید اور عمدہ حدیثیں مروی ہیں کہ آپ ﷺ نے حالت نماز میں اشارے کے ساتھ سلام کا جواب دیا ہے۔ ان میں سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ کو حالت نماز میں ایک آدمی نے سلام کہا، آپ ﷺ نے اسے اشارے کے ساتھ جواب دیا اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ایسے ہی ہے۔ اسی طرح جو شخص دور ہو، سلام کی آواز نہ سنتا ہو، اس کو بھی اشارے کے ساتھ سلام کہنا جائز ہے اور اس کے ساتھ سلام کے الفاظ بھی ادا کرے۔“ [فتح الباری (۱/۱۱۹)]

جھک کر یا کھڑے ہو کر سلام کرنا

(سوال) کیا سلام کے ساتھ جھکنا اور کھڑے ہونا جائز ہے؟

(جواب) سلام کرتے وقت جھکنا درست نہیں کیونکہ اس کی مشابہت رکوع کے ساتھ ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت جھکتے ہوں۔ اسی طرح کسی شخص کے احترام یا تعظیم کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں۔ جیسا کہ آج کل استاد، جج یا کسی بڑے آدمی کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس شخص کو پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے تصویر بن کر کھڑے ہو جائیں وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔“

[ابوداؤد، کتاب الأدب: باب الرجل يقوم للرجل يعظمه بذلك (۵۲۲۹)]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور وہ جب آپ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اس بات کو ناپسند فرماتے ہیں۔ [ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جاء في كراهية قيام الرجل للرجل (۲۷۵۴)]

البتہ آگے بڑھ کر استقبال کرنا یا اٹھ کر ملنا اور بٹھانا درست ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کا فیصلہ کرنے کے لیے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا، جب وہ قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا: «قَوْمُوا إِلَيَّ سَيِّدِكُمْ» ”اپنے سردار کی طرف اٹھو۔“ [بخاری، کتاب المغازی: باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب و مخرجه الى بني قريظة و محاصرته إياهم (۴۱۲۱)]

تعظيماً کھڑے ہونا

(سوال) کیا کسی آدمی کے لیے تعظيماً کھڑا ہونا ٹھیک ہے؟ کھڑا نہ ہونے پر قرآن و حدیث کا کیا حکم ہے؟

(جواب) کسی بھی شخص کے لیے اپنی جگہ تعظيماً کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔ ہاں آگے بڑھ کر اگر استقبال کریں تو اس کی اجازت ہے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمَثَلَ لَهُ الرَّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»

”جس آدمی کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“ [ابوداؤد، کتاب الادب: باب الرجل يقوم للرجل يعظمه بذلك (۵۲۲۹)، ترمذی کتاب الادب: باب ما جاء في كراهية قيام الرجل للرجل (۲۷۰۴)]

ابوجبلو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک گھر میں داخل ہوئے، اس گھر میں ابن عامر اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے تو ابن عامر کھڑے ہو گئے اور ابن الزبیر بیٹھے رہے۔ ابن عامر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

”بیٹھ جاؤ! بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ بندے اس کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے ہو جائیں تو وہ اپنا گھر آگ میں بنا لے۔“ [مسند احمد (۹۱/۴)، الادب المفرد (۹۷۷)، تہذیب الآثار (۸۴۲)، شرح السنة (۳۳۳۰)]

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص محبوب و پیارا نہیں تھا اور جب صحابہ آپ کو دیکھ لیتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اس قیام کو برا سمجھتے ہیں۔“ [ترمذی، کتاب الادب: باب ما جاء في كراهية قيام الرجل للرجل (۲۷۰۴)، شرح السنة (۲۹۴/۱۲)]

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے لیے قیام کرنا درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساری کائنات سے زیادہ محبوب تھے ان کے لیے بھی قیام نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ نبی ﷺ اس بات کو ناپسند کرتے تھے اور آپ نے اس کے لیے وعید بھی بیان کی ہے تو پھر کوئی ٹیچر، پروفیسر، وکیل، جج یا دزیرو بریڈیئر اور جرنیل کس طرح اس قیام کے مستحق ہو سکتے ہیں، جو لوگ کسی کے لیے قیام نہ کرنے والے کو برا کہتے ہیں انھیں رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات پر غور و خوض کرنا چاہیے اور شرع کی مخالفت سے باز رہنا چاہیے۔

دونوں ہاتھوں سے سلام کرنا

سوال کیا دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے؟

جواب مصافحہ کرنا سنت سے ثابت ہے اور اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافِحَانِ إِلَّا غَفَرَ اللَّهُ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَتَفَرَّقَا» [ترمذی، کتاب الاستئذان

باب ما جاء في المصافحة (۲۷۲۷)، ابن ماجہ (۳۷۰۳)، ابوداؤد (۵۲۱۲)، مسند احمد (۲۸۹/۴)]

”جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں، مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دیتا

ہے۔“

واضح رہے کہ جس عمل کی اس قدر فضیلت ہو اس کا اجر تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب اسے صحیح سنت کے مطابق کیا جائے۔ مصافحہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملے تو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔ اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«لَقِيْنِي رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا جُنْبٌ فَآخَذَ بِيَدِي فَمَشَيْتُ مَعَهُ حَتَّى قَعَدَ

فَأَنْسَلْتُ» [بخاری، کتاب الغسل: باب الجنب يخرج ويمشى فى السوق وغيره (۲۸۵)]

”رسول اللہ ﷺ مجھے ملے اور میں جنبی تھا، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر میں آپ کے ساتھ چلا یہاں تک کہ آپ ﷺ بیٹھ گئے پس میں کھسک گیا۔“

② ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«لَقِيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا جُنْبٌ فَمَدَّ يَدَهُ اِلَيَّ فَفَبَضْتُ يَدِي عَنْهُ وَ قُلْتُ اِنِّي

جُنْبٌ فَقَالَ سُبْحَانَ اللهِ اِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ» [شرح معانى الآثار للطحاوى (۱۶۱/۱)]

”میں نے نبی اکرم ﷺ سے حالت جنابت میں ملاقات کی، آپ ﷺ نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور کہا: ”میں جنبی ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سبحان اللہ! مسلمان نجس نہیں ہوتا۔“

یہ حدیث ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے پر نص قطعی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملاقات کے وقت مصافحہ کے لیے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور صحابی رسول سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا ایک ہاتھ جو مصافحہ کے لیے بڑھانا تھا پیچھے کھینچ لیا اور عذر پیش کیا کہ میں جنبی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان تو نجس نہیں ہوتا۔

③ سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«تَرَوْنَ كَفِيَّ هَذَا فَأَشْهَدُ اَنِّي وَضَعْتُهَا عَلَيَّ كَفِّ مُحَمَّدٍ ﷺ» [مسند احمد (۸۹/۴)، موارد

الظمان (۹۴۰)]

”تم لوگ میری اس ہتھیلی کو دیکھتے ہو، میں نے اس ہتھیلی کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔“

④ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللهِ! الرَّجُلُ مِمَّا يَلْقَى اَخَاهُ اَوْ صَدِيْقَهُ اَيْنَحْنِي لَهُ؟ قَالَ لَا قَالَ اَفِيْلْتَرِمُهُ

وَ يُقْبِلُهُ؟ قَالَ لَا قَالَ فَيَاخُذُ بِيَدِهِ وَ يُصَافِحُهُ؟ قَالَ نَعَمْ» [ترمذی، کتاب الاستئذان: باب ما جاء

فى المصافحة (۲۷۲۸)]

”ایک آدمی نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! کوئی آدمی اپنے بھائی یا دوست سے ملاقات کرے تو کیا اس کے لیے جھکے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔“ اس نے کہا: ”کیا اس سے چٹ جائے اور اس کو بوسہ دے؟“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔“ پھر اس نے کہا: ”کیا اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں!“

علامہ البانی رحمہ اللہ نے متعدد طرق کی وجہ سے اس حدیث کو سلسلہ صحیحہ میں نقل فرمایا ہے۔ [سلسلہ الأحادیث الصحیحة (۸۸۱)]

تاہم اس حدیث سے معاف کی ممانعت نہیں نکلتی جو چمٹ کر ملنے سے مختلف ہے۔

⑤ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا مِنْ مُسْلِمٍ التَّقِيَا فَاخَذَ أَحَدُهُمَا بِيَدِ صَاحِبِهِ إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يَحْضُرَ دُعَاؤَهُمَا وَلَا يَفْرُقَ بَيْنَ أَيْدِيهِمَا حَتَّى يَغْفِرَ لَهُمَا » [مسند احمد (۱۴۲/۳)، بزار فی كشف الأستار (ص ۴۱۹)]

”جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ ان کی دعاؤں میں موجود رہے اور ان کے ہاتھ علیحدہ ہونے سے پہلے انھیں بخش دے۔“

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ مصافحہ ایک ہاتھ کے ساتھ کرنا سنت ہے، رسول اللہ ﷺ اسی کی تعلیم دیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی سنت پر عمل کرتے رہے۔ ویسے مصافحہ کے معنی میں بھی یہ بات شامل ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ ملایا جائے جیسا کہ امام ابن اثیر جزری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”وَمِنْهُ حَدِيثُ الْمُصَافِحَةِ عِنْدَ الْإِقَاءِ وَهِيَ مَفَاعَلَةٌ مِنَ الصَّاقِ الْكُفِّ بِالْكَفِّ“ [النهاية فی غریب الحدیث والآخر (۴۳/۳)]

”صحیح لفظ سے ملاقات کے وقت مصافحہ کی حدیث بھی ہے، مصافحہ باب مفاعله سے ہتھیلی کی اندرونی جانب کو ہتھیلی کی اندرونی جانب سے ملانا ہے۔“

مصافحہ کا یہی معنی لغت کی کتاب قاموس اور تاج العروس وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ لہذا مصافحہ کی جو تعریف ہے وہ بھی اہل حدیث کے مصافحہ پر پوری طرح صادق آتی ہے اور جو مصافحہ احتاف کے ہاں رائج ہے اس پر یہ تعریف صادق نہیں آتی۔ بعض لوگ دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَفَّي بَيْنَ كَفَيْهِ التَّشَهُدُ » [بخاری، کتاب الاستئذان: باب الأخذ باليدین (۶۲۶۵)]

”رسول اللہ ﷺ نے مجھے تشہد سکھایا اور میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔“

یاد رہے کہ اس حدیث کا ملاقات کے وقت مصافحہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد سکھا رہے تھے اور تعلیم کے وقت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا۔ اگر اسے ملاقات کے مصافحہ پر محمول کریں تو اس کی صورت یہ بنے گی کہ نبی ﷺ کے دو ہاتھوں میں

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ہاتھ تھا یعنی تین ہاتھ کا مصافحہ۔ جس طرح کسی اہل حدیث کا حنفی حضرت سے مصافحہ ہو تو حنفی کے دو ہاتھ ہوتے ہیں اور اہل حدیث کا ایک ہاتھ اور حنفی بھائی اس مصافحہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان مقلدین بھائیوں پر سخت تعجب ہے کہ جو مصافحہ صحیح احادیث سے ثابت ہے وہ انھیں پسند نہیں اور جو مصافحہ ثابت نہیں (یعنی چار ہاتھوں کا) اس پر یہ اصرار کرتے ہیں۔ اس حدیث سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے دو ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ہاتھوں سے ملے ہوئے تھے۔

اگر بفرض محال اس حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ دونوں طرف سے دونوں ہاتھوں کا مصافحہ ہے اور ابن مسعود کے قول ”كَفَيْتِي“ اسم جنس سے ان کی دونوں ہتھیلیاں مراد لی جائیں تو اس صورت میں ”كَفَيْتِي بَيْنَ كَفَيْهِ“ کا مطلب یہ ہوگا کہ میری دونوں ہتھیلیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان میں تھیں اور جو لوگ دو ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں ان کی یہ صورت نہیں ہوتی لہذا اس حدیث سے ان کا استدلال باطل ہے۔

مذہب حنفی کے جید علماء بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں پکڑنا مزید اہتمام اور تعلیم کی تاکید کے لیے تھا۔ مذہب حنفی کی فقہ کی معروف کتاب ہدایہ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

”أَخَذَ لِيَكُونُ حَاضِرًا فَلَا يَفُوتُهُ شَيْءٌ“ [الهداية: (۱/۹۳)]

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اس لیے پکڑا تھا تاکہ ان کا دماغ حاضر رہے اور کوئی چیز ان سے فوت نہ ہو جائے۔“

علامہ زبیلی حنفی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَمِنْهَا أَنَّهُ قَالَ فِيهِ عَلَّمَنِي النَّسْهَدَ وَ كَفَيْتِي بَيْنَ كَفَيْهِ وَ لَمْ يَقُلْ ذَلِكَ فِي غَيْرِهِ فَذَلَّ عَلَيَّ“

مَزِيدُ الْإِعْتِنَاءِ وَ الْإِهْتِمَامِ“ [نصب الراية (۱/۴۲۱)]

”ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی تشہد کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد پر راجح ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تشہد سکھایا اور میری ہتھیلی آپ کی ہتھیلیوں کے درمیان تھی“ اور یہ بات ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تشہد میں نہیں۔ اس نے مزید توجہ اور اہتمام پر دلالت کی ہے۔“

یہی بات ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایہ کی شرح فتح القدر میں لکھی ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑنا مصافحہ کی غرض سے نہیں تھا بلکہ مزید اہتمام و تاکید کے لیے تھے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے وہ مصافحہ جو ملاقات کے وقت کیا جاتا ہے، مراد نہیں ہے بلکہ یہ ہاتھ میں ہاتھ لینا دینا ہے جیسا کہ بزرگ چھوٹوں کو کوئی چیز تعلیم کرنے کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لے لیتے ہیں۔“ [مجموعہ فتاویٰ اردو (۱/۱۳۴)]

علاوہ ازیں اور کئی احادیث سے بھی ہاتھ پکڑ کر تعلیم دینا ثابت ہے۔ ایک حدیث مندرجہ ذیل ہے۔
سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ بِيَدِهِ وَقَالَ يَا مُعَاذُ! وَاللَّهِ إِنِّي لَأَجِيبُكَ قُلْتُ
وَاللَّهِ إِنِّي لَأَجِيبُكَ فَقَالَ أَوْصِيكَ يَا مُعَاذُ! لَا تَدْعَنَ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُولُ اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى
ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ» [ابوداؤد، كتاب الوتر: باب في الاستغفار (۱۵۲۲)، نسائی
(۵۳۱۳)، عمل اليوم والليلة (۱۰۹)، الأدب المفرد (۶۹۱)، مسند احمد (۲۴۴۱۵)، ابن خزيمة (۷۵۱)، ابن
حبان (۲۴۵)، حاكم (۲۷۳۱)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”اے معاذ! اللہ کی قسم! میں تمہیں دوست رکھتا ہوں۔“ میں نے کہا:
”اللہ کی قسم! میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست رکھتا ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے معاذ! میں تجھے نصیحت کرتا ہوں
کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھنا نہ چھوڑنا: «اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»“
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تعلیم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ طالب علم کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا
جائے تاکہ اس کا دھیان اور توجہ مطلوبہ مسئلے کی طرف ہو۔ حنفی حضرات کی مزید تسلی کے لیے ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔
علامہ جلال الدین خوارزمی حنفی ہدایہ کی شرح کفایہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
”ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث تعلیم کی تاکید پر محمول ہے، اس لیے کہ محمد بن حسن شیبانی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے
ہیں: ”امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ ابو یوسف نے کہا: ”امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ
پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”حماد بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ امام
حماد کہتے ہیں: ”علقمہ رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ علقمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑ
کر مجھے تشہد سکھایا۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں: ”جبرائیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد سکھایا۔“ [الکفایہ شرح الہدایہ (۲۷۳/۱)]

اس حنفی روایت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کا دونوں ہاتھوں کے ساتھ
مصافحہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ طریقہ تعلیم پر محمول ہے جو طالب علم کو مزید تاکید اور اہتمام و توجہ دلانے کے لیے اختیار کیا
جاتا ہے۔ اب تو حنفی حضرات کو اس حدیث سے مروجہ مصافحہ پر استدلال نہیں کرنا چاہیے بلکہ مذکورہ بالا صحیح احادیث کی رو سے
دائیں ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت ہے اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ (واللہ اعلم)

یہود و نصاریٰ سے سلام

(سوال) وہ مسلمان جو دیار غیر میں بعض مجبور یوں کی وجہ سے مقیم ہیں ان کا غیر مسلموں سے میل جول ہوتا ہے تو کیا وہ اہل کتاب

کو سلام کہہ سکتے ہیں؟

(جواب) سلام کہنے سے ایک دوسرے کی عزت و تکریم ہوتی ہے اور عزت و تکریم کے لائق اہل اسلام ہیں، کفار نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهِ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لِكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۸]

”اور عزت اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔“

یہودی اور عیسائی عزت والے نہیں بلکہ ذلیل ہیں، ان کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَ هُمْ صَاغِرُوْنَ ﴾

[التوبة: ۲۹]

”ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہیں سمجھتے نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ ذلیل و خوار لوگ ہیں، ان کی عزت و تکریم نہیں کرنی چاہیے۔ اسی ذلت اور خواری کا احساس دلانے کے لیے انہیں سلام میں پہل کرنے سے منع کیا گیا ہے اور انہیں تنگ راستے کی طرف مجبور کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَبْدَأُوا الْيَهُودَ وَ لَا النَّصَارَى بِالسَّلَامِ وَ اِذَا لَقَيْتُمْ اَحَدَهُمْ فِى طَرِيْقٍ فَاصْطَرُّوْهُ اِلَى

اَضْبَاقِهِ » [مسلم، کتاب السلام: باب النهی عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام و كيف یرد علیہم (۲۱۶۷)،

ابوداؤد، کتاب الأدب: باب فی السلام علی اهل الذمة (۵۲۰۵)، ترمذی، کتاب الاستئذان (۱۶۰۲)،

مسند احمد (۲۶۶/۲)، عبد الرزاق (۱۹۴۵۷)، السلسلة الصحيحة (۷۰۴)]

”یہود و نصاریٰ کو سلام کہنے میں پہل نہ کرو اور جب تم ان میں سے کسی کو راستے میں ملو تو اسے تنگ راستے کی طرف

مجبور کر دو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ کی تکریم نہیں کرنی چاہیے، انہیں سلام میں پہل نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ راستے میں مل جائیں تو انہیں تنگ راستے کی طرف گزرنے پر مجبور کر دیا جائے تاکہ وہ ذلیل و خوار ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ راستے میں اگر ان سے ملاقات ہو تو پھر سلام میں پہل نہیں کرنی چاہیے اور اگر وہ گھریا دکان وغیرہ پر ہوں تو پھر ممانعت نہیں ہے۔ یہ تاویل فاسد ہے۔ سہیل بن ابی صالح کہتے ہیں کہ میں اپنے باپ کے ساتھ شام کی طرف نکلا، شام والے گرجا گھروں میں رہنے والوں کے پاس سے گزرتے تو ان پر سلام کہتے۔ میں نے اپنے باپ سے سنا، انہوں نے کہا: ”میں

نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے:

«لَا تَبْدَأُ وَهُمْ بِالسَّلَامِ وَ اضْطَرُّوهُمْ إِلَىٰ أَضْيَقِهِ» [مسند احمد (۸/۳۵۰)، بتحقیق احمد شاکر]
 ”انھیں سلام کہنے میں پہل نہ کرو اور انھیں تنگ راستے کی طرف مجبور کر دو۔“

اس حدیث کے راوی ابوصالح ذکوان ثقہ تابعی ہیں، انھوں نے اس حدیث کو پیش کر کے واضح کر دیا ہے کہ اس حدیث میں جو ممانعت ہے وہ ہر اہل کتاب کے لیے ہے خواہ وہ اپنے گھر ہی میں کیوں نہ ہو۔

ابو عثمان النضدی کہتے ہیں کہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خط میں ایک راہب کو سلام لکھا تو انھیں کہا گیا: «أَتَسَلِّمُ عَلَيْهِ وَ هُوَ كَافِرٌ؟» ”کیا تم اس کافر کو سلام کہتے ہو؟“ انھوں نے جواب دیا: «أَنَّهُ كَتَبَ إِلَيَّ فَسَلَّمْتُ عَلَيَّ وَ رَدَّدْتُ عَلَيْهِ»
 ”اس نے مجھے خط لکھا اور سلام کہا میں نے بھی اس کا جواب دے دیا۔“ [الأدب المفرد (۱۱۰۱)]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون میں یہ بات معروف تھی کہ اہل کتاب کو سلام کہنے میں پہل نہیں کی جاتی تھی خواہ وہ گھر میں ہوتا یا راستے میں تبھی ابو موسیٰ پر تعجب کا اظہار کیا گیا اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے تسلیم کیا، اس پر انکار نہیں کیا بلکہ عذر پیش کیا کہ اس راہب نے مجھے اپنے خط میں سلام لکھا تھا میں نے اس کا جواب دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جب ہرقل کو خط لکھا تھا تو اس میں اسے سلام کہنے میں پہل نہیں کی بلکہ لکھا:

«بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدَ اللَّهِ وَ رَسُولِهِ إِلَىٰ هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ سَلَامٌ عَلَيَّ مِنْ أَتْبَعِ الْهُدَىٰ» [بخاری، کتاب بدء الوحی (۷)، مسلم، کتاب الجهاد والسير (۱۳۷۳)، الأدب المفرد (۱۱۰۹)]

”اللہ کے نام کے ساتھ جو رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے، محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ہرقل کی طرف جو روم کا حکمران ہے۔ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔“
 اگر آپ ﷺ کی یہود و نصاریٰ کو سلام کی ممانعت صرف راستے کے ساتھ خاص ہوتی تو آپ ﷺ ہرقل کو سلام کہنے میں ابتدا کرتے۔ آپ کے عمل سے بھی یہ بات واضح ہو گئی کہ سلام کہنے کی یہ ممانعت یہود و نصاریٰ کو ہر مقام پر شامل ہے۔

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے یہودی لڑکے کی عیادت کی تو اسے کہا: «أَسَلِّمُ» ”اسلام قبول کر لے۔“
 [بخاری، کتاب الجنائز: باب إذا أسلم الصبى فمات هل يصلى عليه؟ وهل يعرض على الصبى الإسلام (۱۳۵۶)]

تاہم یہود و نصاریٰ کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”کیا حال ہے؟“ یا ”تم نے صبح کیسے کی؟“ وغیرہ جیسا کہ علقمہ تابعی فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بستی کے رئیس کو اشارے سے سلام کہا۔ [الأدب المفرد (۶۲۰/۲)]
 امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس اثر پر یہ باب قائم کیا ہے: ”بَابُ مَنْ سَلَّمَ عَلَيَّ ذِمِّيَّ إِشَارَةً“ یعنی اس بات کا بیان کہ جس نے ذمی کو اشارے سے سلام کہا۔

معلوم ہوا کہ زبان سے اسلام علیکم جیسے پیارے الفاظ سے یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل کرنے کی ممانعت ہے البتہ اشارہ

جو مسلمانوں کا خاص سلام نہیں ہے یا حال احوال دریافت کرنے کی ممانعت نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر آپ کو عیسائی یا یہودی وغیرہ جیسے کفار سلام میں پہل کریں تو آپ انہیں اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْيَهُودَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَحَدُهُمْ فَإِنَّمَا يَقُولُ السَّامُ عَلَيْكُمْ فَقُولُوا وَ عَلَيْكُمْ» [ابوداؤد، کتاب الأدب: باب فی السلام علی أهل الذمة (۵۲۰۶)]

”بلاشبہ یہود میں سے جب تمہیں کوئی سلام کہتا ہے تو وہ کہتا ہے تم پر موت واقع ہو تو تم کہو اور تم پر بھی۔“ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا: ”السَّامُ عَلَيْكُمْ“ آپ ﷺ کے صحابہ نے اس کو سلام لوٹایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس نے ”السَّامُ عَلَيْكُمْ“ کہا ہے۔“ وہ یہودی پڑا گیا تو اس نے اعتراف کر لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو اس نے کہا وہ اس پر لوٹا دو۔“ [الأدب المفرد (۱۱۰۵)، إرواء الغلیل (۱۲۷۶)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہودی و عیسائی جو کلمہ کہے وہی اس پر لوٹاتے ہوئے ”وعلیکم“ کہہ دیں۔ اگر اس نے ”السام علیکم“ کہا ہوگا تو خود اس کا مستحق ٹھہرے گا اور اگر دعائیہ کلمہ کہا ہوگا تو پھر اسے بھی دعائل جائے گی۔ اگر صاف معلوم ہو کہ اس نے ”السلام علیکم“ کہا ہے تو اس کے جواب میں اگر کسی نے ”وعلیکم السلام“ کہہ دیا تو یہ بھی جائز ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿وَ إِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ [النساء: ۸۶]

”جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔“

یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کو بھی شامل ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«رُدُّوْا السَّلَامَ عَلٰی مَنْ كَانَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا أَوْ مَجُوسِيًّا ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يَقُولُ: ﴿وَ إِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا﴾» [الأدب المفرد (۱۱۰۷)]

”سلام لوٹاؤ خواہ کوئی یہودی ہو، عیسائی یا مجوسی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جب تمہیں سلام کہا جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔“

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک اور روایت میں ہے:

«لَوْ قَالَ لِيْ فِرْعَوْنُ بَارَكَ اللهُ فِيْكَ قُلْتُ وَ فِيْكَ وَ فِرْعَوْنُ قَدْ مَاتَ» [الأدب المفرد (۱۱۱۳)]

”اگر فرعون مجھے کہتا اللہ تجھ میں برکت ڈالے تو میں کہتا اور تجھ میں بھی اور بلاشبہ فرعون مر چکا ہے۔“

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر دعائیہ کلمہ کہنے میں پہل کرے تو اسے جواب دے سکتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ لَا يَنْهَأُكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ لَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَ تُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴾ [المتحنه: ۸]

”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا، ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو کفار مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے اور ان کے دین میں مداخلت نہیں کرتے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جاسکتا ہے، لہذا جب وہ ”السلام علیکم“ کہیں تو انہیں ”وعلیکم السلام“ کہہ دیں تو جائز ہے۔

روز قیامت انسان کو کس نام سے پکارا جائے گا؟

سوال ہم نے سنا ہے کہ قیامت کے دن تمام انسانوں کو ان کی ماں کے نام سے پکارا جائے گا کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ملتا ہے؟

جواب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الْعَادِرَ يُرْفَعُ لَهُ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ يُقَالُ هَذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ » [بخاری، کتاب الأدب : باب ما يدعى الناس بأبائهم (۶۱۷۷)]

”عہد توڑنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا اٹھایا جائے گا اور کہا جائے گا: ”یہ فلاں بن فلاں کی دغا بازی ہے۔“

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے:

”بَابُ مَا يُدْعَى النَّاسُ بِأَبَائِهِمْ“

”یعنی لوگوں کو (قیامت والے دن) ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا۔“

اس حدیث کے ان الفاظ ”فلاں بن فلاں کی دغا بازی ہے“ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ قیامت والے دن آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا، ماں کے نام سے نہیں، کیوں کہ یہ نہیں فرمایا کہ یہ فلاں بن فلاں کی دغا بازی ہے۔

امام ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ایسے لوگوں کا رد ہے جو سمجھتے ہیں قیامت والے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے ناموں سے پکارا جائے گا، اس لیے کہ اس میں ان کے باپوں پر پردہ ڈالا جائے گا۔ یہ حدیث ان کے قول کے خلاف ہے۔“ [شرح صحیح البخاری (۳۳۵/۹)]

اور جو روایات ماؤں کے نام سے پکارنے پر دلالت کرتی ہیں وہ انتہائی ضعیف اور منکر ہیں۔

[ملاحظہ ہو: فتح الباری (۵۶۳/۱۰)]

والدین کی طرف دیکھنے کے متعلق حدیث کی وضاحت

سوال (عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی طرف نظر رحمت سے دیکھنے سے حج کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ کیا یہ حدیث اور اس میں ذکر کردہ فضیلت صحیح ثابت ہے؟

جواب (عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”نہیں ہے کوئی نیک اولاد جو اپنے والدین کی طرف نظر رحمت سے دیکھے مگر اللہ ہر نظر کے بدلے اس کے لیے ایک حج مبرور لکھ دیتا ہے۔“ صحابہ کرام نے کہا: ”اگر ہر روز سو مرتبہ دیکھے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں!“ اللہ سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔“ [شعب الایمان: باب فی بر الوالدین (۷۸۵۹)، ہدایۃ الرواة (۴۸۷۲)]

یہ روایت موضوع و من گھڑت ہے، اس کی سند میں نہشل بن سعید ہے۔ نہشل متروک ہے، امام اسحاق بن راہویہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ [تقریب مع تحریر (۲۵۱۴)]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ (۲۶۷۳) میں موضوع قرار دیا ہے جیسا کہ ہدایۃ الرواة کی تعلق میں مذکور ہے۔ لہذا یہ روایت جعلی اور بناوٹی ہے، حدیث رسول نہیں ہے۔

غسل خانے میں گفتگو

سوال کیا کسی ضرورت کے وقت غسل خانے میں گفتگو کی جاسکتی ہے؟ وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

جواب بوقت ضرورت غسل خانے میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ سیدہ ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« ذَهَبْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُهُ يَغْتَسِلُ وَ فَاطِمَةُ ابْنَتُهُ تَسْتُرُهُ قَالَتْ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَقَالَ مَنْ هَذِهِ؟ فَقُلْتُ أَنَا أُمُّ هَانِيٍّ بِنْتُ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ مَرَحَبًا بِأُمِّ هَانِيٍّ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهِ قَامَ فَصَلَّى ثَمَانِيَّ رَكَعَاتٍ مُلْتَحِفًا فَبِي ثُوبٍ وَاحِدٍ فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! زَعَمَ ابْنُ أُمِّی أَنَّهُ قَاتَلَ رَجُلًا قَدْ أَحْرَقْتَهُ فَلَا بُنْ هُبَيْرَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَحْرَقْنَا مَنْ أَحْرَقْتَ يَا أُمَّ هَانِيٍّ! قَالَتْ أُمَّ هَانِيٍّ وَ ذَاكَ ضُحَى » [بخاری، کتاب الصلاة: باب الصلاة فی الثوب الواحد (۳۵۷)]

”میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئی جس سال مکہ فتح ہوا۔ میں نے آپ ﷺ کو غسل کرتے ہوئے پایا اور آپ کی بیٹی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے لیے پردہ کیا ہوا تھا۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کون

ہے؟“ میں نے کہا: ”میں ام ہانی ابو طالب کی بیٹی ہوں۔“ آپ ﷺ نے مرحبا کہا۔ جب آپ ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو (نماز کے لیے) کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے آٹھ رکعتیں ادا کیں۔ آپ ﷺ نے ایک ہی کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میری ماں کے بیٹے (علی بن ابی طالب) نے کہا ہے کہ وہ ہمیرہ کے فلاں بیٹے کو مار ڈالیں گے حالانکہ میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے ام ہانی! جسے تو نے پناہ دی ہم نے بھی اسے پناہ دی۔“ ام ہانی نے کہا: ”یہ چاشت کا وقت تھا۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غسل کرتے وقت دوسرے فرد سے بات کی جاسکتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کے بارے میں پوچھا بھی اور مرحبا بھی کہا۔ لہذا اگر کوئی آدمی غسل خانے میں نہا رہا ہو اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ طلب کر سکتا ہے، شرعی طور پر اس میں کوئی حرج نہیں۔

برہنہ حالت میں کسی کو دیکھنا

(سوال) کیا مرد دوسرے مرد کو کپڑے تبدیل کرتے وقت دیکھ سکتا ہے؟ اور عورت بھی عورت کو کپڑے تبدیل کرتے وقت نگلی حالت میں دیکھ سکتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

(جواب) آدمی کا آدمی کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا، اسی طرح عورت کا عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا حرام ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مرد مرد کی شرمگاہ نہ دیکھے اور نہ عورت عورت کی شرمگاہ دیکھے اور آدمی آدمی کے ساتھ ایک کپڑے میں برہنہ نہ لیئے اور نہ عورت عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں برہنہ لیئے۔“ [صحیح مسلم، کتاب الحيض: باب تحريم النظر الى العورات (۳۳۸)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ مرد و خواتین کے لیے ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا حرام ہے۔ امام ابن القطن القاسی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”مرد کے لیے مرد کی شرمگاہ دیکھنا حلال نہیں، یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔“ اس کے بعد اوپر ذکر کردہ حدیث کو بطور استدلال پیش کیا ہے، اسی طرح انھوں نے ایک اور مقام پر عورت کے لیے عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا بھی کو حرام قرار دیا ہے اور یہی حدیث بطور دلیل ذکر کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہو گیا کہ مرد حضرات مردوں کی شرمگاہ کو نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح عورتیں عورتوں کی شرمگاہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔

روزانہ کنگھی کرنا

(سوال) کیا روزانہ کنگھی کرنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے؟ وضاحت فرما کر ہماری تسلی کر دیں۔

جواب سیدنا عبد اللہ بن مسفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ إِلَّا غَبَاً » [نسائی، کتاب الزینة: باب الترجل

غبا (۵۰۵۸)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے مگر ناغے سے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالوں کو روزانہ کنگھی نہیں کرنی چاہیے لیکن سنن نسائی ہی کی ایک روایت سے یہ پتا چلتا ہے کہ اگر بال بہت زیادہ بکھرے ہوئے ہوں تو روزانہ کنگھی کی اجازت ہے۔ سیدنا ابوقادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَتْ لَهُ جُمَّةٌ ضَخْمَةٌ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَرَهُ أَنْ يُحْسِنَ إِلَيْهَا أَنْ يَتَرَجَّلَ

فِي كُلِّ يَوْمٍ » [نسائی، کتاب الزینة: باب تسكين الشعر (۵۲۳۹)]

”ان کے سر پر بھاری بال تھے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ بالوں سے اچھا سلوک کریں اور روزانہ کنگھی کریں۔“

اس روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض نے یہ تطبیق دی ہے کہ اگر بھاری بال ہوں تو روزانہ کنگھی کرنے کی اجازت ہے ورنہ روزانہ کنگھی کرنا ناجائز ہے۔ لیکن شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

”ابوقادہ کی طرف منسوب یہ روایت جس میں انھیں روزانہ کنگھی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ ان

احادیث کے خلاف ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزانہ کنگھی کرنے سے منع فرمایا ہے۔“ [سلسلة الأحادیث

الصحيحة (۲۲۵۲)]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ روزانہ کنگھی کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ روزانہ کنگھی کرنے کے جواز کی کوئی حدیث رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم)

پینٹ شرٹ پہننا

سوال کیا کسی مسلمان کے لیے پینٹ شرٹ پہننا جائز ہے؟ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انھیں میں سے ہوگا۔“ اس طرح پینٹ شرٹ اور ٹائی غیر مسلموں کا لباس ہے، براہ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں درست رہنمائی فرمائیں۔

جواب شریعت اسلامیہ میں مرد و عورت کے لیے جو لباس اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا ہے جس سے ستر کا مقصود پورا ہو۔ اگر ایسا لباس پہنے جس سے جسم کے چھپانے والے حصے نمایاں ہوں تو وہ ستر کا مقصود پورا نہیں کرتا، اسے اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پینٹ کی کئی شکلیں ہیں، بعض ایسی ہیں جو تنگ ہوتی ہیں اور اس میں شرم گاہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں محدث العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”پینٹ میں دو مصیبتیں ہیں:

① پینٹ پہننے والا کفار سے مشابہت اختیار کرتا ہے جبکہ مسلمان کشادہ اور کھلے پا جاے پہننے ہیں۔ شام اور لبنان میں بعض مسلمان ہمیشہ اس طرح کرتے ہیں۔ مسلمان استعماری طاقتوں سے پہلے پینٹ کو نہیں جانتے تھے، استعماریوں کے آنے پر انھوں نے ان کی عادات سیئہ کو اپنی جہالت و بغاوت کی وجہ سے اختیار کر لیا۔

② پینٹ شرم گاہ کو ابھارتی ہے۔ آدمی کی شرم گاہ گھسنے سے ناف تک ہے اور نمازی آدمی پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے اس وقت بہت دور ہو جب وہ اس کو سجدہ کر رہا ہو۔“ [ملخص از القول العین (ص ۲۰۱)]
رسول اللہ ﷺ نے ایسے پا جاے میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے جس کے اوپر چادر نہ پہنی گئی ہو، ملاحظہ ہو:
[ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: باب إذا كان الثوب ضيقًا يتزر به (۶۳۶)]

البتہ اگر پینٹ کشادہ ہو، تنگ نہ ہو، جس میں شرم گاہ نمایاں نہ ہو تو اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں اور افضل و بہتر یہ ہے کہ پینٹ کے اوپر اتنی لمبی قمیص یا شرٹ ہو کہ آدمی کی ناف سے اور گھسنے کے درمیان والے حصے کو چھپالے تاکہ ستر کا مقصود پورا ہو جائے اور ٹائی لگانا تو صلیب سے مشابہت ہے، اس سے مکمل اجتناب لازم ہے۔

کس رنگ کی گپڑی پہننا مسنون ہے؟

(سوال) آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں نے مختلف رنگ کی گپڑیوں کو اپنا مخصوص شعار بنا لیا ہے مہربانی فرما کر مطلع کر دیں کہ سبز، سرخ، سفید اور سیاہ میں سے کون سے رنگ کی گپڑی پہننا اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہے؟

(جواب) رسول اللہ ﷺ نے سفید لباس پسند فرمایا ہے اور اسے پہننے کی ترغیب بھی دی ہے جیسا کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالْبَيَاضِ مِنَ الثِّيَابِ فَلْيَلْبَسُهَا أَحِبَّاءُكُمْ وَ كَفَنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ » [نسائی، کتاب الزینة: باب الامر بلبس البيض من الثياب (۵۳۲۵)، مسند احمد (۱۲/۵)]

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم سفید لباس کو لازم پکڑو، اس کو تمہارے زندہ لوگ پہنیں اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو، یقیناً یہ تمہارے بہترین کپڑوں میں سے ہے۔“

حضرت سرہ بن جناب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« اَلْبَسُوا الْبَيَاضَ فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَأَطْيَبُ وَ كَفَنُوا فِيهَا مَرْتَاكُمْ » [ترمذی، کتاب الأدب: باب ماجاء فی لبس البياض (۲۸۱۰)، ابن ماجہ (۳۵۶۷)، طلیسلی (۱۸۰۰)]

”سفید لباس پہنو، یقیناً یہ بہت زیادہ پاک اور عمدہ ہے اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو۔“

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ سفید لباس نہایت عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسے پہننے کی ترغیب دلائی ہے اور آپ ﷺ نے ایک صحابی کو سفید گپڑی بندھوائی اور گپڑی جو اللہ کے رسول ﷺ باندھا کرتے تھے، اس کا رنگ

حدیث میں سیاہ مذکور ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

« دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ » [ترمذی، کتاب

اللباس: باب ما جاء في العمامة السوداء (۱۷۳۵)، دارمی (۸۴/۲)]

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ والے دن مکہ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سیاہ پگڑی تھی۔“

حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« أَنْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ » [مسلم، کتاب الحج

باب جواز دخول مكة بغير احرام (۱۳۵۹)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔“

سنن ابی داؤد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرَخَى طَرَفَهَا بَيْنَ

كَتْفَيْهِ » [ابوداؤد، کتاب اللباس: باب في العمامة (۴۰۷۷)]

”میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا، آپ نے خطبہ دیا اور آپ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا۔“

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اعْتَمَّ إِذَا سَدَلَ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتْفَيْهِ قَالَ نَافِعٌ وَكَانَ ابْنُ

عُمَرَ يَسْدِلُ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتْفَيْهِ قَالَ عُبَيْدُ اللَّهِ رَأَيْتُ الْقَاسِمَ وَسَالِمًا يَفْعَلَانِ ذَلِكَ » [ترمذی،

کتاب اللباس: باب في سدل العمامة بين الكتفين (۱۷۳۶)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پگڑی باندھتے تو اس کے شملہ کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکا دیتے۔“ نافع رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ابن

عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔“ عبید اللہ نے کہا: ”میں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبد اللہ بن عمر کو اسی

طرح دیکھا۔“

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ پگڑی باندھنا سنت نبوی ہے۔ رہا سبز پگڑی کا مسئلہ تو اس کا کسی صحیح حدیث میں ذکر

موجود نہیں۔ اگر کسی بھائی کے علم میں سبز پگڑی کی صحیح حدیث ہو تو وہ ہمیں لکھ کر بھیج دے۔ اسی طرح سرخ رنگ کا ذکر بھی ہمیں

کسی صحیح حدیث سے نہیں ملا۔

ٹوپی پر پگڑی باندھنا

سوال کیا ٹوپی پہن کر اوپر پگڑی باندھ لینے میں کوئی شرعی قباحت ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔

جواب امام ابن قیم رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

”كَانَتْ لَهُ عِمَامَةٌ تُسَمَّى السَّحَابُ كَسَاهَا عَلِيًّا وَ كَانَ يَلْبَسُهَا وَ يَلْبَسُ تَحْتَهَا الْقَلْنَسُوءَ وَ

كَانَ يَلْبَسُ الْقَلْنَسُوءَ بِغَيْرِ عِمَامَةٍ وَ يَلْبَسُ الْعِمَامَةَ بِغَيْرِ قَلْنَسُوءٍ“ [زاد المعاد (۱/۱۳۵)]

”نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک گہڑی تھی جس کا نام سحاب تھا، آپ ﷺ نے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پہنائی، اسے آپ پہننے اور کبھی اس کے نیچے ٹوپی ہوتی اور کبھی ٹوپی بغیر گہڑی کے اور گہڑی بغیر ٹوپی کے پہن لیتے۔“

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف گہڑی باندھنا یا صرف ٹوپی پہن لینا یا ٹوپی پر گہڑی باندھ لینا، تینوں طرح جائز و درست ہے کسی صحیح حدیث میں اس کی نفی یا ممانعت نہیں ہے۔

لوہے کی انگوٹھی پہننا

سوال کیا لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام اور ممنوع ہے اور اس کا ثبوت کیا ہے؟

جواب خالص لوہے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن

عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ فِي يَدِهِ خَاتَمٌ مِّنْ ذَهَبٍ فَأَعْرَضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ فَلَمَّا رَأَى الرَّجُلُ كَرَاهِيَتَهُ ذَهَبَ فَأَلْقَى الْخَاتَمَ وَ أَخَذَ خَاتَمًا مِّنْ حَدِيدٍ فَلَبَسَهُ وَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: هَذَا شَرٌّ هَذَا حِلْيَةُ أَهْلِ النَّارِ فَارْجِعْ فَطَرَحَهُ وَ

لَبَسَ خَاتَمًا مِّنْ وَرَقٍ فَسَكَّتْ عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ» [الأدب المفرد (۱۰۲۱)، مسند احمد (۲/۱۶۳)]

”ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی، نبی ﷺ نے اس سے منہ موڑ لیا۔ جب اس آدمی نے نبی ﷺ کی ناپسندیدگی دیکھی تو سونے کی انگوٹھی اتار دی اور لوہے کی انگوٹھی لے کر پہن لی اور دوبارہ نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ بدترین ہے، یہ جہنمیوں کا زیور ہے۔“ وہ پلٹ گیا اور اسے اتار کر پھینک دیا اور چاندی کی انگوٹھی پہن لی، اس پر رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔“

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے اور اس کے مزید شواہد بھی نقل کیے ہیں۔ [غایۃ المرام (ص ۶۸)،

آداب الزفاف (ص ۲۱۷)]

بریدہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ عَلَيْهِ خَاتَمٌ مِّنْ شَبِّهِ فَقَالَ لَهُ مَا لِي أَجِدُ مِنْكَ رِيحَ الْأَصْنَامِ؟ فَطَرَحَهُ ثُمَّ جَاءَ وَ عَلَيْهِ خَاتَمٌ مِّنْ حَدِيدٍ فَقَالَ مَا لِي أَرَى عَلَيْكَ حِلْيَةَ

أَهْلِ النَّارِ؟ فَطَرَحَهُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! مِنْ أَيِّ شَيْءٍ اتَّخِذُهُ؟ قَالَ اتَّخِذُهُ مِنْ وَرِقٍ وَ لَا تَيْمَمُهُ مِثْقَالًا» [ابوداؤد، کتاب الخاتم: باب ما جاء في خاتم الحديد (٤٢٢٣)، نسائی، کتاب الزينة: باب مقدار ما يجعل في الخاتم من فضة (٥١٩٨)، ترمذی، کتاب اللباس: باب ما جاء في الخاتم الحديث (١٧٨٥)]

”ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اس نے پتیل کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ”کیا بات ہے کہ میں تجھ سے بتوں کی بومحسوس کر رہا ہوں؟“ اس نے اس انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا۔ پھر آیا تو اس نے لوہے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا بات ہے کہ میں تجھ پر آگ والوں کا زیور دیکھ رہا ہوں؟“ اس نے اسے پھینک دیا، پھر اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک مشقال سے کم چاندی کی بنا لے۔“

اس روایت کی سند حسن درجہ سے کم نہیں۔ [نبیل المقصود (٤٢٢٣)]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے البتہ اگر لوہے کی انگوٹھی کے ساتھ چاندی کی ملاوٹ کر کے طمع سازی کی گئی ہو تو اس کی رخصت ہے جیسا کہ معقیب رحمہ اللہ سے مروی ہے:

«كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَدِيدٍ مَلُوبٍ عَلَيْهِ فِضَّةٌ قَالَ وَرُبَّمَا كَانَ فِي يَدِي فَكَانَ مُعَيِّبٌ عَلَيَّ خَاتَمَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [ابوداؤد، کتاب الخاتم: باب ما جاء في خاتم الحديد (٤٢٢٤)، نسائی، کتاب الزينة: باب لبس خاتم حديد ملوي عليه فضة (٥٢٢٠)، بیہقی فی شعب الایمان (٦٣٥٢)]

”رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی لوہے کی بنی ہوئی تھی اور اس پر چاندی کی طمع سازی کی گئی تھی۔ وہ بعض اوقات میرے ہاتھ میں ہوتی۔ معقیب رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی کے نگران تھے۔“

ان دونوں احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ محض لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے البتہ اگر اس پر چاندی لگی ہوئی ہو تو پھر جائز ہے۔ علاوہ ازیں صحیح بخاری کی جس روایت میں یہ الفاظ ہیں: «الْتَمَسُ وَ لَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ» ”تم تلاش کرو اگرچہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔“ اس کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”أُسْتَدِلُّ بِهِ عَلَى جَوَازِ لُبْسِ خَاتَمِ الْحَدِيدِ وَ لَا حُجَّةَ فِيهِ لِأَنَّهُ لَا يَلْزَمُ مِنْ جَوَازِ الْإِتِّحَادِ جَوَازُ اللَّبْسِ فَيَحْتَمِلُ أَنَّهُ أَرَادَ وَ جَوَدُهُ لِيَتَنَفَّعَ الْمَرْأَةُ بِقِيَمَتِهِ“ [فتح الباری (٣٢٣/١٠)]

”اس حدیث سے لوہے کی انگوٹھی پہننے پر استدلال کیا گیا ہے حالانکہ اس میں اس کے جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ انگوٹھی لانا، انگوٹھی پہننے کو لازم نہیں۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے انگوٹھی کے وجود کا ارادہ کیا ہو تاکہ عورت اس کی قیمت سے نفع حاصل کرے۔“

لہذا یہ حدیث محض لوہے کی انگوٹھی پہننے پر نص قطعی نہیں ہے، اگر اس سے مراد لوہے کی وہ انگوٹھی لی جائے جو چاندی سے طمع

ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔ وگرنہ خالص لوہے کی انگوٹھی حرام ہے جیسا کہ اوپر احادیث ذکر کر دی گئی ہیں۔ بعض ائمہ نے یہ بھی کہا ہے کہ مذکورہ حدیث میں اگر اباحت ہے تو دیگر احادیث میں تحریم ہے اور جب مباح و تحریم کا باہم

تعارض ہو جائے تو حکم تحریم کا لگایا جاتا ہے۔ [ملاحظہ ہو: آداب الزفاف (ص ۲۱۹/۲۱۹)]

امام اسحاق بن منصور المرزوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: ”أَلْحَاتَمُ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ حَدِيدٍ يُكْرَهُ؟ فَقَالَ أَيْ وَاللَّهِ“ (کیا سونے یا لوہے کی انگوٹھی مکروہ ہے؟ تو انھوں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم!) [مسائل المرزوی (۲۲۴)، بحوالہ آداب الزفاف (ص ۲۱۹/۲۱۹)]

اور یہ بات اصول کی کتب میں موجود ہے کہ جب مطلق مکروہ کا لفظ بولا جائے تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے، یہی بات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، امام مالک، امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے۔ [غایۃ المرام (ص ۶۹/۶۹)]

کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کرنا

سوال کیا کسی کافر کا دیا ہوا تحفہ قبول کیا جاسکتا ہے اور انھیں تحفہ دینا کیسا ہے؟

جواب کافر کا دیا ہوا تحفہ، ہدیہ یا عطیہ قبول کرنا جائز و درست ہے۔ ایک بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ چیز اسلام میں استعمال کرنا جائز و درست ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی کفار کی جانب سے بھیجے گئے ہدایا و تحائف قبول کیے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ”باب قبول الهدیۃ من المشرکین“ قائم کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے اور مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں۔

① سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زہر آلود بکری کا گوشت لائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کچھ کھایا پھر جب اس عورت کو لایا گیا تو اس نے زہر ڈالنے کا اقرار کیا تو کہا گیا کیوں نہ ہم اسے قتل کر دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں۔“ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”اس زہر کا اثر میں نے ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تالو میں محسوس کیا۔“ [بخاری، کتاب الہبۃ: باب قبول الهدیۃ من المشرکین (۲۶۱۷)]

② مکہ سے مصر جاتے ہوئے سمندر کے کنارے ایلہ نامی ایک بندرگاہ تھی، وہاں کے عیسائی حاکم کا نام یوحنا بن ادبہ تھا۔ تو اس حاکم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفید نچر اور ایک چادر ہدیہ کے طور پر بھیجی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھا کہ وہ اپنی قوم کے حاکم کی حیثیت سے باقی رہے، کیونکہ اس نے جزیہ کی ادائیگی منظور کر لی ہے۔ [بخاری، کتاب الزکاة: باب خرص الصخر (۱۴۸۱)، دارمی (۲۵۳۷)]

③ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ریشم کا جبہ دیا گیا، یہ جبہ دوومد (تجوک کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے) کے ایک عیسائی نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تھا۔“ [بخاری، کتاب الہبۃ: باب قبول الهدیۃ من المشرکین (۲۶۱۵)]

جو روایت عیاض بن حمار سے مروی ہے کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی ہدیہ کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو نے اسلام قبول کیا ہے؟“ اس نے کہا: ”نہیں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے مشرکین سے ہدیہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔“

[ابوداؤد، کتاب الخراج: باب فی الامام یقبل هدیایا المشرکین (۳۰۵۷)، ترمذی (۱۵۷۷)، مسند طیب السی (۱۰۸۳)، المنتقی لابن الجارود (۱۱۱۰)، فتح الباری (۲۳۱/۵)]

یہ روایت قتادہ کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کتاب المغازی میں جو روایت بیان کی ہے کہ مشرک عامر بن مالک رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو اس نے آپ کو ہدیہ پیش کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا۔“ یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ بعض نے اسے امام زہری رضی اللہ عنہ سے موصول بھی بیان کیا ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ [فتح الباری (۲۳۰/۵)، تحفة الأحمذی (۱۸۸/۵)]

اب رہا یہ مسئلہ کہ کافر مشرک کو ہدیہ دینا کیسا ہے؟ تو اس کے جواز کے لیے امام بخاری رضی اللہ عنہ نے سورۃ الممتحنہ کی آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ لَمْ يُخَرِّجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ﴾ [الممتحنة: ۸]

”جو لوگ تم سے دین کے متعلق لڑتے نہیں اور نہ انھوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے معاملے میں انصاف کرنے سے تمہیں نہیں روکتا۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جن کافروں نے مسلمانوں کے ساتھ قتال نہیں کیا اور نہ انھیں ان کے گھروں سے نکالا ہے تو ان کے ساتھ دنیاوی اخلاق اور حسن سلوک منع نہیں ہے، پھر یہ بھی یاد رہے کہ بروصلہ اور احسان سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار کو دلی دوست بنا لیا جائے اور ان کے ساتھ محبت کی بیٹنگیں بڑھانی شروع کر دی جائیں کیونکہ کفار کو دلی دوست بنانا منع ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةَ مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَ دُوَا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَ مَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴾

[آل عمران: ۱۱۸]

”اے ایمان والو! تم اپنے دلی دوست ایمان والوں کے علاوہ کسی کو نہ بناؤ۔ کفار تمہاری تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں مبتلا رہو۔ ان کی دشمنی تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جوان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے بھی بڑی ہے۔ ہم نے تمہارے لیے آیتیں بیان کر دی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو۔“

امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ”باب الهدیة للمشرکین (۲۶۱۹)“ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ ﷺ نے جبہ دیا تھا پھر عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں ایک کافر عثمان بن حکیم کو وہ جبہ ہدیہ دے دیا تھا، ذکر کر کے استدلال کیا ہے کہ مشرک کو ہدیہ دیا بھی جا سکتا ہے۔ [فتح الباری (۲۳۲/۵)]

بہر حال دنیاوی اخلاق و سلوک کے تحت مشرک کو ہدیہ دیا جا سکتا ہے اور اس سے قبول بھی کیا جا سکتا ہے، ممانعت والی روایات

قابل حجت نہیں ہیں۔ البتہ ان ہدایا و تحائف کی وجہ سے ان سے دلی دوستی اور محبت و موافقت قائم نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مسلمان کے لیے دوستی و دشمنی کا معیار اسلام ہے۔

وگ یعنی مصنوعی بال لگانا

سوال کیا سر پر مصنوعی بال یعنی وگ لگانا شریعت اسلامیہ کی رو سے جائز ہے؟
جواب، ہیر ٹرانسپلانٹیشن کے طریقہ علاج کے سوا سر پر وگ یعنی مصنوعی بال لگانا یا اصلی بالوں کے ساتھ انھیں ملانا شرعی طور پر درست نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے مصنوعی بال لگانے والے افراد پر لعنت کی ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«لَعَنَ اللَّهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ وَ الْوَاشِمَةَ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ» [بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (۵۹۳۷)، مسلم، کتاب اللباس: باب تحريم فعل الواصلة و المستوصلة (۲۱۲۴)، ابو داؤد، کتاب الترجل: باب في صلة الشعر (۴۱۶۸)، ترمذی (۲۷۸۳)، نسائی (۵۱۰۸)]
 ”اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو مصنوعی بال لگانے اور مصنوعی بال لگوانے والی پر، جسم گود کر نیل بھرنے والی اور بھروانے والی پر۔“

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللَّهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ وَ الْوَاشِمَةَ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ» [بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (۵۹۳۳)، مسند احمد (۳۳۹/۲)]
 ”نبی کریم ﷺ نے مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی، جسم گود کر نیل بھرنے اور بھروانے والی پر لعنت کی ہے۔“

③ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَكِلَ الرَّبَا وَ مُوَكَّلَهُ وَ الْوَاصِلَةَ وَ الْمَوْصُولَةَ وَ الْمُجِلُّ وَ الْمُحَلَّلَ لَهُ» [مسند ابی یعلیٰ (۵۳۵۰)، مسند احمد (۴۴۸/۱)، بیہقی (۲۰۸/۷)]
 ”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی، حلالہ کرنے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، اس پر لعنت کی ہے۔“

④ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللَّهُ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَاتِ وَ الْوَاصِلَاتِ وَ الْمُتَمِصَّاتِ وَ الْمُتَمَفَّلِحَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيَّرَاتِ خَلَقَ اللَّهُ قَالَ قَبْلَ ذَلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِي آسَدٍ يُقَالُ لَهَا أُمُّ يَعْقُوبَ فَاتَتْهُ فَقَالَتْ بَلِّغْنِي عَنْكَ أَنَّكَ لَعَنْتِ الْوَاشِمَاتِ وَ الْمُسْتَوْشِمَةَ وَ الْوَاصِلَاتِ وَ الْمُتَمِصَّاتِ وَ الْمُتَمَفَّلِحَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيَّرَاتِ خَلَقَ اللَّهُ قَالَ مَا لِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى قَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ لَوْحِي الْمُصْحَفِ فَمَا وَجَدْتُهُ فَقَالَ وَاللَّهِ لَئِنْ كُنْتُ قَرَأْتِيهِ لَقَدْ وَجَدْتِيهِ ثُمَّ قَرَأَ ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [ابوداؤد، كتاب الترجل: باب في صلة الشعر (٤١٦٩)، یہ حدیث مختلف طرق اور الفاظ کے ساتھ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی ابن ماجہ اور مسند احمد وغیرہ میں مروی ہے]

”اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جسم گود کر نیل بھرنے اور بھروانے والیوں پر، مصنوعی بال لگانے والیوں پر، چہرے کے بال اکھڑنے والیوں پر اور خوبصورتی کے لیے دانتوں میں جھریاں بنانے والیوں پر جو اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کرنے والیاں ہیں۔“

یہ بات قبیلہ بنو اسد کی ایک عورت کو پہنچی، اسے ام یعقوب کہا جاتا ہے، اس نے کہا: ”(اے ابن مسعود!) مجھے تیرے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے جسم گود کر نیل بھرنے والی اور بھروانے والی، مصنوعی بال لگانے والی، چہرے کے بال اکھڑنے والی اور خوبصورتی کے لیے دانتوں میں جھریاں بنانے والی عورتوں پر لعنت کی ہے جو اللہ کی تخلیق بدلنے والیاں ہیں؟“ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے میں ان پر کیوں نہ لعنت کروں؟ جب کہ یہ کتاب اللہ میں موجود ہے۔“ اس عورت نے کہا: ”میں نے دو تختیوں کے درمیان قرآن کا نسخہ پڑھا ہے، میں نے یہ بات نہیں پائی۔“ فرمانے لگے: ”اللہ کی قسم! اگر تو نے اسے (سمجھ کر) پڑھا ہوتا تو ضرور پالیتی، پھر یہ آیت تلاوت کی“ اور جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آ جاؤ۔“

⑤ حمید بن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّهُ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ عَامَ حَجِّ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَتَنَاولَ قُصَّةً مِنْ شَعْرٍ كَانَتْ فِي يَدِ حَرَسِيٍّ يَقُولُ يَا أَهْلَ الْمَدِينَةِ! أَيْنَ عُلَمَاءُكُمْ؟ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَى عَنْ مِثْلِ هَذِهِ وَ يَقُولُ إِنَّمَا هَلَكْتُ بَنُو إِسْرَائِيلَ حِينَ اتَّخَذَ هَذِهِ نِسَاءَهُمْ» [موطا، كتاب الشعر: باب السنة في الشعر (٧٢٢/٢)، بخاری، كتاب اللباس، باب وصل الشعر (٥٩٣٢)، مسلم (٢١٢٧)، ابوداؤد (٤١٦٧)، نسائی (٥٢٤٧)]

”انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے اس سال سنا جب انہوں نے حج کیا اور معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر تھے۔ وہ غلام کے ہاتھ سے بالوں کا ایک جوڑا (یعنی وگ) لے کر کہہ رہے تھے: ”اے مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ ایسے جوڑے سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے: ”جب بنی اسرائیل کی عورتوں نے اس طرح بنانا شروع کیا اس وقت بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے۔“

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

⑥ «إِنَّكُمْ قَدْ أَحَدْتُمْ زِيَّ سُوءٍ وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الزُّورِ قَالَ وَجَاءَ رَجُلٌ بَعْضًا عَلَيَّ رَأْسَهَا حِرْقَةٌ قَالَ مُعَاوِيَةُ أَلَا وَ هَذَا الزُّورُ قَالَ قَتَادَةُ يَعْنِي مَا تَكْتَبُ بِهِ النِّسَاءُ

أَشْعَارُهُنَّ مِنَ الْخِرْقِ » [مسلم، کتاب اللباس و الزينة: باب تحريم فعل الواصلة و المتوصلة و الواشمة..... (۲۱۲۷)، مسند احمد (۹۳/۴)]

”تم نے بری وضع ایجاد کر لی ہے اور یقیناً نبی ﷺ نے زور (دھوکا) سے منع کیا ہے۔“ ایک شخص ایک لکڑی لے کر آیا جس کی نوک پر ایک چھیتڑا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”خبردار! یہی زور (دھوکا) ہے۔“ (راوی حدیث) قتادہ نے فرمایا: ”مراد یہ ہے کہ عورتیں چھیتڑے لگا کر بال بہت کر لیتی ہیں۔“

④ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« إِنَّ جَارِيَةَ مِنَ الْأَنْصَارِ تَزَوَّجَتْ وَ إِنَّهَا مَرِضَتْ فَتَمَعَطَ شَعْرَهَا فَأَرَادُوا أَنْ يَصْلُوهَا فَسَأَلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَنَ اللَّهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ » [بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (۵۹۳۴)، مسلم، کتاب اللباس و الزينة (۲۱۲۳)، مسند احمد (۱۱۱/۶)، مسند طيالسي (۳۵۷/۱)، تاریخ بغداد (۳۰۹/۱۱)، مسند ابی یعلیٰ (۴۷۵۳)]

”ایک انصاری لڑکی کی شادی ہوئی لیکن وہ بیمار ہو گئی، اس کے سر کے بال گر گئے۔ انھوں نے چاہا کہ اس کے بالوں میں مصنوعی بال (یعنی وگ) ملا دیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مصنوعی بال لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت کی ہے۔“

⑤ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« إِنَّ امْرَأَةً جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ إِنِّي أَنْكَحْتُ ابْنَتِي ثُمَّ أَصَابَهَا شَكْوَى فَتَمَزَّقَ رَأْسُهَا وَ زَوْجُهَا يَسْتَحِثُّنِي بِهَا أَفَأَصِلُ رَأْسَهَا؟ فَسَبَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْوَاصِلَةَ الْمُسْتَوْصِلَةَ » [بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (۵۹۳۵)، مسلم، کتاب اللباس: باب تحريم فعل الواصلة (۲۱۲۲)، شرح السنة (۳۱۸۸)، مسند احمد (۳۴۵/۶)]

”نبی کریم ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا: ”میں نے اپنی لڑکی کا نکاح کیا تھا، پھر اسے بیماری لاحق ہوئی اور سر کے بال گر گئے۔ اس کا خاندان خواہش مند ہے کہ میں اس کے بالوں میں مصنوعی بال (یعنی وگ) جوڑ دو۔ اب کیا میں مصنوعی بال لگا سکتی ہوں؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر مصنوعی بال لگانے اور لگوانے والی پر لعنت کی۔“

مندرجہ بالا صحیح احادیث سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ مصنوعی بال لگوانے ناجائز و ممنوع ہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی عورت کو بھی وگ لگانے کی اجازت نہیں دی جس کے بال بیماری کی وجہ سے گر گئے تھے حالانکہ اس عورت کا خاندان بھی خواہش مند تھا کہ وہ وگ استعمال کرے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا کام کرنے والے پر لعنت کی۔

ظاہر ہے عورتوں کے لیے سر کے بال زینت ہیں اور محرم کے سامنے اظہار زینت ایک فطری تقاضا ہے اور اسلام محرم افراد کے سامنے اس کی اجازت بھی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جعلی اور مصنوعی بال استعمال کرنے پر سخت وعید ہے۔ جب عورت کو اس کی اجازت نہیں تو مرد کو وگ استعمال کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس حرمت کا اطلاق مردوں پر بالادلی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے یہود کا عمل قرار دیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

« قَدِمَ مُعَاوِيَةُ الْمَدِينَةَ آخِرَ قَدَمَةٍ قَدِمَهَا فَحَطَبْنَا فَأَخْرَجَ كُبَّةً مِنْ شَعْرٍ قَالَ مَا كُنْتُ أَرَى أَحَدًا يَفْعَلُ هَذَا غَيْرَ الْيَهُودِ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمَاهُ الزُّورَ يَعْنِي الْوَأَصِلَةَ فِي الشَّعْرِ » [بخاری، کتاب اللباس: باب وصل الشعر (۵۹۳۸)]

”امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آخری مرتبہ مدینہ تشریف لائے تو ہمیں خطبہ دیا اور بالوں کا ایک گچھا نکال کر فرمایا: ”میں نہیں سمجھتا کہ یہودیوں کے علاوہ اور کوئی یہ فیشن کرتا ہوگا، نبی کریم رضی اللہ عنہ نے اسے زور (جھوٹ) سے تعبیر فرمایا یعنی بال جوڑنا۔“

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ وگ لگانا یہود کا کام تھا اور آج بھی ہے لہذا مسلمان مرد ہوں یا عورتیں انہیں وگ لگانے سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔ امام ابن قدامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”حدیث میں ذکر کردہ خصلتیں حرام ہیں، اس لیے کہ نبی کریم رضی اللہ عنہ نے ان کے عامل پر لعنت کی اور مباح کام سرانجام دینے والے کو لعنت کرنا جائز نہیں۔“ [المغنی لابن قدامة (۱۲۹/۱)]

یعنی وگ وغیرہ لگانا حرام ہے کیونکہ وگ لگانے پر شرع میں لعنت وارد ہوئی ہے۔ امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ هَذِهِ الْأَحَادِيثُ صَرِيحَةٌ فِي تَحْرِيمِ الْوَصْلِ وَ لَعْنِ الْوَأَصِلَةِ وَالْمُسْتَوْصِلَةِ مُطْلَقًا وَ هَذَا هُوَ الظَّاهِرُ الْمُخْتَارُ“ [شرح مسلم للنووي (۸۷/۱۴)]

”یہ احادیث وگ کی حرمت اور وگ لگانے اور لگوانے والی پر لعنت میں مطلق طور پر واضح ہیں اور یہی مذہب ظاہر و مختار ہے۔“

قاضی عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” فَقَالَ مَالِكٌ وَ الطَّبْرِيُّ وَ كَثِيرُونَ أَوْ الْأَكْثَرُونَ الْوَصْلُ مَمْنُوعٌ بِكُلِّ شَيْءٍ سِوَاءَ وَصَلْتُهُ بِشَعْرٍ أَوْ صُوفٍ أَوْ خَرِقٍ وَ اِحْتَجُّوا بِحَدِيثِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ ذَكَرَهُ مُسْلِمٌ بَعْدَ هَذَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَجَرَ أَنْ تَصِلَ الْمَرْأَةُ بِرَأْسِهَا شَيْئًا“ [شرح مسلم للنووي (۸۸/۱۴)]

السراج الوهاج (۳۰۶/۲)

”امام مالک، امام طبری اور دیگر بہت سے ائمہ دین رضی اللہ عنہم نے فرمایا: ”بالوں کو ہلکی بھی چیز کے ساتھ جوڑنا منع ہے خواہ انہیں دیگر بالوں، اون یا کپڑے کے ساتھ جوڑا جائے اور ان ائمہ نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے امام مسلم رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد ذکر کیا ہے کہ نبی کریم رضی اللہ عنہ نے عورت کو اس بات سے ڈانٹا ہے کہ وہ اپنے سر کے (بالوں) کے ساتھ کسی اور چیز کو جوڑے۔“

امام نووی رضی اللہ عنہ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

”اس حدیث میں یہ بات ہے کہ وگ لگانا حرام ہے خواہ وہ معذور کے لیے ہو یا دلہن کے لیے یا ان دونوں کے علاوہ کے لیے۔“

نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد فرماتے ہیں: ”یہی بات برحق ہے۔“ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ حُجَّةٌ لِمَنْ قَالَ يَحْرُمُ الْوَصْلُ فِي الشَّعْرِ وَالْوَشْمِ.....“ [فتح الباری (۱۰/۳۷۷)]

”اس حدیث میں ایسے آدمی کے لیے دلیل ہے جو کہتا ہے کہ بالوں میں وگ لگانا، جسم گود کر نیل بھرنا اور چہرے کے بال نوچنا قائل اور مفعول دونوں پر حرام ہے اور یہ ان لوگوں پر حجت ہے جو اس ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کرتے ہیں، اس لیے کہ لفظ ”لعن“ کی دلالت حرمت پر قوی ترین دلائل میں سے ہے بلکہ بعض کے نزدیک کبیرہ گناہوں کی علامت میں سے ہے۔“

مندرجہ بالا صحیح احادیث اور ائمہ محدثین کی تشریحات سے واضح ہوا کہ مصنوعی بال لگانا ممنوع و حرام ہے اور یہود کی عادات میں سے ہے، مرد و زن اس حکم میں برابر ہیں۔ سنجے پن کو ختم کرنے کے لیے صحیح علاج کرایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے لیے دوا و علاج رکھا ہے۔ اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« آتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ كَانَتْما عَلَيَّ رُءُوسِهِمُ الطَّيْرُ فَسَلَّمْتُ ثُمَّ قَعَدْتُ فَحَاءَ الْأَعْرَابِ مِنْ هَهْنَا وَ هَهْنَا فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! ائْتَدَاوِي؟ فَقَالَ تَدَاوُوا فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ دَوَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ: اللَّهُمَّ! [ابوداؤد، كتاب الطب: باب في الرجل يتداوى (۳۸۵۵)، ترمذی (۲۰۳۸)، ابن ماجه (۳۴۳۶)]

”میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے (جم کر بیٹھے) تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ میں نے سلام کیا پھر بیٹھ گیا، دیہاتی لوگ ادھر ادھر سے آئے تو انھوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیا ہم علاج کریں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”علاج کرو یقیناً اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی مگر اس کے لیے دوا بھی اتاری ہے، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھا پا ہے۔“

معلوم ہوا کہ ہر مرض کا علاج موجود ہے، لہذا سنجے پن کا علاج کرایا جاسکتا ہے اور جسم کے کسی جگہ کے بال اتار کر سر پر لگانے سے اگر بال اگ آتے ہیں تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

بہن بھائیوں کا ایک بستر میں سونا

سوال کیا اسلام دس سال کی عمر کے بعد بچوں کے بستر الگ کر دینے کی ہدایت کرتا ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو خود گناہ کے کاموں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں ان کے بچوں کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ [التحریم: ۶]

”اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جس کے اوپر انتہائی مضبوط فرشتے مقرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو انہیں حکم کرتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو خطاب کرتے ہوئے جہاں انہیں خود جہنم سے بچنے کا حکم دیا ہے وہاں انہیں اپنے گھر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ لہذا والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی ہر حرکت سے بچانے کی کوشش کریں جو اسلام کے منافی ہو۔ اسلام نے بچوں کو شر سے بچانے کے لیے کئی ایک اقدامات کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بچہ جب دس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے الگ بستر دیا جائے تاکہ وہ ابتدا ہی سے شیطانی حرکات سے محفوظ رہے۔ رسول مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ» [ابوداؤد، کتاب الصلاة: باب متى یومر الغلام بالصلاة (۴۹۵)، ابن ابی شیبہ (۱/۱۳۷)، دارقطنی (۸۵)، مستدرک حاکم (۱/۱۹۷)، بیہقی (۲/۸۴)، مسند احمد (۲/۱۸۷)، شرح السنة (۵۰۵)]

”اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوں اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کے ترک کرنے پر سزا دو اور ان کے بستر الگ کر دو۔“
علامہ محمود محمد ﷺ سنن ابی داؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں:

«وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ أَى الْمَرَاقِدِ لِأَنَّهُمْ إِذَا بَلَغُوا عَشْرَ سِنِينَ يَقْرُبُونَ مِنْ أَدْنَى حَدِّ الْبُلُوغِ فَتَكْثُرُ شَهْوَاتُهُمْ فَيَحَافُ عَلَيْهِمُ الْفَسَادَ وَفِي هَذَا دَلَالَةٌ عَلَى أَنَّهُ يَجِبُ عَلَى الْوَالِي أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ الصَّبِيَّانِ فِي الْمَضَاجِعِ وَ لَوْ كَانُوا إِخْوَةً وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ» [المنهل اعذب المورود (۴/۱۲۲)]

”ان کے بستر جدا جدا کر دو کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سونے کی جگہیں الگ الگ بناؤ۔ اس لیے کہ جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو بلوغت کی ادنیٰ حد کے قریب ہو جاتے ہیں، ان کی شہوت زیادہ ہو جاتی ہے اور ان پر فساد و خرابی کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ولی پر واجب ہے کہ وہ بچوں کے درمیان سونے کی جگہوں میں تفریق ڈال دے اگرچہ وہ بھائی ہی کیوں نہ ہوں جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں۔“
علامہ مناوی جامع الصغیر کی شرح میں فرماتے ہیں:

«أَى فَرَّقُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِي مَضَاجِعِهِمُ الَّتِي يَنَامُونَ فِيهَا إِذَا بَلَغُوا عَشْرًا حَدْرًا مِنْ غَوَائِلِ

الشَّهْوَةَ وَإِنْ كُنَّ أَحْوَابٍ“ [فتح القدیر شرح الجامع الصغیر بحوالہ عن المعبود (۱/۱۵۸)]
 ”بستر جہاں وہ سوتے ہیں جدا جدا کر دو، شہوت کی مصیبتوں سے ڈرتے ہوئے اگرچہ دو بہنیں ہی ہوں۔“
 امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے السنن الکبریٰ میں یہ باب قائم کیا ہے:

”بَابُ مَا عَلَى الْآبَاءِ وَالْأُمَّهَاتِ مِنْ تَعْلِيمِ الصِّبْيَانِ أَمْرَ الطَّهَارَةِ وَالصَّلَاةِ“
 ”والدین پر بچوں کی تعلیم میں پاکیزگی اور نماز سے جو لازم ہے۔“

اس کے تحت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی قوی سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے:

« حَافِظُوا عَلَيَّ أَبْنَاءَكُمْ فِي الصَّلَاةِ ثُمَّ تَعَوَّدُوا الْخَيْرَ فَإِنَّمَا الْخَيْرُ بِالْعَادَةِ » [بیہقی (۳/۸۴)]

”اپنے بچوں کی نماز کی حفاظت کرو، پھر انہیں خیر کی عادت ڈالو، اس لیے کہ خیر عادت کے ذریعے آتی ہے۔“

مراد یہ ہے کہ جب تم بچوں کو نیکی و بھلائی کی عادت ڈالو گے تو یہ نیکی و بھلائی ان میں مستقل قائم ہوگی کیونکہ جب کسی کام کی عادت پڑ جاتی ہے تو انسان اس کو جلدی ترک نہیں کرتا۔ اس لیے بچوں کو ابتدا ہی سے اچھی باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ وہ نماز، روزہ، تقویٰ، پرہیزگاری اور اخلاق حسنہ کے ابتدا ہی سے عادی ہو جائیں اور شر سے بچے رہیں۔ اسی کے پیش نظر شریعت اسلامیہ بچوں کو دس سال کی عمر ہی سے الگ الگ بستروں میں سونے کی ہدایت کرتی ہے تاکہ وہ اخلاق رذیلہ اور بری عادات میں ملوث نہ ہوں۔ ہمیں اس بات کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM



وراثت کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

جائداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ

(سوال) جائداد کی اولاد میں شرعی تقسیم کے متعلق وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں؟

(جواب) انسان کی جائداد کی تقسیم دو اقسام پر ہے: اولاً: اپنی زندگی میں۔ ثانیاً: مرنے کے بعد۔

پہلی صورت میں آدمی اپنی اولاد کو جو جائداد تقسیم کرتا ہے اسے وراثت نہیں بلکہ ہبہ کرنا یا عطیہ دینا کہا جاتا ہے اور دوسری صورت میں جو مال چھوڑا جاتا ہے اسے ورثہ یا ترکہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں جائداد کی تقسیم کا اللہ تعالیٰ نے اصول و قاعدہ ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ ہے:

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ مِثْلِ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ﴾ [النساء: ۱۱]

”لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا۔“

جب کہ پہلی صورت میں اولاد کے درمیان برابری اور مساوات ہوگی: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ﴾ والا قاعدہ جاری نہیں ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَ إِذَا أُعْطِيَ بَعْضُ وَلَدِهِ شَيْئًا لَمْ يَحْزُ حَتَّى يَعْدِلَ بَيْنَهُمْ وَيُعْطِيَ الْآخَرَ مِثْلَهُ“ [بخاری، کتاب الہبۃ:

باب الہبۃ للولد]

”جب کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کوئی چیز عطا کرے تو یہ اس کے لیے اتنی دیر تک جائز نہیں جب تک وہ ساری اولاد کے درمیان عدل نہ کرے اور دوسرے کو بھی اس کی مثل دے۔“

اس کی دلیل امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث پیش کی ہے:

«عَنْ عَامِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ أَعْطَانِي أَبِي عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا أَرْضِي حَتَّى تُشْهَدَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنِّي أُعْطِيتُ ابْنِي مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَأَمَرْتَنِي أَنْ أُشْهَدَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ أَعْطِيتُ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هَذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ» [بخاری، کتاب الہبۃ: باب الإِشْهَادِ فِي الْهَبَةِ

[۲۰۸۷]

”عاصم نے کہا: ”میں نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو منبر پر کہتے ہوئے سنا: ”میرے باپ نے مجھے عطیہ دیا تو عمرہ بنت رواحہ نے کہا: ”میں اتنی دیر تک راضی نہیں تھی کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنا لے۔“ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے عمرہ بنت رواحہ میں سے اپنے ایک بیٹے کو عطیہ دیا ہے، اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اس پر گواہ بنا لوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو نے اپنی ساری اولاد کو اسی طرح عطیہ دیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔“ تو وہ واپس لوٹے اور اپنا عطیہ واپس لے لیا۔“ [شرح نووی (۱۱/۵۳)]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ قَدْ تَمَسَّكَ بِهِ مَنْ أَوْجَبَ التَّسْوِيَةَ فِي عَطِيَّةِ الْأَوْلَادِ وَ بِهِ صَرَّحَ الْبُخَارِيُّ وَ هُوَ قَوْلُ طَاوُسٍ وَ الثَّوْرِيِّ وَ أَحْمَدَ وَ إِسْحَاقَ وَ قَالَ بِهِ بَعْضُ الْمَالِكِيِّينَ“ [فتح الباری (۵/۲۱۴)]

”جن لوگوں نے اولاد کے درمیان عطیہ کی مساوات کو واجب قرار دیا ہے انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے اور یہی قول طاووس، سفیان ثوری، احمد، اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض مالکیہ کا ہے۔“

عطیہ کی تقسیم کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ان محدثین کے موقف کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”لَا فَرْقَ بَيْنَ الذَّكَرِ وَ الْأُنْثَى وَ ظَاهِرُ الْأَمْرِ بِالتَّسْوِيَةِ يُشْهَدُ لَهُمْ وَ اسْتَأْنَسُوا بِحَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهُ سَوَوَا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُمْ مُفْضِلًا أَحَدًا لَفَضَلْتُمُ النِّسَاءَ أَخْرَجَهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ وَ الْبَيْهَقِيُّ مِنْ طَرِيقِهِ وَ اسْنَادُهُ حَسَنٌ“ [فتح الباری (۵/۲۱۴)]

”عطیہ کی تقسیم میں مذکر و مؤنث کے درمیان کوئی فرق نہیں اور حدیث میں جو مساوات کا حکم ہے اس کا ظاہر بھی اس بات پر شاہد ہے اور انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث سے بھی دلیل پکڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عطیہ کے متعلق اپنی اولاد میں برابری کرو، اگر میں کسی کو ترجیح دینے والا ہوتا تو عورتوں کو دیتا۔“ اسے سعید بن منصور نے نکالا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔“

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اگر آدمی اپنی اولاد کے درمیان کسی نزاع یا جھگڑے کے خدشے کے پیش نظر یا ویسے ہی اپنی جائداد اپنی زندگی میں تقسیم کرنا چاہے تو اس پر اولاد کے درمیان عدل و انصاف لازم ہے، جتنا حصہ لڑکے کو دے اتنا ہی لڑکی کو دے، اسے شریعت کی اصطلاح میں بہہ یا عطیہ کہتے ہیں۔ اگر اولاد کے درمیان عدل سے کام نہیں لے گا تو گناہ گار ہوگا اور اگر اس نے اپنی کسی اولاد کو کچھ دیا ہے اور دوسروں کو نہیں دیا تو والد کو ایسا بہہ یا عطیہ واپس لے لینا چاہیے اور اگر دنیا سے رخصت ہو گیا اور کچھ مال چھوڑ گیا تو اسے ترک اور وراثت کہا جاتا ہے، اس کی تقسیم قانون وراثت کے تحت ہوگی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

زندگی میں وراثت کی تقسیم

(سوال) اگر کوئی شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد اپنی اولاد میں بانٹنا چاہے تو کیا ایسا کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے؟
(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ فَإِنَّ نِسَاءً فَوْقَ أُنثَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ﴾ [النساء: ۱۱]

”اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کے لیے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی حصہ ہے جو میت نے چھوڑا ہے۔“
ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴾ [النساء: ۷]

”مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو والدین اور سب سے زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی والدین اور سب سے زیادہ قریبی رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے مال میں سے حصہ ہے، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ حصہ (اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے) مقرر فرمایا ہے۔“

ان آیات میں الفاظ ”مَا تَرَكَ“ اور ”مِمَّا تَرَكَ“ موجود ہیں جو حقیقت میں موت کے بعد چھوڑے ہوئے مال پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح وراثت اور میراث کے الفاظ بھی اختتام زندگی پر دلالت کرتے ہیں لہذا ان دلائل کی رو سے انسان اپنے مال کو اپنی اولاد یا دیگر رشتہ داروں میں وراثت کے طور پر تقسیم نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اس طرح جائداد تقسیم کر دیتا ہے تو وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔ ہاں اپنے مال میں سے کچھ حصہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو عطیہ یا ہبہ کے طور پر دیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

وراثت میں انصاف کا مسئلہ

(سوال) کیا وراثت میں لڑکی کو لڑکے سے نصف حصہ دینا غیر منصفانہ قانون ہے؟

(جواب) دور حاضر میں یہود و نصاریٰ مسلمانان عالم کو صراط مستقیم سے ہٹانے کے لیے آئے روز گمراہ کن اور شرانگیز نعرے بلند کر رہے ہیں۔ ان نعروں میں آزادی نسواں، مساوات مرد و زن، منصوبہ بندی، انسانی آبادی کی فلاح و بہبود وغیرہ کی آڑ لے کر شیطانی تہذیب کے دلدادہ ہمہ تن مصروف عمل ہیں تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل اور خواتین کو ہدف بنا کر گھر گھر اللہ تعالیٰ اور

رسول اللہ ﷺ کی بغاوت کو عام کر دیا جائے۔ مغربی تہذیب کی آشوب سامانیوں کو عام کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو بھر پور استعمال کیا جا رہا ہے اور دانشوران سو، حجر اور وکلا قسم کے لوگ بھی اس کارِ شر میں نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ ان وکلا اور دانشوران سونے مستشرقین کے زیر تربیت اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی یہود و ہنود کی زبان بولتے ہیں اور رب العالمین کے مبنی بر انصاف احکامات پر دشنام طرازیوں اور زبان طعن دراز کرتے ہیں اور اپنے آپ کو احکم الحاکمین کی بہ نسبت مخلوق کا زیادہ خیر خواہ قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے عورت کو جس قدر حقوق دیے ہیں اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں ناممکن ہے۔ اسلام سے قبل عورت کو جس ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ [النحل: ۵۸، ۵۹]

”اور ان میں سے جب کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے۔ اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، سوچتا ہے کیا اس ذلت کو لیے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے؟ کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں؟“

اس آیت کریمہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام سے قبل عورت تعمر ذلت میں گری ہوئی تھی۔ اسلام نے اسے عزت و وقار اور عفت و عصمت کا حسین لبادہ پہنایا اور اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے اعتبار سے بہت سے حقوق عطا کیے۔ اسے ذلت و نامرادی سے نکال کر احترام و وقار کی وادی میں داخل کر دیا۔ لیکن مغربی اقوام اور مغرب زدہ بے راہ رو افراد کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ انھوں نے حقوق نسواں کے نام سے اسے حجاب اسلامی سے نکال کر سر بازار عریاں کر دیا۔ سیکولر اور لبرل معاشرے کے افراد نے عورت کے ان حقوق کو جو اسے اسلام نے عطا کیے، ہدف تنقید بنایا۔ معترضین نے عورت کی سربراہی، مردوں کے ساتھ اختلاط، معاشی و معاشرتی زندگی میں آزادانہ ماحول، دیت و شہادت، حجاب و ستر اور وراثت کے احکام کو اچھالا اور فضول و لایعنی قسم کے اعتراضات کیے اور انھیں ظلم و ناانصافی سے تعبیر کیا۔

حالانکہ ایسے افراد نے ہمیشہ عورت کو اس کے اصلی حقوق سے محروم رکھا ہے بالخصوص وراثت کے احکام کو بہت زیادہ پامال کیا ہے، اسلام سے قبل عورت وراثت سے بالکل محروم تھی۔ ان کے ہاں یہ تصور تھا کہ عورت نہ تو جنگ میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ اپنے خاندانی افراد کا تحفظ و دفاع کر سکتی ہے لہذا وہ خاندان کی دولت کی وارث کیسے بن سکتی ہے؟ امام سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور امام قنبلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”كَانَ الْمُشْرِكُونَ يَجْعَلُونَ الْمَالَ لِلرِّجَالِ الْكِبَارِ وَلَا يُورَثُونَ النِّسَاءَ وَلَا الْأَطْفَالَ شَيْئًا فَأَنْزَلَ اللَّهُ لِلرِّجَالِ نَصِيبًا مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا“

”مشرکین مال بڑے مردوں کے لیے مقرر کرتے تھے، عورتوں اور بچوں کو وراثت میں سے کچھ نہیں دیتے تھے تو اللہ

تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: ”مردوں کے لیے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ قبل از اسلام عورت وراثت سے محروم تھی تو اسلام نے آ کر عورت کو حق وراثت دلایا اور مختلف اعتبارات سے اس کے حقوق کو مقرر فرما دیا۔ یہود و نصاریٰ نے بھی عورت کے اس مسئلے میں بے انصافی سے کام لیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں عورت کا حق وراثت ہے لیکن عورت کے لیے اپنے ہی خاندان میں شادی کا حکم لگا کر عملاً اس حق کو ختم ہی کر دیا ہے جیسا کہ پرانے عہد نامہ میں کتاب گنتی باب: ۳۶ آیت ۶-۷-۸ میں ہے:

”سو صاف داد کی بیٹیوں کے حق میں خداوند کا حکم یہ ہے کہ وہ جنھیں پسند کریں انہی سے بیاہ کریں، لیکن اپنے باپ دادا کے قبیلہ ہی کے خاندانوں میں بیاہی جائیں۔ یوں بنی اسرائیل کی میراث ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں نہیں جانے پائے گی کیونکہ ہر اسرائیلی کو اپنے باپ دادا کے قبیلے کی میراث کو اپنے قبضے میں رکھنا ہوگا۔“

بائبل کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے عورت کے اوپر اپنے ہی خاندان میں نکاح کی پابندی لگا کر اسے خود آزادی اور وراثت کے اصل قانون سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن ان کے پروردہ حضرات جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے نابلد اور نا آشنا ہیں، وہ اسلام کے عدل و انصاف پر مبنی قوانین و احکام پر معترض ہوتے ہیں۔ حالانکہ ذات باری تعالیٰ عادل و منصف ہے اور عدل و انصاف کرنے والوں کو پسند کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی قانون بھی ظلم و تعدی پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام نے وراثت کے بارے میں جتنے قوانین ذکر کیے ہیں تمام عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کا حق ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ﴾ [النساء: ۱۱]

”اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے تقسیم وراثت کا ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی آدمی فوت ہو جائے تو اس کے ورثا میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو تقسیم اس طرح ہوگی کہ جتنا حصہ دو لڑکیوں کو ملے گا اتنا حصہ اکیلے ایک لڑکے کا ہو گا۔ یہ تقسیم مبنی بر انصاف ہے، اس میں ظلم و تعدی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔

اسلام کے خاندانی نظام میں معیشت کی تمام تر ذمہ داری مرد کے کندھوں پر ہے، عورت کو نظام معیشت سے فارغ رکھا ہے اور مرد کو اس کا کفیل بنایا ہے۔ مرد پر عورت کے علاوہ اس کے بچوں، بوڑھے والدین اور دیگر ضروریات کا بھی بوجھ ہے بلکہ حق مہر کی صورت میں بھی عورت کے پاس مال آتا ہے اور اس کی ادائیگی بھی مرد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں عورت اپنے باپ، بھائی، خاوند اور بیٹے سے بھی حق وراثت پاتی ہے مگر اس کا اپنا خرچ بھی اس کے ذمہ نہیں۔ اس کو جو مال وراثت میں حاصل ہوتا ہے وہ اس کے پاس محفوظ ہے، چاہے اسے کاروبار میں لگائے یا جمع کر کے رکھ چھوڑے۔ غرض جیسے چاہے اس مال میں تصرف کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مرد کو عورت کی نسبت دگنا مال دیا ہے اور اگر عورت کا حصہ نصف کی بجائے مرد کے برابر ہوتا تو یہ مرد

پر ظلم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ظلم نہیں کیا کیونکہ وہ عادل و منصف ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم و علیم بھی ہے، اس کے فیصلے درست ہوتے ہیں، جن میں ذرہ برابر بھی ظلم و نا انصافی کو دخل نہیں ہوتا۔

اگر دونوں کا وراثت میں حصہ برابر ہوتا تو عورت کی بجائے مرد یہ مطالبہ کرتا کہ میرے اوپر معاشی بوجھ اور ذمہ داریاں ہیں عورت کو بھی اس بارگراں میں شریک کیا جائے اور کچھ ذمہ داریاں اس پر ڈال دی جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذمہ داریوں کے تعین کے اعتبار سے اسلام کا نظام وراثت فطری اور منصفانہ ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے یہ وجہ ذکر کی ہے کہ وراثت کا تعلق معاشی ذمہ داری کے ساتھ ہے۔ بیٹا بیٹی کے مقابلے میں باپ کی مالی و معاشی خدمت زیادہ سرانجام دیتا ہے لہذا اس کو باپ کے ترکے میں سے بھی زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ اسلام کے نظام وراثت میں بعض صورتیں ایسی ہیں کہ مرد اور عورت کو برابر حصہ دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الشُّدُّ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ [النساء: ۱۱]

”میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے اگر اس میت کی اولاد ہو۔“

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ میت کی اولاد کی صورت میں ماں باپ کا حصہ برابر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کا برابر حصہ ذکر کیا ہے اور بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد کی نسبت زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میت کے ورثا میں ایک بیٹی اور دو بھائی ہیں تو ایک بیٹی ترکے کا نصف حصہ لے گی اور باقی نصف دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہوگا۔ اس طرح یہاں میت کے بھائی کے مقابلے میں بیٹی زیادہ حصہ لے رہی ہے، اس لیے کہ وراثت میں زیادہ قریبی رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں وراثت کے معاملے میں عورت سے کہیں بھی ظلم و ستم اور نا انصافی سے کام نہیں لیا گیا۔ کہیں مرنے والے کے ساتھ عورت کو زیادہ قربت کی بنا پر اہمیت دی گئی ہے جب کہ دوسری طرف مرد کی معاشی ذمہ داریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر وراثت میں عورت کا حصہ کہیں کم اور کہیں زیادہ دے کر عدل و مساوات کی مثال قائم کر دی گئی ہے۔

چچا کی موجودگی میں پوتا وارث

(سوال) کیا چچا کی موجودگی میں پوتا وارث بن سکتا ہے؟ قرآن و سنت کی رو سے جواب دیں۔

(جواب) چچا کی موجودگی میں پوتا دادا کی وراثت کا حق دار نہیں بن سکتا۔ اس کی دلیل جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ شریعت اسلامیہ نے جن رشتہ داروں کو اپنے میں سے کسی مرنے والے کا وارث ٹھہرایا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ قرآن و سنت میں معین کر دیا گیا ہے۔ انھیں علم میراث کی اصطلاح میں اصحاب الفروض کہتے ہیں۔

دوسرے وہ ورثا جن کے حصوں کی تعیین قرآن و سنت میں نہیں یعنی جو اصحاب الفروض کی عدم موجودگی میں سارا مال لے لیتے ہیں۔ وہ اصحاب الفروض کی موجودگی میں ان سے بچا ہوا مال لیتے ہیں، انہیں عصبات کہتے ہیں۔ بھائی اور پوتا بھی میت کے ان ورثا میں سے ہیں جن کا حصہ معین نہیں ہے۔ تو عصبات میں مال کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ ان اصحاب الفروض کو ان کا مقرر کردہ حصہ دے دینے کے بعد اگر ترکہ میں کچھ باقی ہے تو وہ عصبات کے ان مردوں کو دیا جائے گا جو میت کے زیادہ قریب ہوں اور دور کے تعلق والے محروم رہیں گے۔ اس کی دلیل صحیحین کی حدیث ہے جو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْحَقُّوْا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلَى رَجُلٍ ذَكَرَ» [بخاری، کتاب الفرائض: باب میراث الولد من ابیہ وامہ (۶۷۳۲)]

”مقرر کردہ ان کے مستحقین کو دو اور جو باقی بچ جائے پس وہ اس آدمی کے لیے ہے جو میت کا زیادہ قریبی ہے۔“
رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان واضح کرتا ہے کہ اصحاب الفروض کے مقررہ حصے پورے کر دینے کے بعد جو باقی بچے وہ مرد عصبات میں سے سب سے قریبی کے لیے ہے، کوئی دور والا اس کے ساتھ شریک نہیں ہوگا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

”وَ قَدْ أَجْمَعَ الْمُسْلِمُونَ عَلَى أَنَّ مَا بَقِيَ بَعْدَ الْفُرُوضِ فَهُوَ لِلْعَصَبَاتِ يُقَدَّمُ الْأَقْرَبُ

فَالْأَقْرَبُ فَلَا يَرِثُ عَاصِبٌ بَعِيدٌ مَعَ وَجُودِ قَرِيبٍ“ [شرح نووی (۱۱/۵۳)]

”مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جو اصحاب الفروض کو دینے کے بعد بچ جائے، وہ عصبات کے لیے زیادہ قریبی کو مقدم کیا جائے گا، دور کا عصبہ رشتہ دار قریبی عصبہ کی موجودگی میں وارث نہیں بن سکتا۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں باب قائم کیا ہے:

”بَابُ مِيرَاثِ ابْنِ الْأَبْنِ إِذَا لَمْ يَكُنْ ابْنُ آخَرٍ“

اس کے تحت فرماتے ہیں:

”وَ لَا يَرِثُ وَ لَكِنَّ الْأَبْنَ مَعَ الْأَبْنِ“ [بخاری، کتاب الفرائض (قبل الحدیث / ۶۷۳۵)]

”بیٹے کے ہوتے ہوئے بیٹے کی اولاد وارث نہیں بن سکتی (وہ اولاد میت کے کسی بھی زندہ یا فوت شدہ بیٹے کی ہو)۔“

وارث کے لیے وصیت کرنا

(سوال) کیا وارث کے لیے وصیت کرنا جائز ہے؟

(جواب) میت کی جانب سے اگر کوئی وصیت ہو یا قرض ہو تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِيُ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ﴾ [النساء: ۱۱]

” (مفروضہ حصص اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو، پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر واجب ہو، ادا کر دیا جائے۔“

یہ بھی یاد رہے کہ وصیت غیر وارث کے حق میں زیادہ سے زیادہ ایک تہائی تک کی جاسکتی ہے۔ وارث کے لیے وصیت کرنا درست نہیں، اس لیے کہ ورثا کے حصص اللہ وحدہ لا شریک لہ نے متعین کر دیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« أَلَا إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ وَ لَا يَجُوزُ وَصِيَّةٌ لِوَارِثٍ » [دارمی، کتاب الوصایا: باب الوصیة للوارث (۳۲۶۲)]

”خبردار! یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے، وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔“

اولاد کو عاق کرنا

(سوال) کیا نافرمان اولاد کو وراثت سے محروم (عاق) کیا جاسکتا ہے؟

(جواب) انسان کی جائداد جو وفات کے بعد تقسیم کی جاتی ہے، اسے وراثت یا ترکہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو وہ اپنی زندگی میں تقسیم کرتا ہے، اسے ہبہ کہا جاتا ہے۔ وراثت سے محرومی نافرمانی کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ وراثت سے محرومی یا تو باپ اور بیٹے کے ادیان مختلف ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتَّى » [ابوداؤد، کتاب الفرائض: باب هل يرث المسلم الكافر (۲۹۱۱)، مسند احمد (۱۷۸/۲)، ابن ماجہ (۲۷۳۱)، دارقطنی (۷۵/۴)، شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۶۶۸)]

”دو مختلف دینوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔“

سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَ لَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ » [بخاری، کتاب الفرائض: باب لا يرث المسلم الكافر (۶۷۶۴)، مسلم (۱۶۱۴)، موطا مالك (۵۱۹/۲)، مسند طرابلسی (۱۴۳۵)، مسند احمد (۲۰۰/۵)، دارمی (۳۷۰/۲)، ابوداؤد (۲۹۰۹)، ترمذی (۲۱۰۷)، ابن ماجہ (۲۷۲۹)، دارقطنی (۶۱/۴)، بیہقی (۲۱۷/۶)]

”مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بنتا۔“

اسی طرح قاتل مقتول کا وارث نہیں بنتے گا۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا » [ابوداؤد، کتاب الدیات: باب دیات الأعضاء (۴۵۶۴)، نسائی (۴۲/۸)]

”قاتل کسی بھی چیز کا وارث نہیں بنتے گا۔“

امام ابن عبد البر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو قوی کہا ہے اور علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۶۷۱)]

نافرمان اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کی کوئی دلیل راقم کے علم میں نہیں۔ یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کی خدمت کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے اور نافرمان اولاد کو وعظ و نصیحت اور مختلف مناسب حال احکام سے سمجھانا چاہیے تاکہ اولاد نافرمانی سے باز رہے اور جو مال وہ اپنی اولاد میں خود تقسیم کرے اس میں انصاف لازم ہے۔ اگر ایک یا دو بیٹوں کو کچھ مال دیا ہے تو باقی اولاد کو بھی اسی طرح دے وگرنہ پہلوں سے بھی واپس لے لے۔ جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے انھیں ایک غلام دیا پھر جب معاملہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم نے اس کی مثل اپنی ساری اولاد کو دیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کو واپس لے لو۔“

[بخاری، کتاب الہبۃ: باب الہبۃ للولد (۲۵۸۶)، مسلم (۱۶۲۳)]

مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« لَا تَشْهَدْنِي عَلَى جَوْرِ إِنْ لِبَيْنِكَ عَلَيَّكَ مِنَ الْحَقِّ أَنْ تَعْدِلَ بَيْنَهُمْ » [مسند احمد (۴/۲۶۸)]

”تم مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ بلاشبہ تیری اولاد کا تیرے اد پر حق ہے کہ تو ان کے درمیان عدل سے کام لے۔“

مذکورہ بالا حدیث سے واضح ہو گیا کہ والد اپنی زندگی میں جو عطیات اپنی اولاد کو دے گا وہ سب میں برابر عدل و انصاف سے تقسیم کرے گا۔ بعض اولاد کو محروم کرنا اور بعض کو دینا ظلم ہے۔ ایسے قضیے اور معاملے پر رسول اللہ ﷺ نے شہادت و گواہی نہیں دی۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہمیں اپنی اولاد کی تربیت ابتدا ہی سے صحیح منج پر کرنی چاہیے تاکہ وہ بڑے ہو کر والدین کے فرمانبردار بن سکیں اور والدین کو پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔



حدود کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

زنا کی حد

(سوال) شریعت میں زنا کی حد کیا ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے جرائم کے اختتام کے لیے قرآن مجید میں مختلف جرائم کے اعتبار سے مختلف سزاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح جب مرد و زن آپس میں برا فعل سرانجام دیتے ہیں اور زنا جیسے نفس و قبیح فعل کا ارتکاب کر لیتے ہیں تو شریعت نے ان کے لیے جو سزا تجویز کی ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شادی شدہ مرد و زن زنا کر لیں تو ان کو رجم کیا جائے گا اور اگر وہ غیر شادی شدہ ہوں تو انھیں سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيْشُهُذَّ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [النور: ٢]

”زنا کا مرد و زن میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، ان پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہیں کھانا چاہیے اگر تمہارا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہے اور ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے۔“

تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت عام مخصوص منہ البعض ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام نہیں کہ ہر قسم کے زانی کو سو کوڑے لگائے جائیں بلکہ یہ دیگر شرعی دلائل کی بنا پر خاص ان لوگوں کے متعلق ہے جو کنوارے غیر شادی شدہ ہوں۔ حدیث شریف میں اس کی مزید تفصیل جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اس میں ایک سال کے لیے جلاوطنی بھی مذکور ہے جیسا کہ عنقریب ذکر کیا جائے گا اور جو شادی شدہ ہوں ان کے لیے رجم ہے۔ اسی طرح اگر غلام یا لونڈی جرم زنا کر بیٹھیں تو اس کے لیے پچاس کوڑے ہیں یعنی سو کوڑوں کا نصف جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنْ آتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ [النساء: ٢٥]

”اگر لونڈیاں بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر آزاد عورتوں کی نسبت نصف سزا ہے۔“

لہذا مذکورہ بالا سورہ نور کی آیت کا حکم عام نہیں ہے بلکہ دیگر شرعی دلائل کی بنا پر کنوارے کے لیے خاص ہے۔ شادی شدہ کے لیے جو رجم کی سزا ہے وہ یہ ہے کہ دو آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، ایک نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میرا بیٹا اس

کے ہاں ملازم تھا، وہ اس کی بیوی سے زنا کر بیٹھا ہے۔ میں نے اس کے بدلے ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے پھر میں نے علماء سے دریافت کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے بیٹے پر شرعی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اس کی بیوی پر رجم ہے، لہذا آپ میرے اور اس کے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ فرمادیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

« وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا قُضِيَنَّ بَيْنَكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ الْمِائَةَ شَاةٍ وَالْحَادِمُ رَدُّ عَلَيْكَ وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ وَاعْدُ يَا أُنَيْسُ ! عَلَى امْرَأَةٍ هَذَا فَإِنْ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمَهَا فَاعْتَرَفَتْ فَارْجُمَهَا » [بخاری، کتاب الحدود: باب الاعتراف بالزنا (۶۸۲۷)، موطا (۸۲۲/۲)، مسلم (۱۶۹۷)، ابوداؤد (۴۴۴۰)، نسائی (۲۴۰/۸)، ترمذی (۱۴۳۳)، ابن ماجہ (۲۵۴۹)، دارمی (۹۸/۲)، احمد (۱۱۵/۴)، عبد الرزاق (۱۳۳۰۹)، حمیدی (۸۱۱)، شرح السنة (۲۷۱۰)]

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمہارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور سو بکریاں تجھے واپس دلوا دی جائیں گی اور تیرے لڑکے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اے انیس! تو اس کی بیوی کے پاس جا، اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو سنگسار کر دینا۔“ اس نے اعتراف کر لیا تو اسے رجم کر دیا گیا۔“

مذکورہ بالا صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کنوارا زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ پر رجم یعنی سنگساری کی سزا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا: ”لوگو! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ ﷺ پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور اس میں رجم کی آیت بھی تھی، جس کو ہم نے پڑھا اور یاد رکھا اور عمل کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ فریضہ خداوندی کے ترک کے باعث لوگ گمراہ ہو جائیں۔“ مزید فرمایا:

« آلا وَإِنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ عَلَى مَنْ زَنَى إِذَا أَحْصَنَ وَقَامَتِ الْبَيْتَةُ أَوْ كَانَ الْحَمْلُ أَوْ الْإِعْتِرَافُ آلا وَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ رَجِمَ وَرَجِمْنَا مَعَهُ » [بخاری، کتاب الحدود: باب الاعتراف بالزنا (۶۸۲۹)، مسلم (۱۶۹۱)، ابوداؤد (۴۴۱۸)، ترمذی (۱۴۳۲)، ابن ماجہ (۲۵۵۳)، دارمی (۹۹/۲)، حمیدی (۲۵)، بیہقی (۲۱۱/۸)]

”آگاہ ہو جاؤ بے شک رجم اس آدمی پر جو شادی شدہ ہو اور زنا کا مرتکب ہو حق ہے جب اس پر دلیل قائم ہو جائے یا حمل ٹھہر جائے یا مجرم اعتراف کر لے۔ متنبہ رہو کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔“

اسی حدیث سے معلوم ہوا کہ رجم کی سزا شادی شدہ پر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی نافذ تھی اور خلفاء کے دور میں یہی سزا نافذ العمل تھی۔

مذکورہ بالا آیت اور صحیح و مرفوع احادیث میں صراحتاً یہ بات موجود ہے کہ کنوارا آدمی سو کوڑوں اور ایک سال کی جلا وطنی اور شادی شدہ رجم کا مستحق ہے۔

عمل قوم لوط کی سزا

(سوال) جو شخص قوم لوط والا عمل کرے اس کی سزا کیا ہے؟ کیا اسے معافی مل سکتی ہے یا نہیں؟

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قوم لوط کے اس عمل کو فحش قرار دیا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿ وَ لُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴾ [النمل: ۵۴]

”اور لوط (علیہ السلام) نے جب اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی و فحاشی (کے کام) کیوں کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو۔“

اسی طرح سورہ عنکبوت (۲۸) میں بھی موجود ہے۔ اللہ نے زنا کو بھی فحاشی ہی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْجَ الَّذِي أَنْتُمْ كَانُوا فَاحِشَةً ﴾ [اسراء: ۳۲]

”زنا کے قریب نہ جاؤ یہ فحاشی ہے۔“

معلوم ہوا کہ عمل قوم لوط انتہائی برا اور گندافعل ہے جسے قرآن حکیم میں فحاشی سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں اس کی سزا

قتل ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جسے تم قوم لوط والا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔“ [ابوداؤد، کتاب

الحدود باب فیمن عمل عمل قوم لوط (۴۶۶۲)، ابن الحجارود (۸۲۰)، حاکم (۳۰۱/۴)]

اس حدیث کو حکم، ذہبی، ابن الجارود، ضیاء مقدسی، سیوطی اور علامہ البانی وغیرہم نے صحیح قرار دیا ہے۔

[ارواء الغلیل: (۲۳۵۰)، الحاوی فی الفتاویٰ (۱۱۰/۲)، (۱۱۵)]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا:

”عمل قوم لوط کرنے والے کی حد کیا ہے؟“ تو انھوں نے کہا: ”دیہات میں اونچی عمارت دیکھی جائے اور اس کے اوپر

سے اوندھا گرا دیا جائے پھر اس پر پتھر برسائے جائیں۔“ [ذم اللواط از ہیشم بن خلف الدوری (۴۸)، (۸۲)]

امام ابن القصار اور امام ابن تیمیہ رحمہما نے فرمایا ہے:

”عمل قوم لوط کرنے والے کے قتل پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، اختلاف صرف اس کے قتل کی کیفیت میں ہے۔“

[زاد المعاد (۴۰/۵)، (۴۱)]

حدیث رسول کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔ سید ابو محمد بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ کا اس حدیث پر مفصل مقالہ

”القندیل المشعول لتحقیق حدیث اقتلوا الفاعل والمفعول“ کے نام سے موجود ہے۔ ان دلائل سے واضح ہوتا ہے

کہ باجماع صحابہ ایسا آدمی واجب القتل ہے البتہ عدالت میں مقدمہ پہنچنے سے پہلے اس کے عیب پر اگر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو

اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر وہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے تو معافی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اکثر لوگ ایسا

عمل کرنے والے کو لوطی کہہ دیتے ہیں اور اس غلطی میں خواص و عوام گرفتار ہیں۔

اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کے کام کو عمل قوم لوط کہیں یا پھر اس بستی کی طرف نسبت کریں جس میں یہ فعل واقع ہوتا تھا یعنی اسے سدومی کہہ دیں، لوط علیہ السلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ امید ہے کہ قارئین اس بات کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔

غیر محرم عورت کے ساتھ خلوتِ شبی

(سوال) کیا اجنبی عورت کے ساتھ علیحدگی اختیار کرنا قابل سزا جرم ہے؟

(جواب) شریعت اسلامیہ نے امت مسلمہ کو برائی سے بچانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں تاکہ مسلم معاشرہ انتہائی اعلیٰ اقدار پر مرتب ہو اور ہر طرح کے فتنے سے بچا رہے لیکن شیطانی قوتیں امت مسلمہ کو نقصانات سے دوچار کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ ان کی چالوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں مرد و زن کا اختلاط عام کیا جائے اور اسلامی حد بندی ختم کر دی جائے تاکہ برائی پھیلے۔ کیونکہ غیر محرم مردوں کا غیر محرم عورتوں سے کھلے عام ملنا اور خلوت اختیار کرنا اگر عام ہو جائے تو اس معاشرے میں بہت سی برائیاں جنم لے لیتی ہیں۔ کیونکہ عورت کا فتنہ جس قدر نقصان دہ اور ضرر رساں ہے شاید ہی کوئی اور فتنہ اس قدر نقصان دہ ہو۔ بنی اسرائیل میں تباہی و بربادی کے جو اسباب تھے ان میں سے ایک اہم سبب عورت کا فتنہ ہے۔ یہ جب اپنی حدود (چار دیواری وغیرہ) سے نکل کر زیب و زینت سے آراستہ ہو کر کھلے عام نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں مختلف وساوس پیدا کر کے انہیں اس میں ملوث ہونے پر ابھارتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس فتنے سے بچنے کی تاکید فرمائی۔ صحابی رسول ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الدُّنْيَا حُلُوهٌ حَضْرَةٌ وَإِنَّ اللَّهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَنَظَرٌ كَيْفَ تَعْمَلُونَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةٍ بَيْنِي وَإِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ » [مسلم، کتاب الرقاق: باب اکثر أهل الجنة الفقراء وأكثر أهل النار النساء (۲۷۴۲)، مسند احمد (۲۲/۳)، شرح السنة (۱۲/۹)، بیہقی (۹۱/۷)، مصنف عبد الرزاق (۳۰۵/۱۱)]

”دنیا ٹٹھی ہے اور سرسبز ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنانے والا ہے، وہ دیکھنے والا ہے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو، بے شک بنی اسرائیل کا فتنہ عورتوں سے متعلق تھا۔“

صحابی رسول اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا تَرَكَتُ بَعْدِي فِي النَّاسِ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ » [بخاری، کتاب النکاح: باب ما يتقى من شوم المرأة (۵۰۹۶)، مسلم (۲۷۴۰)، ترمذی (۲۹۴۲)، مسند احمد (۲۰۰/۵)]

”میں نے اپنے بعد لوگوں میں مردوں پر عورتوں سے زیادہ نقصان دہ کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔“

ان دونوں صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں بہت سے فتنے اور آزمائشیں مسلمان پر وارد ہوتی ہیں اور ان آزمائشوں میں سب سے زیادہ آزمائش عورت کے فتنے کی ہے، اگر کوئی مرد عورت کے فتنے سے بچا رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ

لِيَحْلِفَ وَلَا يُسْتَحْلِفَ وَيَشْهَدَ وَلَا يُسْتَشْهَدَ إِلَّا فَمَنْ سَرَّهُ بِحَبْحَةِ الْحَنَةِ فَلْيَلْزِمِ الْجَمَاعَةَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْفِدَىٰ وَهُوَ مِنَ الْإِنْتَيْنِ أَبَعَدَ وَلَا يَخْلُونَ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ ثَالِثُهُمْ وَمَنْ سَرَّهُ حَسَنَتُهُ وَسَاءَ تَهَ سَيِّئَتُهُ فَهُوَ مُؤْمِنٌ» [ترمذی، کتاب الفتن: باب لزوم جماعة المسلمین (۲۱۶۵)، شرح السنة (۲۷/۹)، (۲۲۵۳)، حاکم (۱۱۳/۱)، مسند احمد (۱۸/۱)]

”میرے ساتھیوں کا اکرام کرو پھر ان کے قریب والوں کا، پھر ان کے قریب والوں کا، پھر جھوٹ ظاہر ہو جائے گا یہاں تک کہ آدمی قسم کھائے گا اور (حالانکہ) اس سے قسم طلب نہیں کی جائے گی۔ گواہی دے گا اور اس سے گواہی نہیں مانگی جائے گی۔ خبردار! جسے جنت کا وسط پسند ہو وہ جماعت کو لازم پکڑے، اس لیے کہ اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور وہ دو سے بہت دور ہوتا ہے اور کوئی مرد ہرگز کسی عورت کے ساتھ خلوت اختیار نہ کرے اس لیے کہ ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے، جس شخص کو اس کی نیکی خوش کرے اور برائی بری لگے وہ مومن ہے۔“

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کرنا بالکل منع ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

«خَلْوَةُ الرَّجُلِ بِالْمَرْأَةِ الْأَجْنَبِيَّةِ وَالْمُسَافِرَةِ بِهَا حَرَامٌ فَإِنْ كَانَتْ مِنَ الْمَحَارِمِ فَلَا بَأْسَ بِالْمُسَافِرَةِ بِهَا» [شرح السنة (۲۸/۹)]

”اجنبی عورت سے مرد کا خلوت اختیار کرنا اور اس کیساتھ سفر کرنا حرام ہے اگر عورت محارم سے ہو تو پھر کوئی گناہ نہیں۔“

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«لَا يَخْلُونَ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَةً وَإِنِّي اكْتَتَيْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَكَذَا قَالَ انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ» [مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم الى حج وغيره (۱۳۴۱)، بخاری (۵۲۳۳)، طبرانی کبیر (۳۳۵/۱۱)، مسند احمد (۱۹۳۴، ۳۲۳۱، ۳۲۳۲)]

”کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز خلوت اختیار نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم اور عورت اپنے محرم کے علاوہ سفر نہ کرے۔“ ایک آدمی کھڑا ہوا اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میری بیوی حج کرنے نکلی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں لکھا دیا گیا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو واپس چلا جا اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کر۔“ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِيَّاكُمْ وَالدُّخُولَ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَفَرَأَيْتَ الْحَمُو؟ قَالَ الْحَمُو الْمَوْتُ» [بخاری، کتاب النکاح: باب لا يخلون الرجل بامرأة إلا ذو محرم (۵۲۳۲)، مسلم (۲۱۷۲)، مسند احمد (۱۴۹/۴)، ترمذی (۱۱۷۱)، شرح السنة (۲۲۵۲)]

”عورت پر داخل ہونے سے بچو۔“ ایک انصاری نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! عورت کے مرد کی جانب سے جو رشتہ

دار ہیں (دیور، جیٹھ وغیرہ) ان کے متعلق بتائیں؟“ آپ نے فرمایا: ”وہ (یعنی مو) تو موت ہیں۔“ پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ حج جیسی اہم عبادت کے لیے آپ ﷺ نے عورت کو تنہا جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے اس کے شوہر کو کہا کہ تم خود اس کے ساتھ جا کر حج کرو اور دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے دیور و جیٹھ وغیرہ کو اپنی بھابھی کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے کو موت قرار دیا ہے، جب قریبی رشتہ دار مرد جو غیر محرم ہیں ان سے تنہائی اختیار کرنے سے منع کیا ہے تو دیگر افراد جو اس کے رشتہ دار بھی نہیں، ان کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کرنے بلکہ رات گزارنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا لَا يَبِيْتَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَأَةٍ نَيْبٍ إِلَّا أَنْ يَكُونَ نَاكِحًا أَوْ ذَا مَحْرَمٍ» [مسلم، کتاب السلام: باب تحريم الخلوۃ بالأجنبية والدخول علیها (۲۱۷۱)، تاریخ بغداد (۱۰۹/۸)، التمهيد (۱/۲۲۷)، بیہقی (۹۸/۷)]

”خبردار! کوئی آدمی کسی ثیبہ (شادی شدہ) عورت کے پاس ہرگز رات بسر نہ کرے سوائے خاوند یا محرم کے۔“
امام نووی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

”إِنَّمَا حُصِّصَ الثَّيْبُ لِغَوْنِهَا الَّتِي يُدْخِلُهَا إِلَيْهَا غَالِبًا وَ أَمَّا الْبِكْرُ فَمَصُونَةٌ مُتَّصُونَ فِي الْعَادَةِ مُجَانِبَةٌ لِلرَّجَالِ أَشَدُّ الْمُجَانِبَةِ فَلَمْ يَحْتَجَّ إِلَى ذِكْرِ مَا وَ لَآئِنَّ مِنْ بَابِ التَّنْبِيهِ لِأَنَّهُ إِذَا نُهِىَ عَنِ الثَّيْبِ الَّتِي يَتَسَاهَلُ النَّاسُ فِي الدُّخُولِ عَلَيْهَا فِي الْعَادَةِ فَالْبِكْرُ أَوْلَى“ [شرح مسلم للنووی (۱۹/۱۴)]

”اس حدیث میں ثیبہ (شادی شدہ، مطلقہ، بیوہ) عورت کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اکثر ان عورتوں کے پاس آنا جانا ہوتا تھا اور کنواری لڑکی عادتاً اس سے محفوظ و مامون ہوتی تھی اور مردوں سے اختلاط سے سختی سے بچائی جاتی تھی، اس لیے اس کے ذکر کی حاجت نہیں۔ اس لیے کہ یہ تمبیہ کے باب سے ہے۔ اجماع ثیبہ جس کے پاس آنے سے لوگ تساہل برتتے تھے، کے پاس آنے سے منع کیا گیا تو کنواری لڑکی کے پاس آنا بالادولی منع ہے۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ غیر محرم مرد کو کسی غیر محرم عورت کے ساتھ سفر کرنا، اس کے پاس رات بسر کرنا اور خلوت و تنہائی اختیار کرنا حرام ہے اور ایسے فعل کا مرتکب ہونا واجب التعزیر ہے۔ شریعت اسلامی میں بعض وہ جرائم ہیں جن کی سزا متعین ہے اور بعض وہ ہیں جن کی سزا کا تعین نہیں۔ اول صورت میں حدود کا نفاذ کیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں تعزیر لگائی جاتی ہے۔ فعل حرام کا مرتکب واجب التعزیر ہوتا ہے، دنیا میں اسے سزا دی جاتی ہے جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ وَلَا

تَاتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتُرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْبُؤُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا كَفَّارَةً لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ» [بخاری، کتاب الایمان: باب (۱۸)، مسلم (۱۷۰۹)، نسائی (۱۴۱/۷)، بیہقی (۱۸/۸)، مستدرک حاکم (۳۱۸/۲)]

”میری بیعت اس شرط پر کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے۔ جو بہتان تم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے گھرتے ہو نہ لاؤ گے اور معروف میں نافرمانی نہ کرو گے۔ جس نے تم میں سے وفا کی اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان اشیاء کا مرتکب ہو وہ دنیا میں سزا دیا جائے گا اور وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گا اور جو ان اشیاء کا مرتکب ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔ ہم نے ان شروط پر آپ کی بیعت کر لی۔“

اس حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ «فَعُوقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا» عام ہے جو ہر قسم کے جرم کی سزا کو شامل ہے خواہ وہ حدود سے ہو یا تعزیر سے یا قصاص سے متعلقہ۔ لہذا شرع میں ہر جرم کی سزا ہے تو جو شخص ایسے قبیح افعال کا مرتکب ٹھہرے تو حاکم وقت کو اس پر اس کی سزا جاری کرنی چاہیے۔ ہمارے ملک کے بعض ججوں نے جو یہ بات کہی ہے کہ غیر محرم عورت کے ساتھ خلوت کرنا کوئی جرم نہیں، یہ بالکل غلط ہے اور شرعی علوم سے ناواقفیت، لاعلمی اور عدم تفہیم کا ثبوت ہے۔ ایسے افراد کو جو شرعی علوم سے ناواقف ہوں اور ان کی حالت خلاف شرع ہو، عدالت کی کرسی پر بیٹھانا اسلامی عہدہ قضا کی توہین ہے۔ عدالت کا قاضی و جج وہ ہونا چاہیے جو شرعی علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور اس کی اپنی حالت بھی شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو لیکن انہوں نے ہمارے ملک کا نظام مغربی جمہوریت پر مبنی اور انگریزی قوانین پر مشتمل ہے اور جج حضرات بجائے اس کے کہ قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کریں وہ انگریزی قوانین کو ترجیح دیتے ہوئے ایسے فیصلے سناتے ہیں۔

مرتد کسے کہتے ہیں؟

سوال مرتد کسے کہتے ہیں اور اس کی شرعی سزا کیا ہے؟ قرآن و حدیث سے وضاحت فرمادیں۔

جواب مرتد ام فاعل ہے باب ”إِرْتَدَّ يَرْتَدُّ إِرْتِدَادًا“ سے جس کا لغوی معنی ہے پھرنے والا، پلٹنے والا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ ﴾ [محمد: ۲۵]

”بے شک جو لوگ اپنی پیٹھ کے بل لٹے پھر گئے۔“

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبِغُ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴾ [الكهف: ٦٤]

” (موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا: ”بھی تھا جس کی تلاش میں ہم تھے۔“ چنانچہ وہ دونوں وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس پلٹے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ﴾

[المائدة: ٥٤]

” اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی۔“

مذکورہ بالا تینوں آیات میں ”إِرْتَدَّ، فَارْتَدَّ اور يَرْتَدُّ“ ایک ہی باب کے مختلف صیغے ہیں، جس کا مادہ رَدُّ ہے اور اس کا معنی پھرنا، واپس کرنا وغیرہ ہے اور اصطلاحی طور پر اس کی تعریف یہ ہے:

” ایسا شخص جو اسلام کو اختیار کرنے والا ہو، پھر اس کا کسی قول، فعل، کفریہ عقیدہ یا ضروریات دینیہ میں سے کسی

سے شک کی بنیاد پر دین اسلام سے پھر جانا، مرتد ہونا ہے۔“ [عقوبة الاعدام (ص: ٣٤٩)]

بعض ائمہ نے مرتد کی تعریف یوں کی ہے:

”الرَّاجِعُ عَنِ دِينِ الْإِسْلَامِ إِلَى الْكُفْرِ“ [القاموس الفقہی (ص: ١٤٧)]

”دین اسلام سے کفر کی طرف پلٹنے والا۔“

گویا مرتد ایسا شخص ہے جو اسلام لانے کے بعد واپس کفر کی طرف پلٹ گیا۔ یہ ارتداد اس کے اندر خواہ عقیدہ کی بنا پر پیدا ہوا ہو یا کسی قول، فعل اور شک و شبہ کی بنا پر خواہ سنجیدگی سے واقع ہوا ہو یا مذاق اور ٹھٹھا سے، کیونکہ ارتداد جیسے سنجیدگی سے واقع ہوتا ہے ایسے ہی استہزاء و ہزل، ٹھٹھا و مذاق سے بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ أِبَالَهُ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۗ وَلَا تَعْتَدُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ..... ﴾

[التوبة: ٦٥، ٦٦]

”کہہ دیجیے کیا اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کا رسول ہی تمہارے مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟ تم بھانے نہ بناؤ، یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد کفر کر چکے ہو۔“

مرتد آدمی پکا جہنمی ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ ۖ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ سَبَطْنَا أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ

أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿البقرة: ۲۱۷﴾

”یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑائی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے مرتد کر دیں گے اور تم میں سے جو اپنے دین سے مرتد ہو گیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں غارت ہو جائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔“

مرتد کی دنیوی سزا

سوال مرتد شخص آخرت میں جو عذاب جھیلے گا وہ تو ہے ہی مہربانی فرما کر دنیا میں شریعت نے جو اس کے لیے سزا رکھی ہے اس کی وضاحت فرمادیں؟

جواب دنیا میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَرَقَ قَوْمًا فَبَلَغَ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَقَالَ لَوْ كُنْتُ أَنَا لَمْ أُحْرِقْهُمْ لِأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تُعَذِّبُوا بَعْدَابِ اللَّهِ وَ لَقَتَلْتَهُمْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ» [بخاری، کتاب استتابة المرتدين و المعاندين و قتالهم: باب حکم المرتد و المرتدة و استتابتهم (۶۹۲۲) (۳۰۱۷) مسند حمیدی (۵۳۳)، بیہقی (۱۹۵/۸)، ابن ماجہ، کتاب الحدود: باب المرتد عن دینہ (۲۵۳۵)، مسند احمد (۱/۲۸۲)، دارقطنی (۱۱۳/۳)، ابو داؤد، کتاب الحدود: باب الحكم فيمن ارتد (۴۳۵۱)، نسائی (۱۰۴/۷)، ترمذی (۱۴۵۸)، شرح السنة (۲۵۶۰)، مسند ابی یعلیٰ (۲۵۳۲)]

”علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو آگ میں جلایا۔ یہ بات عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا: ”اگر میں ہوتا تو انہیں آگ میں نہ جلاتا۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کے ساتھ عذاب نہ دو۔“ البتہ انہیں قتل کر دینا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے اپنا دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔“

② سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَّا بِأَحَدِي ثَلَاثٍ: أَلنَّفْسِ بِالنَّفْسِ وَ الثَّيْبِ الزَّانِي وَ الْمُفَارِقِ لِذِينِهِ التَّارِكِ لِلْجَمَاعَةِ» [بخاری، کتاب الديات: باب قول الله تعالى: أن النفس بالنفس والعين بالعين (۶۸۷۸)، مسلم، کتاب القسامة: باب ما يباح به دم المسلم (۱۶۷۶)، مسند احمد (۱/۳۸۲)، ابو داؤد، کتاب الحدود (۴۳۵۲)، ترمذی، کتاب الديات: (۱۴۰۲)، ابن حبان (۴۴۰۴)، نسائی، کتاب القسامة (۱۳/۸)، مسند حمیدی (۱۱۹)، دارقطنی (۸۲/۳)، بیہقی (۱۹/۸)]

”جو مسلمان لا الہ الا اللہ اور میرے رسول ہونے کی گواہی دے، اس کا خون حلال نہیں مگر تین کاموں میں سے کسی ایک کی بنا پر (۱) نفس کے بدلے نفس (۲) شادی شدہ زانی (یعنی رجم کر کے مار دیا جائے) (۳) اپنے دین کو چھوڑنے والا، جماعت کو ترک کرنے والا (یعنی مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو کر کافروں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور دین اسلام ترک کر بیٹھے، مرتد ہو جائے)۔“

③ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«كُلُّ مُرْتَدٍّ عَنِ الْإِسْلَامِ مَقْتُولٌ إِذَا لَمْ يَرْجِعْ ذَكَرًا أَوْ أُنْثَى» [دارقطنی (۹۳/۳)، (۳۱۹۵)]

”اسلام سے مرتد ہونے والا ہر شخص قتل کیا جائے گا اگر وہ واپس نہ پلٹے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔“

اس اثر کی سند حسن ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

[المحلی لابن حزم (۱۲۲/۱۳)]

امام ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہمیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَأَتَّفَقُوا عَلَى أَنَّ الْمُرْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ يَجِبُ عَلَيْهِ الْقَتْلُ» [الافصاح عن معانی الصحاح (۱۸۷/۲)]

”اس بات پر ائمہ دین کا اتفاق ہے کہ اسلام سے مرتد ہونے والا واجب القتل ہے۔“

امام ابن قدامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَأَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَى وَجُوبِ قَتْلِ الْمُرْتَدِّ وَرَوَى ذَلِكَ عَنْ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَوُ عُمَانَ وَعَلِيٍّ وَمَعَاذٍ وَابْنِ مُوسَى وَابْنِ عَبَّاسٍ وَخَالِدٍ وَغَيْرِهِمْ وَكَمْ يُنْكَرُ ذَلِكَ فَكَانَ إِجْمَاعًا»

[المغنی لابن قدامة (۱۲۳/۸)]

”اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہوتا ہے اور یہ بات ابو بکر، عمر، معاذ، ابو موسیٰ، عبد اللہ بن

عباس، خالد وغیرہم رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اس پر انکار نہیں کیا گیا، لہذا اس پر اجماع ہو گیا۔“

اور یہی اجماع علامہ صنعانی، ابن دقیق العید اور کاسانی رضی اللہ عنہم نے نقل کیا ہے۔ [سبیل السلام (۲۶۳/۳)، احکام

الاحکام (۸۴/۳)، بدائع الصنائع (۱۳۴/۷)، بحوالہ عقوبة الاعدام (ص ۳۶۸)]

پس معلوم ہوا کہ قرآن و سنت، اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجماع اہل علم، فقہاء و محدثین کی رو سے مرتد واجب القتل ہے۔

کافر کے بدلے مسلمان کا قتل

سوال کیا کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام اسحاق بن

راہویہ رضی اللہ عنہم اور اہل ظواہر اسی بات کی طرف گئے ہیں۔ ان کے دلائل یہ ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَنَجْعَلِ الْمُسْلِمِينَ كَالْمَجْرُمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴾ [سورة الدخان : ۳۰]

”کیا ہم مسلمانوں کو مجرمین (کفار) کی طرح بنا دیں، تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے فیصلے کرتے ہو۔“

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ﴾ [نساء : ۱۴۱]

”اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راہ نہیں بنائے گا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ﴾ [سجدة : ۱۸]

”کیا مومن فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔“

یہ آیات بینات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کافر مسلمان کے مساوی نہیں ہو سکتا اور جب ان دونوں میں برابری نہیں تو مسلمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی اس بات کی مزید توضیح کرتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« الْمُسْلِمُونَ تَتَكَافَأُ دِمَائُهُمْ يَسْعَى بِدِمَتِهِمْ أَدْنَاهُمْ وَيَجِيرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ وَ هُمْ يَدُّ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ يَرُدُّ مُشِيدَهُمْ عَلَى مُضْعَفِهِمْ وَ مُتَسَرِّبِهِمْ عَلَى قَاعِدِهِمْ لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَ لَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ » [ابوداؤد، كتاب الجهاد: باب فى السرية ترد على أهل العسكر (۲۷۵۱)]

”مسلمانوں کے خون برابر ہیں، ان کا ادنیٰ سا آدمی ذمہ دامن دے سکتا ہے اور دور رہنے والا مسلمان پناہ دے سکتا ہے اور یہ اپنے مخالفین کے مقابلے میں یکشت ہوتے ہیں۔ طاقتور اور تیز رفتار سواروں والا کمزور سواروں والے کے قریب رہے اور جب لشکر میں سے کوئی نکلے نکال کر مال کمائے تو باقی لوگوں کو اس میں شریک کرے اور مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ذمی جس سے عہد لیا گیا ہو۔“

مسند احمد میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔“ [مسند احمد، (۱۲۲۱)]

لہذا کسی مسلمان آدمی کو کافر کے بدلے قتل کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جو لوگ عصر حاضر میں یہ داویا کیے جا رہے ہیں کہ اسامہ بن لادن یا اس کے دیگر مجاہد ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے کر دینا چاہیے انھیں ان قرآنی اور حدیثی نصوص پر غور کرنا چاہیے اور اپنے ناجائز مطالبات سے باز آ جانا چاہیے اور اہل کفر کی سازشوں کو سمجھنا چاہیے۔

بیٹے کے قصاص میں باپ کا قتل

(سوال) اگر کوئی باپ اپنے بیٹے کو قتل کر بیٹھے تو کیا اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا یا اس کا کوئی شرعی حکم ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔

(جواب) اگر کسی وجہ سے باپ اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو قصاص میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا، یہی بات جمہور فقہائے شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ نے کہی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل فقہ کی کتب میں مذکور ہے۔ [الشرح الكبير على متن المقنع (۱۷۵/۵)، المہذب (۱۷۴/۲)، بدایة المجتہد (۴۰/۲)، بدائع الصنائع (۲۳۵/۷)]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آفٍ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ٥ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا ﴾ [الإسراء: ۲۳، ۲۴]

”اور تیرا پروردگار حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اگر تیرے ہاں ان میں سے کوئی اکابر یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں آف تک نہ کہو اور نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ ہی کرو اور ان کے ساتھ ادب و احترام سے بات کرو اور عاجزی و محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کے بازو پست رکھو اور کہو اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے سامنے عاجزی اور تواضع کے بازو پست کرنے کا حکم دیا ہے اور انہیں جھڑکنے اور ایسی بات کہنے سے منع کیا ہے جس سے انہیں تکلیف ہو خواہ وہ چھوٹی سی بات ہی کیوں نہ ہو۔

جب انہیں جھڑکنا اور آف تک کہنا منع ہے تو یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ انہیں قصاص میں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح دیگر حسن سلوک والی آیات سے یہی بات اخذ کی گئی ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو مدیج کے ایک شخص کے پاس ایک باندی تھی اور اس سے اس شخص کا ایک بیٹا تھا۔ وہ اس سے خدمت لیتا تھا۔ جب لڑکا جوان ہو گیا تو ایک دن اس شخص نے اس باندی کو بلایا اور کہا: ”اس طرح کام کرو۔“ لڑکے نے کہا: ”وہ میرے پاس نہیں آئے گی جب تک تو اسے غلام بنائے رکھے گا۔“ لڑکے کے باپ نے غصے میں آ کر تلوار اس کی طرف چھیکی جس سے اس کی ٹانگ کٹ گئی، اس لڑکے کا خون بہ گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ شخص اپنی قوم کے ایک گروہ کے ہمراہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسے کہا:

« يَا عَدُوَّ نَفْسِهِ أَنْتَ الَّذِي قَتَلْتَ ابْنَكَ؟ لَوْ لَا أَنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَا يُقَادُ الْآبُ بِإِنِّيهِ لَقَتَلْتِكَ هَلَمْ دِيَّتَهُ قَالَ فَاتَاهُ بَعْشَرِينَ أَوْ ثَلَاثِينَ وَ مِائَةً بَعِيرٍ قَالَ فَتَخَيَّرَ مِنْهَا مِائَةً فَدَفَعَهَا إِلَى وَرَثَتِهِ وَ تَرَكَ أَبَاهُ » [المنتقى لابن الجارود (۷۸۸)، بیہقی (۳۸/۸)، دارقطنی (۱۴۰/۳)]

”اے اپنی جان کے دشمن! تو وہ ہے جس نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے نہ

سنا ہوتا کہ ”باپ سے بیٹے کے بدلے قصاص نہ لیا جائے“ تو میں تجھے قتل کر دیتا، اس کی دیت لاؤ۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ”وہ ایک سو بیس یا تیس اونٹ لایا، عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے سواونٹ لے کر اس لڑکے کے وارثوں کے حوالے کر دیے اور اس کے باپ کو چھوڑ دیا۔“

یہ روایت حسن درجہ کی ہے۔ علامہ البانی رضی اللہ عنہ نے اسے مختلف طرق کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے۔ [إرواء الغلیل

(۲۲۱۴)، (۲۶۹۱۷)]

یہی روایت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ [ابن ماجہ، کتاب الدیات: باب لا یقتل الوالد بولدہ (۲۶۶۱)، ترمذی (۱۴۰۱)، دارقطنی (۱۴۱/۳) حلیۃ الأولیاء (۱۸/۴)، بیہقی (۳۹/۸)، مسند دارمی (۲۴۰۲)، حاکم (۳۶۹/۴)، ابن ابی شیبہ (۴۳/۱۰)]

اس روایت کی سند میں اگرچہ اسماعیل بن مسلم الہکی راوی کمزور ہے لیکن مختلف طرق اور شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔

عقلی طور پر اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ باپ بیٹے کے وجود کا سبب ہے اس لیے مناسب نہیں کہ بیٹا باپ کے فنا اور خاتمے کا سبب بنے اور دوسری بات یہ ہے کہ قصاص زجر و توبخ کے لیے مشروع کیا گیا ہے، یہاں بیٹے کے قتل کی وجہ سے باپ کو زجر کی حاجت نہیں، اس لیے کہ والدین کی اولاد کے بارے میں شفقت و رافت معروف ہے اور یہ شفقت انھیں ظلم و عدوان کے ساتھ قتل کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ [عقوبة الاعدام (ص: ۱۹۵)]

پس معلوم ہوا کہ والد کو بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔ بعض اہل علم قصاص کی عمومی آیات اور احادیث سے استدلال کرتے ہوئے باپ کو قصاص میں قتل کرنے کے قائل ہیں لیکن مختار قول وہی ہے جو ہم نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عقوبة الاعدام للشیخ محمد بن سعید جامعة الامام محمد بن سعود الإسلامية اور القصاص فی النفس للدكتور عبد اللہ العلی استاذ جامعة الإمام محمد بن سعود۔



دعاؤں اور اذکار کے احکام

WWW.KITABOSUNNAT.COM

تسبیح گننے کا صحیح اور ثابت طریقہ

سوال تسبیحات شمار کرنے کے لیے آج کل رنگا رنگ کی تسبیحیں بازاروں میں بک رہی ہیں اور کھجور کی گھٹلیوں سے بھی یہ کام لیا جا رہا ہے۔ کیا ان چیزوں کا ثبوت سنہ رسول سے ملتا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب تسبیح شمار کرنے کا جو مروجہ طریقہ ہے کہ لوگ کھجور کی گھٹلیوں پر یا کنکریوں پر یا دونوں ہاتھوں پر شمار کرتے ہیں، اس کا ذکر کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں۔ انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« يَا مَعْشَرَ النَّسَاءِ! اِعْقِدْنَ بِالْأَنَامِلِ فَإِنَّهُنَّ مَسْئُولَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ » [ترمذی، کتاب الدعوات
باب ما جاء في عقد التسبيح باليد: (۳۴۸۶)]

”آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ انگلیوں سے تسبیح شمار کریں بے شک ان انگلیوں سے سوال کیا جائے گا اور یہ بلائی جائیں گی۔“

یہ حدیث تو مطلق انگلیوں پر شمار کرنے کے متعلق تھی، اب وہ حدیث ملاحظہ فرمائیں جس میں دائیں ہاتھ کی صراحت موجود ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْقِدُ التَّسْبِيحَ بِيَمِينِهِ » [ابوداؤد کتاب الوتر، باب

التسبيح بالحصی (۱۵۰۲)، الاذکار للنبی (۲۳۰)، عمل اليوم والليلة (۸۱۹)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے تسبیح گنتے تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تسبیح شمار کرتے وقت سنت کے مطابق دائیں ہاتھ پر شمار کرنی چاہیے۔

کیا تسبیح کا استعمال جائز ہے؟

سوال کیا طواف کے چکر شمار کرنے کے لیے تسبیح کا استعمال جائز ہے؟

جواب طواف کے چکر شمار کرنے کے لیے تسبیح کا استعمال ہمارے علم کے مطابق کسی حدیث میں موجود نہیں بلکہ عام ذکر و اذکار کے متعلق بھی کوئی ایسی حدیث نہیں کہ رسول اللہ ﷺ تسبیح کے دانوں پر شمار کرتے ہوں۔

وظائف کی تعداد کا مسئلہ

(سوال) کیا وظائف کی تعداد مقرر ہے، بالخصوص درود شریف کی؟

(جواب) کچھ وظائف تو ایسے ہیں جن کی تعداد کتب احادیث میں مقرر ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کی تعداد رسول کریم ﷺ نے مقرر نہیں فرمائی۔

سومرتبہ درود شریف کے متعلق کوئی صحیح حدیث مجھے معلوم نہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ نے ”پیارے رسول کی پیاری دعائیں“ میں سو ہار درود شریف پڑھنے کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص صبح اور مغرب کی نمازوں کے بعد کلام کرنے سے پہلے سو ہار درود پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی سوسو مرتبہ پوری فرماتا ہے۔ تیس دنیا میں اور ستر آخرت میں۔“

لیکن یہ روایت موضوع ہے، اس کو احمد بن موسیٰ نے روایت کیا ہے جیسا کہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”جلاء الأفہام (۲۹۸)“ میں ہا سند ذکر کیا ہے اور اسی طرح علامہ سخاوی نے ”القول البدیع (۱۷۳)“ میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر ضعف کا حکم بھی لگایا ہے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ احمد بن موسیٰ کے متعلق فرماتے ہیں: ”یہ روایات گھڑتا تھا اور اسانید کو متن سے ملا دیتا تھا۔“ حزہ السہمی فرماتے ہیں: ”اس نے مجاہل مشائخ سے منکر روایات بیان کی ہیں جن کو کسی دوسرے نے بیان نہیں کیا۔ اس لیے محدثین نے اسے کذاب کہا ہے۔“ [میزان الاعتدال (۱۵۹/۱)، المغنی فی الضعفاء (۹۶/۱)، لسان المیزان (۲۳۵/۱)، تنزیہ الشریعة المرفوعة (۳۱۱/۱)]

اور اس کے دیگر رواۃ بھی مجہول ہیں۔ علم الرجال کی معروف کتب میں ان کا ذکر نہیں ملتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔

حافظ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ایک اور سند سے بھی بیان کیا ہے جسے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فجر اور مغرب کی قید نہیں بلکہ مطلق طور پر دن میں سومرتبہ درود پڑھنے کا ذکر ہے۔ [جلاء الأفہام (۳۰۰) (ص: ۲۴۲)]

امام ابن قیم اور علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”القول البدیع (۱۲۸)“ میں لکھا ہے کہ حافظ ابو موسیٰ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور دونوں بزرگوں نے اس کی تحسین نقل کر کے سکوت کیا ہے حالانکہ یہ روایت بھی من گھڑت ہے۔ حافظ ابو موسیٰ بذات خود وضاع اور روایت گھڑنے والا ہے۔ اس کی تحسین کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس کی سند میں عباس بن یکار الضعیفی ہے جس کے بارے میں

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یہ کذاب ہے۔“ [المغنی فی الضعفاء (۵۱۹/۱)، الضعفاء والمتروکین للدارقطنی (۱۳۸/۴۲۴)]

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [مجمع الزوائد (۱۴۰/۱۰)]

امام عقیلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اس کی اکثر روایات میں وہم و نکارت ہے۔“ [الضعفاء الکبیر (۳/۳۶۳)]
امام ابن حبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لَا يَحُوزُ إِلَّا حَتَّاجٌ بِهِ بِحَالٍ وَلَا كِتَابَةٌ حَدِيثُهُ إِلَّا عَلَى سَبِيلِ الْأَعْتِبَارِ لِلْحَوَاصِّ“
[کتاب المجروحین (۲/۱۹۰)]

”اس سے کسی حال میں بھی حجت پکڑنا جائز نہیں اور نہ اس کی روایت کو لکھنا ہی جائز ہے مگر خواص کے لیے اعتبار کے سبیل پر۔“

امام ابن عدی رضی اللہ عنہ نے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ [الکامل لابن عدی (۱۶۶۰/۵)]
اسی طرح اس کا استاد ابو بکر الہذلی جو اس کا ماموں بھی ہے، قابل حجت نہیں اور محدثین کے ہاں بالاتفاق متروک ہے۔
امام یحییٰ بن سعید، امام یحییٰ بن سعین، امام ابو زرعد رازی، امام ابو حاتم رازی، امام نسائی، امام جوزجانی، امام یعقوب بن سفیان، امام ابو احمد حاکم وغیرہم رضی اللہ عنہم نے اسے ضعیف، متروک اور غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۶/۳۱۶/۶)، المغنی فی الضعفاء (۲/۵۷۲)، میزان الاعتدال (۴/۷۳۴)]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى عَلَيَّ مِائَةً غُفِرَ لَهُ » [تاریخ الصفہان (۱/۹۰۱)]

”جس نے مجھ پر سو مرتبہ درود پڑھا اس کی بخشش کر دی گئی۔“

اس روایت کی سند میں سفیان اور اعشش دو مدلس راوی ہیں جن کی تصریح بالسماع موجود نہیں اور احمد بن عبد الرحمن بن بحر السعدی کا فی الحال مجھے ترجمہ نہیں ملا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ عَشْرًا وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ عَشْرًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ مِائَةً وَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ مِائَةً كَتَبَ اللَّهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ بَرَاءَةً مِنَ الْيُنْفَاقِ وَ بَرَاءَةً مِنَ النَّارِ وَ أَسْكَنَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ الشُّهَدَاءِ » [طبرانی اوسط (۲۲۳۱) (۱۱۰/۸)]

”جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے اور جس نے مجھ پر دس مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر سو رحمتیں بھیجتا ہے اور جس نے مجھ پر سو مرتبہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے درمیان نفاق اور جہنم سے براءت لکھ دیتا ہے اور قیامت والے دن اسے شہداء کے ساتھ جگہ دے گا۔“

امام منذری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” وَ فِي إِسْنَادِهِ إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَالِمٍ بْنِ شَيْبَلٍ الْهَجَمِيُّ لَا أَعْرِفُهُ بِحَرْجٍ وَلَا عَدَالَةٍ“

[الترغيب والترهيب (۲/۴۹۰)]

”اس کی سند میں ابراہیم بن سالم بن شبل ہجمی کے بارے میں جرح اور تعدیل میں نہیں جانتا۔“

اسی طرح اس کی سند میں عبدالعزیز بن قیس بن عبدالرحمن مجہول ہے۔ [تقریب التہذیب (ص ۲۱۰)]
سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى يَوْمَ الْجُمُعَةِ مِائَةً مَرَّةً جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَعَهُ نُورٌ لَوْ قُسِمَ ذَلِكَ النُّورُ بَيْنَ الْخَلْقِ كَلَيْهِمْ لَوَسِعَتْهُمْ » [حلیۃ الأولیاء (۴۷/۸)، ترتیب البغیۃ للہیثمی (۲/۳۲۷)]
”جس نے جمعہ والے دن مجھ پر سو دفعہ درود پڑھا، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک نور ہوگا اور اگر وہ نور ساری مخلوق پر تقسیم کر دیا جائے تو انہیں کافی ہوگا۔“

یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس کی سند میں محمد بن عثمان مدلس ہے اور روایت معصن ہے، اس میں سماع کی تصریح نہیں ہے اور اس میں چند مجہول راوی بھی ہیں۔ الغرض مجھے ایسی کوئی صحیح روایت نہیں ملی جس میں درود شریف کے متعلق سو کے عدد کی تعیین ہو البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کثرت کے ساتھ درود شریف پڑھنے کا حکم صحیح احادیث میں موجود ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَكثِرُوا الصَّلَاةَ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ فَمَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ عَشْرًا » [صحيح الجامع الصغير للالبانی (۲۶۳/۱)]
”جمعہ والے دن اور جمعہ والی رات مجھ پر کثرت سے درود پڑھو، جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا۔“

مزید احادیث کے لیے ”السلسلۃ الصحیحۃ اور صحیح الجامع الصغیر“ ملاحظہ فرمائیں۔ البتہ صبح و شام دس دس مرتبہ درود پڑھنے کی حدیث موجود ہے جسے امام منذری اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہما نے حسن قرار دیا ہے۔
حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى عَلَيَّ حِينَ يُصْبِحُ عَشْرًا وَ حِينَ يُمَسِّي عَشْرًا أَدْرَكْتُهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ »
”جس نے مجھ پر صبح و شام دس دس بار درود شریف پڑھا قیامت کے دن اسے میری شفاعت نصیب ہوگی۔“
امام منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اسے امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے دو سندوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک جید ہے۔“

اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ [صحيح الترغيب والترهيب للالبانی (۲۴۰/۱)]

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ [مجمع الزوائد (۱۲۳/۱۰)]

لہذا صبح و شام کے اذکار میں دس مرتبہ درود شریف کا عدد صحیح ثابت ہے، اسے معمول بنائیں اور پھر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے درود شریف پڑھتے رہیں بلکہ اگر آپ اپنی ساری دعاؤں کی جگہ درود ہی پڑھتے رہیں تو یہ بھی درست ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”جب رات کا دو تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو نبی کریم ﷺ کھڑے ہو جاتے اور فرماتے: ”لوگو! اللہ کو یاد کرو، زلزلے کا جھٹکا آ گیا، اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا، موت آگئی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ، موت آگئی اپنی ہولناکیوں کے ساتھ۔“ ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے کہا:

« يَا رَسُولَ اللَّهِ ! إِنِّي أَكْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَيْكَ فَكَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِي ؟ فَقَالَ مَا شِئْتَ قَالَ قُلْتُ الرَّبِيعَ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ قُلْتُ فَالْنُصْفُ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ وَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ قُلْتُ فَالثَّلَاثِينَ ؟ قَالَ مَا شِئْتَ فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قُلْتُ أَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِي كُلَّهَا ؟ قَالَ إِذَا تُكْفَى هَمُّكَ وَيُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ » [ترمذی، کتاب صفة القيامة: باب الترغيب في ذكر الله و ذكر الموت آخر الليل و فضل [كثارة الصلاة على النبي (٢٤٥٧)، مستدرک حاکم (٥١٣/٢)، مسند احمد (١٣٦/٥)، مسند عبد بن حميد بحواله جلاء الافهام (ص: ٤٠) (٥٩)]

”اے اللہ کے رسول! میں آپ پر کثرت سے درود پڑھتا ہوں، میں درود کی آپ کے لیے کیا مقدار رکھوں (یعنی اور دعاؤں کے مقابلے میں)؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس قدر تو چاہے۔“ عرض کیا: ”کیا ایک چوتھائی؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ عرض کیا: ”نصف۔“ فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ عرض کیا: ”دو تہائی؟“ فرمایا: ”جتنا تو چاہے، اگر زیادہ کرے تو بہتر ہے۔“ میں نے عرض کیا: ”میں تمام (وقت) آپ کے درود کے لیے وقف کر دوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایسی حالت میں تیرے مقاصد کی کفایت کی جائے گی اور تیرے گناہ بخش دیے جائیں گے۔“

”يَا مُقْسِطُ“ سات سو مرتبہ اور سورۃ یٰسین بہتر (۷۲) مرتبہ پڑھنا، یہ تعداد کہیں ثابت نہیں بلکہ لوگوں کے اپنے مقرر کردہ اعداد ہیں۔

مجلس برخواست کرنے سے قبل سو مرتبہ استغفار کرنا

سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ہر مجلس برخواست کرنے سے پہلے ۷۰ یا ۱۰۰ مرتبہ استغفار کرتے تھے؟ کیا بندہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی استغفار کر سکتا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں سو (۱۰۰) مرتبہ یہ کلمات کہتے:

« رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْعَفُورُ » [ابوداؤد، کتاب الوتر: باب في الاستغفار (١٥١٦)، ابن ماجه (٣٨١٤)]

”اے میرے پروردگار! مجھے معاف کر دے اور میری توبہ قبول کر لے بلاشبہ توبہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مجلس میں بیٹھے بیٹھے سو (۱۰۰) بار استغفار کرتے تھے تو ہمیں بھی اپنی مجالس میں کثرت سے استغفار کرنا چاہیے تاکہ ہمارے گناہوں کی معافی ہو سکے البتہ دورانِ خطبہ استغفار کرنا ثابت نہیں بلکہ خطبہ دھیان اور توجہ سے سننا چاہیے، جو آدی اپنی توبہ و استغفار میں مشغول ہو وہ خطیب کی بات کو دھیان سے نہیں سن سکتا۔

چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرنا

سوال کیا چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ»

”رسول اللہ ﷺ ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔“ [مسلم، کتاب الحيض: باب ذكر الله تعالى في

حال الجنابة وغيرها (۳۷۳)]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ [آل عمران: ۱۹۱]

”عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور پہلوؤں کے بل یاد کرتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر کھڑے ہو کر، بیٹھ کر اور پہلو کے بل لیٹ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

کلمہ شہادت کا وظیفہ

سوال کیا پورے کلمہ شہادت کا وظیفہ کیا جا سکتا ہے نیز افضل الذکر سے کیا مراد ہے؟

جواب کلمہ طیبہ پڑھنے کے دو مواقع ہیں، ایک بطور اقرار و شہادت اور دوسرا موقع بطور ذکر و عبادت۔ اول الذکر موقع پر دونوں اجزا کو ملا کر پڑھنا لازمی و ضروری ہے کیونکہ ان اجزا کی شہادت کے بغیر انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِلَّا سَلَامٌ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [مسلم،

کتاب الایمان: باب بیان الایمان و الاسلام (۸)، مسند احمد: (۱/۳۱۹)]

”اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔“

لیکن ذکر و عبادت کے موقع پر فقط لا الہ الا اللہ کہنا ثابت ہے کیونکہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، محمد

رسول اللہ ﷺ تو عبد ہیں معبود نہیں ہیں جیسا کہ مسند احمد کی روایت ”عبدہ ورسولہ“ سے عیاں ہے اور کتب احادیث میں بھی

ایسے مواقع پر صرف لا الہ الا اللہ ہی آیا ہے جیسا کہ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« قَالَ مُوسَى يَا رَبِّ اَعَلَمَنِي شَيْئًا اَذْكُرُكَ بِهِ وَ اَدْعُوكَ بِهِ؟ قَالَ قُلْ يَا مُوسَى! لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ يَا رَبِّ! كُلُّ عِبَادِكَ يَقُولُونَ هَذَا قَالَ يَا مُوسَى! لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ عَامِرُهُنَّ غَيْرِي وَ الْاَرْضَيْنِ السَّبْعِ فِيْ كَفِّهِ وَ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ فِيْ كَفِّهِ مَا لَتَّ بِهِمْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ »
[مستدرک حاکم، کتاب الدعاء (۱۹۳۶) (۷۱۰/۱)]

”موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے تو کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ذریعے میں تیرا ذکر کروں اور تجھے پکاروں؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تو لا الہ الا اللہ کہا کر۔“ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”اے میرے رب! لا الہ الا اللہ تو تیرے تمام بندے کہتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کے باشندے بجز میرے، ایک پلڑے میں ہوں اور لا الہ الا اللہ ایک پلڑے میں تو لا الہ الا اللہ ان پر غالب ہو جائے گا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ لا الہ الا اللہ ذکر اور دعا ہے جس پر حدیث کے الفاظ ”اَذْكُرُكَ بِهِ وَ اَدْعُوكَ بِهِ“ دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں یہ آتا ہے:

« عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلَّهِ » [ترمذی، کتاب الدعوات: باب ما جاء ان دعوة المسلم مستجابة (۳۳۸۳)]
”سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”سب سے افضل ذکر ”لا الہ الا اللہ“ ہے اور سب سے افضل دعا ”الحمد للہ“ ہے۔“

اس طرح کی اور بھی بے شمار احادیث موجود ہیں جن میں ذکر صرف لا الہ الا اللہ کو قرار دیا گیا ہے اور ان میں ”محمد رسول اللہ“ کے الفاظ نہیں ہیں کیونکہ ذکر اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور عبادت اس کے علاوہ کسی کی جائز نہیں ہے، ہاں اقرار و شہادت کے وقت ”محمد رسول اللہ“ کہنا ضروری اور لازمی ہے، ورنہ اس کے بغیر ایمان مقبول نہیں ہوگا۔

”لا الہ الا اللہ“ کی فضیلت

(سوال) سنا ہے کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے گی، کیا یہ بات صحیح ہے؟
(جواب) ”لا الہ الا اللہ“ کی اس تعداد کے متعلق تو کسی صحیح حدیث کے بارے میں مجھے علم نہیں البتہ صحیح احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ جس شخص نے صدق دل سے ”لا الہ الا اللہ“ کہا اور اس پر موت آگئی وہ جنت میں داخل ہوگا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بے شک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جو آدمی اس کو دل کی سچائی کے ساتھ کہتا ہے پھر اس پر موت آجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کر دیتے ہیں اور وہ کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ ہے۔“ [مسند احمد (۲۳۱)، مستدرک حاکم (۷۶۱)]

لہذا ”لا الہ الا اللہ“ کو جاننا چاہیے اور صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر ایمان رکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیے کہ اسی پر ہماری موت آجائے۔ (آمین!) اور اس کلمے کو احادیث میں افضل الذکر قرار دیا گیا ہے، لہذا اس کا ذکر بھی کرتے رہیں، البتہ ذکر کے مصنوعی اور نو ایجاد طریقوں سے اجتناب کریں۔



حرام اور مباح امور کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

محرم کے بغیر عورت کا سفر

(سوال) کیا عورت بغیر محرم کے سفر پر نکل سکتی ہے یا ہر حال میں محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے؟ مہربانی فرما کر قرآن و سنت سے جواب دیں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے عورت کی عفت و عصمت کو محفوظ کرنے کے لیے اس کا مسکن گھر کی چار دیواری قرار دیا ہے تاکہ یہ اپنے گھر کے اندر رہ کر اپنی عزت کو بچائے رکھے۔ کیونکہ عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے جیسا کہ یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ یعنی جب عورت گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو لوگوں کی نظروں میں مزین کر دیتا ہے اور لوگ اس کی طرف نگاہیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں، اسے اپنے دامن تزویر میں پھنسانے کے لیے ہر ممکن چارہ جوئی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قواعد و ضوابط مقرر فرمائے ہیں وہ عورت کے تقدس کو محفوظ کرنے ہی کے لیے ہیں۔ عورت کو اگر کسی کام کے لیے سفر پر نکلنا پڑے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کریم ﷺ کے ذریعے بتلایا ہے کہ وہ اپنے محرم کو ساتھ لے کر نکلے، بغیر محرم کے عورت کا سفر کرنا بالکل ناجائز و حرام ہے، عورت نہ ایک دن و رات کا سفر محرم کے بغیر کر سکتی ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ۔ سفر میں محرم کی پابندی عورت کے لیے لازم ہے۔ چند ایک صحیح احادیث ملاحظہ ہوں:

① حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ» [مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (۱۳۳۸)، ابن حبان (۲۷۰۷)، بیہقی (۱۳۸/۳)، ابوداؤد (۱۷۲۶)، ابن ماجہ (۲۸۹۸)، ترمذی (۱۱۶۹)]

”کوئی عورت تین راتوں سے زیادہ محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“

سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے:

«لَا يَجِلُّ لِامْرَأَةٍ تُوْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ سَفْرًا فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَصَاعِدًا إِلَّا وَمَعَهَا أَبُوهَا أَوْ أَخُوهَا أَوْ زَوْجُهَا أَوْ ابْنُهَا أَوْ ذُو مَحْرَمٍ مِنْهَا» [ابو داؤد، کتاب المناسک: باب فی المرأة تحج بغیر محرم (۱۷۲۶)]

”جو عورت اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے تین دن یا اس سے زائد سفر کرنا حلال نہیں مگر اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا خاوند یا بیٹا یا کوئی اور محرم ہو۔“

② حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُوْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ تَسَافِرُ مَسِيرَةَ ثَلَاثِ لَيَالٍ إِلَّا وَ مَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ »

[مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (۱۳۳۸)، ابو داؤد، کتاب المناسك: باب في المرأة تحج بغير محرم (۱۷۲۷)، بیہقی (۱۳۸/۳)، ابن حبان (۱۷۷/۵) (۲۷۱۹)]
 ”جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ تین راتوں کا سفر کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔“

③ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَسَافِرِ الْمَرْأَةُ يَوْمَيْنِ إِلَّا وَ مَعَهَا زَوْجُهَا أَوْ ذُو مَحْرَمٍ » [بخاری، کتاب العمل في الصلاة:

باب مسجد بيت المقدس (۱۱۹۷)، مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (۱۳۳۸)، بیہقی (۱۳۸/۳)، ابن حبان (۱۷۵/۵)، (۲۷۱۳)، مسند ابی یعلیٰ (۲/۳۸۸)]
 ”عورت دو دن کا سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا شوہر یا محرم ہو۔“

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُوْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تَسَافِرَ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ »

[بخاری، کتاب تقصير الصلاة: باب في كم يقصر الصلاة (۱۰۸۸)، مسلم، کتاب الحج: باب. سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (۱۳۳۹)، بیہقی (۱۳۹/۳)، ابن ماجہ، کتاب المناسك: باب المرأة تحج بغير ولي (۲۸۹۹)، ابن حبان (۱۷۶/۵) (۲۷۱۴)]
 ”جو عورت اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے حلال نہیں کہ وہ محرم کے بغیر ایک دن اور رات کا سفر کرے۔“

⑤ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تُوْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تَسَافِرَ يَوْمًا وَاحِدًا لَيْسَ مَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ »

[ابن حبان (۱۷۶/۵) (۲۷۱۵)]

”جو عورت اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے محرم کے بغیر ایک دن کا سفر بھی حلال نہیں۔“

⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تَسَافِرِ الْمَرْأَةُ بَرِيدًا إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ » [ابن حبان (۱۷۶/۵)، (۲۷۱۶)، بیہقی (۱۳۹/۳)،

ابوداؤد (۱۷۲۵)، ابن خزيمة (۱۳۶/۳)، مستدرک حاکم (۱/۴۴۲)]

”عورت ایک برید بھی سفر نہ کرے مگر محرم کے ساتھ۔“

امام ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”هُوَ أَرْبَعَةٌ فَرَايِخُ وَ الْفَرَسُخُ ثَلَاثَةُ أَمْيَالٍ“ [عون المعبود (۷۳/۲)، تحفة الاحوذی (۲۰۶/۲)،
النهاية (۱۱۶/۱)]

”ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اور ایک فرسخ میں تین میل ہوتے ہیں۔“
یعنی ایک برید میں بارہ میل ہوتے ہیں۔ امام ابو بکر ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
”الْبَرِيدُ اثْنَا عَشَرَ مَيْلًا بِالْهَاشِمِيَّ“ [صحیح ابن خزیمہ (۱۳۶/۴)]
”ایک برید میں بارہ ہاشمی میل ہیں۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”برید آدھے دن کا سفر ہے۔“ [شرح مسلم للنووی (۸۷/۹)]
معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں چونکہ پیدل سفر ہوتے تھے اور بارہ میل تقریباً آدھے دن میں سفر طے ہوتا ہوگا۔

④ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«لَا يَخْلُونَ رَجُلًا بِامْرَأَةٍ وَلَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ إِلَّا وَمَعَهَا مَحْرَمٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ!
اُكْتَبْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَ كَذَا وَ خَرَجْتُ امْرَأَتِي حَاجَةً قَالَ اذْهَبْ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ»

[بخاری، کتاب جزاء الصيد : باب حج النساء (۱۸۶۲)، مسلم، کتاب الحج : باب سفر المرأة مع
محرم الى حج وغيره (۱۳۴۱) ابن حبان (۲۷۲۰)، ابن خزیمہ (۲۵۲۹)، مسند احمد (۲۲۲/۱)، مسند
طیالسی (۲۷۳۲)، ارواء الغلیل (۹۹۵)، ابن ماجہ (۲۹۰۰)]

”ہرگز کوئی مرد کسی (غیر محرمہ) سے غلوت اختیار نہ کرے اور ہرگز کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“ ایک آدمی
نے کھڑے ہو کر کہا: ”اے اللہ کے رسول! میرا نام فلاں غزوہ میں لکھا گیا ہے اور میری عورت حج کرنے کے لیے نکلی
ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو چلا جا، اپنی عورت کے ساتھ مل کر حج کر۔“

⑤ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ» [صحیح ابن حبان (۱۷۷/۵) (۲۷۱۸)]
”عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“

⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَجِلُّ لِامْرَأَةٍ تُسَافِرُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ» [صحیح ابن حبان (۱۷۸/۵) (۲۷۲۱)]
”عورت کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں۔“

⑦ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَرْأَةَ أَنْ تُسَافِرَ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ قَالَتْ عَمْرَةٌ
فَالْتَفَتَتْ عَائِشَةَ إِلَى بَعْضِ النِّسَاءِ فَقَالَتْ مَا لِكُلِّكُمْ ذُو مَحْرَمٍ» [صحیح ابن حبان (۱۷۸/۵)]

[(۲۷۲۲)]

”رسول اللہ ﷺ نے عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا ہے۔“ عمرہ بنت عبد الرحمن کہتی ہیں: ”عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعض عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم میں سے ہر ایک کا محرم نہیں ہے۔“

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے واضح ہوا کہ عورت محرم کے بغیر مطلقاً سفر نہیں کر سکتی اور ان روایات میں کوئی تفاوت نہیں ہے، یہ مختلف احوال پر مبنی ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مختلف مواقع پر سوالات کیے گئے کہ کیا عورت محرم کے بغیر تین دن کا سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسی طرح یہ پوچھا گیا کہ عورت محرم کے بغیر دو دن یا ایک دن یا بارہ میل یا مطلق طور پر سفر کر سکتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے نفی میں جواب دیا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْمَرْأَةِ تُسَافِرُ ثَلَاثًا مِنْ غَيْرِ مُحَرَّمٍ فَقَالَ لَا وَ سُئِلَ عَنْهَا تُسَافِرُ يَوْمَيْنِ مِنْ غَيْرِ مُحَرَّمٍ فَقَالَ لَا وَ يَوْمًا فَقَالَ لَا فَادَى كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ مَا حَفِظَ وَ لَا يَكُونُ عَدَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأَعْدَادِ حَدًّا لِلْسَّفَرِ وَ بِاللَّهِ التَّوْفِيقُ“

”رسول اللہ ﷺ سے عورت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر تین دن سفر کر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اور پوچھا گیا کہ وہ محرم کے بغیر دو دن سفر کر سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اور ایک دن کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔ ہر ایک نے جو یاد رکھا آگے پہنچا دیا اور ان اعداد میں سے کوئی عدد بھی سفر کے لیے حد نہیں ہے اور توفیق اللہ کے ساتھ ہے۔“

امام ابن حبان رحمہ اللہ نے نوین حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے:

”ذِكْرُ الْبَيَانِ بِأَنَّ الْمَرْأَةَ مَمْنُوعَةٌ عَنْ أَنْ تُسَافِرَ سَفْرًا قَلَّتْ مَدَّتُهُ أَمْ كَثُرَتْ إِلَّا مَعَ ذِي مُحَرَّمٍ مِنْهَا“

”اس بات کا بیان کہ عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے سفر کی مدت خواہ کم ہو یا زیادہ۔“

اسی طرح دسویں حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان کہ ”تم میں سے ہر ایک کا محرم نہیں“ پر تبصرہ کرتے ہوئے (کہ کوئی اس کا غلط مفہوم نہ لے لے کہ ہر عورت کا محرم تو نہیں ہوتا لہذا محرم کے بغیر سفر ہو سکتا ہے) لکھتے ہیں:

”تُرِيدُ أَنْ لَيْسَ لِكُلِّكُمْ ذُو مُحَرَّمٍ تُسَافِرُ مَعَهُ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ لَا تُسَافِرُوا وَاحِدَةً مِنْكُمْ إِلَّا بِذِي مُحَرَّمٍ يَكُونُ مَعَهَا“ [صحیح ابن حبان (۱۷۸۱/۵)]

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ ہے کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے لیے محرم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے؟ اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ تم میں سے ہر ایک عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”قَالَ الْعُلَمَاءُ اِخْتِلَافُ هَذِهِ الْأَلْفَاظِ لَا اِخْتِلَافَ السَّائِلِينَ وَ اِخْتِلَافَ الْمَوَاطِنِ وَ لَيْسَ فِي النَّهْيِ عَنِ الثَّلَاثَةِ تَصْرِيحٌ بِإِبَاحَةِ الْيَوْمِ وَ اللَّيْلَةِ أَوْ الْبَرِيدِ“ [شرح مسلم للنووی (۸۷/۹)]

”علماء نے کہا ہے کہ احادیث میں جو مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں ان کا سبب سائلین اور جگہوں کا اختلاف ہے اور تین

دن کی مسافت سے ممانعت میں ایک دن رات یا آدھے دن کے سفر کے جواز کی تصریح نہیں ہے۔“
یعنی مختلف سوال کرنے والوں نے مختلف مقامات پر مختلف حالات میں سوال پوچھے، کسی نے تین دن، دو دن، دن رات یا آدھے دن کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے ان کے سوال کے مطابق جواب دیا اور ہر ایک سفر میں محرم کے بغیر سفر کی ممانعت فرمائی اور جس حدیث میں ہے کہ عورت تین دن کی مسافت میں محرم کے بغیر سفر نہ کرے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تین سے کم دنوں کا سفر محرم کے بغیر کر سکتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ ان روایات کا خلاصہ یوں نقل فرماتے ہیں:

”فَالْحَاصِلُ أَنَّ كُلَّ مَا يُسْمَى سَفْرًا تَنْهَى عَنْهُ الْمَرْأَةُ بِغَيْرِ زَوْجٍ أَوْ مُحْرَمٍ سِوَاءَ كَانَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ أَوْ يَوْمَيْنِ أَوْ يَوْمًا أَوْ بَرِيدًا أَوْ غَيْرَ ذَلِكَ لِرِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ الْمُطْلَقَةِ وَ هِيَ آخِرُ رَوَايَاتِ مُسْلِمٍ السَّابِقَةِ لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ إِلَّا مَعَ ذِي مُحْرَمٍ وَ هَذَا يَتَنَاوَلُ جَمِيعَ مَا يُسْمَى سَفْرًا“
[شرح مسلم للنووی (۸۸، ۸۷، ۹)]

”خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ مسافت جسے سفر کہا جاتا ہے عورت کو خاوند یا دیگر محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے گا، خواہ وہ سفر تین دن کا ہو یا دو دن کا، ایک دن کا یا نصف دن کا یا اس سے کم و بیش، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق روایت کی بنا پر اور وہ پیچھے گزرنے والی مسلم کی روایات میں سے آخری ہے کہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور یہ حدیث ہر اس مسافت کو شامل ہے جسے سفر کہا جاتا ہے۔“

نیز دیکھیں: السراج الوہاج (۴۰، ۱)، عون المعبود (۷۲، ۲) علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَ فِي الْحَدِيثِ دَلِيلٌ عَلَى تَحْرِيمِ سَفَرِ الْمَرْأَةِ مِنْ غَيْرِ مُحْرَمٍ وَ هُوَ مُطْلَقٌ فِي قَلِيلِ السَّفَرِ وَ كَثِيرِهِ وَ فِي سَفَرِ الْحَجِّ وَ غَيْرِهِ“

”اس حدیث (یعنی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی) میں محرم کے بغیر عورت کے سفر کی حرمت پر دلیل ہے اور یہ حدیث سفر کی قلت اور کثرت اور سفر حج وغیرہ کو مطلق طور پر شامل ہے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تُسَافِرُ إِلَّا مَعَ ذِي مُحْرَمٍ وَ عُمُومُ اللَّفْظِ يَتَنَاوَلُ عُمُومَ السَّفَرِ فَيَقْضِي أَنْ يَحْرَمَ سَفَرُهَا بِدُونِ ذِي مُحْرَمٍ مَعَهَا سِوَاءَ كَانَ سَفَرُهَا قَلِيلًا أَوْ كَثِيرًا لِلْحَجِّ أَوْ غَيْرِهِ وَ إِلَى هَذَا ذَهَبَ إِبْرَاهِيمُ النَّخَعِيُّ وَ الشَّعْبِيُّ وَ طَاوُسٌ وَ الظَّاهِرِيُّ“ [مرعاة المفاتيح (۳۳۲، ۸)]

”اس حدیث میں ہے کہ بلاشبہ عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے اور (یہاں) لفظ کی عمومیت سفر کی عمومیت کو شامل ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا حرام ہے خواہ کم ہو یا زیادہ، حج کے لیے ہو یا کسی اور غرض سے

اور اس بات کی طرف امام ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام طاووس اور اہل ظاہر (رحمہم اللہ) گئے ہیں۔“

علامہ عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَقَالَ أَكْثَرُ أَهْلِ الْعِلْمِ يَحْرُمُ لَهَا الْخُرُوجُ فِي كُلِّ سَفَرٍ طَوِيلًا كَانَ أَوْ قَصِيرًا وَلَا يُتَوَقَّفُ حُرْمَةُ الْخُرُوجِ بِغَيْرِ الْمَحْرَمِ عَلَى مُسَافَةِ الْقَصْرِ لِاطْلَاقِ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ بَلْفِظٍ لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ“ [تحفة الأحوذی (۲۰۶/۲)]

”اہل علم کی اکثریت نے کہا ہے کہ عورت کو ہر سفر میں (محرم کے بغیر) نکلنا حرام ہے، سفر خواہ لمبا ہو یا چھوٹا۔ محرم کے بغیر نکلنے کی حرمت کو قصر کی مسافت پر موقوف نہیں کیا جائے گا کیونکہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں سفر کی مطلق طور پر ممانعت ہے۔ ان کی حدیث کے الفاظ ہیں: ”عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔“

مولانا مبارکپوری کی اس عبارت سے بھی واضح ہوا کہ عورت کسی طرح بھی محرم کے بغیر سفر نہیں کر سکتی خواہ وہ طویل ہو یا مختصر، مشکل ہو یا آسان ہر حالت میں عورت اپنا محرم یعنی خاوند، باپ، بھائی، بیٹا، ماموں یا چچا غرض ہر وہ آدمی جس کے ساتھ اس کا نکاح حرام ہے، ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر سفر پر نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس مجاہد کو جس کا نام غزوہ میں لکھا گیا تھا، محض اس بنا پر غزوے سے رخصت دے دی کہ اس کی عورت اکیلی حج پر جا رہی تھی اور اسے فرمایا کہ اس کے ساتھ جا کر حج کرو اور صحیح احادیث میں حج کو عورت کا جہاد قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«إِسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ جِهَادُ كُنَّ الْحَجَّ» [بخاری، کتاب الجهاد والسير، باب جہاد النساء (۲۸۷۵)]

”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کے متعلق اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارا جہاد حج ہے۔“

عورت کے لیے محرم کے بغیر حج و عمرہ کا حکم

(سوال) کیا حج اور عمرہ کے لیے عورت محرم کے بغیر سفر کر سکتی ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) حج اور عمرہ یا کسی دیگر سفر کے لیے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا درست نہیں۔ عورت کے سفر کے لیے محرم کا ہونا شرط ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِمَرْأَةٍ تُوْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ تُسَافِرَ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ لَيْسَ مَعَهَا حُرْمَةٌ» [بخاری، کتاب التفسیر: باب فی کم یقصر الصلاة (۱۰۸۸)]

”جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے محرم کے بغیر دن رات کا سفر کرنا حلال نہیں۔“

(۲) عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا:

«لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِمَرْأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ وَلَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ إِلَّا وَمَعَهَا ذِي مَحْرَمٍ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَةً وَإِنِّي اُكْتَبْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَكَذَا قَالَ

أَنْطَلِقُ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ» [بخاری، کتاب الجهاد و السیر: باب من اکتتب فی حیث فخرجت امرأته حاجة (۳۰۰۶)، مسلم، کتاب الحج: باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره (۱۳۴۱)]
 ”کوئی مرد کسی عورت سے ہرگز خلوت اختیار نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم ہونا چاہیے اور نہ کوئی عورت سفر کرے مگر اس کے ساتھ اس کا محرم ہونا چاہیے۔“ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ”اے اللہ کے رسول! میری عورت حج کرنے کے لیے چل پڑی ہے اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھا جا چکا ہے۔“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تو چل اپنی عورت کے ساتھ جا کر حج کر۔“

اس مفہوم کی متعدد احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ بعض فقہائے مالکیہ اور شوافع نے محرم کے بغیر عورت کو سفر کی اجازت دی ہے لیکن انھوں نے پراسن راستے اور قافلے کی شرط عائد کی ہے۔ بعض نے کہا فرض حج میں محرم شرط نہیں لیکن نقلی حج میں شرط ہے۔ یہ قول ابن سیرین اور اوزاعی کا ہے۔ (المعنی لابن قدامة ۲۳۰/۳)

اور ظاہر یہ ہے اس عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت دی ہے جس کا خاوند ہے اور نہ محرم اور ہر ایک نے اپنے مذہب پر درج ذیل دلائل سے حجت پکڑی ہے:

① رسول اللہ ﷺ نے حج کی استطاعت کی تفسیر زادراہ اور سواری سے کی ہے: (تہذیبی: ۴/۳۲۷) اور یہ عورت زادراہ اور سواری کی استطاعت رکھتی ہے، لہذا حج کر سکتی ہے۔

② دوسری دلیل یہ دی ہے کہ عدی بن حاتم کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قریب ہے کہ اکیلی عورت حج کے لیے حیرہ سے نکلے گی، کوئی اس کا ہمرکاب نہیں ہوگا، وہ اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھائے گی۔“ [بخاری، کتاب المناقب: باب علامات النبوة فی الاسلام (۳۰۹۵)]

③ تیسری دلیل قیاسی ہے کہ یہ سفر واجب ہے، اس کے لیے محرم کی شرط نہیں ہے۔ جیسے مسلمان عورت کفار کے ہاتھوں سے رہائی پالے تو وہ اکیلی ہی سفر کر کے دارالسلام میں آجائے گی اور یہ امر متفق علیہ ہے۔

مذکورہ بالا دلائل جو ان حضرات کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں ان سے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنے پر دلیل لینا درست نہیں ہے۔

نبی ﷺ کا استطاعت کے لیے زادراہ اور سواری کی تفسیر کرنا مرد کے حق میں ہے، عورت کے نہیں، یا اسے اس بات پر معمول کیا جائے گا کہ یہ حج کی بڑی بڑی شرطیں ہیں اور بقیہ شروط سے غفلت نہیں برتی جائے گی اور یہ بات مذکورہ فقہاء کو بھی تسلیم ہے کہ یہ دو بڑی شرطیں ہیں، اسی لیے انھوں نے عورت کے لیے پراسن راستے اور قافلے کی شرط لگائی ہے اور بعض نے قرض کی ادائیگی، اہل و عیال کا نفقہ اور سواری کے اوپر جم کر بیٹھنا وغیرہ کی شرط بھی لگائی ہے اور یہ شروط تو مذکورہ حدیث میں نہیں ہیں اور شوافع و مالک نے دلیل کے بغیر اپنی طرف سے یہ شرائط عائد کی ہیں اور اگر ان دونوں روایتوں میں تعارض مان لیا جائے تو پھر بھی ہمارے دلائل راجح ہوں گے کیونکہ وہ عورت کے حوالے سے خاص ہیں اور ان کی صحت پر امت متفق ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت سے دلیل پکڑنا بھی درست نہیں، اس لیے کہ وہ ایک حادثہ کے وقوع پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا

امرد واقع ہوگا اور اس میں امن کی خبر دی گئی ہے جبکہ عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا امر دیگر ہے جس سے یہ روایت خاموش ہے۔ اس لیے عورت کو سفر حج وغیرہ میں محرم کے بغیر نکلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے کیونکہ اس کی ممانعت پر خاص دلائل موجود ہیں۔ اسی طرح مسلمان قیدی عورت پر قیاس بھی درست نہیں۔ اس لیے اس کا سفر کرنا ضرورت شرعی اور امر مجبوری ہے، اس پر حالت اختیاری کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی یاد رہے کہ عورتیں مردوں کے لیے بہت بڑے فتنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ کسی جماعت یا معاشرے میں عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا فتنہ کو دعوت دینا اور شرک پھیلانے کا باعث ہے بلکہ تھوڑے اور کم دنوں کا سفر بھی فتنے کو جنم دیتا ہے تو دور دراز اور مہینے سے زائد سفر تو بالاولیٰ فتنوں کو جنم دیتا ہے اور اسلام تو عورت کی عفت و عصمت کا محافظ اور کرامت انسانیہ کا نگہبان ہے۔ نبی ﷺ نے عورت کی عفت و عصمت کے لیے ایک صحابی کو غزوہ سے رخصت دے دی اور اسے اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کرنے کا حکم دیا۔ صحابی رسول کو جہاد جیسے عظیم کام سے رخصت دے کر عورت کو محرم کے بغیر سفر حج کرنے سے منع کر دیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق عورت کے لیے مطلق طور پر محرم کے بغیر سفر کرنا حرام قرار دیا ہے۔ لہذا حج و عمرہ ہو یا کوئی اور سفر عورت محرم کے بغیر اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اسی میں اس کی عزت، کرامت اور عفت و عصمت ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

ہاتھ اور پاؤں کی تصویر اتروانا

(سوال) کیا سر کے علاوہ باقی جسم کی تصویر بنانا جائز ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

(جواب) یہ بات درست ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جاندار اشیاء کی تصاویر کو حرام قرار دیا ہے۔ تصاویر کے مٹانے کے حکم کے ساتھ جاندار اشیاء کی تصاویر بنانے والے پر لعنت کی گئی ہے اور قیامت کے دن کے سخت ترین عذاب کی وعید سنائی گئی ہے لیکن غیر جاندار چیزوں کی تصاویر اور جس تصویر کا سر کاٹ دیا گیا ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ایک آدمی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”میں یہ تصویریں بناتا ہوں، مجھے ان کے بارے میں فتویٰ دیجیے؟“ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہنے لگے: ”قریب آؤ۔“ وہ قریب ہو گیا۔ انھوں نے کہا: ”قریب آ جاؤ۔“ وہ اور قریب آیا تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کہا:

«أُنْبِتُكَ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ وَ يَجْعَلُ لَهُ بِكُلِّ صُورَةٍ صَوْرَهَا نَفْسًا تُعَذِّبُهُ فِي جَهَنَّمَ وَقَالَ إِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَا لَا نَفْسَ لَهُ» [مسلم، کتاب اللباس: باب

تحريم تصوير الحيوان (۲۱۱۰)]

”میں تمہیں اس کی خبر دیتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: ”ہر تصویر بنانے والا آگ میں جائے گا، اس کے لیے اس کی بنائی ہوئی تصویر کے بدلے میں ایک نفس مقرر کر دیا جائے گا جو اس کو جہنم میں

عذاب دے گا۔“ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اگر تو نے ضرور تصویر ہی بنائی ہے تو پھر درختوں کی بنا لو یا جس چیز میں جان نہیں۔“

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ جس چیز میں جان نہیں اس کی تصویر بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری دلیل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: ”میں گزشتہ رات بھی آیا تھا، گھر میں اس لیے داخل نہ ہوا کہ دروازے پر تصویریں تھیں۔“ گھر میں ایک پردے پر تصاویر تھیں اور کتا بھی گھر میں تھا، پھر کہا:

”فَمُرُّ بِرَأْسِ التَّمْثَالِ الَّذِي فِي الْبَيْتِ فَلْيَقْطَعْ فَيَصْبِرْ كَهَيْئَةِ الشَّحْرَةِ وَ مَرُّ بِالْبَيْتِ فَلْيَقْطَعْ وَ يُجْعَلْ مِنْهُ وَ سَادَتَيْنِ مُتَبَدِّلَتَيْنِ تُوَطَّئَانِ وَ مَرُّ بِالْكَؤُوبِ فَلْيَخْرُجْ فَفَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ“ [ترمذی، کتاب الأدب: باب ان الملائكة لا تدخل بيتا فيه صور (۶/۲۸۰)]

”گھر والی تصاویر کے سر کے متعلق حکم دے دو کہ اسے کاٹ دیا جائے تو وہ درخت جیسی بن جائیں گی اور پردے کو کاٹ کر اس کے دو گدے بنا لیے جائیں جو قدموں میں روندے جائیں اور کتے کو گھر سے نکال دیا جائے۔“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کر دیا۔“

اس حدیث کے پہلے جملے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ساری تصویر میں حرام صرف سر ہی ہے۔ اگر اسے کاٹ دیا جائے تو وہ درخت کی صورت میں بن جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ثابت ہوا کہ تصاویر والے پردے وغیرہ کو پھاڑ کر ایسی جگہ استعمال کر لیا جائے جو قدموں میں روندے جائیں یا جس سے ان کی خست ظاہر ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”أَمَّا الشَّجَرُ وَ نَحْوُهُ مِمَّا لَا رُوحَ فِيهِ فَلَا تَحْرُمُ صُنْعَتَهُ وَ لَا التَّكْسُبُ بِهِ سِوَاءَ الشَّجَرِ الْمُشْمِرِ وَ غَيْرِهِ وَ هَذَا مَذْهَبُ الْعُلَمَاءِ كَافَّةً“ [شرح مسلم للنووی (۴/۹۱۱)]

”درخت اور اس جیسی اور چیزیں جن میں روح نہیں ہے ان کی تصویر بنانا حرام نہیں اور نہ ان سے کمائی کرنا ہی حرام ہے، یہ تمام علماء کا مذہب ہے۔“

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”أَمَّا الْجِسْمُ بِلَا رَأْسٍ فَهُوَ كَالشَّحْرَةِ لَا شَكَّ فِي جَوَازِهِ“ [المجموع الثمین (۲/۲۴۵)]

”اور جسم سر کے بغیر درخت کی طرح ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔“

گھر میں تصویر لگانے کا حکم

سوال کیا گھر میں میت کی تصویر لگانا جائز ہے؟

جواب گھروں میں ذی روح اشیاء کی تصاویر لگانا جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذی روح ابھی زندہ ہو یا اسے موت آجائے، خواہ

یادگیری کے لیے ہو یا کسی اور مقصد کے لیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

« لَا تَدْعُ صُورَةَ إِلَّا طَمَسْتُهَا وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَيْتُهُ »

[صحیح مسلم کتاب الجنائز باب الأمر بتسوية القبر (۹۶۹)]

”کوئی صورت نہ چھوڑ کر اسے مٹا دے اور جو قبر اونچی ہو اسے برابر کر دے۔“

یعنی عام قبروں کے برابر کر دے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ تصویریں ختم کرنے کا حکم ہے لٹکانے کا نہیں۔

جاندار کی تصویر والے لباس

سوال کیا نماز پڑھتے وقت ایسی جیکٹ یا قمیص پہنی جاسکتی ہے جس پر کسی پرندے یا کسی اور جاندار کی تصویر ہو؟

جواب کسی بھی جاندار، ذی روح پرندے وغیرہ کی تصویر بالکل ناجائز اور حرام ہے، حرمت تصویر پر بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا:

”میں تصویر بناتا ہوں، آپ ان کے متعلق مجھے فتویٰ دیں؟“ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور فرمایا:

”تمہیں اس بات کی خبر دوں گا جو میں نے رسول ﷺ سے سنی، آپ نے فرمایا: ”ہر تصویر بنانے والا نفس جہنمی ہے اس

کے لیے ہر صورت کے بدلے، جو اس نے بنائی تھی، ایک نفس بنایا جائے گا، وہ اسے جہنم میں عذاب دے گا، ابن

عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر تو ضرور تصویر بنانے ہی والا ہے تو اس کی تصویر بنا جس میں روح نہیں۔“

[مسلم کتاب اللباس باب تحريم تصوير الحيوان (۲۱۱۰)]

معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر حرام ہے۔ ایسا لباس مطلق طور پر پہننا ہی نہیں چاہیے خواہ نماز کے لیے ہو یا غیر نماز کے

لیے۔ اگر ان تصاویر کے چہرے مسخ کر دیے جائیں تو پھر ان کا استعمال درست ہے۔ تفصیل کے لیے راقم کی کتاب ”ٹی وی

معاشرے کا کینسر“ ملاحظہ ہو۔

قوالی کی شرعی حیثیت اور عرسوں کے کھانے

سوال شریعت اسلامیہ میں قوالی کی کیا حیثیت ہے نیز عرس وغیرہ کے کھانوں کا کیا حکم ہے؟ کیا انھیں کھانا جائز ہے؟

جواب موجودہ دور میں قوالی کا سلسلہ بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر گاڑیوں، بسوں وغیرہ میں صبح ہوتے ہی ڈرائیور حضرات

قوالی کا سماع کرتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی ڈرائیور گاڑی چلاتے وقت گانے لگا دے اور اس کو منع کیا

جائے تو وہ گانوں کی کیسٹ بند کر کے قوالی لگا دیتے ہیں، جب روکا جائے تو کہتے ہیں مولوی صاحب ہم نے گانے تو بند کر

دیے ہیں، یہ تو قوالی ہے جو اسلام میں جائز ہے۔ حالانکہ قوالی گانے سے بھی بڑا جرم ہے۔ اولاً اس لیے کہ قوالیوں میں شریک

باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، بیروں و فقیروں کے متعلق ایسی ایسی لغو باتیں بیان کی جاتی ہیں جو سراسر شریعت اسلامیہ سے

متضاد اور روح اسلام کے خلاف ہوتی ہیں۔ کیونکہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کے ساتھ مخلوق میں سے کسی کو برابر سمجھنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« أَكْبَرُ الْكِبَائِرِ الْأَشْرَاطُ بِاللَّهِ » [بخاری، کتاب الاستئذان: باب من اتكأ بين يديه أصحابه (۶۲۷۳)]
 ”تمام کبیرہ گناہوں سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔“

ثانیاً: ان تمام قوانینوں میں ڈھول، سارنگی، مزامیر اور آلات لہو ولعب وغیرہ بجائے جاتے ہیں جو شرعاً بالکل حرام ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝ وَإِذَا تُلِيَ عَلَيْهِ آيُنَا وَ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَسَّطَهُ بَعْدَآبِ أَلِيمٍ ۝ ﴾ [لقمان: ۶، ۷]

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کے آلات کو خریدتے ہیں۔ اس لیے کہ سمجھ بوجھ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو بہکا دیں اور اس کو ہنسی مذاق بنا دیں۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا اور جب (ان لوگوں میں سے) کسی کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اکڑتا ہوا پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے گویا اس نے اس کو سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ اس آیت کریمہ میں ”لہو الحمدیث“ سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

« الْأَعْنَاءُ وَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُرَدِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ » [تفسیر ابن کثیر (۴۸۶۱۳)]

”اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں! اس سے مراد گانا ہے۔“ آپ نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا۔ یہی تفسیر سیدنا عبد اللہ بن عباس، جابر، عکرمہ رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، مجاہد، کھول اور علی بن حذیرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ گانا بجانا اور اس کے آلات خریدنا بالکل ناجائز اور حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہی کا باعث ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ گانے بجانے اور ان کے آلات خریدتے اور سنتے ہیں ان پر اگر اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھا جائے تو وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ موڑتے ہیں اور ایسے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انھوں نے سنا ہی نہیں۔ بعینہ یہی کیفیت آج کل اکثر گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی ہے، اگر ان کو تلاوت کی کیسٹ لگانے کے لیے کہا جائے تو طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور اگر گانے بجانے اور قوالی کی کیسٹ کے متعلق کہیں تو فوراً لگا دیتے ہیں۔ گویا کلام باری تعالیٰ سے چڑ اور شیطانی عمل سے محبت ہے۔ باجوں اور آلات لہو ولعب کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« لِيَكُونَنَّ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحَرَّ وَ الْحَرِيرَ وَ الْخَمْرَ وَ الْمَعَارِفَ » [بخاری، کتاب

الأشربة: باب ما جاء فيمن يستحل الخمر (۵۵۹۰)]

”میری امت میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جو عورتوں کی شرمگاہ، ریشمی کپڑے، شراب اور باجے حلال ٹھہرائیں گے۔“ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح زنا و شراب حرام ہیں اسی طرح باجے گا جے بھی حرام ہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل میں جائے بغیر بریلوی حضرات کے امام مولوی احمد رضا خان بریلوی کے ایک فتوے کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے امام کے فتوے ہی کو پڑھ کر راہ راست پر آجائیں۔ احمد رضا خان کی کتاب احکام شریعت (ص: ۶۰، حصہ اول) پر ایک سائل کا سوال یوں درج ہے:

”آج میں جس وقت آپ سے رخصت ہوا اور نماز مغرب کے لیے مسجد گیا، بعد نماز مغرب میرے ایک دوست نے کہا کہ چلو ایک جگہ عرس ہے، میں چلا گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور اس طریقہ سے قوالی ہو رہی ہے کہ ایک ڈھول، دو سارنگی بج رہی ہیں اور چند قوال پیران پیر دھبیر کی شان میں اشعار کہہ رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نعت کے اشعار اور اولیاء اللہ کی شان میں اشعار گارہے ہیں اور ڈھول سارنگیاں بج رہی ہیں۔ یہ باجے شریعت میں قطعی حرام ہیں۔ کیا اس فصل سے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء خوش ہوتے ہوں گے؟ اور یہ حاضر جلسہ گناہ گار ہوئے یا نہیں اور ایسی قوالی جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو کس طرح؟“

احمد رضا خان اس سائل کا جواب یوں تحریر کرتے ہیں: ”ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گناہ گار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر، بغیر اس کے کہ عرس کرنے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف ہو۔ نہیں بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور ایسا عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔ وجہ یہ ہے کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا، ان کے لیے اس گناہ کا سامان پھیلا یا اور قوالوں نے انھیں سنایا۔ اگر وہ سامان نہ کرتا، یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا۔ پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا، وہ نہ عرس کرتا، نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے جاتے۔ لہذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔“

اس کے بعد آگے (ص: ۶۳، ۶۵) پر رقمطراز ہیں: ”سید الاولیاء شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا: ”ان ایام میں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایسے مجمع میں جہاں چنگ و رہاب اور دیگر مزامیر تھے، رقص کیا۔“ فرمایا: ”انھوں نے اچھا کام نہیں کیا، جو چیز شرع میں ناجائز ہے، ناپسندیدہ ہے۔“ اس کے بعد ایک نے کہا: ”جب یہ جماعت اس مقام سے باہر آئی تو لوگوں نے ان سے کہا: ”تم نے یہ کیا کیا؟ وہاں تو مزامیر تھے، تم نے سماع کس طرح سنا؟ اور رقص کیا۔“ انھوں نے جواب دیا: ”ہم اس طرح سماع میں مستغرق تھے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہاں مزامیر ہیں یا نہیں۔“ سلطان المشائخ نے فرمایا: ”یہ جواب کچھ نہیں، اس طرح تو تمام گناہوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔“

مسلمانو! کیسا صاف ارشاد ہے کہ مزامیر ناجائز ہیں اور اس عذر کا کہ ہمیں استغراق کے باعث مزامیر کی خبر نہ ہوئی، کیا مسکت جواب عطا فرمایا کہ ایسا حیلہ ہرگناہ میں ہو سکتا ہے۔ شراب پیے اور کہہ دے شدت استغراق کے باعث ہمیں خبر نہ ہوئی کہ شراب ہے یا پانی، زنا کرے اور کہہ دے کہ غلبہ حال کے سبب ہمیں تمیز نہ ہوئی کہ جو رو ہے یا بیگانی۔

مولوی احمد رضا خان کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ تواری سننا، سنانا، عرسوں اور میلوں پر اس کا انعقاد کرنا حرام و ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں گانے بجانے کے آلات، ڈھول، سارنگی، ستار وغیرہ بجائے جاتے ہیں جن کی اسلامی شریعت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

ہاں اگر ایسے اشعار ہوں جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں اور مذکورہ خرابیوں سے پاک ہوں تو انہیں پڑھنا جائز و درست ہے جیسا کہ شاعر رسول سیدنا حسان رضی اللہ عنہ اشعار کہا کرتے تھے۔ باقی رہا اہل قبور کے لیے نذر و نیاز کی پکائی ہوئی دیکھیں یا مردوں پر پڑھائے ہوئے چڑھاوے تو یاد رہے کہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے:

«عَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كَانَ نَذَرَ رَجُلٍ عَلَىٰ عَهْدِ النَّبِيِّ (ﷺ) أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بِوَأْنَةٍ فَسَأَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنِّي نَذَرْتُ أَنْ أَنْحَرَ إِبِلًا بِوَأْنَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ كَانَ فِيهَا وَتَنٌ مِنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ؟ قَالُوا لَا، قَالَ فَهَلْ كَانَ فِيهَا عَيْدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ؟ قَالُوا لَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْفِ بِنَذْرِكَ فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرِ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ» [ابو داؤد، کتاب الايمان والنذور: باب ما يؤمر

به من الوفاء بالنذر (۳۳۱۳)، بیہقی (۸۳۱۰)]

”ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نذر مانی تھی کہ بوانہ کے مقام پر اونٹ ذبح کروں گا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ”میں نے نذر مانی ہے کہ بوانہ جگہ اونٹ ذبح کروں گا۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہاں جاہلیت میں کسی بت کی پرستش تو نہیں ہوتی تھی؟“ لوگوں نے جواب دیا: ”نہیں۔“ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ”کیا وہاں کوئی تہوار یا میلہ تو نہیں لگتا تھا؟ انہوں نے کہا: ”نہیں۔“ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اپنی نذر پوری کر، بلاشبہ جو نذر اللہ جل و علا کی نافرمانی میں ہو، وہ پوری نہیں کی جائے گی اور نہ اس نذر کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے جو اس کی وسعت سے باہر ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نذر و نیاز اللہ کے نام کی دینی چاہیے، دوسری بات کہ کسی ایسی جگہ اللہ کے نام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں جہاں کسی بت کی پوجا کی جاتی رہی ہو اگرچہ وہ اب باقی نہ رہا ہو۔ اسی طرح وہاں بھی اللہ کے نام کی نذر پوری نہیں کی جائے گی جہاں اہل کفر و شرک کا کوئی میلہ یا تہوار منایا جاتا ہو۔ لہذا ایسے مقامات جہاں عرس و میلے لگائے جاتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کے نام کی نذر و نیاز دینا یا کھانا درست نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

دل بہلانے کے لیے بانسری بجانا

(سوال) کیا دل بہلانے کے لیے یا فارغ اوقات میں بانسری بجانا اسلام میں جائز ہے؟
(جواب) اسلام میں بانسری بجانے کی اجازت نہیں ہے، دل بہلانے کے لیے قرآن حکیم کی تلاوت کرو اور علمائے دین کی تقاریر وغیرہ سنا کرو۔ مومن آدمی کا دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:
 ”خبردار! اللہ کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔“ (الرعد: ۲۸)

موسیقی کے آلات وغیرہ اللہ کی یاد سے غافل کرنے والی چیزیں ہیں اور شیطانی آوازیں ہیں۔ نافع بیان کرتے ہیں:
 ”عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں اگلیاں ڈال لیں اور راستے سے ہٹ گئے اور مجھے کہا:
 ”اے نافع! کیا تم کوئی آواز سن رہے ہو۔“ میں نے کہا: ”نہیں!“ تو انہوں نے اپنے کانوں سے اگلیاں نکال دیں
 اور کہا: ”میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ نے اسی طرح کی آواز سنی اور ایسے ہی کیا۔“
 [ابوداؤد، کتاب الأدب: باب كراهية الغناء والزمير (۴۹۲۴)، بیہقی (۲۲/۱۰)]
 اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ بانسری کی آواز دل بہلانے کے لیے یا کسی اور غرض کے لیے درست نہیں ہے۔ رسول
 اللہ ﷺ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سن کر اپنی اگلیاں کانوں میں ڈال لی تھی۔ ہمیں بھی بانسری کی آواز سے
 بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

قبروں پر عرس اور میلے کا حکم

(سوال) بعض لوگ قبروں پر عرس اور میلے ثابت کرنے کے لیے یہ روایت پیش کرتے ہیں: «يَأْتِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى رَأْسِ كُلِّ حَوْلٍ قَبُورِ الشُّهَدَاءِ» «رسول اللہ ﷺ ہر سال کی ابتدا یا انتہا پر شہدائے (احد) کی قبروں پر آتے تھے۔“ کیا ایسی کوئی صحیح روایت کتب احادیث میں موجود ہے؟
(جواب) جو لوگ قبروں پر عرس میلے، قوالی و محفل سماع، ڈھول و سارنگی وغیرہ منکرات قائم کرتے ہیں ان کے اس عمل کی دلیل قرآن و سنت میں موجود نہیں ہے۔ زمانہ خیر القرون میں اس کا کہیں بھی وجود نہیں، مسلم اقوام کے جب مشرک اقوام سے میل جول اور روابط ہونے لگے تو اس اختلاط کے نتیجے میں کئی ایک مشرکانہ اور مجتہدانہ رسم و رواج اور عقائد و اعمال نے امت مسلمہ میں جگہ پکڑ لی اور لوگوں نے انبیاء ﷺ اور اولیائے کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں پر یا ان کے ناموں پر عرس اور میلے قائم کرنے شروع کر دیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

« لَا تَجِدُوا قَبْرِي عَيْدًا وَلَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُورًا وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَصَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ

تَبْلُغُنِي » [مسند احمد (۸۷۹۰)، ابوداؤد، کتاب المناسك: باب زيادة القبور (۲۰۴۲)، شعب الايمان

للبيهقي (۴۱۶۲)]

”میری قبر کو میلانا نہ بنانا اور نہ اپنے گھروں کو قبرستان بناؤ اور تم جہاں کہیں بھی ہو مجھ پر درود بھیجو، تمہارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ درواز کا سفر کر کے نبی ﷺ کی قبر پر اجتماع کرنا جائز نہیں کیونکہ زیارت قبر کا مقصد تو وہاں صلوٰۃ و سلام ہی پڑھنا ہے جبکہ صلوٰۃ و سلام تو آپ کو دور و نزدیک سے پہنچا دیا جاتا ہے، لہذا جب رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر عید و میلاد جیسا اجتماع کرنا درست نہیں تو اور کسی کی آپ کے مقابلے میں کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (سورۃ آل عمران کی آیت ۶۴) کی تفسیر کے ضمن میں فائدہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”لَا يَجُوزُ مَا يَفْعَلُهُ الْجُهَالُ بِقُبُورِ الْأَوْلِيَاءِ وَالشَّهَدَاءِ مِنَ السُّجُودِ وَالطَّوَافِ حَوْلَهَا وَإِتِّخَاذِ الشُّرُجِ وَالْمَسَاجِدِ عَلَيْهَا وَمِنَ الْاجْتِمَاعِ بَعْدَ الْحَوْلِ كَالْأَعْيَادِ وَيُسْمُونَهُ عُرْسًا“

[تفسیر مظہری (۶۵/۲)]

”اولیاء اور شہداء کی قبروں پر جاہل حضرات جو سجدے کرتے ہیں، ان کے گرد طواف کرتے ہیں، چراغاں اور دیے جلاتے ہیں قبروں پر مسجدیں قائم کرتے ہیں اور سال بعد عیدوں کی طرح جو اجتماع منعقد کرتے اور اسے عرس کا نام دیتے ہیں یہ جائز نہیں ہے۔“

پس معلوم ہوا کہ قبروں پر عرس میلے جہاں کی پیداوار ہے، کتاب و سنت میں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ اب رہی سوال میں ذکر کردہ روایت تو اسے امام بیہقی نے دلائل النبوة (۳/۳۰۸) میں واقدی کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور سیوطی نے شرح الصدور میں بحوالہ بیہقی بیان کیا ہے جبکہ محمد بن عمر واقدی سلمی مشہور کذاب راوی ہے۔

زکریا بن یحییٰ الساجی، امام بخاری، امام احمد، ابن نمیر، ابن المبارک، اسماعیل بن زکریا، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، مسلم، نسائی، ابوالاحمد، الحاکم اور دارقطنی وغیرہم نے اسے متروک، کذاب اور غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ (تہذیب الکمال (۱۰۰/۱۷)) امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”واقدی کی کتب سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔“ (تہذیب (۳۲۵/۹))

یہی روایت ابو زید عمر بن شہب الیمری نے اپنی کتاب ”تاریخ المدینة المنورة (۱۳۲/۱)“ میں بطریق ابی غسان (محمد بن یحییٰ الکنانی) روایت کی ہے، حدیث مع سند مندرجہ ذیل ہے:

« حَدَّثَنِي عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَمْرَانَ عَنْ مُوسَى بْنِ يَعْقُوبَ الزَّمْعِيِّ عَنْ عَبَّادِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْتِي قُبُورَ الشَّهَدَاءِ بِأَحَدٍ عَلَى رَأْسِ كُلِّ حَوْلٍ »

[تاریخ المدینة المنورة (۱۳۲/۱)]

یہ تین طلل کی بنا پر ناقابل حجت ہے:

۱۔ اس کی سند میں عبدالعزیز بن عمران راوی کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے کہا ”لم یکن من أصحاب الحدیث

”یہ اصحاب الحدیث میں سے نہیں ہے) اور ایک مرتبہ کہا: ”لَيْسَ بِثِقَةٍ“ (ثقیل نہیں ہے)۔ ابو زکریا کہتے ہیں ”رَأَيْتُهُ هَاهُنَا بَبُعْدَادٍ كَأَن يَشْتُمُ النَّاسَ وَيَطْعَنُ فِي أَحْسَابِهِمْ لَيْسَ حَدِيثُهُ بِشَيْءٍ“ ”میں نے اسے بغداد میں دیکھا ہے، یہ لوگوں کو گالیاں دیتا اور ان کے حسب نسب میں طعن کرتا تھا، اس کی روایت کوئی چیز نہیں۔“

محمد بن یحییٰ نساہوری کہتے ہیں: ”عَلَىٰ بَدَنَةِ إِنْ حَدَّثْتُ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ عَمْرَانَ حَدِيثَنَا، يُضَعِّفُهُ جَدًّا“ اگر میں عبدالعزیز بن عمران سے حدیث بیان کروں تو مجھ پر ایک اونٹ کی قربانی لازم ہو۔“ وہ اسے بہت ضعیف قرار دیتے تھے۔“

امام بخاری فرماتے ہیں: ”مُنْكَرُ الْحَدِيثِ لَا يُكْتَبُ حَدِيثُهُ“ امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ لَا يُكْتَبُ حَدِيثُهُ“ یہ منکر الحدیث اور متروک الحدیث ہے اس کی روایت لکھی نہیں جاتی۔ (تہذیب الکمال ۵۲۰/۱۱)

ابن حبان کہتے ہیں: ”يُرْوَى الْمَنَاكِبُ عَنِ الْمَشَاهِيرِ“ ”یہ مشہور راویوں کے نام سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔“ ابو حاتم کہتے ہیں: ”ضَعِيفُ الْحَدِيثِ، مُنْكَرُ الْحَدِيثِ جَدًّا“ ابن ابی حاتم کہتے ہیں: ”إِمْتِنَاعُ أَبُو زُرْعَةَ مِنْ قِرَاءَةِ حَدِيثِهِ وَتَرْكُ الرِّوَايَةِ عَنْهُ“ ابو زرعة نے اس کی روایت پڑھنے سے منع کیا اور اس سے روایت لینا چھوڑ دیا۔ (تہذیب ۳۱۳/۶)

بلکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وَقَالَ عُمَرُ بْنُ شَبَّهٍ فِي أَحْبَارِ الْمَدِينَةِ كَانَ كَثِيرُ الْعَلَطِ فِي حَدِيثِهِ لِأَنَّهُ احْتَرَقَتْ كُتُبُهُ فَكَانَ يُحَدِّثُ مِنْ حِفْظِهِ“ (تہذیب ۳۱۳/۶) ”عمر بن شبہ نے اخبار المدینہ میں کہا یہ اپنی روایت میں کثرت سے غلطیاں کرتا تھا، اس لیے کہ اس کی کتابیں جل گئی تھیں تو اپنے حافظے سے بیان کرتا تھا۔“

۲۔ اسی طرح اس کا استاذ موسیٰ بن یعقوب الرضی مختلف فیہ ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”صُدُوقٌ سَيِّءُ الْحِفْظِ“ جبکہ دکتور بشار عواد اور شیخ شعیب ارناؤط لکھتے ہیں: ”بَلْ ضَعِيفٌ يُعْتَبَرُهُ فِي الْمُتَابَعَاتِ وَالشَّوَاهِدِ، فَقَدْ ضَعَّفَهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ فَقَالَ: ضَعِيفُ الْحَدِيثِ، مُنْكَرُ الْحَدِيثِ وَالنِّسَائِيُّ قَالَ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ وَالذَّارِقُطْنِيُّ قَالَ: لَا يُحْتَجُّ بِهِ وَقَالَ أَحْمَدُ: لَا يَعْجَبُنِي حَدِيثُهُ“ (تحریر تقریب التہذیب ۴۱۱/۳)

”بلکہ یہ ضعیف راوی ہے، متابعات و شواہد میں اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اسے علی بن المدینی نے ضعیف قرار دیا اور کہا: ”یہ ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث ہے۔“ نسائی نے کہا: ”قوی نہیں ہے۔“ دارقطنی نے کہا: ”قابل حجت نہیں۔“ احمد نے کہا: ”اس کی روایت مجھے پسند نہیں ہے۔“

۳۔ اور تیسری علت یہ ہے کہ یہ عباد بن ابی صالح جسے عبداللہ بن ابی صالح بھی کہا جاتا ہے، کی مرسل روایت ہے اور اس کے بارے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”لین الحدیث“ ”یہ کمزور روایت والا ہے۔“ (تقریب مع تحریر ۲۲۲/۲)

لہذا یہ روایت کسی طرح بھی قابل حجت نہیں ہے۔ یہی روایت امام عبدالرزاق نے المصنف (۵۷۳/۳) (۵۷۳/۳) (۶۷۱۶)

میں عن رجل من أهل المدينة عن سهيل بن أبي صالح عن محمد بن ابراهيم التيمي کے طریق سے اور طبری نے سورہ رعد کی آیت (۲۳) کے تحت حدثنی المثنی قال حدثنا سوید قال أخبرنا ابن المبارك عن ابراهيم بن محمد عن سهل بن أبي صالح عن محمد بن ابراهيم ذكر كى ہے، نیز دیکھیں ابن کثیر (۵۲۹/۲) مطبوعہ مکتبہ تحانیہ پشاور، تفسیر ثعلبی (۲۸۷/۵)۔

عبدالرزاق کی سند میں رجل من أهل المدينة مبہم ہے۔

جبکہ طبری کی سند میں ثنی بن ابراهیم الطبری کے حالات نامعلوم ہیں اور پھر یہ روایت مرسل ہے جو محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام میں سے ہے۔ لہذا یہ روایت کسی بھی صحیح یا حسن سند سے مروی نہیں، اس لیے عباد القبول کا اس سے استدلال درست نہیں۔

گانا اور میوزک سننا

سوال کیا مسلمان کے لیے گانا اور میوزک سننا جائز ہے؟

جواب گانا اور میوزک سننا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتے ہیں، نیز انھیں سنتے رہنے سے دل بیمار اور سخت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب مبین اور اس کے رسول امین کی سنت اس کی حرمت پر شاہد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنُ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ﴾ [لقمان: ۶]

”اور لوگوں میں سے بعض ایسا ہی ہے جو بے ہودہ حکایتیں (آلات طرب) خریدتا ہے۔“

اکثر مفسرین اور بہت سے علمائے کرام نے ”لَهْوَ الْحَدِيثِ“ کی تفسیر گانا اور آلات طرب سے کی ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”میری امت میں کچھ جماعتیں ہوں گی جو حریر، خمر اور معازف کو حلال بنا لیں گے۔“ [بخاری، کتاب الأشربة:

باب ما جاء فيمن يستحل الخمر (۵۵۹۰)]

”حر“ سے مراد حرام شرمگاہ ہے اور ”حریر“ یعنی ریشم جو مشہور چیز ہے اور مردوں کے لیے حرام ہے۔ ”خمر“ یعنی شراب یہ بھی

مشہور ہی ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوگا جس میں نشہ ہو اور یہ عام مسلمان مرد و عورت، بڑے اور بچے کے لیے حرام ہے

اور اس کا پینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور ”معازف“ گانا بجانا اور ہر قسم کے آلات طرب۔ گانے بجانے کی حرمت پر کئی ایک

نصوص، آیتیں اور حدیثیں جنہیں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”اغاثة اللفغان من مكائد الشيطان“ میں ذکر کیا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے تمام مسلمانوں کی ہدایت و توفیق کی اور اس کے غضب سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے ہیں۔

مخفوں میں تالی بجانا

سوال تقریبات اور جلسوں میں تالی بجانا جائز ہے یا مکروہ؟

(جواب) محفلوں میں تالی بجانا غیر اسلامی فعل ہے، کم از کم اسے مکروہ تو کہا ہی جا سکتا ہے، حالانکہ دلیل کے اعتبار سے یہ حرام ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے بارے میں کہا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاةُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً ﴾ [انفال: ۳۵]

”بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹھل اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں۔“

علمائے کرام کا کہنا ہے کہ ”مُكَاءً“ سے مراد سیٹی بجانا اور ”تَصَدِيَةً“ سے مراد تالی بجانا ہے اور ایک مومن کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کوئی پسندیدہ چیز دیکھے یا اچھی بات سنے تو سبحان اللہ یا اللہ اکبر کہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی بے شمار حدیثوں سے ثابت ہے اور اگر عورتیں مردوں کے ساتھ نماز میں ہوں اور امام کچھ بھول جائے تو ان کے لیے امام کو آگاہ کرنے کی غرض سے تالی بجانا جائز ہے لیکن مرد بھی کام ”سبحان اللہ“ کہہ کر انجام دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح سنت سے یہی ثابت ہے۔

معلوم ہوا کہ مردوں کی تالی بجانے میں کافروں اور عورتوں سے مشابہت پائی جاتی ہے، ان دونوں کی مشابہت اختیار کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ واللہ ولی التوفیق!

موسیقی، اسلام کی نظر میں

(سوال) اسلام کی نظر میں موسیقی کی کیا حیثیت ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ لقمان میں اہل سعادت جو اللہ کے کلام کے سماع سے فیض یاب ہوتے ہیں، ان کا ذکر کر کے بعد میں اہل شقاوت کا ذکر کیا ہے جو کلام الہی سننے سے تو اعراض کرتے ہیں لیکن نغمہ و سرود، ساز و موسیقی اور گانے وغیرہ خوب ذوق و شوق سے سنتے ہیں بلکہ ایسے افراد بھی ہیں جو اسے عبادت سمجھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَ لِيَ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَسَّشْرَهُ بَعْدَآبِ أَيْمِهِ ﴾ [لقمان: ۷، ۶]

”اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غافل کرنے والی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ کریں اور اسے ہنسی و مذاق بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے اور (یہ ایسا شخص ہے کہ) جب اس کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو تکبر کرتے ہوئے اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔ آپ اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔“

اس آیت کریمہ میں لفظ ”لہو الحدیث“ کا مطلب گانا بجانا اور آلاتِ طرب وغیرہ ہیں جیسا کہ صحابی رسول سیدنا عبد اللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« أَلْغِنَاءُ وَاللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُرَدِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ » [ابن ابی شیبہ (۳۰۹/۶)، تفسیر ابن کثیر (۴۸۶/۳) تفسیر ابن جریر طبری (۶۲/۲۱)، بیہقی (۲۲۳/۱۰)]

”اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! اس آیت میں ”لہو الحدیث“ سے مراد گانا بجانا ہے۔“ یہ بات آپ نے تین مرتبہ دہرائی۔“
امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ“ [مستدرک حاکم (۴۱۱/۲)]
”یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے تخریج نہیں کیا۔“

امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی امام حاکم رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”لہو الحدیث“ سے مراد گانے بجانے اور اس کی مثل اشیاء ہیں۔“ [تفسیر ابن جریر طبری (۶۲، ۶۱/۲۱)، بیہقی

(۲۲۱/۱۰)، کشف الاستار (۲۲۶/۴)، ابن ابی شیبہ (۳۱۰/۶)، الأدب المفرد (۷۸۶)]

اس کی سند حسن ہے۔ علاوہ ازیں جابر، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ، ابراہیم نخعی، مجاہد، کھول، عمرو بن شعیب، علی بن بذیمہ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر (۴۸۶/۳)، المنتقى النفیس من تلبیس ابلیس (ص ۳۰۳)]
ائمہ سلف کی اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ ”لہو الحدیث“ کا مفہوم آلات طرب اور گانا بجانا ہے۔ لہذا ایسے آلات خریدنا جو گانے بجانے، ضلالت و گمراہی کا سرچشمہ ہوں، حرام ہیں۔

مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے آلات سننے والے افراد کی یہ خصلت بھی ہوتی ہے کہ وہ قرآنی آیات سننے سے دور بھاگتے ہیں اور یہ بات عملاً دیکھی گئی ہے کہ جب کسی ڈرامیور کو، جب وہ گانا لگاتا ہے، تلاوت وغیرہ کی کیسٹ لگانے کا کہا جائے تو وہ اس پر غصے میں آجاتا ہے بلکہ بعض اوقات لڑ پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کو دردناک عذاب کی بشارت دی ہے اور جس کام پر عذاب کی وعید ہو وہ کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے جیسا کہ علامہ بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب ”الزواجر“ اور امام ذہبی رحمہ اللہ کی کتاب ”الکبائر“ میں تصریح ہے۔ بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے:

« الْكَبَائِرُ كُلُّ ذَنْبٍ خَتَمَهُ اللَّهُ بِنَارٍ أَوْ لَعْنَةٍ أَوْ غَضَبٍ أَوْ عَذَابٍ »

”ہر وہ گناہ جسے بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے عقاب آگ، غضب، لعنت یا عذاب کے الفاظ کے ساتھ کیا ہو، وہ کبیرہ گناہ ہے۔“

نیز کبیرہ گناہوں کا تذکرہ سورہ نساء (۳۱) اور سورہ نجم (۳۲) میں موجود ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ۚ وَ تَضْحَكُونَ ۚ وَ لَا تَبْكُونَ ۚ وَ أَنْتُمْ سَامِدُونَ ﴾

[النجم: ۵۹-۶۱]

”کیا تم اس بات (قرآن) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں بلکہ تم کھیل رہے ہو۔“

اس آیت کریمہ میں قرآن مجید کے سماع پر ہنسنے اور کھیلنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ”سامدون“ یعنی کھیلنے والے

کی تفسیر صحابی رسول عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یوں بیان کرتے ہیں:

”هُوَ الْغِنَاءُ بِالْحَمِيرِيَّةِ أَسْمَدٌ لَنَا تَغْنَى“ [بیہقی (۲۲۳/۱۰)، ابن حجر طبری (۸۲/۲۷)]
 ”حمیری قبیلے کی لغت میں ”سم“ سے مراد گانا ہے، جو کوئی شخص گانا گائے تو کہتے ہیں ”اسمد لنا۔“
 امام مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”وَ هُوَ الْغِنَاءُ يَقُولُ أَهْلُ الْيَمَنِ سَمَدٌ فَلَانٌ إِذَا غَنَى“ [المنتقى النفيس (ص ۳۰۴)]
 ”اس سے مراد گانا ہے، جب کوئی شخص گانا گائے تو اہل یمن کہتے ہیں ”سمد فلان۔“
 تیسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ اسْتَنْزِزْ مَن اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَ اجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ وَ عَدْهُمْ وَ مَا يَعْذُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ﴾ [بنی اسرائیل: ۶۴]
 ”اور ان میں سے تو جسے بھی اپنی آواز سے بہکا سکتا ہے بہکا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا اور ان کے مال اور اولاد میں تو شریک ہو جا اور ان سے وعدے کر اور شیطان انھیں وعدے نہیں دیتا مگر سب کے سب فریب و دھوکا ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں شیطانی آواز سے مراد موسیقی، آلات طرب، گانے بجانے اور رقص و سرود کی محافل میں فحش گوئی اور ہر وہ آواز ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی دعوت دیتی ہے۔ امام مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”هُوَ الْغِنَاءُ وَ الْمَزَامِيرُ“ [المنتقى النفيس (۳۰۴)، تفسیر ابن کثیر (۵۶/۳)]
 ”اس سے مراد گانا اور مزامیر ہے۔“

قرآن مجید کی ان تینوں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ گانا بجانا اور آلات طرب حرام اور شیطانی آوازیں ہیں، ان سے اجتناب انتہائی لازمی ہے۔ اس کے متعلق چند ایک صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم مندرجہ ذیل ہیں:

① سیدنا ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

« لِيَكُونَنَّ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَّ وَ الْحَرِيرَ وَ الْخَمْرَ وَ الْمَعَارِفَ وَ لَيَنْزِلَنَّ أَقْوَامٌ إِلَيَّ حَنْبٍ عَلِيمٌ يَرُوحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَّهُمْ يَأْتِيهِمْ يَعْنِي الْفَقِيرَ لِحَاجَةٍ فَيَقُولُونَ ارْجِعْ إِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللَّهُ وَ يَضَعُ الْعَلَمَ وَ يَمَسُخُ آخَرَيْنَ قَرَدَةً وَ حَنَازِيرَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ » [بخاری، کتاب الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر و يسميه بغير اسمه (۵۵۹۰)، مسند الشاميين (۳۳۴/۱) (۵۸۸) المعجم الكبير (۳۴۱۷)، بیہقی (۲۲۱/۱۰)، ابو داؤد (۴۰۳۹)، تہذیب السنن (۲۷۱/۵)، تاریخ کبیر (۳۰۴/۱)]

”میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور باجے حلال ٹھہرائیں گے اور چند لوگ ایک پہاڑ

کے پہلو میں اتریں گے۔ شام کو ان کا چرواہا ان کے جانور لے کر ان کے پاس آئے گا اور ان کے پاس ایک فقیر آدمی حاجت و ضرورت کے لیے آئے گا، وہ اسے کہیں گے ہمارے پاس کل آنا۔ رات کو اللہ تعالیٰ ان پر پہاڑ گرا کر انہیں تباہ کر دے گا اور ان میں سے کچھ لوگوں کو بندر اور سور بنا دے گا۔ وہ قیامت تک اسی طرح رہیں گے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ باجے گا بے حلال سمجھنے والے لوگ عذاب الہی میں گرفتار ہوں گے۔ یہاں بندر اور سور کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے اور بندر حرم میں اور سور بے حیائی میں ضرب الٹل ہے یعنی حدیث میں مذکورہ صفات کے حاملین دنیا دار، شہوت پرست اور حریص و لالچی ہوں گے اور بے حیائی و بے غیرتی میں سورتی کی مثل ہوں گے۔

② مذکورہ بالا حدیث دوسری سند کے ساتھ بھی مروی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں:

«لَيْشُرَبَنَّ نَاسٌ مِّنْ أُمَّتِي الْخَمْرَ يُسْمُونَهَا بِغَيْرِ اسْمٍ يُعْزَفُ عَلَيَّ رُوُوسِهِمْ بِالْمَعَارِيفِ وَ الْمُغْنِيَّاتِ يَخْسِفُ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ وَ يَجْعَلُ مِنْهُمْ الْقِرْدَةَ وَ الْخَنَازِيرَ» [ابن ابی شیبہ (۱۰۷/۸)، موارد الظمان (۱۳۸۴)، بیہقی (۲۹۵/۸)، (۲۲۱/۱۰)، طبرانی کبیر (۳۴۱۹)، مسند احمد (۳۴۲/۵)]

”البتہ ضرور میری امت کے لوگ شراب پیتیں گے اور اس کا نام بدل دیں گے۔ ان کے سروں پر گلوکارائیں اور آلات طرب بجائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض افراد کو بندر اور سور بنا دے گا۔“

③ سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيَّ أُمَّتِي الْخَمْرَ وَ الْمَيْسِرَ وَ الْمُعْزَرَ وَ الْكُوبَةَ وَ الْقَيْنِينَ وَ زَادَنِي صَلَاةَ الْوَيْتْرِ» [مسند احمد (۱۶۵/۲)، ابو داؤد (۳۶۸۵)، بیہقی (۲۲۱/۱۰)، کتاب المعرفة والتاریخ (۵۱۹/۲)]

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت پر شراب، جو، گہیوں کی بنید، طبلہ اور سارنگی حرام کر دیے ہیں اور مجھے نماز وتر زائد عطا کی ہے۔“

④ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ الْخَمْرَ وَ الْمَيْسِرَ وَ الْكُوبَةَ وَ قَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ» [مسند احمد (۲۸۹/۱)، کتاب الأشربة لأحمد (۱۹۳)، بیہقی (۲۲۱/۱۰)، طبرانی کبیر (۱۰۱/۱۲)، دارقطنی (۷/۳)]

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر شراب، جو اور طبلہ حرام کیا ہے اور فرمایا ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“

⑤ «عَنْ نَافِعٍ قَالَ سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إصْبَعِيهِ عَلَى أُذُنِيهِ وَ نَأَى عَنِ الطَّرِيقِ وَ قَالَ لِي يَا نَافِعُ! هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ فَقُلْتُ لَا قَالَ فَرَفَعَ إصْبَعِيهِ مِنْ أُذُنِيهِ وَ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا» [ابو داؤد، کتاب

الأدب: باب كراهية الغناء والزمر (٤٩٢٤)، بيهقي (٢٢/١٠)، المنتقى النفيس (ص ٣٠٤/١)، موارد الظمان (٢٠١٣)، مسند احمد (٨/٢)، حلية الأولياء (١٢٩/٦)، طبرانی صغير (١٣/١)

”نافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ہانسری کی آواز سنی تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور راستے سے ہٹ گئے اور مجھ سے پوچھا: ”اے نافع! کیا تو کوئی آواز سن رہا ہے؟“ میں نے کہا: ”نہیں۔“ تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے نکال لیں اور فرمایا: ”میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی آواز سنی اور ایسا ہی کیا۔“

⑥ «عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ وَقَذْفٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَمَتَى ذَاكَ؟ قَالَ إِذَا ظَهَرَتِ الْأَقْيَانُ وَالْمَعَارِيفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُورُ» [ترمذی، کتاب الفتن: باب ما جاء في علامة حلول المسخ والحسف (٢٢/١٢)]

”حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس امت کے اندر زمین کے اندر دھنسا، صورتیں بدلنا اور بہتان بازی پیدا ہوگی۔“ مسلمانوں سے ایک آدمی نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! ایسا کب ہو گا؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب گلوکارائیں اور طبلے سارنگیاں عام ہوں گی اور شرابیں پی جائیں گی۔“

⑦ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا نَهَيْتُ عَنْ صَوْتَيْنِ أَحْمَقَيْنِ فَاجِرَيْنِ: صَوْتُ مِزْمَارٍ عِنْدَ نِعْمَةٍ وَصَوْتُ رَنَّةٍ عِنْدَ مُصِيبَةٍ» [ترمذی، کتاب الحناظر: باب ما جاء في الرخصة في البكاء على الميت (١٠٠٥)، طبقات ابن سعد (١٣٨/١)، مسند طرابلسی (١٦٨٣)، حاکم (٤٠/٤)، شرح السنة (٤٣١/٥)، امام بغوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔]

”مجھے دو بدترین آوازوں سے روکا گیا ہے، خوشی کے وقت ہانسری کی آواز سے اور مصیبت کے وقت رونے کی آواز سے (یعنی نوحہ خوانی وغیرہ سے)۔“

⑧ «عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ تَمَنِ الْكَلْبِ وَكَسْبِ الزَّمَارَةِ» [شرح السنة (٢٣/٨)، (٢٠٣٨)، بيهقي (١٢٦/٦)، غريب الحديث لأبي عبيد (٣٤١/١)]

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور گلوکارہ کی کمائی سے منع کیا ہے۔“

سیدنا عبد اللہ بن مسعود اور سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر اور قرآنی آیات کی تفسیر میں گزر چکا ہے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کا ایک اور اثر مندرجہ ذیل ہے:

① «عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ إِلَى السُّوقِ فَمَرَّ عَلَيَّ جَارِيَةٌ

صَغِيرَةٌ تَغْنَى فَقَالَ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَوْ تَرَكَ أَحَدًا لَتَرَكَ هَذِهِ» [الأدب المفرد (۷۸۴)، ابن ابی الدنیا (۱۵۶/۱)، بیہقی (۳۲۳/۱۰)، شعب الایمان]

”عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بازار کی طرف نکلا۔ آپ ایک چھوٹی بچی کے پاس سے گزرے، وہ گانا گا رہی تھی، تو آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”یقیناً شیطان اگر کسی کو چھوڑتا تو وہ اس بچی کو چھوڑ دیتا۔“

② ام علقمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«إِنَّ بَنَاتِ أَحْيَى عَائِشَةَ حَتَّىٰ قَبِيلَ لِعَائِشَةَ أَلَا تَدْعُو لَهُنَّ مَنْ يُلْهِيَهُنَّ قَالَتْ بَلَىٰ فَأَرْسَلْتُ إِلَىٰ عَدِيٍّ فَأَتَاهُنَّ فَمَرَّتْ عَائِشَةُ فِي الْبَيْتِ فَرَأَتْهُ يَتَغَنَّىٰ وَيُحَرِّكُ رَأْسَهُ طَرْبًا وَكَانَ ذَا شَعْرٍ كَثِيرٍ فَقَالَتْ أُوْ شَيْطَانٌ أَخْرِجُوهُ أَخْرِجُوهُ» [الأدب المفرد (۲۴۷)، بیہقی (۲۲۳/۱۰)، سلسلہ الأحادیث الصحیحة (۳۵۸/۲)]

”عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کی بیٹیوں کا ختمہ کیا گیا تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا: ”کیا ہم ان بچیوں کے لیے کسی ایسے شخص کو دعوت دیں جو انھیں کھیل میں مشغول کر دے؟“ انھوں نے کہا: ”کیوں نہیں۔“ عدی نامی آدمی کو پیغام دیا گیا، وہ آیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا (اس کے پاس سے) گھر میں گزریں، اسے دیکھا تو وہ گانا گا رہا تھا اور جھوم جھوم کر سر ہل رہا تھا اور وہ گنے بالوں والا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”افسوس! یہ تو شیطان ہے، اس کو نکال دو، اس کو نکال دو۔“

③ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما اس آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [المائدہ: ۹۰]

”اے ایمان والو! شراب، جوا، آستانے اور فالنامے کے تیر پلید ہیں، شیطانی کام سے ہیں، ان سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”هِيَ فِي التَّوْرَةِ إِنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ الْحَقَّ لِيُذْهِبَ بِهِ الْبَاطِلَ وَيُطِيلَ بِهِ اللَّعْبَ وَالزَّفْنَ وَالزَّمَارَاتِ وَالْمَزَاهِرِ وَالْكُنَانَاتِ وَالتَّصَاوِيرِ وَالشَّعْرَ وَالْخَمْرَ لِمَنْ طَعَمَهَا أَقْسَمَ بِيَمِينِهِ وَعَزَّتْهُ لِمَنْ شَرِبَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا لَأَعْطِشْنَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ تَرَكَهَا بَعْدَ مَا حَرَّمْتُهَا سَقَيْتُهُ إِيَّاهَا مِنْ حَظِيرَةِ الْقُدْسِ“ [بیہقی (۲۲۲/۱۰)، تفسیر ابن ابی حاتم (۱۱۹۶/۴)، غریب الحدیث لأبی عبید (۲۷۶/۴)، غریب الحدیث لابن قتیبہ (۳۸۸/۲)]

”یہ بات تورات میں ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے حق اتارا تاکہ اس کے ذریعے باطل ختم کر دے اور اس کے ذریعے کھیل تماشے، ناچ، بانسریاں، سارنگیاں، ڈھولکیاں، تصویریں، برے شعر اور شراب کو باطل قرار دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت و عزت کی قسم کھائی ہے کہ جس نے اس کو میرے حرام کرنے کے بعد پیا، میں اسے قیامت کے روز ضرور پیاسا رکھوں گا اور جس نے اسے میرے حرام کرنے کے بعد ترک کر دیا، میں اس کو جنت سے پلاؤں گا۔“

③ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”إِعْلَمَنَّ أَنَّ سِمَاعَ الْغِنَاءِ يَجْمَعُ شَيْئَيْنِ أَحَدُهُمَا: إِنَّهُ يُلْهِى الْقَلْبَ عَنِ التَّفَكُّرِ فِي عَظَمَةِ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَالْقِيَامَةِ بِحُدُومِهِ وَالثَّانِي إِنَّهُ يُمِيلُهُ إِلَى اللَّذَّاتِ وَالْعَاجِلَةِ الَّتِي تَدْعُو إِلَى اسْتِيفَائِهَا مِنْ جَمِيعِ الشَّهَوَاتِ الْحِسِّيَّةِ وَمُعْظَمُهَا النِّكَاحُ وَكَيَسَ تَمَامُ لَذَّتِهِ إِلَّا فِي الْمُتَحَدِّدَاتِ وَلَا سَبِيلَ إِلَى كَثْرَةِ الْمُتَحَدِّدَاتِ مِنَ الْحِلِّ فَلِذَلِكَ يَحُثُّ عَلَى الزِّنَى“ [المنتقى النفيس (ص ۲۸۹)]

”گانا سننا دو چیزوں کو جمع کرتا ہے۔ ایک تو دل کو اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غور کرنے اور اس کی خدمت میں قائم رہنے سے غافل کر دیتا ہے اور دوسرے دل کو جلد حاصل ہونے والی لذتوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اور انہیں پورا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے، ہر قسم کی حسی شہوتیں پیدا کرتا ہے، جن میں بڑی شہوت نکاح ہے اور نکاح کی پوری لذت نئی عورتوں میں ہے اور نئی عورتوں کی کثرت حلال ذریعے سے حاصل ہونا دشوار ہے لہذا انسان کو زنا پر برا بیخیز کرتا ہے۔“

مندرجہ بالا آیات، صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ بات واضح ہو گئی کہ گانے بجانے کے آلات یعنی طبلے، سارنگیاں، بانسریاں، ڈھولکیاں، باجے گاجے، طنبورے، ڈفلیاں، تونے، ڈگڈیاں اور سائرین شرعاً حرام و ناجائز ہیں، پھر ان پر رقص و سرود کی محافل قائم کر کے گانے گانا جو انسانی شہوت کو بھڑکانے اور انہیں لذات کی طرف مائل کرنے کا بھرپور سامان ہے، ان کی خرید و فروخت قطعاً درست نہیں۔

خودکشی

(سوال) قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائیے کہ خودکشی (جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاک کرنا) کس حالت میں یا کس موقع پر جائز ہے؟

(جواب) خودکشی اسلام میں حرام ہے اور کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس آدمی نے اپنے آپ کو کسی آلے کے ساتھ قتل کیا تو اسے اسی کے ساتھ جہنم کی آگ میں عذاب دیا جائے گا۔“

[صحیح بخاری، کتاب الجنائز: باب ما جاء في قاتل النفس: (۱۳۶۳)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو آدمی گلا گھونٹتا ہے وہ آگ میں بھی اپنے گلے کو گھونٹتا رہے گا اور جو آدمی اپنے آپ کو نیزہ مارتا ہے وہ آگ میں بھی

اسی طرح اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔“ [صحیح بخاری: کتاب الجنائز: باب ما جاء في قاتل النفس (۱۳۶۵)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ خودکشی کرنا یعنی اپنے آپ کو ہلاک کرنا اسلام میں حرام ہے، آدمی جس آلے کے ساتھ اپنے آپ کو زخمی کرے گا یا ہلاک کرے گا قیامت والے دن جہنم کی آگ میں بھی وہ اسی آلے کے ساتھ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ لہذا حالات جیسے بھی ہوں خودکشی سے اجتناب لازم ہے۔

عزت بچانے کی خاطر خودکشی کرنا

(سوال) آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس کسی نے خودکشی کی تو اس کو اسی آلے کے ساتھ قیامت تک عذاب دیا جاتا رہے گا جس کے ساتھ اس نے خودکشی کی۔“ تو ایسی عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا جنہوں نے اپنی عزت بچاتے ہوئے اپنی جانیں ضائع کر دیں؟ مثلاً ہم سنتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی، کیا کسی بھی صورت میں خودکشی جائز نہیں؟

(جواب) اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرایا اور اپنی جان کو قتل کر ڈالا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں گرتا رہے گا۔ جس نے زہر کا گھونٹ بھر کر اپنے آپ کو مار ڈالا، اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں اس کے گھونٹ بھرتا رہے گا اور جس نے کسی تیز دھار آلے سے اپنے آپ کو قتل کیا اس کا آلہ اس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں اپنے پیٹ کو زخمی کرتا رہے گا۔“ [صحیح بخاری، کتاب الطب: باب شرب السم والدواء بہ (۰۷۷۸)]

جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”ایک آدمی کو زخم لگا، اس نے (زخم کی تاب نہ لا کر) اپنے آپ کو مار ڈالا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”میرے بندے نے جان نکالنے میں مجھ پر جلدی کی میں اس پر جنت کو حرام کرتا ہوں۔“ [صحیح بخاری، کتاب الحناظر: باب ماجاء فی قاتل النفس (۱۳۶۴)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اپنا گلا خود گھونٹتا ہے وہ جہنم میں بھی اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور جو برچھے یا تیر وغیرہ سے اپنے آپ کو مارتا ہے وہ جہنم میں بھی اسی طرح اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔“ [صحیح بخاری، کتاب الحناظر: باب ما جاء فی قاتل النفس (۱۳۶۵)]

ان احادیث صحیحہ سے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ خودکشی حرام ہے، خودکشی کرنے والے پر اللہ نے جنت حرام کی ہے اور جس طرح اپنے آپ کو مارے گا اسی طرح جہنم میں اسے سزا دی جائے گی۔

صورت مسئلہ میں بظاہر تو یہ بات بڑی اچھی لگتی ہے کہ اپنی عزت بچانے کی غرض سے جان دی گئی ہے لیکن مجھے اس طرح کی خودکشی کے بارے کوئی حدیث نہیں ملی۔ ہماری جماعت کے معروف و مشہور مفتی اور شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی رضی اللہ عنہ کا الاعتصام ۷ مئی ۲۰۰۲ء میں ایک فتویٰ طبع ہوا ہے، اس کی عبارت درج ذیل ہے:

”اس قسم کے حالات کے باوجود خودکشی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ خودکشی بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح کی جبری صورت میں عورت پر حد قائم نہیں ہوتی، وہ بری الذمہ ہے، چنانچہ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے کہ

عورت کو جب زنا پر مجبور کیا جائے تو اس پر کوئی حد لگاؤ نہیں ہوگی۔“

حضرت حافظ صاحب نے جس باب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح البخاری میں کتاب الاکراه کا چھٹا باب ہے۔ اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ لیث بن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں مجھے نافع نے خبر دی ہے، انھیں صفیہ بنت ابی عبید نے بتایا: ”حکومت کے غلاموں میں سے ایک غلام نے نرس کے حصے کی ایک باندی سے زبردستی زنا کر کے اس کی بکارت زائل کر دی تو عمر رحمہ اللہ نے اس غلام پر حد جاری کی اور اسے شہر بدر کر دیا اور اس باندی پر حد نہیں لگائی کیونکہ غلام نے اس سے زبردستی کی تھی۔“ اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی سے اجتناب کرنا چاہیے اور اگر کسی عورت سے جبر و اکراہ کی صورت میں بدکاری کی گئی تو وہ عورت اللہ کے ہاں بری الذمہ ہے، اس پر کوئی حد و سزا نہیں البتہ مجرموں کو شرعی حد لگائی جائے گی۔ اگر کفار و مشرکین مسلمان خواتین کی عصمت دری کریں اور ان کی عفت و پاکدامنی کو داغ دار کریں تو دوسرے مسلمان بھائیوں پر ان عورتوں کی عفت و عصمت کا بدلا لینا واجب ہے۔ اگر مسلمان اپنی اسلامی بہنوں کا بدلا نہیں لیتے تو اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ جہاد جو دین اسلام کی چوٹی ہے اس کے مقاصد میں سے یہ امر بھی ہے جس سے آج امت مسلمہ چشم پوشی کر رہی ہے، اگر جہاد فی سبیل اللہ کو صحیح معنوں میں جاری کر دیا جائے تو مسلمان خواتین کو یہ نوبت پیش نہ آئے۔ افسوس صد افسوس کہ آج کتنی تعداد میں مسلم حکمران، ممالک اور عوام موجود ہیں لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے فریضے کو سمجھنے سے عاری ہیں اور اپنی دنیاوی خواہشات اور لذات کے پیچھے لگ کر اس فریضے سے غفلت برت رہے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں جہاد کو کھڑا کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے اور مسلم خواتین کی عفت و عصمت کو محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

رسومات میں شرکت کرنا

(سوال) میں اپنے خاندان میں اکیلا اہل حدیث ہوں، باقی سب شرک و بدعت میں مبتلا ہیں تو میں ان کے ساتھ اپنے معاملات کیسے رکھوں؟ ان کی رسومات تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ اور ان کی شادی بیاہ میں شرکت کا کیا حکم ہے؟

(جواب) آپ اپنے عزیز و اقارب سے حسن سلوک سے پیش آئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے مشرکین رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا حکم فرمایا تھا جیسا کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”میری ماں جو مشرک تھیں، اس وقت آئیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میری ماں تشریف لائی ہیں اور وہ رغبت رکھنے والی ہیں، کیا میں اس سے صلہ رحمی کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔“ [بخاری، کتاب الہبۃ و فضلہا: باب الہدیۃ

للمشرکین (۲۶۲۰)، مسند احمد (۳۴۴/۶)]

اور قرآن حکیم میں بھی ارشاد خداوندی ہے:

(وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا) [لقمان: ۱۵]

”اپنے والدین کے ساتھ دنیا میں اچھے طریقے سے پیش آئیں۔“

لہذا آپ اپنے والدین اور عزیز واقارب سے صلہ رحمی کریں، اچھے طریقے سے پیش آئیں، ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کریں اور انہیں حکمت کے ساتھ عقیدہ توحید اور کتاب سنت کی دعوت دیتے رہیں، اگر وہ کوئی سخت کلمات بھی کہہ دیں تو برداشت کریں، اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیر ہے۔ البتہ ان کی رسومات اور خلاف شرع امور میں شرکت سے اجتناب کریں، خوشی و غمی کے موقع پر ضرور جائیں لیکن ایسے مواقع پر ڈھول، گانا بجانا، بے پردگی اور شادی کے غیر شرعی رسومات ہوں تو ان امور میں ان سے علیحدہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔ (آمین!)

ہوٹلوں میں منعقد تقریبات میں شرکت

(سوال) کیا شادی بیاہ کی تقریبات ہوٹلوں اور شادی گھروں میں منعقد کی جاسکتی ہیں؟ کتاب و سنت کی رو سے صحیح راہ نمائی فرمائیں۔
(جواب) عصر حاضر میں شادی بیاہ کی اکثر تقریبات ہوٹلوں اور شادی گھروں میں منعقد کی جاتی ہیں اور ان تقریبات میں بے شمار قباحتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ:-

① اکثر مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ مرد و زن کا اختلاط بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آزادانہ طریقے سے خواتین مردوں میں گھوم رہی ہوتی ہیں اور اسلامی حجاب کو ترک کر کے گلوں میں دوپٹے ڈال کر پھرتی ہیں، بلکہ کئی خواتین ایسے غیر شرعی لباس میں ملیں ہوتی ہیں کہ شرم و حیا بالائے طاق ہوتی ہے۔

② ایسی تقریبات فضول خرچی اور غیر ضروری اخراجات کا باعث بنتی ہیں جبکہ فضول خرچی شرعی طور پر جائز نہیں۔ قرآن حکیم میں فضول خرچ افراد کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔

③ اکثر تقریبات میں ویڈیو بنائی جاتی ہے جس میں مرد غیر محرم عورت کی تصاویر اتارتے ہیں جو شرعاً حرام ہے۔ جہاں ایسی اخلاق باختہ اور حیا سوز اشیاء موجود ہوں تو وہاں تقریبات منعقد کرنے سے گریز کیا جائے اور اگر مذکورہ قباحتیں موجود نہ ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ آج کل اکثر گھروں میں جگہ اتنی کم ہوتی ہے کہ دعوت و لیمہ پر بلائے گئے افراد کے لیے جگہ کم پڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے لوگ ہوٹل وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ بہر کیف بوقت ضرورت ایسی اشیاء سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھانا بالکل صحیح اور درست ہے۔

ویڈیو اور موسیقی والی شادیوں میں شرکت

(سوال) ایسی شادیاں جہاں موسیقی اور ویڈیو بنانے کا اہتمام ہو اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟
(جواب) ایسی شادیوں میں شرکت کرنا درست نہیں، اس لیے کہ موسیقی سننا اور بجانا شرعاً ناجائز و حرام ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”ان میں سے جس کو تو اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے۔“ [بنی اسرائیل: ۶۳]

یعنی شیطان کو جب ڈھیل دی گی تو اسے یہ بھی چھٹی مل گئی کہ وہ انسانوں کو اپنی آواز کے ذریعے اگر پھسلا سکتا ہے تو اپنا کام کر کے دیکھے۔ اس آواز کے بارے کئی مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد گانا بجانا، مزا میر اور ہر وہ آواز ہے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح سورہ لقمان میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق آیت (۶) میں ”أَلْهَوَ الْهَدْيُ“ سے مراد گانا بجانا ہے۔ لہذا گانا بجانا اور آلات موسیقی شرعی طور پر درست نہیں۔ تصویر اتارنا اور اتروانا بھی شرعاً حرام ہے۔ نبی ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ مصورین کو قیامت والے دن سب سے سخت عذاب ہوگا۔ لہذا تصویر بنوانا بھی شرعاً درست نہیں اور وہ مجالس جہاں یہ خلاف شرع کام ہو رہے ہوں ان میں شرکت کرنا صحیح نہیں۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور اللہ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگ جائیں۔ ورنہ تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ منافقین اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔“ [نساء: ۱۴۰]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ایسی مجالس جہاں احکام شرع کی خلاف ورزی ہو رہی ہو ان میں شرکت کرنا منع ہے اور شرکت کرنے والا بھی انہیں جیسا ہوگا۔ آپ کی ایک حدیث میں ہے:

”جو آدمی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسے دسترخوان پر ہرگز نہ بیٹھے جہاں شراب پیش کی جا رہی ہو۔“

[مسند احمد (۲۰۱)۔ ترمذی، کتاب الأدب: باب ما جاء فی دخول الحمام: (۲۸۰۱)]

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس دسترخوان پر شریعت کے خلاف کوئی چیز ہو وہاں شرکت کرنا درست نہیں۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”ہم ایسے ویسے میں شریک نہیں ہوتے جس میں طبلے سارنگیاں ہوں۔“ [آداب الزفاف لشیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۶)]

لہذا طبلے سارنگیوں، گانے بجانے اور ویڈیو وغیرہ منکرات پر مشتمل مجلس میں حاضر ہونے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ دعوت قبول کرنا مستحب ہے تو دوسری طرف حصول منکر اس سے مانع ہے۔ مانع اور قصصی میں جب تعارض ہو تو حکم مانع کا ہوگا، لہذا ایسی شادی جس میں مندرجہ ذیل خرافات ہوں اس میں شرکت کرنا ناجائز و ممنوع ہے، البتہ اگر کوئی شخص تبلیغ کی نیت سے وہاں جائے تو کوئی حرج نہیں، اگر تبلیغ نہیں کر سکتا تو بالکل نہ جائے۔

داماد سے پردہ

(سوال) داماد سے پردہ کا کیا حکم ہے؟

(جواب) داماد محارم میں سے ہے یعنی ان مردوں میں سے ہے جن سے عورت کی شادی شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ محرمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔“ [النساء: ۲۳]

یعنی یہ بھی حرام ہیں اور یہ اہل علم کا اجماعی مسئلہ ہے۔ مذکورہ آیت کی رو سے بیوی کی ماں، اس کی دادی اور نانی اس کے خاوند کے لیے حرام ہیں۔ لہذا ساس کے لیے داماد سے پردہ نہیں ہے، وہ اپنے داماد کے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکتی ہے اس کے ساتھ بوقت ضرورت کہیں جانا پڑ جائے تو جا سکتی ہے۔ اگر ایسا کرتی ہے تو الفت و محبت کی پائیداری کے لیے یہ زیادہ بہتر اور زیادہ افضل ہے۔

خاوند کی وفات کے بعد ملازمت کرنا

(سوال) جب عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ ملازمہ ہو، اس کا کوئی کفیل نہ ہو تو اس مجبوری کے پیش نظر کیا وہ اپنی ملازمت پر جا سکتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

(جواب) جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو اسے عدت اپنے اسی گھر میں گزارنی چاہیے جس میں وہ شوہر کی رفاقت کے وقت قیام پذیر تھی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن فریجہ بنت مالک سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور بنی خدرہ میں اپنے اہل کے پاس جانے کی اجازت چاہی۔ کیونکہ ان کے خاوند اپنے مفروز غلاموں کے پیچھے نکلے اور مقام قدم (مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر) کے پاس جب وہ ان سے ملے تو انہوں نے ان کو قتل کر دیا، وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے گزارش کی کہ مجھے اپنے اہل کے پاس جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں اس لیے کہ شوہر نے مجھے ایسے گھر میں نہیں چھوڑا جس کے وہ مالک رہے ہوں اور نہ نفقہ چھوڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے تو ہاں کر دی اور میں واپس ہو گئی یہاں تک کہ جب میں حجرہ یا مسجد میں پہنچی تو آپ نے مجھے بلایا اور کہا: ”تو نے کیسے کہا؟“ میں نے آپ ﷺ کو پورا واقعہ دوبارہ سنایا اور اپنے شوہر کا حال ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے گھر ہی میں رہو یہاں تک کہ تمہاری عدت ختم ہو جائے۔“ وہ کہتی ہیں کہ پھر میں نے اس گھر میں چار ماہ دس دن عدت گزار لی اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انہوں نے مجھے بلوا کر اس بارے میں دریافت کیا، میں نے انہیں بتایا تو اسی کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا اور اس کی پیروی کی۔ [ترمذی، کتاب الطلاق واللعان: باب ما جاء أين تعدت المتوفى عنها زوجها (۱۲۰۴)]

امام ترمذی فرماتے ہیں: ”یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کے اکثر اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے، انہوں نے عدت گزارنے والی عورت کے لیے جائز نہیں رکھا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے عدت پوری ہونے سے پہلے منتقل ہو۔

امام سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ رضم کا یہی موقف ہے اور بعض اہل علم صحابہ نے کہا: ”عورت اگر اپنے خاوند کے گھر عدت نہ گزارنا چاہے تو جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔“ امام ترمذی فرماتے ہیں: ”پہلی بات صحیح ترین ہے یعنی عورت اسی گھر میں عدت گزارے جہاں وہ اپنے شوہر کی رفاقت میں قیام پذیر تھی۔“ [ترمذی مع

موطا میں امام محمد نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

البتہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ مجبوری کے تحت کام کاج کے لیے دن کے وقت گھر سے نکل سکتی ہے اور رات اسی گھر میں آکر بسر کرے گی۔ انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ کو طلاق دے دی گئی تو انھوں نے (اپنی عدت کے دوران) اپنے باغ کی کھجوریں اتارنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے انھیں باہر نکلنے سے منع کیا اور ڈانٹا تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں، آپ نے فرمایا: ”ہاں! جاؤ اپنے درخت کی کھجوریں توڑو ممکن ہے کہ تم اس میں سے کچھ صدقہ کر دیا کرو اور نیکی کا کام کرو۔“ [صحیح مسلم، کتاب الطلاق: باب جواز خروج المعتدة البائن (۱۴۸۳)، ابوداؤد (۲۲۹۷)، مسند احمد، (۳۲۱/۳)، ابن ماجہ (۲۰۳۴)]

ان کا کہنا ہے کہ آپ نے اس حدیث میں مطلقہ کو عدت کے دوران بوقت ضرورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے، لہذا وفات کی عدت والی عورت کو اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ اس کی تائید مجاہد تابعی کے اس اثر سے بھی ہوتی ہے کہ احد کے دن بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔ ان کی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا:

”اے اللہ کے رسول! ہم رات کے وقت وحشت محسوس کرتی ہیں، اس لیے چاہتی ہیں کہ کسی دوسری عورت کے ہاں رات بسر کر لیں اور جب ہم صبح کریں تو اپنے گھر کو جلدی واپس آجائیں؟“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم جس کسی کے ہاں چاہو بات چیت کرو اور جب سونا چاہو تو ہر عورت اپنے اپنے گھر چلی جائے۔“ [بیہقی: (۴۳۶/۵)]

لہذا معلوم ہوا کہ عورت بوقت مجبوری کام کاج کی غرض سے گھر سے نکل سکتی ہے لیکن رات اپنے گھر ہی میں بسر کرے گی۔

کسی کی وفات پر خاموشی اختیار کرنا

(سوال) کسی کے مرنے پر ایک منٹ یا اس سے زیادہ عرصہ خاموش رہنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ سوگ کا صحیح طریقہ ہے؟

(جواب) لوگوں کا مذکورہ طریقہ کسی دلیل سے ثابت نہیں، البتہ اگر کوئی آدمی کسی کی موت کا سن کر اچانک سکتے میں آجائے تو وہ الگ مسئلہ ہے، فطرتی طور پر ایسا ہو جاتا ہے، جب کسی انتہائی عزیز کی موت کی خبر ملتی ہے تو یکدم سکتہ طاری ہو جاتا ہے، انسان منہ سے کچھ بول نہیں سکتا لیکن کسی کی وفات کی خبر سن کر درخواست کرنا اور ایک یا دو تین منٹ کی خاموشی کے لیے کہنا یہ کوئی سوگ کا طریقہ نہیں ہے۔

کتا کھلوانا

(سوال) کیا کتا رکھنا جائز ہے نیز اپنے آپ کو کتا کھلوانا کیا ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے آگاہ فرمائیں۔

(جواب) اسلام کی نظر میں یہ ایک ناپسندیدہ جانور ہے، اسے گھر میں رکھنے سے رحمت کے فرشتے گھر میں داخل نہیں ہوتے اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① « عَنْ أَبِي طَلْحَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ

بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيرُ » [بخاری، کتاب بدء الخلق: باب اذا قال أحدكم آمين والملائكة في السماء فوافقت إحداهما الأخرى (۳۲۲۵)]

”حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتاب یا تصاویر ہوں۔“

ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وعدے کے باوجود نہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان ہوئے پھر بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما جو ابھی کم عمر تھے، وہ گھر میں کتے کا بچہ لے آئے تھے۔

② سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« طَهُورٌ إِنَاءٌ أَحَدِكُمْ إِذَا لَغَّ فِيهِ الْكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ أَوْ لَاهُنَّ بِالْتَّرَابِ » [مسلم کتاب الطہارۃ: باب حکم ولوغ الکلب: (۲۷۹)]

”جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھوئے، جن میں سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ ہو۔“

③ خالص سیاہ رنگ کا کتا اگر نمازی کے آگے سے گزر جائے اور اس کے سامنے سترہ نہ ہو تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

« الْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ » [مسلم، کتاب الصلاة: باب قدر ما یستر المصلی (۵۱۰)]

”کالا کتا شیطان ہے۔“

④ خالص سیاہ رنگ کے کتے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

« عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَعْقِلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ لَا أَنَّ الْكِلَابَ أُمَّةٌ مِنَ الْأُمَمِ لَأَمَرْتُ بِقَتْلِهَا كُلِّهَا فَاقْتُلُوا مِنْهَا الْأَسْوَدَ الْبَهِيمَ » [ابو داؤد، کتاب الصيد: باب اتخاذ الكلب للصيد وغيره (۲۸۴۵)]

”حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے امتوں میں سے ایک امت ہیں تو میں تمام کتے مار ڈالنے کا حکم دے دیتا، لیکن اب تم ان میں سے خالص سیاہ رنگ کے کتے کو مار دو۔“

⑤ اسی طرح دو نطفوں والے سیاہ کتے کو بھی مارنے کا حکم ہے:

« عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ أَمَرْنَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتَّىٰ إِنَّ الْمَرْأَةَ تَقْدُمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ ثُمَّ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا وَقَالَ

عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَيْمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ» [مسلم، کتاب المسافاة: باب الأمر بقتل الكلاب (۱۰۷۲)]

”سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کتے مار ڈالنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ بادیہ سے کوئی عورت اپنا کتا لے کر آتی تو ہم اسے مار ڈالتے، پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں قتل کرنے سے منع فرما دیا اور فرمایا: ”تم دو نقطوں والے کالے سیاہ کتے کو مارو کیونکہ وہ شیطان ہے۔“

③ اللہ تعالیٰ کی آیات کا علم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہشات کی وجہ سے ان سے نکل جانے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی ہے:

﴿وَاتَّبِعْ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ [الأعراف: ۱۷۶]

بدترین انسان یعنی برے عالم کی مثال کتے کے ساتھ دینے سے اس کی ذلت واضح ہے۔

④ اپنے دیے ہوئے عطیے کو واپس لینے والے کی مثال کتے کے ساتھ دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«لَيْسَ لَنَا مِثْلُ السُّوءِ الَّذِي يُعْوِذُ فِي هَيْبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِي قَيْئِهِ» [بخاری، کتاب الهبة و فضلها:

باب لا يحل لأحد ان يرجع في هبته و صدقته (۲۶۲۲)]

”بری مثال ہمارے لیے نہیں، جو شخص اپنا ہبہ واپس لیتا ہے وہ کتے کی طرح ہے جو اپنی تہ دو بارہ چاٹ لیتا ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو کتا قرار دیتے ہیں خواہ وہ شیخ جیلانی کے کتے بنیں یا مدینہ کے کتے (مگ مدینہ) یا رسول اللہ ﷺ کے کتے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس جانور کے ساتھ نفرت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس چیز کے ساتھ خود کو تشبیہ دینا کیسے درست ہو سکتا ہے جس سے نبی کریم ﷺ سخت نفرت رکھتے ہوں؟

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بڑے بہترین انداز میں فرمائی اور اسے اپنی تمام مخلوقات پر شرف عطا کیا، عقل و شعور کے ذریعے جانوروں سے ممتاز کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ

كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ [الإسراء: ۷۰]

”یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی اور خشکی و تری میں انھیں سواری دی اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق

عطا کیا اور انھیں بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری عنایت کی۔“

جس خالق نے انسان کو سب سے بہترین تخلیق کیا اور اسے اپنی دیگر مخلوقات پر برتری و منزلت اور اعلیٰ مقام عطا کیا، اگر انسان اس کا صحیح شکر گزار بندہ بن کر رہتا ہے تو وہ کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس انسان کی مثال کتے سے دی جائے۔ کیونکہ کتا نجس و پلید ہے۔ لہذا انسان کو اس نجس اور پلید جانور کی مثال نہیں بننا چاہیے اور نہ اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہنا چاہیے۔ یہ تمام احکامات آپ ﷺ کے مدینہ سمیت ہر جگہ کے کتوں سے متعلق ہیں۔

جو لوگ اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نسبت انتہائی تذلل و عاجزی پر مبنی ہے، حالانکہ یہ شیطانی فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر یہ نسبت تذلل و عاجزی و انکسار والی ہوتی تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)، تابعین عظام اور تبع تابعین (رضی اللہ عنہم) اس سے محروم نہ ہوتے۔ خیر القرون کے لوگوں میں اس طرح کی نسبت کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ کسی نے اپنے آپ کو مدینے کا کتا کہا ہو۔ یہ نسبت موجودہ دور کے صوفی اور قبر پرست لوگوں ہی میں پائی جاتی ہے اور جو اپنے آپ کو سگ مدینہ کہتے ہیں ان کا دماغ اس قدر مفلوج و ماؤف ہو چکا ہے کہ وہ کتوں کو بھی ولی اور صاحب کرامت بزرگ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ جیسا کہ مولوی اشرف علی تھانوی اپنی کتاب ”امداد المشتاق (ص: ۱۵۸)“ میں اور حاجی امداد اللہ اپنی کتاب ”شام امداد یہ (۷۶۲)“ میں لکھتے ہیں:

”جنید بغدادی بیٹھے تھے، ایک کتا سامنے سے گزرا، آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا تو سب کتوں نے اس کے گرد بیٹھ کر مراقبہ کیا۔“

اسی طرح مولوی منظور احمد شاہ اپنی کتاب مدینۃ الرسول (ص: ۴۰۸) میں ”مدینۃ الرسول کے سگان محترم اور چند یادیں“ کے عنوان کے تحت جماعت علی شاہ کا واقعہ لکھتا ہے:

”آپ اپنے احباب میں مدینۃ الرسول کی کسی گلی میں کھڑے تھے کہ سامنے سے ایک زخمی کتا چلتا ہوا گزرا۔ اس کتے کو کسی نے پتھر مارا تھا۔ سید صاحب اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے۔ اس بے خودی میں سگ طیبہ کو کلاوے میں لے لیا۔ اپنی دستار سے اس کا خون صاف کیا، پھر ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا: ”اے سگ مدینہ! خدا را بارگاہ رسالت میں میری شکایت نہ کر دینا۔“ پھر دیر تک سگ طیبہ کو کلاوے میں لے کر روتے رہے۔“

اسی طرح صفحہ (۴۰۹) پر لکھتا ہے:

”۱۹۶۸ء کی بات ہے، پیر سید حیدر علی شاہ نے مجھے مدینۃ الرسول میں یہ واقعہ سنایا کہ ایک حاضری پر سیدنا نے فرمایا: ”آج مدینۃ الرسول کے درویشوں کی دعوت ہے۔“ دیکھیں پکوا دی گئیں، بازار سے نئے برتن منگوا لیے گئے۔ عرض کی گئی: ”حضور! درویشوں کی آمد کا سلسلہ کب شروع ہوگا؟“ فرمایا: ”یہ درویش آئیں گے نہیں، تمہیں ان کے حضور جا کر نذرانہ خود پیش کرنا ہوگا۔“ فرمایا: ”یہ روٹیاں، یہ گوشت مدینہ منورہ کے سگان محترم کو پیش کیا جائے۔“ چنانچہ تلاش کر کے حکم کی تعمیل کی گئی۔“

اسی طرح صفحہ (۴۰۹، ۴۱۰) پر ”سگ طیبہ کی نوازش“ کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:

”ایک حاضری میں مدینہ منورہ سے واپسی کی ساری رات سگان مدینہ کی زیارت میں صرف کر دی۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان کی قدم بوسی کر کے مدینہ سے رخصت ہوں۔ یہ بھی شوق تھا کہ سگ طیبہ کی آواز بھی ریکارڈ کر لوں۔ ٹیپ لے کر گھومتا رہا۔ کسی سگ نے مجھے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ جوں ہی کسی سگ طیبہ کے قریب گیا اس نے مجھ سے نفرت کی اور دور چلا گیا۔ سحری کے قریب ایک سگ طیبہ کو سویا ہوا پایا، دور بیٹھ گیا کہ اس کی بیداری پر سلام عرض کروں گا۔ ایک کار کی آواز سے وہ بیدار ہو گیا۔ میں نے قریب جانے کی کوشش کی تو وہ نفرت سے بھاگ گیا۔ میں نے وہیں کھڑے

منت سماجت کی کہ خدا کے لیے قدم بوسی کا موقع دے دو، صبح مدینہ چھوٹ رہا ہے پھر قسمت کی بات ہے۔

ہات بنتی ہے میری تیرا بگڑتا ہے کیا

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میری اس عاجزانہ درخواست پر وہ رک گیا۔ میں قریب ہوا تو قدم بوسی کی، اس کی آواز ٹیپ کی اور صبح کی اذان ہوتے ہی میں وہاں سے چلا تو کم و بیش پچاس قدم سگ طیبہ میرے ساتھ آیا۔ سگ طیبہ کی اس نوازش کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ مجھے قریب جانے کا موقع دیا اور پچاس قدم میرے ساتھ چل کر مجھے شرف بخشا۔“

قارئین کرام! مذکورہ بالا واقعات ہا حوالہ آپ کے سامنے ذکر کیے ہیں۔ ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کی توحید چھوڑ کر شرک کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے صحیح منہج کو چھوڑ کر بدعات اور رسوم و رواج سے خود کو وابستہ کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے اپنی رحمت اٹھا لیتے ہیں، پھر وہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے حتیٰ کہ کتوں کو کلاوے میں لے کر روتا پھرتا ہے۔ کبھی وہ کتوں کو بوسہ دیتا ہے اور کبھی گلیوں میں کتوں کی محبت سے گھومتا ہوا راتیں گزارتا ہے اور کتے کی قدم بوسی اور اس کی آواز ریکارڈ کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی کتوں سے اپنے عشق کا اظہار کرتے ہوئے انھیں درویش بنا دیتا ہے اور کتوں کے دربار میں نذرانہ لے کر پیش ہوتا ہے۔ یہ گندے کام اس آدمی کی قسمت میں ہوتے ہیں جو رحمت ایزدی سے دھکار دیا جاتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو انسانیت سے خارج کر کے کتا کہنے لگتا ہے۔ کتا خواہ بریلی شریف کا ہو، یا دیوبند کا، مدینہ کا ہو یا مکہ کا، غرض کسی جگہ کا بھی کیوں نہ ہو، اس کے متعلق شریعت مطہرہ کا یہی حکم ہے کہ وہ جس برتن میں منہ ڈال جائے وہ برتن پلید ہو جاتا ہے جہاں موجود ہو وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا۔ وہ کتے مدینہ منورہ ہی کے تھے جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ احکامات جاری فرمائے تھے کہ ”کالا کتا شیطان ہے“ اور پھر آپ ﷺ نے ایسے کتوں کو قتل کرنے کا بھی حکم دیا۔ لہذا کسی انسان کو یہ لائق نہیں کہ ان تمام احکامات کو جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کتا کہے۔ اپنے آپ کو کتا کہنا عقل و نقل کے بھی خلاف ہے اور ناجائز و غیر مشروع بھی ہے۔

گھروں میں کتے رکھنا بھی جائز نہیں البتہ تین کاموں کے لیے نبی ﷺ نے کتا رکھنے کی اجازت دی ہے، مویشیوں کی حفاظت کے لیے، شکار کے لیے یا کھیتی کی حفاظت کے لیے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی شخص کتا رکھے گا تو روزانہ اس کے اجر سے ایک قیراط کی کمی ہو جائے گی۔ قیراط اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی مقرر پیمانہ ہے۔ جنازے میں شامل ہونے کے ثواب والی حدیث میں مذکور قیراط کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے۔“ مسلم میں ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا

كَلَبَ مَاشِيَةً أَوْ صَيْدًا أَوْ زُرْعًا انْتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطًا» [مسلم، کتاب المساقاة: باب

الأمر بقتل الكلاب و بيان نسخه و بيان تحريم اقتنائها إلا لصيد أو زرع أو ماشية و نحو ذلك (۱۰۷۵)]

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مویشیوں کے لیے، شکار کے لیے یا کھیتی کے لیے

(رکھے گئے) کتے کے علاوہ کسی نے کوئی کتا رکھا تو اس کے اجر سے روزانہ ایک قیراط کم ہو جائے گا۔“
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صرف گھر کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا جائز نہیں۔ بعض لوگ قیاس کے ذریعے اسے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس صورت میں تین قسم کے کتوں کو مستثنیٰ کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔

چوسر کھیلنا کیسا ہے؟

(سوال) کیا چوسر کھیلنا شرعاً جائز و درست ہے؟

(جواب) چوسر کھیلنا حرام ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس آدمی نے چوسر کا کھیل کھیلا گویا اس نے اپنے ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون سے رنگ لیے۔“ [مسلم، کتاب

الشعر: باب تحریم اللعاب بالنرد شیر (۲۲۶۰)]

اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس شخص نے چوسر کا کھیل کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔“ [ابوداؤد، کتاب الأدب:

باب النهی عن اللعاب بالنرد (۴۹۳۸)]

یہ دونوں احادیث ہر طرح کا چوسر کھیلنے والے پر منطبق ہوتی ہیں، خواہ اس میں جوئے کا عنصر شامل ہو یا نہ ہو لہذا ہمارے ہاں شہروں اور کئی محلوں کے اندر جو چوسر وغیرہ کے کھیل کھیلے جاتے ہیں یہ شیطانی کام ہیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی پر مشتمل ہونے کی بنا پر حرام ہیں۔

عورت کے لیے چہرے کے بال اکھیڑنا

(سوال) کیا عورت خوبصورتی کے لیے چہرے کے بال اکھاڑ سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔

(جواب) کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اکھیڑے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خلق کو بدلنا ہے اور شیطانی عمل

ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

«عَنْ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لَعَنَ اللَّهُ الْوَأَشِمَاتِ وَالْمُسْتَوَشِمَاتِ وَالْمُتَمَصِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّحَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغْيِرَاتِ خَلَقَ اللَّهُ فَبَلَغَ ذَلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِي آسَدٍ يُقَالُ لَهَا أُمُّ يَعْقُوبَ فَجَاءَتْ فَقَالَتْ إِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي أَنَّكَ لَعَنْتِ كَيْتَ وَكَيْتَ ؟ فَقَالَ وَمَا لِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ ؟ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ مَا وَجَدْتُ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَالَ لَيْنُ قَرَأْتِيهِ لَوْ جَدْتِيهِ أَمَا قَرَأْتِ: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ قَالَتْ بَلَى قَالَ فَإِنَّهُ قَدْ نَهَى عَنْهُ قَالَتْ فَإِنِّي أَرَى أَهْلَكَ

يَفْعَلُونَهُ قَالَ فَأَذْهَبِي فَأَنْظِرِي فَذَهَبَتْ فَظَنَرَتْ فَلَمْ تَرَ مِنْ حَاجَتِهَا شَيْعًا فَقَالَ لَوْ كَانَتْ كَذَلِكَ مَا جَامَعْتُهَا [بخاری، کتاب التفسیر: باب ﴿وَمَا آتَاكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ (۴۸۸۶)، (۵۹۳۱)]

”سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ نے گودنے والی اور گدوانے والی اور چہرے کے بال اکھیڑنے والی، خوبصورتی کے لیے دانتوں پر سونہ کرنے والی اور اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔“ بنو اسد کی ام یعقوب نامی عورت کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور اس نے کہا: ”مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے اس طرح لعنت کی ہے؟“ تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور وہ کتاب اللہ میں بھی موجود ہو؟“ اس نے کہا: ”میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر اس میں یہ چیز مجھے نہیں ملی۔“ تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ بات مل جاتی۔ کیا تو نے یہ نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں، اس سے باز آ جاؤ۔“ تو اس نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے روکا ہے۔“ تو اس عورت نے کہا: ”تمہاری بیوی میں بھی یہ بات موجود ہے۔“ انھوں نے کہا: ”جاؤ اور دیکھو۔“ وہ گئی اور اسے ان کی بیوی میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی پھر واپس آئی تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر اس میں ایسا عمل موجود ہوتا تو میں اس کے ساتھ جماعت نہ کرتا۔“

مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے چہرے کے بال اکھیڑے یا دیگر فیشن وغیرہ کیلئے دانت رگڑ کر خوبصورت کرے یا چہرے اور باقی جسم پر نیل وغیرہ بھر کر پھول بنائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے فعل پر لعنت کی ہے اور جس فعل پر لعنت ہو وہ حرام ہوتا ہے۔ لہذا ایسا عمل اپنانا بالکل ناجائز و حرام ہے۔

بیوی کے ساتھ جھوٹ بولنا

سوال کیا کسی صحیح حدیث سے پتا چلتا ہے کہ مرد اپنی اہلیہ کے ساتھ جھوٹ بول سکتا ہے؟ بسا اوقات گھر میں جھگڑا ہو جاتا ہے، اسے سلجھانے کے لیے آدمی کوئی جھوٹی بات کہہ ڈالتا ہے، کیا اس پر گناہ تو نہیں ہوگا؟

جواب ام کلثوم بنت عقبہ مہاجرہ صحابیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: آپ نے فرمایا:

«لَيْسَ الْكُذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْمِي خَيْرًا أَوْ يَقُولُ خَيْرًا؟ وَقَالَتْ وَلَمْ أَسْمَعُهُ يُرَخِّصُ فِي شَيْءٍ مِنَ الْكُذِبِ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ إِلَّا فِي ثَلَاثِ الْحَرْبِ وَالْإِصْلَاحِ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيثُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَحَدِيثُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا»

[السنن الكبرى للنسائي (۸/۳۶، ۸۵۸۸)، واللفظ له صحيح البخاری، کتاب الصلح: باب ليس الكاذب

الذی يصلح بين الناس (۲۶۹۲) الادب المفرد (۳۸۵) صحيح مسلم (۲۶۰۵) سنن أبي (۴۹۲۱، ۴۹۲۰) سنن الترمذی (۱۹۳۸)

”وہ آدمی کذاب نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کراتا ہے، وہ خیر کی بات بڑھاتا یا کہتا ہے: ام کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”میں نے کسی چیز کے بارے میں جھوٹ کی رخصت دیتے ہوئے آپ کو نہیں سنا جو لوگ کہتے ہیں سوائے تین مواقع پر: جنگ میں، لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں، آدمی کا اپنی بیوی سے اور بیوی کا اپنے شوہر سے بات کرنا۔“ اسلام میں رشتہ ازدواج کی بڑی اہمیت ہے اور حتی الوسع اسے برقرار رکھنا چاہیے اور خوشگوار زندگی گزارنے کی کاوش و کوشش کرنی چاہیے، بسا اوقات شیطان اس مقدس رشتے میں دراڑ ڈال دیتا ہے اور شوہر و بیوی کو جدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ پاک نے شریعت میں اس رشتہ کو بحال رکھنے کے لیے مرد و زن ہر دو کو رخصت دی کہ وہ اپنے زندگی کے ہم سفر کو راضی رکھے خواہ جھوٹ ہی بولنا پڑ جائے، صلح و صفائی اور امن و آشتی کو رواج دیں۔ اس موقع پر جھوٹ کو مباح تو قرار دے دیا لیکن اس بابرکت رشتے کا انقطاع گوارا نہیں کیا۔

قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو زمین پر رکھنا

سوال کیا قرآن مجید یا دیگر آسمانی و اسلامی کتب کو زمین پر رکھ دینا جائز ہے؟ بعض لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے، جہاں خود بیٹھے ہوتے ہیں وہاں زمین پر قرآن پاک وغیرہ رکھ دیتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب قرآن پاک ہو یا کوئی بھی اسلامی و دینی کتاب، اس کا ادب و احترام کرنا ہمارے اوپر لازم ہے۔ ہمیں ان کا ادب کرتے ہوئے بلند رکھنا چاہیے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ آیا، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو وادی قف کی طرف دعوت دی، آپ ﷺ ان کے ہاں مدراس میں چلے گئے۔ انھوں نے کہا: ”اے ابوالقاسم! ہم میں سے ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، ان کے درمیان فیصلہ کیجیے۔“ انھوں نے آپ ﷺ کے لیے ایک تکیہ رکھا، آپ اس پر بیٹھ گئے پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس تورات لاؤ۔“ تورات لائی گئی تو آپ نے اپنے نیچے سے تکیہ نکالا اور اس کے اوپر تورات رکھی، پھر فرمایا: ((اَمْنُکَ یَاکُ وَبِئْسَ اَنْوَلُکَ)) ”میں تیرے اوپر بھی ایمان لایا اور اس پر بھی جس نے تجھے نازل کیا ہے۔“ پھر فرمایا: ”میرے پاس اپنے سب سے زیادہ علم والے کو لاؤ۔“ ایک نوجوان کو لایا گیا، پھر آگے رجم کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الحدود: باب فی رجم الیہودیین (۴۴۴۹))

شیخ الالبانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ یہ روایت ہشام بن سعد کی وجہ سے حسن ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تورات جو آسمانی کتاب تھی، نبی ﷺ نے اس کا ادب کرتے ہوئے اسے تکیہ پر رکھا۔ قرآن حکیم تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان والی کتاب ہے، اس کا ادب کرنا تو بالادوی ضروری ٹھہرا۔ اس لیے قرآن پاک کا ادب کرتے ہوئے اسے زمین نہ رکھا جائے بلکہ اس کو کسی بلند جگہ رکھا جائے تاکہ اس کی توجہ سے بچا جاسکے۔

سکول میں گھنٹی بجانا

(سوال) سکول میں پیریدہ بدلنے کیلئے جو گھنٹی بجائی جاتی ہے کیا یہ شرعاً درست ہے؟ شرعی حیثیت واضح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔
(جواب) اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سکول کے اوقات معلوم کرنے کے لیے گھنٹی سے کام لینے سے فائدہ ہے مگر مسلمان کے سامنے صرف فائدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا بھی پابند ہے۔ چاہے اسے کسی چیز میں چاہے کتنا زیادہ فائدہ دکھائی دیتا ہو، اگر اللہ اور اس کے رسول اس سے منع فرمادیں تو وہ حکم عدولی نہیں کرے گا، وقتی نقصان خوش دلی سے گوارا کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ۲۱۹]

” (لوگ) آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہوتا ہے۔“

کتاب اللہ کا اعجاز دیکھیے، شراب اور جوئے کے فوائد سے انکار نہیں کیا، فائدہ تسلیم کر کے بتایا کہ ان کا باعث گناہ ہونا فائدہ اٹھانے میں حائل ہے۔ گھنٹی کا بھی یہی حال ہے۔ بڑی گھنٹی کو عربی میں ناقوس کہتے ہیں، جانوروں کے گلے والی گھنٹی کو جرس کہتے ہیں، اس سے چھوٹی ہو تو اسے طبل (یعنی گھنگھرو) کہتے ہیں۔ ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ناقوس وقت کی اطلاع دینے کیلئے بجائی جاتی ہے اور جرس اونٹوں کی قطار میں اس بات سے آگاہ رکھتی ہے کہ آخری اونٹ بھی قطار کے ساتھ موجود ہے، اگر جانور رھٹ یا خراس پر چل رہا ہو تو وہ گھنٹی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصروف کار ہے یا رک گیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان کے گناہ ہونے کی جانب بھاری ہے۔ ناقوس سے عیسائیوں سے مشابہت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» [مسند احمد (۴۹/۲)]

”جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت کرے گا وہ انہی سے ہے۔“

مسلمانوں کے لیے وقت کی اطلاع دینے کے لحاظ سے سب سے اہم چیز اذان ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«لَمَّا كَثُرَ النَّاسُ قَالَ ذَكِّرُوا أَنْ يَعْلَمُوا وَقَتَ الصَّلَاةِ بِشَيْءٍ يَعْرِفُونَهُ فَذَكَّرُوا أَنْ يُورُوا نَارًا أَوْ

يَضْرِبُوا نَاقُوسًا فَأَمَرَ بِلَالٍ أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ وَ أَنْ يُؤَيِّرَ الْإِقَامَةَ» [بخاری، کتاب الاذان: باب

الاذان منی منی (۶۰۶)]

”جب لوگ زیادہ ہوئے تو انھوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ نماز کا وقت کس چیز کے ساتھ معلوم کریں، جسے وہ پہچان لیا کریں تو انھوں نے ذکر کیا کہ آگ کو جلا دیا کریں یا گھنٹی بجا دیا کریں تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دہری

اذان دیں اور اکہری اقامت کہیں۔“

بخاری میں روایت مختصر ہے۔ ابوالشیخ نے اسے ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

”لوگوں نے کہا: ”اگر ہم گھنٹی بنا لیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ تو عیسائیوں کے لیے ہے۔“ انھوں نے کہا: ”اگر

ہم بوق (بگل) بنا لیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ یہود کے لیے ہے۔“ انھوں نے کہا: ”اگر ہم آگ بلند کر دیں؟“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ مجوس کے لیے ہے۔“ [فتح الباری، (تحت الحدیث/۶۰۳)]

اس سے معلوم ہوا کہ وقت کی اطلاع کے لیے اسلام میں گھنٹی، بگل یا آگ کی بجائے انسانی آواز کو اختیار کیا جاتا ہے اور یہی فطرت ہے کیونکہ گھنٹی، بگل یا آگ ہر جگہ اور ہر وقت میسر نہیں آسکتے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کے غیر فطری طریقے کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسند فرمایا۔

جرس (جانوروں کے گلے والی گھنٹی) اور ناقوس میں یہ فرق ہے کہ جرس خود بخود جانور کی حرکت سے بجتی ہے جب کہ ناقوس بجائی جاتی ہے۔ نغمے کے لحاظ سے دونوں کی آواز ملتی جلتی ہے۔ عیسائیوں کی مشابہت کے علاوہ ناقوس (بڑی گھنٹی) کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ گھنٹی کی آواز کا نغمہ ہے جو ناقوس اور جرس دونوں میں موجود ہے اور مزامیر (باجوں) سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْحَرَسُ مَزَامِيرُ الشَّيْطَانِ» [مسلم، کتاب اللباس: باب كراهة الكلب والحرس في السفر (۲۱۱۴)]

”گھنٹی شیطان کے باجے ہیں۔“

گھنٹی شیطان کی پسندیدہ ہونے کی وجہ سے فرشتوں کو اس سے اتنی نفرت ہے کہ رقتاء کے جس قافلے یا مجلس میں وہ موجود ہو (رحمت کے) فرشتے ان کے ساتھ نہیں رہتے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيهَا كَلْبٌ وَلَا جَرَسٌ» [مسلم، کتاب اللباس: باب كراهة الكلب

والحرس في السفر (۲۱۱۳)]

”فرشتے ان مسافروں کے ساتھ نہیں رہتے جن کے ساتھ کتا یا گھنٹی ہو۔“

یہ چیزیں ایسی ناپاک ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود ہوں تو رحمت کے فرشتے وہاں آنے سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَصْبَحَ يَوْمًا وَاجِمًا فَقَالَتْ مَيْمُونَةُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! لَقَدْ اسْتَنْكَرْتُ هَيْتَكَ مِنْذُ الْيَوْمِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ جِبْرِيلَ كَانَ وَعَدَنِي أَنْ يُلْقَانِي اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقِنِي أَمْ وَاللَّهِ مَا أَخْلَفَنِي قَالَ فَظَلَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَهُ ذَلِكَ عَلَى ذَلِكَ ثُمَّ وَقَعَ فِي نَفْسِهِ جَرُّو كَلْبٍ تَحْتَ قُسْطَاطٍ لَنَا فَأَمَرَ بِهِ فَأُخْرِجَ ثُمَّ

أَخَذَ بِيَدِهِ مَاءً فَفَضَّحَ مَكَانَهُ فَلَمَّا أَمْسَى لَقِيَهُ جَبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ قَدْ كُنْتَ وَعَدْتَنِي أَنْ تَلْقَانِي الْبَارِحَةَ قَالَ أَجَلٌ وَ لَكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ» [مسلم، كتاب اللباس:

باب تحريم تصوير صورة الحيوان (۲۱۰۵)]

”ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اس حال میں صبح کی کہ آپ ﷺ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے، خاموش تھے۔ فرمانے لگے: ”جبرائیل علیہ السلام نے آج رات مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں ملے۔ اللہ کی قسم! انھوں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔“ پھر آپ ﷺ کے دل میں کتے کے ایک بچے کا خیال آیا جو آپ کی چارپائی کے نیچے تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا تو اسے نکال دیا گیا، پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس جگہ پانی چھڑکا۔ شام ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”آپ نے مجھ سے کل رات ملنے کا وعدہ کیا تھا؟“ انھوں نے فرمایا: ”ہاں! مگر ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔“

اب آپ کفار کی مرغوب و محبوب چیز کو دیکھیں تو اس میں کتا، تصویر اور جرس نمایاں نظر آئیں گی، ان کی یہ کوشش ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ہو یا غیر مسلم، کوئی بھی گھر ان سے خالی نہ رہے حتیٰ کہ ان کے بنائے ہوئے کلاک ہمارے گھروں اور ہماری مساجد میں آویزاں ہیں جن میں وقت بتانے کے لیے گھنٹی کی آواز رکھی گئی ہے۔ بلکہ گھنٹی کے مزامیری نغمے کو کم سمجھ کر موسیقی کی آواز دو گھنٹیوں کے درمیان بڑھادی گئی ہے۔ گھروں کے دروازے پر لگائی جانے والی گھنٹی کی آواز بھی عموماً ناقوس یا جرس سے ملتی جلتی ہے۔ اب اگر مسلمان رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر چلنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے گھروں سے، اپنی مسجدوں سے، اپنے مدارس اور اپنی سواریوں سے شیطان کے ان مزامیر کو دور کرنا ہوگا، کلاکوں سے وہ پرزہ نکالنا ہوگا جس سے گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم پیریڈ بدلنے کے لیے یا وقت کی اطلاع دینے کے لیے کیا کریں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے انسانی آواز استعمال کی جائے۔ اس کے لیے سپیکر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کونسا پیریڈ ہے؟ یا پھر ہم الیکٹرانک گھنٹی کی جگہ وہ آلہ بھی استعمال کر سکتے ہیں جس میں انسانی آواز بھری ہوئی ہو۔ آج کل بہت سے ٹائم ٹیس اور گھڑیوں میں اذان یا اقامت یا دوسری قسم کی آوازیں بھری گئی ہیں۔ گھروں میں لگائے جانے والے آلات میں گھنٹی کی آواز کی جگہ ”السلام علیکم“ وغیرہ کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ اسی طرح پیریڈ بدلنے کے لیے الفاظ بھی بھرے جا سکتے ہیں۔ الدعوتہ ماڈل سکولز سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ الیکٹرانک سائنس کا یہ معمولی سا کام کرنے سے عاجز نہیں رہیں گے۔ ہمارے مجاہد بھائی جو باقاعدہ سائنس کے تعلیم یافتہ بھی ہیں، انھوں نے اپنی گاڑیوں میں ایسے پرزے لگائے ہیں کہ دروازہ کھولیں تو السلام علیکم اور اس قسم کے فقرات کی آواز خود بخود نکلتی ہے اور گھروں میں بھی اس قسم کی اطلاع دینے والے آلات لگائے ہیں۔

اگر انسانی آواز والا آلہ مشکل ہو تو ایسا آلہ استعمال کریں جس میں آواز تو ہو مگر وہ ناقوس یا جرس یا موسیقی سے نہ ملتی ہو

تا کہ عیسائیوں سے مشابہت اور شیطان کے ماحول سے اجتناب ہو سکے۔ الارم کے طور پر مرغ کی آواز بھی استعمال ہو سکتی ہے بلکہ ہو رہی ہے۔

آخر میں گزارش ہے کہ جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چونکہ ہماری نیت یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں میں بننے والی گھنٹیوں سے مشابہت نہیں ہے، ویسے بھی بجانے کا انداز ان سے یکسر مختلف ہے لہذا اس کے بارے میں اجتہاد سے آگاہ فرمائیں۔ تو گزارش ہے کہ ہر کام کے درست ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک تو یہ کہ نیت درست ہو دوسرا وہ کام فی نفسہ درست ہو۔ اگر کوئی کام فی نفسہ غلط ہے تو نیت جتنی مرضی درست کر لیں وہ کام درست نہیں ہوگا۔ امید ہے کہ ان کے سامنے اس کے دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

گھنٹی بجانا فی نفسہ غلط کام ہے۔ یہ شیطان کا باجا ہے۔ جس گھر میں یہ ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ اب اگر پیریڈ بتانے کا تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو بھی تو کیا فائدہ؟ جب کہ ہم نے شیطان کو خوش کیا اور فرشتوں کو گھر میں آنے سے روک دیا۔ اجتہاد کے متعلق یاد رہے کہ اجتہاد تو وہاں ہوتا ہے جہاں ہمیں واضح حکم معلوم نہ ہو اور وہ بھی اس وقت تک جائز ہے جب تک ہمیں قرآن و حدیث سے اس کا واضح حکم معلوم نہ ہو جائے۔ اس کے بعد نہ اجتہاد کرنا جائز ہے اور نہ کسی کے اجتہاد کے پیچھے چلنا۔

تقریبات میں طبلے بجانا اور ترانے پڑھنا

سوال تقریبات وغیرہ کے موقعوں پر ہم فحش گوئی سے پاک ترانوں کے ساتھ طبلے استعمال کرتے ہیں، اس میں کئی کئی راتیں صرف ہو جاتی ہیں، کیا ہمارا یہ عمل قابل انکار ہے؟

جواب ہمیں کوئی ایسی دلیل معلوم نہیں جس سے طبلوں کا استعمال جائز ثابت ہو، اس کے برخلاف صحیح حدیثوں کے ظاہری مفہوم سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے عام آلات طرب، بانسری و سارنگی وغیرہ حرام ہیں۔ اس قسم کی حدیثوں میں سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور گانے بجانے کو حلال جانیں گے۔“

[صحیح بخاری، کتاب الأشربة: باب ما جاء فيمن يستحل الخمر و يسمية بغير اسمة (۵۵۹۰)]

اس حدیث میں لفظ ”معاذ“ استعمال ہوا ہے اور لفظ ”معاذ“ ہر قسم کے گانوں اور تمام آلات طرب کو شامل ہے۔

اپریل فول

سوال اپریل فول کی حیثیت قرآن اور حدیث کی رو سے واضح فرمادیں۔ جزاکم اللہ خیراً

جواب اپریل فول کا شرعی حکم معلوم کرنے سے پہلے اس کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ اپریل انگریزی سال کا چوتھا مہینا ہے۔

یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظ (Aprilis) اپریلیس یا (Aperire) اپیریر سے ماخوذ ہے۔ یہ لفظ موسم بہار کے آغاز، پھولوں کے کھلنے اور نئی کوٹلیں پھونکنے کے موسم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور فول (Fool) بے وقوفی، حماقت اور جھوٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو اپریل فول کا مفہوم یہ ہے کہ اپریل کی یکم تاریخ کو وہ لوگ جھوٹ بول کر استہزاء و مذاق کیا کرتے تھے۔ اس کی مختلف توجیہات کی جاتی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ فرانس میں سال کی ابتدا جنوری کی بجائے اپریل سے ہوتی تھی۔ جب فرانس میں تاریخی کیلنڈر تبدیل کیا گیا اور ۱۵۶۴ء میں نیا کیلنڈر جاری کیا گیا تو جو لوگ اس نئے کیلنڈر کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی مخالفت کرتے تھے، انھیں طعن و تشنیع، مذاق اور استہزاء کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور ان کے ساتھ انتہائی برے طریقے سے پیش آیا جاتا تھا۔

اپریل فول کا ذکر سب سے پہلے ڈریک نیوز لیٹر (Drak news letter) اخبار میں ملتا ہے۔ مذکورہ اخبار نے دو اپریل ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں لکھا کہ کچھ لوگوں نے یکم اپریل کو لندن ٹاور میں شیروں کے غسل کا عملی مشاہدہ کروانے کا اعلان کیا۔ یکم اپریل کو یورپ میں ہونے والے مشہور واقعات میں سے اہم اور مشہور واقعہ وہ ہے جو انگریزی اخبار ”الفینج سنٹار“ نے ۳۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو اعلان کیا کہ یکم اپریل کو اسلنجنون (جو ایک شہر کا نام ہے) کے زرعی فارم میں گدھوں کی عام نمائش اور میلا ہوگا۔ لوگ انتہائی شوق سے جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ انتظار میں تھک کر چور ہو گئے تو انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ میلا کب شروع ہوگا؟ مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ آخر کار انھیں بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے میلے میں آئے ہیں وہ خود ہی گدھے ہیں۔ [ماخوذ از ”اپریل فول کی تاریخی و شرعی حیثیت“]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ اپریل فول یہودیوں اور عیسائیوں کی جاری کردہ فحیح رسم ہے جس میں جھوٹ پر مبنی خبریں دے کر لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جھوٹی خبر دینے سے معاشرے میں بگاڑ و فساد حتیٰ کہ قتل و غارت کی نوبت آجاتی ہے اور جھوٹ قرآن و سنت کی رو سے قطعی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ [البقرة: ۱۰]

”ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا وصف جھوٹ بولنا ذکر کیا ہے اور اس پر انھیں دردناک عذاب کی بشارت دی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّىٰ يَدْعَهَا إِذَا اتَّيَمَنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَحَرَ» [بخاری،

کتاب الایمان: باب علامات المنافق (۳۴)]

”سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس آدمی میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص

منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے:

① جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ② جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

③ جب عہد کرے تو عہد شکنی کرے۔ ④ اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنا شرعاً ناجائز و حرام ہے اور نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْحَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيُصْدَقُ حَتَّى يَكُونَ صِدْقًا وَإِنَّ الْكُذْبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يَكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذَابًا » [بخاری، کتاب الأدب: باب قول الله تعالى ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴾ و ما ينهى عن الكذب (٦٠٩٤)، مسلم، کتاب البر والصلوة: باب قبح الكذب و حسن الصدق و فضله (٢٦٠٧)، مسند احمد (٣٩٣/١)]

”یقیناً سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بے شک آدمی سچ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ صدیق بن جاتا ہے اور یقیناً جھوٹ برائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور برائی آگ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور بے شک آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھا جاتا ہے۔“
حضرت سرہ بن جنبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« رَأَيْتُ رَجُلَيْنِ آتِيَانِي قَالَ الَّذِي رَأَيْتَهُ يُشْقُ شِدْقُهُ فَكَذَّابٌ يَكْذِبُ بِالْكَذْبَةِ تُحْمَلُ عَنْهُ حَتَّى تَبْلُغَ الْآفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ » [بخاری، کتاب الأدب: باب قول الله تعالى: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ ﴾ (٦٠٩٦)]

”میں نے گزشتہ رات خواب میں دو آدمیوں (فرشتوں) کو دیکھا، وہ میرے پاس آئے، انھوں نے کہا: ”جس شخص کو تم نے دیکھا کہ اس کے جڑے چیرے جارہے تھے، وہ دنیا میں بہت جھوٹ بولنے والا تھا، جو جھوٹ بات کہہ دیتا، سارے ملک میں پھیل جاتی۔ قیامت تک اس کو یہی سزا ملتی رہے گی۔“
حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« دَعُ مَا يُرِيئُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيئُكَ فَإِنَّ الصِّدْقَ طَمَآنِينَةٌ وَإِنَّ الْكُذْبَ رِيئَةٌ » [ترمذی، کتاب صفة القيامة: باب (٢٥١٨)، نسائی، کتاب الأشربة (٥٧١٤)، مسند ابی یعلیٰ (٦٧٦٢/١٢)، حلیۃ الأولیاء (٢٦٤/٨)، بیہقی (٣٣٥/٥)، مسند طیالسی (١٢٩١)]

”مٹھلک بات کو ترک کر کے غیر مٹھلک کو اختیار کر، یقیناً سچائی میں اطمینان ہے اور جھوٹ میں بے سکونی ہے۔“
سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: إِمَامٌ كَذَّابٌ وَ عَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ وَ الشَّيْخُ الزَّانِيُ» [مسلم، کتاب الایمان: باب بیان غلط تحریم إسبال الإزار (۱۰۷)، مسند ابی یعلیٰ (۱۱۹۷/۱۱)، مسند ابی عوانة (۴۰/۱)، بیہقی (۱۶۱/۸)، مسند احمد (۴۸۰/۲)، نسائی (۸۶/۵)]

”تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر رحمت ہی کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے: جھوٹا حکمران، تنگ دست متکبر اور بوڑھا بدکار۔“

ان صحیح احادیث سے جھوٹ بولنے کی مذمت معلوم ہوئی کہ جھوٹا آدمی جب ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے تو اللہ کے ہاں کذاب لکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جھوٹے شخص کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا بھی نہیں اور جھوٹ سے اطمینان بھی نصیب نہیں ہوتا بلکہ بے سکونی اور تردد رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر مبالغہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ فَتَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴾ [آل عمران: ۶۱]

”ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“

علاوہ ازیں سابقہ اقوام کی رذیل صفات میں سے جھوٹ کا ذکر قرآن مجید نے بالخصوص کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا شرعاً حرام ہے اور اپریل فول کی بنیاد ہی جھوٹ ہے، لہذا یہ شرعاً بالکل حرام ہے۔ نیز یہ یہود و نصاریٰ کی فحیح عادات میں سے ایک عادت ہے جسے اپنانا یہود کی تقلید اور ان کے ساتھ مشابہت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت سے کئی مواقع پر منع فرمایا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَمَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» [مسند احمد (۴۹/۲)]

”جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَ لَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنْ هُدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهُدَىٰ وَ لَئِنْ أَتَبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَ لَا نَصِيرٍ ﴾ [البقرة: ۱۲۰]

”یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کے راستے کی پیروی کر لیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں آپ کا کوئی کارساز اور مددگار نہیں آسکے گا۔“

مندرجہ بالا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ شریعت اسلامیہ میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور یہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ و راستہ ہے۔ لہذا اپریل فول شرعاً حرام ہے اور یہود و نصاریٰ کی عادات قبیحہ اور بری

رسم سے ہے۔ اس پر چلنا یہود و نصاریٰ کے طرز کو اپنانا ہے، جو کسی بھی مسلمان کے لیے درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اخلاقِ رذیلہ اور عاداتِ قبیحہ سے ہر مسلمان مرد و زن اور چھوٹے بڑے کو محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

ماتم کا شرعی حکم

(سوال) ہمارے معاشرے میں یہ رواج سا بن چکا ہے کہ محرم جو اسلامی سال کا سر آغاز ہے اس کی ابتدا رونے پینے اور ماتم کرنے سے ہوتی ہے جس کی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔ ازراہ کرم اس کی شرعی حیثیت سے آگاہ فرمادیں۔

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی ہے۔ گریبان چاک کرنا، سینہ کو بی کرنا وغیرہ صبر کے خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾ [البقرة: ۱۵۳]

”اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

انسان کو احکام شریعت پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور مصائب و آلام برداشت کرنے پڑتے ہیں، صبر و صلاۃ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین معاون ہیں، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ مومن کے لیے ہر حال میں بہتری ہے، تکلیف کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی میں شکر گزار رہتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکامات اور مومنین کی آزمائش کا ذکر کیا ہے۔

﴿ وَ لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَ لَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ

بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْحُوجِ وَ النَّقْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَ الْأَنْفُسِ وَ الشَّمَرَاتِ وَ بَشِيرِ الصَّابِرِينَ ۝

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ﴾ [البقرة: ۱۵۴-۱۵۶]

”جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے اور البتہ ہم

آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ ڈر سے اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور صبر

کرے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے، جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ ”إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ“ کہتے

ہیں۔“

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مومن آدمی کو اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے آزماتے ہیں، کبھی خوف اور ڈر کے ذریعے، کبھی جانوں اور مالوں کی کمی کے ذریعے اور کبھی پھلوں کے نقصانات سے۔ ایمان دار آدمی کو جب ان میں سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے صبری نہیں کرتا بلکہ صبر کے ساتھ ان مصائب کو برداشت کرتا ہے۔ جو لوگ مصیبت یا پریشانی دیکھ کر بے صبری کریں اور داویلا مچائیں، گریبان چاک کریں، ہال نوچیں وہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق امت محمدیہ (ﷺ) سے

نہیں ہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ وَ شَقَّ الْجُيُوبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ» [بخاری، کتاب

الحنائل: باب ليس مننا من ضرب الخدود (۱۲۹۷)]

”جس شخص نے رخسار پیٹنے اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے واہیلے کی طرح واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں۔“

عشرہ محرم الحرام میں جو لوگ سیدنا علی، سیدنا حسین اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہم کا نام لے کر گلی کوچوں میں نکلے ہیں اور گریبان چاک کرتے ہیں، سینہ کوبی کرتے ہیں، ان کا یہ عمل قرآن و سنت کے خلاف ہونے کے علاوہ ائمہ اہل بیت اور مجتہدین فقہ جعفریہ کے فتاویٰ کے بھی خلاف ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ قبیح عمل ۳۵۲ھ محرم الحرام میں بغداد میں معز الدولہ شیعہ کے حکم سے جاری ہوا۔ اس سے قبل اس عمل قبیح کا نام و نشان نہیں ملتا۔ امام ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”عشرہ محرم الحرام میں اس قبیح رسم کا رواج بغداد میں معز الدولہ شیعہ سے ہوا، جس نے دس محرم الحرام ۳۵۲ھ کو حکم دیا

کہ دکانیں بند کر دی جائیں، بازار اور خرید و فروخت کا کام روک دیا جائے اور لوگ نوحہ کریں، مکمل کالا لباس پہنیں،

عورتیں پرانگندہ ہو کر گریبان چاک کریں، بیعتی ہوئی شہر کا پتھر لگائیں۔“ [تاریخ ابن اثیر (ص ۱۹۷)]

اب ہم فقہ جعفریہ کی معتبر کتاب سے چند روایات درج کرتے ہیں:

”عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ إِنَّ الصَّبْرَ وَالْبَلَاءَ لِيَأْتِيَانِ إِلَى الْمُؤْمِنِ فَيَأْتِيهِ الْبَلَاءُ وَ هُوَ صَبُورٌ وَ إِنَّ

الْحَزْنَ وَالْبَلَاءَ لِيَأْتِيَانِ إِلَى الْكَافِرِ فَيَأْتِيهِ الْبَلَاءُ وَ هُوَ حَزُوعٌ“ [فروع کافی، کتاب الحنائن

(۱۳۱۸)]

”امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ”یقیناً صبر اور آزمائش دونوں مومن پر آتے ہیں۔ مومن پر

جب آزمائش آتی ہے تو وہ صبر کرنے والا ہوتا ہے۔ بے صبری اور آزمائش دونوں کافر پر آتے ہیں، جب اس پر

آزمائش آتی ہے تو وہ بے صبری کرتا ہے۔“

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے اس فتوے سے معلوم ہوا کہ صبر کرنے والا مومن ہے اور جو بے صبری کرتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

”قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِفَاطِمَةَ إِذَا آتَاكِ مِثُّ فَلَا تَحْمِشِي عَلَيَّ وَ جُهَاً وَ لَا

تُرِيحِي عَلَيَّ شَعْرًا وَ لَا تُنَادِي بِالْوَيْلِ وَ لَا تُقِيمِي عَلَيَّ نَائِحَةً“ [فروع کافی، کتاب النکاح

(ص ۲۲۸)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ”جب میں مر جاؤں تو مجھ پر چہرہ نہ نوحتا اور نہ مجھ پر اپنے بال

بکھیرنا اور نہ واویلا کرنا اور نہ مجھ پر نوحہ کرنا۔“

”قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَنْبَغِي الصِّيَاخُ عَلَى الْمَيِّتِ وَ لَا شَقُّ الثِّيَابِ“ [فروع کافی

(۱۸۸۱)]

”امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میت پر چیخ پکار اور کپڑے پھاڑنا جائز نہیں۔“

امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جس نے قبر کی تجدید کی یا کوئی شبیہ بنائی وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔“ [من لا یحضرہ الفقیہ:

باب النوادر]

« قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْطَمَنَّ خَدًّا وَلَا تَخْمِشَنَّ وَجْهًا وَلَا تَنْتِفِنَنَّ شَعْرًا وَلَا تَشْقُقَنَّ جَبِيًّا وَلَا تُسَوِّدَنَّ نُؤْبًا وَلَا تَدْعِينَ بِالْوَيْلِ » [فروع کافی، کتاب النکاح

(ص ۲۲۸۱)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”رخسار ہرگز نہ پیٹنا اور نہ چہرہ نوچنا اور نہ بال بکھیرنا اور نہ گریبان چاک کرنا اور نہ کپڑے سیاہ کرنا اور نہ واویلا کرنا۔“

مندرجہ بالا فقہ جعفریہ کی پانچ روایات سے معلوم ہوا کہ فقہ جعفریہ میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، امام باقر اور امام جعفر صادق وغیرہ سے روایات موجود ہیں جو واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مصیبت کے وقت بال بکھیرنا، چہرہ پیٹنا، سینہ کوبی کرنا، واویلا کرنا، مرعے پڑھنا، شہمیں بنانا، قبروں کی تجدید کرنا جائز اور حرام عمل ہے۔ لہذا بیخ تن کا نعرہ لگانے والوں کو مذکورہ بالا فقہ جعفریہ کے پانچ دلائل کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے اور اس کی خلاف ورزی سے بچنا چاہیے۔

غمی کے موقع پر گریبان پھاڑنا یا سینہ پیٹنا

(سوال) کیا کسی غمی کے موقع پر اپنے گریبان کو پھاڑنا، چہرے یا سینے کو پیٹنا یا واویلا کرنا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مصیبت اور پریشانی کے وقت صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ (البقرہ: ۱۵۳)

اسی طرح فرمایا:

”جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کر دیے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے اور ہم ضرور تمہاری کسی چیز کے ساتھ آزمائش کریں گے، خوف سے اور بھوک سے اور جانوں، مالوں اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادیں، جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانے والے ہیں۔“ (البقرہ: ۱۵۴-۱۵۶)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن آدمی مصیبت و پریشانی کے موقع پر صبر و تحمل سے کام لیتا ہے، گریبان چاک کرنا یا چہرہ نوچنا اور سینہ کوبی کرنا صبر و تحمل کے خلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَ شَقَّ الْجُيُوبَ وَ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ» [بخاری، کتاب الجنائز:

باب ليس منا من شق الجيوب (۱۲۹۴)]

”جس آدمی نے رخسار پیٹے اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے داویلے کی طرح داویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی، بال منڈانے

والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے براءت کی ہے۔ [صحیح مسلم، کتاب الایمان: باب تحريم ضرب الحدود

و شق الجيوب (۱۰۴)]

آپ کا ایک ارشاد گرامی ہے:

”اگر نوحہ کرنے والی نے اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کی تو قیامت والے دن اس طرح اٹھائی جائے گی کہ اس پر

گندھک کا تھیس اور خارش کی قمیص ہوگی۔“ [صحیح مسلم، کتاب الجنائز: باب التشديد في النياحة: (۹۳۴)]

لہذا آفات اور مصائب و آلام میں صبر و تحمل کا دامن تھامنا چاہیے، جزع و فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے سے باز رہنا

چاہیے۔

ہدیہ و تحفہ واپس لینے کا حکم

سوال کیا کسی آدمی کو ہدیہ و تحفہ دے کر واپس لینا جائز ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

جواب کسی شخص کو ہدیہ و تحفہ دے کر پھر واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔ ہدیہ لغت و شرع کے اعتبار سے بہہ ہے۔ عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«الْعَائِدُ فِي هَبْتِهِ كَالْعَائِدِ يَعُوذُ فِي قَيْئِهِ» [صحیح البخاری کتاب الهبة: باب لا يحل لأحد أن يرجع

في هبة و صدقته (۲۶۲۱)، صحیح مسلم (۱۶۲۲)]

”بہہ میں واپس پلٹنے والا ایسے ہے جیسے کوئی اپنی تے میں واپس لوٹتا ہے۔“

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

«لَيْسَ لَنَا مِثْلُ السَّوِّءِ» [بخاری، کتاب الهبة: باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبة و صدقة (۲۶۲۲)]

”ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے۔“

عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ أَنْ يُعْطِيَ عَطِيَّةً ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا إِلَّا الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطَى وَلَدَهُ وَمِثْلَ الَّذِي

يُعْطَى الْعَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيهَا كَمِثْلِ الْكَلْبِ أَكَلَ حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَهُ ثُمَّ عَادَ فِي قَيْئِهِ» (مسند احمد

۲/۲۷، ۷۸)، ابوداؤد، کتاب البيوع: باب الرجوع في الهبة (۳۵۳۹)، ترمذی (۲۱۳۲)، نسائی

(۳۷۰۳)، ابن ماجہ (۲۳۷۷) اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ التحقیقات الرضیة (۵۲۶/۲)
 ”کسی بھی آدمی کے لیے حلال نہیں کہ وہ عطیہ دے کر پھر اس میں رجوع کرے سوائے والد کے اس چیز میں جو وہ اپنے بیٹے کو دیتا ہے اور جو آدمی عطیہ دے کر پھر اس میں رجوع کرتا ہے وہ اس کتے کی طرح ہے جو کھاتا ہے حتیٰ کہ جب سیر ہوتا ہے تو توتے کر دیتا ہے پھر اپنی توتے میں رجوع کرتا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ہدیہ و تحفہ اور ہبہ و عطیہ دے کر پھر اس سے واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے مگر والد اپنی اولاد میں سے کسی کو عطیہ دے کر واپس لے سکتا ہے اور اس پر نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ والی اوپر ذکر کردہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ لہذا کسی بھی شخص کو تحفہ دے کر واپس لینا چاہیے اور اس کی مثال بھی بہت بری ہے اور مسلمان کے لیے ایسی مثال کا مصداق بننا درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

بسم اللہ یا قرآنی آیات کو اعداد کی صورت لکھنا

سوال کیا بسم اللہ یا دوسری قرآنی آیات کو اعداد کی صورت میں لکھنا جائز ہے اور اس میں شرعی قباحت کیا ہے؟ قرآن و حدیث سے جواب دیں۔

جواب اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہمیں زندگی گزارنے کے آداب بتائے ہیں اور جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقدس فرامین کے ذریعے عملی نمونہ پیش کر کے ان کی مکمل وضاحت فرمادی۔

① ان اسلامی آداب میں سے ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ہر کام میں اللہ کا نام لے۔ مسلمانوں کو ہر اہم کام ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے شروع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ اس میں برکت ہوتی ہے۔ تحریر میں بھی جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے کہ اسے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور سرداروں کو جو کتب مبارک تحریر فرمائے ان سب میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ لکھی گئی جیسا کہ احادیث مبارکہ کی کتابوں میں وہ خطوط مکمل طور پر درج ہیں۔

② کچھ لوگوں نے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کی بجائے ”۷۸۶“ کا ہندسہ اختیار کر لیا ہے اور عوام میں بھی یہی عدد رائج ہو گیا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اعداد کو کبھی الفاظ کا بدل تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ یہود میں یہ چیز پائی جاتی تھی اور وہ الفاظ کو اعداد کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ میں ۷ اور ۱۳ کے عدد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے ان کی مذہبی کتابوں میں ساتویں سال کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کے لیے خاص احکام موجود ہیں۔ اس بنا پر حضرت عیسیٰ ﷺ کے نسب نامہ کو ابراہیم ﷺ سے لے کر مسیح ﷺ تک چودہ چودہ ناموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مسیحی علماء اس بات کی ایک وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چودہ کا عدد سات کا دگنا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ داؤد، جسے عبرانی میں دوو..... کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے اعداد ۱۳ ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ عیسیٰ ﷺ داؤد ﷺ کے روحانی وارث ہیں۔

③ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حساب جمل یعنی حروف و اعداد کے ہیر پھیر کے بانی اور اس پر ایمان رکھنے والے غیر مسلم اہل کتاب ہیں، مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں اور الگ الگ حرف کے طور پر پڑھے جاتے ہیں ان کے متعلق کتب تفسیر میں یہ روایات موجود ہیں کہ یہود نے جب یہ حروف سنے تو ان کا خیال تھا کہ اس سے مراد مدت ہے کہ اس نبی کی نبوت اتنا عرصہ رہے گی، چنانچہ ”الم“ کو سن کر ایک یہودی عالم نے کہا کہ مسلمانوں کا نبی تو محض اکہتر سال تک باقی رہے گا۔ جب اسے بتایا گیا کہ قرآن میں ”المص“ بھی ہے تو اس نے کہا یہ ۱۶۱ سال ہو گئے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ قرآن مجید میں ”الر“ بھی ہے تو اس نے کہا یہ تو اور زیادہ ہو گئے۔ پھر جب اس کے سامنے ”الم“ پیش کیا گیا تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا کیونکہ یہ ۲۷۱ بنتے ہیں۔ آخر کہنے لگا کہ مسئلہ الجھ گیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ان کا مقصد کیا ہے؟ (جب کہ ان حروف کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور یہی موقف درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔)

④ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف اور اعداد کو ایک دوسرے کا بدل قرار دینے کا تصور یہودیوں کی طرف سے آیا ہے لہذا مسلمانوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں بھی اعداد کو الفاظ کا بدل سمجھنے کا تصور موجود نہیں۔

اگر کسی کا نام انور ہے تو اس کو ۲۵ صاحب کہہ کر نہیں بلایا جاتا۔ نہ قریشی صاحب ۶۲۰ کہلانا پسند کریں گے۔ اگر مولانا صاحب کی بجائے ۱۲۸ صاحب کہہ دیا جائے تو وہ یقیناً ناراض ہو جائیں گے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے؟

⑤ پھر ایک عدد ضروری نہیں کہ ایک ہی عبارت کو ظاہر کرے بلکہ اس سے زیادہ عبارتوں کے مجموعی عدد کے بھی مساوی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی عدد ۸۶۷ جسے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کا بدل قرار دیا جاتا ہے، یہ ہندوؤں کے معبود کرشن کے نام کا نعرہ ”ہرے کرشنا“ کے اعداد کا مجموعہ بھی ہے۔

⑥ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر اعداد الفاظ کا بدل ہیں تو کیا ہم اپنے معاملات میں ان کا اس لحاظ سے استعمال قبول کر سکتے ہیں؟ ایک شخص آپ سے کوئی واقعہ بیان کرتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم کھاؤ، وہ کہتا ہے ”چھیا سٹھ کی دوسو“ میں سچ کہہ رہا ہوں تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ اس نے اللہ کی قسم کھائی ہے؟ کیا اس کی بات کا اعتبار کر لیا جائے؟ اسی طرح نکاح کے موقع پر دولہا کہے میں نے ۱۳۸ کیا تو کیا یہ تسلیم کیا جائے گا کہ اس نے ”قبول“ کر لیا؟ یا کوئی اپنی بیوی سے کہے جا تجھے ۱۴۰ ہے، تو کیا اسے ”طلاق“ سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً کوئی سمجھ دار اس منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

⑦ پھر کیا وجہ ہے کہ جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اسے اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کے لیے اور جناب رسول اللہ ﷺ کے ام مبارک کے لیے ہم پسند کریں۔ ایک مومن کے لیے اس کا تصور بھی ناقابل قبول ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کی جگہ ۷۸۶ اس لیے لکھتے ہیں تاکہ اللہ کے پاک نام کی بے حرمتی نہ ہو۔ کاغذ پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہو تو اسے ادب سے رکھنا چاہیے لیکن ۷۸۶ لکھا ہو تو اس قدر احتیاط کی ضرورت نہیں۔ ان حضرات کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ۷۸۶ بسم اللہ کا بدل نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا احترام کرنا ضروری نہیں ورنہ اگر عدد بھی بسم اللہ ہے تو اس کا احترام بھی اسی طرح ضروری ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ۷۸۶ کا عدد بسم اللہ کا نعم البدل صرف تحریر میں سمجھا جاتا ہے، زبان سے بولنے میں نہیں، ورنہ کھانا کھاتے ہوئے بھی سات سو چھیاسی (۷۸۶) پڑھ کر کھانا شروع کر دیا جائے اور تلاوت کرتے ہوئے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھایا جائے اور اگر نماز کے لیے اذکار کے اعداد نکال لیے جائیں تو بڑی آسانی سے جھٹ پٹ نماز سے فراغت حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ۷۸۶ کا عدد استعمال کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا مبارک نام اور مکمل ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ لکھا کریں تاکہ وہ یہود و نصاریٰ کی نقل سے بچتے ہوئے اللہ کے نام کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں۔

داڑھی اور مونچھوں کے متعلق شرعی احکامات

(سوال) کیا داڑھی کی کاٹ چھانٹ کرنا جائز ہے اور کیا رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہے؟ مہربانی فرما کر صحیح سنت رسول سے آگاہ فرمادیں۔

(جواب) ① نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاعْفَاءُ اللَّحْيَةِ» [مسلم، کتاب الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ (۲۶۱)]
 ”دس خصلتیں فطرت سے ہیں جن میں سے مونچھیں تراشنا اور داڑھی بڑھانا بھی ہے۔“

② عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«خَالِفُوا الْمُشْرِكِينَ أَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَ أَوْفُوا اللَّحْيَ» [مسلم، کتاب الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ (۲۵۹)]

”مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھوں کو پست کرو اور داڑھی کو پورا کرو۔“

③ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ أَهْلَ الْكِتَابِ يَقْضُونَ عَثَائِنَهُمْ وَيُوقِرُونَ سِبَالَهُمْ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضُوا سِبَالَكُمْ وَوَقِرُوا عَثَائِنَكُمْ وَخَالِفُوا أَهْلَ الْكِتَابِ» [مسند احمد (۲۶۴/۵)، حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ [فتح الباری (۳۰۴/۱۰)] اور علامہ عینی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ [عمدۃ القاری (۵۰/۲۲)]

”ہم نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اہل کتاب داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں۔“ آپ ﷺ نے

فرمایا: ”تم موٹھیں کاٹو اور داڑھیاں بڑھاؤ اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔“

مذکورہ بالا تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ موٹھیں کاٹنا یا پست کرنا اور داڑھی بڑھانا فطرت اسلام میں داخل ہے اور داڑھی کاٹنا اور موٹھیں بڑھانا فطرت اسلام کو بدلنا اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی علامت ہے۔ لہذا جو شخص موٹھیں بڑھاتا ہے، کاٹتا نہیں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت دردناک عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور: ۶۳]

”پس جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، انہیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب اترے۔“

باقی رہا داڑھی کی مقدار کا مسئلہ تو اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اس کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ سے پانچ الفاظ مروی ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

” فَحَصَلَ خَمْسُ رَوَايَاتٍ أَعْفُوا وَ أَوْفُوا وَ أَرْحُوا وَ أَرْجُوا وَ وَفِرُوا وَ مَعْنَاهَا كُلُّهَا تَرَكُهَا عَلَى حَالِهَا هَذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْحَدِيثِ الَّذِي يُقْتَضَى الْفَاطَةُ “ [شرح مسلم للنووی (۱۲۹۱)]

”پانچ روایات مروی ہیں ”اعفوا، اوفوا، ارحوا، ارجوا اور وفروا“ ان سب کا معنی یہ ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ اس حدیث کے ظاہری الفاظ اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں۔“

لہذا جب اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اسے کاٹنا اہل کتاب کی علامت بتائی ہے تو داڑھی کو اس حال پر چھوڑ دینا ہی منشاء الہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے آپ ﷺ کے فرمان کے ہوتے ہوئے کسی دوسری بات کی طرف توجہ کرنا درست نہیں۔ بعض حضرات داڑھی تراشنے اور اس کی کاٹ چھانٹ کرنے کے متعلق جامع ترمذی کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهِ مِنْ عَرَضِهَا وَ طُولِهَا » [ترمذی، کتاب

الأدب: باب ماجاء فی الأخذ من اللحية (۲۷۶۲)]

”رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض و طول سے کاٹتے تھے۔“

اگر یہ روایت درست ہوتی تو فی الجملہ داڑھی تراشوانے اور کاٹ چھانٹ کرنے پر استدلال صحیح ہوتا ہے لیکن یہ روایت انتہائی کمزور بلکہ من گھڑت ہے۔ اس کی سند میں عمر بن ہارون نامی راوی ہے جس کے بارے میں حافظ الحدیث امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام عبد الرحمن بن مہدی، امام احمد ابن حنبل اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ کذاب خبیث ہے اور امام صالح جزیرہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔ امام علی بن مدینی اور امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔ امام ابو علی الحافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ متروک الحدیث ہے۔ امام

ساجی ﷺ فرماتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام ابو نعیم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر حدیثیں بیان کرتا ہے اور محض بچ ہے۔ امام عجمی ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ [تہذیب التہذیب (۳۱۶/۴ - ۳۱۷)]

علامہ البانی ﷺ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ (۳۰۴/۱)]

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بے اصل، من گھڑت اور بے بنیاد روایت سے نہ صرف استدلال کیا جاتا ہے بلکہ اسے صحیح احادیث کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے اور ایک ایسے نظریہ کو ثابت کیا جاتا ہے جس کا خیر القرون میں سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ بعض لوگ اس بے بنیاد روایت کو دلیل بنا کر داڑھی کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیتے ہیں کہ کچھ داڑھی اوپر والے حصے سے مونڈ دی اور کچھ نیچے والے حصے سے اور چہرے پر ایک چھوٹی سے پٹی کی صورت میں چند بال رکھ لیے جو کھلم کھلا شریعت سے مذاق اور شیطان کی پیروی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ سے بغاوت اور اظہار بیزاری ہے۔ انہوں تو اس بات کا ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اور اپنے آپ کو سکا لکھنے والے لوگ اس سنت متواترہ کا نہ صرف مذاق اڑاتے ہیں بلکہ اسے سنت نبوی سے بھی خارج کر دیتے ہیں۔

داڑھی رکھنا فرض ہے

(سوال) داڑھی رکھنا اسلام میں فرض ہے یا واجب، سنت ہے یا صرف ایک عبادت؟ جو رکھ لی جائے تو بہتر ہے ورنہ کوئی گناہ نہیں اور اگر داڑھی کے بارے میں کوئی ارشاد خداوندی ہے تو وہ بھی لکھ دیں اور لفظ فرض کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

(جواب) مسلمان مرد کے لیے داڑھی رکھنا ضروری و لازمی ہے جسے شرعی اصطلاح میں فرض و واجب کہتے ہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ نے اسے فطرت میں سے قرار دیا ہے اور اس کے رکھنے کا حکم ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

”دس چیزیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کتر وانا، واڑھی بڑھانا، مسواک کرنا اور ناک میں پانی ڈال کر اوپر کو کھینچنا،

ناخن کٹوانا، انگلیوں کے جوڑ اچھی طرح دھونا، بغل کے بال اکھیڑنا، زیر ناف بال صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔“

راوی حدیث مصعب نے کہا: ”میں دسویں چیز بھول گیا ہوں مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کلی کرنا ہو۔“ [صحیح مسلم،

کتاب الطہارۃ: باب خصال الفطرۃ: ۲۶۱]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

”مشرکین کی مخالفت کرو، واڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔“ [مسلم، کتاب الطہارۃ: باب خصال

الفطرۃ (۲۵۹)]

ان ہر دو احادیث سے معلوم ہوا کہ داڑھی بڑھانا فطرت میں سے ہے اور اس کے بڑھانے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے اور اہل علم خوب جانتے ہیں کہ حکم کا صیغہ کسی کام کو واجب و فرض کرنے کے لیے ہوتا ہے الا یہ کہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو اسے وجوب کے حکم سے خارج کرتا ہو اور یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جو اسے وجوب کے حکم سے نکالتا ہو لہذا داڑھی رکھنا

فرض و واجب ہے۔ امام ابن کثیر نے اپنی تاریخ کی کتاب البدایہ والنہایہ میں، اسی طرح تاریخ طبری اور المنتظم لابن الجوزی میں لکھا ہے:

”ایران کے دو باشندے جو داڑھی منڈے تھے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کے چہرے دیکھ کر اپنا رخ انور پھیر لیا، پھر ان سے جب دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ہمارے آقاؤں نے ہمیں داڑھی مونڈنے کا حکم دیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے میرے رب نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے۔“

معلوم ہوا داڑھی بڑھانا اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جمہور ائمہ محدثین کے ہاں فرض و واجب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مسلم وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو فرمایا:

”اے لوگو! بے شک اللہ نے تمہارے اوپر حج فرض کیا ہے سو تم حج کرو۔“ تب ایک آدمی نے پوچھا: ”اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟“ آپ ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ اس نے تین دفعہ یہ بات کہی پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تمہیں اس کی استطاعت نہ ہوتی۔“ [مسلم، کتاب الحج: باب فرض الحج مرة فی العمر (۱۳۳۷)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ فرض اور واجب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور اس کا ادا کرنا ضروری و لازمی ہوتا ہے۔ لہذا داڑھی رکھنا شرعی طور پر فرض اور واجب ہے، اس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔

داڑھی کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث

(سوال) داڑھی کے متعلق مختلف لوگوں کا نظریہ مختلف ہے، کوئی کچھ کہتا ہے تو کوئی کچھ۔ پچھلے دنوں بخاری شریف کا مطالعہ کر رہا تھا (ترجمہ و تفسیر علامہ وحید الزماں) تو ایک حدیث نظر سے گزری جس کا ترجمہ کچھ یوں تھا: ”نافع سے، اور انھوں نے ابن عمر سے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے، بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مشرکین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے داڑھیاں چھوڑ دو اور مونچھوں کو خوب کتر ڈالو۔“ اور عبداللہ بن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی مٹھی سے تھامتے اور جتنی زیادہ ہوتی اس کو کتر دیتے تھے۔“ [صحیح بخاری، کتاب اللباس: باب تقليم الأظفار: (۵۸۹۲)]

اس حدیث مبارکہ میں نبی ﷺ نے مشرکوں کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ داڑھیاں بڑھاؤ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کتنی بڑھاؤ، آیا شروع ہی سے رکھنی چاہیے یا کاٹی جاسکتی ہے؟ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق ہے کہ وہ جب حج یا عمرہ کرتے تو مٹھی بھر سے زائد داڑھی کٹوا دیتے۔ کیا ان کا یہ فعل نبی ﷺ کے قول کے خلاف تھا یا کوئی اور بات تھی؟ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ عمل ایک سے زائد مرتبہ کیا ہے۔ بعض لوگ داڑھی کے متعلق کہتے ہیں اگر رکھ لی جائے تو ثواب ہے اور اگر نہ رکھی جائے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا مشرک بھی داڑھی رکھتے تھے؟ آج کل جو کافر ہیں وہ تو داڑھی نہیں رکھتے۔ تو اگر تراشیدہ داڑھی رکھ لی جائے تو کس قدر گناہ ہوتا ہے۔ اسلام میں ”خط“ کا کوئی تصور موجود ہے یا نہیں اور داڑھی فرض ہے یا

سنت اور اگر سنت ہے تو کیسی سنت؟ اور جو لوگ داڑھیاں نہیں رکھتے اسلام نے ان کے متعلق کیا وعید سنائی ہے؟ اہل سنت داڑھی کو مٹھی سے بڑھانا مکروہ اور اہل شیعہ حرام قرار دیتے ہیں، شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

(جواب) داڑھی رکھنے کے متعلق بخاری شریف کی حدیث صریح نص ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی کو بڑھانے کا حکم دیا ہے اور آپ نے خود داڑھی بڑھائی اور داڑھی کا کاٹنا اور منڈانا نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی اس کے علاوہ بھی کئی احادیث داڑھی بڑھانے اور اسے معاف کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ احادیث میں داڑھی کے متعلق ”وَاعْفُوا أَوْفُوا، وَقِرُّوا، أَرْجُوا، أَرْجُوا“ پانچ طرح کے الفاظ ملتے ہیں جنہیں امام نووی نے مسلم کی شرح میں اور قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ داڑھی کو اول روز سے رکھ لینا چاہیے، کاٹ چھانٹ اور منڈانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ صحابی رسول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا ذاتی عمل کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، مرفوع حدیث کے مقابل اس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ مذکورہ بالا احادیث کے الفاظ حدیث امر کے صیغے ہیں اور امر لغت عرب میں وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اسلام میں داڑھی رکھنا واجب ہے۔ اس کا خط بنوانے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اہل تشیع کے ہاں داڑھی تراشنا حرام ہے جیسا کہ علامہ محمد حسین نجفی نے اپنی کتاب ”حرمت ریش تراشی“ میں با دلائل واضح کیا ہے اور کئی ایک ائمہ اہل سنت کے ہاں داڑھی ایک مشمت ہونی چاہیے اور وہ آثار صحابہ سے دلیل لاتے ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ حدیث نبوی کے مقابلے میں اثر صحابی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ لہذا بہتر موقف یہی ہے کہ داڑھی بڑھائی جائے اللہ کے رسول ﷺ نے خود داڑھی بڑھائی بھی ہے اور بڑھانے کا حکم بھی دیا ہے اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ لہذا ہمیں بھی اس کی حد بندی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

خضاب لگانا

(سوال) خضاب لگانا کیسا ہے اور کیا سیاہ خضاب استعمال کرنا ممنوع اور حرام ہے؟ تفصیل سے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں۔

(جواب) رسول اکرم ﷺ اپنے بالوں کو خود بھی خضاب لگاتے تھے اور اس کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین اپنے سفید بالوں کو رنگا کرتے تھے۔ شریعت اسلامیہ میں سیاہ خضاب ممنوع و حرام ہے، اس کے علاوہ مہندی یعنی سرخ، زرد، سیاہی، مائل وغیرہ خضاب جائز و مشروع ہے۔ سیاہ رنگ کی ممانعت میں کئی ایک احادیث ہیں جن کو آئندہ بالتفصیل ذکر کیا جائے گا۔ پہلے آپ ﷺ کی خضاب کے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں:

① « عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ مَوْهَبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى أُمِّ سَلَمَةَ فَأَخْرَجَتْ إِلَيْنَا شَعْرًا مِنْ

شَعْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَخْضُوبًا بِالْحِنَّاءِ وَالْكَثْمِ » [بخاری، کتاب اللباس: باب ما يذكر

فی الشیب (۵۸۹۷)، مسند احمد (۲۹۶۱/۶)، الحاکم (۴۷۵/۱)، ابن ابی شیبہ (۴۳۴/۸)]

”عثمان بن عبداللہ نے کہا: ”میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا تو انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے بالوں سے ایک بال

نکالا جس کو مہندی اور کتم کا خضاب لگا ہوا تھا۔“

کتم ایک ایسی بوٹی ہے جو زم زمین میں اگتی ہے۔ اس کے پتے زیتون کی طرح ہوتے ہیں، چرخی وغیرہ پر چڑھ کر بلند ہوتی ہے، مروج کے دانے کی طرح اس کا پھل ہوتا ہے۔ اس کے اندر گٹھلی ہوتی ہے جب اسے کوٹا جائے تو رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کے پتوں کا عرق نکال کر ایک ادوق کی مقدار پیا جائے تو سخت تے آتی ہے۔ اگر کسی کو کتا کاٹ جائے تو اس کے علاج کے لیے مفید ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب اسے پانی میں ڈال کر پکایا جائے تو اس سے سیاہی نکلتی ہے جس سے لکھا جاتا ہے۔ [زاد المعاد (۳۶۶/۴)]

۲) « عَنْ أَبِي رَمْثَةَ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ قَدْ لَطَخَ لِحْيَتَهُ بِالْحِجَاءِ »

[ابو داؤد، کتاب الترجل: باب فی الحضاب (۴۲۰۸)، احمد (۱۶۳/۴)، نسائی (۱۴۰۸)]

”ابو رمثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ نے اپنی داڑھی مبارک کو مہندی لگائی ہوئی تھی۔“

۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« وَ أَمَّا الصُّفْرَةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْبِغُ بِهَا فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَصْبِغَ

بِهَا » [بخاری، کتاب الوضوء: باب غسل الرجلین فی النعلین (۱۶۶)، احمد (۱۷۱۲)، مسلم (۱۱۸۷)،

ابو داؤد (۱۷۷۲)، ابن ماجہ (۳۶۲۶)، ابن ابی شیبہ (۴۴۳/۸)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ زرد رنگ کا خضاب لگاتے تھے، میں بھی یہی پسند کرتا ہوں۔“

انس رضی اللہ عنہ سے مروی جس روایت میں آپ ﷺ کے خضاب کی نفی ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ رقمطراز ہیں:

” وَ حَاصِلُهُ أَنَّ مَنْ جَزَمَ أَنَّهُ حَضَبَ أَنَّهُ حَضَبَ كَمَا فِي ظَاهِرِ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ وَ كَمَا فِي حَدِيثِ ابْنِ

عُمَرَ الْمَاضِي قَرِيبًا أَنَّهُ حَضَبَ بِالصُّفْرَةِ حَكِي مَا شَاهَدَهُ وَ كَانَ ذَلِكَ فِي بَعْضِ الْأَحْيَانِ وَ

مَنْ نَفَى ذَلِكَ كَانَسَ فَهُوَ مُحْمُولٌ عَلَى الْأَكْثَرِ الْأَغْلَبِ مِنْ حَالِهِ « [فتح الباری (۳۰۴/۱۰)]

”خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس نے بالجزم یہ بات کی کہ آپ ﷺ نے خضاب لگایا جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ظاہر حدیث

میں ہے اور جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے زرد خضاب لگایا، جو قریب ہی پیچھے گزری

ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انھوں نے مشاہدہ کیا بیان کر دیا اور یہ کبھی کبھی ہوتا تھا اور جس نے انس رضی اللہ عنہ کی طرح

خضاب کی نفی کی ہے وہ اکثر اور اغلب حالت پر محمول ہے۔“

مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کبھی کبھی خضاب بھی لگایا کرتے تھے اور اکثر نہیں لگاتے تھے۔ علامہ ابن قیم رضی اللہ عنہ رقمطراز ہیں:

” فَإِنْ قِيلَ قَدْ نَبَتَ فِي الصَّحِيحِ عَنْ أَنَسٍ أَنَّهُ قَالَ لَمْ يَخْتَضِبِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قِيلَ: قَدْ أَجَابَ أَحْمَدُ ابْنَ حَنْبَلٍ عَنْ هَذَا وَقَالَ: قَدْ شَهِدَ بِهِ غَيْرُ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى

النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ حَضَبَ وَ لَيْسَ مَنْ شَهِدَ بِمَنْزِلَةٍ مَنْ لَمْ يَشْهَدْ فَأَحْمَدُ أَتَبَت

حِضَابَ النَّبِيِّ وَ مَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ وَ مَالِكٌ أَنْكَرَهُ « [زاد المعاد (۳۶۷/۴)]

”اگر یہ کہا جائے کہ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب نہیں لگایا تو کہا جائے گا اس کا جواب امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ نے کہا: ”انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ (ام سلمہ، ابو رمحہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما) نے نبی ﷺ کے خضاب کی شہادت دی ہے اور جس نے مشاہدہ کیا، وہ مشاہدہ نہ کرنے والے کی منزلت پر نہیں ہو سکتا (یعنی مشاہدہ کرنے والے کی بات زیادہ قابل قبول ہوگی)۔“ امام احمد رضی اللہ عنہ نے اور ان کے ساتھ محدثین کی ایک جماعت نے نبی ﷺ کا خضاب ثابت کیا ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ نے اس بات کا انکار کیا ہے۔“

امام مالک رضی اللہ عنہ کی یہ بات درست نہیں کیونکہ صحیح سند کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے خضاب لگایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے، علاوہ ازیں خضاب لگانے میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت بھی ہے اور اس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَعْفُوا اللَّحْيَ وَخُذُوا الشَّوَارِبَ غَيْرَ وَاشْتَبِهُوا وَلَا تُشَبِّهُوا بِالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى» [احمد (۳۵۶۱۲)]

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”داڑھیاں بڑھاؤ، مونچھیں ترشواؤ اور اپنی سفیدی کو بدلو اور یہود و نصاریٰ کی مشابہت نہ کرو۔“

یہی حدیث مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

«إِنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى لَا يَصْبِغُونَ فَخَالِفُوهُمْ» [بخاری، کتاب أحاديث الانبياء: باب ما ذكر عن بني اسرائيل (۳۴۶۲) و کتاب اللباس: باب الخضاب (۵۸۹۹)، مسلم، کتاب اللباس والزينة (۲۱۰۳)، ابو داؤد، کتاب الترجل: باب في الخضاب (۴۲۰۳)، ابن ماجه (۳۶۲۱) نسائي (۵۰۷۴)، احمد (۲۴۰۱۲-۳۰۹)، ابن ابی شيبه (۴۳۱/۸)، عبد الرزاق (۱۵۴/۱۱)]

”بلاشبہ یہود و نصاریٰ (اپنے بالوں کو) نہیں رنگتے، تم ان کی مخالفت کرو۔“

جس رنگ کا خضاب لگانا جائز ہے اس کے متعلق چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَشِيخَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ بِيضَ لِحَاهُمْ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! حَمِّرُوا وَصَفِّرُوا وَخَالِفُوا أَهْلَ الْكِتَابِ» [مسند احمد (۲۶۴/۵)]

”رسول اللہ ﷺ انصار کے بوڑھے افراد جن کی داڑھیاں سفید تھیں، کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”اے انصار کی جماعت! (داڑھیاں) سرخ اور زرد کرو اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔“

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [فتح الباری (۳۵۴/۱۰)]

علامہ عینی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ [عمدة القاری (۵۰/۲۲)]

② «عَنْ أَبِي ذَرِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَحْسَنَ مَا

غَيْرْتُمْ بِهِ الشَّيْبَ الْحِنَاءَ وَ الْكُتْمُ» [ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی الخضاب (۴۲۰۴)، ترمذی، کتاب اللباس، باب ما جاء فی الخضاب (۱۷۵۳)، ابن ماجہ (۳۶۲۲)، مسند احمد (۱۵۴۱۵)، نسائی (۵۰۸۴)، عبد الرزاق (۱۵۳/۱۱)، ابن ابی شیبہ (۴۳۳/۸)، موارد الظمان (۱۴۷۵)]

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک جس چیز کے ذریعے تم اپنی سفیدی کو بدلتے ہو ان میں سب سے عمدہ مہندی اور کتم ہے۔“

⑤ « عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ مَرَّ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَاءِ فَقَالَ مَا أَحْسَنَ هَذَا قَالَ فَمَرَّ آخَرَ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَاءِ وَ الْكُتْمِ فَقَالَ هَذَا أَحْسَنُ مِنْ هَذَا قَالَ فَمَرَّ آخَرَ قَدْ خَضَبَ بِالصُّفْرَةِ فَقَالَ : هَذَا أَحْسَنُ مِنْ هَذَا كُتْلِهِ »

[ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی الخضاب (۴۲۱۱)، ابن ماجہ (۳۶۲۷)، ابن ابی شیبہ (۴۳۲/۸)، طبقات ابن سعد (۴۴۰/۱)، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حید قرار دیا ہے۔ [التحقیق علی المشکاة (۱۲۶۶/۲)]

”ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک آدمی گزرا جس نے مہندی کا خضاب لگایا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ کس قدر اچھا ہے؟“ پھر ایک اور آدمی گزرا جس نے مہندی اور کتم ملا کر لگایا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ اس سے بھی اچھا ہے۔“ پھر ایک آدمی اور گزرا جس نے زرد خضاب لگایا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ ان سب سے اچھا ہے۔“

مذکورہ بالا روایات میں بعض میں مطلقاً خضاب لگانے کا حکم ہے لیکن رنگ کی قید نہیں اور بعض روایات میں رنگ کا ذکر موجود ہے تو شرعی اصول کی رو سے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ظہار کے کفارے میں گردن آزاد کرنے کا ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ﴾ [المحاذلة: ۳]

”جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کر لیں پھر اپنے قول کی طرف رجوع کریں تو ایک گردن آزاد کریں۔“

اس آیت میں مطلق گردن آزاد کرنے کا ذکر ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ وہ غلام مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح قسم کے کفارے میں بھی عام گردن کا ذکر ہے۔ لیکن قتل خطا کے کفارے میں ہے:

﴿ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاءً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ﴾ [النساء: ۹۲]

”جس نے کسی مومن شخص کو غلطی سے قتل کر دیا تو وہ ایک مومن غلام آزاد کرے۔“

اس آیت میں مومن غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔ لہذا پہلے دونوں کفاروں میں بھی مومن غلام ہی مراد ہوگا کیونکہ وہ مطلق ہیں، یہ آیت مقید ہے اور مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن احادیث میں صرف رنگنے کا ذکر ہے ان کو ان احادیث پر منطبق کیا جائے گا جن میں جائز رنگوں کا ذکر ملتا ہے۔ سیاہ خضاب لگانے سے منع کیا گیا ہے اور اس سے ممانعت

کے متعلق چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

① جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَتَى بَابِي قَحَافَةَ يَوْمَ فَتَحَ مَكَّةَ وَرَأْسُهُ وَ لِحْيَتُهُ كَالثُّغَامَةِ بَيَاضًا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرُوا هَذَا بِشَيْءٍ وَ اجْتَنِبُوا السَّوَادَ» [مسلم، كتاب اللباس والزينة: باب استحباب خضاب الشيب بصفرة أو حمرة و تحريمه بالسواد (٢١٠٢) نسائي (٥٠٨٩)، ابوداؤد (٤٢٠٤) ابن ماجه (٣٦٢٤)، ابن ابى شيبه (٤٣٢١٨)، عبد الرزاق (١٥٤١١)، حاكم (٢٤٤٣)، بيهقي (٣١٠٧)]

”فتح مکہ والے دن (ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد) ابو قحافہ کو لایا گیا۔ ان کا سر اور داڑھی سفید (سفید پھولوں والا ایک درخت) کی طرح سفید تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سفیدی کو بدلوا اور سیاہی سے اجتناب کرو۔“

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذْهَبُوا بِهِ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ فَلْيَغْيِرْهُ بِشَيْءٍ وَ اجْتَنِبُوا السَّوَادَ» [مسند احمد (٣١٦٣)]

”انہیں ان کی بعض عورتوں کی طرف لے جاؤ، وہ ان کی سفیدی کو بدلیں اور سیاہی سے بچو۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«وَ يَحْرُمُ خِضَابُهُ بِالسَّوَادِ عَلَى الْأَصَحِّ وَ قِيلَ يُكْرَهُ كَرَاهَةً تَنْزِيهًا وَ الْمُخْتَارُ التَّحْرِيمُ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ اجْتَنِبُوا السَّوَادَ» [شرح مسلم للنووی (١٩٩٢)]

”سب سے صحیح قول کے مطابق سیاہ خضاب حرام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیاہ خضاب مکروہ تنزیہی ہے۔ مختار قول حرمت کا ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سیاہ خضاب سے بچو۔“

علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«فَقَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اجْتَنِبُوا السَّوَادَ دَلِيلٌ وَاضِحٌ عَلَى النَّهْيِ عَنِ الْخِضَابِ بِالسَّوَادِ» [تحفة الأحوذی (٥٧٣)]

”آپ ﷺ کا فرمان ”سیاہی سے بچو“ سیاہ خضاب کی حرمت پر واضح دلیل ہے۔“

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ إِنَّ الْمَأْدُونَ فِيهِ مُقَيَّدٌ بِغَيْرِ السَّوَادِ لِمَا أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «غَيْرُوهُ وَ اجْتَنِبُوا السَّوَادَ» [فتح الباری (٤٩٩٦)]

”سیاہ خضاب کے علاوہ خضاب لگانے کی اجازت ہے، اس لیے کہ امام مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کی سفیدی کو بدلوا اور اسے سیاہی سے بچاؤ۔“

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”المجموع“ میں فرماتے ہیں:

”اتَّقُوا عَلِيَّ دَمَ خِضَابِ الرَّأْسِ وَ اللَّحْيَةِ بِالسَّوَادِ“ [المجموع شرح المہذب (۳۲۳/۱)]
 ”سر اور داڑھی کے بالوں کو سیاہ خضاب لگانے کی مذمت پر محمدین کا اتفاق ہے۔“

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

”وَ الصَّحِيحُ بَلَى الصَّوَابُ أَنَّهُ حَرَامٌ“ [المجموع شرح المہذب (۳۲۳/۱)]
 ”صحیح بلکہ درست یہ ہے کہ سیاہ خضاب حرام ہے۔“

علامہ سفارینی نے نقل کیا ہے:

”وَ يُكْرَهُ بِالسَّوَادِ إِتِّفَاقًا نَصَّ عَلَيْهِ“ [شرح ثلاثیات مسند احمد (۵۳/۲)]
 ”سیاہ خضاب کی کراہت پر اتفاق ہے، اس پر نص شرعی موجود ہے۔“

② انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”غَيِّرُوا الشَّيْبَ وَ لَا تَقْرَبُوهُ السَّوَادَ“ [مسند احمد (۲۴۷/۳)، صحیح الجامع الصغیر (۴۱۶۹)]
 ”سفید بالوں کو بدلو اور ان کو سیاہی کے قریب نہ کرو۔“

③ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”كُنَّا يَوْمًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَتْ عَلَيْهِ الْيَهُودُ فَرَأَاهُمْ يَبِضُّ اللَّحْيَ فَقَالَ مَا لَكُمْ لَا تُغَيِّرُونَ فِقِيلٌ إِنَّهُمْ يَكْرَهُونَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَكِنَّكُمْ غَيَّرُوا وَ إِيَّامِي وَ السَّوَادَ“ [مجمع الزوائد (۱۶۰/۵) طبرانی (۱۶۳/۵) امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے]
 ”ہم ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہودی آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سفید داڑھیاں دیکھ کر فرمایا: ”تمہیں کیا ہے تم انہیں رنگتے کیوں نہیں؟“ کہا گیا کہ یہ نا پسند کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے مسلمانو! لیکن تم رنگ بدلو اور سیاہی سے بچتے رہو۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بالوں کی سفیدی کو بدلنے سے کراہت کرنا یہودیوں کا کام تھا۔ مسلمان سیاہ خضاب سے

اجتناب کرتا ہے اور دیگر خضاب پسند کرتا ہے۔

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”يَكُونُ قَوْمٌ يَخْضِبُونَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ بِالسَّوَادِ كَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ لَا يَرِيحُونَ رَائِحَةَ
 الْحَنَّةِ“ [مسند احمد (۲۷۳/۱)، بیہقی (۳۱۱/۷)، ابو داؤد، کتاب الترجل: باب فی الخضاب (۴۲۱۲)]
 ”آخر زمانے میں ایک قوم ہوگی جو کبوتر کے پٹوں کی طرح سیاہ خضاب لگائیں گے، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیں گے۔“

یہ حدیث بھی سیاہ خضاب کی ممانعت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں شدید وعید ہے۔

⑤ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«يَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ يُسْوَدُونَ أَشْعَارَهُمْ لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَيْهِمْ» [مجمع الزوائد (۱۶۴/۵)]

طبرانی اوسط (۳۸۱۵)، اس کی سند حید ہے]

”آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے بال سیاہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے۔“

⑥ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَضَبَ بِالسَّوَادِ سَوَدَ اللَّهُ وَجْهَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [مجمع الزوائد (۱۶۶/۵)]

”جس شخص نے سیاہ خضاب لگایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ سیاہ کر دے گا۔“

مذکورہ بالا چھ احادیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ خضاب کی شریعت میں بڑی مذمت آئی ہے اور اس پر شدید وعید فرمائی گئی۔

اس لیے یہ حرام ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔ [الزواجر (۲۶۱/۱)]

علاوہ ازیں داڑھی یا سر کے بالوں کو شادی بیاہ یا کسی کاروباری سلسلے کے لیے سیاہ کرنا دھوکا اور فراڈ ہے۔ اپنے بڑھاپے کو

چھپانا، جوانی ظاہر کرنا ہے، دھوکا دہی اور اصلیت چھپانا بھی شرع محمدی میں حرام ہے۔ جو لوگ سیاہ خضاب نکاح یا جہاد کے

موقع پر لگانے کا جواز پیش کرتے ہیں وہ ابن ماجہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ أَحْسَنَ مَا اخْتَضَبْتُمْ بِهِ لَهَذَا السَّوَادِ أَرَعَبَ لِنِسَائِكُمْ فِيمَكُمْ وَ أَهْيَبَ لَكُمْ فِي صُدُورِ

عَدُوِّكُمْ» [ابن ماجہ، کتاب اللباس : باب الخضاب بالسواد (۳۶۲۵)]

”بہترین خضاب جو تم لگاتے ہو وہ سیاہ رنگ کا ہے، جس سے تمہاری عورتیں تمہاری طرف زیادہ رغبت رکھیں اور

تمہارے دشمن کے سینوں میں یہ ہیبت ناک ہے۔“

یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی چند جوہات ہیں:

① رفاع بن دغفل سدوسی راوی اس کی سند میں ضعیف ہے۔

② عبد الحمید بن صلی لین الحدیث ہے۔ اس سند کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”بعض راویوں کا بعض

سے سماع معروف نہیں۔“ لہذا یہ روایت کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی۔

چاندی کی انگٹھی پہننا

(سوال) کیا چاندی کی انگٹھی پہننا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہننے یا بائیں ہاتھ کی انگلی میں؟

(جواب) مرد و عورت کسی کے لیے بھی چاندی کی انگٹھی پہننے میں کوئی حرج نہیں، دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں

پہنی جاسکتی ہے مگر دانے ہاتھ میں پہننا زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ بانس کے مقابلہ میں دایاں بہتر اور افضل ہے۔ لیکن مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی یا گھڑی پہننا جائز نہیں ہے، یہ صرف عورتوں کے لیے خاص ہے۔ اس لیے کہ رسول ﷺ سے ایسی بہت سی حدیثیں مروی ہیں جو مردوں کے لیے سونے اور ریشم کی حرمت اور عورتوں کے لیے ان کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں۔

گھڑی باندھنا

(سوال) ہاتھ میں گھڑی باندھنے کا کیا حکم ہے؟ بہت سے لوگ یہ سمجھ کر کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے ہمیں گھڑی باندھنے سے منع کرتے ہیں؟

(جواب) میں گھڑی پہننے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، اس میں عورتوں سے مشابہت کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ عورتوں اور مردوں کی گھڑیاں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر ایک جیسی بھی ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں، بالکل اسی طرح جس طرح عورتوں اور مردوں کی انگوٹھی مشترک ہوتی ہے اور دونوں کے لیے پہننا درست ہے۔ اس کے علاوہ گھڑی باندھنے کا مقصد زیب و زینت نہیں ہوتا بلکہ اوقات جاننے کے لیے باندھی جاتی ہے۔

عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا

(سوال) عورت کا خوشبو لگا کر باہر نکلنا کیسا ہے؟

(جواب) اگر اس کو عورتوں کے اجتماع میں شرکت کے لیے جانا ہو اور راستے میں مردوں کے قریب سے گزرتا پڑے تو اس کے لیے خوشبو استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور ایسے بازاروں میں جہاں مرد ہوں معطر ہو کر جانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”کوئی بھی عورت خوشبو استعمال کر کے ہمارے ساتھ نماز عشاء میں شریک نہ ہو۔“ [صحیح مسلم، کتاب الصلاة:

باب خروج النساء الى المساجد (۴۴۴)]

اس معنی کی اور بھی حدیثیں ہیں۔ ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کا معطر ہو کر ان راستوں پر چلنا جہاں مرد ہوتے ہیں اور مردوں کے اجتماع میں جانا، جیسے مساجد وغیرہ ہیں، فتنہ کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس کے برخلاف پردہ کا اہتمام کرنا اور زیب و زینت کی نمائش سے بچنا عورت پر واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہارِ قبح کرتی تھیں اس طرح زینت نہ

دکھاؤ۔“ (الاحزاب: ۳۳)

مثلاً چہرہ اور سر وغیرہ کی بے پردگی بھی نمائشِ زیب و زینت میں داخل ہے۔

فیشن کے لیے ناخن بڑھانا

سوال عورتوں اور مردوں کا فیشن کے لیے ناخن بڑھانا کیا ہے؟

جواب عورتوں اور مردوں کے لیے ناخن تراشنا فطرت میں سے ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَاعْفَاءُ اللَّحْيَةِ وَالسِّوَاكِ وَاسْتِنْسَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْأَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَتَنْفُ الْإِبْطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ قَالَ زَكَرِيَّا قَالَ مُصْعَبٌ وَ نَسِيْتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمَضْمُضَةُ» [مسلم، کتاب الطہارۃ: باب حصال الفطرۃ (۲۶۱)]

”دس اشیاء فطرت میں سے ہیں: مونچھیں تراشنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، شرمگاہ کے اردگرد سے بال موٹنا اور پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔“

زکریا بن ابی زائدہ کہتے ہیں کہ مصعب بن شبیب نے کہا: ”میں دسویں بات بھول گیا ہوں، ہو سکتا ہے وہ کلی کرنا ہو۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ناخن تراشنا فطرت میں سے ہے۔ ہر مسلمان مرد و زن کو اپنے ناخن بڑھانے کی بجائے تراشنے چاہئیں۔ جو لوگ ناخن بڑھاتے ہیں ان کا یہ عمل خلاف فطرت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی حد چالیس دن مقرر فرمائی ہے یعنی چالیس دن کے اندر اندر ناخن تراش لینے چاہئیں۔ اُس ﷺ نے بیان کیا:

«وَوَقْتُ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ وَتَقْلِيمِ الْأَظْفَارِ وَتَنْفِ الْإِبْطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ أَنْ لَا نَتْرُكَ أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً» [مسلم، کتاب الطہارۃ: باب حصال الفطرۃ (۲۵۸)]

”ہمارے لیے مونچھیں تراشنے، ناخن کاٹنے، بغلوں کے بال اکھیڑنے اور شرمگاہ کے اردگرد کے بال موٹنے کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ نہ چھوڑیں۔“

لہذا کسی مسلمان مرد یا عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے ناخن چالیس دنوں سے زیادہ تک ترک کر دے بلکہ چالیس دن کے اندر اندر یہ تراش دینے چاہئیں۔ جن لوگوں نے فیشن کے لیے ناخن بڑھا رکھے ہیں اور انھیں تراشنے سے جی چراتے ہیں انھیں اپنے عمل پر توجہ دینی چاہئیں، اگر ہم ان فطری امور کا لحاظ نہیں رکھتے تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں ظاہری طور پر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ شریعت اسلامیہ نے داڑھی بڑھانے، مونچھیں کاٹنے اور ناخن تراشنے وغیرہ جیسے احکام مقرر کر کے مسلمان کا غیر مسلم سے عملی فرق واضح کر دیا ہے۔ لہذا ان امور سے غفلت برتنا اپنی پہچان کھودینا ہے۔

راہ چلتے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

سوال کیا راستے میں چلتے ہوئے اگر کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو فوراً نظر پھیر لینا چاہیے یا نہیں اور حدیث میں ہے کہ پہلی نظر

معاف ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

(جواب) نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر کبھی جاتی ہے، غلط نظر انسان کو گمراہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔ اسی لیے اسے آنکھ کا زنا بھی کہا گیا ہے۔ لہذا اس کے استعمال میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ قرآن حکیم میں نظر کو نیچا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ اسے بچا کر رکھا جائے۔ اگر راستے میں چلتے چلتے کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو اسے فوراً پھیر لینا چاہیے نہ کہ کنگلی باندھ کر مسلسل دیکھتے جائیں۔ نظر کے پیچھے نظر لگائے رکھنا حرام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”نظر کے پیچھے نظر نہ لگاؤ۔“ [ابوداؤد، کتاب النکاح: باب ما یؤمر بہ من غص بصر (۲۱۴۸)]

اسی طرح مسند احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اچانک نظر کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا: ”اپنی نگاہ کو پھیر لو۔“ [مسند احمد (۳۶۱/۴)]

یہ حدیث اس بات پر نص صریح ہے کہ نظر پڑ جائے تو پہلی بار ہی دیکھتے نہیں رہنا چاہیے بلکہ فوراً نگاہ پھیر لینی چاہیے۔ اگر ہر شخص یہ خیال کرے کہ اس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی پر اگر کوئی شخص اس طرح نظر ڈالے رہے تو کیا وہ اس بات کو پسند کرے گا؟ جواب نفی میں ہوگا۔ جب ایماندار شخص اپنے گھر کی خواتین کے بارے میں یہ پسند نہیں کرتا تو دوسرے شخص کی ماں، بہن وغیرہ کے بارے میں بھی اسی طرح محتاط رہنا چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ صحیح شرم و حیا کی دولت سے مالا مال رکھے اور نظر کی پراگندگی سے محفوظ رکھے۔ (آمین!)

شادی شدہ عورت کے لیے باپ کی اطاعت

(سوال) اگر کسی عورت کا باپ اسے اپنے خاوند کے ہاں جانے سے روکے تو کیا عورت پر اپنے باپ کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں، نیز اس کا باپ شرعی لحاظ سے مجرم ہے یا نہیں؟

(جواب) کسی بھی عورت کے باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کے خاوند کے پاس جانے سے روکے اور اگر باپ منع کرے تو عورت پر باپ کی بات ماننا ضروری نہیں۔ کیوں کہ نکاح کے بعد عورت پر زور و اختیار اس کے شوہر کا ہوتا ہے اور باپ شرعی عذر کے بغیر روکنے پر گناہ گار اور مجرم ہوگا۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم میں سے ہر شخص راہی و نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی..... عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران اور راعیہ ہے، اس سے بھی اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“

[مسلم، کتاب الإمارة: باب فضیلة الأمير العادل و عقوبة الجائر (۱۸۲۹)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار بن جاتی ہے اور اس سے گھر کے متعلق

پوچھ گچھ ہوگی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا:

”عورت پر لوگوں میں سے سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”اس کے خاوند کا۔“ میں نے کہا: ”آدمی پر لوگوں میں سے زیادہ حق کس کا ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس

کی ماں کا۔“ [کشف الاستار عن زوائد البزار (۱۴۶۲)، نسائی کبریٰ (۱۷۴/۳)، عشرة النساء (۲۶۶)]

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب عورت پانچ نمازیں ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی

اطاعت کرے تو اسے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہتی ہے گزر جاؤ۔“ [مسند احمد (۱۹۱/۱)]

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ عورت پر سب سے زیادہ حق اس کے خاوند کا ہے اور اگر خاوند کی اطاعت کرتی ہے تو

جنت کے سب دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ حصین حصن کہتے ہیں کہ میری پھوپھی نے مجھے حدیث بیان کرتے

ہوئے بتایا:

”میں نبی کریم ﷺ کے پاس کسی ضرورت کے تحت گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم خاوند والی ہو؟“ میں نے کہا:

”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے کہا: ”تم اس کے حق میں کیسی ہو؟“ کہنے لگیں: ”میں نے اس کے حق میں کبھی کوتاہی نہیں

کی سوائے اس کام کے جس کے کرنے میں عاجز آجاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اس کی نسبت کہاں ہو، وہ

تمھاری جنت اور جہنم ہے۔“ [المستدرک للحاکم (۵۴۸/۲)، (۱۸۹/۲)، (۲۸۶۹)]

یہ صحیح حدیث بھی خاوند کی اہمیت پر بڑی عیاں اور واضح ہے۔ لہذا عورت کو اپنے شوہر کی بات ماننا چاہیے اور اس کے باپ

کو اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

خوش طبعی

(سوال) دوست احباب کا آپس میں خوش طبعی کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ لہو و لعل کے زمرے میں آکر منع تو نہیں؟ وضاحت کریں۔

(جواب) دوست احباب کا آپس میں خوش طبعی کرنا اگر حقیقت پر مبنی ہو اور شریعت کا استہزاء و مذاق نہ ہو تو بالکل درست ہے۔

نبی کریم ﷺ خود بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ انس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی ابو عمیر کے پاس ایک

سرخ چوچ والا پرندہ تھا، جس کے ساتھ وہ کھیلتا تھا، جب وہ پرندہ مر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے کہا:

”سرخ چوچ والے پرندے نے کیا کیا؟“ [بخاری، کتاب الأدب: باب الانبساط إلی الناس (۶۱۲۹)، مسلم،

کتاب الأدب: باب جواز تکنیة من لم یولد (۲۱۵۰)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا:

”اے اللہ کے رسول! یقیناً آپ بھی ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔“

[ترمذی، کتاب البر والصلۃ: باب ما جاء فی المزاح (۱۹۹۰)]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے لیے اونٹ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہم تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے۔“ اس نے کہا: ”میں اونٹنی کا بچہ کا کیا کروں گا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر اونٹ کسی نہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔“ [ابوداؤد، کتاب الأدب: باب ما جاء فی المزاح (۴۹۹۱)، ترمذی کتاب البر والصلۃ:

باب ما جاء فی المزاح (۱۹۹۱)]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انس رضی اللہ عنہ سے کہا:

« يَا ذَا الْأُذُنَيْنِ! » «اے کانوں والے!»

[ترمذی، کتاب البر والصلۃ (۱۹۹۲)، ابوداؤد، کتاب الأدب (۵۰۰۲)]

الغرض ایسی خوشی طبعی جو جھوٹ پر مبنی ہو وہ جائز نہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”اس آدمی کے لیے بربادی ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے بربادی ہے۔“

[ابوداؤد، کتاب الأدب: باب التشدید فی الکذب (۴۹۹۰)، ترمذی، کتاب الزہد: باب ما جاء من تکلم

بالکلمة یضحک الناس (۲۳۱۵)]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بلوغ المرام (۱۵۳۳) میں فرماتے ہیں: ”اس کی سند قوی ہے۔“ لہذا جھوٹ کہنے سے اجتناب کرنا

چاہیے۔



WWW.KITABOSUNNAT.COM

KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

چند اہم مسائل کا بیان

WWW.KITABOSUNNAT.COM

شادی کرنے میں بھی والدین کی اطاعت

(سوال) میں ایک شیبہ (شوہر دیدہ) سے شادی کا خواہش مند ہوں، میرے والد راضی ہیں، لڑکی اور اس کے اہل خانہ بھی راضی ہیں، صرف میری والدہ راضی نہیں ہیں، وہ اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہیں، کیا میں اپنی والدہ کی پسند و ناپسند کی پروا کیے بغیر اس عورت سے شادی کر سکتا ہوں؟ کیا شادی کر لینے کے بعد میں اپنی والدہ کا نافرمان کہلاؤں گا یا نہیں؟

(جواب) والدہ کا بہت بڑا حق ہے اور اس سے حسن سلوک سے پیش آنا ایک اہم فریضہ ہے، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ جس عورت کو آپ کی والدہ ناپسند کرتی ہیں اس سے شادی نہ کریں، اس لیے کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ آپ کی خیر خواہ ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں اس عورت کے اخلاق سے متعلق ایسی باتوں کا علم ہو جو آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ ویسے آپ کو اس کے علاوہ بھی بہت سی عورتیں مل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [طلاق: ۳، ۲]

”جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔“

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ والدہ کی دل جوئی و فرمانبرداری تقویٰ میں سے ہے، الا یہ کہ والدہ دیندار نہ ہو اور مطلوبہ دیندار اور تقویٰ والی ہو۔ اگر بات ایسی ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر اس معاملہ میں آپ پر والدہ کی اطاعت لازم نہیں ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ» [بخاری، کتاب الأحكام: باب السمع والطاعة: (۷۱۴۵)]

”اطاعت صرف نیک کاموں میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو ایسے کام کرنے کی توفیق دے جس سے وہ راضی ہو نیز جو چیز آپ کے حق میں مفید ہو اور آپ کے دین و دنیا کے لیے کارآمد ہو اسے آپ کے لیے آسان بنا دے۔ [ابن ہازم]

ولدیت تبدیل کرانے کا حکم

(سوال) بیرون ملک ملازمت کے لیے ولدیت تبدیل کرانے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) زمانہ جاہلیت سے رواج چلا آ رہا تھا جو ابتدائے اسلام میں بھی موجود رہا کہ لوگ لے پالکوں کو حقیقی بیٹا سمجھتے تھے اور انہیں حقیقی بیٹوں کی مانند حقوق حاصل تھے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے لے کر پالا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہیں زید بن محمد رضی اللہ عنہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل کی:

﴿ اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَمْ تَعْلَمُوْا اَبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَ مَوَالِيكُمْ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الاحزاب: ۵]

”لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف منسوب کر کے بلاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے۔ اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں اور جو تم سے بھول چوک ہو جائے اس میں تم پر گناہ نہیں، البتہ گناہ وہ ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔“ [بخاری، کتاب التفسیر: باب ادعواہم لآباءہم ہو اقسط عند اللہ (۴۷۸۲)، مسلم، کتاب فضائل الصحابة: باب فضائل زید بن حارثہ و أسامة بن زید (۲۴۲۵)، تحفة الأحوذی (۵۸/۹)]

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو جو حضرت حذیفہ ابن عتبہ کی بیوی تھیں، رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگی: ”ابو حذیفہ کا غلام سالم ہمارے پاس آتا ہے اور میں کام کاج کے لباس میں ہوتی ہوں، ہم اسے بیٹا سمجھتے ہیں۔“ ابو حذیفہ نے اسے اسی طرح چھٹی بنا رکھا تھا جیسے رسول اللہ ﷺ نے زید کو بیٹا بنایا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔

﴿ اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الاحزاب: ۵]

”لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے۔“ [بخاری، کتاب النکاح: باب الإكفاء فی الدین (۵۰۸۸)، ابو داؤد (۲۰۶۱)، ابن الجارود (۶۹۰)، موطا مالك (۶۰۵/۲)، دارمی (۸۱/۲)، عبد الرزاق (۴۰۹/۷)، مسند احمد (۲۰۱/۶)، صحیح ابن حبان (۴۲/۲)، بیہقی (۴۰۹/۷)، مسلم (۱۴۵۳)، ابن ماجہ (۱۹۴۳)، مسند حمیدی (۲۷۸)]

اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد رضی اللہ عنہ نہیں کہا جاتا تھا بلکہ انہیں ان کے باپ حارثہ ہی کی طرف منسوب کر کے پکارا جاتا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جاہلی رسم کی ممانعت کر دی اور ساری نسبتیں ختم کر کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے بلانے کا حکم دیا۔ جس کی نسبت کا علم نہیں تو انہیں بیٹا کہنے کی بجائے بھائی اور دوست کہنا چاہیے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

« أَنْتَ أَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا » [بخاری، کتاب المغازی: باب عمرة القضاء (۴۲۵۱)، مسند احمد (۱۱۵/۱)، شرح السنة (۱۴۰/۱۴)، بیہقی (۶/۸)، مستدرک حاکم (۱۲۰/۳)]

”تم ہمارے بھائی اور دوست ہو۔“

جو شخص جان بوجھ کر غلط انتساب کرے گا وہ سخت گناہ گار ہوگا۔ حضرت علیؓ کے صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے:

«وَمَنْ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ أَوْ اتَّكَمَى إِلَى غَيْرِ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا» [مسلم، کتاب الحج: باب المدينة حرم بین عمیر الی ثور (۱۳۷۰)، ترمذی (۲۱۲۰)، ابن ماجہ (۲۶۰۹)، مسند احمد (۳۲۸/۱)، مسند ابی یعلیٰ (۲۵۴۰)، ابو داؤد (۵۱۱۵)]

”جس شخص نے اپنے باپ کے علاوہ کی طرف نسبت کی یا جس غلام نے اپنے موالی (جنہوں نے اسے آزاد کیا) کے علاوہ نسبت کی اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہو، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس سے نفلی اور فرض کوئی عبادت قبول نہیں کرے گا۔“

نبی کریم ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيهِ فَالْحَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ» [بخاری، کتاب الفرائض: باب من ادعی الی غیر ابیہ (۶۷۶۶)، وفی کتاب المغازی (۴۳۲۶، ۴۳۲۷)، ابن ماجہ (۲۶۱۰)، مسند طیالسی (۱۹۹)، عبد الرزاق (۱۶۳۱۰)، (۱۶۳۱۳)، ابن ابی شیبہ (۸۲۵/۸)، مسند احمد (۱/۱۶۹)، مسند عبد بن حمید (۱۳۵)، ابو داؤد (۵۱۱۳)، مسند ابی یعلیٰ (۷۰۰)، مسند ابو عوانہ (۱/۲۹)، شرح السنة (۲۳۷۶)]

”جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا بھی ہے کہ وہ میرا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔“

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ لَمْ يَرَحْ رَائِحَةَ الْحَنَّةِ وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ خَمْسِ مِائَةِ عَامٍ» [ابن ماجہ، کتاب الحدود: باب من ادعی الی غیر ابیہ او تولى غیر موالیہ (۲۶۱۱)، مسند احمد (۱۷۱/۲)، مسند طیالسی (۲۲۷۴)]

”جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا اور بلاشبہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے پائی جائے گی۔“

حضرت ابو ذرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«لَيْسَ مِنْ رَجُلٍ ادَّعَى لِغَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُهُ إِلَّا كَفَرَ بِاللَّهِ وَمَنْ ادَّعَى قَوْمًا لَيْسَ لَهُ فِيهِمْ نَسَبٌ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [مسلم، کتاب الایمان: باب بیان حال ایمان من قال لأخيه المسلم یا کافر! (۶۱)، مسند احمد (۱۶۶/۵)]

”جو شخص جانتے ہوئے بھی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسبت کی اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور جس نے

کسی ایسی قوم میں سے ہونے کا دعویٰ کیا جس قوم میں اس کا نسب نہیں ہے تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔“
مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

” (إِدْعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ « أَى نَسَبَهُ إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ «إِلَّا كَفَرَ» كُفْرًا مُخْرَجًا عَنِ الْإِسْلَامِ إِنْ كَانَ مُسْتَحِلًّا لَهُ وَإِلَّا فَقَدْ كَفَرَ النِّعْمَةَ وَالْإِحْسَانَ وَحَقَّ اللَّهُ وَحَقَّ أَبِيهِ وَهَذَا كَمَا قَالَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النِّسَاءِ يَكْفُرُنَّ ثُمَّ خَسِرَهُنَّ بِكُفْرَانِهِنَّ الْإِحْسَانَ وَ كُفْرَانَ الْعَشِيرِ “
[منة المنعم (۱/۹۱)]

” جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف حلال سمجھتے ہوئے نسبت کی تو اس نے ایسے کفر کا ارتکاب کیا جو اسلام سے خارج کرنے والا ہے اور اگر ایسے نہیں ہے تو اس نے نعمت، احسان، اللہ کے حق اور اپنے باپ کے حق سے کفر کیا ہے یعنی کفران نعمت کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے کفر کے بارے میں فرمایا پھر اس کی تفسیر کفران احسان اور کفران عشیر سے کی۔“

مذکورہ بالا آیت اور صحیح و صریح احادیث سے معلوم ہوا کہ کسی بھی شخص کے لیے اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کرنا حلال نہیں، جو شخص جانتے بوجھتے اپنے آپ کو کسی کی طرف منسوب کرے تو وہ کفر صریح کا مرتکب ہوتا ہے اور جس شخص کے باپ کا علم نہ ہو اسے بیٹا کہنے کی بجائے بھائی یا دوست کہا جائے۔ البتہ اگر کوئی کسی چھوٹے کو محبت اور پیار سے بیٹا یا بھتیجا کہے تو وہ الگ بات ہے۔

مذکورہ بالا آیت اور احادیث اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو خواہ اپنے ملک میں یا بیرون ملک، کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے دلیل لینا بالکل غلط ہے کیونکہ آیت کے نزول کے بعد زید بن محمد رضی اللہ عنہ نہیں کہا جاتا تھا۔ احکامات منسوخہ سے استدلال کرنا بالکل مردود ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ظاہر بات کہنے سے دلیل لینا بھی بالکل غلط اور باطل ہے اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی تصریح فرمادی ہے کہ غیر باپ کی طرف جان بوجھ کر نسبت کرنے والا کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

دوسرے ملک میں کاروبار کی غرض سے ولدیت بدل کر جانے کو ابراہیم علیہ السلام کے معاملہ سے ذرہ بھر بھی علاقہ نہیں ہے۔ بخاری شریف کی مذکورہ حدیث اس امر پر بالکل واضح ہے کہ نسبت بدلنا حرام ہے۔

توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی اصل ولدیت اپنے کاغذات پر تحریر کرے، اپنے کیے پر ندامت اختیار کرے اور اللہ کے حضور سچے دل سے معافی چاہے کیونکہ سچی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ پچھلے گناہ کو ترک کرے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے اور اپنے کیے پر ندامت اختیار کر کے اللہ سے استغفار کر لے۔

جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاض الصالحین میں توبہ کے باب میں ذکر کیا ہے۔ اپنے کاغذات میں اپنی اصل ولدیت تحریر کرنا ضروری ہے۔ جان بوجھ کر غلط ولدیت لکھنے کے متعلق اوپر ذکر کردہ احادیث پر غور کر لیں۔ اگر اصل ولدیت تحریر نہ کر سکے اور وہاں رہ کر اسلامی احکامات کا اظہار نہ کر سکے تو ایسا شخص اپنے وطن واپس آ جائے۔

علاوہ ازیں ایسے افراد کی دیگر ممالک میں رہ کر کمائی کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر وہاں رہ کر صحیح حلال کام و تجارت کرتے ہیں تو آمدنی حلال ہے بصورت دیگر حرام۔ یہ غلط ولدیت تحریر کرنے کی وجہ سے احادیث میں مذکور وعید کے مستحق ضرور ہیں لیکن ان کی کمائی پر حرمت کا حکم تب لگے گا جب وہ وہاں حرام کام کر کے اجرت لیں کیونکہ فعل حرام پر اجرت حرام ہے۔ جیسے شراب بنانا حرام ہے اور شراب بیچ کر اجرت لینا بھی حرام ہے۔ سود حرام ہے اور سود کے ذریعے کمائی کر کے کھانا بھی۔ حرام سودی معاملات میں تعاون کرنے والے کاتب اور گواہ بھی اس پر جو اجرت لیں گے، وہ حرام ہے۔ اسی طرح زنا حرام ہے اور زنا کی اجرت بھی۔ الغرض فعل حرام پر اجرت درست نہیں اور اگر فعل صحیح جائز اور شرعی ہے تو اس پر لی گئی اجرت درست ہے۔

اولاد کے نان و نفقہ کی ذمہ داری

(سوال) کیا گھریلو اخراجات اور اولاد کے نان و نفقہ کی ذمہ داری عورت پر ہے یا مرد پر؟

(جواب) عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اللہ نے مرد پر ڈالی ہے، عورت اگرچہ مال دار ہی کیوں نہ ہو وہ گھر کے اخراجات کی ذمہ دار نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں مرد کو وجہ سے حاکم قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ وہی فضیلت:

کہ اللہ نے مرد کو فطری طور پر ایسا بنایا ہے کہ اسے عورت پر درجہ و مقام حاصل ہے۔

۲۔ کسی فضیلت:

کہ مرد اپنا مال و متاع خرچ کرتا ہے اس مال کے خرچ کرنے کی وجہ سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”عورت کے لیے کھانا اور کپڑا عرف کے مطابق مہیا کرنا بیچ کے باپ پر فرض ہے۔“ [البقرہ: ۲۳۳]

ان دو آیات کریمہ سے واضح ہوا کہ مال خرچ کرنا، کھانا اور لباس فراہم کرنا مرد کی ذمہ داری ہے، اولاد کے باپ کا حق ہے کہ وہ بچوں کی ماں کو کھانا اور کپڑا لاکر دے۔ ہر مرد کی آمدنی کے لحاظ سے خرچ کا تعین کیا جائے گا، اگر مرد کے پاس اسباب و ذرائع زیادہ ہیں تو اس کا حق ہے کہ وہ اپنی دولت کے لحاظ سے عورت کو سہولتیں دے اور جس طرح کا کھانا پینا اور لباس خود پسند کرتا ہے بیوی کو بھی اسی حساب سے دے اور اگر کوئی مرد تنگ دست ہے تو وہ اپنی آمدن کے لحاظ سے خرچ کرے گا۔ بہر صورت نان و نفقہ کی ذمہ داری اللہ نے مرد کے کندھوں پر ڈالی ہے، عورت کا یہ حق نہیں کہ وہ گھر کے اخراجات

برداشت کرنے کے لیے نوکری و جاب تلاش کرے، اس کا حق ہے کہ گھر کی چار دیواری میں خاوند کی خدمت، گھر کی نگرانی اور بچوں کی نگہداشت کرے، دفاتر، بازار، کارخانہ و فیکٹری، ہوٹلز و ریستورنٹ وغیرہا کی زینت نہ بنے۔

میاں بیوی میں علیحدگی کی صورت میں نابالغہ بچی کے خرچہ کا حکم

(سوال) میاں بیوی میں علیحدگی کی صورت میں نابالغہ بچی کا خرچہ کس پر ہے؟

(جواب) مذکورہ صورت اگر صحیح رقم کی گئی ہے تو اس میں نابالغہ بچی کا خرچہ والد پر واجب ہے اور والد شرعی طور پر پابند ہے کہ وہ اپنی بچی کا نان و نفقہ ادا کرے، بچی خواہ والد کے پاس ہو یا والدہ کے پاس۔ سید الفقہاء امام الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب یوں قائم کیا ہے ”باب وجوب النفقة على الأهل و العیال“ کہ مرد پر بیوی بچوں کا خرچہ دینا واجب ہے۔ پھر اس کے تحت یہ حدیث لائے ہیں:

« عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا تَرَكَ غَنِيًّا وَ الْيَدِ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى وَ أِبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ تَقُولُ الْمَرْأَةُ إِمَّا أَنْ تُطْعِمَنِي وَ إِمَّا أَنْ تُطَلِّقَنِي وَ يَقُولُ الْعَبْدُ أُطْعِمَنِي وَ اسْتَعْمِلَنِي وَ يَقُولُ الْابْنُ أُطْعِمَنِي إِلَى مَنْ تَدْعُنِي »

[صحیح بخاری، کتاب النفقات : باب وجوب النفقة على الأهل و العیال (۵۳۵۵)]

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جسے ادا کرنے کے بعد دینے والا مالدار ہی رہے اور دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور سب سے پہلے اپنے زیر کفالت افراد پر خرچہ کرو، بیوی کہتی ہے مجھے کھلاؤ یا طلاق دو اور غلام کہتا ہے مجھے کھلاؤ اور کام پر لگاؤ اور بیٹا کہتا ہے مجھے کھلاؤ۔ مجھے کس کے سپرد کرتے ہو؟“

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غَنِيٍّ وَ أِبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ [صحیح بخاری، کتاب النفقات : باب وجوب النفقة على الأهل و العیال (۵۳۵۶)، سنن النسائی، کتاب الزکاة : باب ای الصدقة افضل (۲۵۴۵)، مسند احمد (۲/۲۷۸)، (۷۷۴۱)، صحیح ابن حبان (۴۲۴۳)، بیہقی (۴/۱۷۷)، کتاب العیال (۷) لابن ابی الدنیا، حلیۃ الأولیا (۲/۱۸۱)، تاریخ بغداد (۸/۴۸۲)]

”بہترین صدقہ وہ ہے جس کے ادا کرنے کے بعد آدمی مالدار رہے اور سب سے پہلے اپنے زیر کفالت افراد پر خرچہ کرو۔“

تھقاف بن حکیم کہتے ہیں کہ عبدالعزیز بن مروان نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا:

« إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ إِنَّ الْيَدَ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى وَ أِبْدَأُ

بِمَنْ تَعُولُ وَ لَسْتُ أَسْأَلُكَ شَيْفًا وَ لَا أُرِدُّ رِزْقًا رَزَقَنِيهِ اللَّهُ مِنْكَ“ [مسند احمد (۴/۲)، (۴۷۷۴)، طبقات ابن سعد (۱۵۰/۴)، مسند ابی یعلیٰ (۵۷۳۰)، الجامع الصغیر (۱۰۰۲۷)]

”بلاشبہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ”دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور جو لوگ تیرے زیر کفالت ہیں ان پر پہلے خرچ کر۔ میں تجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں کرتا اور جو رزق مجھے اللہ نے تجھ سے دیا اسے میں رد نہیں کروں گا۔“

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان پر اس کے زیر کفالت افراد کا خرچ واجب ہے، یہ بھی یاد رہے کہ والد پر اولاد کا نان و نفقہ اس وقت تک واجب ہے جب تک لڑکا بالغ نہ ہو جائے اور لڑکی کا نکاح نہ کر دیا جائے۔

لڑکے کی بلوغت اور لڑکی کے نکاح کے بعد ان کا نفقہ والد کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے بشرطیکہ لڑکا کمانے پر قادر ہو، معذور نہ ہو۔ حافظ الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ذَهَبَ الْحَمَهُورُ إِلَى أَنَّ الْوَاجِبَ أَنْ يُنْفِقَ عَلَيْهِمْ حَتَّى يُبْلَغَ الذَّكَرُ أَوْ تَتَزَوَّجَ الْأُنثَى ثُمَّ لَا نَفَقَةَ عَلَى الْآبِ إِلَّا أَنْ كَانُوا زَمَنِي فَإِنْ كَانَتْ لَهُمْ أَمْوَالٌ فَلَا وَجُوبَ عَلَى الْآبِ وَالْحَقُّ الشَّافِعِيُّ وَ لَا الْوَالِدَ وَ إِنْ سَفَلَ بِالْوَالِدِ فِي ذَلِكَ“ [فتح الباری (۵۰۱، ۵۰۰/۱۹)]

”جمہور ائمہ محدثین رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ باپ پر اولاد کا نفقہ واجب ہے، یہاں تک کہ لڑکا بالغ ہو جائے اور لڑکی کی شادی ہو جائے، اس کے بعد والد پر کوئی نفقہ نہیں الا یہ کہ اولاد لنگڑی لولی اور معذور ہو۔ پس اگر اولاد صاحب مال ہو تو پھر باپ پر نفقہ واجب نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پوتوں، پڑپوتوں کو بھی نیچے تک اس حکم میں اولاد کے ساتھ ملحق کیا ہے۔“

لہذا باپ پر اس نابالغ بچی کا خرچہ واجب ہے اور باپ شرعی طور پر اس حق کی ادائیگی کا پابند ہے بصورت دیگر سخت گناہ گار ہو گا۔ لیکن اس خرچہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ باپ کو اس بچی سے ملنے پر کسی قسم کا حکم امتناعی جاری کر سکے کیونکہ جس طرح نابالغ بچی کا نفقہ شرعاً باپ پر واجب ہے اسی طرح باپ کو اپنی بچی سے ملاقات کا بھی شرعاً حق حاصل ہے اور اس کے اس شرعی حق کو عدالت سلب نہیں کر سکتی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَا تَضَارُّ وَالِدَةَ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُودًا لَهُ بِوَلَدِهِ ﴾ [البقرة: ۲۳۳]

”ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔“

پس عدالت ایسی پابندی لگانے کی شرعاً مجاز نہیں، ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نابالغ بچی کی پرورش کا حق اس کی ماں ہی تو ہے، ماں ہی اس کو اپنے پاس رکھے گی اور ہر طرح سے اس کی پرورش کرے گی۔ مگر عدالت یا ماں اس بچی کے والد کو اس سے ملاقات کرنے سے روک نہیں سکتے۔

عدالت نے اگر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے جو اللہ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿ لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ۲۳۳]

”ہر ایک نفس کو اس کی ہمت و بساط کے مطابق حکم ہوا کرتا ہے۔“

اس کے علاوہ سورۃ طلاق میں ہے:

﴿لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا﴾ [الطلاق: ۷]

”جو وسعت والا ہے وہ اپنی وسعت سے خرچ کرے گا اور جس کا رزق تنگ ہے وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اتنا ہی حکم کرتا ہے جتنی اس کو طاقت دی ہے۔“

تو عدالت بلاشبہ خرچ کی ادائیگی پر مجبور کر سکتی ہے اور عدالت کو اپنے اختیار بروئے کار لا کر ایسا بندوبست کرنا چاہیے جس کی وجہ سے باپ یہ خرچ ادا کرنے پر مجبور ہو جائے اور اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی

(سوال) اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو اولاد کس کے پاس رہے گی؟

(جواب) مذکورہ بالا صورت کی تقسیم کے لیے درج ذیل احادیث صحیحہ و حسنہ پر غور کیا جائے:

① نبی کریم ﷺ نے کفار مکہ سے جب صلح کا معاہدہ کیا اور اس کے نتیجے میں آئندہ سال عمرہ کے لیے تشریف لے گئے اور تین دن کی مدت پوری ہو گئی تو مکہ والے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا:

« قُلْ لِيَصَاحِبِكَ أُخْرَجْنَا فَقَدْ مَضَى الْأَجَلُ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَبِعْتَهُ ابْنَةُ حَمْزَةَ تَنَادِي يَا عَمُّ يَا عَمُّ فَأَتَانَا وَلَهَا عَلِيٌّ فَأَخَذَ بِيَدِهَا وَقَالَ لِفَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ دُونَكَ ابْنَةُ عَمِّكَ حَمَلْتَهَا فَأَخْتَصَمَ فِيهَا عَلِيٌّ وَ زَيْدٌ وَ جَعْفَرٌ قَالَ عَلِيٌّ أَنَا أَخَذْتُهَا وَ هِيَ بِنْتُ عَمِّي وَ قَالَ جَعْفَرٌ هِيَ ابْنَةُ عَمِّي وَ خَالَتُهَا تَحْتِي وَ قَالَ زَيْدٌ بِنْتُ أُخِي فَقَضَى بِهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَخَالَتَهَا وَ قَالَ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ وَ قَالَ لِعَلِيٍّ أَنْتَ مِنِّي وَ أَنَا مِنْكَ قَالَ لِيَجْعَفِرَ أَشْبَهَتْ خَلْقِي وَ خَلْقِي وَ قَالَ لِيَزِيدُ أَنْتَ أَخُونَا وَ مَوْلَانَا وَ قَالَ عَلِيٌّ أَلَا تَتَزَوَّجُ بِنْتُ حَمْزَةَ؟ قَالَ إِنَّهَا بِنْتُ أُخِي مِنَ الرِّضَاعَةِ » [صحيح البخارى، كتاب المغازى: باب عمرة القضاء (٤٢٥١)، سنن ابى داود، كتاب الطلاق: باب من احق بالولد (٢٢٧٨)، مسند احمد (١١٥/١)، (٩٣١)، مستدرک حاکم (١٢٠/٣)، مسند بزار (٧٤٤، كشف)، ابن حبان (٧٠٤٦)، ابن ابى شيبه (١٠٥/١٢)، بيهقي (٦/٨)]

”اپنے ساتھی سے کہو کہ اب یہاں سے چلے جائیں کیونکہ مدت پوری ہو چکی ہے۔“ جب نبی کریم ﷺ مکہ سے نکلے تو حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی چچا چچا کہتے ہوئے آئی، علی رضی اللہ عنہ نے اسے لے لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس

لے آئے اور کہا: ”اپنے چچا کی بیٹی کو لے لو، میں اسے اٹھالایا ہوں۔“ اس بچی کے بارے علی، زید اور جعفر رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوا، علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں نے اسے پکڑا ہے، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔“ جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔“ اور زید رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یہ میرے بھائی کی لڑکی ہے۔“ لیکن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خالہ کے حق میں فیصلہ دیا اور فرمایا: ”خالہ ماں کے درجہ میں ہوتی ہے۔“ اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”تم مجھ سے اور میں تم سے ہوں۔“ جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تم شکل و صورت اور عادات و اخلاق میں مجھ سے مشابہ ہو۔“ اور زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تم ہمارے بھائی اور مولیٰ ہو۔“ علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”آپ حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لے لیں۔“ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔“

④ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ! إِنَّ ابْنِي هَذَا كَانَ بَطْنِي لَهُ وَعَاءٌ وَتُدْبِي لَهُ سِقَاءٌ وَحِجْرِي لَهُ حِوَاءٌ وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِي وَارَادَ أَنْ يَنْتَزِعَهُ مِنِّي فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي » [سنن ابی داؤد ، کتاب الطلاق ، باب من احق بالولد (۲۲۷۶) ، بیہقی (۴/۸) ، مستدرک حاکم (۲/۲۰۷) ، مسند احمد (۲/۱۸۲) ، (۶۷۰۷) ، عبد الرزاق (۱۲۰۹۷) ، سنن الدار قطنی (۳۷۶۶ ، ۳۷۶۷ ، ۳۷۶۸)]

”بلاشبہ ایک عورت نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کے لیے تھیلا تھا اور میرے دونوں پستان اس کے مشکیزہ تھے اور میری گود اس کو سیٹھ رہی اور اب اس کے والد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور مجھ سے وہ اسے چھیننا چاہتا ہے۔“ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو اس کی زیادہ حق دار ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔“

⑤ ابو یونس کہتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک فارسی عورت آئی، اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا، دونوں (میاں بیوی) نے اس کا دعویٰ کیا اور شوہر بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔ اس عورت نے کہا: ”اے ابو ہریرہ! (عورت نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فارسی میں گفتگو کی) میرا شوہر میرا بیٹا لے جانا چاہتا ہے۔“

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے فارسی میں بات کرتے ہوئے کہا: ”تم دونوں اس پر قرحہ ڈال لو۔“ اس عورت کا شوہر آیا تو اس نے کہا: ”میرے بیٹے کے بارے میں مجھ سے کون جھگڑا کر سکتا ہے؟“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

”اے میرے اللہ! میں یہ فیصلہ اس لیے دے رہا ہوں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، آپ کے پاس ایک عورت آئی اس نے کہا: ”میرا شوہر مجھ سے میرا بیٹا چھیننا چاہتا ہے، حالانکہ وہ مجھے ابو عبثہ کے کنویں سے پانی پلاتا ہے اور اس نے مجھے نفع پہنچایا ہے۔“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِسْتَهْمَا عَلَيْهِ فَقَالَ زَوْجُهَا مَنْ يُحَاقِنِي فِي وَوَلَدِي ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا اَبُوكَ وَهَذِهِ اُمُّكَ فَحُذِّ بِيدِ اَيُّهُمَا شِئْتَ فَاخَذَ بِيدِ اُمِّهِ فَاَنْطَلَقَتْ بِهِ »

”تم دونوں اس پر قرعہ اندازی کرو۔“ تو اس کے شوہر نے کہا: ”میرے بچے کے بارے میں مجھ سے کون جھگڑا کرتا ہے؟“ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے، ان دونوں میں سے جس کا چاہو ہاتھ پکڑ لو۔“ تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلے گئی۔“ [سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب من أحق بالولد (۲۲۷۷)، واللفظ له، جامع الترمذی، کتاب الأحکام، باب ما جاء فی تخيير الغلام بين ابويه اذا افرقا (۱۳۵۷)، سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب تخيير الصبي بين أبويه (۲۳۵۱)، کتاب الأم (۹۲/۵)، مسند شافعی (۶۲/۲)، سنن سعید بن منصور (۲۲۷۰)، مسند حمیدی (۱۰۸۳)، سنن الدارمی (۲۲۹۸)، شرح مشکل الآثار (۳۰۸۰)، مسند ابو یعلیٰ (۶۱۳۱)، بیہقی (۳/۸)، مسند احمد (۴۴۷/۲)، (۹۷۷۱)، ابن ابی شیبہ (۲۳۷/۵)]

⑤ رافع بن سنان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

« أَنَّهُ أَسْلَمَ وَ أُمِّتِ امْرَأَتُهُ أَنْ تُسَلِّمَ فَآتَتْ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ ابْنَتِي وَ هِيَ فَطِيمٌ أَوْ شَبْهُهُ وَ قَالَ رَافِعُ ابْنَتِي فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْعُدِي نَاحِيَةً وَ قَالَ لَهَا أَقْعُدِي نَاحِيَةً وَ أَقْعُدِي الصَّبِيَّةَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ قَالَ أَدْعُواهَا فَمَالَتْ الصَّبِيَّةُ إِلَى أُمِّهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَللَّهُمَّ اهْدِهَا فَمَالَتْ الصَّبِيَّةُ إِلَى أَبِيهَا فَأَخَذَهَا » [سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب إذا أسلم أحد الابوين لمن يكون الولد (۲۲۴۴)، سنن النسائي، کتاب الطلاق، باب اسلام أحد الزوجين و تخيير الولد (۳۵۲۵)، سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب تخيير الصبي بين ابويه (۲۳۵۲)، مستدرک حاکم (۲۰۷، ۲۰۶/۲)، بیہقی (۳/۸)، مسند احمد (۴۴۶/۵)، (۲۳۷۵۷)، السنن الكبرى للنسائي (۶۳۸۵) شرح مشکل الآثار، اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، علامہ البانی نے بھی اسے صحیح ابی داؤد میں ذکر کیا ہے]

”میں اسلام لے آیا لیکن میری بیوی نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگی: ”میری بیٹی دودھ چھوڑنے والی ہے یا دودھ چھوڑنے کے قریب ہے۔“ اور رافع کہنے لگے: ”میری بیٹی ہے۔“ نبی کریم ﷺ نے رافع سے کہا: ”ایک جانب بیٹھ جاؤ“ اور اس خاتون سے کہا ”تم بھی ایک جانب بیٹھ جاؤ۔“ آپ ﷺ نے بچی کو دونوں کے درمیان بٹھا دیا پھر فرمایا: ”تم دونوں اسے بلاؤ۔“ بچی جب ماں کی طرف مائل ہونے لگی تو نبی کریم ﷺ نے دعا کی: ”اے میرے اللہ! اس بچی کو ہدایت دے۔“ تو وہ اپنے باپ کی طرف مائل ہو گئی اور رافع رضی اللہ عنہ نے اس بچی کو لے لیا۔“

ان احادیث صحیحہ و حسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی پڑ جائے تو بچے اگر چھوٹی عمر کے ہوں تو ماں ان کی زیادہ حقدار ہے جب تک وہ نکاح نہیں کرتی۔ اگر بچوں کی ماں موجود نہ ہو تو خالہ کو ماں کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور اگر بچے سن شعور کو پہنچ جائیں تو انھیں والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا، وہ جس کے پاس جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔

البتہ والدین میں سے کسی ایک کو بھی اولاد کے ساتھ ملاقات سے نہیں روکا جائے گا۔ کیونکہ صلہ رحمی واجب ہے۔ حضانت و پرورش میں بچے کی نگہداشت مقصود ہوتی ہے جس سے اس کی جسمانی و روحانی تربیت ہو اور جس کے ذریعے یہ اغراض و مقاصد حاصل نہ ہو سکتے ہوں تو اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا۔

جیسا کہ ماں اگر دوسری جگہ شادی کر لے تو اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا جیسا کہ آپ نے فرمایا:

«أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي» [مسند احمد (۱۸۲/۲)، ابو داؤد (۲۲۷۶)]

”جب تک تو نکاح نہ کر لے اس کی زیادہ حق دار ہے۔“

کیونکہ جب دوسرے شخص سے نکاح ہو جاتا ہے تو وہ صحیح طور پر پہلے خاوند کی اولاد کی نگہداشت نہیں کر سکتی۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اسی طرح عورت اگر مجنوں ہو یا جذام و کوڑھ وغیرہ جیسے امراض میں مبتلا ہو یا کافر ہو جس سے بچے کے دین و عقائد خراب ہونے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں بھی عورت کا حق حضانت ختم ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو ”اسلامی طرز زندگی (۶۶۳)“ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے حصول کے لیے ان کے درمیان قرعہ اندازی بھی کر سکتے ہیں جیسا کہ اوپر حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں بالتصریح موجود ہے۔ اسی طرح ایک صحیح مرسل روایت میں خلیفہ رسول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی فیصلہ موجود ہے۔ قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی اہلیہ ام عاصم بنت عاصم انصاریہ سے بیٹے کے بارے جھگڑا ہو گیا، عمر رضی اللہ عنہ نے ام عاصم سے جدائی اختیار کی۔

ایک دفعہ عمر رضی اللہ عنہ قباء تشریف لائے اور اپنے بیٹے عاصم کو مسجد کے صحن میں کھیلتے ہوئے پایا تو اسے بازو سے پکڑا اور سواری پر اپنے آگے بٹھالیا، اب بچے کی نانی نے انہیں آلیا اور ان سے جھگڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ یہ فیصلہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میرا بیٹا ہے اور عورت نے کہا میرا بیٹا ہے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«رَبِّحُهَا وَفِرَاشُهَا وَحِجْرُهَا خَيْرٌ لَّهُ مِنْكَ حَتَّى يَشُبَّ وَ يَخْتَارَ لِنَفْسِهِ»

”اس عورت کی ہوا، بستر اور گود آپ کی نسبت بچے کے لیے زیادہ بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جائے اور اپنے نفس کا مختار بن جائے۔“

اور ایک روایت میں ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«الْأُمَّ أَعْطَفُ، وَالْطَفُ وَأَرْحَمُ وَأَخْنَا وَأَرْأَفُ هِيَ أَحَقُّ بِوَلَدِهَا مَا لَمْ تَتَزَوَّجْ»

”ماں زیادہ مشفق، لطیف، رحم کرنے والی، نائل ہونے والی اور نرم ہے یہ اپنے بچے کی زیادہ حق دار ہے جب تک شادی نہ کر لے۔“ [موطا للمالك (۷۶۸، ۷۶۷/۲)، بیہقی (۵۱۸)، عبد الرزاق (۱۲۶۰۰)، (۱۲۶۰۱) سنن

سعید بن منصور (۲۲۷۲)]

امام ابن عبد البر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”یہ خبر کئی اسانید مقطوعہ و متصلہ سے مشہور ہے اسے اہل علم کے ہاں قبولیت عامہ حاصل

ہے۔ [زاد المعاد (۴۳۶/۵)]

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے دور خلافت میں اس پر فتویٰ دیتے اور فیصلہ فرماتے رہے ہیں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت اس بات میں نہیں کی کہ جب تک بچہ چھوٹا ہو اور سن تیز تک نہ پہنچا ہو تو وہ ماں کے پاس رہے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی ان دونوں کا کوئی مخالف نہیں ہے۔“ [زاد المعاد (۴۳۶/۵)]

روایت فضیلتِ سورۃ واقعہ کی تحقیق

(سوال) کیا سورۃ الواقعہ سے تنگی دور ہونے والی بات صحیح ہے؟

(جواب) سورۃ الواقعہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سورت غنا اور توگمری والی ہے، جو اسے رات کو پڑھے، اپنے اہل و عیال کو پڑھائے اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچتا۔ لیکن اس کے متعلق مروی روایات ضعیف اور موضوع ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا قَالَ وَ قَدْ أَمَرْتُ بَنَاتِي أَنْ يَقْرَأْنَهَا كُلَّ

لَيْلَةٍ » [عمل اليوم والليلة لابن السني (۶۸۰)، المطالب العالیة (۳۷۶۵)، شعب الایمان للبيهقي

(۲۴۹۸)، اللعل المتناهیة (۱۰۵/۱)، تفسیر ابن کثیر (ص ۱۲۹۳/۱) مطبوعہ دارالسلام

”جس شخص نے ہر رات سورۃ الواقعہ تلاوت کی اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں نے اپنی

بیٹیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر رات اسے تلاوت کریں۔“

ابن کثیر اور شعب الایمان میں یہ بھی ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے گئے تو کہا: ”آپ کو کیا شکوہ ہے؟“ تو انہوں نے کہا: ”اپنے گناہوں کا۔“ پھر کہا: ”آپ کی کیا خواہش ہے۔“ تو انہوں نے کہا: ”اپنے رب کی رحمت کی۔“ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کسی طبیب کو بھیج دوں۔“ کہنے لگے: ”طبیب ہی نے تو بیمار کیا ہے۔“ پھر کہا: ”میں تمہارے لیے کچھ مال کا حکم دوں؟“ کہنے لگے: ”ایک دن پہلے آپ نے مجھے اس سے منع کیا ہے۔ مجھے اس کی حاجت نہیں۔“ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اسے اپنے اہل و عیال کے لیے چھوڑ دینا۔“ کہنے لگے: ”میں نے انہیں ایک ایسی چیز کی تعلیم دی ہے جب وہ اسے پڑھیں گے تو فقیر نہیں ہوں گے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے ہر رات سورۃ الواقعہ کی تلاوت کی وہ فقیر نہیں ہوگا۔“ یہ روایت ضعیف و مضطرب ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

① اس کی سند میں شجاع یا ابو الشجاع راوی مجہول ہے، امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« هَذَا حَدِيثٌ مُنْكَرٌ وَ شَجَاعٌ وَ السَّرِيٌّ لَا أَعْرِفُهُمَا » [اللعل المتناهیة (۱۰۵/۱)، میزان

الاعتدال (۲/۲۶۵) (۴/۵۳۶)، لسان المیزان (۶/۱۳۹۲)]

”یہ روایت منکر ہے اور اس کی سند میں شجاع اور السری کو میں نہیں پہچانتا۔“

② اسی طرح اس کی سند میں ابو طیبہ یا ابو ظبیہ بھی مجہول ہے۔ [میزان الاعتدال (۴/۵۴۲)، تقریب التہذیب (ص/۴۱۳)]

③ اس کی سند میں اضطراب بھی ہے، السری کے شاگردوں نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ اس کا استاد شجاع ہے یا ابو الشجاع۔ اسی طرح شجاع کے استاد میں بھی اختلاف ہے کہ وہ ابو فاطمہ ہے یا ابو ظبیہ۔ پھر انھوں نے ابو ظبیہ کا لفظ ضبط کرنے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ وہ ابو ظبیہ ہے یا ابو طیبہ؟

④ اور یہ ابو ظبیہ عیسیٰ بن سلمان الجرجانی ہے اور اس کی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت منقطع ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے [لسان المیزان (۶۱/۷)، تعلیق العلل المتناہیة (۱۰۵/۱)]

⑤ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو چار وجوہ کی بنا پر ضعیف کہا ہے:

① یہ منقطع ہے جیسا کہ امام دارقطنی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

② اس کا متن منکر ہے جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

③ اس کے راوی ضعیف ہیں جیسا کہ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

④ یہ روایت مضرب ہے اور اس کے ضعیف ہونے پر امام احمد، امام ابو حاتم، امام ابن ابی حاتم، امام دارقطنی، امام بیہقی وغیرہم کا اجماع ہے۔ [سلسلۃ الأحادیث الضعیفة (۱/۳۰۵)، (۲۸۹)]

⑤ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

« مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا أَوْ مَنْ قَرَأَ كُلَّ لَيْلَةٍ ﴿ لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ وَجْهُهُ فِي صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ » [تذکرۃ الموضوعات (ص/۷۸)، ذیل الأحادیث الموضوعة (۱۷۷)]

”جس شخص نے ہر رات سورۃ الواقعہ تلاوت کی اسے کبھی فاقہ نہیں پہنچے گا اور جس نے ہر رات ﴿ لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾ کی تلاوت کی وہ اللہ سے قیامت کے دن اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا۔“

اس کی سند میں احمد بن محمد بن عمر الیمامی کذاب راوی ہے جس کی وجہ سے یہ روایت موضوع ومن گھڑت ہے۔ [سلسلۃ الأحادیث الضعیفة (۱/۳۰۵)، (۲۹۰)، کتاب المجروحین (۱/۱۴۳)، میزان الاعتدال (۱/۱۴۳)]

⑥ انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

« مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ وَ تَعَلَّمَهَا لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْعَافِلِينَ وَ لَمْ يَفْتَقِرْ هُوَ وَ أَهْلُ بَيْتِهِ »

”جس نے سورۃ الواقعہ کی تلاوت کی اور اسے سیکھا وہ غافل لوگوں میں نہیں لکھا جائے گا نیز وہ اور اس کے گھر والے فقیر نہیں ہوں گے۔“

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”ذیل الاحادیث الموضوعۃ (۲۷۷) میں اسے ابو الشیخ کی روایت بطریق عبد القدوس بن حبیب از حسن از انس رضی اللہ عنہ مرفوع بیان کیا ہے اور فرمایا کہ عبد القدوس بن حبیب متروک ہے۔ امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت وضع کرتا تھا۔ امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ (۱/۳۰۶)، (۳۹۱)]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سورۃ الواقعہ کے متعلق مروی روایات ضعیف اور موضوع ہیں۔ بہت سارے خطیب اور واعظ حضرات اس روایت کو بیان کرتے ہیں اور وظائف و اوراد بتانے والے مشائخ بھی اسے اپنے مریدوں کو تلقین کرتے ہیں اور فراخی رزق کے لیے یہ فضائل کینڈوں کی صورت میں شائع بھی کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ ہے کہ خطباء اور واعظین کو روایت کی صحت و سقم سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور کچھ اہل علم اس مسئلے میں تساہل ہیں اور فضائل اعمال میں ضعیف روایت بھی قبول کیے جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک کسی عمل کی فضیلت و استحباب ایک خالص شرعی مسئلہ ہے، اس میں ایسی روایت قابل حجت اور لائق استناد ہے جس میں کوئی علت قادحہ نہ ہو جو اسے ضعیف بنا دے۔

ضعف بیان کرنا اہل علم پر لازم ہے، اگر وہ ضعف بیان نہیں کریں گے تو عام لوگ اسے صحیح سمجھ کر قبول کرتے جائیں گے۔ مسائل کے لیے صحیح اور حسن احادیث کے علاوہ کسی سے حجت نہیں پکڑنی چاہیے اور یہ مذہب بڑے بڑے ائمہ محدثین کا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ لَا يَجُوزُ أَنْ يَعْتَمَدَ فِي الشَّرِيعَةِ عَلَى الْأَحَادِيثِ الضَّعِيفَةِ الَّتِي لَيْسَتْ صَحِيحَةً وَ لَا

حَسَنَةً“ [قاعدہ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ (ص: ۱۱۲)]

”شریعت میں ضعیف احادیث جو صحیح ہیں اور نہ حسن، قابل اعتماد نہیں۔“

مشہور حنفی عالم محمد زاہد کوثری نے لکھا ہے: ”ضعیف روایت کو مطلق طور پر نہ لینا امام بخاری، امام مسلم، امام ابو بکر بن العربی جو اپنے دور کے بہت بڑے مالک تھے، امام ابوشامہ المقدسی جو اپنے وقت کے کبیر شافعی عالم تھے، امام ابن حزم اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور ان کا اس مسئلہ میں قوی غیر مہمل بیان ہے۔“ [مقالات کوثری (ص: ۴۵، ۴۶)]

لہذا ضعیف روایات مطلق طور پر قابل حجت نہیں، فضائل میں اور نہ مسائل میں۔ فقر و تنگ دستی کے لیے اللہ تعالیٰ سے اخلاص سے دعا کریں وہ ضرور دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

﴿ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴾ [الفصص: ۲۴]

”اے میرے پروردگار! تو بھلائی میں سے جو کچھ میری طرف اتارے میں اس کا محتاج ہوں۔“

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”ایک مکاتب غلام ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”میں اپنی مکاتب سے عاجز آچکا ہوں، آپ میرا تعاون کریں۔“

علیؑ نے فرمایا: ”کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھاؤں جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے سکھائے تھے؟ اگر تیرے اوپر پہاڑ جتنا بھی قرض ہو اللہ تعالیٰ اسے اتار دے گا۔“ پھر انہوں نے یہ دعا بتلائی:

«اللَّهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَأَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ» [ترمذی، کتاب الدعوات (۳۵۶۳)، مسند احمد (۱۵۳/۱)، مستدرک حاکم (۵۳۸/۱)]

”اے اللہ! اپنے حلال کے ذریعے اپنے حرام سے میری کفایت فرما اور اپنے فضل کے ساتھ مجھے اپنے علاوہ سے غنی کر دے۔“

توبہ کے بعد مسروکہ مال نامعلوم مالکوں تک پہنچانا

(سوال) توبہ کے بعد مسروکہ مال نامعلوم مالکوں تک کیسے پہنچایا جائے؟

(جواب) قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے سے ہٹا چلتا ہے کہ بندے کے لیے توبہ کا دروازہ مسلسل کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ [الزمر: ۵۳]

”اے نبی! کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ» [مسلم، کتاب الذکر و الدعاء: باب استجباب الاستغفار (۲۷۰۳)]

”جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔“

دوسری حدیث میں ہے:

«إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغْرَعِرْ» [ترمذی، کتاب الدعوات: باب فی فضل التوبة (۳۵۳۷)]

”اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس کی روح حلقوم تک نہیں پہنچ جاتی۔“

ان دلائل سے یہ واضح ہو گیا کہ توبہ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے، ایسا شخص اگر صدق دل سے توبہ کر لے اور حق داروں کو ان کا حق پہنچانا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا کیونکہ یہ اس کی طاقت میں نہیں اور اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“ اس

کے علاوہ اس کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قتل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کے اتنے بڑے جرم کو صرف ہجرت کی وجہ سے معاف کر دیا ہے تو ایسا شخص جس کا جرم اس سے کم ہے اللہ تعالیٰ اس کی بھی توبہ قبول کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے شخص کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنی چاہئیں۔ خصوصاً صدقہ زیادہ کرنا چاہیے تاکہ گزشتہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے۔

علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث

سوال کیا علم حاصل کرنے کے متعلق چین جانے والی حدیث صحیح ہے؟

جواب یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ”الرحلة فی طلب الحدیث“ میں تین سندوں سے یہ روایت ذکر کی ہے، جن کا دارو مدار الحسن بن عطیہ عن ابی عاتکہ طریف بن سلمان عن انس پر ہے اور اسی سند سے انھوں نے ”تاریخ بغداد (۳۶۴/۹)“ ابن عبد البر نے ”جامع بیان العلم و فضلہ (۸۷/۱)“ میں ذکر کی ہے اور امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ نے ”مکتاب الضعفاء الکبیر (۲۳۰/۲)“ میں ”حماد بن خالد الحیاط قال حدثنا طریف بن سلمان ابو عاتکہ قال سمعت انس بن مالک“ کے طریق سے ذکر کی ہے اور ابو عاتکہ طریف بن سلمان کے سوا کسی سے چین کے الفاظ محفوظ نہیں ہیں اور طریف منکر الحدیث اور متروک راوی ہے۔

طریف کی اس روایت کی طرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”التاریخ الکبیر (۳۱۰/۴)“ (۶۰۲۹) میں اشارہ کر کے اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے اور جسے امام بخاری منکر الحدیث قرار دیں، اس سے روایت لینا حلال نہیں جیسا کہ میزان الاعتدال وغیرہ میں مذکور ہے، لہذا یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ (واللہ اعلم!) ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں اس کی متابعت ذکر کی ہے لیکن اس سند میں یعقوب بن اسحاق العسقلانی کذاب راوی ہے جیسا کہ ”میزان الاعتدال (۴۴۹/۴)“ وغیرہ میں ہے۔

ابن عدی نے اس روایت کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے لیکن اس کی سند میں احمد بن عبد اللہ الجوباری کذاب راوی ہے، لہذا اس کی سند بھی عطل قادحہ سے خالی نہیں۔ امام ابن جوزی نے تو اسے موضوعات میں شمار کیا اور اسماعیل بن محمد العجلونی نے ”کشف الخفاء و مزیل الالباس (۱۳۸/۱)“ میں ذکر کر کے اسے مجموعی طرق کے لحاظ سے حسن قرار دیا ہے۔ حقیقت میں یہ نہ موضوع ہے نہ حسن بلکہ انتہائی ضعیف ہے۔

وفات کے بعد میت کی طرف سے سود کے مال سے صدقہ کرنا

سوال اگر مسلمان والدین اپنی وراثت میں غفلت دنیا اور معاشرے کی مجبوری کی بنا پر اپنے بال بچوں کی دینی تربیت نہ

کر سکیں، گھر میں بے پردگی کا آزادانہ ماحول رکھا اور سود کو نفع سمجھتے ہوئے اس سے اولاد کے لیے جائیداد بھی چھوڑ گئے اور گھر کے آزادانہ ماحول میں ڈش، ویڈیو، کیبل بچوں کے وقت پورا کرنے کے لیے لگا گئے ہوں، تو کیا اب ان کی وفات کے بعد ان کے ورثہ سے ان کے لیے صدقہ و خیرات کر سکتے ہیں؟

(جواب) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا» [صحیح مسلم: کتاب الزکوٰۃ باب قبول الصدقہ من الکسب الطیب و تربیتها: (۱۰۱۵)]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔“

چونکہ متوفی کا مال سودی ہے اور سود نص قرآنی سے حرام و ناپاک ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ ہے، ایسے مال سے صدقہ قبول نہیں ہوتا اور کفارہ گناہ نہیں بن سکتا، ہاں پسماندگان کی دعاؤں سے میت کو فائدہ ہو سکتا ہے، اگر اس کے پسماندگان اولاد وغیرہ ان غیر شرعی تکلفات و آلات وغیرہ کو ختم کر دیں اور توبہ و استغفار کی پابندی کر کے اپنی حالت شریعت کے مطابق بنالیں اور رزق حلال کھانے کی کوشش کریں تو پھر مخلصانہ دعائیں آپ کے والدین کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں کیونکہ جس جسم کو حرام سے غذا دی گئی ہو یا لباس حرام پہنایا گیا ہو تو ایسے شخص کی دعا قبولیت کے شرف سے محروم رہتی ہے۔ اگر آپ کے والدین سود کو حلال سمجھتے ہوں اور کفر یا شرک کی حالت میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے ہوں تو پھر آپ کے صدقات و خیرات اور مخلصانہ دعائیں بھی بے سود اور غیر مفید ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ معاشرے کی مجبوری کوئی شرعی مجبوری نہیں کیونکہ مسلمان معاشرے کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات اور اسلامی تعلیمات کا پابند ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و لا تبطلوا اعبالکم ﴾ [محمد: ۳۳]

”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال باطل نہ کرو۔“

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو صحیح عقیدہ، عمل صالح، رزق حلال، صدق مقال اور دین حنیف کی پابندی نصیب کرے۔ (آمین!)

ناراضی کے دوران شوہر فوت ہو جائے تو؟

(سوال) اگر بیوی سے ناراضی کے دوران ہی شوہر فوت ہو جائے تو؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے لیے باعث سکون بنایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِيَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَ رَحْمَةً

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَايَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [الروم: ۲۱]

”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں تاکہ تم ان سے آرام

پاؤ۔ اس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی قائم کر دی ہے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ شوہر کے لیے بیوی سکون و اطمینان کا سبب ہے اور مرد وزن کے اس رشتے کو اللہ تعالیٰ نے محبت و رحمت بنایا ہے۔ لیکن بسا اوقات شیطان اس رشتے میں رکاوٹ ڈالنے اور اطمینان و سکون کو بے سکونی، بد امنی اور زحمت میں بدلنے کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے۔

جس کی بنا پر ان دونوں کے درمیان محبت نفرت میں بدل جاتی ہے اور لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ یہ گھریلو لڑائی جھگڑے میاں بیوی دونوں کی کسی نہ کسی غلطی کی بنا پر کھڑے ہوتے ہیں۔

اور جب کوئی ایسی غلطی مرد یا عورت سے صادر ہو جائے تو اسے دور کرنے کے ساتھ توبہ و استغفار کو لازم پکڑنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ [النساء: ۱۱۰]

”جس نے کوئی برا عمل کیا یا اپنی جان پر ظلم کیا، پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہی تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشے والا مہربان پائے گا۔“ لہذا کسی قسم کی بھی زیادتی خواہ شوہر سے ہو جائے یا اس کی رفیقہ حیات سے، انہیں اس میں توبہ و استغفار کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ جو بھی نیکی کر سکے، کرے کیونکہ نیکیاں بھی گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلْفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلَّذِينَ كَرِهُوا﴾ [هود: ۱۱۴]

”نماز قائم کیجیے دن کے دونوں اطراف میں اور رات کی گھڑیوں میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ نیکیاں کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں لہذا نیکیوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ جس قسم کی بھی نیکی ہو سکے ضرور کرے یعنی صدقات و خیرات وغیرہ۔ نبی ﷺ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

﴿إِتَّقِ اللَّهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ وَ أَتَّبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمَحُّهَا وَ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقِي حَسَنٍ﴾ [ترمذی، کتاب البر والصلوة: باب ما جاء فی معاشرۃ الناس (۱۹۹۴)، مسند احمد (۱۵۳/۵)، دارمی، کتاب الرقاق (۲۷۹۱)]

”تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈر، برائی کے پیچھے نیکی لگا دے، وہ اسے مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھا معاملہ کر۔“

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ نیکی کرنے سے آدمی کی برائی اور گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہذا ایسی عورت جس کا اپنے خاوند کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہوا ہو یا خاوند کی غلطی کی وجہ سے معاملہ بڑھ گیا ہر دو صورتوں میں توبہ و

استغفار سے کام لے اور مرنے والے کے حق میں دعائے خیر کرے اور خود توبہ و استغفار کے ساتھ ساتھ نیکی کے کام یعنی نماز، روزہ، تلاوت قرآن پاک، صدقات و خیرات وغیرہ سے کام لے، فرائض کی پابندی کرے اور نقلی امور کی طرف رغبت رکھے، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔

مسلمان مریض کو خون کا عطیہ

(سوال) کسی مسلمان مریض کو خون کا عطیہ دینا کیسا ہے؟

(جواب) جب بوقت مجبوری ماہر حکماء یا ڈاکٹروں کے کہنے پر مریض کو خون کی ضرورت ہو تو اسے خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ﴾ [الانعام: ۱۱۹]

”جو کچھ تمہارے اوپر حرام کیا ہے اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہے الا کہ تم کسی چیز کے لیے مجبور ہو جاؤ۔“ معلوم ہوا کہ اضطراری حالت میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے اور یہ بقدر ضرورت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

﴿ غَيْرَ بَاغٍ وَ لَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهٖ ﴾ [البقرة: ۱۷۳]

”جسے مجبوری ہے وہ نہ تو بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہی ہو، تب اس پر کوئی گناہ نہیں۔“ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

« الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَ لَا يُسْلِمُهُ وَ مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ » [بخاری، کتاب المظالم: باب لا يظلم المسلم المسلم (۲۴۴۲)]

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے جو نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے کسی کے حوالے کرتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں لگا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت میں ہوتا ہے۔“ معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مسلمان کی حاجت پوری کرنا جائز و درست ہے اور یہ خون دینا حالت اضطرار میں بالکل صحیح ہے۔ (واللہ اعلم!)

کالے بکرے کا صدقہ

(سوال) صدقہ کیا ہے، صدقہ دینے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا جو عزیز و اقارب غریب ہوں، معذور ہوں ان کو صدقہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیا مجاہدین اس کے مستحق ہیں کہ نہیں؟ مروجہ طریقہ کہ کالا بکرا یا کالی بکری کی سری جو مسجد یا مدرسہ وغیرہ میں صدقہ کے

طور پر دی جاتی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ» [صحیح بخاری، کتاب الأدب: باب كل معروف صدقة: (۶۰۲۱)]
 ”ہر نیکی صدقہ ہے۔“

اور ایک حدیث میں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”بلاشبہ ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ ہے، ہر تہلیل صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، نہی عن المنکر صدقہ ہے، آدمی کا اپنی اہلیہ سے صحبت کرنا صدقہ ہے۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی جب اپنی شہوت کے لیے اپنی اہلیہ کے پاس آتا ہے تو اس کو اس میں اجر ملتا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم بتاؤ اگر وہ فعل حرام میں واقع ہوتا تو کیا اسے گناہ ہوتا؟ پس اس طرح جو فعل حلال طریقے سے کرے گا تو اسے اجر ملے گا۔“

[صحیح مسلم کتاب الزکاة: باب بیان أن اسم الصدقة: (۱۰۰۵)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا کام انسان کے لیے صدقہ ہوتا ہے البتہ عرف عام میں وہ مال و متاع جو آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لیے کسی فقیر، مسکین، محتاج اور مجاہد کو دیتا ہے وہ صدقہ کرتا ہے، جس طرح محتاج کو صدقہ دینا درست ہے اسی طرح مجاہدین اسلام کو بھی صدقہ دیا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ (جہاد) میں رکے ہوئے ہیں، زمین میں (کاروبار وغیرہ کے لیے) سفر نہیں کر سکتے، سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف انھیں غنی گمان کرتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچانے گا۔ وہ

لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔“ [البقرہ: ۲۷۳]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے صدقات و خیرات کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کے لیے صدقات بالکل درست ہیں بلکہ موجودہ حالات میں مجاہدین کو زکوٰۃ اور صدقات دے کر کفر کے خاتمے کے لیے میدانوں میں روانہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ یہ مجاہدین ہی کا ایسا گروہ ہے جس سے کفر اور اس کے لیڈر دن رات پریشان رہتے ہیں اور کئی حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان مجاہدین کی مدد نہ کی گئی تو پھر پاکستان کے لیے بھی انتہائی زیادہ خطرات ہیں۔ ہماری مساجد، مدارس، گھر بارتب ہی محفوظ ہوں گے جب جہاد صحیح معنوں میں قائم ہوگا۔ لہذا ان مجاہدین کے لیے صدقات اور زکوٰۃ دیں (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے) بلکہ یہ بھی یاد رہے کہ مجاہد غنی اور دولت مند بھی ہو تو بھی اسے صدقہ دیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ افراد کے علاوہ کسی دولت مند کو صدقہ حلال نہیں جن میں سے ایک غازی فی سبیل

اللہ ہے۔ [ابوداؤد، کتاب الزکاة: باب من يجوز له أخذ الصدقة وهو غنی (۱۶۳۵)، (۱۶۳۶)]

اور لوگوں میں جو کالا بکرا یا بکری وغیرہ صدقہ دینے کا تصور ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں، صدقہ کسی بھی پاک و حلال مال سے دیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے سیاہ و سفید جانور کی کوئی قید نہیں۔

مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی

(سوال): مذہبی جلسوں میں نعرہ بازی کیسا عمل ہے؟

(جواب) نبی اکرم ﷺ جب وعظ و نصیحت فرماتے تو اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو بیان کرتے تھے اور صحابہ کرام توجہ سے سماعت فرماتے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو توجہ سے سننے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴]

”جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اس آیت کریمہ کی رو سے قرآن مجید کے بیان کے وقت خاموشی کا حکم ہے اور دوران وعظ نعرہ بازی کرنا، یہ شور و غل ہے جو آداب قرآن کے منافی ہے۔ ایز اللہ کے نبی ﷺ کی کسی بھی حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آپ ﷺ کے وعظ کے دوران صحابہ کرام اس طرح نعرہ بازی کرتے ہوں۔ لہذا ہمیں ان امور سے اجتناب کرنا چاہیے۔

کوئے کا شرعی حکم

(سوال): کوئے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(جواب) کوا شریعت محمدیہ میں حرام ہے، اسے کھانا جائز نہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو فاسق قرار دیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

① «عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خَمْسٌ فَوَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي

الْحِلِّ وَالْحَرَمِ الْحَيَّةَ وَالْغُرَابُ الْأَبْقَعُ وَالْفَأْرَةُ وَالْكَلْبُ الْعُقُورُ وَالْحِدَاةُ» [بخاری،

کتاب بدء الخلق: باب إذا وقع الذباب في شراب أحدكم (۳۳۱۴)، ابن ماجہ (۳۰۸۷)، ترمذی (۸۳۷)]

”ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”پانچ اشیاء فاسق ہیں، سانپ، کوا، چوہیا،

کاٹنے والا کتا اور چیل۔“

امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”أَمَّا الْغُرَابُ الْأَبْقَعُ فَهُوَ الَّذِي فِي ظَهْرِهِ أَوْ بَطْنِهِ بَيَاضٌ“ [شرح مسلم للنووی (۱/۳۸۱)]

”غراب الابقع سے مراد وہ کوا ہے جس کی پشت یا پیٹ پر کچھ سفیدی ہو۔“

② «عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْحَيَّةُ فَاسِقَةٌ

وَالْعُقْرُبُ فَاسِقٌ وَالْفَأْرَةُ فَاسِقٌ وَالْغُرَابُ فَاسِقٌ فَقِيلَ لِلْقَاسِمِ أَيُّوْكُلُ الْغُرَابِ؟ قَالَ مَنْ

يَأْكُلُهُ بَعْدَ قَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسِقًا» [ابن ماجہ، کتاب الصيد: باب

الغراب: (۳۲۴۹)، مسند احمد (۶/۲۰۹)]

”عاشق صدیقہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سانپ فاسق ہے، کچھو فاسق ہے، چوہیا فاسق ہے اور کوا فاسق ہے۔“ قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: ”کیا کوا کھایا جاتا ہے؟“ تو انھوں نے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کو فاسق کہنے کے بعد اسے کون کھاتا ہے؟“

⑤ «عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ مَنْ يَأْكُلُ الْغُرَابَ؟ وَقَدْ سَمِعَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسِقًا وَاللَّهُ مَا هُوَ مِنَ الطَّيِّبَاتِ» [ابن ماجہ، کتاب الصيد: باب الغراب، (۳۲۴۸)]

”ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”کوا کون کھاتا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام فاسق رکھا ہے۔ اللہ کی قسم! کوا پاکیزہ چیزوں میں سے نہیں ہے۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ کوا فاسق ہے اور پاکیزہ چیزوں میں سے نہیں ہے لہذا اس کا کھانا حرام ہے۔ شریعت مطہرہ کی ان تصریحات کے باوجود حنفی حضرات کے نزدیک کوا مفتیٰ بہ قول کے مطابق حلال ہے اس کا کھانا پکانا بالکل درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مشہور متعصب حنفی مولوی محمد حبیب اللہ ڈیروی کا اس مسئلہ پر اردو زبان میں ایک مستقل رسالہ ہے جس کا نام ”الشیء العجائب فی حلة الغراب“ یعنی کوا حلال ہے۔ اس میں مولوی حبیب اللہ ڈیروی نے موجودہ دیسی شہری کوا حلال قرار دیا ہے اور اسے فقہ حنفی کا مفتیٰ بہ قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”البحر الرائق شرح کنز الدقائق (۱۷۲/۸)“ کے حوالے سے لکھتا ہے:

”وَنَوْعٌ يَخْلَطُ بَيْنَهُمَا وَهُوَ أَيْضًا يُؤْكَلُ عِنْدَ الْإِمَامِ وَهُوَ الْعَقَقُ لِأَنَّهُ يَأْكُلُ كَمَا يَأْكُلُ

الدَّجَاجُ وَعَنْ أَبِي يُوسُفَ أَنَّهُ يَكْرَهُ أَكْلَهُ لِأَنَّهُ غَالِبُ أَكْلِهِ الْحَيْفُ وَالْأَوْلَىٰ أَصْحُحُ“ [کوا

حلال ہے (ص ۴/۴)]

”اور کوا کی ایک قسم دانہ اور مردار دونوں کھاتا ہے وہی کھایا جائے نزدیک امام اعظم کے اور اس کا نام عقق ہے اس لیے کہ وہ مرغی کی طرح (گندگی اور دانہ) کھاتا ہے اور امام ابو یوسف رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا کھانا مکروہ ہے اس لیے کہ اس کی اکثر غذا گندگیوں کا کھانا ہے اور اول قول امام اعظم کا زیادہ صحیح ہے۔“ اسی طرح یہی بات فتاویٰ خانینہ برہان فتاویٰ عالمگیری (۳/۳۹۱) کے حوالے سے لکھی ہے۔

مولوی سرفراز صفدر نے اپنی کتاب اتمام البرہان کے صفحہ (۳۲۱) پر مبسوط (۱۱/۲۲۶) اور عنایہ شرح ہدایہ (۲۲/۸) کے حوالہ سے ابو حنیفہ رضی اللہ عنہما کا مذہب یہی درج کیا ہے کہ کوا حلال ہے۔

مولوی حبیب اللہ اپنے رسالہ ”کوا حلال ہے“ کے صفحہ (۴۱) پر ”عقق“ کا معنی شہری کوا لکھتا ہے۔ اسی طرح اس کے دیسی و شہری ہونے کے دس حوالے درج کیے ہیں اور یہ بات بار بار لکھی ہے کہ یہ کوا جو ہمارے اردگرد بیٹھتا ہے مفتیٰ بہ قول کے

مطابق حلال ہے، اس کا کھانا جائز ہے۔

علاوہ ازیں مولوی محمد نصیر الدین میرٹھی دیوبندی نے کوئے کی حلت پر ساٹھ سے زائد حنفی علماء کے فتاویٰ پر مشتمل ایک کتاب بنام ”فصل الخطاب فی تحقیق مسئلۃ الغراب“ لکھی اور مفتی رشید احمد لدھیانوی کے فتاویٰ پر مشتمل کتاب ”احسن الفتاویٰ“ کی ساتویں جلد میں صفحہ (۲۳۹ تا ۲۵۸) میں اپنا فتویٰ اور مفتی محمد تقی کا فتویٰ ”رفع الحجاب عن حکم الغراب“ طبع ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حنفی دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتی بہ قول کے مطابق شہری کو حلال ہے۔

نوائے وقت لاہور صفحہ ۲: مجریہ ۱۹۷۶ء کی رپورٹ کے مطابق جامعہ حنفیہ سلاں والی سرگودھا میں حکیم شریف الدین، قاری فتح محمد کراچی والے، قاری محمد صدیق جھنگ والے اور حافظ محمد ادیس کے متفقہ فیصلے کے مطابق کوئے ذبح کر کے کھائے گئے اور فقہ حنفی کے فتوے پر عمل کیا گیا۔

قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا

سوال کیا قل اور ساتے کی جگہ کوئی دینی پروگرام کروانا جائز ہے؟

جواب مرنے والے پر نوحہ خوانی جاہلیت کا عمل ہے۔ صحیح مسلم میں ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت میں چار چیزیں جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جنہیں وہ نہیں چھوڑیں گے۔“ تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک چیز ”نیاحۃ“ (بین کرنا) شمار فرمائی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

”نوحہ کرنے والی موت سے پہلے تو بہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس پر گندھک

کی قمیص اور خارش کا کرتہ ہوگا۔“ [مسلم، کتاب الحناجز: باب التشدید فی النیاحۃ (۹۳۴)]

نوحہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ میت کے دفن کے بعد میت کے گھر میں اجتماع کیا جائے اور کھانا تیار کیا جائے۔ مسند احمد میں جریر بن عبد اللہ الجلیلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

«كُنَّا نَعُدُّ الْإِجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنَيْعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النَّيَاحَةِ» [مسند احمد (۲/۴۰۴)]

”یعنی ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میت کے گھر والوں کی طرف اکتھ کرنا اور کھانا تیار کرنا نوحہ میں سے شمار کرتے تھے۔“

اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی (رضی اللہ عنہ) سے صراحت آئی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قسم کے اجتماع اور کھانا تیار کرنے کو نوحہ (بین کرنا) شمار کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی اظہار غم کی ایک مذموم صورت ہے جس میں اہل میت پر بے جا بوجھ ڈالا جاتا ہے، کھانا تیار کرنے کی ناروا مشقت ڈالی جاتی ہے اور بلا ضرورت تمام کام چھوڑ کر اکٹھے ہونے کا بے جا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی بری منانے کا سلسلہ بھی اظہار غم کی ایک ایسی ہی صورت ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں بلکہ خالص کفار کی رسم ہے۔ کفار کی کئی اور رسمیں مثلاً تہیجا، ساتواں، دسواں، چالیسواں بھی مسلمانوں میں داخل ہو گئی ہیں۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جو شخص ان رسوم میں حاضر نہ ہو اسے مطعون کیا

جاتا ہے کہ اسے مرنے والے کا کوئی غم اور صدمہ نہیں۔ چنانچہ ملامت کے خوف سے مجبوراً لوگ ان رسوم میں پہنچتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو میت کے گھر اس قسم کے اجتماعات مثلاً تیجے، ساتویں، دسویں، چالیسویں اور برسی کو دین ہی بنا لیا ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان دنوں میں اس طریقے سے اکٹھ کرنا، کھانا پکانا، مولوی صاحب کا اس پر ختم پڑھنا نوحہ کی ایک صورت ہونے کے علاوہ ہندوؤں کی نقالی ہے اور ان دنوں میں وہ بھی اکٹھ کرتے اور کھانا تیار کرتے ہیں جس پر ان کے پنڈت باقاعدہ اپنی کتاب پڑھتے ہیں، ان حضرات کے علماء بھی ان کاموں کو کارثواب قرار دینے کے لیے دلائل گھڑتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوامی دین اختیار کر لینے کی وجہ سے ان کا کام یہ نہیں کہ قرآن و سنت سے لوگوں کی رہنمائی کریں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ لوگوں نے جو رسوم اختیار کر لی ہیں، انہیں قرآن و سنت سے ثابت کریں، خواہ ان کا قرآن و سنت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ بعض لوگ جو کسی اہل حدیث گھر میں پیدا ہو گئے مگر اتباع سنت سے اپنے آپ کو آراستہ نہ کر سکے، نہ بدعت سے اجتناب کا جذبہ قائم رکھ سکے، وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہیں۔ وہ اگر ان رسوم میں شریک ہوتے ہیں تو اتباع سنت کا آہائی شرف ہاتھ سے جاتا ہے، شریک نہیں ہوتے تو اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ جاہلانہ رسوم میں مبتلا حضرات کی ملامت برداشت کر سکیں۔ یہ لوگ ان رسوم کو جائز کرنے کے لیے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک حیلہ یہ ہے جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ تیسرے دن قل اور ختم وغیرہ کا اہتمام تو نہیں کرتے لیکن مولوی صاحب کی تقریر کروا لیتے ہیں اور ساتھ کھانا کھلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اس موقع پر میت والوں کے ہاں اکٹھ کرنا اور کھانا تیار کرنا اظہار غم کی ایک صورت ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نوحہ خوانی میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر کبھی اس قسم کا اجتماع نہیں کیا اور نہ کھانا ہی کا اہتمام کیا ہے۔

عورتوں میں یہ کام مردوں سے بھی زیادہ ہے حتیٰ کہ بعض اہل حدیث مدارس کی مقررہ خواتین باقاعدہ اس قسم کی مجالس میں شریک ہوتی ہیں اور اپنے خیال میں لوگوں کو قل اور ختم کی بدعات سے بچاتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ وہ دوسروں کو بدعت سے بچاتے بچاتے خود ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اس پر اجتماع اور کھانا نوحہ کی ایک قسم ہے اور بجائے خود ایک عبادت ہے۔

ہاں کسی کی موت کی خبر آنے پر اس کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کر کے بھیجنا سنت ہے کیونکہ اس وقت گھر والے غم و اندوہ کی وجہ سے کھانا پکانے کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

«لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اصْنَعُوا لِأَلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْعَلُهُمْ» [ابن ماجہ، کتاب الجنائز: باب ما جاء في الطعام يبعث الى اهل الميت (۱۶۱۰)،

ترمذی (۹۹۸)، ابوداؤد (۳۱۳۲)]

”جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس ایسی چیز آئی ہے جس نے انہیں مشغول کر دیا ہے۔“

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”وَ أُحِبُّ لِجِيرَانِ الْمَيِّتِ أَوْ ذِي قَرَابَةٍ أَنْ يَعْمَلُوا لِأَهْلِ الْمَيِّتِ فِي يَوْمِ يَمُوتُ وَ لَيْتَهُ طَعَامًا يُشْبِعُهُمْ فَإِنَّ ذَلِكَ سُنَّةٌ وَ ذِكْرٌ كَرِيمٌ وَ هُوَ مِنْ فِعْلِ أَهْلِ الْحَبْرِ قَبْلَنَا وَ بَعْدَنَا لِأَنَّهُ لَمَّا جَاءَ نَعَى جَعْفَرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: «اجْعَلُوا لِأَلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَإِنَّهُ جَاءَهُمْ مَا يَشْعَلُهُمْ» [كتاب الام (۳۱۷/۱)]

”میں میت کے رشتہ داروں کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ میت کی وفات کے دن اس کے گھر والوں کے لیے اس دن اور اس رات کے لیے اتنا کھانا تیار کریں جس سے وہ سیر ہو جائیں کیونکہ یہ سنت ہے اور اچھی یاد ہے اور یہ ہم سے پہلے اور پچھلے اہل خیر کا عمل ہے۔ کیونکہ جب جعفر رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ ان کے پاس وہ چیز آئی ہے جس نے انہیں مشغول کر دیا ہے۔“

اس حدیث سے اس دن میت کے گھر والوں کے پاس آنے والے مہمانوں کا کھانا تیار کر کے بھیجنے کی ترغیب بھی ملتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے لیے کھانا تیار نہیں کر سکتے تو مہمانوں کے لیے کھانا کیسے تیار کر سکیں گے۔ مگر اس حدیث کا مردہ قل ساتے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کھانا تیار کر کے جلے کے نام پر تعزیتی ماتمی اجتماع ہی کا کوئی تعلق ہے۔ میت کے گھر والوں کے پاس تعزیت کے لیے جانا بھی مسنون ہے مگر اس کے لیے باقاعدہ اجتماع کرنا اور اس کا دن مقرر کرنا درست نہیں۔ بغیر کسی پروگرام کے جیسے جیسے لوگ آتے جائیں تعزیت کر کے واپس چلے جائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ میت کے گھر میں تیسرے یا ساتویں دن قل اور ساتے کی بجائے کسی دینی پروگرام کا اہتمام کرنا اور کھانا تیار کرنا نوحہ خوانی میں شامل ہے اور درحقیقت ماتمی اجتماع ہے۔ اس لیے اس میں شریک ہونا جائز نہیں خواہ تبلیغ دین کے بہانے سے ہو کیونکہ ناجائز کام کو دین کی تبلیغ کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں جیسے کہ آج کل اقامت دین کی دعویدار جماعتیں تواری، تصویر کشی، موسیقی، بھنگڑے، ڈرامے، یوم پیدائش، برسی وغیرہ کو اپنے خیال میں اقامت دین کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی صرف وہی صورتیں جائز ہیں جن میں کوئی شرعی قباحت نہ پائی جائے۔ بلند مقاصد کے لیے ذرائع بھی صاف ستھرے ہونے چاہئیں۔

احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا

سوال: کیا احناف کے ہاں فاتحہ پیشاب سے لکھنا جائز ہے؟

جواب: پیشاب نجس و پلید ہے، اس کے ساتھ قرآن مجید لکھنا حرام ہے:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا رَفَعَهُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ عَامَّةُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ فَتَنْزَهُوا مِنَ الْبَوْلِ» [دارقطنی (۱/۱۲۸)]

”ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عام عذاب قبر پیشاب سے ہوتا ہے لہذا تم پیشاب سے بچو۔“

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبُولِ» [دارقطنی (۱۲۸/۱)، حاکم (۱۸۳/۱)، امام حاکم رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے اور مجھے اس کے ضعف کی کوئی علت معلوم نہیں۔ شیخین نے اس کو نہیں نکالا۔ امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے بھی تلخیص میں امام حاکم رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ہے۔]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اکثر عذاب قبر پیشاب سے ہے۔“

ان احادیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پیشاب نجس و پلید ہے اور اس پلیدی سے اجتناب نہ کرنے کے باعث عذاب قبر ہوتا ہے اور اس کی مثال بھی حدیث میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے دو آدمیوں کی قبر دیکھ کر بتایا کہ انھیں عذاب ہو رہا ہے جن میں سے ایک کو پیشاب سے اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔ لہذا جب پیشاب پلید اور نجس ہے تو اس کے ساتھ سورہ فاتحہ یا کوئی اور قرآنی آیت لکھنا بالکل حرام ہے اور قرآن مجید کی توہین ہے۔ لیکن اس کے برعکس فقہ حنفیہ میں سورہ فاتحہ کو پیشاب کے ساتھ لکھنا جائز لکھا گیا ہے۔ فقہ حنفی کا یہ فتویٰ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں بلخ کے ایک بہت بڑے حنفی فقیہ ابو جعفر ہندوانی کے استاد ابو بکر محمد بن احمد اسکاف کی طرف منسوب ہو کر شائع ہوا۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان میں موصوف سے منقول ہے:

”وَالَّذِي رُعِفَ فَلَا يَرَقًا دُمُهُ فَارَادَ أَنْ يَكْتُبَ بِدَمِهِ عَلَى جَبْهَتِهِ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ قَالَ أَبُو بَكْرِ الْأَسْكَافِ يَحُوزُ قَيْلٌ لَوْ كَتَبَ بِالْبُولِ قَالَ لَوْ كَانَ فِيهِ شِفَاءٌ لَا بَأْسَ بِهِ“ [فتاویٰ قاضی خان (۳۶۵/۴)]

”اگر کسی کی تکبیر بند نہ ہوتی ہو تو اس نے اپنے ماتھے پر خون کے ساتھ قرآن میں سے کچھ لکھنا چاہا تو ابو بکر اسکاف نے کہا: ”یہ جائز ہے۔“ کہا گیا: ”اگر وہ پیشاب کے ساتھ لکھے تو؟“ اس نے کہا: ”اس میں شفا ہو تو کوئی حرج نہیں۔“

یہی فتویٰ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ سراجیہ، باب التداوی (۷۵)، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، باب تنزح البعر بوقوع نحس (ص ۱۶۱)، حموی شرح الأشباہ والنظائر، باب القاعدة الحامسة الضرر لا يزال (ص ۱۰۸) اور الدر المختار شرح الدر المختار المعروف فتاویٰ شامی، باب التداوی بالمحرم (ص ۱۴۷) احتاف کا یہ فتویٰ انتہائی غلط ہے اور قرآن مجید کی توہین ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلك۔

ایک بریلوی عالم مولوی غلام رسول سعیدی نے صحیح مسلم کی اردو زبان میں شرح لکھی ہے، اس کی پہلی جلد میں ”عبد المجید شریقی برٹل برطانیہ“ کے تاثرات درج ہیں۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”فقہ کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علاج کی غرض سے خون یا پیشاب کے ساتھ سورہ فاتحہ کو لکھنا جائز ہے، راقم

الحروف نے اکثر علماء سے اس کے متعلق پوچھا مگر چونکہ یہ بات بڑے بڑے فقہاء نے لکھی ہے اس لیے سب نے اس مسئلے پر سکوت اختیار کیا ہے۔“

علامہ سعیدی نے پہلی بار اس جمود کو توڑا، وہ لکھتے ہیں:

”میں کہتا ہوں کہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورۃ فاتحہ لکھنے والے کا ایمان خطرے میں ہے۔ اگر کسی آدمی کو روز روشن سے زیادہ یقین ہو کہ اس عمل سے اس کو شفا ہو جائے گی تب بھی اس کا مرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورۃ فاتحہ لکھنے کی جرأت کرے۔ اللہ تعالیٰ ان فقہاء کو معاف کرے جن سے ہال کی کھال نکالنے اور جزئیات مستہلک کرنے کی عادت کی وجہ سے یہ قول شنیع سرزد ہو گیا ورنہ ان کے دلوں میں قرآن مجید کی عزت و حرمت بہت زیادہ تھی۔“ [شرح صحیح مسلم (۶/۵۵۷)]

مذکورہ بالا حوالہ سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ کو پیشاب یا خون سے لکھنا فحش کے اندر جائز قرار دیا گیا تھا جس پر مولوی غلام رسول سعیدی نے تبصرہ کرتے ہوئے اس سے مرجانا بہتر قرار دیا ہے۔ یعنی مذکورہ فقہاء مثلاً قاضی خان، ابو بکر اسکاف، ابن نجیم المعروف ابو حنیفہ ثانی، علامہ سراج الدین، حموی، ابن عابدین شامی اور فتاویٰ عالمگیری کو مرتب کرنے والے سینکڑوں فحش اس فتوے کو لکھ کر اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال گئے ہیں، ان کے لیے یہ فتویٰ دینے سے مرجانا بہتر تھا اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان حضرات کو فقہی جزئیات بیان کرتے ہوئے ہال کی کھال ادھیڑنے کی عادت تھی جس بنا پر انھوں نے بہت سے فضول اور لایعنی قسم کے فتوے صادر کیے جس کی حقیقت فتاویٰ عالمگیری کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ صحیح اور سیدھا دین قرآن و حدیث والا ہے، اس کو مضبوطی سے تھامنے میں نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی پر قائم و دائم رکھے۔ (آمین ۱)

قرآن خوانی کرانا

(سوال): کیا قرآن خوانی کرانا جائز ہے؟

(جواب) کچھ چیزیں اصلاً حرام ہوتی ہیں اور کچھ وصفاً حرام ہوتی ہیں۔ مثلاً خنزیر تو اصلاً حرام ہے اور غیر اللہ کے نام کا بکرا بھی حرام ہے لیکن یہ بکرا غیر اللہ کا نام پکارنے کی وجہ سے حرام ہوا ہے اصلاً حلال تھا۔ اسی طرح قرآن مجید پڑھنا اصلاً تو حلال و جائز تھا بلکہ ثواب ہے مگر قرآن خوانی کا مروجہ طریقہ حرام ہے۔ حلقہ بندی، مخصوص آیات و سورا کا ورد و تکرار اور پھر کسی خاص مقصد یا ایصال ثواب کے لیے پڑھنا، یہ ایسے اوصاف ہیں جو قرآن پڑھنے کو ثواب کی بجائے التابعدت یعنی گناہ بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں سنت سے ثابت نہیں ہیں اور جو عمل سنت سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَحَدَّتْ فِيْ أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيْهِ فَهَوٌ رَدٌّ » [بخاری، کتاب الصلح: باب إذا اصطالحوا علی

صلح جور (۲۶۹۷)]

”جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہے۔“

نیز فرمایا:

« وَ شَرَّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا » [بخاری، کتاب الاعتصام بالكتاب والسنة : باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ (۷۲۷۷)]

”دینی معاملات میں بدترین کام نئے ایجاد شدہ ہیں۔“

ویسے بھی نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نیک کام یا عبادت کو بھی اگر دنیاوی مقاصد کے لیے کیا جائے تو وہ دنیاوی مقاصد پورے ہوں یا نہ ہوں، دنیا داری کی نیت اس عمل کے ثواب کو برباد یا کم ضرور کر دیتی ہے۔ حدیث نبوی ہے:

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَ رَسُوْلِهِ فَهِيَ حِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَ رَسُوْلِهِ وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى الدُّنْيَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِيَ حِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَا جَرَ إِلَيْهِ » [بخاری، کتاب بدء الوحى (۱)، (۵۴)]

”اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے، جس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی تو واقعی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہی ہوئی اور جس نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت کا ثمرہ وہی ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔“

لہذا مرد وچہ قرآن خوانی اپنے دوسرے اوصاف کے اعتبار سے ہدعت ہونے کے ساتھ دنیا داری کی نیت کی وجہ سے بھی برباد ہے۔

جھوٹی قسم کا کفارہ

سوال اگر کوئی شخص مشکل میں پھنس جائے اور جھوٹی قسم اٹھانے پر اس کی مشکل حل ہو جائے تو اس کی سزا یعنی کفارہ کیا ہے؟

جواب جھوٹی قسم اٹھانا کبیرہ گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کبیرہ گناہ یہ ہیں، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو قتل کر دینا اور جھوٹی قسم اٹھانا۔“

[بخاری، کتاب الأیمان والنذور: باب اليمين الغموس: ۶۶۷۵]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”دو شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس جھگڑالے کر آئے۔ ان دونوں میں سے ایک (مدعی علیہ) پر قسم واقع ہو گئی۔ اس نے کہا: ”مجھے اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی محبوب نہیں! مدعی کی کوئی چیز میرے پاس نہیں۔“ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جبریل رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ”قسم کھانے والا جھوٹا ہے، مدعی کا حق اس کے پاس ہے۔“ آپ ﷺ نے اس کو مدعی کا حق ادا کرنے کا حکم دیا، جبریل رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اس کی قسم کا کفارہ لا الہ الا اللہ کی

معرفت ہے یا لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔“

[مسند احمد (۱/۲۹۶)، (۲۰۳)، (۳۲۲)، (۲/۷۰)، مستدرک حاکم (۴/۹۶) ابو داؤد (۳۲۷۵)، اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے]

امام ابو داؤد فرماتے ہیں: ”اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کفارہ ادا کرنے کا حکم نہیں دیا۔“ تفسیر احسن البیان (۳۲۲) میں ہے کہ قسم کی تین قسمیں ہیں: لغو، غموس اور معقدہ۔

لغو وہ قسم ہے جو انسان بات بات پر عادتاً بغیر ارادہ اور نیت کے اٹھاتا رہتا ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ غموس وہ جموئی قسم ہے جو انسان دھوکا اور فریب دینے کے لیے کھائے۔ یہ کبیرہ گناہ بلکہ اکبر الکبائر ہے لیکن اس کا کفارہ نہیں۔ معقدہ وہ قسم ہے جو انسان اپنی بات میں تاکید اور پختگی کے لیے اراداً اور نیتاً کھائے، ایسی قسم اگر توڑے گا تو اس کا وہ کفارہ ہے جو اگلی آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یعنی سورہ مانہ کی آیت (۸۹) میں۔

معلوم ہوا کہ جموئی قسم کا کفارہ نہیں صرف اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ کی شہادت دیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

قسم کا کفارہ اور مسکین کے کھانے کی مقدار

سوال قسم کا کفارہ کیا ہے اور مسکین کے کھانے کی مقدار کیا ہے؟

جواب اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورہ المائدہ (۸۹) میں قسم کا کفارہ یہ بیان کیا ہے کہ اوسط درجے کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یہ دس مسکینوں کو کھلاؤ یا انھیں کپڑے پہنا دو یا ایک غلام آزاد کرو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم کا کفارہ اور کھانے کی مقدار دونوں چیزیں بتا دی ہیں کہ تم اپنے گھروں میں جو اوسط درجے کا کھانا استعمال کرتے ہو اس میں سے دس مسکینوں کو کھلا دو۔ اس کی متعین مقدار کہ کلو یا ڈیڑھ کلو ہو، اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث وارد نہیں۔ ہر شخص اپنے گھر کا حساب دیکھ کر فیصلہ کرے اور لباس کم از کم اتنا ضرور ہو جس میں نماز ادا کی جا سکتی ہو۔ واللہ اعلم!

دو یا تین نابالغ بچوں کی وفات پر جہنم سے آزادی

سوال کیا یہ حدیث ہے کہ اگر کسی کے دو یا تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو جنت میں جگہ دے گا؟ برائے مہربانی صحیح رہنمائی کریں۔

جواب والدین کو اگر اپنی نابالغ اولاد کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑے تو ایسے والدین کو اس صدمے کا اجر ملتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”جب کسی مسلمان کے تین نابالغ بچے فوت ہو جائیں تو اللہ ان بچوں پر رحم کی وجہ سے ایسے مسلمان کو جنت میں داخل

کر دے گا۔“ [صحیح بخاری، کتاب الجنائز باب فضل من مات له ولد فاحتسب (۱۲۴۸)]

ایک خاتون بچہ لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر کہنے لگی:

”یا رسول اللہ! اس بچے کے لیے دعا فرمائیں کیونکہ میں اس سے قبل تین بچوں کو دفنا چکی ہوں۔“ آپ ﷺ نے کہا:

”کیا تو تین بچوں کو دفن کر چکی ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے اسے کہا: ”تب تو تم نے جہنم سے ایک

بہت محفوظ ہاڑ بنالی ہے۔“ [صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ: باب فضل من يموت له ولد فيحتسبه (۲۶۳۶)]

اگر کسی مسلمان کے دو بچے بھی فوت ہو جائیں تو وہ بھی اپنے والدین کے لیے ذریعہ نجات بن سکتے ہیں۔ نبی مکرم ﷺ

نے ایک بار خواتین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”تم میں سے جس کے تین بچے فوت ہو جائیں وہ (قیامت کے دن) جہنم سے رکاوٹ کا ذریعہ بن جائیں گے۔“ ایک

عورت نے پوچھا: ”اگر کسی کے دو بچے فوت ہو جائیں تو کیا حکم ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! دو بچے بھی جہنم سے

رکاوٹ بن جائیں گے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الجنائز: باب فضل من مات له ولد فاحتسب (۱۲۴۹)]

مذکورہ بالا احادیث صحیحہ صریحہ سے معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی کو اگر اپنے تین یا دو نابالغ بچوں کا صدمہ برداشت کرنا پڑے تو

اس اندوہناک اور غمناک حادثہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اجر سے نوازے گا اور یہ بچے ان کے لیے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بن

جائیں گے اور اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے گا۔ مومن آدمی کا معاملہ اللہ کے ساتھ بہت پیارا ہے، یہ مصیبت

آنے پر صبر سے کام لیتا ہے اور خوشی آنے پر شکر کرتا ہے اور صبر و شکر دونوں اس کے حق میں اللہ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ لہذا مسلم

آدمی کو ہر مصیبت پر صابر اور ہر خوشی و مسرت پر شاکر رہنا چاہیے اور ہر دو صورتوں میں اس کے لیے اجر ہی اجر ہے۔

چچا زاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ

سوال: کیا چچا زاد یا خالہ زاد بھائی سے پردہ ضروری ہے؟

جواب: مسلمان عورت کے لیے غیر محرم مرد سے حجاب و پردہ ضروری ہے۔ شوہر کے بھائی یا چچا زاد یا خالہ زاد بیوی کے لیے

محرم ہیں لہذا وہ ان کے سامنے بے حجاب نہیں رہ سکتی اور جسم کے جو اعضا وہ اپنے محرم رشتہ دار کے سامنے کھول سکتی ہے وہ ان

کے سامنے نہیں کھول سکتی اگرچہ یہ لوگ کتنے ہی پارسا، متقی، پرہیزگار اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں۔

عورت جن لوگوں کے سامنے اپنی زینت ظاہر کر سکتی ہے ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ

إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوْ التَّابِعِينَ غَيْرِ

أُولَى الْأَرْبَابَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوْ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ﴾ [النور: ۳۱]

” اور اپنی زیب و زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپوں یا اپنے سر یا اپنے بیٹے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجیوں یا اپنے بھانجیوں یا اپنے میل جول کی عورتوں یا اپنے غلاموں یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے واقف نہیں۔“

خاوند کے بھائی یا اس کے چچا زادان رشتوں کی وجہ سے بیوی کے محرم نہیں ہیں۔ عزت و آبرو کے تحفظ اور فساد و شر کے ذرائع کو روکنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صالح اور غیر صالح میں کوئی فرق نہیں کیا اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ شوہر کے بھائی کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”خاوند کا بھائی تو موت ہے۔“ [بخاری، کتاب النکاح: باب لا یخلون رجل (۵۲۳۲)، مسند احمد (۴/۴۹۷)]

”حمو“ سے مراد خاوند کے بھائی دیور، جیٹھ وغیرہ ہیں جو بیوی کے لیے محرم نہیں ہیں، لہذا مسلمان کو دین کے تحفظ اور عزت و آبرو کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ جو لوگ اسلامی احکامات کو سچے دل سے قبول کر لیتے ہیں ان کے لیے اس پر عمل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ایک ہی گھر میں رہ کر عورت اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر اپنے گھر کے کام کاج کرے اور دیور، جیٹھ وغیرہ کو بھی چاہیے کہ وہ اس معاملے میں محتاط رہیں، گھر میں کام کاج کے وقت اپنی بھانجی کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ گھر کے کسی کمرے میں بیٹھ جائیں۔ بکثرت آمد و رفت نہ کریں۔ اگر کسی ضرورت کے لیے باہر نکلنا ہو تو آواز دے کر متنبہ کر دیں تاکہ پردہ کر لیا جائے۔ لہذا میرے بھائی دین کی باتوں پر عمل کرنا اہل اسلام کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی ایسے معاملات تھے لیکن وہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سچے نمونے تھے، انھیں اللہ کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری ہی میں کامیابی نظر آتی تھی، اس لیے ہمیں بھی فراخ دلی سے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور ایسے مسائل کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔

آیت کریمہ پڑھنے کی فضیلت

(سوال) کیا آیت کریمہ پڑھنے کی کوئی فضیلت ہے؟

(جواب) آیت کریمہ قرآن مجید کی سورۃ الانبیاء کی مشہور آیت ہے، اللہ کے نبی پونس ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ ذَا النُّونِ اِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ ﴾ [الانبیاء: ۸۷]

” اور مچھلی والے (نبی پونس ﷺ کو یاد کیجیے) جب وہ غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر اس نے اندھیروں میں پکارا: ”الہی! تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی خطا

کاروں میں سے ہوں۔“ تو ہم نے اس کی پکار کو قبول کیا اور ہم سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیتے ہیں۔“

قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نبی یونس علیہ السلام جب مچھلی کے پیٹ میں گرفتار ہو گئے اور مشکلات میں پھنس گئے تو انھوں نے مشکل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ کو ان کلمات کے ساتھ پکارا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ان اندھیروں سے نجات دے دی اور بتا دیا کہ مشکلات کو حل کرنے والا، مصائب و بلیات سے نجات دینے والا، دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا سب سے بڑا فریاد رس غوث اعظم صرف اللہ تعالیٰ ہے اور مشکل سے نجات صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کوئی بھی ایمان والا اللہ تعالیٰ کو پکارے تو وہ اس کی دعا سنتا اور قبول کرتا ہے۔

جیسا کہ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں۔ اس لیے مشکل حالات میں آفات و بلیات کو ٹالنے کے لیے آیت کریمہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

« دَعْوَةُ ذِي النُّونِ إِذَا دَعَا بِهَا وَهُوَ فِي بَطْنِ الْحُوتِ ﴿ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴾ فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا مُسْلِمٌ رَبَّهُ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ لَهُ ﴾ [عمل الیوم واللیلہ (۶۵۶)، مسند احمد (۱۷۰/۱)، حاکم (۵۰۵/۱)، المختارۃ للضیاء المقدسی، ترمذی (۳۵۰۵)]

”مچھلی والے پیغمبر کی دعا، جب انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں پکارا ﴿ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴾ تھی، اس دعا کے ساتھ کوئی مسلمان کسی بھی چیز کے متعلق دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔“

اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیا یہ دعا یونس علیہ السلام ہی کے ساتھ خاص ہے یا عام مومنین کے لیے بھی ہے؟“ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

« أَلَا تَسْمَعُ إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿ فَنَجِّنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَلِكَ نُنَجِّي الْمُؤْمِنِينَ ﴾ »

”کیا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنتا: ”ہم نے اسے غم سے نجات دی اور ایمان والوں کو ہم اسی طرح نجات دیتے ہیں۔“

یعنی یہ دعا صرف یونس علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام ایمان والوں کے لیے بھی ہے، جب بھی ایمان والے اللہ تعالیٰ کو آفات و بلیات، مشکلات و مصائب، دکھ و آلام میں، الغرض کسی بھی کام کے لیے پکاریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرے گا، اس لیے جو شخص ضرورت مند ہے وہ خود یہ دعا اللہ کے حضور کرے، اپنی حاجت اللہ کے سامنے رکھ کر اسے پکارے۔ عامۃ الناس کی اکثریت اس بات میں گرفتار ہے کہ وہ کھجور کی گھٹلیاں یا اس جیسی دیگر اشیاء جمع کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور آیت کریمہ پڑھواتے ہیں، یہ ایک رواج بن چکا ہے اور بالکل بے ثبوت اور بے بنیاد چیز ہے۔ ہر انسان کو اپنا تعلق

اللہ تعالیٰ سے استوار کرنا چاہیے، وہ خود اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے، اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہو، توبہ و استغفار سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

وہ ضرور معاف کرے گا اور اپنی رحمت بے پایاں سے کرم کرے گا، ہاں زندہ انسان سے جا کر دعا بھی کروا سکتا ہے لیکن لوگوں کا ہجوم بولا کر سنگ ریزوں یا گھٹیوں پر آیت کریمہ کا ورد کرانا سوائے ایک رواج کے اور کچھ نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی مذکورہ حدیث اور قرآن حکیم کی آیت سے صرف یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جس مسلم کو کوئی حاجت ہے وہ خود اللہ تعالیٰ سے ان کلمات کے ذریعے دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ ہماری آفات کا ازالہ فرمائے اور قحط سالی، دکھ درد اور ہر قسم کی بیماریوں سے شفا نصیب فرمائے۔ (آمین!)

تاج کہنی کی کتاب اعمال قرآنی

(سوال) تاج کہنی کی مطبوعہ کتاب ”اعمال قرآنی“ میں لکھا ہے کہ فلاں فلاں آیات کو کسی چیز پر اس طرح دم کر کے کھایا پیا جائے تو مسئلہ حل ہوتا ہے۔ سورۃ نور کی آیات (۳۹، ۴۰) کے بارے لکھا ہے کہ ”ان آیات کو لوگ کے چالیس دانوں پر دم کر کے ہر رات ایک دانہ کھایا جائے، تو اولاد ہو جائے گی“ کیا یہ درست ہے؟

(جواب) قرآن حکیم یا کسی صحیح حدیث میں ایسی بات مروی نہیں ہے کہ قرآن کی یہ آیات لوگ کے چالیس دانوں پر دم کر کے کھائیں تو اولاد ہوگی، یہ صاحب کتاب کی اپنی ایجاد ہوگی یا کسی اور بزرگ کا قول، البتہ قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مسنون اور صحیح اذکار سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مختلف مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچنے کے اذکار و وظائف کے بارے میں راقم کی کتاب ”پریشانیوں سے نجات“ ملاحظہ کر لیں، جس میں صرف صحیح احادیث اور قرآنی آیات درج کی گئی ہیں۔

ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب

(سوال) کیا ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نمازوں کا ثواب مل سکتا ہے؟

(جواب) دینی امور کی تبلیغ و اشاعت یا تحصیل دین نماز و روزہ وغیرہ کے لیے ایسی کوئی صحیح و صریح حدیث نہیں ملتی جس میں یہ بات مذکور ہو کہ ایک نماز یا ایک تسبیح کا ثواب انچاس کروڑ نمازوں کے برابر ہے۔ تبلیغی حضرات نے اس بات کی بنیاد ضعیف روایات پر رکھی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ أَرْسَلَ بِنَفَقَةٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ أَقَامَ فِي بَيْتِهِ فَلَهُ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ دِرْهَمٍ وَ مَنْ عَزَا بِنَفْسِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ أَنْفَقَ فِي وَجْهِ ذَلِكَ فَلَهُ بِكُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُمِائَةِ أَلْفٍ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ ﴿ وَ اللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾ » [ابن ماجہ، کتاب الجہاد: باب فضل النفقة فی سبیل اللہ (۲۷۶۱)]

”جس نے اللہ کی راہ میں خرچہ بھیج دیا اور خود گھر میں ٹھہرا رہا، اس کے لیے ہر درہم کے بدلے میں سات سو درہم ہیں اور جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا اور اپنے اوپر اس مال کو خرچ کیا، اس کے لیے ہر درہم کے معاوضے میں سات لاکھ درہم کا ثواب ہے۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ”اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔“ اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الصَّلَاةَ وَالصَّيَامَ وَالذِّكْرَ يُضَاعَفُ عَلَى النَّفَقَةِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ بِسَبْعِمِائَةٍ ضِعْفٍ» [التَّغْيِبِ وَالتَّرْهِيْبِ (۲/۲۶۷)]

”یقیناً نماز، روزہ اور ذکر اللہ کی راہ میں روپیہ خرچ کرنے سے سات سو گنا ملتا ہے۔“

سبز پٹریوں والے یعنی دعوت اسلامی والے بھی انہی ضعیف روایتوں کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے ساتھ نکلنے والے ماور وقت لگانے والے کو ایک نماز کے بدلے انچاس کروڑ نماز کا ثواب ملے گا۔ یہ عقیدہ انہوں نے شاید تبلیغی جماعت ہی سے متاثر ہو کر اپنایا ہے۔

اسی طرح سات لاکھ کو سات سو سے ضرب دینے سے انچاس کروڑ بن جاتے ہیں لیکن یہ دونوں روایات سنداً ضعیف اور ناقابل حجت ہیں۔ پہلی روایت میں ظلیل بن عبد اللہ راوی مجہول ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ روایت منکر ہے۔“ [تہذیب التہذیب (۳/۱۶۷)، لسان المیزان (۲/۴۱۰)]

امام منذری رحمہ اللہ نے بھی ترغیب و ترہیب میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی عدالت و جرح کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ دوسری روایت میں دو ضعیف راوی ہیں۔

① پہلا راوی زبان بن فائد امام ساجی ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی روایات کو منکر کہا ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے اسے ضعیف اور امام ابن حبان نے منکر الحدیث اور ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۳/۳۰۸)]

② دوسرا راوی سہل بن معاذ ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی روایت کو ناقابل اعتبار اور ضعیف قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب (۴/۲۵۸)]

لہذا جب یہ دونوں روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تو ان سے استدلال بے کار ہے۔ ثانیاً اگر یہ روایات بالفرض صحیح بھی ہوں، تو تب بھی یہ ثواب تبلیغی جماعت کے لیے نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین کے لیے ہوگا۔ اس روایت کے الفاظ «مَنْ عَزَا بِنَفْسِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ» ”جو بذات خود اللہ کی راہ میں نکل کر لڑا“ اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اور اس نوع کی دوسری جماعتیں تو قتال فی سبیل اللہ کو تسلیم ہی نہیں کرتیں، لہذا وہ اس ثواب سے محروم ہوں گی۔

ترجمہ پڑھنے کا ثواب

(سوال) کیا ترجمہ پڑھنے کا بھی اجر ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴾ [محمد: ۲۴]

”بھلا کیا وہ غور نہیں کرتے قرآن میں یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں؟“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ » [بخاری، کتاب العلم: باب من یرد اللہ خیراً یفقهہ فی الدین (۷۱)، مسلم (۱۰۳۷)]

”اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرنا چاہتا ہے اس کو دین میں سمجھ دے دیتا ہے۔“

فرمان باری تعالیٰ ہے:

”اللہ جسے چاہے دین کی باتوں میں عقل اور سمجھ دے دیتا ہے اور جسے سمجھ عنایت ہوئی، اسے بڑی نعمت مل گئی اور نصیحت قبول کرنا صرف عقلمند کا کام ہے۔“ [البقرة: ۲۶۹]

حدیث میں ہے:

”عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔“ [ابوداؤد، کتاب العلم: باب فی فضل العلم (۳۶۴۱)، ترمذی، (۲۶۸۲)، ابن ماجہ (۲۲۳)]

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ دین میں سمجھ بوجھ اور بصیرت حاصل کرنے کی فضیلت ملتی ہے۔ اگر قرآن کی تلاوت کے علاوہ ترجمہ پڑھنے اور دین میں بصیرت حاصل کرنے کا ثواب نہ ہوتا تو یہ فضیلت علماء کو بھی حاصل نہ ہوتی۔ البتہ صرف ترجمہ پڑھنے کو قرآن کی تلاوت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ترجمہ پڑھنے کا ثواب اپنی جگہ اور تلاوت کا ثواب اپنی جگہ ہے۔

سیاہ لباس پہننا

(سوال) سیاہ کپڑے پہننا کیسا ہے؟

(جواب) شرعی طور پر سیاہ لباس پہننے میں کوئی قباحت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ام خالدہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے وہ کہتی ہیں:

”نبی کریم ﷺ کے پاس کپڑے لائے گئے، ان میں ایک چھوٹی سیاہ چادر تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارے خیال میں ہمیں یہ چادر کس کو پہنانی چاہیے؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے پاس ام خالد بنت خالد کو لاؤ۔“ اسے اٹھا کر لایا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اسے چادر پہنا دی اور فرمایا: ”اسے بوسیدہ اور پرانا کر۔“ اس چادر میں سبز یا زرد نشانات تھے، آپ نے فرمایا: ”اے ام خالد! یہ اچھا ہے۔“ [بخاری، کتاب

اللباس: باب الخمیصة السوداء (۵۸۲۳)]

اسی طرح بخاری شریف کے اس مقام پر نبی ﷺ کی سیاہ چادر کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ لباس پہننا درست ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بعض مخصوص ایام میں ان سے مشابہت کی وجہ سے اجتناب کیا جائے۔

مرد و خواتین کا اختلاط

(سوال) میں ایک ایسے ہسپتال میں ملازمت کرتا ہوں جس میں ہمیشہ اجنبی عورتوں سے اختلاط رہتا ہے اور ان سے بات چیت کرنا پڑتی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(جواب) خواتین سے اختلاط نا جائز اور انتہائی مہلک اور حد درجہ خطرناک ہے، خاص طور پر جب عورت زیب و زینت سے ہو اور بے پردہ ہو۔ کیونکہ ایسی خواتین جو زینت لگا کر میک اپ کے دیزیز پردوں میں معطر ہو کر مردوں کی مجالس سے گزرتی ہیں انھیں شرعاً ہر کار قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو بھی عورت خوشبو لگا کر کسی قوم کے پاس سے گزرے تاکہ وہ اس کی خوشبو پالیں وہ زانیہ ہے۔“ [مسند احمد (۴/۴۱۴)]

اسی طرح خوشبو لگانے والی عورت کو رات کی نماز میں حاضر ہونے سے روکا گیا ہے۔ [مسند احمد (۲/۳۰۴)]

آج ہسپتالوں، دفاتر، یونیورسٹیز الغرض ہر ادارے میں عورتوں کو داخل کر دیا گیا ہے اور وہ بے پردہ، میک اپ کر کے مردوں میں گھومتی پھرتی ہیں۔ اسلام میں اس طرح مرد و زن کا اختلاط حرام ہے۔ آپ کوئی ایسی ملازمت تلاش کر لیں جہاں ایسی قباحتیں نہ ہوں۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو شرعی آداب سکھائیں اور اسلام کی پابند بنائیں، انھیں ایسی نوکری کے لیے مت بھیجیں جو فتنے کا باعث ہو اور معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کرے۔

گھروں میں پردہ

(سوال) کیا خواتین کو اپنے گھروں میں بھی دوپٹا اوڑھنا چاہیے؟

(جواب) مسلمان عورت کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا فیصلہ ہے کہ یہ پردے کے اندر رہنی چاہیے، اسے کھلے عام پھرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ عورت کو اپنے گھر میں بھی سر پر دوپٹا وغیرہ اوڑھنا چاہیے کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتْ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ» [ترمذی، کتاب الرضاع: باب ما جاء في كراهية الدخول على المغيبات (۱۱۷۳)، صحيح ابن خزيمة (۱۶۸۵، ۱۶۸۶)، صحيح ابن حبان (۳۲۹- الموارد) المعجم الكبير للطبراني (۱۰/۱۳۲)، تاريخ بغداد (۸/۴۵۱)، مجمع الزوائد (۲/۱۵۶)، علامه الباني رحمه الله نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱/۳۰۳)، (۲۷۳)، نصب الرایة (۲۹۸، ۲۹۹)]

”عورت پردہ ہے جب یہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت ایسی چیز ہے جو چھپانے کے لائق ہے، اس لیے عورت کو بذات خود پردہ قرار دے دیا، لہذا مسلمان خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنے سارے وجود کو ڈھانپ کر رکھیں سوائے چہرے اور ہاتھوں کے، کیونکہ گھر میں کام کاج کے لیے انہیں کھلا رکھنا ایک ضرورت ہے اور یہ ستر سے مستثنیٰ ہے لیکن غیر مردوں کے آگے ان اعضاء کو بھی کھلا نہیں رکھنا چاہیے۔

نماز کی تارک بیوی کا حکم

(سوال) میرے گھر میں نماز کے معاملہ میں بہت سستی ہے، خصوصاً میری اہلیہ نماز ادا کرنے میں غفلت کا شکار ہو جاتی ہے جبکہ چھوٹے بچے نماز ادا کرنے کے لیے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بے وضو ہوتے ہیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ نماز سیکھیں تو اس حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

(جواب) بچوں کو نماز سکھانا ہمارا حق و فریضہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قول و فعل سے بچوں کو مسنون نماز کا طریقہ بتائیں کیونکہ ابوداؤد میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کی تعلیم دو اور دس سال کے ہو جائیں تو انہیں مار کر نماز پڑھاؤ۔ اس صحیح حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ تربیت اولاد انتہائی ضروری ہے، بچوں کو سات سال کی عمر تک نماز سکھا دینی چاہیے۔ نبی مکرم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے امت کو فریضہ نماز بتایا ہے۔ جب آپ کے لیے منبر بنا دیا گیا تو آپ نے اس پر چڑھ کر نماز ادا کی اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو منبر سے اتر کر زمین پر سجدہ کیا اور پھر ارشاد فرمایا:

« أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا صَنَعْتُ هَذَا لِتَأْتُمُوا بِي وَ لِتَعْلَمُوا صَلَاتِي » [صحیح البخاری، کتاب

الجمعة: باب الخطبة على المنبر (۹۱۷)]

”اے لوگو! میں نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا تاکہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز سیکھ لو۔“

لہذا عملاً نماز سکھانا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے، بچے اگر کچھ بوجھ والی عمر کو پہنچ چکے ہیں تو انہیں طہارت اور وضو کا طریقہ بتانا چاہیے پھر نماز سکھانی چاہیے۔ رہا بیوی کا مسئلہ تو شوہر پر واجب ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے اور ادب سکھائے، اگر وہ اس کا حکم مان کر نماز ادا کرنے لگ جائے تو بہت اچھا ہے اور اگر ترک نماز پر اصرار کرے تو کافر ہو جائے گی اور اس کے لیے حلال نہیں رہے گی، نکاح ٹوٹ جائے گا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہجرت کرنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا:

﴿ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ﴾

[متحنہ : ۱۰]

”اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ ایمان والی ہیں تو انہیں کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ، یہ ان کے لیے حلال نہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں۔“

مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی کافر یا مرتد سے شادی کرے اور اگر یہ ارتداد یا صریح کفر نکاح کے بعد پیدا ہوا ہو تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، لہذا مسلمان مرد یا عورتیں سب کو چاہیے کہ وہ فریضہ نماز ادا کریں۔ اس جوڑے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی دعا ہے جو رات کو قیام کے لیے ایک دوسرے کو بیدار کرتے ہیں، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى وَ أَيْقَظَ امْرَأَتَهُ فَإِنِ ابْتِ نَضَعَ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ رَحِمَ اللَّهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَ أَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَإِنِ أَبِي نَضَحَتْ فِي وَجْهِ الْمَاءِ»

[ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ: باب قیام اللیل (۱۳۰۸)، ابن خزیمہ (۱۱۴۸)، ابن حبان (۶۴۶)، المستدرک للحاکم (۳۰۹/۱)]

”اللہ تعالیٰ ایسے مرد پر رحم کرے جو رات کو اٹھے اور نماز ادا کرے اور اپنی بیوی کو بیدار کرے، اگر وہ اٹھنے سے انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینے مارے اور ایسی عورت پر بھی رحم کرے جو رات کو اٹھ کر نماز ادا کرے اور اپنے شوہر کو بیدار کرے، اگر وہ بیدار ہونے سے انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی کے چھینے مارے۔“

اس حدیث کو امام حاکم اور امام ذہبی رضی اللہ عنہما نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، یہ روایت نسائی اور ابن ماجہ میں بھی موجود ہے اور محمد بن عجلان کی تصریح بالسماع نسائی کے ہاں ثابت ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَيْقَظَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى أَوْ صَلَّى رَكَعَتَيْنِ جَمِيعًا كُتِبَا فِي الذَّاكِرِينَ وَ الذَّاكِرَاتِ » [ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ: باب قیام اللیل (۱۳۰۹)، ابن حبان (۶۴۵)]

”جب آدمی رات کے وقت اپنی اہلیہ کو بیدار کرے پھر وہ دونوں نماز ادا کریں یا فرمایا دونوں دو رکعت پڑھیں تو وہ دونوں ذاکرین اور ذاکرات میں لکھے جائیں گے۔“

ان ہر دو صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے مرد کو اپنی اہلیہ اور عورت کے لیے اپنے شوہر کو جگانا چاہیے، کیونکہ نماز ایک اہم ترین فریضہ ہے، اس سے غفلت برتنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اللہ ہمیں صحیح عمل کی توفیق عنایت کرے۔ (آمین!)

عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے کی دلیل پکڑنے والوں کا رد

(سوال) کیا یہ روایت کسی صحیح سند سے مروی ہے: «لَوْ كَانَ مُوسَى وَ عِيسَى حَيِّينِ لَمَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اتِّبَاعِي»

”اگر موسیٰ و عیسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔“ مرزائی حضرات اس روایت کو پیش کر کے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرتے ہیں۔ صحیح تحقیق اس کے بارے میں کیا ہے؟

(جواب) اس روایت کو ابن کثیر نے «وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ» کی تفسیر (۴۰۶/۱) اور سورہ کہف میں موسیٰ و خضر کے قصہ میں (۱۱۱/۳) بیان کیا ہے، لیکن اس کا کوئی حوالہ بیان نہیں کیا جبکہ اس روایت کا حدیث و سنت کی معروف کتب میں کہیں ذکر نہیں اور نہ اس کی کوئی اصل ہے اور یہ ان متواتر احادیث کے خلاف ہے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ اٹھانے

جانے کا ذکر ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بارے میں مولانا ابراہیم میرسیا لکھنؤی رحمہ اللہ کی کتاب ”شہادۃ القرآن“ لائق مطالعہ ہے، اسی طرح حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں متواتر روایات پر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کا ایک مضمون ماہنامہ ”محدث“ میں طبع ہو چکا ہے۔ اصل حدیث یوں ہے: ((لَوْ كَانَ مُؤَسَى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي)) أَوْ كَمَا قَالَ۔

ہومیو پیتھی ادویات استعمال

(سوال) کیا ہومیو پیتھی ادویات استعمال کرنا جائز ہے؟

(جواب) یہ بات بالکل عیاں اور واضح ہے کہ ہومیو پیتھک ادویات میں الکحل استعمال ہوتی ہے اور الکحل شراب ہے، اس کے استعمال کی اجازت نہیں۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ سے شراب کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا اس کا سرکہ بنایا جا سکتا ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔“ [مسلم، کتاب الأشربة: باب تحريم تحليل الخمر (۱۹۸۳)]

وائل حضری سے روایت ہے: ”طارق بن سويد نے نبی ﷺ سے شراب کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے منع کیا تو اس نے کہا: ”میں نے یہ دوائی کے لیے بنائی ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بلاشبہ یہ دوا نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے۔“ [مسلم، کتاب الأشربة: باب تحريم التداوي بالخمير (۱۹۸۴)]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی یمن سے آیا، اس نے نبی ﷺ سے ایسی شراب کے بارے میں پوچھا جسے وہ اپنی زمین میں مکئی سے بنا کر پیتے تھے، اسے مزر کہا جاتا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہ نشہ آور ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر نشہ آور حرام ہے۔ بے شک اللہ کا اس شخص کے لیے عہد ہے جو نشہ آور چیز پیتا ہے کہ اسے طیبۃ النبال سے پلائے گا۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! طیبۃ النبال کیا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ جہنیوں کا پینا دغیرہ ہے۔“ [مسلم، کتاب الأشربة: باب بيان أن كل مسكر خمر (۲۰۰۲)]

الغرض اس معنی کی بے شمار احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ الکحل یعنی شراب پینا حرام ہے لہذا وہ دوا جس میں شراب ملائی گئی ہو خواہ وہ ہومیو پیتھک ہو، ایلو پیتھک یا دیسی اس کا استعمال حرام ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ استعمال کے وقت وہ موجود نہیں ہوتی تو گزارش یہ ہے کہ شراب کی بیج اور خریداری بھی منع ہے۔ جب یہ دوا خریدی جاتی ہے تو اس میں الکحل ہوتی ہے لہذا اس کا پینا اور خریداری کرنا دونوں حرام ہیں۔

لقطہ کا حکم

(سوال) لقطہ یعنی گری پڑی چیز کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(جواب) لفظ زمین پر گری ہوئی چیز اٹھالینے کو کہتے ہیں، اس کی تین صورتیں ہیں:

① وہ چیز بالکل معمولی سی ہو اور کھانے کے کام آنے والی ہو۔ اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے اٹھا کر صاف

کر کے تناول کر لیا جائے جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرَةٍ مَسْقُوطَةٍ فَقَالَ لَوْ لَا أَنْ تَكُونَ مِنْ صَدَقَةٍ لَأَكَلْتُهَا»

[بخاری، کتاب البیوع: باب ما يتزوه من الشبهات (۲۰۵۵)]

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک گری ہوئی کھجور کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”اگر (مجھے یقین ہوتا کہ) یہ صدقہ کی نہیں ہے تو میں اسے کھا لیتا۔“

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّي لَأَنْقَلِبُ إِلَى أَهْلِي فَأَجِدُ التَّمْرَةَ سَاقِطَةً عَلَى فِرَاشِي فَأَرْفَعُهَا لِأَكْلِهَا ثُمَّ أَحْشَى أَنْ تَكُونَ صَدَقَةً فَأَلْقِيهَا»

[بخاری، کتاب اللقطة: باب إذا وجد تمره في الطريق (۲۴۳۲)]

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”(کبھی) جب میں اپنے گھر آتا ہوں تو اپنے بستر پر پڑی ہوئی کھجور دیکھتا ہوں تو کھانے کے لیے اس کو اٹھا لیتا ہوں لیکن پھر خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ صدقہ کی نہ ہو، اس لیے میں اسے پھینک دیتا ہوں۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر راستے میں کوئی ایسی گری پڑی چیز مل جائے جو معمولی ہو اور کھانے کے قابل ہو تو اٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ظَاهِرٌ فِي جَوَازِ أَكْلِ مَا يُوجَدُ مِنَ الْمُحَقَّرَاتِ مُلْتَمَى فِي الطَّرِيقَاتِ لِأَنَّهُ ذَكَرَ أَنَّهُ لَمْ يَمْتَنِعْ مِنْ أَكْلِهَا إِلَّا تَوَرُّعًا لِخَشْيَةِ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ الَّتِي حُرِّمَتْ عَلَيْهِ لَا لِغَوْنِهَا مَرْمِيَّةً فِي الطَّرِيقِ فَقَطُ“ [فتح الباری: ۸۶/۵]

”یہ حدیث راستے میں پڑی ہوئی حقیر چیزوں کو اٹھا کر کھالینے کے جواز میں ظاہر ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ذکر کیا ہے کہ انھیں اس کھجور کے کھانے میں صرف یہ چیز مانع ہوئی کہ کہیں یہ صدقہ کی نہ ہو جو آپ پر حرام کیا گیا ہے۔ نہ کہ اس کا راستے میں فقط گرا پڑا ہونا۔“

لہذا معمولی سی کھانے والی چیز گری پڑی مل جائے تو اسے اٹھا کر کھا سکتے ہیں، اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ وہ چیز ہو تو معمولی نوعیت کی مگر کھانے کے کام آنے والی نہ ہو جیسے چھڑی، کوڑا، رسی، چاقو وغیرہ۔

اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ تین دن تک لوگوں کے اجتماع میں اعلان کرتا رہے یا اتنی دیر اعلان کرے کہ اسے

یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اس کے بعد اسے تلاش نہیں کرے گا۔ سید سابق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”الْشَّيْءُ الْحَقِيرُ لَا يُعْرَفُ سَنَةً بَلْ يُعْرَفُ زَمَنًا يُظَنُّ أَنْ صَاحِبَهُ لَا يَطْلُبُهُ بَعْدَهُ وَ لِلْمُلْتَقِطِ أَنْ

يَنْتَفِعَ بِهِ إِذَا لَمْ يُعْرِفْ صَاحِبَهُ“ [فقہ السنۃ : ۲۳۳/۳]

”حقیر سی چیز کا سال بھر اعلان نہ کیا جائے بلکہ اتنی دیر اعلان کیا جائے کہ یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اس کے بعد اسے تلاش نہیں کرے گا۔ ایسی چیز کو اٹھانے والا اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے جب اس کا مالک معلوم نہ ہو۔“
اس کی دلیل بعض روایات و آثار سے ملتی ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«رَخَّصَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَصَا وَالسُّوْطِ وَالْحَبْلِ وَإِشْبَاهِهِ يَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ يَنْتَفِعُ بِهِ» [ابو داؤد، کتاب اللقطة: باب التعريف باللقطة (۱۷۱۷)، بیہقی (۱۹۰/۶)]
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں لاشی، کوڑا، رسی اور اس جیسی اشیاء میں رخصت دی ہے کہ اگر کوئی آدمی ایسی چیز گری پڑی اٹھالے تو وہ اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے۔“

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”وَ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ“ [فتح الباری : ۸۵/۵]

”اس کی سند میں ضعف ہے۔“

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”فِي هَذَا الْحَدِيثِ شَكٌّ وَ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ“ [بیہقی (۱۹۰/۶)]

”اس حدیث کے مرفوع ہونے میں شک ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے۔“

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ راجح بات یہ ہے کہ حدیث موقوف ہے، مرفوع نہیں اور مرفوع و موقوف دونوں صورتوں میں علت یہ ہے کہ اس کی سند میں ابو الزبیر مدلس راوی ہیں اور انھوں نے اپنے استاد سے سننے کی وضاحت نہیں کی۔ [ارواء الغلیل (۱۵/۶)]

علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث ہے کہ انھیں بازار سے ایک دینار ملا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کہا: ”تین دن تک اس کا اعلان کرو۔“ انھوں نے ایسا ہی کیا تو کوئی شخص ایسا نہ ملا جو اس دینار کو پہچاننے والا ہو۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر کے آپ کو خبر دی۔ آپ نے انھیں کہا: ”اسے کھا لو۔“ اس نے اس ایک دینار کو بارہ درہم سے تبدیل کیا، اس میں سے تین درہم کی بھجوریں اور ایک درہم کا زیتون خریدا..... الغرض ان کے پاس تین درہم باقی بچ گئے۔ جب انھوں نے ان اشیاء میں سے کچھ حصہ استعمال کر لیا تو اس دینار کا مالک آ گیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: ”مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھالینے کا حکم دیا تھا۔“ وہ اسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ بات بیان کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”اس کا دینار اسے ادا کر دو۔“ انھوں نے کہا: ”ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب ہمارے پاس کوئی چیز آئے گی تو ہم اسے ادا کر دیں گے۔“ [عبد الرزاق (۱۴۲/۱۰)، (۱۸۶۳۷)، باب احلت اللقطة اليسيرة، نصب الراية (۳/۴۷۰)، كشف الأستار (۲/۱۳۱)،

(۱۳۶۸)، مسند ابی یعلیٰ (۲/۳۳۲)، (۱۰۷۳) [

امام بزار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اس کی سند میں ابو بکر بن ابی سبرہ ہے، وہ لین الحدیث ہے۔“ علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ابو بکر بن ابی سبرہ وضاع ہے۔“ [مجمع الزوائد (۴/۱۶۹)، (۶۸۴۹)]

لیکن حافظ ضیاء مقدسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”یہ ابو بکر بن ابی سبرہ کے علاوہ ہے اور اس حدیث کو انھوں نے احادیث مختارہ میں ذکر کیا ہے۔“ (واللہ اعلم)

حضرت یعلیٰ بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ التَّقَطَ لِقُطَّةٍ يَسِيرَةً دِرْهَمًا أَوْ حَبْلًا أَوْ شِبْهَ ذَلِكَ فَلْيُعْرِفْهُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ كَانَ فَوْقَ ذَلِكَ فَلْيُعْرِفْهُ سَنَةً» [مسند احمد (۴/۱۷۳)]

”جو شخص کوئی ہلکی سی چیز گری پڑی اٹھالے جیسے درہم یا رسی یا اس جیسی کوئی اور چیز تو وہ تین دن تک اس کا اعلان کرے، اگر اس سے اوپر ہو تو ایک سال تک اس کا اعلان کرے۔“

مسند احمد کے مطبوعہ نسخے میں اس حدیث کے آخر میں ایک سال کا ذکر ہے، جب کہ مجمع الزوائد (۳/۱۶۹) میں «فَلْيُعْرِفْهُ سِنَةً أَيَّامٍ» کے الفاظ ہیں یعنی چھ دن تک اس کا اعلان کرے۔ مسند احمد کے اطراف (۵/۷۴) میں بھی اسی طرح ان الفاظ کو ضبط کیا گیا ہے اور محقق نے مسند احمد کے ترکی اور ہندی مخطوطے سے بھی اسی طرح ثبت کیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی ایسی چیز کا اعلان تین یا چھ دن تک کرے، اگر مالک نہ آئے تو استعمال کرے لیکن اس کی سند میں عمر بن عبد اللہ بن یعلیٰ کمزور راوی ہے۔ مذکورہ بالا روایات میں اگرچہ ضعف ہے لیکن ان کی تائید میں صحیح آثار موجود ہیں جیسا کہ اسماعیل بن امیہ سے روایت ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«إِذَا وَجَدْتَ لِقُطَّةً فَعَرِّفْهَا عَلَيَّ بِبَابِ الْمَسْجِدِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فَإِنْ جَاءَ مَنْ يَعْتَرِفُهَا وَإِلَّا فَشَانُكَ بِهَا» [مصنف عبد الرزاق (۱۰/۱۳۶)]

”جب تو کوئی گری پڑی چیز پائے تو مسجد کے دروازے پر تین دن تک اس کا اعلان کر۔ اگر تو اس کا پہچاننے والا آجائے تو اس کے حوالے کر اور اگر نہ آئے تو اسے استعمال کر لے۔“

اس لفظ کو معمولی سی چیز ہی پر محمول کیا جائے گا۔

جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور اثر میں ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا جس کو ایک ستو کی تھیلی ملی تھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ وہ تین دن تک اس کا اعلان کرے۔ وہ تین دن کے بعد آیا، اس نے کہا: ”اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں۔“ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے غلام! اسے پکڑ لے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اسے درندے لے جائیں یا ہوائیں اڑا دیں۔“ [عبد الرزاق (۱۰/۱۴۳)]

لہذا جب کوئی معمولی سی چیز ملے جو کھانے کے کام نہ آنے والی ہو تو اس کا تین دن تک یا اتنے دن تک اعلان کرے کہ

یقین ہو جائے کہ اس کا مالک اسے تلاش نہیں کرے گا، اس کے بعد وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔

③ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ چیز قیمتی ہو۔ اس کا سال بھر اعلان کرتا رہے۔ عصر حاضر میں اخبارات، ریڈیو، بڑے بڑے جلسوں میں اعلان کرایا جاسکتا ہے اور اگر سال تک مالک نہ آئے تو اسے اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ اگر مالک آجائے تو اسے وہ چیز واپس کرنی پڑے گی۔ اگر وہ استعمال کر چکا ہو اور اصل چیز موجود نہ ہو تو اتنی قیمت ادا کر دے اور جب چیز ملے تو اس کی علامات اور نشانیاں اچھی طرح ذہن نشین کر لے یا نوٹ کر لے۔

لطف اگر حیوان ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو ایسا ہوگا جو اپنا دفاع خود کر سکتا ہوگا جیسے اونٹ، بیل وغیرہ تو ایسے حیوان کو نہ پکڑا جائے اور اگر ایسا ہو کہ وہ اپنا دفاع خود نہ کر سکتا ہو تو اسے پکڑ لیا جائے جیسے بکری وغیرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے گری پڑی چیز کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَعْرِفَ عِفَاصَهَا وَ وَكَاثَهَا ثُمَّ عَرَفَهَا سَنَةً فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَإِلَّا فَشَانُكَ بِهَا »

”اس کا ٹاٹ اور تسمہ خوب پہچان لے پھر سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے، اگر اس کا مالک آجائے تو اس کے سپرد کر دو ورنہ جو چاہو کرو۔“

پھر اس نے گم شدہ بکریوں کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذَّئِبِ »

”وہ تیرے لیے ہے یا تیرے بھائی کے لیے یا بھیڑیے کے لیے۔“

پھر اس نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَا لَكَ وَ لَهَا ؟ وَمَعَهَا حَدَاءٌ هَا وَ سِقَائُهَا تَرِدُ الْمَاءَ وَ تَأْكُلُ الشَّجَرَ حَتَّى يَجِدَهَا رَبُّهَا »

[بخاری، کتاب اللقطة: باب اذا لم يوجد صاحب اللقطة بعد سنة فمى لمن وجدها (۲۴۲۹)، مسلم، کتاب اللقطة (۱۷۲۲)]

”تجھے اس سے کیا سروکار؟ اس کا پانی، اس کے جوتے اس کے پاس ہیں۔ گھاٹ پر آ کر پانی پی لے گا، درختوں کے

پتے کھائے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اس کے پاس آجائے گا۔“

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ لطف اگر قیمتی چیز ہو یا جانور بکری وغیرہ کی مثل ہو تو اس کو پکڑ لے، اس کی علامات و نشانیاں اچھی طرح ذہن نشین کر لے اور سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے، اگر اس کا مالک سال تک نہ آئے تو اسے ضمانت و ذمہ داری کے ساتھ اپنے استعمال میں لے آئے اور اگر اس کا مالک بعد میں آجائے تو اس کی ملکیت باقی رہتی ہے لہذا وہ چیز واپس کرنی پڑے گی اور اگر ایسا حیوان ہو جو اپنا دفاع کر سکتا ہو تو اسے نہیں پکڑنا چاہیے۔ گری پڑی چیز جس شخص کو مل جائے اسے وہ چیز چھپانی نہیں چاہیے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لفظ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« تَعْرِفُ وَلَا تَغِيبُ وَلَا تَكْتُمُ فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَإِلَّا فَهُوَ مَالُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ » [مجمع

الزوائد (۴/۲۹۷)، (۶۸۳۹)، مسند بزار (۱۳۶۷)، كشف الأستار]

”اس کی شناخت کی جائے اور اسے غائب کیا جائے نہ چھپایا جائے۔ اگر اس کا مالک آجائے تو اس کے حوالے کر دو

اور اگر نہ آئے تو وہ اللہ کا مال ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔“

شناخت و پہچان کا حکم اس لیے ہے کہ اس چیز کے جعلی دعویدار پیدا نہ ہوں بلکہ جو شخص صحیح علامات بیان کر دے اس کے

حوالے کر دی جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تحقیق

سوال کیا اجتہاد کے متعلق معاذ رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث صحیح ہے؟

جواب سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ہے۔ سنن ابی داؤد میں اس سند کے ساتھ مروی ہے:

« حَدَّثَنَا حَفْصُ ابْنِ عُمَرَ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ أَبِي عَوْنٍ عَنِ الْحَارِثِ بْنِ عَمْرٍو، ابْنِ أَخِي الْمُغِيرَةَ بْنِ شُعْبَةَ عَنْ أَنَسٍ مِنْ أَهْلِ حِمَاصٍ مِنْ أَصْحَابِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا آرَادَ أَنْ يَبْعَكَ مُعَاذًا إِلَى الْيَمَنِ قَالَ كَيْفَ تَقْضِي إِذَا عُرِضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ قَالَ أَقْضِي بِكِتَابِ اللَّهِ قَالَ فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ قَالَ أَحْتَمِدُ بِرَأْيِي وَلَا أُلُو فَضْرَبَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدْرَهُ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا يَرْضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ » [ابو داؤد، كتاب القضاء: باب اجتہاد الرأى فى القضاء (۳۵۹۲)، (۱۸/۲)،

ترمذی، كتاب الأحكام: باب ما جاء فى القاضى كيف يقضى (۱۲۳۸)]

”معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں یمن کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا تو انھیں کہا:

اے معاذ! جب تیرے پاس کوئی معاملہ آئے تو تو کیسے فیصلے کرے گا؟“ انھوں نے کہا: ”میں کتاب اللہ کے

ذریعے فیصلہ کروں گا۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تو کتاب اللہ میں نہ پائے تو؟“ انھوں نے کہا: ”سنت

رسول ﷺ سے فیصلہ کروں۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تو کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ پائے تو؟“ انھوں

نے کہا: ”میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا۔“ تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ

رکھا اور کہا: ”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جس کے

ذریعے وہ رسول اللہ ﷺ کو راضی کرتا ہے۔“

یہ روایت انتہائی ضعیف ہے اور اس کے ضعف کے اسباب درج ذیل ہیں:

- ① اس کی سند میں ابوعمرو محمد بن عبید اللہ اشعری حارث بن عمرو سے روایت بیان کرنے میں متفرد ہے۔
- ② دوسرا راوی حارث بن عمرو مجہول ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریب (ص: ۲۰) پر لکھا ہے: ”مَجْهُولٌ مِّنَ السَّادِسَةِ“

- ③ اس روایت میں تیسری کمزوری یہ ہے کہ اس کی سند میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے اصحاب معاذ غیر معروف ہیں، پتا نہیں وہ کون ہیں؟
- لہذا مندرجہ بالا تین اسباب کی وجہ سے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ ضعیف ہے۔

بینک کی چوکیداری کی نوکری

سوال کیا بینک کی چوکیداری کی نوکری جائز ہے؟

جواب بینک میں کام کرنے والے مینیجر وغیرہ چونکہ سودی کاروبار میں شریک ہونے کی وجہ سے لعنت کے حقدار ہو جاتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود لکھنے والے اور سود کے گواہوں پر لعنت کی ہے اور انہیں گناہ میں برابر قرار دیا ہے۔ [مسلم، کتاب المساقاة: باب لعن آکل الربا و مؤكله (۱۰۹۸)]

اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ سود کھانے اور کھلانے پر لعنت کے ساتھ سود لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت کیوں ہے؟ نہ انہوں نے سود لیا اور نہ سود دیا۔ یا ور ہے کہ اس پر لعنت سودی معاملے میں تعاون کی وجہ سے ہے اور گناہ پر تعاون حرام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ [المائدة: ۲]

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، زیادتی اور گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈر جاؤ، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

بینک کی چوکیداری کرنے والا شخص بھی سودی رقم کا تحفظ کر کے گناہ پر تعاون کر رہا ہے، اس لیے اس کی نوکری درست نہیں۔

سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا

سوال کیا سودی کاروبار کرنے والے کے گھر سے کھانا جائز ہے؟

(جواب) جس شخص کے بارے میں یہ بات معلوم ہو کہ اس کا کاروبار سود پر مبنی ہے تو اس کی رقم سے خریدی ہوئی کوئی چیز بھی کھانا یا پینا جائز نہیں کیونکہ سود صریح حرام اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور سودی معاملات پر گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے اور انھیں برابر کے لعنتی قرار دیا ہے۔ [مسلم، کتاب المساقاة: باب لعن آکل الربا (۱۵۹۸)]

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سود کے ستر حصے ہیں اور سب سے چھوٹا حصہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔“ [ابن ماجہ، کتاب التجارات

: باب التغلیظ فی الربا (۲۲۷۴)]

لہذا اتنے بڑے گناہ سے اجتناب اور ہر طرح کے سودی معاملے سے مکمل گریز کیا جائے تاکہ آخرت سنور جائے۔

لفظ ”نصب“ کا معنی

(سوال) لفظ ”نصب“ کا معنی کیا ہے اور کیا آستانہ بھی نصب ہے؟

(جواب) انصاب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا واحد نصب ہے اور لغت میں اس سے مراد وہ تمام مقامات ہیں جو لوگوں نے غیر اللہ کی پرستش کے لیے مخصوص کیے ہوتے ہیں۔ عربی لغت کی معتبر کتاب القاموس میں لکھا ہے:

”كُلُّ مَا جُعِلَ عَلَمًا كَالنَّصِيبَةِ وَكُلُّ مَا عُيِدَ مِنْ دُونَ اللَّهِ“ [القاموس المحيط (۱/۱۳۷)]

”وہ جس کو علم بنایا جائے جیسے کہ نصیبہ ہے اور ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے اس کو نصب کہتے ہیں۔“

نصب کا یہی معنی محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازی نے ”مختار الصحاح (ص: ۶۶۱)“ اور ”المعجم الوسيط (ص: ۹۲۵)“ پر مذکور ہے اور اردو تراجم میں مولانا مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں یہی ترجمہ کیا ہے بلکہ ایک حاشیے میں لکھا ہے:

”اصل میں لفظ ”نصب“ استعمال ہوا ہے اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے

لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی صورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا معنی لفظ

آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا یا کسی خاص مشرک کا نہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔“

یہ معنی لغت کے اعتبار سے درست ہے اور ”كُلُّ مَا عُيِدَ مِنْ دُونَ اللَّهِ“ میں داخل ہے کیونکہ موجودہ دور میں تمام آستانوں پر غیر اللہ سے فریادری، سجدہ ریزی، نذر و نیاز اور چڑھاوے وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں۔ جو کام اللہ کے لیے مختص ہیں وہ بزرگوں کے آستانوں سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ لہذا نصب یا انصاب کا معنی آستانے کرنا درست ہے غلط نہیں۔

علماء کی سیکورٹی

(سوال) حفاظت کے لیے علماء کا اپنے لیے محافظ رکھنا کیسا ہے؟

(جواب) دشمنان دین کی بڑھی ہوئی یلغاروں اور فسادات کی بنا پر اپنی حفاظت کے لیے اسباب کو بروئے کار لانا توکل کے خلاف نہیں جیسا کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے کہا: ”کیا میں اپنی اونٹنی چھوڑ دوں اور اللہ پر توکل کروں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کا گھٹنا باندھ اور توکل کر۔“ [صحیح ابن حبان (۲۵۳۹)، مستدرک حاکم (۶۲۳)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اسباب کو بروئے کار لانا توکل علی اللہ کے خلاف نہیں لہذا علمائے کرام یا قائدین اسلام اگر دشمنان دین کی خنثیہ چالوں سے محفوظ ہونے کے لیے حفاظتی ساز و سامان کا بندوبست کرتے ہیں تو یہ توکل علی اللہ کے خلاف نہیں۔

جہاد و قتال ایک ایسا فریضہ ہے جس میں اسلحہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے جس سے جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہے اور جان و مال کی حفاظت شریعت اسلامی میں مطلوب ہے۔ قرآن حکیم اور صحیح احادیث میں ایسے دلائل بکثرت موجود ہیں جن میں اسباب اختیار کرنے کا صراحتاً حکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ﴾ [الانفال: ۶۰]

”اور ان کافروں کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق قوت تیار رکھو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلے کے لیے تیاری کا حکم ہے۔ اس طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَذَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغَفَّلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَ أَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً ﴾

[النساء: ۱۰۲]

”کفار چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور اسباب و متاع سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ ایک بارگی تم پر حملہ کر دیں۔“

ان واضح آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی کو اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ اور اسباب جمع رکھنے چاہئیں تاکہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست اچھے طریقے سے کر سکے۔ ہاڈی گارڈ بھی اسباب میں سے ایک سبب ہے جسے ضرورت کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر حفاظت اور پہرے کا بندوبست کیا ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل روایت میں ہے: ”ایک رات آپ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور فرمایا: ”آج رات

چوکیداری کون کرے گا؟“ تو آپ ﷺ کی بات پر لیک کہہ کر ایک انصاری اور ایک مہاجر صحابی نے رات کو چوکیداری کی۔“

[ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: باب الوضوء من الدم (۱۹۸)، مستدرک حاکم (۱۵۶/۱)]

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ حفاظتی بندوبست کرتے ہوئے آپ نے پہرے داروں کا بندوبست کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے

رات کو آپ کی اور دیگر ساتھیوں کی حفاظت کے لیے چوکیداری کی۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حطیم میں نماز ادا کرتے تو عمر رضی اللہ عنہما تلوار سونت کر آپ ﷺ کا پہرا دیتے تھے۔

[تاریخ مدینة لابن شبة (۳۰۰/۱)]

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور وہ آپ کے پہلو میں تھیں۔ کہتی ہیں میں

نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! آپ کو کیا ہوا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کاش! میرا کوئی صالح صحابی آج رات میرا پہرا دے۔“

”کہتی ہیں ہم اسی حال میں تھے کہ ہم نے اسلحہ کی آواز سنی۔“ آپ نے کہا: ”کون ہے؟“ تو اس آدمی نے کہا: ”میں سعد بن ابی وقاص ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تیری کیا حالت ہے؟“ اس نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں آپ کی چوکیداری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ سو گئے اور میں نے آپ ﷺ کے خزانوں کی آواز سنی۔“

[بخاری، کتاب الجہاد: باب الحراسة فی الغزو فی سبیل اللہ (۲۸۸۵)، تاریخ مدینة منورة (۱/۳۰۰)]

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ مسائل کا استنباط کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”دشمن سے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدابیر کرنا صحیح ہے۔ لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنے سلطان و امیر کے قتل کے ڈر کی وجہ سے پہرا دیں۔“ [فتح

الباری (۶/۶۱)]

ایک صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بھی اسلحہ لایا جاسکتا ہے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ اس کے پھالے کو پکڑ کر رکھے تاکہ کسی مسلمان کو زخمی نہ کر دے لہذا مساجد و غیر مساجد میں اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ لایا جاسکتا ہے اور اسباب کے تحت محافظ وغیرہ رکھنا درست ہے۔

غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا

سوال غیر محرم مردوں سے عورتوں کا مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

جواب عورتوں کا غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرنا ناجائز ہے۔ نبی ﷺ نے عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا:

«إِنِّي لَا أُصَافِحُ النِّسَاءَ» [نسائی، کتاب البيعة: باب بيعة النساء (۴۱۸۶)، احمد (۶/۳۵۷)]

”میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا۔ آپ صرف زبانی بیعت

لیا کرتے تھے۔“ [مسلم، کتاب الإمارة: باب كيفية بيعة النساء (۱۸۶۶)]

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو عمدہ نمونہ بنایا ہے لہذا ہمیں رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری کرنی چاہیے اور غیر محرم اجنبی عورتوں سے قطعاً مصافحہ نہیں کرنا چاہیے تاکہ فتنہ و فساد اور مشکوک ماحول سے اجتناب ہو، البتہ عورتوں کا اپنے محرم رشتہ داروں، مثلاً باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا

سوال کیا آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے لینز لگانا جائز ہے؟

جواب مارکیٹ میں دو طرح کے لینز دستیاب ہیں۔ ایک تو نظر کے لیے کہ جس شخص کی بینائی کمزور پڑ جائے تو وہ عینک کی

جگہ لینز لگاتا ہے اور دوسرے بالکل سادہ ہیں جو بینائی کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ فیشن اور زینت سمجھ کر لگائے جاتے ہیں، تو ان دونوں کے لگانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ البتہ خواتین کے بارے میں ایک بات کا لحاظ ضروری ہے۔ کہ کتنی ہی نصوص شرعیہ میں عورت کو غیر محرم کے سامنے اظہار زینت سے روکا گیا ہے، لہذا اگر کوئی عورت لینز لگا کر غیر محرم کے سامنے اس کا اظہار کرتی ہے اور آنکھوں کے رنگ کو تبدیل کر کے دعوت گناہ دیتی ہے تو یہ فعل عبث اور حرام ہوگا، اس کے لیے لینز لگانے کی اجازت نہیں ہے اور جو عورتیں شرعی لباس و حجاب کا لحاظ رکھتی ہیں، مگر سے باہر نکلتے ہوئے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہیں تو جس طرح دیگر زیب و زینت ان کے حق میں جائز اور درست ہے تو یہ بھی اس قسم میں داخل ہے۔

سالگرہ منانا

(سوال) کیا سالگرہ منانا جائز ہے؟

(جواب) شادی یا پیدائش وغیرہ کی سالگرہ منانا دین اسلام میں ثابت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی ولادت بھی ہوئی اور شادیاں بھی، اسی طرح آپ کی بیٹیوں کی شادیاں بھی ہوئیں لیکن یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں کہ آپ نے اپنی یا اپنی اولاد کی سالگرہ منائی ہو یا اپنے اصحاب کو سالگرہ منانے کا حکم دیا ہو یا کسی صحابی نے سالگرہ منائی ہو اور آپ ﷺ نے اس پر سکوت کر کے برقرار رکھا ہو۔ لہذا یہ فعل اسلامی نہیں۔ اگر اسلام میں اس کی کوئی اہمیت ہوتی تو ضرور اس کا کہیں تذکرہ ہوتا لیکن عیسائیوں وغیرہ کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اسے منانا شروع کر دیا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ”جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں تو وہ مردود ہے۔“ لہذا سالگرہ منانا درست نہیں۔

صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن

(سوال) صاع، مد، رطل اور وسق کا صحیح وزن کیا ہے؟

(جواب) صاع ماپ کا پیمانہ ہے، وزن کا نہیں۔ جب اسے اوزان میں لایا جاتا ہے تو اجناس کی مختلف اقسام کی بنا پر اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے، جس کی بنا پر اہل علم میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک صاع میں ۴ مد ہوتے ہیں اور یہ بات اہل علم کے ہاں معروف ہے کہ صاع نبوی $\frac{1}{5}$ ہے، لہذا ایک مد کا وزن $\frac{1}{4}$ رطل ہے۔ ایک وسق میں ۶۰ صاع ہوتے ہیں تو ۵ وسق کے ۳۰۰ صاع ہوئے۔ ۵ وسق کا وزن صاع کے وزن پر موقوف ہے۔

برصغیر کے عام علماء صاع کا وزن دو سیر گیارہ چھٹانک تین تولے اور چار ماشے بیان کرتے ہیں۔

مولانا عبد اللہ محدث روپڑی کے فتاویٰ اہل حدیث (۲۰۹/۲) میں لکھا ہے کہ صاع مدینہ کا معتبر ہے اور اس کا صحیح اندازہ پانچ رطل اور تہائی رطل ہے اور رطل کا مشہور اندازہ آدھ سیر ہے۔ اس حساب سے صاع دو سیر پختہ انگریزی ۱۰ چھٹانک ۳ تولے ۴ ماشے ہوتا ہے۔

جبکہ محدث حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک مد ۹ چھٹانک کے برابر اور ۳ مد ۳۶ چھٹانک کے برابر ہوئے اور ایک صاع پھر سوادوسیر ہوا۔ ۵ دن کا ۱۶ من ۳۵ سیر ہوا۔ جب کہ صحیح اور اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ایک مد میں نصف کلو کے قریب گندم آتی ہے۔ اس لحاظ سے پانچ دن ۳۰۰ صاع کا وزن ۶۰۰ کلو گندم یعنی ۱۵ من کے برابر ہوگا۔

مَدَّ يَمْدًا كَمَا مَعْنَى "پھیلاتا" ہے۔ لغت کی مشہور کتب "لسان العرب (۵۳/۱۳)، مجمع بحار الأنوار (۵۶۸/۴) اور النہایۃ فی غریب الحدیث والآخر (۳۰۸/۴) میں ہے:

"إِنَّ أَصْلَ الْمُدِّ بَأَنَّ يُمَدُّ الرَّجُلُ يَدَيْهِ فَيَمْلَأُ كَفَيْهِ طَعَامًا"
 "مد کی اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور ہتھیلیوں میں غلہ بھرے۔"
 قاموس میں ہے:

"الْمُدُّ بِالضَّمِّ مِكْيَالٌ وَهُوَ رِطْلَانٍ أَوْ رِطْلٌ وَ ثُلُثٌ أَوْ مِلْيٌ كَفِي الْإِنْسَانِ الْمُعْتَدِلِ إِذَا مَلَأَهُمَا وَ مَدَّ يَدَهُ بِهِمَا وَ بِهِ سُمِّيَ مُدًّا وَ قَدْ جَرَّبْتُ ذَلِكَ فَوَجَدْتُهُ صَحِيحًا" [القاموس المحيط (ص/۴۰۷)]

"مدضمہ (پیش) کے ساتھ پیمائش کا پیمانہ اور وہ دور رطل (اہل عراق اور ابوحنیفہ کے نزدیک) یا رطل (اہل حجاز کے ہاں) یا درمیانی انسان کی دونوں ہتھیلیاں ہیں، جب وہ ان دونوں کو بھرے اور ہتھیلیاں پھیلا دے۔ اسی وجہ سے اسے مد کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کا تجربہ کیا اور اسے صحیح پایا۔"
 ایک اور مقام پر رطراز ہیں:

"الْصَّاعُ أَرْبَعَةُ أَمْدَادٍ كُلُّ مُدٍّ رِطْلٌ وَ ثُلُثٌ قَالَ الدَّوُّودِيُّ : مِعْيَارُهُ الَّذِي لَا يَخْتَلِفُ : أَرْبَعُ حَفَنَاتٍ بِكَفَيْ الرَّجُلِ الَّذِي لَيْسَ بِعَظِيمِ الْكَفَّيْنِ وَ لَا صَغِيرِهِمَا إِذْ لَيْسَ كُلُّ مَكَانٍ يُوجَدُ فِيهِ صَاعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِنَّتَهَى وَ جَرَّبْتُ ذَلِكَ فَوَجَدْتُهُ صَحِيحًا"
 [القاموس المحيط (ص/۹۵۵)]

"ایک صاع کے چار مد ہوتے ہیں۔ ہر ایک مد $\frac{1}{4}$ رطل ہوتا ہے۔ (ایک صاع $\frac{1}{5}$ رطل ہوتا ہے) داود نے کہا: "اس کا معیار جو مختلف نہیں ہوتا ایسے آدمی کے دونوں ہاتھوں کی چار لہیوں ہیں جس کی ہتھیلیاں نہ بڑی ہوں اور نہ چھوٹی۔ اس لیے کہ ہر جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاع نہیں پایا جاتا۔ علامہ فیروز آبادی صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور اسے صحیح پایا ہے یعنی ایسی چار لہیوں رطل کے برابر ہوتی ہیں۔"
 امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَ قَالَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ : الصَّاعُ أَرْبَعُ حَفَنَاتٍ بِكَفَيْ رَجُلٍ مُعْتَدِلٍ الْكَفَّيْنِ" [المجموع (۱۲۹/۶)] ، نیز دیکھیں: مغنی المحتاج (۳۸۲/۱)، المصباح المنیر (۴۱۵/۱)، الايضاح والتبیان فی

معرفة المكيال والميزان (ص ۵۷-۵۶)، بحوالہ التعليق على كتاب الزكاة للبعوى (ص ۲۲۳) [

”علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: ”ایک صاع میں درمیانی ہتھیلیوں والے آدمی کی چار لپیں ہوتی ہیں۔“

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ایک صاع میں درمیانی ہتھیلیوں والے آدمی کی چار لپیں ہوتی ہیں۔ حافظ عبد السلام

بھٹوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”اسلام دین فطرت ہے اور اس کے مقرر کردہ پیمانے بھی سادہ اور فطری ہیں۔“ سعودی عرب کے مشہور

مفتی شیخ عبد العزیز بن باز اور ان کے ساتھ ہیئۃ کبار العلماء کے اراکین نے بھی یہی فرمایا ہے کہ صدقہ فطر ادا کرنے کا

آسان طریقہ یہ ہے کہ معتدل ہاتھوں والا آدمی دونوں ہاتھوں کی لپیں چار دفعہ بھر کر ادا کر دے۔

یہ مقدار ہمارے تجربہ کے مطابق گندم میں سے دو کلو ہے اور ہر شخص خود بھی تجربہ کر سکتا ہے: ”احکام زکوٰۃ و عشر (ص: ۵۳)

اور مفتی عبد الرحمن رحمٰنی کے رسالہ ”المیزان فی الأوزان“ میں بھی یہی بات موجود ہے۔ لہذا انھوں نے جو اپنی کتاب ”مسائل

عشر پر تحقیقی نظر (ص: ۱۲-۱۱) میں پانچ وسق کا وزن تقریباً ۲۰ من کے برابر قرار دیا ہے، وہ درست نہیں۔ صحیح اور درست ۱۵ من

وزن پانچ وسق بنتا ہے۔ (واللہ اعلم)

بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا

(سوال) بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال کرنا کیسا ہے؟

(جواب) مسلمان آدمی کا مال، خون اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے کسی شخص کی چیز اس کی اجازت و رضامندی کے بغیر

استعمال کرنا درست نہیں۔ دفاتر یا مساجد وغیرہ میں ایک دوسرے کے جوتے اجازت کے بغیر استعمال کرنا درست نہیں۔ دفاتر یا

مساجد وغیرہ میں جو لوگ ایک دوسرے کی جوتیاں اجازت کے بغیر استعمال کرتے ہیں اس میں بہت سی قباحتیں ہیں:

① کسی بھائی کی چیز اس کی اجازت کے بغیر لینا ہی حلال نہیں یہاں تک کہ اس کی لاشی بھی نہیں اٹھائی جاسکتی۔

ابو حمید ساعدی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيهِ بِغَيْرِ طَيْبٍ نَفْسِهِ مِنْهُ» [ابن حبان (۱۱۶۶) فی موارد الظمان]

”کسی بھی مسلمان کے لیے اپنے بھائی کی لاشی اس کی رضامندی کے بغیر لینا حلال نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کا مال دوسرے مسلمان پر حرام قرار دیا ہے، اس لیے بغیر اجازت چیز اٹھانے سے وہ فعل حرام کا

ارتکاب کرتا ہے۔

② جس شخص کا جوتا اٹھایا جاتا ہے جب وہ اسے تلاش کرتا ہے تو نہ ملنے پر وہ کسی دوسرے کا پہن لیتا ہے جس سے یہ عمل

مسلل آگے چل پڑتا ہے، جس سے ایک کی بجائے کئی افراد پریشان ہوتے ہیں۔ تو پہلا شخص جس نے یہ برا عمل جاری

کیا مسلل گناہ حاصل کرتا رہتا ہے، اس پر اپنے عمل کا بھی گناہ اور اس کی وجہ سے جتنے لوگ اس فعل میں مبتلا ہوئے ان کا

بھی گناہ بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کمی کی جائے۔ بہت کم ایسے افراد دیکھے گئے ہیں جو اپنا جوتا گم ہونے پر کسی

دوسرے کا نہ پہنیں۔ (واللہ اعلم)

۳) پھر اس عمل سے یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایک جوتا کسی کا پہن لیتے ہیں اور ایک کسی دوسرے کا، جس کی بنا پر اثر جوتے بیکار سمجھے جاتے ہیں اور انھیں مستقل لا وارث سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔

۴) اخلاقیات کا انحطاط بڑھتا جاتا ہے اور اچھے بھلے لوگ بدن ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص کی غلطی سے پوری تحریک بدنام ہو جاتی ہے۔ بہر کیف ایک چھوٹی سی غلطی بڑے بڑے جرائم کا سبب بن جاتی ہے اور چوری جیسی بد عادت جنم لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قبیح عادات اور اخلاق رذیلہ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین!)

شوہر سے پوچھے بغیر عورت کا صدقہ کرنا

سوال شوہر سے پوچھے بغیر کیا عورت صدقہ کر سکتی ہے؟

جواب عورت کو اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر مال خرچ نہیں کرنا چاہیے۔

ابو اسامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ شَيْئًا مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَلَا الطَّعَامَ؟ قَالَ

ذَلِكَ أَفْضَلُ أَمْوَالِنَا » [ابوداؤد، کتاب البیوع: باب فی تضمین انعامیة (۳۵۶۵)، ترمذی (۶۷۰)، ابن

ماجہ (۲۲۹۵)، مسند احمد (۲۶۷/۵)، مسند طیالسی (۱۱۲۷)، مصنف عبد الرزاق (۱۶۶۲۱)،

التمہید (۲۳۰/۱)، بیہقی (۱۹۴، ۱۹۳/۴)، شرح السنہ (۲۰۴/۶)]

”عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی چیز خرچ نہ کرے۔“ کہا گیا: ”اے اللہ کے رسول! اور

غلہ بھی نہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ تو ہمارے افضل مالوں سے ہے۔“

معلوم ہوا کہ جب ایسا صدقہ اور خیرات جو غلے سے کم قدر و قیمت والا ہو وہ خاوند کی اجازت کے بغیر خرچ نہیں کر سکتی تو

جو غلہ افضل اموال سے ہے وہ کیسے خرچ کر سکتی ہے؟ [تحفة الاحوذی (۲۸۸/۳)]

اگر عورت کو معلوم ہو کہ صدقات و خیرات کرنے سے مرد نہیں روکتا بلکہ پسند کرتا ہے تو پھر خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا تَصَدَّقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا كَانَ لَهَا بِهِ أَجْرٌ وَ لِلزَّوْجِ مِثْلُ ذَلِكَ وَ لَا يَنْقُصُ كُلُّ

وَاحِدٍ مِنْهُمْ مِنْ أَجْرِ صَاحِبِهِ شَيْئًا لَهُ بِمَا كَسَبَ وَ لَهَا بِمَا أَنْفَقَتْ » [ترمذی، کتاب الزکاة: باب

ما جاء فی نفقة المرأة من بیت زوجها (۶۷۱)، نسائی فی السنن الکبری (۳۵/۲)]

”جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے صدقہ کرتی ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے اور شوہر کو بھی اسی طرح اجر ملتا ہے

اور ہر ایک دوسرے کے اجر کو کم نہیں کرتا۔ مرد کے لیے اس کی کمائی کا اجر اور عورت کے لیے اس کے خرچ کرنے کا

اجر ہے۔“

عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أَعْطَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا بِطَيْبِ نَفْسٍ غَيْرِ مُفْسِدَةٍ فَإِنَّهَا لَهَا مِثْلُ أَجْرِهِ لَهَا مَا

نَوَتْ حَسَنًا وَ لِلْحَازِنِ مِثْلُ ذَلِكَ » [ترمذی، کتاب الزکاة: باب ما جاء فی نفقة المرأة من بیت

زوجها (۶۷۲)، نسائی فی السنن الکبریٰ (۳۷۹/۵)]

”جب عورت شوہر کے گھر سے خوشی کے ساتھ عطیہ دے اور عطیہ میں اسراف کرنے والی نہ ہو تو اس کے لیے شوہر

کے اجر کے مثل اجر ہے اور عورت کے لیے وہ ہے جو اس نے اچھی نیت کی اور خازن کو بھی اسی جتنا اجر ہے۔“

علامہ مبارک پوری رضی اللہ عنہ اس کی شرح میں رقمطراز ہیں:

« وَ هَذَا مُحْمُولٌ عَلَيْهِ! إِنَّ الزَّوْجَ لَهَا بِذَلِكَ صَرِيحًا أَوْ دَلَالَةً » [تحفة الأحموذی (۳۹۰/۳)]

”یہ عورت کے لیے شوہر کی اجازت پر محمول ہے، خواہ یہ اجازت صراحتاً ہو یا اشارتاً۔“

مطلب یہ ہے کہ مرد نے عورت کو واضح طور پر خرچ کرنے کی اجازت دے رکھی ہو یا اس کے عمل سے معلوم ہو کہ

عورت کے خرچ کرنے پر وہ ناراض نہیں ہوتا۔ مرقاة میں یہ قول بھی ہے:

”یہ معاملہ اہل حجاز کی عادت کے موافق ہے، ان کی عادت تھی کہ انھوں نے اپنی بیویوں اور نوکروں کو اجازت دے

رکھی تھی کہ وہ مہمان نوازی کریں، سائل، مساکین اور پڑوسیوں کو کھلائیں پلائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو

اس اچھی عادت اور عمدہ خصلت پر شوق دلایا ہے۔“ [مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (۴/۴۳۵)]

لہذا عورت کو جب شوہر کی طرف سے اجازت ہو، خواہ یہ اجازت وضاحت کے ساتھ ہو یا کسی اور طریقے سے تو اسے خرچ

کرنا چاہیے، مرد کی طرح عورت کو بھی اجر ملے گا، مرد کو کمائی کرنے کی وجہ سے اور عورت کو خرچ کرنے کی وجہ سے۔ ہمارے

گھروں میں مرد حضرات کی عادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اور خواتین اللہ کی راہ میں عطیات و صدقات دیتی رہتی ہیں اور

شوہر اس پر ناراض نہیں ہوتے۔ بہر کیف عورت کو شوہر کی اجازت اور رضا مندی حاصل کر لینی چاہیے۔ (واللہ اعلم)

افتتاح کے لیے فیتا کا ثنا

سوال دکان وغیرہ کے افتتاح کے لیے فیتا کاٹنے کا کیا حکم ہے؟

جواب کسی دکان، فیکٹری، دفتر وغیرہ کا افتتاح کرنے کے لیے پہلے فیتا باندھ دینا پھر کسی بڑے آدمی کو بلا کر بسم اللہ کرانا اور

فیتا کاٹنا کسی صحیح حدیث یا آثار صحابہ سے ثابت نہیں اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہی ہے۔ یہ صرف غیر مسلموں کی اندھی تقلید کا

نتیجہ ہے۔ اسلام نے کسی بھی اچھے کام کے افتتاح سے پہلے جو طریقہ کار بتایا ہے وہ استخارہ ہے یعنی با وضو ہو کر پہلے دو رکعت

نماز ادا کریں پھر دعائے استخارہ پڑھیں، پھر محنت، توجہ اور اخلاص کے ساتھ کام کریں، ملاوٹ، ظلم، دھوکا دہی، کرخت رویہ جیسے اخلاق رذیلہ سے اجتناب کریں تو اللہ تعالیٰ خیر و برکت نازل کرے گا۔ البتہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلا پھل دیکھتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے: ”اے اللہ! ہمارے پھل میں برکت فرما اور ہمارے شہر میں برکت فرما اور ہمارے صاع میں برکت فرما اور ہمارے مد میں برکت فرما۔ اے اللہ! بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے ظلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا کی اور میں تجھ سے اسی طرح کی مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل دے دیتے۔“ [مسلم، کتاب فضائل المدینة: باب فضل المدینة و دعاء النبی فیہا بالبركة و بیان تحریمہا و تحریم صیدہا و شجرہا (۱۳۷۳)]

اور دوسری حدیث مسلم میں ہے کہ آپ کے پاس بچوں میں سے جو بھی چھوٹا بچہ حاضر ہوتا آپ اسے وہ پھل دے دیتے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کوئی کام نیا نیا ہو تو کسی صالح اور اللہ کے ولی کے پاس جا کر دعا کروائیں اور اگر پھل نیا نیا تیار ہو تو دعا کروا کے کسی سب سے چھوٹے بچے کو دے دیں۔

حرام جانور کے اعضاء کا حکم

سوال کیا حرام جانوروں کے اعضاء انسانی بدن میں لگائے جاسکتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ہمارے استعمال کے لیے جو اشیاء بنائی ہیں وہ حلال اور طیب ہیں، حرام و خبیث اشیاء ہمارے لیے ناجائز ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ﴾ [الأعراف: ۱۵۷]

”اور آپ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں۔“

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض علماء نے کہا ہے:

”فَكُلُّ مَا أَحَلَّ اللَّهُ تَعَالَى مِنَ الْمَأْكَلِ فَهُوَ طَيِّبٌ نَافِعٌ فِي الْبَدَنِ وَ الدِّينِ وَ كُلُّ مَا حَرَّمَهُ فَهُوَ

خَبِيثٌ ضَارٌّ فِي الْبَدَنِ وَ الدِّينِ“ [تفسیر ابن کثیر (۴۳۹/۳)]

”کھانے والی اشیاء میں سے جو چیز بھی اللہ نے حلال کی ہے وہ پاک اور جسم و دین کے لیے نفع بخش ہے اور ہر وہ

چیز جسے اللہ نے حرام کیا ہے وہ ناپاک اور جسم و دین کے لیے نقصان دہ ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء میں نفع اور پاکیزگی ہے جب کہ حرام کردہ اشیاء میں ضرر اور نقصان ہے۔ رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حرام اشیاء کو دوا کے لیے استعمال کرنے سے روکا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّوَاءِ الخَبِيثِ » [ابو داؤد، کتاب الطب : باب فی الأدوية المكروهة (۳۸۷۰)، ترمذی، کتاب الطب : باب ما جاء فيمن قتل نفسه بسم أو غيره (۲۰۴۵)، ابن ماجه، کتاب الطب : باب النهی عن الدواء الخبيث (۳۴۵۹)، بیہقی (۵/۱۰)، مستدرک حاکم (۴۱۰/۴)، مسند احمد (۴۱۶/۱۳)، (۸۰۴۸)، ابن ابی شیبہ (۵/۸)، حلیۃ الأولیاء (۳۷۴/۵)، بیہقی فی شعب الایمان (۵۶۲۲)]

”رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا سے منع کیا ہے۔“

بعض روایات میں اس کی تفسیر زہر اور خمر سے کی گئی ہے لیکن یہ حدیث عام ہے۔ زہر، شراب اور ہر حرام چیز کو شامل ہے۔ تابع ﷺ بیان کرتے ہیں:

« كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا دَعَا طَبِيبًا يُعَالِجُ بَعْضَ أَهْلِيهِ اشْتَرَطَ عَلَيْهِ أَنْ لَا يُدَاوِيَ بِشَيْءٍ مِمَّا حَرَّمَ اللَّهُ » [بیہقی (۱۶۵/۱۰)]

”ابن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی ایسے طبیب کو بلاتے جو ان کے گھر میں سے کسی کا علاج کرتا تو اس پر شرط لگاتے کہ وہ کسی ایسی چیز سے علاج نہیں کرے گا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔“

اس اثر کی سند صحیح ہے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَلَا تَتَدَاوَوْا بِحَرَامٍ » [ابو داؤد، کتاب الطب : باب فی الأدوية المكروهة (۳۸۷۴)، بیہقی (۵/۱۰)، شرح السنة (۱۳۹/۱۲)]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا نازل کی اور ہر بیماری کے لیے دوا بنائی۔ پس تم دوا کرو اور حرام سے دوا نہ کرو۔“

اس کی سند میں گو اسماعیل بن عیاش مدلس ہے اور اس کا استاد ثقبہ بن مسلم مستور ہے لیکن حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کا قوی

شاہد ہے اور اس کے پہلے حصے کا شاہد ابو داؤد (کتاب الطب، باب فی الرجل یتداوی (۳۸۵۵) میں حدیث اسامہ ہے۔

مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ حرام اشیاء سے علاج کرنا منع ہے لہذا حرام جانوروں کے اعضا کی پیوند کاری جسم

انسانی میں درست نہیں۔ (واللہ اعلم!)

کیوٹر بازی اور مرغ لڑانا

سوال کیوٹر اڑانا یا مرغ لڑانا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب شریعت کی نظر میں کیوٹر بازی مکروہ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَجُلًا يَتَّبِعُ حَمَامَةً فَقَالَ: شَيْطَانٌ يَتَّبِعُ شَيْطَانَةَ » [ابن

ماجه، کتاب الأدب : باب اللعب بالحمام (۳۷۶۵)، مسند احمد (۲۲۱/۱۷)، (۸۵۴۳)، الأدب

المفرد (۱۳۰۰)، المسند الجامع (۶۳۹/۱۷)]

”بلاشبہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو ایک کبوتر کے پیچھے دوڑتا ہوا دیکھا تو فرمایا: ”شیطان شیطان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“ قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اس حدیث میں کبوتروں کے ساتھ کھینے کی کراہت پر دلیل ہے اور یہ ایسا کھیل ہے جس کی شرع میں اجازت نہیں دی گئی اور شیطان کا لفظ ایسے آدمی پر بولا جانا اس پر دلالت کرتا ہے اور کبوتر پر شیطان کے لفظ کا اطلاق یا تو اس وجہ سے ہے کہ وہ آدمی کے اس کے لیے پیچھے لگنے کا سبب ہے یا وہ ایسا شیطانی عمل کرتا ہے کہ اس کی مطابقت اور اس کے حسن صورت اور نفعی کی عمرگی کے باعث انسان اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یا وہ حقیقت میں کبوتر کی شکل میں جن شیطان ہے جو آدمی کو اللہ کے ذکر سے غافل کرتا ہے۔“ [فضل اللہ الصمد (۲/۶۸۴)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”بچ نکلوانے، انڈے لینے، انس کے لیے یا خطوط بھیجنے کے لیے کبوتر رکھنا بلا کراہت جائز ہیں۔ بہر کیف کبوتروں کے ساتھ کھینے کے متعلق صحیح بات یہی ہے کہ مکروہ ہے اور اگر اس کھیل کے ساتھ جو اہل جائے تو حرام ہے۔“ [فضل اللہ الصمد (۲/۶۸۴)، مرقاة شرح مشکاة (۸/۲۸۰)]

رہا جانوروں کو آپس میں لڑانا تو یہ بھی شرعاً حرام ہے کیونکہ جانوروں کو ایذا دینا شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں ہے۔ جانوروں کو لڑانے کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جانوروں کو ایذا و تکلیف دینا درست نہیں۔“ [مسند ابی یعلیٰ (۶۵۱) مسند بزار (۲۰۶۳)]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جس کے چہرے پر داغ لگایا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جاؤ اونٹ کے مالک سے کہو کہ اس کے چہرے سے آگ کو دور رکھے۔“ [مسند ابی یعلیٰ (۶۵۱)، مسند بزار (۲۰۶۳)]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گدھا دیکھا جس کے چہرے کو داغا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی لعنت بر سے اس آدمی پر جس نے یہ داغ دیا۔“ [مسند بزار (۲۰۶۵)، طبرانی اوسط (۵/۱۵۷)، مجمع الزوائد (۱۳۲۴۰)]

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَيْهِ بِحِمَارٍ قَدْ وَسِمَ فِي وَجْهِهِ فَقَالَ: أَمَا بَلَعَكُمْ أَنِّي لَعَنْتُ مَنْ وَسِمَ الْبَهِيمَةَ فِي وَجْهِهَا أَوْ ضَرَبَهَا فِي وَجْهِهَا؟ فَتَنَهَى عَنْ ذَلِكَ» [ابو داؤد، كتاب الجهاد: باب النهى عن الوسم فى الوجه (۲۵۶۴)، مسند احمد (۲۲/۷۲)، ابن ابى شيبه (۵/۴۰۶)]

”نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک گدھا گزرا جس کے چہرے پر داغ لگایا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تمہیں یہ بات نہیں پہنچی کہ میں نے اس آدمی پر لعنت کی ہے جس نے جانوروں کے چہرے پر داغ دیا یا مارا؟“ پس آپ ﷺ نے اس کام سے منع فرمادیا۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ جانوروں کو لڑانا اور انھیں ایذا دینا کسی طرح بھی جائز نہیں، لہذا مرغ، کتے، بئیر، تیر وغیرہ لڑانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ تو جو لوگ جانوروں کو لڑاتے یا ان پر جوا لگاتے ہیں وہ فعل حرام کے مرتکب ہیں، انھیں اس فعل سے باز آ جانا چاہیے۔

زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں

سوال کیا زیادہ نمازیں پڑھنے والا شہید سے پہلے جنت میں جا سکتا ہے؟

جواب جس حدیث سے یہ استدلال کیا جاتا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”بنو قضاعہ میں سے دو آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسلام لائے، ان دونوں میں سے ایک اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا اور دوسرا ایک سال بعد اللہ کو پیارا ہوا۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ بعد میں فوت ہونے والا شہید سے پہلے جنت میں داخل ہو گیا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مجھے بڑا تعجب ہوا، میں نے صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس بات کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَلَيْسَ قَدْ صَامَ بَعْدَهُ رَمَضَانَ وَ صَلَّى سِتَّةَ آلَافٍ رَكْعَةً أَوْ كَذَا وَ كَذَا رَكْعَةً صَلَاةَ السَّنَةِ »

[مسند احمد (۲/۳۳۳)، الترغیب والترہیب (۱/۲۴۴)، مجمع الزوائد (۱۰/۲۰۷)، امام منذری اور علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔]

”کیا اس نے بعد میں رمضان کے روزے نہیں رکھے اور چھ ہزار رکعات نماز یا اتنی اتنی رکعات سال بھر ادا نہیں کیں؟“

اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ جو خواب دیکھنے والے ہیں، ان کی زبانی بھی یہ حدیث موجود ہے۔ [ابن ماجہ، کتاب

تعبیر الروایا: باب تعبیر الروایا (۵/۳۹۲)، بیہقی (۳/۳۷۲)، مشکل الآثار (۳/۱۰۰)]

اس صحیح حدیث سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا اور روزہ رکھنے والا شخص شہید سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ لہذا نماز روزہ ادا کرتے رہو جہاد کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ فلسفہ بالکل غلط ہے اور نہ حدیث کا یہ مفہوم ہے کہ نماز روزہ ادا کرتے رہیں اور جہاد نہ کریں بلکہ یہ دونوں شخص مجاہد بھی تھے اور نمازی بھی تھے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مشکل الآثار میں اس مسئلہ کو شرح و بسط کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ یہ دونوں شخص مجاہدین میں سے تھے۔ دونوں نے اکٹھے ہجرت کی اور دونوں جہاد وغیرہ میں برابر تھے۔ ایک تو محاذ جنگ میں شہید ہو گیا اور دوسرا مہربان (محاذ جنگ پر پہرا دیتا تھا یا ہر وقت جہاد کے لیے تیار) تھا اور اس کے ساتھ اسے دیگر اعمال صالحہ کا موقع بھی مل گیا اور مہربان کے بارے میں یہ حدیث بھی ہے کہ مہربان کا عمل واجر جاری رہتا ہے۔ لہذا یہ بعد میں فوت ہونے والا اپنے زائد اعمال کی وجہ سے اپنے بھائی سے آگے نکل گیا۔ [ملاحظہ ہو: مشکل الآثار (۳/۱۰۳)]

معلوم ہوا کہ یہ دونوں صحابی مجاہد تھے۔ ایک مجاہد شہید ہو گیا جب کہ دوسرا مجاہد اپنے سال بھر کے اعمال صالحہ کی وجہ سے آگے نکل گیا۔ لہذا بعض متصوفین اور منکرین جہاد کا اس روایت سے استدلال کر کے جہاد چھوڑ کر گھر بیٹھے رہنا اور ”اللہ ہو“

کا تصور باندھ کر مصنوعی ذکر کے طریقوں میں مشغول رہنا اور لوگوں کو جہاد سے روکنا ایک مغالطہ اور دھوکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے اور یہ بھی یاد رہے کہ کچھ لوگ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں اپنے اعمال صالحہ کی بنا پر صدیقیت کے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں اور شہداء سے بھی آگے نکل جاتے ہیں لیکن یہ مقام مکمل دین اسلام کو اپنانے اور عمل پیرا ہونے ہی سے ملتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ جیسے عمل صالح اور ایمان کا انکار کر کے نہ صدیقیت کا مقام ملتا ہے اور نہ شہادت ہی کا۔ اس حدیث کے اور بھی شواہد ہیں۔ عبید اللہ بن خالد اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا، ان میں سے ایک شہید کر دیا گیا اور دوسرا اس کے بعد فوت ہوا، ہم نے اس کا جنازہ پڑھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تم نے کیا کہا؟“ صحابہ نے کہا: ”ہم نے اس کے لیے دعا کی:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ اللَّهُمَّ ارْحَمْهُ اللَّهُمَّ الْحَقُّهُ بِصَاحِبِهِ»

”اے اللہ! تو اسے بخش دے، اے اللہ! تو اس پر رحم فرما! اے اللہ! اسے اس کے ساتھی کے ساتھ ملا دے۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«فَأَيْنَ صَلَاتُهُ بَعْدَ صَلَاتِهِ وَ أَيْنَ عَمَلُهُ بَعْدَ عَمَلِهِ؟ فَلَمَّا بَيَّنَّهَا كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ»

[نسائی، کتاب الجنائز: باب الدعاء (۱۹۸۷)، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد: باب فی النور یری عند قبر الشہید (۲۵۲۴)، مسند احمد (۵۰۰/۲)، کتاب الزہد لابن المبارک (۱۳۴۱)، کتاب الزہد للبیہقی (۶۳۳)]

”اس کی اس کے بعد کی نماز کہاں گئی اور اس کا اس کے بعد کا عمل کہاں گیا؟ ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

پھولوں کا تحفہ پیش کرنا

سوال کسی کو پھولوں کا تحفہ پیش کرنا کیسا ہے؟

جواب ایک دوسرے کو تحفے دینا اچھی عادت ہے اور اس سے محبت بڑھتی ہے، شریعت میں تحفے دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

«تَهَادَوْا تَحَابُّوا» [الأدب المفرد للبخاری (۵۹۴)]

”ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تم آپس میں محبت کرنے لگو گے۔“

حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔ [تلخیص الحبیبر (۷۵/۳)]

اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجتا ہرگز حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کا ایک کھر ہی ہو۔“ [بخاری، کتاب

الہبة: باب فضل الہبة (۲۰۶۶)

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدیہ و تحفہ لینا یا دینا محبت کا باعث ہے۔ لہذا پھولوں کا گلہستہ ہو یا کوئی کھانے پینے کی حلال چیز، ایسے تحفے دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ اس میں یہود کی مشابہت ہے۔ مشابہت سے مراد کسی قوم کے ایسے شعار و مخصوص طرز کو اپنانا ہوتا ہے جس کی اسلام میں اجازت نہ ہو۔

بال زائل کرنے کا حکم

(سوال) مختلف جسم کے حصوں سے بال زائل کرنے کا کیا حکم ہے؟

(جواب) پشت، پنڈلی اور جسم کے دوسرے حصوں سے بال زائل کرنا جائز ہے، اگر اس سے بدن کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور اس کا مقصد کافروں کی مشابہت نہ ہو کیونکہ اصل اباحت ہے اور کسی بھی مسلمان کے لیے بلا دلیل کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینا جائز نہیں ہے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ان اشیاء کے بارے میں خاموش رہنا ان کے مباح و جائز ہونے کی دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے مونچھیں کتروانے، ناخن کاٹنے، بغل کے بال اکھیڑنے اور شرمگاہ کے بال مونڈنے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح مردوں کے لیے سر مونڈنے کو بھی مباح کیا ہے اور چہرے کے بالوں کو اکھیڑنے والی اور اکھڑوانے والی عورتوں پر لخت بھیجی ہے۔ نیز ہمیں داڑھی بڑھانے، اسے لمبی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ جس سے خاموش رہ جائیں وہ مباح ہوتا ہے، اسے حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں جنہیں ضائع مت کرو، کچھ حدود متعین کی ہیں جنہیں پامال مت کرو، کچھ

چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے جن کا ارتکاب نہ کرو اور تم پر رحم کرتے ہوئے کچھ چیزوں سے دانستہ سکوت اختیار کیا ہے ان

کی کرید میں نہ پڑو۔“ [دارقطنی (۱۸۳/۴)، طبرانی کبیر (۲۲۲، ۱۲/۲۴)]

مذکورہ حدیث کی روشنی میں بہت سے علماء نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ اس معنی و مفہوم کی اور بھی احادیث و آثار مروی ہیں، جن میں سے کچھ کو حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے جامع العلوم والحکم میں ابو ثعلبہ سے مروی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے نقل کیا ہے، جو مزید معلومات حاصل کرنا چاہے وہ مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کرے۔ (واللہ اعلم)

دین کے لیے وقف کی گئی اولاد سے کام لینا

(سوال) میں نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے قبل منت مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ بیٹا عطا فرمائے گا تو اس کو اللہ کے راستے میں وقف

کروں گا، اب یہ چھ سات سال کا ہو چکا ہے تو کیا میں اس کو گھر کا چھوٹا موٹا کام کہہ سکتا ہوں یا نہیں؟

(جواب) اللہ تعالیٰ کے لیے وقف شدہ بیٹے کا مفہوم تو یہ ہے کہ اسے دین اسلام کی سر بلندی کے لیے لگا دیا جائے تاکہ یہ اللہ

کے دین کا کام کرے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ والدین اپنے بیٹے کو گھریار کا کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں کہہ سکتے۔ والدین کی اطاعت بھی دین اسلام میں داخل ہے اور نیک اولاد اللہ کے حقوق بھی ادا کرتی ہے اور والدین کے بھی۔ آپ اسے خلاف شرع کوئی کام نہیں کہہ سکتے اور نہ جب یہ بڑا ہو جائے اسے دنیاوی جھیلوں میں جھونک سکتے ہیں، آپ اسے خالص اللہ کا دین پڑھائیں اور مجاہد فی سبیل اللہ بنانے کی بھرپور کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں اور کاوشوں کو دین اسلام کی سر بلندی کے لیے بار آور کرے۔ (آمین!)

رسول اللہ ﷺ کا ختنہ

(سوال) کیا رسول اللہ ﷺ کا ختنہ کیا گیا تھا؟

(جواب) نبی کریم ﷺ کو اللہ وحدہ لا شریک لہ نے سب سے اعلیٰ و ارفع بنایا ہے اور بے شمار صفات و خوبیوں سے نوازا ہے۔ آپ ﷺ کے مخنون پیدا ہونے کے متعلق مختلف روایات ہیں جو اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

① انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے فرمایا: ”میری کرامت میں سے ہے کہ میں مخنون پیدا ہوا ہوں، کسی نے میری شرمگاہ کو نہیں دیکھا۔“ [طبرانی صغیر (۹۳۶) طبرانی اوسط، العلل المتناہیة (۱/۱۶۵) دلائل النبوة لأبی نعیم (۱/۴۶) مجمع الزوائد (۵۲/۱۳۸)]
لیکن اس کی سند میں سفیان بن محمد الغزالی الجعفی سارق الحدیث اور متعم بالکذب ہے۔ (میزان الاعتدال (۲/۱۸۲)، لسان المیزان (۶/۱۸۵) اسی طرح اس کی سند میں یثیم اور حسن بصری مدلس بھی ہیں۔

② عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مخنون پیدا ہوئے۔ [طبقات ابن سعد (۱/۱۰۳) دلائل النبوة (۱/۴۶) البداية والنهاية (۲/۲۶۵)] یہ روایت یونس بن عطا کی وجہ سے صحیح نہیں۔

③ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا جس وقت اس نے آپ کے دل کی طہارت کی۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن عیینہ اور سلمہ بن محارب کے بارے میں علامہ بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں ان دونوں کو نہیں پہچانتا۔“ [مجمع الزوائد (۵۲/۱۳۹)]

④ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عبدالمطلب نے ساتویں دن نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا اور دعوت کی اور آپ کا نام محمد رضی اللہ عنہ رکھا۔ [سیر أعلام النبلاء (۱/۲۱)]

اس کی سند میں ولید بن مسلم مدلس ہیں۔ اس روایت کو امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہما والی روایت سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن قیم رضی اللہ عنہ نے اس روایت کے متعلق تین اقوال نقل کیے ہیں:

① آپ ﷺ پیدا ہونے کے مخنون پیدا ہوئے لیکن اس باب میں جو حدیث سب سے زیادہ مشہور ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ امام ابن جوزی رضی اللہ عنہ نے اسے ”الموضوعات“ میں ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں اور یہ آپ ﷺ کے

خواص میں سے بھی نہیں۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ مختون پیدا ہوئے ہیں۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ ختنہ اس دن ہوا جب حلیمہ دانی کے ہاں ملائکہ نے آپ ﷺ کا شق صدر کیا۔

③ تیسرا قول یہ ہے کہ ولادت کے ساتویں دن آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے ختنہ کیا اور اس تقریب پر دعوت بھی کی

اور آپ ﷺ کا نام محمد (ﷺ) رکھا۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”اس باب میں ایک مسند غریب روایت کی گئی ہے۔“

[زاد المعاد (۱/۸۲۰۸۱)]

یہ مسئلہ دو فاضلوں کمال الدین ابی طلحہ اور کمال الدین بن العدیم کے درمیان واقع ہوا۔ اول الذکر نے اس پر کتاب لکھ ماری اور ہر طرح کی بے لگام روایات اکٹھی کر دیں کہ آپ ﷺ مختون پیدا ہوئے اور ثانی الذکر نے اس کا نقض کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ نبی ﷺ کا عرب کے دستور کے مطابق ختنہ ہوا، چونکہ یہ رواج تھا اس لیے ثبوت کے لیے کسی سند کی حاجت نہیں، مدعی کو دلیل پیش کرنی چاہیے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ تھی یا چار؟

(سوال) خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک بیٹی فاطمہ تھی یا چار؟

(جواب) رسول اکرم ﷺ کی ۲۵ برس کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی اور بعثت سے قبل سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آپ ﷺ کی تین بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ ﷺ نے ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کیا، رقیہ اور ام کلثوم کا نکاح بالترتیب آپ ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ تیسری صدی ہجری تک کسی بھی شخص نے آپ ﷺ کی مذکورہ بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا اور فریقین (شیعہ و سنی) کی معتبر کتب میں ان بیٹیوں کا تذکرہ موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ایک غالی شیعہ ابو القاسم علی بن احمد بن موسیٰ التوفی ۳۵۲ھ نے اپنی بدنام زمانہ کتاب ”الاستغاثۃ فی بدع الثلاثة“ میں اس بات کا انکار کیا اور کہا: ”یہ آپ ﷺ کی حقیقی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ بیٹیاں تھیں۔ حالانکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عتیق بن عازر مخزومی سے ہوا اور اس سے ایک لڑکی ہندہ پیدا ہوئی۔ پھر اس کے بعد دوسرا نکاح ابو ہالہ تمیمی سے ہوا جس سے ایک لڑکا ہند اور ایک لڑکی ہالہ پیدا ہوئی اور اس کے بعد پھر آپ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ آپ ﷺ سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چار بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ نسب کی یہ تفصیل کتاب نسب قریش (ص: ۲۲۸، ۳۳) میں، کشف الغمۃ فی معرفۃ الأئمة، عمدۃ الطالب فی أنساب آل ابی طالب اور جمہرۃ الأنساب وغیرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اپنے پہلے خاندانوں سے زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا نامی کوئی بیٹی نہیں۔ یہ شیعہ کا دجل اور ان کی تلمیذ ہے۔

لیکن شیعہ محدثین میں سے مشہور شیعہ عبد اللہ مامقانی نے اپنی کتاب ”تنقیح المقال (ص: ۷۹)“ پر ابو القاسم کوئی کی اس بات

کا رد کیا ہے۔

چنانچہ عبداللہ ماتقانی شیعہ نے لکھا ہے:

”ابو القاسم کوفی کا ”الاستغاثۃ فی بدع الثلاثة“ میں یہ قول کہ زینب اور رقیہ رضی اللہ عنہما آپ کی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ ربیبہ تھیں، یہ قول بلا دلیل ہے، یہ ابو القاسم کی محض اپنی رائے ہے جس کی حیثیت نصوص کے مقابلے میں مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں۔ کتب فریقین میں رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیوں پر نصوص موجود ہیں اور شیعوں کے پاس اپنے اقوال موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔“

یہ بات بھی یاد رہے کہ اکثر علمائے شیعہ نے ابو القاسم شیعہ کی ہنوت پر نقد کیا ہے بلکہ اسے بے دین قرار دیا ہے جیسا کہ معروف شیعہ عالم شیخ عباس قمی نے ”تمۃ الممتہی (ص: ۲۹)“ پر لکھا ہے:

”ابو القاسم کوفی علی بن احمد بن موسیٰ وفات یافت و اودر آخر عمر مذہب فاسد شدہ بود و کتابها بسیار تالیف کرده انداز کتاب ہائے ابو القاسم کوفی کتاب الاستغاثۃ است“

”ابو القاسم کوفی فوت ہوا تو آخر عمر میں اس کا مذہب فاسد ہو گیا تھا اور اس نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں۔ اس کی کتابوں میں سے ایک کتاب ”الاستغاثۃ“ بھی ہے۔“

اسی طرح شیعہ عالم آقا میر نے ”نقد الرجال (ص: ۲۲۶)“ پر لکھا ہے:

”أَبُو الْقَاسِمِ كُوفِيٌّ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكُوفَةِ كَانَ يَقُولُ مِنْ آلِ أَبِي طَالِبٍ وَ غَلَا فِي آخِرِ عُمُرِهِ وَ فَسَدَ مَذْهَبُهُ وَ صَنَّفَ كُتُبًا كَثِيرَةً أَكْثَرُهَا عَلَى الْفَسَادِ“

اس سے معلوم ہوا کہ ابو القاسم کوفی جو عالی شیعہ تھا اور کئی فساد پر مبنی کتابوں کا مصنف تھا، اس نے سب سے پہلے بنات الرسول ﷺ کا انکار کیا، پھر اس کی پیروی میں بعد والے شیعوں نے انکار کیا حالانکہ قرآن مجید، کتب احادیث اور فریقین کی کتب سے یہ بات تو اتر کی حد تک ثابت ہے کہ آپ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اب نصوص ملاحظہ کریں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَسَاءُهَا النَّبِيُّ قُلٌّ لِّأَزْوَاجِكَ وَ بَنَاتِكَ وَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِئِبِهِنَّ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْدُبْنَ وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ [الاحزاب: ۵۹]

”اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادریں لٹکا لیا کریں، یہ قریب تر ہے کہ وہ پہچانی جائیں۔ پس وہ ایذا نہ دی جائیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس آیت کریمہ میں لفظ ”ازواج“ زوجہ کی اور لفظ ”بنات“ بنت کی اور لفظ ”نساء“ امراة کی جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے اور اس آیت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ ﷺ کی بیٹیاں تین سے زائد تھیں اور فریقین کی

کتب سے اس بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی بیٹیوں کی تعداد چار ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت میں پردے کے احکام بیان کیے جا رہے ہیں اور احکام شرعیہ کا مکلف بالغ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نزول آیت کے وقت آپ ﷺ کی تین سے زائد بالغ بیٹیاں موجود تھیں جنہیں پردے کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل سنت کے ہاں تو یہ بات متفقہ ہے کہ آپ ﷺ کی چار بیٹیاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، اس لیے اہل سنت کے حوالے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو لوگ اس بات کے منکر ہیں، ہم ان کی معتبر کتابوں کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں:

① عبد اللہ ماقانی شیعہ اپنی کتاب ”تنقیح المقال فی احوال الرجال (ص: ۷۷)“ پر قمر طراز ہیں:

”إِنَّ كُتُبَ الْفَرِيقَيْنِ مَشْحُونَةٌ بِأَنَّهَا وُلِدَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَ أُمُّ كَلثُومُ وَ فَاطِمَةُ وَ رُقِيَّةُ وَ بَنَاتُهُ أَدْرَكْنَ الْإِسْلَامَ وَ هَاجَرْنَ مَعَهُ وَ اتَّبَعْنَهُ“

”بے شک فریقین کی کتب اس بات سے بھری پڑی ہیں کہ آپ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیاں زینب، ام کلثوم، فاطمہ اور رقیہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں اور انہوں نے اسلام کو پایا اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی اور آپ ﷺ کی اتباع کی۔“

② مشہور شیعہ محدث محمد بن یعقوب کلینی نے ”اصول کافی“ باب التاریخ (ص: ۲۷۸) پر لکھا ہے:

”وَ تَزَوَّجَ خَدِيجَةَ وَ هُوَ ابْنُ بَضْعٍ وَ عِشْرِينَ سَنَةً قَوْلِدَ لَهُ مِنْهَا قَبْلَ مَبْعِثِهِ الْقَاسِمُ وَ رُقِيَّةُ وَ زَيْنَبُ وَ أُمُّ كَلثُومُ وَ وُلِدَ لَهُ بَعْدَ الْمَبْعَثِ الطَّيِّبُ وَ الطَّاهِرُ وَ الْفَاطِمَةُ“

”آپ ﷺ نے ۲۵ برس کی عمر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے ایک بیٹا قاسم اور تین بیٹیاں رقیہ، زینب اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد طیب، طاہر اور فاطمہ پیدا ہوئے۔“

③ شیخ صدوق نے لکھا ہے:

”وَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا حُمَيْرَا فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى بَارَكَ فِي الْوَلُودِ فَإِنَّ خَدِيجَةَ رَحِمَهَا اللَّهُ وَلَدَتْ مِنِّي طَاهِرًا وَ هُوَ عَبْدُ اللَّهِ وَ هُوَ الْمُطَهَّرُ وَلَدَتْ مِنِّي الْقَاسِمُ وَ فَاطِمَةَ وَ رُقِيَّةَ وَ أُمُّ كَلثُومُ وَ زَيْنَبُ“

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے حمیرا! بے شک اللہ تعالیٰ نے بچے دینے والی میں برکت رکھی ہے۔ خدیجہ نے مجھ سے طاہر کو جنم دیا اور وہ عبد اللہ اور مطہر ہے اور اس نے مجھ سے قاسم، فاطمہ، رقیہ، ام کلثوم اور زینب رضی اللہ عنہا کو جنم دیا۔“

اس حوالہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی چار بیٹیوں کا اقرار کر رہے ہیں جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

④ ”مناقب ابن شہر آشوب (۱۶۱/۱)“ میں ہے:

”وَ أَوْلَادُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَدِيدِجَةَ الْقَاسِمُ وَ عَبْدُ اللَّهِ وَ هُمَا الطَّاهِرُ وَ الطَّيِّبُ وَ أَرْبَعُ بَنَاتٍ زَيْنَبُ وَ رُقِيَّةُ وَ أُمُّ كَلْثُومُ وَ فَاطِمَةُ“

”آپ ﷺ کی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اولاد قاسم اور عبد اللہ رضی اللہ عنہما تھی اور وہ دونوں طاہر و طیب تھے اور چار بیٹیاں زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہما تھیں۔“

⑤ تذکرۃ المعصومین (ص ۶) پر ہے:

”تَزَوَّجَ حَدِيدِجَةَ : وَ هُوَ ابْنُ بَضْعٍ وَ عِشْرِينَ سَنَةً فَوَلَدَتْ لَهُ قَبْلَ مَبْعَثِهِ رُقِيَّةً وَ أُمَّ كَلْثُومَ وَ زَيْنَبَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُنَّ“

”جب رسول اللہ کی عمر ۲۰ برس سے کچھ زیادہ تھی تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور بعثت سے پہلے خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی تین بیٹیاں رقیہ، ام کلثوم اور زینب رضی اللہ عنہما تھیں۔“

⑥ شیعہ حضرات کی معروف ترین کتاب ”تحفۃ العوام (ص: ۱۱۶)“ پر ہے:

”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى رُقِيَّةَ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَ الْعَنْ مَنْ أَدَى نَبِيَّكَ فِيهَا اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى كَلْثُومِ بِنْتِ نَبِيِّكَ وَ الْعَنْ مَنْ أَدَى نَبِيَّكَ فِيهَا“

”اے اللہ! اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی کو اس بارے میں تکلیف دی، اس پر لعنت کر۔ اے اللہ! اپنے نبی ﷺ کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت نازل فرما اور جس نے تیرے نبی کو اس بارے میں تکلیف دی اس پر لعنت کر۔“

اس کے علاوہ شیعہ مذہب کی معتبر کتب حیاة القلوب، حلاء العیون، تہذیب الأحکام، الاستبصار، مرآة العقول، فروع کافی، صافی شرع کافی، کشف الغمۃ، قرب الاسناد، مجالس المؤمنین، اعلام الوری، منتخب التواریخ، مناقب آل ابی طالب، امالی شیخ طوسی، رجال کشی اور انوار نعمانیہ وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے چار بیٹیوں کا ذکر موجود ہے۔

کالے کپڑے پہننے کا حکم

① سوال) کالے کپڑے پہننے کا کیا حکم ہے؟

② جواب) شرعی طور پر سیاہ لباس پہننے میں کوئی قباحت نہیں۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے ایک روایت نقل کی ہے:

”ام خالدہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس کپڑے لائے گئے، ان میں ایک چھوٹی سیاہ چادر تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارا کیا خیال ہے ہم یہ چادر کسے پہنائیں؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”میرے پاس ام خالد بنت خالد کو لاؤ۔“ اسے اٹھا کر لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں چادر پکڑی اور اسے پہنا دی اور فرمایا: ”اسے بوسیدہ و پرانا کرو۔“ اس چادر میں سبز یا زرد نشانات تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے ام خالد! یہ اچھا ہے۔“

[بخاری، کتاب اللباس : باب الخمیصة السوداء : (۵۸۲۳)]

بخاری ہی میں نبی کریم ﷺ کی سیاہ چادر کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ لباس پہننا درست ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بعض مخصوص ایام میں مشابہت کی وجہ سے اجتناب کیا جائے۔

ضعیف روایات کا حکم

(سوال) کیا ضعیف روایات قابل حجت ہیں؟

(جواب) ضعیف روایات سے شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا اگرچہ بعض علماء ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال میں ضعیف روایات ذکر کرتے ہیں لیکن کبار محدثین و اصولیین ضعیف حدیث پر عمل کرنے کو نہ تو احکام میں جائز سمجھتے ہیں اور نہ فضائل اعمال وغیرہ ہی میں۔ ان محدثین کے گروہ میں امام یحییٰ بن معین، امام بخاری، امام مسلم، امام ابن حبان الہستی، امام ابن حزم، امام ابن العربی المالکی، امام ابو شامہ المقدسی، امام ابن تیمیہ، امام شاطبی، امام خطیب بغدادی اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ جیسی عظیم الشان ہستیاں شامل ہیں۔ علامہ محمد جمال الدین القاسمی رقمطراز ہیں:

”ضعیف روایت کے بارے میں تین مذاہب ہیں: پہلا مذہب یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً جائز نہیں، نہ احکام میں اور نہ فضائل میں۔ ابن سید الناس نے عیون لأثر میں امام یحییٰ ابن معین رحمہم اللہ کی نسبت اور علامہ سخاوی نے فتح المغنیف میں امام ابوبکر ابن العربی کی طرف یہ مذہب منسوب کیا ہے۔ بظاہر امام بخاری اور امام مسلم رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام بخاری کا اپنی صحیح میں شرط اور امام مسلم کا ضعیف راویوں پر تشبیح کرنا اور صحیحین میں ان سے کسی روایت کی تخریج نہ کرنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے ہاں ضعیف روایت پر عمل مطلق طور پر جائز نہیں۔ یہی مذہب امام ابن حزم رحمہم اللہ کا ہے، انھوں نے اپنی کتاب ”المسلل والنخل“ میں فرمایا ہے: ”(پانچویں چیز وہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ) وہ روایت جس کو اہل مشرق و مغرب نے یا گروہ نے گروہ سے یا ثقہ نے ثقہ سے نقل کیا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی لیکن اگر کسی طریق میں کوئی ایسا راوی ہے جو کذب، غفلت یا مجہول الحال ہونے کے ساتھ مجروح ہے تو یہ بھی وہ بات ہے جس کو بعض مسلمانوں نے بیان کرنا جائز رکھا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا بیان کرنا، اس کی تصدیق کرنا اور اس سے کچھ اخذ کرنا حلال نہیں۔“ [قواعد التحذیر من فنون مصطلح الحدیث (ص ۱۱۳)]

دوسرا مذہب علامہ قاسمی رحمہم اللہ نے امام سیوطی رحمہم اللہ وغیرہ کا نقل کیا ہے، جن کے نزدیک ضعیف روایت پر عمل کرنا مطلقاً جائز ہے۔ تیسرا مذہب فضائل اعمال میں ضعیف روایات کو چند شرطوں کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلا مذہب ہی راجح و قوی ہے کیونکہ کسی امر کا مستحب ہونا بھی ایک شرعی امر ہے اور شرعی امور کے لیے صحیح احادیث ہی درکار ہوتی ہیں۔

[قواعد التحذیر من فنون مصطلح الحدیث (ص ۱۱۳)]

مشہور حنفی عالم محمد زاہد کوثری نے ضعیف روایت کو مطلق طور پر نہ لینے کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ [مقالات

کوثری (ص/ ۴۵۰-۴۶)]

علامہ احمد شاہ کرطبی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ [الفوائد المجموعہ فی الأحادیث الموضوعۃ (ص/ ۲۸۳)]

علامہ شوکانی کرطبی نے بھی اس کے قائل ہیں۔ [الفوائد المجموعہ فی الأحادیث الموضوعۃ (ص/ ۲۸۳)]

امام ابن تیمیہ اور علامہ ناصر الدین عینی بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ [قاعدة جلیلة فی التوسل والوسيلة (ص/ ۱۱۲) -

(۱۱۳) صحیح الجامع الصغیر (ص/ ۵۱)]

گھر سے نکلنے کی دعا کی وضاحت

(سوال) آپ کے مرکزی ڈائری میں گھر سے نکلنے کی اور داخل ہونے کی دو دعائیں لکھی ہیں:

① « بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ »

② « اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَوْلَجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَكُنَّا وَ عَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا »

جبکہ صلوة الرسول کی تخریج تسہیل الوصول (ص: ۴۹۴/۴۹۵) میں لکھا ہے کہ یہ دونوں روایات ضعیف ہیں، برائے مہربانی

صحیح رہنمائی فرمائیں؟

(سوال) گھر سے نکلنے کی یہ دعا ابو داؤد، ترمذی، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی، التوکل لابن ابی

الدنیا، کتاب الدعاء للطبرانی اور ابن حبان وغیرہا میں مروی ہے، اس کے متعلق میری تحقیق یہی ہے کہ یہ روایت

درست نہیں۔ اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ ابی طلحہ سے بیان کرنے والے راوی ابن جریج ہیں اور یہ مدلس ہیں اور اپنی

روایت میں انھوں نے اپنے استاد اسحاق سے حدیث سننے کی وضاحت نہیں کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ ابن جریج کی

اسحاق سے مجھے ملاقات معلوم نہیں۔ [الفتوحات الربانیة (۱/ ۳۳۵)]

لہذا یہ روایت اس علت کی وجہ سے درست نہیں اور گھر میں داخل ہونے والی یہ روایت بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اس کی

سند میں شریح بن عبید حضری ہیں جن کی ابو مالک اشعری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت مرسل ہے۔ جیسا کہ امام ابو حاتم رازی نے اپنی

کتاب مراسیل (۹۰) میں ذکر کیا ہے اور مرسل محدثین کے ہاں ضعیف کی اقسام میں سے ہے، لہذا یہ دونوں روایتیں ہمارے

نزدیک اسنادی اعتبار سے صحیح نہیں۔ ڈائری مرتب کرنے والے بھائی کو (ان شاء اللہ) متنبہ کر دیں گے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد

(سوال) آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا مراد ہے؟

(جواب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے بارے میں اہل علم مختلف فیہ ہیں:

① ایک قول یہ ہے کہ آل نبی سے مراد وہ لوگ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ پھر ان میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ آل نبی جن پر صدقہ حرام ہے وہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ خاص طور پر بنو ہاشم ہیں۔

② دوسرا قول یہ ہے کہ آل نبی ﷺ سے مراد آپ ﷺ کی اولاد اور بیویاں ہیں۔

③ تیسرا قول یہ ہے کہ آل نبی ﷺ سے مراد قیامت تک آنے والے آپ کے پیروکار ہیں۔

④ چوتھا قول یہ ہے کہ آل سے مراد آپ ﷺ کی امت کے متقی و پرہیزگار لوگ ہیں۔

پہلے قول کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ کھجوریں پکنے کے وقت آپ ﷺ کے پاس مختلف کھجوریں لائی جاتی تھیں۔ مختلف لوگ کھجوریں لاتے یہاں تک کہ آپ کے ہاں کھجوروں کا ڈھیر لگ جاتا۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما ان کھجوروں سے کھینے لگے تو ان میں سے ایک نے کھجور پکڑ کر منہ میں ڈال لی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے کھجور نکال دی اور فرمایا: ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آل محمد صدقہ نہیں کھاتے؟“ [بخاری، کتاب الزکاة: باب اخذ صدقة التمر..... (۱۴۸۵)]

صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے کہ ربیعہ اور فضل بن عباس کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ”یہ صدقات لوگوں کی میل کچیل ہیں اور یہ محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی آل کے لیے حلال نہیں۔“ [مسلم، کتاب الزکاة: باب ترك استعمال آل النبی علی الصدقة (۱۰۷۲)]

آپ ﷺ کی اولاد اور ازواج کو آل محمد ﷺ میں شامل کرنے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ہے:

«اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ» [بخاری، کتاب أحاديث الأنبياء: باب قول الله:

واتخذ الله إبراهيم خليلاً (۳۳۶۹)]

”اے اللہ! محمد ﷺ اور آپ کی ازواج اور اولاد پر رحمت نازل فرما۔“

امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا کی شرح التعمیر میں ذکر کیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آل محمد سے مراد آپ ﷺ کی بیویاں اور اولاد ہے اور «اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ» آل محمد ﷺ کی تفسیر ہے۔ اسی طرح صحیحین کی حدیث:

«اللَّهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ قُوتًا» [مسلم، کتاب الزکاة: باب فى الكفاف والقناعة (۱۰۵۵)]

”اے اللہ! آل محمد کا رزق بقدر خوراک بنا دے۔“

ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی یہ دعائے مستجاب تمام بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب پر صادق نہیں آتی کیوں کہ ان میں اس وقت بھی دولت مند اور صاحب وسعت تھے اور اب بھی ہیں مگر ازواج و ذریت پر یہ دعا بالکل صادق آتی ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں ان کا رزق بقدر خوراک تھا اور آپ ﷺ کے بعد بھی یہی حال تھا۔ اگر کہیں سے مال آجاتا تو ازواج

مطہرات بقدر خوراک کچھ رکھ کر باقی صدقہ کر دیتی تھیں۔
تیسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ معظم اور متبوع شخص کی آل وہ ہوتی ہے جو اس کے طریقے اور دین پر ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَا هُم بِسَحْرِ﴾ [القمر: ۴۳]

”ہم نے آل لوط کو سحری کے وقت نجات دی۔“

یہاں آل لوط سے مراد ان کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَذِلُّوْا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [غافر: ۴۶]

”آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔“

یہاں آل فرعون سے مراد اس کے پیروکار ہی ہیں۔ اسی طرح داہلہ بن اسحق کے بارے میں بیہقی میں حدیث ہے کہ آپ نے انہیں اپنے اہل میں شمار کیا حالانکہ داہلہ رضی اللہ عنہ نسب میں تو بنو لیث بن کبر میں سے تھے لیکن وہ اتباع رسول ﷺ میں سے تھے۔ چوتھے قول کی دلیل یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [ہود: ۴۶]

”یہ آپ کے اہل میں سے نہیں، اس لیے کہ یہ اچھے اعمال والا نہیں۔“

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے جلاء الأفہام میں اس موضوع پر مفصل بحث کر کے فرمایا ہے کہ ان چاروں میں سے صحیح ترین قول پہلا ہے۔ کیوں کہ اس شبہ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی ان احادیث میں رفع کر دیا ہے: ”صدقہ محمد اور آل محمد پر حلال نہیں“ اور ”آل محمد کو رزق بقدر خوراک عطا کر۔“ ان احادیث کے مضمون کو ملحوظ رکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ آل محمد ﷺ سے مراد عموم امت کو سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے [جلاء الأفہام لابن القیم رحمہ اللہ]

خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں

سوال اگر کوئی اس طرح کے کام میں اپنی ماں کے حکم کی نافرمانی کرے جس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ جیسے کہ میری ماں مجھے زیب و زینت اختیار کرنے اور بے پردہ رہنے کو کہتی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ”حجاب“ بے ہودہ چیز ہے، دین میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محفلوں میں جانے اور ایسے کپڑے پہننے کو کہتی ہیں جن سے ہر وہ عضو جھانکتا نظر آتا ہے جس کی نمائش کو اللہ تعالیٰ نے عورت کے لیے حرام قرار دیا ہے نیز جب وہ مجھے پردہ میں دیکھتی ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتی ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں، چاہے ماں ہو یا باپ یا کوئی اور ہو، نبی

اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”صرف معروف ہی میں اطاعت کی جائے گی۔“ (بخاری، کتاب الأحکام: باب السمع والطاعة للامام)

الخ، (۶۱۴۵)

دوسری جگہ فرمایا: ”خالق کی نافرمانی کی صورت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔“ [مسند احمد، (۱/۱۳۱)]

اور وہ تمام کام جنہیں کرنے کی آپ کی ماں آپ کو دعوت دیتی ہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے ہیں، ان میں اپنی ماں کی اطاعت کرنا آپ کے لیے جائز نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت اور شیطان کی اطاعت سے محفوظ رکھنے کی دعا کرتے ہیں۔

قرآن پاک کے شہید اور اراق کو محفوظ کرنا

سوال کچھ لوگ قرآن پاک کے شہید اور اراق دفن کر دیتے ہیں یا کنویں اور دریا وغیرہ میں ڈال دیتے ہیں، کیا یہ جائز ہے۔ قرآن وحدیث کی رو سے تحریر کریں۔

جواب قرآن حکیم کے شہید اور اراق ہوں یا کسی اور دینی کتاب کے انہیں جس طرح بھی مناسب ہو محفوظ کر دینا چاہیے تاکہ ان کی توہین نہ ہو۔ انہیں دفن کر کے بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جلا کر راکھ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح البخاری میں عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے۔ الغرض ایسی مکمل صورت اختیار کی جائے جس سے ان اور اراق کا تحفظ ہو جائے۔ آج کل کئی لوگ دریاؤں میں ڈال دیتے ہیں، اس میں کچھ قباحتیں بھی ہیں۔ دریائے راوی میں گندے گٹروں کا پانی گرتا ہے اور اکثر یہ خشک رہتا ہے۔ اب جس پانی میں پاخانے اور پیشاب والا پانی ملا ہو اس میں ان اور اراق کو ڈالنے سے توہین ہوتی ہے، اس سے بچا جائے۔ کئی علاقوں کو دریا سے نہریں نکال کر سیراب کیا جاتا ہے اور ایسے اور اراق اس پانی میں بہ کر کھیتوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں لوگوں کے پاؤں تلے روندے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر طریقہ یہی ہے کہ گہرا گڑھا کھود کر زمین میں دفن کر دیا جائے یا جلا کر ان کی حیثیت ختم کی جائے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ

سوال کیا احناف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں؟

جواب فقہ حنفی کو ماننے والے خواص و عام کی حالت یہ ہے کہ جب کسی صحابی کا فتویٰ یا قول امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق ہو تو اس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اگر مخالف ہو تو غیر فقیہ وغیر مجتہد اور اعرابی کہہ کر نال دیتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَا تُصَرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنْ ابْتِغَاهَا بَعْدَ ذَلِكَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلُبَهَا فَإِنَّ

رَضِيهَا أَمْسَكَهَا وَإِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ» [مسلم، کتاب البیوع: باب تحریم بیع الرجل علی بیع اخیه..... الخ (۱۵۱۵) ، بخاری، کتاب البیوع: باب النهی للبائع أن یحفل الإبل (۲۱۴۸)]

”اونٹنی اور بکری کا دودھ روک کر نہ بچھو اور جو آدمی ایسا جانور خریدے تو دودھ دوہنے کے بعد اس کی اپنی مرضی ہے اگر چاہے تو رکھ لے اور اگر چاہے تو اس کو واپس کر دے اور ایک صاع کھجور کا بھی ساتھ دے۔“

احناف کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے۔ ملا جیون حنفی نے لکھا ہے:

”فَإِنَّ هَذَا الْحَدِيثَ مُخَالَفٌ لِلْقِيَاسِ مِنْ كُلِّ وَجْهِ“

”ہر لحاظ سے یہ حدیث قیاس کے مخالف ہے۔“

اس کے بعد کہتے ہیں: ”اگر راوی عدالت اور ضبط کے ساتھ معروف ہو، فقیہ نہ ہو جیسا کہ انس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہوگی تو ضرورت کے تحت چھوڑ دیا جائے گا ورنہ ہر لحاظ سے رائے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔“

بلاشبہ یہ حدیث ہر لحاظ سے قیاس کے خلاف ہے کیوں کہ یہ ایک صاع کھجور دودھ کے عوض دے رہا ہے۔ قیاس کا تقاضا ہے کہ دودھ کا تاوان دودھ ہی سے ادا کیا جائے یا اس کی قیمت سے اور اگر کھجور بدلا ہو تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ دودھ کی کمی بیشی کے لحاظ سے کھجور میں بھی کمی بیشی ہو، نہ یہ کہ کمی بیشی کے ہر حال میں ایک صاع کھجور ضروری ہو۔ اس لیے احناف نے کہا ہم دیکھیں گے کہ اس حدیث کا راوی کون ہے؟ اگر راوی فقیہ ہوا تو حدیث لی جائے گی اور قیاس کو ترک کیا جائے گا اور اگر راوی غیر فقیہ و غیر مجتہد ہوا تو قیاس کو مانا جائے گا اور حدیث کو چھوڑا جائے گا۔“

[نور الأنوار (۱۷۹)، اصول شاشی (۷۵)، الحسامی مع شرح النظامی (۷۵)، اصول ہزدوی (۱۵۹)، التوضیح والتلویح (۴۷۳)، اصول سرخسی (۳۴۱/۱)]

احناف نے کہا: ”اس حدیث کے راوی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ فقیہ ہیں۔ اس لیے یہ حدیث متروک ہے۔“

نور الانوار کی عبارت یہ ہے:

”وَإِنْ عُرِفَ بِالْعَدَالَةِ وَالضَّبْطِ دُونَ الْفِقْهِ كَأَنَسِ وَأَبِي هُرَيْرَةَ إِنْ وَافَقَ حَدِيثُهُ الْقِيَاسَ عُمِلَ بِهِ وَإِنْ خَالَفَهُ لَمْ يُتْرَكْ إِلَّا بِالضَّرُورَةِ لَأَنَسَدَ بَابَ الرَّأْيِ مِنْ كُلِّ وَجْهِ“

یہ حدیث صرف سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی نہیں بلکہ، اس حدیث کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیان کرتے ہیں۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اسی روایت کے بعد ان کا یہ فتویٰ درج کیا ہے اور مذکورہ بالا روایت کی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ ہیں تو حنفیوں کو چاہیے کہ وہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی غیر فقیہ کہہ دیں۔ اس کے علاوہ یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مسند ابویعلیٰ موصلی میں، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن ابی داؤد اور طبرانی میں، سیدنا عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے خلائیات بہیقی میں اور رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تحفۃ الاحوذی میں مروی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”وَ أَظُنُّ أَنَّ لِهَذِهِ النُّكْتَةِ أَوْرَدَ الْبُخَارِيُّ حَدِيثَ ابْنِ مَسْعُودٍ عَقِبَ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ إِشَارَةً مِنْهُ إِلَى أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ قَدْ أَفْتَى بِوُفْقِ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ فَلَوْ لَا أَنَّ خَبَرَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي ذَلِكَ ثَابِتٌ لَمَا خَالَفَ ابْنُ مَسْعُودٍ الْقِيَاسَ الْحَلِيِّ فِي ذَلِكَ“ [فتح الباری (۴/۳۶۵)]

”مجھے یقین ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بعد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اس لیے نقل کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ اگر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ثابت نہ ہوتی تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ قیاس جلی کی مخالفت نہ کرتے۔“

اس لیے اصول شاشی پر حاشیہ لگانے والا صحیح اٹھا اور اس نے کہا:

”لَكِنَّ هُنَا دِقَّةٌ قَوِيَّةٌ وَ هِيَ أَنَّ هَذَا الْحَدِيثَ جَاءَ فِي الْبُخَارِيِّ بِرِوَايَةِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَيْضًا وَ الْحَالُ أَنَّهُ مَعْرُوفٌ بِالْفِقْهِ وَ الْإِجْتِهَادِ“

”یہاں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہی روایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی بخاری میں مروی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں۔“

اسی لیے بعض حنفیوں نے اس اصول سے جان چھڑانے کے لیے کہا: ”یہ قاضی ابو یوسف کے شاگرد عیسیٰ بن ابان کا قاعدہ ہے۔ مگر ان کی جان کی خلاصی اس قانون سے کبھی نہیں ہو سکتی۔“

اولاً: اس لیے کہ ان کے اصول کی معتبر کتابوں میں یہ قانون موجود ہے جس کی بنا پر یہ حدیث مصراۃ کو رد کرتے ہیں اور یہ قانون جہاں جہاں موجود ہے اس کے حوالے میں نے اوپر درج کر دیے ہیں۔

ثانیاً: مولوی خلیل احمد سہارنپوری نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ ہمارے حنفی علماء ہی کا یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

”وَ الْأَصْلُ عِنْدَنَا أَنَّ الرَّاَوِيَ إِنْ كَانَ مَعْرُوفًا بِالْعَدَالَةِ وَ الْحِفْظِ وَ الصَّبْطِ دُونَ الْفِقْهِ وَ الْإِجْتِهَادِ مِثْلُ أَبِي هُرَيْرَةَ وَ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَإِنَّ وَافَقَ حَدِيثُهُ الْقِيَاسَ عَمِلَ بِهِ وَ إِلَّا لَمْ يُتْرَكْ إِلَّا لِضُرُورَةٍ وَ انْسِدَادِ بَابِ الرَّأْيِ وَ تَمَامِهِ فِي أُصُولِ الْفِقْهِ“ [حاشیہ علی البخاری (۱/۲۸۸)]

”ہمارے نزدیک قاعدہ یہی ہے کہ اگر راوی عدالت، حفظ اور ضبط میں تو معروف ہو لیکن فقہت و اجتہاد کی دولت سے محروم ہو جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا انس ابن مالک رضی اللہ عنہ ہیں تو اگر ان کی حدیث قیاس کے مطابق ہوگی تو عمل کیا جائے گا اور اگر قیاس کے خلاف ہوگی تو بوقت ضرورت چھوڑ دی جائے گی تاکہ رائے و قیاس کا دروازہ بند نہ ہو اور اس کی مکمل بحث اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے۔“

حنفی علماء کا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہنا سراسر باطل ہے۔ امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے:

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حفظ حدیث اور ادائے حدیث میں سب سے فائق تھے۔ انھوں نے حدیث مصراۃ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، ہم پر لازم ہے کہ اس پر عمل کریں۔“ [سیر أعلام النبلاء (۲/ ۶۱۹)]

یہاں یہ بات ضرور یاد رہے کہ اصل کتاب و سنت ہے، اس کے برعکس قیاس فرع ہے۔ اصل کو فرع کے ساتھ رد کرنا مردود و باطل ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت قیاس کے بھی مطابق ہے۔ مزید تفصیل کے لیے امام ابن قیم رضی اللہ عنہ کی کتاب ”اعلام الموقعین“ کا مطالعہ کیجیے۔

صحیح بخاری کو ناقابلِ صحت سمجھنے والوں کا حکم

(سوال) صحیح بخاری کو ناقابلِ صحت سمجھنے والوں کا کیا حکم ہے؟

(جواب) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل مجموعہ کے بارے میں اس طرح کا موقف اپنانا اور کتب احادیث کو حقیر سمجھنا بدعتوں اور زندگیوں کا کام ہے۔ جو لوگ حدیث کی کتاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ ﴿ وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ کا مصداق ہیں۔ اصل ایمان کا راستہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے افراد کا نام لے کر نہیں بتایا کہ فلاں فلاں شخص ایماندار ہیں اور فلاں فلاں کافر، مشرک اور بدعتی ہیں بلکہ عقائد و اعمال بتائے ہیں جن کے اپنانے سے آدمی مسلمان ہوتا ہے اور ایسے عقائد و اعمال بھی بتائے ہیں جن کو اختیار کرنے سے آدمی دائرۃ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جو آدمی ایسا یقین پیدا کر لے کہ اللہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ ذات، صفات اور افعال میں یکتا اور بے مثل ہے۔ فرشتے اس کی پیدا کردہ نورانی مخلوق ہیں اور جہاں جہاں اس نے ان کی ذمہ داری لگا رکھی ہے وہ احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں وہ برحق ہیں اور قرآن حکیم اس کی طرف سے آخری کتاب نازل ہوئی ہے۔ اب اس کے احکامات کے مطابق چلنا چاہیے اور اس کے تمام انبیاء و رسل سچے ہیں، آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کی اطاعت و اتباع فرض ہے اور قیامت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔ جس میں ہر انسان کو اس کے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ نیکی اور بدی پیدا کرنے والا وہی ہے۔

تو ایسے عقائد اختیار کرنے والا مسلم و مؤمن ہے اور کلمہ شہادت کے اقرار کے بعد نماز قائم کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، صاحب استطاعت کا زکوٰۃ دینا اور حج کرنا، جس آدمی کے اندر یہ باتیں پائی جائیں وہ مسلمان ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہائش رکھنا ہو، اس میں دیار عرب یا عجم کی کوئی قید نہیں ہے اور جس کے عقائد یہ نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے۔ ہر چیز اپنی علامت سے پہچانی جاتی ہے۔ ورنہ کوئی زندیق یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ امام مالک، امام احمد، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام

بخاری، امام مسلم وغیرہ کا اسلام لانا قرآن کی کسی آیت سے ثابت ہے یا حدیث کی کسی کتاب میں مرقوم ہے؟
زندیق و ملحد لوگ بھی ایسا سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں مگر تفہیم ہے ایسے لوگوں پر جو اپنے آپ کو مسلمان گردانتے ہیں اور یہ سوال داغ دیتے ہیں کہ بخاری شریف کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے تو صحیح نہیں کہا، یا احادیث کی تصحیح و تضعیف اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ثابت کرو۔ ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن میں شرم و حیا کا مادہ ہاتی نہ ہو۔ اسلام نے جو علامات بتائی ہیں جن سے آدمی مسلمان ہوتا ہے، اس کا کوئی ذی شعور آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر علامت و پہچان کا لحاظ نہ کیا جائے تو کائنات کا نظام فاسد ہو جائے۔ اسلام، کفر و شرک، فسق و بدعت کا دار و مدار علامت پر رکھتا ہے۔ اسلام کی حفاظت کے لیے شرع نے کئی ایک قواعد و ضوابط دیے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِبِهَالَةٍ فَنُصِبُوا عَلَيْكُمْ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ﴾ [المحمرات: ۶]

”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو، بغیر تحقیق کے اس کی بات قبول نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ بغیر کسی تحقیق کے تم کسی پر بہتان باندھ دو یا عیب و الزام جڑ دو پھر تم اپنی جہالت کی بنا پر کیے ہوئے پر پچھتانے لگو۔“

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عادل آدمی کی خبر واحد قبول ہوگی۔ اگر ہم عادل کی خبر لینے سے توقف کریں تو گویا ہم نے اس کے اور فاسق کے درمیان برابری کر دی۔ اس طرح تخصیص فائدے سے خالی ہو جاتی ہے۔ فسق کا اصل معنی کسی چیز سے لگانا ہے۔ کھجور جب اپنے چمکے سے باہر نکل جاتی ہے تو کہا جاتا: ”فَسَقَتِ الرُّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا“ (کھجور اپنے چمکے سے نکل گئی) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

”چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اصحاب نے دلیل پکڑی ہے کہ خبر واحد حجت ہے اور فاسق کی شہادت غیر مقبول ہے۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا: ”فاسق کی خبر میں توقف کی یہ علت ہے کہ وہ فاسق ہے۔ اگر عادل کی خبر واحد بھی مقبول نہ کی جائے تو فاسق کی ترتیب پر اس کو بیان کرنے کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ مفہوم سے دلیل پکڑنے کے باب سے ہے۔“

یہ بات کئی ایک تفاسیر میں موجود ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ عادل کی خبر واحد حجت اور قابل قبول ہے اور مالک الملک کے مذکورہ بالا فرمان کو سامنے رکھیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مرتب کردہ صحیح بخاری کو دیکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں جن راویوں کی خبریں جمع کی ہیں وہ عدالت اور صدق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور جب سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک ائمہ محدثین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس کی صحت پر متفق ہوئے ہیں کیوں کہ اس کی روایات اصول قرآنی کے عین مطابق ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

ہر مضعف کے لائق ہے کہ وہ یقین کرے کہ صحیح والا راوی کسی راوی کی تخریج کرے تو اس کے نزدیک اس کی عدالت کا

مقتضی ہوتا ہے اور اس کا ضبط اور خافل نہ ہونا اس کے نزدیک صحیح ہوتا ہے، بالخصوص جب ساتھ یہ بات مل جائے کہ جمہور ائمہ دین نے ان دونوں کتابوں پر صحیحین کا لفظ بولا ہے اور یہ لفظ ان کتابوں کے علاوہ دیگر کو حاصل نہیں ہوا۔ [فتح الباری مقدمہ]

الغرض بخاری کے راوی عدالت و ضبط کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور ان کی بیان کردہ احادیث صحیح ہیں اور یہ صحت علمائے احناف کی اکثریت نے تسلیم کی ہے۔ دو چار جاہل و معاند اگر صحیح بخاری کے خلاف بات کریں تو ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ مولوی غلیل احمد سہارنپوری نے جو مقدمہ بخاری تالیف کیا اس میں صحیح بخاری کی صحت کا صاف اقرار موجود ہے۔

اگر کسی کے کچھ کہہ دینے ہی سے عیب لازم آجاتا ہے تو امام دارالہجرۃ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا ہے وہ کسی بھی اہل علم سے مخفی نہیں۔ اس کی تفصیل امام عبداللہ بن احمد ابن حنبل کی ”کتاب السنۃ“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اگر صرف کہہ دینے ہی کا اعتبار کیا جائے تو تمام احناف ردی اور نالائق تصور کیے جائیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کہنے والے بہت کچھ کہتے رہتے ہیں، اصل میں چیز کی حقیقت ملاحظہ کرنی چاہیے۔

صحیح بخاری کے اصح ہونے پر تو امت مسلمہ متفق ہو چکی ہے، اگر بخاری کے منکر ہیں تو تمام دہریہ قسم کے الحاد پسند اور ان کے تبعین، کیوں کہ صحیح بخاری بے دینوں اور طغیوں کا دائرہ کار تک کر دیتی ہے اور عمل کی راہ واضح کر دیتی ہے۔ بخاری کی صحت کا انکار ایسے ہی ہے جیسے کوئی مجنوں اپنا سر پتھر پر مار کر پتھر توڑنا چاہے۔ وہ اپنا سر تو پھوڑ لے گا لیکن پتھر کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بالکل اسی طرح بخاری کی صحت بہر حال رہے گی اور ایسے مجنوں حدیث کے منکر اور بے دین ہو جائیں گے۔ صحیح بخاری کی عظمت و شان اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی بنا دی ہے کہ منکر بھی اپنے مدارس میں پڑھانے پر مجبور ہیں۔ اتنی دہریہ کسی شخص کو سند فراغت نہیں ملتی جب تک وہ صحیح بخاری پڑھ نہیں لیتا۔ ہر مدرسہ میں دورہ حدیث کے اندر یہ کتاب شامل ہے اور کتنے ہی احناف ایسے ہیں جنہوں نے صحیح بخاری کو تمام ذخیرہ احادیث میں سے سب سے زیادہ صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی احادیث کو قطعی اور یقینی قرار دیا ہے۔

بہر کیف کتب احادیث کے بارے میں زبان درازی کرنے والے لوگ اہل اسلام میں سے نہیں ہیں، طغی و ذندیق ہیں اور ایسی باتیں پھیلا کر خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ (آمین)

کیا امام بخاری اور دیگر محدثین بھی مقلد تھے؟

سوال بعض لوگوں سے سنا ہے کہ امام بخاری اور دیگر محدثین بھی تقلید کرتے تھے، وہ خود مجتہد نہیں تھے، کیا یہ بات درست ہے؟ ہادلائل ذکر کریں۔

جواب امام بخاری اور دیگر اکابر محدثین حدیث و فقہ میں اپنے دور کے اساطین علم اور مجتہدین و فقہاء تھے۔ ان ائمہ محدثین کی امانت و دیانت اور فقہیت و اجتہاد معروف ہے اور ان کی مرتب کردہ کتب کو دیگر کتب سے ممتاز اور صحیح ترین قرار دیا گیا

ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے متعلق تو یہ جملہ زبان زد عام و خاص ہے: "أَصْحَحُ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللَّهِ الْبُخَارِيِّ" اللہ کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری کی بخاری شریف ہے اور بخاری کی فقہ و اجتہاد کے بارے بھی یہ جملہ عام ہے: "فَقُتِبَهُ الْبُخَارِيُّ فِي تَرَاجُمِهِ" امام بخاری کی فقہت ان کے تراجم ابواب میں ہے۔ امام بخاری کے مجتہد ہونے کی گواہی تو کہا۔ ائمہ محدثین نے دی ہے جو کتب رجال میں ان کے ترجمہ میں موجود ہے، ہم یہاں صرف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کا شمیری کا ایک قول ذکر کرتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:

"جان لو کہ امام بخاری بلا شک و شبہ مجتہد ہیں اور ان کے بارے جو یہ مشہور ہے کہ وہ شافعی ہیں تو اس کی وجہ مشہور مسائل میں ان کی طرف سے امام شافعی کی موافقت ہے مگر نہ امام ابوحنیفہ سے ان کی موافقت امام شافعی کے ساتھ موافقت میں کم نہیں۔" (فیض الباری: ۱/۵۸)

علامہ کا شمیری کے اس قول سے عیاں ہوتا ہے کہ امام بخاری بلا ریب مجتہد تھے اور مقلدین نے چند مسائل میں کسی امام کے ساتھ موافقت کی وجہ سے انہیں اس کا مقلد بنا دیا ہے۔ وہ قطعاً کسی امام کے مقلد نہ تھے اور نہ اس کی کوئی پختہ دلیل موجود ہے۔ امام بخاری جیسے امام الفہماء والمحدثین کو مقلد قرار دینا سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔ انہوں نے فقہ الحدیث پر کام کیا ہے، کسی مخصوص امام کے نظریات کو نہیں اپنایا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے جامع ہیں اور صحیح و سقیم کے پرکھنے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح احادیث کو مختلف فقہی ابواب کے تحت یکجا کیا ہے بلکہ ان کی جمع کردہ احادیث کے بارے علامہ کا شمیری نے لکھا ہے:

"صحیحین کی احادیث قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، شمس اللامۃ سرخسی، ابن تیمیہ اور ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہم کا یہی قول ہے اور گویہ تعداد کے لحاظ سے کم ہے مگر درست رائے یہی ہے۔" (فیض الباری: ۱/۴۵)

امام بخاری کی طرح امام ابو داؤد، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام حمیدی، امام ابن خزیمہ، امام ابن حبان، امام ابوعوانہ وغیرہم بھی حدیث و فقہ میں امام تھے اور انہوں نے کسی بھی امام و مجتہد کی تقلید نہیں کی۔ ان ائمہ حدیث نے اپنی اپنی کتب میں احادیث کو لا کر ان پر ابواب قائم کر کے بے شمار مسائل کا استنباط و استخراج کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ محدثین کے اصول و ضوابط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان ائمہ محدثین کے ہاں پہلے بزرگوں کی تقلید نہ تھی اور وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان مذاہب میں سے ہر مذہب کی بعض روایات و آثار متناقض و مخالف ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد و ضوابط کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، آثار صحابہ اور تابعین و مجتہدین کی پیروی کی۔ [الانصاف (ص ۲۶۱)، حجة الله البالغة (۱/۱۴۹)]

معلوم ہوا کہ محدثین کسی بھی امام کے مقلد نہ تھے اور نہ ان کی اندھا دھند پیروی کرتے تھے بلکہ جو قواعد و ضوابط انہوں نے روایات کے لیے وضع کیے وہ ان کے مطابق احادیث و آثار وغیرہ کی پیروی کرتے تھے اور اصل طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی خاص آدمی کی تقلید کے بغیر قرآن و حدیث کی پیروی کی جائے اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی بننے کی بجائے سچا مسلمان بن کر امت مسلمہ کو تفرقہ بندی میں تقسیم ہونے سے بچایا جائے، سب نسبتیں ترک کر کے صحیح اسلام کی راہ اپنائی جائے اور سلف صالحین

کے طریق کو لازم پکڑا جائے۔ جو لوگ تقلید کو لازم قرار دیتے ہیں وہ امت مسلمہ کو فرقہ بندی میں تقسیم کرنے کے درپے ہیں اور فرقہ بندی کے عذاب کو امت پر مسلط کر رہے ہیں۔ انہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور کتاب و سنت کی راہ پر خود بھی چلنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دینی چاہیے۔

کیا اختلاف امت رحمت ہے؟

(سوال) کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ امت کا اختلاف رحمت ہے؟ کتاب و سنت کی رو سے واضح کریں۔

(جواب) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”آپ کہہ دیں اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو مختلف گروہ بنا کر ایک کو دوسرے سے مزہ چکھادے۔ آپ دیکھیں کہ ہم کس طرح دلائل پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔“ (الانعام: ۶۵)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ امت کی گروہ بندی عذاب الہی ہے اور عذاب الہی رحمت کس طرح ہو سکتی ہے؟! امت میں کفر و اسلام، توحید و شرک، سنت و بدعت اور دیگر کئی قسم کے اختلافات موجود ہیں، انہیں رحمت سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اختلاف و افتراق سے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اور تم شرک کرنے والوں میں سے مت بنو جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ ہو گئے اور ہر گروہ اپنے طریق پر شاداں و فرحان ہے۔“ (الروم: ۳۱، ۳۲)

دوسری جگہ فرمایا: ”اور تم آپس میں جھگڑا و اختلاف نہ کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔“ (الانفال: ۴۶)

بعض لوگ کہتے ہیں آپس کے فردی اختلافات کی بنا پر حنفی و شافعی، حنبلی و مالکی، بنیاد رحمت ہے۔ یاد رہے یہ بات بھی کسی صورت درست نہیں، ان کا اگر مسائل اجتہاد یہ میں اختلاف ہے تو ان میں سے حق صرف ایک ہوگا جس کی بنیاد دلیل پر ہوگی، دوسرا خطا اور غلطی پر ہوگا اور خطا و غلطی کو رحمت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

امام ابن عبدالبرؒ نے اس موضوع پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے، فرماتے ہیں: ”اگر دونوں مختلف صورتیں درست ہوتیں تو سلف صالحین ایک دوسرے کے اجتہادی فیصلوں کے بارے خطا کا حکم نہ لگاتے اور عقل و فکر بھی اس بات کا انکار کرتی ہے کہ ایک چیز اور اس کی ضد دونوں صحیح و درست ہوں۔ (جامع بیان العلم: ۸۸/۲)

معلوم ہوا کہ مجتہدین نے ایک دوسرے کے مسائل پر خطا کا حکم لگایا تھا۔ اگر دوسرا بھی جائز و درست ہوتا تو اس پر خطا کا حکم کیوں لگاتے۔ ایک دفعہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کے درمیان اس بات پر اختلاف ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے یا نہیں۔ سیدنا ابی بن کعبؓ نے کہا: ”درست ہے۔“ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ”یہ اس وقت

درست ہے جب دیگر کپڑے نہ ہوں یہ اختلاف سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ غصے میں تشریف لائے اور فرمایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دواپسے صحابہ نے اختلاف کیا جن کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ان سے احکام لیے جاتے ہیں ابی (رضی اللہ عنہ) نے سچ کہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کمی نہیں کی، لیکن میں اس کے بعد اس مسئلہ میں یہاں جس کسی کو اختلاف کرتے ہوئے دیکھوں گا تو اسے سزا دوں گا۔“ (جامع بیان العلم : ۸۴/۲)

غور فرمائیں جب ان پاکباز ہستیوں کا اختلاف خلیفہ راشد نے پسند نہیں کیا تو آج کے دور کا وہ اختلاف جو کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اسے کیسے پسند کر لیا جائے اور رحمت قرار دے کر توحید و شرک اور سنت و بدعت کو اکٹھا گوارا کر لیا جائے، لہذا اختلاف و انتزاع سے کمال اجتناب کیا جائے۔ بعض لوگوں نے ایک روایت گھڑی کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے، یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے۔ جیسا کہ علامہ مناوی نے فیض القدير (۲۱۲/۱) میں ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے کیا خوب کہا ہے: ”اگر اختلاف رحمت ہے تو اتفاق یقیناً ناراضی کا سبب ہے۔“ (الاحکام : ۶۴/۵)

ہر امت کے لیے فتنہ والی حدیث کی تحقیق

سوال کیا یہ کوئی حدیث ہے کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے؟ اگر یہ کوئی حدیث ہے تو اس کی تخریج درکار ہے۔

جواب اللہ تعالیٰ نے ہر امت کی ابتلا و آزمائش کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی پیروی کرتی ہے یا ہوائے نفسانی کے پیچھے پڑتی ہے، اس دنیا میں اللہ نے جن امتوں سے انسان کو گزارنا ہے ان میں سے ایک مال بھی ہے۔ جو آدمی اپنے مال و متاع کو اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے حصول کے لیے فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے وہ قابل رشک ہے اور جو دنیاوی جاہ و جلال، کفر و شرک کی اشاعت، آلات طرب اور ذموم و سارگی کی خرید و فروخت، گندے ڈانچے، گانے بجانے کے آلات، فلمی سی ڈیز وغیرہ میں اپنا مال برباد کرتا ہے وہ دنیا و آخرت میں خائب و خاسر ہے، مال کو فتنہ تو خود اللہ العالمین نے قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ [انفال: ۲۸]

”جان لو تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں۔“

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس فرماتے کی تفسیر میں آیت ہیں کہ فتنہ سے مراد تمہارا اخبار و امتحان ہے۔ وہ تمہیں اموال و اولاد عطا کر کے دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اس پر اس کا شکر بجالاتے اور اطاعت کرتے ہو یا ان اموال کے ذریعے تم اس سے بے رغبت ہو جاتے اور منہ موڑ لیتے ہو۔ جیسے اللہ نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ [التغابن: ۱۵]

”تمہارے اموال و اولاد فتنہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔“

اور ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَ نَبَلُّوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الانبیاء: ۳۵]

”ہم امتحان کے لیے شر اور خیر کے ذریعے تمہاری امتلا کرتے ہیں۔“

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴾ [المنافقون: ۹]

”اے ایمان والو! تمہیں تمہارے اموال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ خسارہ پانے والے ہیں۔“

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مال و زر انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ مال کے ذریعے انسان کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے بلکہ اس دل پر حصول مال، حفاظت مال، ہوا و حرص اور اس کے بڑھنے کی فکر کے گھنے پردے پڑ جاتے ہیں اور دل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے اور جس آدمی کے اندر اس قسم کے امراض جگہ پکڑ لیں اس کے لیے مال و متاع کا اکٹھا کرنا درست نہیں، ایسے لوگوں کے متعلق اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

« لَا تَتَّعِدُوا الضَّيْعَةَ فَتَرَعْبُوا فِي الدُّنْيَا »

”صنعت و تجارت اور زراعت وغیرہ کو اختیار نہ کرو تم دنیا کی رغبت میں پڑ جاؤ گے۔“

[صحیح ابن حبان (۷۱۰)، مسند ابی یعلیٰ (۵۲۰۰)، مسند احمد (۴۲۶/۱)، تاریخ بغداد (۱/۱۸)، مسند حمیدی (۱۲۲)، ترمذی (۲۳۲۹)، مستدرک حاکم (۳۲۲/۴)، ابن ابی شیبہ (۲۴۱/۱۳) کتاب الزهد لأحمد ابن حنبل (ص ۲۹)، مسند طہالسی (۷۴/۲ - ۷۵)، اخبار اصہبان (۱۱۶/۲)]

صنعت و تجارت اور تجارت ایسے لوگوں کو کرنی چاہیے جو اس کی وجہ سے اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿ رِبْحًا لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ بِخَافُونَ يَوْمًا

تَتَّقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴾ [النور: ۳۷]

”اللہ کے گھر میں ایسے آدمی ہیں جنہیں تجارت اور کاروبار اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتے، وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں پلٹ جائیں گی۔“

بہر کیف مال و دولت ایک ایسی آزمائش ہے جس میں پڑ کر انسان فتنے کا شکار ہو جاتا ہے اور اطاعت الہی سے غافل ہو جاتا ہے آپ نے جس حدیث کے متعلق سوال کیا ہے وہ کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَإِنَّ فِتْنَةَ أُمَّتِي الْمَالُ»

”ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور یقیناً میری امت کا فتنہ مال ہے۔“

[ابن حبان (۹۱/۵ - ۹۲) (۳۲۱۲)، ترمذی، کتاب الزهد : باب ما جاء ان فتنه هذه الأمة في المال (۲۳۳۶)، تاریخ کبیر للبخاری (۲۲۲/۷)، طبرانی کبیر (۱۷۹/۱۹)، مسند الشہاب للقضاعی (۱۰۲۲)، مستدرک حاکم (۳۱۸/۴)، مسند احمد (۱۶۰/۴)، اسد الغابۃ (۴/۸۵)، الاستیعاب (۲۵۱/۹)، الاصابۃ (۳۰۲/۸ - ۳۰۳)

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح الاسناد قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، امام ابن عبدالبر نے فرمایا: ”ہو حدیث صحیح“ امام منذری نے ”الترغیب والترہیب ۴/۱۷۸“ میں ذکر کر کے فرمایا کہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے۔

ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) کا نکاح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے

سوال کیا ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) کا نکاح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے ہوا تھا؟

جواب سیدہ ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) جو سیدہ فاطمہ الزہراء بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی تھیں، بلاشبہ ان کا نکاح حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے ہوا اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف فریقین فکے محدثین و مؤرخین کو بغیر کسی تردد کے ہے اور ہر دو مکتب فکر کی معرکہ آرا کتب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ پہلے اہل سنت کے محدثین و مؤرخین کی تصریحات نقل کی جاتی ہیں پھر شیعہ محدثین و مؤرخین کے حوالہ جات درج کیے جائیں گے:

① « قَالَ تَعْلَبَةُ بْنُ أَبِي مَالِكٍ إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَسَمَ مَرُوطًا بَيْنَ نِسَاءٍ مِنْ نِسَاءِ الْمَدِينَةِ فَبَقِيَ مِرْطٌ جَيِّدٌ فَقَالَ لَهُ بَعْضُ مَنْ عِنْدَهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَعْطِ هَذَا بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِي عِنْدَكَ يُرِيدُونَ أُمَّ كَلْثُومَ بِنْتِ عَلِيٍّ فَقَالَ عُمَرُ أُمَّ سَلِيْطٍ أَحَقُّ وَأُمَّ سَلِيْطٍ مِنْ نِسَاءِ الْأَنْصَارِ مِمَّنْ بَايَعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمَرُ فَإِنَّهَا كَانَتْ تَزْفُرُ لَنَا الْقُرْبَ يَوْمَ أُحُدٍ » [بخاری، کتاب الجہاد: باب حمل النساء القرب الی الناس فی الغزو (۲۸۸۱)]

”عبلہ بن ابی مالک کہتے ہیں کہ سیدنا عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم کیں تو ایک عمدہ چادر بیچ گئی۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے کہا: ”اے امیر المؤمنین! یہ چادر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نواسی کو دیجیے۔“ یعنی ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) جو سیدنا عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کی بیوی تھیں۔ سیدنا عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ”ام سلیط زیادہ حق دار ہیں۔“ وہ انصاری عورت تھیں انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بیعت کی تھی۔ سیدنا عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ”ام سلیط جنگ احد کے دن

ہمارے لیے مکھیں لاد لاد کر لاتی تھیں۔“

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَدْ تَزَوَّجَ أُمَّ كَلثُومٍ بِنْتِ عَلِيٍّ وَ أُمُّهَا فَاطِمَةُ وَ لِهَذَا قَالُوا لَهَا بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ وَ كَانَتْ قَدْ وُلِدَتْ فِي حَيَاتِهِ وَ هِيَ أَصْغَرُ بَنَاتِ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلَامُ“ [فتح الباری (۷۹/۶)]

”سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں اور ان کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ تھیں۔ اس لیے لوگوں نے ان کو بنت رسول اللہ کہا۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پیدا ہوئی تھیں اور یہ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔“

امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تصریح سے واضح ہوا کہ سیدہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔

② ” وَ وُضِعَتْ حَنَازَةُ أُمِّ كَلثُومٍ بِنْتِ عَلِيٍّ امْرَأَةَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَ ابْنِ لَهَا يُقَالُ لَهُ زَيْدٌ وَ وُضِعَا حَمِيمًا وَ الْإِمَامُ يَوْمَئِذٍ سَعِيدٌ بِنُ الْعَاصِ“

”ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا جو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، ان کا اور ان کے بیٹے زید کا جنازہ اکٹھا رکھا گیا اور اس دن امام سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھے۔“

③ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

” وَ تَزَوَّجَ أُمَّ كَلثُومٍ بِنْتِ عَلِيٍّ بِنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَوَلَدَتْ لَهُ زَيْدًا لَمْ يُعْقَبْ وَ رُقِيَّةً“ [جمهرة أنساب العرب (۱۰۲، ۳۸)]

”ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں، ان سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ان سے ایک لڑکا زید اور ایک لڑکی رقیہ پیدا ہوئے۔“

④ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

” وَ تَزَوَّجَ أُمَّ كَلثُومٍ بِنْتِ عَلِيٍّ بِنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ وَ أُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَوَلَدَتْ لَهُ زَيْدًا وَ رُقِيَّةً“ [تاریخ الأمم والملوک (۵۶۴/۲)]

”ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا جن کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں، اس سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا۔ اس سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔“

امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات رقم کی ہے۔ [الاستیعاب علی هامش اصابة (۴/۴۹۰)]

ائمہ اہل سنت کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا سے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا اور

اس سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔ اب شیعہ ائمہ کی تصریحات ملاحظہ کریں۔

سب سے پہلے ہم شیعہ حضرات کی معتبر کتاب کافی کی عبارت پیش کرتے ہیں جو ان کے ہاں بخاری شریف کے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اور بعض شیعہ محدثین کی تصریح کے مطابق یہ وہ کتاب ہے جو محمد بن یعقوب کلینی "صاحب کافی" نے کتب کے بعد امام مہدی کے پاس فار میں پیش کی تو انہوں نے کہا: "یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔"

① شیخ کا مہذب الاسلام محمد بن یعقوب کلینی لکھتا ہے:

"عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي تَرْوِيجِ أُمِّ كَلْثُومٍ فَقَالَ إِنَّ ذَلِكَ فَرَجٌ غَضِبْنَاهُ" [فروع کافی، کتاب النکاح: باب تزویج ام کلثوم (۳۴۶/۵)]

"امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ سے ام کلثوم کے نکاح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے کہا: "یہ ایک رشتہ تھا جو ہم سے چھین لیا گیا۔"

② ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں:

"عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سِنَانٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ قَالَ سَأَلْتُهُ عَنِ الْمَرْأَةِ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا أَيْنَ تَعْتَدُ فِي بَيْتِهَا أَوْ حَيْثُ شَاءَتْ؟ ثُمَّ قَالَ إِنَّ عَلِيًّا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عُمَرُ أَنَّى أُمِّ كَلْثُومٍ فَأَخَذَ بِيَدِهَا فَأَنْطَلَقَ بِهَا إِلَى بَيْتِهِ" [فروع کافی، کتاب الطلاق: باب المتوفى عنها زوجها المدخول بها أين تعتد وما يجب عليها (۱۱۵/۶)]

"عبداللہ بن سنان امام صادق سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے مسئلہ دریافت کیا: "جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے وہ عدت کہاں گزارے؟ اپنے شوہر کے گھر رہے یا جہاں مناسب خیال کرے وہاں رہے؟" تو آپ نے جواب دیا: "جہاں چاہے عدت گزارے کیوں کہ جب عمر فوت ہوئے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے گھر لے گئے۔"

شیعوں کے شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی کتاب "تہذیب الاحکام" میں فردوس کافی سے ان دونوں روایتوں کو اسی طرح نقل کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کتاب شیعوں کے ہاں صحیح مسلم کے پائے کی ہے۔

③ اسی طرح ابو جعفر محمد بن حسن طوسی نے اپنی دوسری کتاب جو شیعوں کی صحاح اربعہ میں شمار ہوتی ہے، میں بھی اسی روایت کو درج کیا ہے:

"عَنْ جَعْفَرٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ مَاتَتْ أُمُّ كَلْثُومٍ بِنْتُ عَلِيٍّ وَ ابْنُهَا زَيْدٌ بِنُ عُمَرَ ابْنِ الْعَطَّابِ فِي سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ لَا يُدْرَى أَيُّهُمَا هَلَكَ قَبْلُ وَ لَمْ يُورَثْ أَحَدُهُمَا مِنَ الْآخَرِ وَ صَلَّى عَلَيْهِمَا جَمِيعًا" [تہذیب الاحکام، کتاب المعراث (۲۶۲/۹)]

"امام جعفر صادق اپنے والد محمد ہاتھی سے روایت کرتے ہیں کہ ام کلثوم بنت علی اور اس کا بیٹا زید بن عمر بن خطاب

دلوں ماں بیٹا ایک ہی وقت میں فوت ہوئے اور یہ علم نہ ہو سکا کہ دلوں میں سے پہلے کون فوت ہوا ہے اور ان دلوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا وارث نہ بن سکا اور ان دلوں کی نماز جنازہ بھی اکٹھی پڑھی گئی۔“

⑤ شیعہ فقہ کی معتبر کتاب شرائع الاسلام کی شرح ایک شیعہ عالم سالک نے لکھی ہے وہ صاحب شرائع کے اس قول ”مہجوز نکاح العربیة بالمعجمی والہاشمیة والعکس“ کے تحت لکھتا ہے:

”زَوْجٌ عَلَیْہِ اَبْنَتُهُ اُمَّ کَلْتُوْمٌ مِنْ عُمَرَ“

”عربی عورت کا عجمی مرد سے نکاح جائز ہے اور اسی طرح ہاشمیہ عورت کا غیر ہاشمی مرد سے اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا علیؑ نے اپنی بیٹی ام کلثومؑ کا نکاح عمر سے کیا تھا۔“

سیدہ عائشہؓ کے حوالے سے صحیح بخاری کی ایک روایت پر نظر

(سوال) ایک حدیث میں ہے کہ ام المومنین عائشہؓ سے غسل جنابت کا طریقہ پوچھا گیا تو انہوں نے پانی منگوا کر پردے کے پیچھے غسل کر کے بتایا۔ کچھ لوگ اس کو غلط رنگ دے رہے ہیں کہ آپؓ نے بغیر کپڑوں کے غسل کر کے دکھایا۔ اس حدیث کی مفصل وضاحت فرمائیں۔

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ کا دین قرآن و حدیث میں محصور ہے۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مقصود و مطلوب ہے کہ اللہ کے قرآن کو صحیح طور پر تسلیم کیا جائے اور رسول اللہؐ کی اطاعت کا معنی ہے کہ آپؐ کی حدیث و سنت کو تسلیم کیا جائے۔ آپؐ کے طریقہ کار کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ آپؐ کی سیرت اور اسوۂ کامل کو اپنی زندگیوں میں جگہ دی جائے۔ بعض لوگ قرآن حکیم کے نام پر آپؐ کی احادیث مبارکہ کو غلط رنگ دے کر قرآن و حدیث میں کھڑاؤ کے درپے ہیں اور بعض جعلی قواعد و ضوابط وضع کر کے کتب احادیث میں موجود احادیث رسول کو رد کرنے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو عربی علوم سے نابلد و ناواقف ہیں اور عربی کتاب کا ایک صفحہ بھی پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض نادان قرآن حکیم کے الفاظ بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ ہمارا کئی ایسے نادانوں سے سابقہ پڑا ہے جو بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو ہدف تنقید بناتے ہیں لیکن ان میں صحیحین کی ایک لائن پڑھنے کی بھی سکت و ہمت نہیں ہوتی بلکہ ایک دفعہ سوال میں پوچھی گئی حدیث پر معترض بن کر ایک آدی ہمارے پاس آیا اور کچھ سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ساتھ لایا۔ ہم نے صحیح بخاری اصل عربی والا نسخہ سامنے رکھ دیا اور کہا یہ حدیث صحیح بخاری سے نکالو، اللہ شاہد ہے وہ آدی حدیث نہ نکال سکا بلکہ ہمیں کہنے لگا آپ ہی نکال دیں۔ جب ہم نے اس کی مزموہ حدیث نکادی تو پھر اس سے کہا اس کا ترجمہ کرو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا اور ﴿فَبَہِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾ کا مصداق ہو کر واپس لوٹ گیا اور آج تک ملاقات کے لیے نہیں آیا۔ بہر کیف چند گمراہ اور گمراہ کرنے والے رسول اللہؐ کی احادیث صحیحہ کا مفہوم بگاڑ کر عوام کو متنفر اور گمراہ کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں ہدایت

نصیب کرے۔

ان پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی صادق آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتَّى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَالًا فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا» [ابن ماجہ ، کتاب السنۃ ، باب اجتناب الرأى والقیاس: ۵۲]

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم بندوں سے چھین کر قبض نہیں کرتا لیکن وہ علم کو علماء کے قبض کرنے کے ذریعہ قبض کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، وہ سوال کیے جائیں گے، تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں۔ گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔“

سوال میں جو حدیث درج کی گئی ہے، اس کے بارے میں بعض شریک عناصر مکررین حدیث اور معاندین بہت غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں اور حدیث کا مفہوم بگاڑ کر محدثین کرام رضی اللہ عنہم اور کتب احادیث کے بارے میں زبان درازی کرتے ہیں، سب سے پہلے صحیح بخاری سے اس حدیث کا متن درج کرتے ہیں پھر اس کی تفصیل عرض کریں گے۔
ابوبکر بن حفص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:

«سَمِعْتُ أَبَا سَلَمَةَ يَقُولُ دَخَلْتُ أَنَا وَ أَخُو عَائِشَةَ عَلَى عَائِشَةَ فَسَأَلَهَا أَحْوَهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ نَحْوًا مِنْ صَاعٍ فَاعْتَسَلَتْ وَأَفَاضَتْ عَلَى رَأْسِهَا وَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهَا حِجَابٌ» [بخاری، کتاب الغسل بالصاع ونحوه (۲۵۱)]

”میں نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہما سے سنا، انھوں نے کہا: ”میں اور عائشہ رضی اللہ عنہما کا بھائی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ ان کے بھائی نے ان سے نبی ﷺ کے غسل کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ایک صاع کی مقدار برتن منگوا یا پھر غسل کیا اور اپنے سر پر پانی بہا دیا اور ہمارے درمیان اور ان کے درمیان حجاب تھا۔“

اس حدیث کے بارے میں جو غلط فہمی پھیلائی گئی ہے اس کے لیے درج ذیل امور پر غور فرمائیں:

① دونوں سائل ان کے محرم رشتہ دار تھے، غیر محرم نہیں تھے۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما ان کے رضاعی بھانجے تھے، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان کی خالہ تھیں۔ اس لیے کہ ان کی بہن ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے انھیں دودھ پلایا تھا۔ [فتح الباری (۳۶۵/۱)، شرح مسلم للنووی (۴/۴)]

اور دوسرے بھی ان کے رضاعی بھائی تھے۔ صحیح بخاری میں تو «أَخُو عَائِشَةَ» ہے یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی اور صحیح مسلم

وغیرہ میں شعبہ کے طریق سے مروی حدیث میں ہے کہ «أَخُوهَا مِنَ الرِّضَاعَةِ» یعنی ”وہ ان کے رضاعی بھائی تھے۔“ [مسلم (۳۲۰)، نسائی (۲۲۸)، مسند ابی عوانہ (۸۴۹)] امام نووی رضی اللہ عنہ اور محدثین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ

رضاعی بھائی عبداللہ بن یزید ہیں۔

بہر کیف ان دونوں میں سے کوئی ایک ہو یا کوئی اور رضاعی بھائی ہو، اس سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، رضاعی رشتے بھی اسی طرح حرام ہیں جیسے نسبی رشتے حرام ہیں۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ» [مسلم، کتاب الرضاع: باب يحرم من الرضاعة ما يحرم من الولادة (۱۴۴)، بخاری، کتاب النکاح: باب وأمهاتكم اللتي أرضعنكم (۵۰۹۹)، موطا، کتاب الرضاع]

”جو رشتے ولادت سے حرام ہوتے ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں۔“
لہذا دونوں مسائل غیر محرم نہ تھے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کا مقصود غسل کے لیے پانی کی مقدار بتانا ہے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر باب منعقد کیا ہے: ”بَابُ الْغُسْلِ بِالصَّاعِ وَنَحْوِهِ“ یعنی ”صاع اور اس کے برابر پانی سے غسل کرنا۔“ اور مسلم شریف میں اس پر یوں باب باندھا گیا ہے: ”بَابُ الْقَدْرِ الْمُسْتَحَبِّ مِنَ الْمَاءِ فِي غُسْلِ الْجَنَابَةِ“
”غسل جنابت میں مستحب پانی کی مقدار کا بیان۔“

اور زیر بحث حدیث میں «غسل النبي ﷺ» سے مراد نہانے کی بجائے ”نہانے کا پانی“ بھی ہو سکتا ہے اور ان معانی میں یہ لفظ صحیح بخاری میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں میمونہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ہے:

«صَبَّيْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا» [بخاری، کتاب العلم: باب المضمضة والاستنشاق في الجنابة (۲۵۹)]

”میں نے نبی ﷺ کے لیے غسل کا پانی بہایا۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

«وَضَعْتُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلًا» [بخاری، کتاب الغسل، باب من أفرغ يمينه على شماله في الغسل (۲۶۶)]

”میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا۔“

اس بنیاد پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے نہانے کے لیے غسل کے پانی کے بارے میں سوال کیا کہ اس کی مقدار کتنی تھی۔ اس کے جواب میں عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک برتن منگوا یا جس میں ایک صاع کی مقدار کے برابر پانی تھا اور انھیں بتا دیا کہ اتنے پانی سے رسول اللہ ﷺ غسل کیا کرتے تھے۔ ان کی مراد رسول اللہ ﷺ کے غسل کی نمائش نہ تھی۔ غسل کی کیفیت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے زبانی بتائی تھی۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت میں ہے:

«قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ بَدَأَ بِيَمِينِهِ فَصَبَّ عَلَيْهَا مِنْ

الْمَاءِ فَعَسَلَهَا ثُمَّ صَبَّ الْمَاءَ عَلَى الْأَذَى الَّذِي بِهِ يَبْمِينِيهِ وَغَسَلَ عَنْهُ بِشِمَالِهِ حَتَّى إِذَا قَرَعَ

مِنْ ذَلِكَ صَبَّ عَلَى رَأْسِهِ» [مسلم، کتاب الحيض: باب القدر المستحب من الماء (۳۲۱)]

”عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ جب غسل فرمانے کا ارادہ کرتے تو دائیں ہاتھ سے شروع کرتے، اس پر پانی ڈالتے اور اسے دھوتے پھر دائیں ہاتھ سے گندگی والی جگہ پانی ڈالتے اور اسے بائیں ہاتھ سے دھوتے، جب اس سے فارغ ہوتے تو اپنے سر پر پانی اٹھیل دیتے۔“

اور سنن نسائی میں ہے کہ ابوسلمہ کہتے ہیں:

« وَصَفَتْ عَائِشَةُ غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْجَنَابَةِ » [نسائی، کتاب الطهارة: باب

إعادة الجنب غسل بديه به۔۔۔ (۲۴۷)]

”عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا غسل جنابت بیان فرمایا۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ساتلوں کی اصل غرض غسل کی کیفیت پوچھنا نہ تھی بلکہ غسل جنابت کے لیے پانی کی مقدار پوچھنا تھی۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے جب غسل جنابت کے لیے پانی کی مقدار کا بتایا کہ آپ ﷺ ایک صاع پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے تو ان دونوں محرم رشتہ داروں نے اس مقدار پر تعجب کیا اور کہا: ”اتنے کم پانی سے کیسے نہایا جاسکتا ہے؟“ پھر نبی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو سمجھایا کہ یہ بالکل ممکن ہے۔ وہ پردے کے پیچھے گئیں اور غسل کر کے آگئیں اور ثابت کر دیا کہ تقریباً ایک صاع کی مقدار سے غسل ہو سکتا ہے اور یہ تعجب کئی لوگوں کو پہلے بھی ہوا اور آج بھی لوگ کرتے ہیں کہ اتنے کم پانی سے غسل کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنْ جَنَابَةٍ صَبَّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ

حَفَنَاتٍ مِنْ مَاءٍ فَقَالَ لَهُ الْحَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ إِنَّ شَعْرِي كَثِيرٌ قَالَ جَابِرٌ فَقُلْتُ لَهُ يَا ابْنَ أَخِي!

كَانَ شَعْرُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْثَرَ مِنْ شَعْرِكَ وَأَطْيَبَ » [مسلم، کتاب الحيض:

باب استحباب إفاضة الماء (۳۲۹)]

”رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تھے تو اپنے سر پر تین لپیں ڈالتے تھے۔“ حسن بن محمد نے انھیں کہا: ”بلاشبہ

میرے بال زیادہ ہیں۔“ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے اسے کہا: ”اے جھنجھو! رسول اللہ ﷺ کے بال تیرے بالوں سے زیادہ

اور صاف تھہرے تھے۔“

اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ تھوڑے پانی کے استعمال پر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا لیکن اللہ کے رسول ﷺ ایسے مقامات پر بھی اسراف نہیں کرتے تھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی غسل کے پانی کی مقدار ایک صاع بتائی اور ان کے متعجب ہونے پر پردے کے پیچھے جا کر غسل کر کے آئیں اور انھیں سمجھا دیا کہ ایک صاع پانی سے غسل کرنا صحیح اور درست ہے

اور عملاً ممکن بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث میں «بَيْنَنَا وَ بَيْنَهَا حِجَابٌ» کے الفاظ ہیں کہ ہمارے اور ان کے درمیان حجاب تھا، اس سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ انھوں نے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو غسل کرتے دیکھا۔ اگر ان کو دکھانا ہوتا تو حجاب و پردے میں جانے کا کوئی مطلب نہیں رہتا اور ہمارے علم میں کوئی ایسی صحیح حدیث موجود نہیں جس میں یہ ہو کہ انھوں نے ام المومنین کو غسل کرتے دیکھا۔ جو لوگ یہ مفہوم نکالتے ہیں ان کے پاس اس کے پیچھے کوئی پختہ دلیل موجود نہیں۔ اگر حجاب کرنے کے بعد بھی نظر آتا ہو تو اس آیت پر غور فرمائیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾ [الاحزاب: ۵۳]

”جب تم ان سے کسی متاع کا سوال کرو تو حجاب کے پیچھے رہ کر سوال کرو۔“

آپ غور فرمائیں اگر حجاب کرنے کے بعد بھی خاتون نظر آئے تو اس حجاب کا کیا فائدہ؟ پھر حجاب کے بغیر ہی سوال کی اجازت دے دی جاتی اور حدیث میں بھی لفظ حجاب ایسے لوگوں کے ابطال کے لیے نمایاں اور واضح ہے اور ان کی خود تراشیدہ باتوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ بہر کیف شریک مکررین حدیث بلکہ اصلاً مکررین قرآن اور گمراہ کرنے والے لوگوں کا استدلال اور طریقہ کار انتہائی غلط ہے اور مسلمان آدمی کے لیے روا نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی احادیث کا مذاق اڑائے۔ بلکہ ایسے لوگ صحیح احادیث کے استہزاء کی بنا پر مسلمان نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ (آمین!)

عورت کی آواز سننا

سوال کیا عورت کی آواز سننا حرام ہے؟

جواب عورت کی آواز کا پردہ نہیں ہے۔ عورت شری حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مردوں سے بات کر سکتی ہے۔ اس کی آواز شیریں اور لوجھدار نہیں ہونی چاہیے بلکہ سنجیدگی اور معقول حد تک بلند ہوتا کہ مخاطب اگر دل میں کسی قسم کا روگ رکھتا ہو تو وہ کسی قسم کے غلط خیالات اور تصورات دل میں نہ جما سکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کئی ایک مسائل ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جا کر پوچھتے تھے اور آپ حجاب و پردے کے پیچھے ان کے مسائل سن کر جوابات دیا کرتی تھیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنَّ اتَّقِيْتُنَّ فَلَا تَحْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي

قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾ [الاحزاب: ۳۲]

”اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو نرم گفتگو نہ کرو تا کہ جس آدمی کے دل میں روگ ہے وہ کسی قسم کا طمع نہ رکھے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اگرچہ خطاب ازواج مطہرات سے کیا ہے لیکن یہ حکم عام ہے اور ہر عورت کو

شامل ہے کہ وہ اجنبی مردوں سے گفتگو کرتے وقت نرم اور لودچار طریقہ سے بات نہ کریں بلکہ اچھے طریقے سے بات کریں اور ﴿قُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ کہہ کر اللہ تبارک و تعالیٰ نے معروف اور عمدہ طریقے سے گفتگو کی اجازت دی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں اس کا مفہوم یہ لکھا ہے:

”عورت اجنبی مردوں سے ایسے کلام سے مخاطب ہو جس میں نرمی نہ ہو یعنی عورت اجنبی مردوں سے اس طرح بات نہ کرے جیسے اپنے شوہر سے کرتی ہے۔“

اس آیت کریمہ سے واضح ہو گیا کہ عورت کی آواز جو شرعی حدود کے دائرے میں مردن سکتا ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ سلف صالحین کے منہج سے بھی اس بات پر روشنی پڑتی ہے کیوں کہ بڑے بڑے محدثین نے کئی ایک احادیث کی کتب خواتین محدثات سے پڑھی ہیں۔ امام مزی کے اساتذہ میں زینب رضی اللہ عنہا اور کریمہ بنت احمد المرزوبیہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری کا درس کئی ایک محدثین نے لیا۔ اگر کتب رجال کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے آخر میں کتاب النساء میں بے شمار صحابیات و تابعیات وغیرہا کا ذکر خیر ملتا ہے جن سے مرد حدیث روایت کرتے ہیں۔ لہذا یہ بات صحیح و درست ہے کہ شرعی دائرہ کار میں رہتے ہوئے مرد حضرات خواتین سے مسائل سن سکتے ہیں، اس پر شرعاً کوئی حرج نہیں ہے اور عورت بھی مسائل بیان کرتے ہوئے سنجیدگی کو لازم رکھے۔

حضرت علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں؟

(سوال) کیا حضرت علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں؟

(جواب) حضرت علیہ السلام بندے تھے اور کئی ایک محدثین نے با دلائل ثابت کیا ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ امام قرطبی نے کہا: ”وہ جمہور کے نزدیک نبی تھے۔ اس بات کی شہادت قرآنی آیات دیتی ہیں، اس لیے بھی کہ نبی اپنے سے کم مقام والے سے علم نہیں سیکھتا اور باطن کے حکم پر انبیاء ہی کو اطلاع دی جاتی ہے اور ان کے آب بقا پینے والی کہانی بلا دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے لیے بھی بیعتگی نہیں رکھی ہر ایک نے موت کا جام پینا ہے اور حضرت علیہ السلام کی موت پر امام بخاری، ابراہیم الحاربی، ابو جعفر ابن السنادی، ابو یعلیٰ بن الفراء، ابو طاہر العبادی اور ابو بکر ابن العربی رضی اللہ عنہم وغیرہم محدثین نے قطعی حکم صادر کیا ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جو آپ نے آخری ایام میں فرمایا: ”ایک صدی بعد سطح زمین پر جو لوگ آج موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔“

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ نے جو بھی نبی بھیجا اس سے بیٹھا لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تو وہ ان پر ضرور ایمان لائے اور ان کی ضرور مدد کرے اور کسی بھی صحیح خبر میں موجود نہیں کہ حضرت علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے ہوں اور نہ یہ ہی ثابت ہے کہ انھوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا ہو اور آپ نے بدر والے دن فرمایا: ”اے اللہ! اگر یہ گروہ ہلاک کر دیا گیا تو تیری زمین میں عبادت نہیں کی جائے گی۔“ اگر حضرت علیہ السلام موجود

ہوتے تو یہ نفی صحیح نہ ہوئی۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری (۶/۴۳۴)]

لہذا حضرت عائشہؓ فوت ہو چکے ہیں، یہی بات دلائل کی رو سے قوی اور مضبوط ہے۔ اس سلسلے میں کئی شعروں اور حکایتوں میں حضرت کی تاقیامت زندگی اور عمر حضرت کی جو باتیں کی جاتی ہیں وہ سراسر غیر شرعی ہیں۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے کے متعلق حدیث

(سوال) کیا یہ حدیث صحیح ہے: ”جو آدمی کسی یتیم کے سر پر اللہ کی رضا کے لیے ہاتھ رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آتے ہیں اللہ ہر بال کے بدلے ایک نیکی عطا کرتا ہے؟“

(جواب) یتیم بچوں کے سر پر دست شفقت رکھنا اجر کا باعث ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کی طرف شقاوت قلبی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔“ (مسند احمد: ۲/۲۶۳۔ فتح الباری: ۱۱/۱۵۱)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے۔ البتہ مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ روایت ابو امامہؓ سے احمد، طبرانی، حلیۃ الاولیاء اور شرح السنۃ میں موجود ہے لیکن اس کی سند میں علی بن یزید الہبانی منکر الحدیث ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری (۱۱/۱۵۱) میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب!)

خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے

(سوال) کیا خواتین کے لیے بھی سونے کا زیور ممنوع ہے؟

(جواب) خواتین کے لیے سونے کا زیور پہننا جائز ہے خواہ وہ گولائی والا ہو یا نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَوْ مَنْ يَنْشَوْنَهَا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرَ مُبِينٍ﴾ [الزخرف: ۱۸]

”کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات کی وضاحت نہ کر سکے۔“

اس آیت کریمہ میں عورت کی پرورش زیور میں بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے زیورات پہننے کی تردید نہیں کی اور اس قول میں عموم ہے۔ زیور گولائی والا ہو یا کسی اور طرز پر تیار کیا گیا ہو۔

امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”عورت ناقص ہے، اس کا نقص بچپن ہی سے زیور پہننا پر پورا کیا جاتا ہے۔“ [تفسیر ابن کثیر (۵/۵۱۹) بتحقیق

عبد الرزاق مہدی]

امام مجاہدؒ فرماتے ہیں:

”رُحِصَ لِلنِّسَاءِ فِي الذَّهَبِ وَالْحَرِيرِ“

”عورت کو سونے اور ریشم کی اجازت دی گئی ہے۔“

اور پھر انھوں نے یہی آیت تلاوت کی۔ اَلکِیَا اَلہِ رَاسِیَ فَرَمَاتے ہیں:

”فِیْہِ ذَلَالَةٌ عَلٰی اِبَاحَةِ الْحُلٰی لِلنِّسَاءِ وَ الْاِحْمَاعُ مُنْعَقِدٌ عَلَیْہِ وَ الْاِخْبَارُ فِیْہِ لَا تُحْصٰی“

[تفسیر قرطبی (۴۸/۱۶)، مختصر قرطبی (۵۲/۴)، تفسیر القرآن للکِیَا اَلہِ رَاسِیَ (۳۹۱/۴)]

”اس آیت میں عورتوں کے لیے زیور مباح ہونے کی دلیل ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے اور اس بارے میں احادیث شمار نہیں کی جاسکتیں۔“

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« حُرْمَ لِبَاسِ الْحَرِیْرِ وَ الذَّهَبِ عَلٰی ذُكُورِ اُمَّتِیْ وَ اُجَلِّ لِاَنَاثَتِہِمَّ » [ترمذی، کتاب اللباس: باب

ما جاء فی الحریر و الذهب (۱۷۲۰)، مسند احمد (۳۹۲/۴)، شرح معانی الآثار (۲۵۱/۴)، نسائی،

کتاب الزینة: باب تحريم الذهب علی الرجال (۵۱۴۸)، عبد بن حمید (ص ۱۹۳/۱)، ابن ابی شیبہ

(۸۳۲/۸)، مسند طیالسی (۵۰۶)]

”ریشم کا لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔“

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« الْحَرِیْرِ وَ الذَّهَبِ حَرَامٌ عَلٰی ذُكُورِ اُمَّتِیْ وَ حِلٌّ لِاَنَاثَتِہِمَّ » [تحفة الأخیار بترتیب شرح مشکل

الآثار (۴۱۹۸) (۲۵۰/۶)]

”ریشم اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام ہے اور ان کی عورتوں کے لیے حلال ہے۔“

عبد اللہ بن زبیر الغافقی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

« قَالَ سَمِعْتُ عَلِیًّا یَقُولُ اَحَدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ ذَهَبًا بَیْمِیْنِہِ وَ حَرِیْرًا بِشِمَالِہِ

ثُمَّ رَفَعَ بَیْہِمَا یَدَیْہِ فَقَالَ هَذَا حَرَامٌ عَلٰی ذُكُورِ اُمَّتِیْ » [مسند احمد (۱۴۶/۲)، عبد بن حمید

(۸۰)، مسند ابی یعلیٰ (۲۷۲)، بیہقی (۴۲۵/۲)، ابن ابی شیبہ (۳۵۱/۸)، ابن ماجہ (۳۵۹۵)، مسند

بزار (۸۸۶)، ابن حبان (۵۴۳۴)]

”میں نے علی رضی اللہ عنہ سے سنا انھوں نے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ میں سونا اور بائیں میں ریشم پکڑا پھر

دونوں ہاتھوں کو ان کے ساتھ بلند کیا اور فرمایا: ”یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔“

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

« اَنَّ اَمْرَاتِیْنِ اَتَتْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ وَ فِیْ اَیْدِیْہِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ

لَہِمَا اَتُوْذِیَانَ زَكَاتَہُ قَالَتَا لَا قَالَ فَقَالَ لَہِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اَتَحِبَّانِ اَنْ

یُسُوْرَکُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَیْنِ مِنْ نَارٍ قَالَتَا لَا قَالَ فَادِّیَا زَكَاتَہُ » [ترمذی، کتاب الزکوٰۃ: باب ماجاء

فی زکوٰۃ الحلی (۶۳۷) ، ابو داؤد (۱۵۶۳) ، بیہقی (۱۴۰/۴) ، شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو حید قرار دیا ہے۔ [إرواء الغلیل (۲۹۲/۳)] امام ابن قطن نے اسے صحیح کہا ہے۔ [نصب الرایۃ (۳۷۰/۲)]

”بے شک دو عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے نگلن تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا: ”کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم دونوں پسند کرتی ہو کہ اللہ تمہیں ان کے بدلے میں آگ کے نگلن پہنا دے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر ان کی زکوٰۃ دو۔“

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

« دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَى فِي يَدَيَّ فَتَحَاتٍ مِنْ وَرِيٍّ فَقَالَ مَا هَذَا يَا عَائِشَةُ؟ فَقُلْتُ صَنَعْتُهُنَّ أَتَزِينُ لَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَتَوَدِّينَ زَكَاتَهُنَّ قُلْتُ لَا لَوْ مَشَاءَ اللَّهُ قَالَ هُوَ حَسْبُكَ مِنَ النَّارِ » [ابو داؤد، کتاب الزکاة: باب الكنز ما هو و زکاة الحلی (۱۵۶۵)، حاکم (۳۸۹/۱)، بیہقی (۱۳۹/۴) امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے شیخین کی شرط پر صحیح کہا اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موافقت کی ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ حدیث اسی طرح ہے جیسے حاکم و ذہبی نے کہا ہے۔ [إرواء الغلیل (۲۹۷/۳)]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ میں چاندی کی چوڑیاں دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ”اے عائشہ! یہ کیا ہے؟“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے انھیں تیار کیا ہے تاکہ آپ کے لیے رحمت اختیار کروں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ میں نے کہا: ”نہیں یا کہا جو اللہ نے چاہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ آگ سے تجھے کافی ہیں۔“

ان صحیح احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت سونے و چاندی کا زیور پہن سکتی ہے اور اس کے ذمے ان زیورات کی زکوٰۃ ہے۔ اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو اس کی سزا جہنم کی آگ ہوگی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”یہ احادیث اور دیگر جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں، عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کی اہاحت پر دلالت کرتی ہیں اور خاص طور پر جن روایات میں عورتوں کے لیے سونے کی حرمت کا ذکر ہے ان اخبار کے منسوخ ہونے پر ہم نے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیورات حلال ہیں۔“ [بیہقی (۱۴۲/۴)]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”عورتوں کے لیے ریشم پہننا اور سونے اور چاندی کے زیورات پہننا صحیح احادیث کی رو سے اجماع کے ساتھ جائز ہے۔“ [المجموع (۴۴۲/۴)]

نیز فرماتے ہیں: ”مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ عورتوں کے لیے سونے اور چاندی کا ہر طرح کا زیور جائز ہے جیسے طوق، ہار، انگوٹھی، ننگن، پینچیاہ، گلوبند اور ہر وہ چیز جو گلے وغیرہ میں پہنی جاتی ہے اور ہر وہ چیز جسے پہننے کی وہ عادی ہوں، اس سے کسی چیز میں اختلاف نہیں۔“ [المجموع (۶/۴۰)]

صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس میں مردوں کو سات چیزوں سے منع کیا گیا ہے، اس کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”جب یہ بات مقرر ہو چکی تو یہ ممانعت جو سونے کی انگوٹھی پہننے کے متعلق آئی ہے، مردوں کے ساتھ خاص ہے، عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں اور عورتوں کے لیے اس کے حلال ہونے پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔“ [فتح الباری (۱۰/۳۱۷)]

پھر اس کے بعد ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ابن ابی شیبہ سے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث لائے ہیں کہ نجاشی نے سونے کی انگوٹھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ بھیجی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ انگوٹھی اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو پہنا دی۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ صاحب رسالہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”عورتوں کے لیے سونے کے زیورات کے مباح ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اتنی زیادہ روایات مروی ہیں کہ ممانعت والی روایات سے زیادہ ظاہر اور مشہور ہیں اور اسی طرح آیت کی دلالت بھی عورتوں کے لیے زیورات کے مباح ہونے پر واضح ہے اور عورتوں کا زیورات پہننا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہمارے اس دن تک بغیر کسی تکبیر کے مستفیض و مشہور ہو چکا ہے۔“ [احکام القرآن (۳/۳۸۸)]

لہذا عورتوں کے لیے سونے کے زیورات پہننا بالکل واضح اور ظاہر ہے، رہی وہ روایت جس میں مذکور ہے کہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو عورت سونے کا ہار پہنے گی قیامت والے دن اس کی گردن میں اس کی مانند آگ کا ہار پہنایا جائے گا اور جو عورت سونے کی بالیاں پہنے گی قیامت والے دن اس کے کان میں اس کی مانند آگ کی بالیاں پہنائی جائیں گی۔“

[ابوداؤد، کتاب المخاتم: باب ما جاء فی الذهب للنساء (۴۲۳۸)، نسائی (۸/۱۵۷)، مسند احمد (۶/۴۶۰)]

اس کی سند میں محمود بن عمرو ہے جسے ابن حبان کے سوا کسی نے ثقہ قرار نہیں دیا اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کا راویوں کی توثیق کے بارے میں قاعدہ معروف ہے کہ ہر وہ راوی جس پر کسی نے جرح نہ کی ہو اسے وہ کتاب الثقات میں درج کر دیتے ہیں۔

محمود بن عمرو بن یزید بن اسکن کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقبول ہے یعنی متابعت کے وقت جب کہ دکتور بشار عواد اس پر تعلق و تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بلکہ یہ مجہول الحال ہے، اس سے صرف دو راویوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اکیلے نے صرف اسے کتاب الثقات میں درج کیا ہے، اس لیے ابن قطان نے اسے مجہول کہا ہے اور ذہبی نے کہا ہے: ”اس میں جہالت ہے۔“ امام ذہبی کے کلام کے لیے دیکھیں۔ [میزان الاعتدال (۴/۷۸)، المغنی فی الضعفاء (۲/۳۹۲)، الکاشف (۲/۲۴۶)] اسے امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف کہا ہے۔ [المحلی (۱۰/۸۳) (۱۹۱۹)]

امام ابن قنن الغاسی اسماء بنت یزید والی زیر بحث روایت کے تحت لکھتے ہیں:

”اس روایت کی علت یہ ہے کہ محمود بن عمرو مجہول الحال ہے اگرچہ اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔“ [بیان الوهم والابہام (۵۹۰/۳)]

یہ روایت چونکہ ضعیف ہے اس لیے صحیح احادیث اور قرآنی دلالت کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ واللہ اعلم۔ پس اس تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ عورتوں کے لیے سونے اور چاندی وغیرہ کے زیورات پہننا مباح اور جائز ہے، البتہ خواتین پر لازم ہے کہ وہ زیورات کی زکوٰۃ ادا کیا کریں۔ جن زیورات کی زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے وہ کنز و خزانہ شمار نہیں ہوتے اور پہننے والی خاتون کے لیے جہنم میں جانے کا باعث نہیں بنتے۔

نفاق سے براءت

(سوال) کیا مسجد نبوی میں چالیس نمازوں کی ادائیگی سے نفاق سے براءت ہوتی ہے؟

(جواب) یہ روایت سند کے ساتھ حسب ذیل ہے:

« حَدَّثَنَا عُقْبَةُ بْنُ مُكْرَمٍ وَ نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ الْجَهْضَمِيُّ قَالَا حَدَّثَنَا أَبُو قَتَيْبَةَ سَلَّمَ بَنْ قُتَيْبَةَ عَنْ طُعْمَةَ بْنِ عَمْرٍو ، عَنْ حَبِيبِ بْنِ أَبِي ثَابِتٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى لِلَّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا فِي جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيرَةَ الْأُولَى كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَتَانِ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَ بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ » [ترمذی، ابواب الصلاة: باب ماجاء فی فضل التكبيرة الأولى (۲۴۱)]

”انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ”جس نے اللہ کے لیے چالیس دن جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور وہ تکبیر اولیٰ کو پالیتا ہے تو اس کے لیے دو خلاصیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ ایک خلاصی آگ سے اور دوسری نفاق سے۔“

یہ روایت انس رضی اللہ عنہ سے مختلف طرق کے ساتھ مروی ہے۔ ایک طریق حبیب بن ابی ثابت عن انس رضی اللہ عنہ سے اور حبیب سے یہ روایت طعمہ بن عمرو نے بیان کی ہے۔ [الکامل لابن عدی (۲/۸۱۰)، ذخیرۃ الحفاظ (۴/۲۱۸۹)، شعب الایمان للبیہقی (۶/۱۶۱)، العلل المتناہیة (۱/۴۳۵)]

اور اسی طرح خالد بن طہمان ابو العلاء الخفاف نے بھی حبیب سے یہ روایت بیان کی ہے۔

پھر اس روایت کو موقوف و مرفوع دونوں طرح بیان کیا گیا ہے۔ جب موقوف و مرفوع میں جھگڑا ہو تو روایت مرفوع سمجھی جاتی ہے، اگر موقوف مان لیں تو پھر بھی حکماً مرفوع ہوگی کیوں کہ اس میں رائے و قیاس کو دخل نہیں۔ یہی روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے عمارہ بن غزیہ نے بھی بیان کی ہے جیسا کہ ابن ماجہ (۷۹۸) اور شعب الایمان للبیہقی (۶/۱۲۳) میں ہے۔

لیکن یہ سند ضعیف ہے، اس میں انقطاع ہے۔ عمارہ بن غزیہ کی ملاقات انس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے اور اسماعیل بن عباس حمص و شامی کی روایت غیر شامیوں سے ضعیف ہوتی ہے اور اس روایت میں اس کے استاذ عمارہ بن غزیہ شامی نہیں بلکہ مدنی ہیں۔ الغرض اس کی کئی اسناد ہیں اور سب سے بہتر اوپر ذکر کردہ سند ہے جس کی بنیاد پر یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ جس روایت میں مسجد نبوی کا ذکر ہے وہ مسند احمد (۴۰۲۰، ۱۲۵۸۳)، طبرانی اوسط (۲۱۱/۶) اور مجمع المحرمین (۲۸۰/۳) میں موجود ہے۔

مگر اس کی سند میں عہیط بن عمر مجہول راوی ہے اور عبدالرحمن بن ابی الرجال اس سے بیان کرنے میں منفرد ہے۔ لہذا چالیس روز تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرنے والے کے ہارے میں یہ فضیلت ہے کہ اسے دوزخ کی آگ اور منافقت سے بری کر دیا جاتا ہے۔ مسجد نبوی کے حوالے سے اس کی سند درست نہیں۔

شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت

(سوال) کیا شعبان کی ۱۵ ویں رات جسے شب برأت کا نام دیا جاتا ہے اس کی فضیلت میں کوئی صحیح روایت موجود ہے؟ بعض لوگ سورہ دخان کی ابتدائی آیات شب برأت کے ہارے میں بتاتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

(جواب) اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورہ دخان کی ابتدا میں جو فرمایا ہے:

”بے شک ہم نے اس قرآن کو برکت والی رات میں نازل کیا کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں، یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔“ [الدخان: ۴، ۳]

اس آیت میں ”لیلۃ مبارکۃ“ سے مراد ”لیلۃ القدر“ ہے جس کی تفسیر خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کر دی ہے، ارشاد ہاری تعالیٰ ہے:

”بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو قدر والی رات میں نازل کیا۔“ [القدر: ۱]

سورہ دخان میں جس رات کو مبارک قرار دیا ہے اسے ہی سورہ القدر میں لیلۃ القدر فرمایا ہے۔ رمضان المبارک کے ہارے میں ارشاد ہاری ہے:

”رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“ [البقرہ: ۱۸۵]

قرآنی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا نزول رمضان کے مہینا میں ہوا اور اس ماہ مبارک کی پابریکت اور قدر والی رات میں جن لوگوں نے ”لیلۃ مبارکۃ“ کو شعبان کی نصف رات قرار دیا ہے ان کی بات درست نہیں۔ ملاحظہ ہو (تفسیر ابن کثیر) (سورہ الدخان: ۳) رہا اس رات کی تخصیص کے ہارے میں روایات کا وارد ہونا تو یاد رہے کہ اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔

امام عقیلی فرماتے ہیں: ”نصف شعبان کی رات اللہ تعالیٰ کے نزول کے ہارے میں جتنی روایات مروی ہیں سب ضعیف ہیں۔“

[الضعفاء: ۲۹/۳] اور یہی بات حافظ ابوالخطاب ابن دجیہ نے کہی ہے۔ [الباعث علی انکار البدع والحوادث: (ص ۵۲/)] البتہ عمومی طور پر ہر رات آسمان دنیا پر نزول باری تعالیٰ کے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں۔ شعبان کی تخصیص کے ساتھ نہیں۔ ”البدع والنہی عنہا“ میں لکھا ہے کہ میں نے مشائخ اور فقہاء میں سے کسی کو بھی نصف شعبان کی رات کی طرف التفات کرتے ہوئے نہیں پایا اور کھول کی روایت ذکر کرتے ہوئے بھی کسی کو نہیں پایا اور دیگر راتوں کے علاوہ اس کی فضیلت کا بھی قائل کوئی نہیں۔ اسی طرح البدع والنہی عنہا (ص ۱۱۳/۱) میں صحیح سند کے ساتھ ابی ملیکہ النمیری سے نقل کیا گیا ہے:

”انہیں کہا گیا قاضی زیاد النمیری کہتا ہے: ”نصف شعبان کی رات کا اجر شب قدر کے اجر کی طرح ہے“ تو فرمانے لگے: ”اگر یہ بات میں اس سے سن لیتا اور میرے ہاتھ میں لائچی ہوتی تو اس سے اس کی پٹائی کر دیتا۔“ ابن رجب فرماتے ہیں:

”اکثر علمائے حجاز نے اس کا انکار کیا ہے جن میں سے عطاء بن ابی رباح اور ابن ابی ملیکہ ہیں۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے فقہائے مدینہ سے یہ بات نقل کی ہے اور اصحاب مالک وغیرہ کا یہی قول ہے۔ انہوں نے کہا کہ ”ذَلِكَ كُلُّهُ بَدْعَةٌ“ کہیہ سارا عمل بدعت ہے۔“

مذکورہ توضیح سے معلوم ہوا کہ سلف صالحین ائمہ حجاز کے ہاں شب برأت کا کوئی تصور نہ تھا، اصل میں قدر و برکت والی رات لیلۃ القدر ہے جس میں قرآن حکیم کا نزول ہوا اور شب قدر کو خود رسول اللہ ﷺ بیدار ہوتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ شعبان کے مہینا میں ۱۵ ویں رات کی خاص فضیلت کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق جتنی روایات مروی ہیں ان میں بعض موضوع و من گھڑت قصے ہیں اور بعض ضعیف اور ناقابل احتجاج ہیں۔

شعبان کی نصف رات کے اعمال کی حیثیت

سوال شعبان کی نصف رات کو بعض لوگ صلاة البراءة یا صلاة الالفیة ادا کرتے ہیں، بعض ۱۰۰ رکعات نماز اور ہر رکعت میں ۱۰ بار سورۃ اخلاص پڑھتے ہیں، اس طرح ایک ہزار مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھی جاتی ہے۔ کیا ایسا عمل کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

جواب صلاة البراءة یا صلاة الالفیة بدعت ہے، اس کا ثبوت کسی بھی صحیح روایت میں موجود نہیں۔ علامہ طاہر بن ہندی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

”شعبان کی نصف رات کو جو نماز الفیہ ادا کی جاتی ہے یہ بدعات میں سے ہے، جس میں سو رکعات میں سے ہر رکعت میں ۱۰ بار ”قل ہو اللہ“ پڑھی جاتی ہے اور لوگوں نے عیدوں سے زیادہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے متعلق اخبار و آثار ضعیف یا موضوع ہیں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں جو اس کا ذکر کیا ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے اور

نہ تفسیر شععی سے دھوکا کھایا جائے کہ شب قدر لیلیۃ القدر ہے۔ اس نماز کی وجہ سے عوام الناس ایک عظیم فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ اس کے سبب وہ چراغاں کثرت سے کرتے ہیں اور اس پر فسق و فجور اور عفت و عصمت دری کا ترتب رہتا ہے، جس کا ذکر ناقابل بیان ہے۔ یہ نماز سب سے پہلے بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں ایجاد کی گئی ہے۔“
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الموضوعات (ص ۴۵، ۴۶) لہذا ایسی کوئی نماز شریعت سے ثابت نہیں جس میں ۱۰۰۰ بار سورۃ اخلاص تلاوت کی جائے اور اسے صلاۃ البراءۃ کا نام دیا جائے۔

پندرہ شعبان کا قیام اور روزہ

(سوال) کیا شعبان کی پندرہویں رات کا قیام اور روزہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

(جواب) اس سلسلہ میں سیدنا علیؑ سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے:

”جب نصف شعبان کی رات ہو تو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو۔“ [میزان الاعتدال (۱۰۰۲۴)، تذکرۃ الموضوعات: (۴۵) کنز العمال (۳۵۱۷۷)]

یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں ابن ابی سبرۃ ہے جس کے بارے میں امام احمد بن حنبل اور امام یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ یہ روایات گھڑتا ہے۔

لہذا روایت موضوع ہے، اس لیے خاص اہتمام کے ساتھ شب برأت کا قیام اور صبح کا روزہ رکھنا درست نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں کا معمول ہے کہ وہ سوموار، جمعرات یا چاند کی ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کا روزہ رکھتے ہیں، جنہیں ایام بیض کہا جاتا ہے یا ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن روزہ رکھتے ہیں، ان کے معمول میں آجائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن خصوصاً اس رات جاگنا اور صبح روزے کا اہتمام کرنا یہ درست نہیں ہے۔

WWW.KITABOSUNNAT.COM
KITABOSUNNAT@GMAIL.COM

